اردو

جلد ۱۶ | اپریل سنہ ۱۹۳۶ ع | حصہ ۶۲

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

اردو

فہرستِ مضامین

بابت اپریل سنہ ۱۹۳۶ ع

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	سوویٹ تھیٹر	جناب اختر حسین صاحب رائے پوری	۱۸۱
۲	روسی ڈراما	جناب محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن)	۱۹۷
۳	"بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کی اصل حقیقت	ایڈیٹر	۲۱۵
۴	شاد عظیم آبادی کا غیر مطبوعہ کلام	حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم	۲۳۰
۵	غالب کا سفر کلکتہ	مولانا غلام رسول مہر بی۔ اے ایڈیٹر انقلاب لاہور	۲۴۳
۶	نظم فانی	حضرت فانی بدایونی	۲۵۹
۷	اردو کی چند کمیاب کتابیں	جناب محمد اجمل خاں صاحب ایم۔ اے	۲۶۰
۸	افضل شاہ کا ایک شاہکار	میاں سلطان احمد وجودی صاحب	۲۷۵
۹	تبصرے	ایڈیٹر و دیگر حضرات	۲۹۰
۱۰	معلومات ادبیہ	ادارہ	۳۱۷

سوویت تھیٹر

از

سید اختر حسین صاحب رائے پوری

جدید روس کی زندگی کے کسی شعبے پر بحث کرنے سے پہلے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ وہ ہر آن تغیر پذیر ہے۔ نئے اور نئے اصول ابھی تجربے کی آگ میں تپ رہے ہیں، قدیم کے خلاف قدرتی طور پر رد عمل کا جذبہ کارفرما ہے اور دور جدید منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے نئی نئی راہیں تلاش کر رہا ہے۔ آرٹ کے خط و خال بدل گئے ہیں اور جو چیز کل مایۂ ناز تھی آج باعث ننگ ہے —

انقلاب سے پہلے کا روسی تھیٹر فنی اعتبار سے انتہائے عروج کو پہنچ گیا تھا۔ اداکاری اور ادا آموزی میں کوئی غیر ملکی تھیٹر اس کا ہم پلہ نہ تھا۔ انقلاب کے بعد اس کا روپ بالکل بدل گیا ہے۔ اس کی روح و قالب میں جو اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کے متعلق فن کاروں کی رائے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ نئے تجربے فنی معیار پر ناقص اترتے ہیں اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ انہوں نے ایک نئی شاہ راہ قائم کر دی ہے اور تھیٹر کے مردہ جسم میں تازہ روح پھونک دی ہے —

پہلے گروہ میں وہ لوگ ہیں جو ہر چیز کو قدیم روایات کی عینک سے دیکھتے ہیں اور جن کے نزدیک آرٹ حظ اور تفریح کا ذریعۂ محض

ہے۔ اگر وہ سوویٹ تھیٹر کے تخلیقی اور تعلیمی مقصد کو ناپسند کریں تو عجب نہیں۔

سوویٹ تھیٹر کی طرف سے کئی عذر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ وہ آرٹ اور زندگی کی ابدی بے تعلقی کا قائل نہیں ہے۔ وہ تو اپنے آپ کو ان دونوں کا سنگم تصور کرتا ہے۔ دوسرے تھیٹروں کی طرح وہ ناظر کے جذبات میں ہیجان برپا کر کے اپنے اثرات کو وہیں ختم نہیں کر دیتا بلکہ وہ ان ہیجانات اور جذبات کو ایک صاف، صحیح مقصد کی برآری کے لیے پابند کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ زار کے طبقۂ امرا کے لیے نہیں بلکہ ان لوگوں کی ذہنی اور روحانی تربیت کے لیے موجود ہے جو اشتراکی نظام کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ سوویٹ تھیٹر کی نشو و نما امن و سکون کی گود میں نہیں بلکہ ہنگامہ و اضطرار کے سائے میں ہو رہی ہے۔

اس وقت سوویٹ روس کا دھارا "اشتراکی واقعیت" کی طرف بہہ رہا ہے۔ اس اصطلاح سے مدعا یہ ہے کہ خیالات و جذبات کو اس طریقے سے حقیقت کی طرف راغب کیا جائے کہ سماجی نظام کو بدلنے میں مدد ملے۔ وہ واقعیت کافی نہیں ہے جو کیمرے کی طرح حالات کا فوٹو اتار دیتی ہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ انسان کو مستقبل سے باخبر رکھے اور اسے اس کی تعمیر کے گر سکھائے۔

بعد انقلاب روس ایک ہنگامی دور سے گزر رہا ہے۔ زندگی کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ ایک لمحہ ٹھہر کر اپنے منتشر اوراق کو یکجا کر لے۔ اس کی انقلاب آفرینی کا جائزہ سینما آسانی سے لے سکتا ہے مگر تھیٹر کے لیے یہ کار دشوار ہے۔ اسی وجہ سے ڈراما نہ تو کسی ایک سانچے میں ڈھل سکا

ہے اور نہ وہ طور مخصوص روایات کا پابند ہے - زندگی تیزی سے بدل رہی ہے اور حقیقت کی جستجو میں نئے نئے تجربوں اور مشاہدوں میں مصروف ہے - ڈراما اس کا عکس اور نقاش ہے - یہی نہیں اس کا نصب العین یہ ہے کہ زندگی کو اس کی منزل تک پہنچانے میں مدد دے اور اسی اعتبار سے وہ اپنے رنگ روپ کو بدل رہا ہے —

سوویت تھیٹر کی ترقی کا سہرا بڑی حد تک مشہور اداکار میئر ہولڈ کے سر ہے - قبل انقلاب ماسکو آرٹ تھیٹر میں بھی اس کی جدت طرازیاں قدامت پرستوں کی نگاہ میں خار کی طرح کھٹکتی تھیں - جدید تھیٹر کی تعمیر میں اس کے آگے دو دشواریاں تھیں - سب سے اہم مسئلہ لکھنے کا تھا - قدیم تماشوں کا روحانی اور انفرادی فلسفہ اداکار کی بناوٹی جذبہ کشی اور اسٹیج کی پر ابہام فضا جدید فلسفۂ زندگی کے سر تا سر منافی تھی - میئر ہولڈ کو ایسے تماشوں کی ضرورت تھی جو ناظر کے دل میں قدیم سے نفرت اور جدید سے محبت کا ولولہ پیدا کرے اور ایسے اسٹیج کی ضرورت تھی جہاں ایکٹروں اور تماشائیوں میں کوئی فصل باقی نہ رہے یعنی پورا ناٹک گھر اسٹیج کا کام دے - میئر ہولڈ اس اصول پر کاربند ہے کہ تھیٹر کا آرٹ تمثیل نگار کا مطیع نہیں ہے اور ناظم کو پورا حق ہے کہ تمثیل کے اظہار کے لیے وہ پیرایہ اختیار کرے جسے وہ مناسب سمجھتا ہے - چنانچہ انقلاب کے بعد جب نئی تمثیلوں کا قطعی فقدان تھا صرف یہی ہو سکتا تھا کہ ناٹکوں کو سماجی ضرورت کے مطابق بدل لیا جائے - اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادھر اُدھر سے کچھ مقام یا مناظر چھانٹ دیے جاتے تھے بلکہ ہوتا یہ تھا کہ پورا ڈراما مقتضائے وقت کے مطابق ڈھال لیا جاتا تھا اور وہ نئے حالات سے اتنا قریب ہو جاتا تھا کہ تمثیل نگار کو بھی اس

کی پہچان میں ایک بار دھوکا ہو سکتا تھا —

ماسکو آرٹ تھیٹر اور میئر ہولڈ کی صنعت میں بڑا فرق یہ ہے کہ جہاں اول الذکر زندگی کی گہرائیوں تک پہنچنا چاہتا ہے میئر ہولڈ زندگی کی وسعت سے آشنا ہونا چاہتا ہے - یہی وجہ ہے کہ وہ کسی ایک مسلسل پلاٹ کے ذریعے داخلی دنیا کو بے نقاب کرنے کی کوشش نہیں کرتا - وہ ناٹک کو مختلف ابواب میں تقسیم کرتا ہے اور سینما کے کیمرے کی طرح سرعت سے تھوڑی دیر میں خارجی دنیا کی متعددیت کو پیش کردیتا ہے - ایسی اداکاری اسے ناپسند ہے جو فرد کے ذہنی ہیجان کا اظہار کرتی ہے - وہ اپنے اداکاروں کو ہمیشہ مصروف کار دیکھنا پسند کرتا ہے - وہ زندگی کی وحدت کا ترجمان ہے اور تماشے میں کسی ایک جذبے کو غالب نہیں ہونے دیتا - شیکسپیر کی طرح وہ ایک ہی ڈرامے میں حزن وطرب اور اونچ نیچ کو جمع کردیتا ہے - اس کا اداکار دراصل ایک نٹ ہے جو ہاؤ بھاؤ یا بول چال سے نہیں بلکہ جسمانی حرکتوں سے اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرتا ہے - اسٹیج پر جو گیت سنائے جاتے ہیں ان میں ہم آہنگی ہوتی ہے جو سماج کی یک جہتی کو ظاہر کرتی ہے - میئر ہولڈ کی نظر میں اداکار کا کام یہ ہے کہ اشتراکی نقطۂ نگاہ سے نیک و بد کی تمیز کرے - یعنی ظلم کو ایسے ہولناک طریقے سے پیش کرے کہ ناظرین اس کے خلاف لڑنے کو تیار ہو جائیں اور نئے سماج کی ایسی روح افزا تصویر بنائے کہ ناظر اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کو ہیچ سمجھیں - کلاسکل معیار یہ ہے کہ اداکار کے عمل سے یہ ظاہر ہو کہ تمثیل نگار کے اصل منشا کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے اور حقیقت کا مشاہدہ یا تجربہ کر رہا ہے - لیکن میئر ہولڈ کا اداکار عوام کی روح کو اس حقیقت

سے متاثر کرنے کا دعویٰ کرتا ہے جسے اداکار اس کی روح میں منتقل کرچکا ہے —

میئر ہولڈ کا تھیٹر بناؤ سنگار اور آرایش کا قایل نہیں - پردے، پینٹ روشنی اور بازوؤں کا استعمال موقوف کردینے سے اب اسٹیج اور ناٹک گھر میں کوئی تمیز نہیں رہی - اداکار ناظرین کے درمیان بے تکلف گھوم پھر سکتا ہے - یہی نہیں اسٹیج پر حقیقی ساز و سامان لایا جانے لگا تاکہ اصل و نقل میں کوئی فرق نہ رہے - اسٹیج کو زیادہ واقعاتی بنانے کے لیے سینما کا بھی متعدد استعمال بھی اسی نے رواج کردیا - 'دنیا کا خاتمہ' نامی تمثیل ریل کے پل پر دکھائی گئی جس پر شروع سے آخر تک یہ تماشا ہوتا رہا - خانہ جنگی کی ہولناکی کو شدید تر کرنے کے لیے اس نے یہ ترکیب کی کہ ناٹک گھر میں ایک موٹر سائیکل چھوڑدی جو اپنے شور و غوغا سے منظر کو زیادہ دہشت ناک بنا رہی تھی - اس کا اسٹیج اس طور پر سجایا جاتا ہے جو اداکاری کے لیے تو ضروری نہیں ہوتا مگر اس سے ماحول کی تشریح بخوبی ہوجاتی ہے - بات یہ ہے کہ میئر ہولڈ جن لوگوں کو تماشا دکھا رہا تھا - ان کی زندگی ہنگاموں اور واقعات سے پر تھی - انقلاب اور خانہ جنگی نے جذبات میں ہیجان پیدا کردیا تھا اور لوگ صرف ایسے تماشے دیکھنا چاہتے تھے جو جوش آفریں ہوں - سماجی نقطۂ نظر سے داخلی، فلسفیانہ اور نفسیاتی ڈرامے چنداں کارآمد نہ تھے - میئر ہولڈ کا تھیٹر گویا سرکس، سوانگ اور ناٹک کا مرکب تھا - اس کا تخیل اس نے کچھ تو زیر سما چینی تھیٹر اور کچھ عہد وسطیٰ کے میلو ڈراما سے حاصل کیا ہے - لیکن اس میں اس نے بے مقصد جذباتی اداکاری کو کوئی جگہ نہیں دی —

یہ بھولنے کی بات نہیں کہ میئر ہولڈ تھیٹر کو محض سود مندی کا ادارہ نہیں بنانا چاہتا - زندگی کو وہ بھی حسین بنانا چاہتا ہے لیکن اس کے لیے وہ آرایش تصنع اور نک سک کو بدنما تصور کرتا ہے - مثلاً Teacher Bubus نامی جرمنی ڈرامے کو موثر بنانے کے لیے وہ پس منظر کی موسیقی کے لیے مشہور المیہ نگار Chopin کے گیتوں کو ناٹک میں جوڑتا ہے - اداکاروں کے ناچ بھی پر سوز ہیں اور وہ سب بے بسی کی جالیوں میں اس طرح گھرے ہوئے ہیں کہ دیکھنے والا الم سے پسیج جاتا ہے -

میئر ہولڈ کا سب سے بڑا کمال اس کی اثر پذیری ہے - مثلاً جرمن ناول "تمہید" کے اس سین کو لیجیے جس میں ایک کمیونسٹ کا بیٹا مارا جاتا ہے - موم بتی کی دھیمی روشنی میں باپ اپنے پھٹے ہوئے کوٹ سے بیٹے کی لاش ڈھک رہا ہے - ہر طرف کچھ مرجھائے ہوئے پھول بکھرے ہوئے ہیں بہت ہی مدھم سروں میں ایک مرثیہ گایا جا رہا ہے - بتائیے یہ منظر بہت ہی اثر طراز ہوگا -

ہولے ہولے میئر ہولڈ ایک ایسے تھیٹر کی تعمیر کر رہا ہے جو سماجی اور نفسیاتی اعتبار سے نہایت اہم ہے - سوویت تھیٹر کی تخلیق میں اس کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا ماسکو آرٹ تھیٹر کا -

قبل انقلاب ماسکو آرٹ تھیٹر نے ڈرامائی دنیا کو اپنے کمالات سے بہت متاثر کیا تھا - اس کا فنی معیار بلا شبہ نہایت بلند تھا - اس آرٹ کی بنیاد اداکار ہی کے کمال پر تھی جس کے توسل سے فرد کے جذبات کی ترجمانی بڑی نزاکت سے کی جاتی تھی - لیکن انقلاب کا انحصار اجتماعیت پر تھا اور اب انفرادی تعلقات کی اہمیت جمعیت کے آگے دب گئی تھی - زندہ رہنے کے لیے ضروری تھا کہ یہ تھیٹر اپنے ماحول

کے مطالبات کو پورا کرے۔ شروع میں کئی سال اس کا کام بند سا رہا کیونکہ پرانے ادا آموز اور اداکار یا تو منتشر ہو گئے تھے یا دور جدید کی ترجمانی کے لیے ناموزوں تھے - نئی تمثیلوں کا کال ٹوٹا تھا - ان دشواریوں کی وجہ سے اس کے ہمدردوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں - کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ آرٹ تھیٹر کی روایات اور نئے مسائل میں بعدالمشرقین ہے اور ان میں کسی قسم کا سنجوگ نہیں ہو سکتا - دوسرا گروہ اس تھیٹر کو قدامت کی بے روح فضا میں رکھنا چاہتا تھا - لیکن مسلسل جد و جہد کے بعد آرٹ تھیٹر نے ان تمام نظریوں کو غلط ثابت کر دیا - اس نشاۃ ثانیہ کا آغاز سنہ ۲۷ میں Armoured Train نامی تماشے کے ساتھ ہوا - تھیٹر اپنی قدیم روایات پر قایم رہا یعنی اس کا سب سے اہم نقطہ اداکار تھا اور سب سے اہم عنصر کردار کا نفسیاتی تجزیہ - لیکن اب اداکار ذاتی رنج و راحت کے تنگ کوچے سے باہر نکل آیا تھا - اس نے اپنا مقصد یہ بنا لیا تھا کہ نئے سماجی نظام کی ترجمانی کرے - اس طرح ہر کردار کے ساتھ اس کے طبقے کی تصویر اسٹیج پر آجاتی تھی - اب اس تھیٹر کا منشا یہ ہو گیا ہے کہ فطرت انسانی، کمالات اداکاری اور سماجی نفسیات کے تجزیہ کا بہترین امتزاج دنیا کے سامنے لائے - یعنی اس کی کارگزاری کا دایرہ انقلاب کی وجہ سے تنگ نہیں ہوا بلکہ بہت زیادہ وسیع ہو گیا ہے - میئر ہولڈ اور اس کے انتہا پسند اسکول سے یہ تھیٹر اس معاملے میں اختلاف کرتا ہے کہ تماشے کا مرکز اداکار نہیں بلکہ ناظم ہے - چنانچہ اب بھی وہاں اداکار ہی کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے - آرٹ تھیٹر کی حیات تازہ کا بہترین کارنامہ کلاسکس کی تمثیلی تفسیر تھی - ان میں بھی طالسطائی کے ناول Resurrection کی تماشہ گری

کو خاص فوقیت حاصل ہے - تو یہ تھا کہ انہیں طالسطائی کا روحانی فلسفہ گہرا رنگ نہ پکڑنے پائے اور کیریکٹر اور واقعات اور مصنف کتاب کی سماجی اور نفسیاتی اہمیت کو پس پشت نہ ڈال دے - لیکن ماسکو آرٹ تھیٹر نے بڑے انوکھے ڈھنگ سے یہ تماشا دکھایا طالسطائی کی اخلاقی تعلیم قلم زد کر دی گئی اور ناول چار منفصل منظروں میں تقسیم کیا گیا - جیل، دیہات، عدالت اور سائبیریا کا سفر۔ ان سب میں باکمال اداکاروں اور حسب حال مناظر کی معاونت سے زار کے ملازموں کی سفاکی، کسانوں کی بیچارگی، عدالت کی بے انصافی اور سائبیریا کی ہولناکی بے نقاب کر دی گئی اور سب سے اول مرتبہ طالسطائی کی روح کو اصل لباس میں منظر عام پر پیش کی گئی ـــ

سنہ ۳۲ ع کی فنی اصلاح کے بعد سٹینسلاوسکی کی سرکردگی میں اس تھیٹر کے اصول زیادہ وقعت حاصل کر رہے ہیں۔ ان اصولوں کا ماحصل یہ ہے کہ کردار ماحول کی ترجمانی کرے اور اداکار اس کے توسل سے ماحول کے خارجی پہلو کو روشنی میں لائے - لیکن یہ پوری روش یکسر فنی اور صنعتی ہو - سٹینسلاوسکی اسے پسند کرتا ہے کہ اداکار ناظر کی طرف توجہ کرے لیکن اس کے برعکس میئر ہولڈ ناظر اور اداکار کو قریب ملانا چاہتا ہے -

وختنگوف کا تھیٹر ان دو مختلف دھاروں کا سنگم ہے - وہ نہ تو یہ ماننے کے لیے تیار تھا کہ تمثیل نگار اور اداکار ناظم کی بساط کے مہرے ہیں، وہ جہاں چاہے انہیں اٹھا کر رکھ سکتا ہے - اور نہ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار کہ کردار کی داخلی دنیا کو سمجھنے کے لیے خارجی حالات سے بے التفاتی برتی جا سکتی ہے - ماسکو آرٹ تھیٹر دیانت داری سے ہر بھلے برے کردار کی ترجمانی کرتا ہے لیکن وختنگوف کا سب سے کارگر حربہ طنز اور حزن ہے۔

ناپسندیدہ کردار کو وہ اس طرح پیش کرے گا کہ ناظرین کی ہمدردی اس کے ساتھ ہو جائے لیکن ناپسندیدہ کردار کے ارد گرد وہ ایسی نفرت خیز فضا پیدا کر دیتا ہے جو مبالغے کی حد کو پہنچ جاتی ہے - جواں مرگ وختنگاف کے بعد بھی اس کے شاگرد اس کے آرٹ کے ارتقا میں مصروف رہے اور اب اس میں وہ تضاد نظر نہیں آتا - نفسیاتی یا فلسفیانہ تجزیے سے کنارہ کش ہو کر یہ تھیٹر قدیم رومانوں یا جدید مسائلی ڈراموں کے ذریعے سماج کے ظاہر و باطن کو سمجھاتا ہے - بات چیت اور چال ڈھال میں تھیٹری ادا کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اور مناظر کی وضاحت میں بڑی باریک بینی سے کام لیا جاتا ہے - ماحول اور اداکاری میں تازگی پیدا کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا جاتا ــــ

مشہور ادا آموز تیروف کی حیثیت سب سے جداگانہ ہے - انقلابی روس سے پہلے وہ جمالیاتی تھیٹر کا سب سے بڑا حامی تھا - تماشا گاہ اس کے لیے وہ جگہ تھی جہاں انسان حقیقت کی کلفتوں کو بھول جاتا ہے - ہاؤ بھاؤ ، گت ، آرایش اور شاعرانہ بول چال کی طرف وہ خاص توجہ کرتا تھا - اس کے کیمرنی تھیٹر میں اداکاری کم اور ناچ گانے زیادہ ہوا کرتے تھے - گویا ناٹک کم اور نوٹنکی زیادہ ہوتی تھی - اس کا جمالیاتی رجحان تجرد کی حد تک پہنچ گیا تھا - انقلاب نے سب سے زیادہ نقصان اس کے تھیٹر کو پہنچایا کیونکہ مظلوم سماج اور زندگی سے اس کے فن کو کوئی تعلق نہ تھا - نئی دنیا اس کے تماشوں کو بے جان اور اس کے اداکاروں کو بے روح سمجھتی تھی کیونکہ اس نے آرایش اور تصنع کی خاطر ڈرامے کے اصل فلسفیانہ موضوع کو قربان کر دیا تھا - گویا اس کا تھیٹر ہندوستان کے پارسی اسٹیج کا ایک عمدہ نمونہ تھا ــــ

لیکن روزمرہ زندگی تھیٹر نے اپنے کو حالات کے مطابق بدل لیا ہے - یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے ہم عصروں کے نقش قدم پر چل رہا ہے - اب تک سوویٹ روس میں اسے کوئی ایسا تمثیل نگار نہیں ملا جو اس کے معیار پر صحیح اترے - علاوہ بریں وہ زندگی کے ارتقائی منازل کا جائزہ نہیں لیتا بلکہ اس کے نتائج کو اسٹیج پر لانا اسے زیادہ مرغوب ہے - نفسیاتی ڈرامے کی تفصیل ۔ روز مرہ کے واقعات اور اشتہاری ڈراموں (Poster - plays) سے اس کو چڑ ہے - اب وہ صاف ایسے تماشے دکھاتا ہے جس میں انحطاط پذیر مغربی تہذیب میں ... کی کشمکش ظاہر کی جاتی ہے - یعنی یہ کہ انسان میں حرص، خود غرضی اور نفرت کیسی ہوتی جاتی ہے اور مدنیت و رواداری کے ... میں کتنا اچھا پن آتا جاتا ہے - تھیٹر نہ تو اداکاری میں تفصیل کو پسند کرتا ہے اور نہ اسٹیج میں - اختصار اور اشارہ میں اس کی ساری خوبی پنہاں ہے -

ان اختلافی امور کے باوجود سوویٹ تھیٹر میں کئی چیزیں مشترک ہیں - بغاوت اور تصنع کے دن اب ہٹ گئے - زندگی اور تھیٹر کی بے تعلقی بھی ختم ہو گئی - سیاست سے اجتناب کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی - فرد کے بجائے جمعیت، داخلی کشاکش کے بجائے بیرونی ہنگامے کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی ہے - نہ اب پہلے کی طرح اداکار اپنی ذات کو پیش پیش رکھنے اور "نمبر ون" حاصل کرنے کی کوشش کرسکتا ہے - قدیم تھیٹر میں ہر کردار کی خود پسندی کی وجہ سے تماشے میں وحدت پیدا نہ ہوتی تھی، لیکن اب یہ نہیں ہو سکتا - اب اداکاری میں باہمی مقابلے کا پتا بھی نہیں ملتا، اس کی جگہ باہمی تعاون نے لی ہے - تماشے کے منشا کو زیادہ روشن کرنے کے لیے سوویٹ تھیٹر دوسری ملکوں

سے بڑی آزادانہ مدد لیتا ھے - تماشے کو زیادہ اثر پذیر بنانے کے لیے نقاشی، عمارت سازی اور موسیقی سے کام لیا جاتا ہے - کردار میں کوئی الہامی یا غیر فطری شان پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی —

سوویٹ تھیٹر کا سب سے بڑا کمال اس کی اثر پذیری ھے - ڈرامے کے موضوع کو اپنے نقطہ نظر میں ڈھال کر پیش کرنے کے لیے وہ کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا - اسٹیج، اداکار، موسیقی، روشنی غرض کہ ہر چیز صرف ایک مشترک مقصد کے لیے کار بند ہوتی ہے اور وہ ھے اثر آفرینی —

سوویٹ تھیٹر کی سب سے بڑی کمزوری مناسب ناٹکوں کی کمی ہے - سوویٹ روس نے اب تک کوئی ایسا تمثیل نگار پیدا نہیں کیا جو جدید تھیٹر کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے زمان و مکان سے بالاتر ہو کر دور جدید کی صحیح تصویر کرے - ممکن ھے کہ جب تک دور جدید میں استقلال نہ پیدا ہو جائے یہ مسئلہ التوا میں پڑا رہے - کیوں کہ جس طرح مصور کسی ہلتی ہوئی چیز کی چھب نہیں اتار سکتا یا نغمہ تیز و تند ہوا میں قرار نہیں پا سکتا اسی طرح ادب بھی کسی ایسے دور میں پھل پھول نہیں سکتا جس میں ہر چیز کا خاکہ دھندلا اور مبہم ہو —

(۲)

اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ آج سوویٹ روس کے سوا دنیا کے ہر ملک میں تھیٹر زوال پذیر ھے - ناطق فلموں کے رواج کے ساتھ اس کا چلن اور بھی کم ہوتا جاتا ھے - اس کے برعکس روس کے ہر علاقے میں تھیٹروں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے - اور اس صنعت سے عوام کی دلچسپی اور بھی زیادہ حیرت انگیز ھے - وجہ یہ ھے کہ تھیٹر اب ایک تعلیمی ادارہ ہے اور زندگی کے لیے اس کی سود مندی ناگزیر ہوتی جاتی ہے -

زار کے زمانے میں تمام روس میں ۱۵۳ ناٹک گھر تھے۔ سنہ ۳۳ع میں
ان کی تعداد ۵۹۰ ہوگئی تھی اور ۱۱۵ نئے ناٹک گھر زیر تعمیر تھے۔ ماسکو
شہر میں صرف ۷ مستقل تھیٹر تھے جو اب بڑھ کر ۲۹ ہوگئے ہیں۔ اداکاری
کی تعلیم گاہوں میں دوگنا اضافہ ہوگیا ہے تنہا ماسکو شہر میں ان کی
تعداد ۲۸ ہے۔ قبل انقلاب روس میں مزدوروں کی ناٹک منڈلیاں صرف
۱۹ تھیں اب یہ بڑھ کر پانچ ہزار کے اوپر پہنچ گئی ہیں۔ اجتماعی
کھیتوں میں اور چھوٹے چھوٹے گاؤں میں سیری منڈلیوں کی مانگ روز
بروز بڑھتی جاتی ہے۔ کم از کم ہر دس ہزار مزدور اور کسان اپنی فرصت
کا وقت مقامی ناٹک منڈلیوں میں گزارتے ہیں۔ اس کے باوجود ناظروں
کی تماشا پسندی اتنی تیزی سے بڑھتی جاتی ہے کہ ناٹک گھروں میں
تل رکھنے کی جگہ نہیں ملتی —

سوویت روس کا تماشائی تھیٹر کو اپنی زندگی کا شعبہ سمجھتا ہے۔
پنچایتوں اور کمیٹیوں کے ذریعے وہ ہر تماشے کے متعلق تھیٹر کے ناظم اور
اداکاروں کو مشورے دے سکتا ہے۔ ہر تھیٹر اپنے ناظروں کی کانفرنس کرتا
ہے جس میں تھیٹر کی کارگزاریوں کی رپورٹ اور آیندہ پروگرام پر بحث
ہوا کرتی ہے۔ ہر تھیٹر کی سیری شاخیں ہوتی ہیں جو دیہاتوں اور
کارخانوں کا گشت لگاکر عوام کے احساسات اور جذبات کا صحیح اندازہ
لگایا کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ وہ مقامی ناٹک منڈلیوں کی تربیت کا
کام بھی انجام دیتی ہیں۔ یہ تحریک مزدوروں اور کسانوں سے آگے بڑھ
کر قیدیوں تک میں عام ہوتی جاتی ہے اور ہر قید خانے میں ناٹک اور
سوانگ ہوا کرتے ہیں —

اس تحریک کی داغ بیل انقلاب کے بعد ہی پڑ چکی تھی جب کہ

روس کے بڑے بڑے شہروں میں وہ "جلتا ناٹک" (Mass - Plays) ہوا کرتے تھے جن کی وجہ سے مخالفوں کو سوویٹ تھیٹر کے متعلق بد ظنی پھیلانے کا موقع مل گیا - اس قسم کے تماشوں کی ابتدا اس خیال سے ہوئی کہ ہر ناظر کو اداکار ہونا چاہئے کیوں کہ کشمکش زندگی میں کوئی آدمی محض تماشہ بین نہیں رہ سکتا —

بسا اوقات ایسے تماشوں میں ہزاروں آدمی شریک ہوا کرتے تھے - ایک زمانے میں یہ تماشے فوجوں میں بھی پھیل گئے تھے - ان کا واحد موضوع طبقاتی جنگ اور ظلم کی شکست اور صداقت کی فتح تھی - مثلاً "مزدور کی آزادی" نامی تماشے کو لیجئے اس کا پس منظر فرانس کا انقلاب ہے ایک عظیم الشان عمارت کے ستونوں پر ایک قلعے کی بہت بڑی تصویر لٹکی ہوئی ہے - چبوترے پر نوابین' سلطان اور پوپائے اعظم بیٹھے ہوئے ہیں - سیڑھیوں کے نیچے بہت سے غلام کھڑے ہوئے ہیں - وہ ان آقاؤں کو گرفتار کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان امیروں کے خدام ان کو بھگا دیتے ہیں - یہ کشاکش دیر تک ہوتی ہے - اور آخر میں غلام اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتے ہیں - نوابوں امیر فرار ہوجاتے ہیں اور قلعے کا کینواس گر پڑتا ہے - اس کے پیچھے آزادی کا شاداب درخت دکھلائی دیتا ہے - غلام سرخ جھنڈے لے کر ناچتے ہیں' آزادی کے ترانے گاتے ہیں اور آتش بازی چھوڑی جاتی ہے - گویا یہ رام لیلا کی قسم کی چیز تھی لیکن اتنے عظیم الشان پیمانے پر پیش کی جاتی تھی کہ ایک موقع پر اس میں چھ ہزار آدمیوں نے شرکت کی - فوجی بارکوں میں تو واقعتاً یہ تماشہ جنگی جہازوں اور طیاروں کے ساتھ دکھلایا جاتا تھا - اب اس کا رواج بالکل موقوف ہوگیا ہے -

تھیٹر کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے - یہاں بچوں اور غیر روسی

اقلیتوں کے ناٹکوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ ہمارے ملک میں تھیٹر سے جو سچی اخلاقی روایات وابستہ ہیں انہیں دیکھتے ہوئے ہم روس کے بچوں کے تھیٹر کی تعلیمی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ان تھیٹروں کا انتظام براہ راست محکمۂ تعلیم کے ہاتھ میں ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کی تفریح اور تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت بھی ہو اور فنون لطیفہ کا ذوق بھی پیدا ہو۔ یہ اداکار بچوں کی نفسیات کا ماہر ہوتا ہے۔ کوئی بھی تماشہ دیکھنے سے پہلے بچوں کو اس سے متعلق ہر چیز بتا دی جاتی ہے۔ بچوں پر تماشے کے رد عمل کا غور سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور ہر ایسی چیز حذف کر دی جاتی ہے جس کا ان پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ بچوں کو ہر تماشے پر اپنی رائے ظاہر کرنی پڑتی ہے اور ان کے نمائندے اداکاروں اور ادا آموزوں سے تبادلۂ خیالات کیا کرتے ہیں۔ بعض تھیٹروں میں اسٹیج اور تماشے کی ہیئت ایسی ہوتی ہے کہ بچے ناظر خاص موقعوں پر اس میں خود حصہ لے سکیں۔ عموماً یہ تماشے موسیقانہ ہوتے ہیں کیونکہ بچے فلسفہ کی بات چیت کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔ نہ وہ کسی اونچ نیچ اور ہیر پھیر کی بات کو پسند کرتے ہیں۔ جس اداکاری میں سادگی اور تمثیل میں سچائی نہ ہو اسے وہ ہرگز نہ دیکھیں گے۔ اب ہر بڑے اسکول میں کوئی ناٹک منڈلی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن گورکی کے ایک تھیٹر نے تو چار پانچ سال کے بچوں کے لئے بھی تماشے تیار کیے ہیں —

غیر روسی اقلیتوں کے تھیٹر کا فروغ بھی بہت دلچسپ ہے۔ زار کے عہد حکومت میں ان کی حیثیت نہیں کے برابر تھی۔ عام جہالت اور سماجی رجعت کے علاوہ حکام کی سختی انہیں کسی طرح پنپنے نہ دیتی تھی۔

روسی ترکستان اور دوسرے مسلم علاقوں میں تھیٹر کا نام و نشان نہ تھا۔ یہودیوں پر اتنا سخت احتساب تھا کہ وہ کسی قسم کی فنی یا تخلیقی ترقی نہ کرسکتے تھے۔ یوکرین تھیٹر کو اپنی مادری زبان کے بجائے روسی زبان میں تھیٹر کرنے ہوتے تھے۔ انقلاب نے ان اقلیتوں کی کایا پلٹ کردی ہے۔ اب ان میں تقریباً ایک سو مستقل ناٹک گھر ہیں۔ جن میں ۴۰ مختلف زبانوں میں تھیٹر کھیے جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۲ میں ماسکو میں جو ناٹک دنگل ہوا تھا اس نے بتادیا کہ ۱۵ سال کے مختصر عرصے میں انہوں نے کتنی ترقی کی ہے۔ ان میں سے بعض تو فنی اعتبار سے ماسکو کے تھیٹروں سے کسی طرح ہیٹے نہ تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی قومی روایات کو بھولتے جاتے ہیں۔ ہر قومی تھیٹر اپنے ملک کے ناچ گانے اور باجوں کا استعمال کرتا ہے اور نجی روایات اور معاشرت کا پورا پورا خیال رکھتا ہے۔ بااین ہمہ ڈرامے کا موضوع انقلابی، سماجی اور اقتادی ہوتا ہے۔ پچھڑی ہوئی اقلیتیں روسی اور غیر ملکی ڈراموں کو اپنے ماحول کے مطابق بدل لیا کرتی ہیں۔ قومی ادب کی اٹھان کے ساتھ رفتہ رفتہ اب نئے ناٹک بھی لکھے جارہے ہیں —

انقلاب کے بعد قومی تھیٹروں کے آگے دو مختلف مسایل تھے۔ یہودی، ارمنی، سفید روسی وغیرہ پہلے سے ڈرامائی روایات کے وارث تھے۔ وہاں تھیٹر کی بنیاد نئے سرے سے نہیں رکھنی تھی بلکہ قدیم تھیٹر کو نیا جامہ پہنانا تھا اور اس کے اُن عناصر کو چھانٹ دینا تھا جو نئی زندگی کے لیے مضر اور ناموزوں تھے۔ لیکن مُسلم اقلیتوں کو نئے سرے سے اپنے تھیٹر کی بنیاد ڈالنی تھی۔ انہیں سامنتی اور مولویانہ تعصبات، سماجی رجعت اور جہالت سے لڑکر تھیٹر کی تعمیر کرنا تھی۔ عورتیں

اسٹیج پر نہ آسکتی تھیں اور اداکار کا پیشہ نہایت ہی سوقیانہ سمجھا جاتا تھا - ان علاقوں میں عوام کی جہالت اور مذہبی تعصبات کو دور کرنے کے علاوہ لوگوں کو تھیٹر کی رغبت اور اداکاری کی ابجد سکھانی تھی -

ملاؤں نے شروع شروع میں تھیٹر کی سخت مخالفت کی - ازبکستان میں کئی لڑکیاں اس وجہ سے قتل کر دی گئیں کہ انھوں نے اسٹیج پر آنے کی جرأت کی تھی لیکن اب ملاؤں کی سرکوبی کے بعد یہ قصہ ختم ہو گیا ہے - اور روسی ترکستان وغیرہ میں بھی تھیٹر اسی سرعت سے قومی زندگی کی تعمیر میں حصہ لے رہا ہے -

اس مختصر سے خاکے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سوویت روس میں تھیٹر کس قدر مقبول ہے اور کتنا مفید کام انجام دے رہا ہے - پیشہ ور تھیٹروں کے علاوہ شوقین (Amateur) ناٹک منڈلیوں کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا - سرخ افواج میں ، کارخانوں میں ، اجتماعی کھیتوں میں اور طلباء میں غرض کہ آبادی کے ہر حصے میں ایسے بے شمار کلب موجود ہیں جو ڈراموں یا سوانگوں کے ذریعے لوگوں میں تھیٹر کا شوق بڑھاتے جاتے ہیں - تھیٹر کی نئی جدتوں کے ساتھ موسیقی میں بھی نئے رجحانات پیدا ہو گئے ہیں ڈرامے میں روکھی پھیکی بول چال کسی کو نہیں بھاتی - اس کی شان دوبالا کرنے کے لیے موسیقی کا خاص انتظام کیا جاتا ہے اور اس سے مختلف موقعوں اور کیفیتوں کے اظہار کا کام لیا جاتا ہے - آرائشی صنعت کا بھی خاص انتظام کیا جاتا ہے اور بہترین آرائش گر اس خدمت پر مامور ہوتے ہیں -

اس بدگمانی کی کوئی وجہ نہیں کہ سوویت تھیٹر قدیم تمثیل نگاروں کی طرف توجہ نہیں کرتا - سوشلسٹ تہذیب کا فرض اول یہ ہے

کہ پرانی تہذیبوں کا تنقیدی جائزہ لے اور ان کی جو چیزیں زمانہ حال کے لیے مفید ہوں انہیں اپنے میں ضم کر لے - چنانچہ سوویت تماشہ گاہ پر یونان ' روم اور عہد وسطیٰ کے تمام شاہکار پیش کیے جاتے ہیں اور شوق سے دیکھے جاتے ہیں - یہ ضرور ہے کہ ان کی تعبیر اس انداز سے کی جاتی ہے کہ وہ سماجی اعتبار سے مفید ہوں اور اپنے زمانے کے تاریخی اور تہذیبی حالات کو ابھار کر دکھائیں - کچھ عرصہ سے شکسپیر کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے اور ادیبوں اور عالموں میں اس کے ناٹک کا چرچا پھیلتا جاتا ہے چند سال ہی میں ان کی کئی کانفرنسیں شیکسپیر کے سماجی مقصد کو سمجھنے کی غرض سے ہو چکی ہیں - لیکن اب تک کوئی نہ سمجھ سکا کہ آیا اس کے پس ذہن کوئی تھا بھی یا نہیں - حال ہی میں اس کے ناٹکوں کا مجموعہ ایک لاکھ کی تعداد میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو چکا ہے —

اس امر میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ سوویت روس کی زندگی میں تھیٹر کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے - آج دنیا کے ہر ملک میں علم و ادب کا معیار کم ہوتا جاتا ہے - لیکن اس کے برعکس سوویت روس میں سائنس اور ادب کا ہر شعبہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے - اس سے وہاں کی تہذیب کی برتری یقیناً ثابت ہوتی ہے - تھیٹر کی صنعت بھی آج اس کے دم سے زندہ ہے اور پھل پھول رہی ہے - وقت کے ساتھ اس کا حسن نکھرتا جائے گا اور تجربے اور مشاہدے کے بعد اس کا پایہ زیادہ بلند اور مستحکم ہو جائے گا —

روسی ڈراما

پہلا دور

از

[جناب محمد مجیب صاحب بی۔ اے آکسن]

روس میں مغربی تہذیب کی نقل کے سلسلے میں ڈرامہ دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ شروع میں یہ شاہی خاندان اور درباریوں تک محدود تھا۔ اور پیٹر اعظم کا باپ ماسکو کے چند جرمن باشندوں سے ڈرامے لکھوا کر دربار میں تماشے کراتا تھا۔ ان جرمن ادیبوں کے علاوہ اس دور میں ایک روسی عالم پولوت سکی کا نام بھی ڈراما نویسوں میں ملتا ہے اور اس کے چند مذہبی ڈرامے اب تک موجود ہیں۔ لیکن اس فن کو رائج کرنے کی کوشش قبل از وقت تھی، اور قدامت پسند امیروں اور درباریوں نے اسے جائز دلچسپیوں میں شامل نہیں ہونے دیا۔ جب پیٹر اعظم تخت پر بیٹھا اور اسے ریاست پر کافی تسلط حاصل ہو گیا تو اس نے جرمنی سے ایکٹر بلوائے اور خود ان کے رہنے سہنے کا انتظام کیا (۱۷۰۲ء)۔ پہلے ماسکو میں ایک تھیٹر قائم ہوا، جو بعد کو پیٹر اعظم کے نئے دارالسلطنت میں منتقل کرا دیا گیا، اور رفتہ رفتہ ناظرین کے شوق اور دلچسپی کے ساتھ تھیٹروں اور ایکٹروں کی تعداد بڑھتی رہی۔ ان تھیٹروں میں جو ڈرامے دکھائے جاتے تھے وہ زیادہ تر جرمن ڈراموں کی نقلیں یا ترجمے

ہوا کرتے تھے، اور ان کے ایکٹر بھی اکثر غیر قوموں کے لوگ ہوتے تھے۔ ۱۷۵۰ میں چند لوگوں نے مل کر قصبہ یاروسلاول میں ایکٹروں کی جماعت بنائی، اور انہیں کو روس کے پہلے دیسی ایکٹر سمجھنا چاہیے۔ قائم ہونے کے چھ سال بعد ملکہ ایلی زبیتا کے حکم سے یہ جماعت پیٹر برگ بلا لی گئی، اسے "شاہی تھیٹر" کا خطاب دیا گیا اور ریاست نے باقاعدہ اس کی سرپرستی شروع کر دی —

ملکہ کیتھرین دوم (۱۷۶۲ – ۱۷۹۶) کو تمام فنون لطیفہ کا بہت ذوق تھا، اور انشاپردازی میں وہ طبع آزمائی بھی کیا کرتی تھی۔ اس کے عہد میں تھیٹر کو بہت فروغ ہوا، اور سوماروکوف نے متعدد ڈرامے لکھ کر دکھانے کے واسطے بھی بہت سامان مہیا کر دیے۔ اس زمانے کے ایکٹروں اور ڈراموں پر تنقید نہ کی جائے تو بہتر ہے۔ فرانس کی تقلید میں سارے تعلیم یافتہ روسی ایسے دیوانے ہو گئے تھے کہ ڈراما اور ایکٹنگ میں فرانسیسی طرز کے سوا ان کی نظروں میں کچھ جچتا نہیں تھا، اور مصنوعی، بے جان فرانسیسی طرز کی نقل کر کے انہوں نے اپنا معیار بہت گرا دیا۔ تقلید کے مرض نے انتہا کو پہنچ کر ایک حد تک خود اپنا علاج کیا، اور ملکہ کیتھرین کے عہد ہی میں بے تکی تقلید کے مخالف اپنی آواز بلند کرنے لگے۔ کنیازنین (۱۷۴۲ – ۱۷۹۱) اور اوزیروف (۱۷۶۹ – ۱۸۱۶) نے فرانسیسیوں کی نقل تو نہیں چھوڑی مگر انہوں نے روسی زندگی کو اپنا موضوع بنایا اور یوں روس کے پہلے حقیقت نگار ڈراما نویس دے نیس فون ویزن (۱۷۴۴ – ۱۷۹۲) کے لیے میدان تیار ہو گیا —

دے نیس فون ویزن کا خاندان جرمنی سے آکر روس میں آباد ہو گیا لیکن فون ویزن کی پیدائش تک وہ بالکل روسی ہو گیا تھا اور جو دولت

اس کے پاس تھی وہ بھی زیادہ تر گنوائی جا چکی تھی۔ ۱۷۶۲ میں فون ویزن نے تعلیم ختم کر کے وزارت خارجہ کے ایک دفتر میں نوکری کر لی جہاں اسے فرانسیسی اور جرمنی زبان سے معاہدات کا ترجمہ کرنا ہوتا تھا۔ نوکر ہونے کے دو سال بعد ہی اس نے اپنا پہلا ڈراما "فوجی افسر" شائع کیا، اور اگر وہ اپنی تصنیف کا سلسلہ جاری رکھتا تو وہ روس کی ادبی دنیا پر آسانی سے چھا جاتا، لوگوں کو "فوجی افسر" کو جس نے پڑھا اس نے بہت پسند کیا لیکن فون ویزن کو ملازمت میں بہت ترقی ہوئی، وہ امیرانہ زندگی بسر کرنے لگا، کئی سال یونہی ضائع کرتا رہا۔ اور یوں "فوجی افسر" کے بعد اٹھارہ سال تک اس نے کوئی ڈراما نہیں لکھا۔ لیکن جب فون ویزن نے اپنا دوسرا ڈراما "بھولا بالغ" شائع کیا اور وہ اسٹیج پر دکھایا گیا تو اس کی ایسی دھوم مچی جس کا آج کل اندازہ کرنا مشکل ہے۔ "بھولا بالغ" اس کا کارنامہ تھا اور اس کی آخری تصنیف بھی۔ ایک خاص قسم کی کیفیت، جو معلوم نہیں کہ مذہب کے اثر سے پیدا ہوئی یا کوئی بیماری تھی، اس کے ذہن پر بھوت کی طرح سوار ہو گئی، اور اس کی صحت عیاشی کی نذر ہوئی۔ موت سے بہت پہلے اس کی زندگی بے مصرف ہو چکی تھی —

اس زمانے کا تقاضا تھا کہ روسی سوسائٹی پر تنقید کی جائے، اور فون ویزن نے اپنے دونوں ڈراموں میں تنقید اور طنز سے رنگ پیدا کیا۔ اس نے یہ طرز بلا وجہ نہیں اختیار کیا، اس کا خیال تھا کہ مغربی قوموں کا دن ڈھل رہا ہے، اور روس میں ابھی صرف افق پر ذرا سی سرخی نئے دن اور تازہ زندگی کی پہلی جھلک دکھا رہی ہے۔ "ہم شروع کر رہے ہیں، وہ خاتمے کے قریب ہیں۔ مستقبل ہمارا ہے، اور ہم اپنی

قومی زندگی کو جو شکل چاہیں دے سکتے ہیں" اس عقیدے نے فون ویزن کے طنز کو اور بھی بے باک کردیا اور روسیوں میں خود داری پیدا کرنے کی آرزو کو اور بھی گرما دیا۔ "فوجی افسر" میں اس نے اپنے زمانے کی فرانس پرستی اور اس تربیت کا مذاق اڑایا جو فرانس پرستی نے رائج کرائی تھی۔ اس ڈرامے کا ہیرو اوانشکا اس زمانے کے نوجوانوں کا ایک مثالی نمونہ ہے اور اسے پیش کرنے کا مقصد والدین کو بیدار کرنا اور نوجوانوں کو غیرت دلانا ہے۔ اوانشکا نے جس اسکول میں تعلیم پائی اس کا بانی، منتظم اور ہیڈ ماسٹر ایک فرانسیسی ہے جو پیرس میں کرایے کی گاڑی چلاتا تھا، اور روس میں آکر عالم اور مدرس بن گیا۔ اس مدرسے سے فارغ ہوکر اوانشکا پیرس گیا، وہاں اوباشوں کی صحبت میں پڑکر بازاری زندگی کی راہ و رسم سیکھی اور روس واپس ہوا۔ یہ اپنی قابل رشک تربیت کی بنا پر ناز نخرے کرنے لگا۔ واپسی کے بعد باپ سے اس کی جو پہلی گفتگو ہوتی ہے اس کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:-

فوجی افسر (اوانشکا کا باپ) سن رے، اوان، بچپن سے اب تک میری نظر شرم سے بہت کم نیچی ہوئی ہے لیکن تو تو مجھے ایسا شرمندہ کررہا ہے کہ جی چاہتا ہے زمین میں دھنس جاؤں۔

اوانشکا: ابا جان، میں کیسے گوارا کرسکتا ہوں کہ آپ لوگ کسی روسی لڑکی سے میری شادی کردیں —

فوجی افسر: مگر تو فرانسیسی کیسے بن بیٹھا؟ کیا تو روس میں نہیں پیدا ہوا تھا؟ —

اوانشکا: میرا جسم روس میں پیدا ہوا مگر میری روح شاہ فرانس کی تابعدار ہے ... مجھے آپ کے عہدے اور آپ کی عزت آبرو

سے کوئی واسطہ نہیں، میں اس کا لحاظ کرنے پر تیار نہیں، خصوصاً جب آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ دنیا کی سیر کر آیا ہوں، پیرس میں رہ چکا ہوں —

فوجی افسر: بھلا یہ بھول جانا کسی کے بس کی بات ہے؟ مطلب میں، ہر لمحہ آپ کی کوئی نہ کوئی نئی حماقت اس کی یاد تازہ کردیتی ہے، اور آپ کی حماقتیں ایسی ہیں کہ اگر آپ روس میں ہوتے تو آپ کی سب سے ادنیٰ حماقت کی سزا میں آپ کی نازک پیٹھ پر کوڑے لگتے -

اوانشکا: ابا جان، آپ تو ہر وقت اسی خیال میں رہتے ہیں کہ آپ کے سامنے سواهیوں کی ایک قطار کھڑی ہے اور آپ کمان دے رہے ہیں - آخر اس قدر چلانے کی ضرورت کیا ہے؟ —

فوجی افسر: ٹھیک کہتا ہے، چلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن تونے مجھے پھر تنگ کیا تو تیری پیٹھ پر کم از کم سو روسی ڈنڈے رسید کروں گا۔ سمجھا؟ —

اوانشکا: جی، سمجھا .. میرے خیال میں اگر آپ کی کسی جنگل میں ایک ریچھ سے مڈبھیڑ ہوجائے تو وہ آپ کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرے جیسا آپ میرے ساتھ کررہے ہیں —

فوجی افسر. کیا بد زبان لونڈا ہے! باپ کو ریچھ سے تشبیہ دیتا ہے، کیا میری صورت ریچھ کی سی ہے؟ —

وانشکا: مشابہت کا کوئی سوال نہیں- میں نے تو بس اپنا خیال صاف صاف ظاہر کردیا ہے. میری طبیعت ہی کچھ ایسی صاف گو واقع ہوئی ہے —

فرانس پرستی ھی روسی سماج کا روگ نہیں تھی کوئی سمجھ دار روسی اس سے انکار نہیں کرسکتا تھا کہ قدامت پسند حلقوں میں جہالت اور تنگ نظری کی کوئی انتہا نہ تھی اور ان لوگوں کی اصلاح کرنا اتنا ھی ناگزیر تھا جتنا فرانس کے مقلدوں کا دماغ درست کرنا - فون ویزن نے اپنے دوسرے ڈرامے "پسر نابالغ" میں قدیم طرز کے ایک گھرانے کی تصویر دکھائی ھے اور پرانے فلسفہ حیات اور طرز معاشرت کا بھرم کھول دیا ھے - ڈرامے کا "ھیرو" متروفان ایک سولہ سترہ برس کا نوجوان ھے جس کی دماغی حالت چھ سات سال کے بچے کی سی ھے اسے اپنی طبیعت پر بالکل قابو نہیں اور اپنی تربیت کی وجہ سے وہ انسانیت کی تمام فضیلتوں سے بالکل کورا رہ گیا ھے - اس کی ماں پروستکووا کو حکومت کی ایسی ھوس ھے کہ وہ اسے یا اس کے باپ کو کسی قسم کی آزادی دینا گوارا نہیں کرسکتی شوھر کو اس کی ڈانٹ ڈپٹ نے ایسا سہما دیا ھے کہ وہ کسی معاملے میں رائے رکھنے کا حوصلہ ھی نہیں کرتا اور متروفان کو اس کے دلار نے چھچھلا اور احمق بنا دیا ھے - پروستکووا کے گھر کی حالت ڈرامے کے پہلے دو سین سے معلوم ھوجاتی ھے -

پہلا سین

متروفان، پروستکووا اور ایک خادمہ متروفان ایک تازہ سلا ھوا کفتان پہنے ھے -

پروستکووا: کفتان بالکل چوپٹ ھوگیا ھے - (خادمہ سے) ارے، جا ذرا
اس بد معاش ترشکا کو بلا تو لا! موے چوتڑے نے کفتان بالکل
تنگ کردیا ھے - متروفان بیٹے، میں تو سمجھتی ھوں تمہارا اس

* عربی خفتان ھے - ایک طرح کا کوٹ جو اچکن سے بہت ملتا تھا -

میں دم گھٹ رہا ہوگا۔ جاؤ پوچھو، جاؤ، ذرا اپنے ابا جان کو بلا لاؤ۔ (متروفان چلا جاتا ہے۔)

دوسرا سین

پروستکووا، تریشکا وغیرہ۔

پروستکووا: ابے گدھے ادھر آ۔۔ میں نے تجھ سے کہہ دیا تھا کہ کفتان ذرا ڈھیلا سینا۔ ایک تو بچہ اپنی خدا کے فضل سے بڑھ رہا ہے، دوسرے اسے تنگ کپڑے پہننا نہیں چاہئیں۔ اس کا بدن بہت نازک ہے۔ پھر بتا تو نے کفتان کیوں تنگ کر دیا۔

تریشکا: سرکار، آپ تو جانتی ہیں میں درزی نہیں ہوں، آپ کے حکم سے سینا شروع کیا ہے۔ میں نے تو پہلے ہی عرض کیا تھا کفتان کسی اچھے درزی سے سلوائیے۔

پروستکووا: تو کیا کفتان سینے کے لیے درزی ہونا ضروری ہے؟ تیری بھی کیا گائے بھینس کی سی سمجھ ہے!

تریشکا: مگر سرکار درزی اپنا کام سیکھتے ہیں، میں نے تو کبھی کچھ سیکھا نہیں۔

پروستکووا: تو تو بس اپنی رٹ لگائے ہے۔ ارے یہ تو بتا کہ اگر ایک درزی نے دوسرے سے سیکھا تو آخر دنیا میں جو سب سے پہلا درزی تھا اسے کس نے سکھایا؟

تریشکا: اگر اسے کسی نے سکھایا نہیں تو وہ کفتان مجھ سے بھی بدتر سیتا ہوگا۔ (متروفان دوڑتا ہوا اندر آتا ہے۔)

متروفان: ابا جان کو بلا آیا ہوں۔ انہوں نے فرمایا: ابھی آتا ہوں۔ لیجیے وہ آ بھی گئے۔ (پروستکوف ڈرتے ڈرتے داخل ہوتا ہے۔)

پروستکووا : یہ تم آخر مجھ سے چھپے چھپے کیوں رہتے ہو؟ ... ...
دیکھو سرکار! آپ کی طبیعت کی نرمی نے مجھے کیا دن دکھائے ہیں -
دیکھو ماموں کی منگنی کے دن بھانجے کو کس شان کا کفتان
پہننا نصیب ہوا ہے! دیکھو تریشکہ نے کیسا نفیس کفتان سیا ہے!

پروستکوف : (خوف سے ہیچھے ہٹتے ہوئے) ہاں، کچھ ڈھیلا ہے -

پروستکووا : میاں عقلمند، آپ خود ڈھیلے ہیں -

پروستکوف : مگر میں تو سمجھا تھا کہ آپ کا بھی یہی خیال ہے -

پروستکووا : مگر تم خود کیا اندھے ہوگئے ہو؟

پروستکوف : آپ کی موجودگی میں میری آنکھیں نہیں دیکھتی ہیں -

پروستکووا : یا اللہ، مجھے بھی کیسا شوہر ملا ہے! اتنی بھی سمجھ نہیں
کہ ڈھیلے اور تنگ میں تمیز کر سکے -

پروستکوف : مجھے ہمیشہ آپ کی رائے پر اعتبار رہا ہے اور رہے گا -

پروستکووا : جی، تو پھر یہ بھی سمجھ لیجیے کہ میں ان لونڈی غلاموں
کو سر نہ چڑھاؤں گی - جائیے، اس لڑکے کو فوراً سزا
دیجیے! (سکوتی نن، پروستکووا کا بھائی داخل ہوتا ہے) -

سکوتی نن : کسے سزا دیجیے؟ کیوں؟ خاص میری منگنی کے دن؟ بہن، آپ سے
التجا کرتا ہوں کہ سزا کو منگنی کے بعد تک ملتوی رکھیے ...
میرا نام تراس سکوتی نن نہیں اگر میں کبھی کسی کو سزا
دینے میں تامل کروں، اس معاملے میں بہن میری آپ ہی
کی سی عادت ہے - لیکن آپ خفا کس بات پر ہوئیں؟ -

پروستکووا : دیکھو بھیا، تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے - مترو فان پیارے،
ادھر آؤ - دیکھو بھیا، یہ کفتان ڈھیلا ہے؟ -

سکوتی نن: نہیں۔

پروستکوف: مگر بیگم میں نے تو خود کہا تھا تنگ ہے!

سکوتی نن: مجھے تو وہ تنگ ہی نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ تو بھی نہایت نفیس سا ہے۔

پروستکووا: (ترپشکا سے) دور ہو مردود! (حاضرین سے) جا بچے کو ناشتہ کھلا، اس کے استاد آتے ہوں گے۔

"پھر نا بالغ" کی ہیروئن پروستکووا کی ایک رشتے کی بھتیجی سوفیا ہے، جو اپنے والد کے انتقال کے بعد پروستکووا کے یہاں رہنے لگی اور وہیں اس نے تربیت پائی۔ سکوتی نن کی منگنی جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ اسی کے ساتھ ٹھہری تھی۔ ڈرامے کا اصل قصہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب پروستکووا کو خبر ملتی ہے کہ سوفیا کو ورثے میں دس ہزار روبل نقد اور ایک جائداد ملنے والی ہے۔ سوفیا کے ساتھ اس کا برتاؤ ہمیشہ سے خراب تھا، لیکن یہ خبر سنتے ہی وہ اس پر نہایت مہربان ہو جاتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ وہ سکوتی نن کی بجائے میتروفان سے شادی کر لے۔ سکوتی نن کی ساری عمر سور پالنے میں گزری ہے اور سوروں کے سوا وہ کسی موضوع پر گفتگو نہیں کر سکتا، لیکن روپے کے لالچ میں سوفیا سے اس کا برتاؤ نہایت نیاز مندانہ ہو جاتا ہے اور وہ خاندان والوں کو اس پر مجبور کرنا چاہتا ہے کہ سوفیا کی اس سے شادی کرا دی جائے۔ بہن اور بھائی میں اپنی اپنی غرض پوری کرنے کے لیے جو مقابلہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے کو زچ کرنے کو وہ جو چالیں چلتے ہیں نہایت مضحکہ خیز ہیں۔ مگر بیچاری سوفیا مصیبت میں پھنس جاتی ہے۔ اتفاق سے اس کا چچا ستارودوم اس موقع پر آپہنچتا ہے اور سوفیا کو پناہ مل جاتی ہے۔ ستارودوم کے سامنے پروستکووا اور سکوتی نن سے کچھ بنائے

نہیں بنتا، اور آخر میں سونیا اسی کے مشورے سے ایک خوش اخلاق اور روشن خیال نوجوان سے شادی کر لیتی ہے۔ پروستکووا کی ناکامی اس کی تباہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے، کیوں کہ جائداد کو ساہوکاروں سے بچانے کی یہی صورت تھی کہ متروفان کی کسی امیر لڑکی سے شادی ہو جائے۔ سکوتی نن مایوس ہو کر پھر اپنے سوروں میں جا بیٹھتا ہے —

"پھر نابالغ" کا موضوع نہایت مناسب ہے اور اس کے اکثر کیرکٹر اس کے زمانے کے روسیوں کی سچی تصویریں ہیں۔ لیکن مصنف نے واقعات کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے بیان میں بہت عجلت کی ہے جو کبھی کبھی ناگوار معلوم ہوتی ہے، اور ڈرامے کے بعض کیرکٹر اس طرح بے موقع پر نمودار ہوتے ہیں کہ ڈرامے کی حقیقت نگاری میں شبہہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نئے خیالات کی تبلیغ بھی جس انداز سے کی گئی ہے وہ "پھر نابالغ" کو بہ حیثیت ڈرامے کے کم زور کر دیتی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو اپنے قدردانوں سے اس کی امید نہیں تھی کہ وہ اشارے اور کنایے سے بات سمجھ لیں گے اور سب کچھ تفصیل سے کہنے پر مجبور تھا۔ پروستکووا سکوتی نن اور متروفان روس کے دیہاتی شرفا کی ذہنیت کے عیب دکھانے کے لیے بہت کافی ہیں۔ ان کی صورت کا نقشہ کھینچنے کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ اصلاح کی الگ سے ترغیب دلائی جائے۔ لیکن سونیا کا چچا ستارودوم، جسے فون ویزن نے اپنے خیالات کا مبلغ بنایا ہے نہایت لمبی لمبی تقریریں کرتا ہے جن سے طبیعت اکتا جاتی ہے اور ڈرامے کا ایک اچھا خاصا کیرکٹر ہماری نظروں سے گر جاتا ہے۔ دراصل "پھر نابالغ" کا کوئی اچھا کیرکٹر اس خوبی سے نہیں دکھایا گیا ہے۔ جیسے پروستکووا یا سکوتی نن۔ ہر ایک میں یہ نقص ہے کہ وہ خالص خوبیوں کا مجسمہ بنایا گیا ہے

اور ایک جیتی جاگتی ہستی نہیں بلکہ مصنف کی ایجاد معلوم ہوتی ہے —

" پھر نابالغ " کے بعد ایک مدت تک کوئی ایسا ڈراما نہیں لکھا گیا جو صحیح معنوں میں روسی کہا جا سکتا ہے - اوزیروف (۱۷۶۹ - ۱۸۱۲) کے ڈراموں میں رومانیت کے اثرات ظاہر ہونے لگے، اور اگرچہ رومانیت بھی روس میں یورپی اثر ہی کی تقلید میں اختیار کی گئی، اس میں قومی فطرت اور مذاق کے ظاہر ہونے کی خاص گنجائش تھی - اوزیروف نے اس وقت جب پولینڈ سے جنگ ہو رہی تھی ایک قومی ڈراما " دمیتری دونسکوئی " لکھا جو نہایت مقبول ہوا لیکن دراصل ڈراما اور تاریخ دونوں کے لحاظ سے یہ بالکل مہمل ہے - کریلوف، جس کی کہانیاں اتنی مشہور ہوئیں، کئی سال تک ڈرامے کے میدان میں طبع آزمائی کرتا رہا، مگر اس کی طبیعت ڈراما نویسی کے لیے بالکل ناموزوں تھی، اور وہ فرانسیسی اور کامیاب روسی ڈراموں کی نقل سے آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر سکا - جو ترقی انیسویں صدی کے پہلے بیس سالوں میں ہوئی وہ ایکٹنگ اور اسٹیج تیار کرنے کے (Staging) فن میں ہوئی - اس زمانے میں اچھے ایکٹروں کی ایک خاص تعداد پیٹربرگ اور ماسکو میں پیدا ہو گئی اور فرانسیسی ڈرامے اور ان کی روسی نقلیں دونوں مقابلتاً بہت بہتر طریقے سے دکھائی جانے لگیں - شیکسپیر کی قدردانی بھی اسی دور میں شروع ہوئی، اور یوں ایکٹروں کو اپنا کمال دکھانے کے لیے بہت موقع تھا —

روسی سوسائٹی کا عکس اُتارنے اور روسیوں کو حقیقت سے آگاہ کرنے کا بیڑا الکساندر سرگے یوچ گریبوئیدوف (۱۷۹۵ - ۱۸۲۹) نے اُٹھایا - " عقل مندی کی سزا " حقیقت نگاری اور تنقید کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے - گریبوئیدوف ایک رئیس خاندان میں پیدا ہوا اور اس نے بہت اچھی تعلیم پائی -

"عقل مندی کی سزا" کا خاکہ اس کے ذہن میں طالب علمی کے زمانے ہی سے قائم تھا اور اس وقت سے ۱۸۲۳ تک جب ڈراما مکمل ہوگیا، وہ اسی کی تصنیف میں مشغول رہا۔ ۱۸۱۲ میں نپولین نے روس پر حملہ کیا اور گریبوئے دوف وطن کو دشمن سے محفوظ رکھنے کے لیے فوج میں بھرتی ہوگیا۔ اس نے چار سال فوجی افسر کی زندگی بسر کی، یہاں اسے خلاف معمول صحبت بہت اچھی ملی، کیوں کہ وطن پرستی کے جوش میں تعلیم یافتہ طبقے کے بہترین نوجوان فوج میں بھرتی ہوگئے تھے، گریبوئے دوف نے اس صحبت سے پورا فائدہ اٹھایا، اور اس کے ڈرامے کے بصیرت افروز خیالات اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ ۱۸۱٦ میں گریبوئے دوف نے اپنی ماں کے اصرار پر وزارت خارجہ میں ملازمت کرلی، اور دو سال بعد روسی سفیر کا سکریٹری ہوکر طہران چلا گیا۔ یہاں اس نے فارسی سیکھی، ایران کی خوب سیر کی، اور اپنی خوش مزاجی اور شرافت کی وجہ سے دربار میں بھی ہر دلعزیز ہوگیا۔ مگر وہ بہت سچا اور مخلص، یعنی نہایت ہی خود غرض وطن پرست تھا، اور ہم وطنوں کی حمایت کے سلسلے میں اسے بہت کچھ کرنا پڑا جو شاہ ایران اور اس کے ولی عہد عباس مرزا کو بہت ناگوار معلوم ہوا۔ ۱۸۲۱ میں گریبوئے دوف تفلس آیا، اور چونکہ علاج کی غرض سے کچھ عرصے وہیں رہنا تھا اس لیے اس نے قفقاز کے گورنر کے مشیر کا عہدہ حاصل کرلیا، اور یہ خدمت بھی بہت تن دہی اور سلیقے سے انجام دی۔ کوئی تین سال بعد وہ رخصت لےکر روس آیا، اور اپنے دوستوں کو "عقلمندی کی سزا" جو اس نے تفلس کے قیام کے دوران میں ختم کرلیا تھا، دکھایا۔ ڈراما بے حد پسند کیا گیا، لیکن کوشش اور سفارشوں کے باوجود دفتر احتساب نے اسے تھیٹر میں دکھانے کی اجازت نہیں دی۔ گریبوئے دوف

رخصت کے بعد تفلس واپس ہوا ہی تھا کہ پیٹرزبرگ میں ۱۸۲۵ کی مشہور بغاوت ہوئی، اور اس کی گرفتاری کا حکم بھی جاری ہوا۔ اس کی خبر گریبوئے دوف کو ایک دوست کے ذریعے سے مل گئی تھی اور جب پولیس والے تلاشی لینے آئے تو وہ ان کاغذات کو جن سے اس کا باغیوں سے تعلق ظاہر ہوتا تھا جلا چکا تھا۔ پھر بھی وہ گرفتار کر کے پیٹرزبرگ بھیج دیا گیا اور ایک سال کے قریب قید رہا۔ قید سے چھوٹا تو وہ قفقاز میں اپنے پرانے عہدے پر دوبارہ مامور ہوگیا، اور روس اور ایران کی جنگ میں جو اسی زمانے میں چھڑ گئی تھی، اس نے بہت حصہ لیا۔ جنگ کے ختم ہونے پر وہ روس کی طرف سے صلح کے شرائط منظور کرانے کو ایران بھیجا گیا۔ ان شرائط نے ترکمان چائی کے صلح نامے کی صورت اختیار کی جس کے رو سے ایران کے ایک بہت زرخیز علاقے پر روس کا قبضہ ہوگیا، اور اس کو ایران کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا حق بھی حاصل ہوگیا۔ صلح کے بعد گریبوئے دوف چند مہینے کے لیے روس آیا، اور پھر روسی سفیر کی حیثیت سے طہران گیا۔ اسے معلوم تھا کہ عباس مرزا، شاہ ایران، ترکمان چائی کے صلح نامے کا بدلہ ضرور لے گا۔ اور وہ طہران یہی سمجھ کر گیا تھا کہ شاید ہی زندہ واپس آتا ہو۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ ایک روز شہر کے غنڈوں کی ایک فوج نے اس کے مکان کو گھیر لیا، اور اندر گھس کر اسے مار ڈالا۔

سرکاری ملازمت کی وجہ سے گریبوئے دوف کو ادبی مشاغل کے لیے بہت کم مہلت ملی تھی۔ "عقلمندی کی سزا" کے علاوہ اس نے صرف ایک ڈراما اور لکھا جس کا آخری حصہ گم ہوگیا ہے۔ اس وقت اس کی نسبت صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں نے پورا ڈراما پڑھا ان کا بیان ہے کہ وہ بہت اچھا تھا۔ گریبوئے دوف کی قبل از وقت موت سے روسی ادب کو بہت نقصان ہوا،

مگر اس کا نام زندہ رکھنے کو "عقلمندی کی سزا" بہت کافی ہے -

یہ ڈراما نظم میں ہے ' لیکن روسی نقاد سب اس پر متفق ہیں کہ نظم میں ہونے کے باوجود وہ ماسکو کی عام بول چال کی زبان کا بہترین نمونہ ہے - اس کی ظرافت بھی بے مثل ہے ' اور اس کی ہر دلعزیزی کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ اس کے سینکڑوں فقرے مدتوں تک ہر روسی کی زبان پر رہے - اس کا قصہ بھی ایسا ہے جسے صرف اس زمانے کی نہیں بلکہ ہر وقت اور تقریباً ہر قوم کے تعلیم یافتہ اور خوش حال طبقے کی زندگی کا آئینہ کہا جاسکتا ہے ' اور دیکھنے والا اس کے کیرکٹر ہر جگہہ دیکھہ سکتا ہے - فاموسوف ' جو کسی محکمے میں ایک اعلیٰ عہدہ دار ہے ' ہر وقت اپنی لڑکی سوفیا کے واسطے شوہر کی تلاش میں رہتا ہے ' اور یہ فرض اس پر بہت گراں گزرتا ہے - اس کی لڑکی سوفیا کو مگر کسی بات کی فکر نہیں - رات کو دیر تک وہ عشق کے فسانے اور جذبات کو بھڑکانے والے فرانسیسی ناول پڑھتی رہتی ہے ' دن کے دو پہر گزر جاتے ہیں تو سوکر اٹھتی ہے اور لوگوں سے ملنے ملانے چلی جاتی ہے - اس کی کل روحانی ضروریات ناولوں کے مطالعے سے پوری ہوجاتی ہیں ' اور جب جی چاہتا ہے تو وہ اپنے باپ کے سکریٹری مولچالن کو دل بہلانے کے لیے اپنے پاس بلا لیتی ہے - مولچالن کو اس سے کوئی محبت نہیں ' وہ صرف اپنی ترقی کے واسطے ضروری سمجھتا ہے کہ اپنے آقا کی لڑکی کو خوش رکھے - اس وجہ سے وہ سوفیا کے کمرے میں جاکر بیٹھتا ہے اور عجز و نیاز کی باتیں کرتا ہے مگر موقع ملتا ہے تو سوفیا کی خادمہ لیزا کو پیار کرنے کی کوشش کیا کرتا ہے - فاموسوف کے ملنے والوں میں ایک فوجی افسر سکالوزوب ہے ' جس سے وہ اپنی لڑکی سوفیا کی شادی کرنا چاہتا ہے ' مگر

سکالوزوب سوفیا کو ایک آنکھ نہیں بھاتا، کیونکہ وہ ہر وقت فوجی
معاملات پر گفتگو کرتا رہتا ہے اور فوجی معاملات کے سوا اور کچھ اس کی
سمجھ میں آتا نہیں۔ سکالوزوب کے علاوہ فاموسوف کے اور بہت سے معزز
لوگوں سے مراسم ہیں، بیگم توگوا وسوف ہیں، جن کی چھ لڑکیاں
ہیں، اور جو ہر شخص کو اس نظر سے دیکھتی ہیں کہ وہ ان کا داماد
بن سکتا ہے یا نہیں، ان کے یہاں اکثر آتی ہے۔ اسی طرح گوریچ کی؛
ریپی تی لوف، وغیرہ بھی جو ملازم ہیں اور نوکری کی ترقیوں سے چمٹے
رہتے ہیں۔ اس گروہ میں جہاں ہر شخص کی نظر محدود اور خیالات
تنگ ہیں، ڈراما کا ہیرو چاٹ سکی پہلے ہی ایک طوفان برپا کر دیتا ہے۔
وہ بچپن میں سوفیا کے ساتھ کھیلا کرتا تھا، سوفیا سے اسے محبت تھی،
لیکن کچھ صحت کے خیال سے اور کچھ سیر و سیاحت کے شوق میں وہ
زیادہ تر ماسکو اور اپنے بچپن کے ماحول سے دور رہا اور کئی سال
غائب رہنے کے بعد اس ارادے سے واپس آیا ہے کہ اگر ممکن اور مناسب
ہو تو سوفیا سے شادی کرلے۔ اپنے ہم وطنوں کی تنگ نظری اور غفلت سے
اسے شکایت پہلے سے تھی، مگر اس مرتبہ یہ لوگ سب اس کو ناقابل
برداشت معلوم ہونے لگے، اور اس کی زبان، جو ہمیشہ سے تیز اور اس کے
قابو سے باہر تھی، عیب جوئی کرنے اور زہر اگلنے سے ایک لمحہ بھر بھی
باز نہیں رہتی۔ پہلے ہر جگہ سب اس کی آؤ بھگت کرتے ہیں، کیونکہ وہ
رئیس ہے، اور اس کی شادی نہیں ہوئی ہے، مگر اس کی زہریلی اور
خطرناک باتیں سب کو بہت جلد بیزار کر دیتی ہیں۔ چاٹ سکی خود
برداشتہ خاطر ہے، اور جب سے سوفیا کے چال چلن کی خبر ہو جاتی
ہے تو ماسکو کی زندگی سے اس کا آخری رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، ڈرامے کے

آخر میں جب فاموسوف نے ایک دعوت دی ہے اور اس کے تمام دوست آشنا جمع ہیں، چاٹ سکی ایک لمبی تقریر میں اپنی ساری نفرت اور بیزاری بیان کرکے چل کھڑا ہوتا ہے، اور ارادہ کرلیتا ہے کہ پھر کبھی ماسکو کی صورت نہ دیکھوں گا - فاموسوف کے مہمان، جو چاٹ سکی کا مطلب نہیں سمجھ سکے ہو اور اس کے اچانک غائب ہو جانے کی وجہ ہیں اس کی تاویل یوں کرتے ہیں کہ اسے پولیس نے گرفتار کر لیا ہے، اور پھر مبالغہ غلط فہمی اور غیبت کا شوق ایک حیرت انگیز طریقہ سے انہیں یقین دلا دیتا ہے کہ چاٹ سکی دیوانہ ہو گیا ہے —

مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک ایسے شخص کا جو بلند حوصلہ، روشن ضمیر اور بیدار دل ہے بلا وجہ دیوانہ قرار پانا مصنف کی طرف سے ان لوگوں کی ایسی سخت تنقید ہے جس کے مقابلے میں خود چاٹ سکی کے اعتراض ہلکے اور معمولی نظر آتے ہیں - اس کے بعد چاٹ سکی کی عذر خواہی کرنا ضروری نہیں - لیکن چاٹ سکی کے خیالات اور اس کی ہمت کی داد دیتے ہوے ہمیں اس کی اپنی خامیوں سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہیے، اور مصنف کا مقصد بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہم ایسا کریں- چاٹ سکی کا معیار بلند ہے، اس کے خلوص سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس کا درد سچا اور دل سوز ہے، مگر اس کے خیالات کا تعمیری پہلو بہت کم زور ہے، وہ سب کچھ درہم برہم کرنے پر تلا ہوا ہے، کچھ بنا کر کھڑا کرنے کا اہل نہیں - اس نے ارادہ کرلیا ہے کہ نوکری، خوشامد، خود پسندی اور حیوانی سکون سے اپنی زندگی کو پاک رکھوں گا، مگر اس کی زندگی بس ایک صاف مکان ہے جس میں رہتا کوئی نہیں- گریبوئیدوف اپنے ہیرو کی اس کم زوری سے بخوبی واقف ہے، اور جس طرح چاٹ سکی کے اعتراض عبرت انگیز اور دل افروز ہیں، اسی طرح

اس کی خامیاں اور مذمت کی ایک بہت ہی آموزندہ پر درد تصویر بن جاتی ہیں - جس حقیقت کو یہ ڈراما واضح کرتا ہے وہ اصل یہ ہے کہ روسی سوسائٹی کے معترض اور مصلح اتنے ہی پست اور محدود ہیں جتنے کہ وہ لوگ جو ان کی ظرافت اور طنز کا تختۂ مشق ہوتے ہیں اور یہی حقیقت کی وہ تصویر ہے جسے دیکھ کر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی آتا ہے —

"عقل مندی کی سزا" کی تصنیف کے بعد سے ۱۸۳۵ تک، جب گوگول کا ڈراما "انسپکٹر جنرل" شائع ہوا، ڈراما نویسی کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ملتا۔ پشکن کے "بورس گودونوف" میں شاعرانہ خوبیاں بہت ہیں، مگر ڈرامے کی حیثیت سے وہ بہت معمولی ہے - گوگول کے ڈراموں کا اس کی تصانیف کے سلسلے میں پہلے ذکر آچکا ہے۔ اس کی خصوصیت جس کا روسی تھیٹر اور ناٹک کے فن پر بہت گہرا اثر ہوا، یہ تھی کہ اس نے ایکٹروں کا ایک دوسرے سے اور ان سب کا ڈراما نویس سے گہرا تعلق قائم کرنے کی کوشش کی جس سے ڈرامے کا مطلب، اس کی خوبیاں اور باریکیاں پوری طرح سے ظاہر ہو سکیں، ایکٹر بجائے اپنا اپنا کمال دکھانے کے ڈرامے کی خاص فضا پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہوں، اور مختلف کیرکٹروں کی ہم آہنگی ان کا معیار بن جائے - "عقل مندی کی سزا" کو تو بہت عرصے تک محکمۂ احتساب نے اسٹیج پر دکھانے کی اجازت نہیں دی، لیکن گوگول کے ڈرامے اور بیرونی ڈراما نویسوں کے چند منتخب کارنامے ماسکو میں ایک ایسے تھیٹر کا کام چلانے کے لیے کافی تھے، جس نے گوگول کے معیار کو اختیار کیا تھا- ایکٹروں کو اس تیاری کی بہت ضرورت تھی، کیوں کہ گوگول کے بعد جو ڈراما نویس پیدا ہوا اس کے ڈراموں کا حق ادا کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

"بھارتیہ ساھتیہ پرشد کی اصل حقیقت"

از

ایڈیٹر

بہت سے اصحاب اس جملے کے معنی نہیں سمجھیں گے اور اس عنوان کو پڑھ کر انہیں اُلجھن ہوگی۔ اس لئے سب سے اول یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے معنی ہیں "ہندوستان بھر کی ادبیات کی انجمن"۔ اس کا پہلا اجلاس ۲۴ اور ۲۵ اپریل کو ناگپور میں ہوا۔ مہاتما گاندھی اس کے صدر تھے۔ انہیں تاریخوں میں "ہندی ساھتیہ سمیلن" کے اجلاس بھی مختلف اوقات میں وہیں ہوئے۔ اس کے صدر بابو راجندر پرشاد تھے۔ اس سے قبل کہ میں پرشد کے اس اجلاس کے حالات بیان کروں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کی "شان نزول" سے مختصر طور پر بحث کروں یعنی یہ کہ یہ انجمن کن وجوہ سے وجود میں آئی اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ جب تک یہ نہ کہا جائے گا اس کی پوری حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی۔

مسٹر کاکا کالیلکر اس اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنے اڈریس میں بھارتیہ ساھتیہ پرشد کی پیدائش کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، میں اسی کا خلاصہ یہاں لکھتا ہوں کیوں کہ اُن کا بیان زیادہ مستند سمجھا جائے گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۱۹ ع میں مہا راشٹ ساھتیا سمیلن منعقدہ برودہ میں سب سے یہ خیال پیدا ہوا۔ اس کے بعد

کولھاپور کے اجلاس میں مہاراجہ بڑودہ نے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا خاکہ بہت پرزور طریقے پر پیش کیا۔ پھر کراچی میں کانگریس کے موقع پر مسٹر کنھیا لال منشی سے جو میری بات چیت ہوئی تو اس میں بھی ہم نے ایک ایسی سوسائٹی کی ضرورت کو محسوس کیا۔ پچھلے سال جب اندور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا اور ہم ایک جا جمع ہوئے تو ایک مرتبہ پھر اس کے متعلق منظور کی گئی جسے عمل میں لانے کے لئے مسٹر کنھیا لال منشی، ہری ہر شرما اور گردھا شرما کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کے چند مہینے کے بعد مہاراشٹر ساہتیہ سمیلن کا اجلاس بھی اندور میں ہوا۔ اس نے بھی کولھاپور کی تحریک کو عمل میں لانے کے لئے ہندی ساہتیہ سمیلن سے تعاون کا ارادہ ظاہر کیا۔ ہندی ساہتیہ سمیلن نے کاکا کالیلکر [illegible] کو اپنا نمائندہ بنا کر اس کو اندور بھیجا۔ اندور مہاراشٹر ساہتیہ سمیلن نے اپنی مجلس پرشد کو اطلاع دی کہ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے لئے ایک مہاراشٹر کمیٹی قائم کی جائے جو ہندی ساہتیہ سمیلن کو بھارتیہ ساہتیہ سمیلن قائم کرنے میں مدد دے۔ اسی طرح کرناٹک اور گجرات کی ساہتیہ سمیلنوں نے بھی اس تحریک کو سراہا ہے۔

یہ تو ہے اس کی پیدائش اور ابتدا کی حقیقت۔ اب رہا اس کا مقصد سو وہ اُس قرارداد سے ظاہر ہے جو ناگپور کے اجلاس میں منظور کی گئی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں —

"اس پرشد کا اُدیش (مقصد) ہوگا کہ (الف) ہندوستان کے سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے ساہتیوں (ادبوں) اور ساہتکاروں (ادیبوں) میں آپس میں میل کرنا اور اس نام سے بھارتیہ ساہتیوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا۔ (ب) اس سبھا کا کام 'ہندی یعنی ہندستانی' میں ہوگا ...... —

اُس کمیٹی نے جو اس انجمن کے مقاصد کی تکمیل کے لئے مقرر کی گئی تھی،

لا کام یہ کیا کہ ماہانہ "ہنس" کو جو کئی سال سے ملک کے قابل ادیب منشی یم چند صاحب کی اڈیٹری میں جاری تھا، اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور ب اُسے پرشد کا رسالہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور منشی پریم چند صاحب کے ساتھ گجراتی زبان کے ادیب اور مورخ مسٹر کنھیا لال منشی بھی اس کی ڈیٹری میں شریک ہوگئے ہیں —

اس مختصر تمہید کے بعد جو بھارتیہ ساہتیا پرشد کی پیدائش اور مقاصد کے متعلق تھی، میں آپ کو اس کے پہلے اجلاس کی روداد سنانا چاہتا ہوں جو ہم سب کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے

۲۴ اپریل سنہ ۱۹۳۶ع کو تقریباً ۱۰ بجے دن کے اس کا پہلا جلسہ شروع ہوا۔ سب سے اول مسٹر کاکا کالیلکر نے اپنا اڈریس پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد صدر انجمن مہاتما گاندھی کا مطبوعہ اڈریس جو صرف ایک صفحہ کا تھا تقسیم کر دیا گیا اور مہاتما جی نے یہ کہہ کر کہ مطبوعہ اڈریس پڑھ کر سنانا فضول ہے وہ آپ خود پڑھ لیں گے، زبانی تقریر شروع کر دی۔ یہ ایسی آہستہ آواز میں تھی کہ پاس والے بھی اچھی طرح نہ سن سکے۔

پرشد کے اس جلسے کا سب سے بڑا کارنامہ وہ رزلیوشن تھا جسے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ زیادہ تر بحث اسی پر رہی۔ اس کے پہلے جز سے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ البتہ دوسرے جز پر بہت کچھ گفتگو رہی۔ اصل مسودے میں یہ الفاظ تھے کہ اس پرشد (انجمن) کی ساری کارروائی "ہندی ہندستانی" میں ہوگی۔ یہ لفظ پہلی بار یہاں سننے میں آیا۔ غالباً یہ مہاتما گاندھی کے جدت پسند دماغ کا نکتہ تھا۔ میں نے مہاتما جی سے کہا کہ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ریزولیوشن میں یہ طے کیا تھا کہ اس ملک کی زبان ہندستانی ہوگی خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں۔ اس کے بعد آپ نے ہنس کے متعلق جو تحریر شائع کی

اُس میں آپ لکھتے ہیں کہ اس رسالے کے مضامین کی زبان ہندی اتھوا (یا) ہندستانی ہوگی - اس کے کیا معنے - فرمانے لگے کہ کانگریس کا رزولیوشن بھی میں نے ہی "بنایا تھا" - میں نے عرض کیا یہ صحیح ہے لیکن اُس وقت ہندوستانی کے معنے ہم ہرگز ہندی نہیں سمجھتے تھے - کہنے لگے کہ اب میں نے اس کے معنے بتا دیے ہیں جو جلسہ کی تحریر میں آپ نے دیکھے - یہ گاندھی جی کی مخصوص زبردستی ہے - یہ انہوں نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے یعنی "ہندی ہندوستانی" جو بالکل بے معنی ہے - یہی لفظ پرشد کی مجلس استقبالیہ کے صدر کاکا کالیلکر صاحب نے اپنے اڈریس میں استعمال کیا تھا - معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحبوں نے پہلے سے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندستانی کا لفظ تنہا استعمال نہ کیا جائے تاکہ اس کی گنجائش ہی باقی نہ رہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اس کا مفہوم "اردو" لے سکے - جب گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ "ہندی ہندستانی" سے آپ کا کیا مطلب ہے تو فرمایا وہ ہندی جو آگے چل کر ہندستانی ہونے والی ہے - اس پر یہ اعتراض کیا گیا یہ تو کوئی زبان نہ ہوئی، یہ تو آپ کی خواہش یا منشا ہے - اس سوال کے جواب میں کہ ہندی کونسی زبان ہے اور ہندستانی کونسی، مہاتما جی نے فرمایا کہ ہندی ادبی زبان ہے اور عام لوگ کم سمجھتے ہیں اور ہندستانی وہ زبان ہے جو عام لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں لیکن ابھی اس کا ادب نہیں بنا - اپنے مطبوعہ اڈریس میں اُنہوں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہندی کو ہندستانی کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس بھاشا میں اُن فارسی الفاظ کو جو زبان میں رائج ہو گئے ہیں ترک نہ کیا جائے - غرض صبح کا جلسہ اسی پر ختم ہوگیا اور کوئی بات طے نہ ہوئی —

سہ پہر کے جلسے میں پھر یہی بحث چھڑ گئی - جب مہاتما جی سے یہ کہا گیا کہ رزولیوشن میں یا تو آپ ہندی کا لفظ رکھیے یا ہندوستانی کا، ہندی ہندوستانی کے کوئی معنے نہیں - تو فرمایا کہ ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں اور میں ہندی کو نہیں

چھوڑ سکتا، مجھے ہندی سمیلن کے ساتھ ساتھ چلنا ہے - میں نے کہا کہ آپ نیشنل کانگریس کے فیصلے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے جس نے یہ قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی - میں نے دانستہ دوبارہ یہ بات اس لیے کہی تھی کہ صبح کی گفتگو کے وقت پنڈت جواہر لال نہرو موجود نہ تھے، اس وقت وہ میرے قریب تشریف رکھتے تھے اور خیال تھا کہ وہ بحیثیت صدر کانگریس کے ضرور میری تائید کریں گے، لیکن مجھے افسوس اور کسی قدر مایوسی ہوئی کہ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموش بیٹھے رہے - اور ایک نہیں وہاں اکٹھے تین کانگریس کے صدر موجود تھے (دو سابق اور ایک حال) مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا - گاندھی جی نے میرے سوال کے جواب میں وہی کہا جو صبح فرما چکے تھے - اس کے بعد جب یہ گفتگو بڑھی تو گاندھی جی نے 'ہندی ہندوستانی' کو بدل کر "ہندی یعنی ہندوستانی" کے الفاظ رکھ دیے - مسٹر اختر حسین صاحب رائے پوری نے یہ ترمیم پیش کی کہ رزولیوشن میں یا تو لفظ ہندی رکھا جائے یا ہندوستانی - کیونکہ مہاتما جی خود ہندی اور ہندوستانی کے دو الگ الگ مفہوم بتا چکے ہیں، اس بنا پر ہندی اور ہندوستانی ایک زبان نہیں ہو سکتیں اور اس لیے ہندی یعنی ہندوستانی بے معنی ہوگا - ان دونوں میں سے کوئی ایک لفظ رکھنا مناسب ہوگا - میں نے یہاں تک کہا کہ آپ صرف ہندی رکھیے اور میں اس کی تائید کروں گا - اس پر وہ ہنسنے لگے اور کہا یہ نہیں ہو سکتا - آخر مہاتما جی نے ووٹ پر آمادگی ظاہر کی - مسٹر کنہیا لال منشی نے کہا کہ یہ معاملہ ادبی اور لسانی ہے ووٹ سے طے نہیں ہونا چاہیے - مہاتما جی نے کہا کہ ووٹ کے سوا کوئی چارہ نہیں، فیصلے کی یہی ایک تدبیر ہے - ووٹ کا حکم صادر ہوا - لیکن ووٹ لینے سے پہلے بڑی ہوشیاری یہ کی گئی کہ ہندی سمیلن کے ان نمایندوں کو بھی ووٹ کا حق دے دیا گیا جو اس وقت اس جلسے میں حاضر تھے - نتیجہ یہ ہوا کہ

کثرت راے اس ترمیم کے خلاف نکلی - اگر ھندی سمیلن کے نمائندوں کو ووٹ کی اجازت نہ دی جاتی جس کا انہیں حق حاصل نہ تھا تو ترمیم غالباً منظور کرنی پڑتی - مگر مہاتما گاندھی بھارتیہ ساھتیہ پرشد کو ھندی سمیلن کا بچہ سمجھتے ھیں اور ان کے تصور میں یہ دو مجلسیں کبھی الگ نہیں ھونے پاتیں ، حالانکہ بقول منشی پریم چند کے یہ خیال صحیح نہیں ھے - پہلے دن کی کارروائی یہیں ختم ھو گئی —

اصل معاملہ تو پہلے ھی دن طے ھوچکا تھا دوسرے دن ۲۵ اپریل کو ایک معمولی جلسہ ھوا - پہلے دن سہ پہر کو ایک گفتگو یہ بھی چھڑ گئی تھی کہ ھمیں اپنی زبانوں کے ادب کا رخ بدلنا چاھیے - بار بار پرانے فرسودہ خیالی مضامین کو دھرانا موجودہ حالات کے بالکل منافی ھے - ھمیں اپنے ادب کو زندہ اور زندگی کے حالات مطابق بنانا چاھیے - اس بحث میں پنڈت جواھر لال نہرو نے بھی حصہ لیا اور یہ ارادہ ھوا کہ دوسرے روز ایک رزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا جاے - کنھیا لال منشی اور دو ایک اور صاحب اس خیال کی مخالفت کرتے رھے - پرشد کے مہاپرشوں نے اس خوف سے کہ کہیں جدید خیال والے کوئی سخت رزولیوشن پیش نہ کردیں ، رات ھی کو اس مضمون کا ایک ھلکا سا رزولیوشن تیار کیا اور دوسرے روز اجلاس شروع ھوتے ھی پہلے اسے پڑھ کر سنایا جو بلا اختلاف منظور کرلیا گیا - لیکن یہ رزولیوشن بہت کچھ تصریح کا محتاج تھا اس لیے ان صاحبوں نے جو دیسی ادبیات کی اصلاح پر مصر تھے ، ایک الگ بیان شایع کیا - اس کے بعد انتظامی کمیٹی کے ارکان کا انتخاب ھوا - ان میں سے چند تو ھندی ساھتیا سمیلن نے اپنے حق کی بنا پر اپنے نمائندے انتخاب کیے اور کچھ مہاراشٹ ساھتیا سمیلن نے اور چند متفرق اشخاص منتخب ھوے - بھارتیہ ساھتیہ پرشد کے پہلے اجلاس کی کارروائی ختم ھوئی —

اب اس کارروائی پر میں مختصر سا تبصرہ کرنا چاہتا ہوں - آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ہندوستانی کو ہندی میں اور ہندی کے معنے ہندوستانی بنانے میں، پھر " ہندی ہندوستانی " کی جدید لفظ کے اختراع میں اور آخر میں ہندی یعنی ہندوستانی کے الفاظ میں کیسے کیسے پہلو بدلے ہیں - پہلے اردو کا لفظ ترک کر کے ہندوستانی اختیار کیا گیا تھا - یہاں تک کچھ مضائقہ نہ تھا اور اس پر ہم بھی رضامند تھے اور ہمارے بعض مستند ادیبوں اور اہل الرائے اصحاب نے یہ لفظ لکھنا شروع کردیا تھا بلکہ ان کا اصرار تھا کہ اردو کی بجائے اب ہندوستانی لکھا جائے اور اس پر ایک حد تک عمل بھی ہونے لگا تھا - فریقین نے یہ سمجھوتا تسلیم کرلیا تھا - اب ہندوستانی کا لفظ بھی متروکات میں داخل ہوگیا اور صرف ہندی رہ گیا - معترض کے لیے ان کے پاس جواب موجود ہے ، وہی جو گاندھی جی نے فرمایا " ہندی یعنی ہندوستانی " - گاندھی جی نے رسالۂ ہنس کی زبان کو بھی ہندی اتھوا ہندوستانی فرمایا ہے - جب ان سے کہا گیا کہ ہنس کی زبان بہت کٹھن ہے وہ ہندوستانی نہیں ہوسکتی بلکہ اس کی زبان کلکتہ کے مشہور رسالہ وشال بھارت سے بھی زیادہ مشکل ہے تو انہیں حیرت ہوئی - ہنس کے اڈیٹروں نے تو صاف صاف لکھ دیا ہے کہ " اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے خاص و عام کی زبان ہوچکی ہے - مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنے والے اسے زندہ ملکی زبان بنانے کا عہد کر چکے ہیں " - اس کی تائید بابو راجندر پرشاد کے اس خطبۂ صدارت سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے ہندی ساہتیا سمیلن میں پڑھا تھا - اس میں انہوں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ " خوشی کی بات ہے کہ اس کمیٹی کی کوشش سے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی بنیاد ڈالی جا رہی اور اس کا پہلا اجلاس اس ناگپور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہو رہا ہے - اس کے ذریعہ سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ہندی کے پرچار کے متعلق لوگوں میں جو

غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے وہ بھی دور ہو جائے گی اور ہمیں امید ہے کہ اس سے ہندی پرچار میں مدد ملے گی" - کاکا کالیلکر صاحب نے بھی اپنے اڈریس میں صاف طور پر اس کا اعلان کیا ہے - فرماتے ہیں کہ "جن لوگوں نے اس تحریک (بھارتیہ ساہتیا پرشد) کی ابتدا کی ہے انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمارا سارا کاروبار راشٹر بھاشا (قومی زبان) ہندی ہندستانی میں چلے گا - ہماری کوشش ہے کہ تمام ہندستان کی بھاشاؤں کی ابجد ایک ہی ہو اور سب میں ناگری لپی (رسم خط) جاری ہو جائے تاکہ وہ اپنے اپنے صوبے کی زبان کا کام ناگری میں کریں" —

یہ الفاظ ایسے صاف اور صریح ہیں کہ ان کے لیے کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں - بھارتیہ ساہتیا پرشد کا یہ مقصد بے شک قابل تعریف ہے کہ وہ دیسی زبانوں کے ادبیات کی اصلاح و ترقی چاہتی ہے لیکن اس کا دوسرا مقصد بلا شبہ ہندی زبان کا پرچار ہے جس میں وہ اور ہندی سمیلن دونوں متفق ہیں - اور غالباً یہی وجہ ہے کہ پرشد کے اجلاس کی تاریخیں اور مقام بدل کر اسے انہیں ایام اور اسی مقام میں رکھا گیا جن تاریخوں میں اور جہاں ہندی سمیلن کا اجلاس تجویز ہوا تھا - تا کہ ہندی سمیلن کے اثر اور امداد سے مستفید ہو سکے - غرض یہ کہ پرشد ادبیات کے مسئلے سے گزر کر زبان کی اشاعت پر آگئی ہے اور مختلف زبانوں کے ادب اور ادیبوں کے اتحاد عمل سے ہندی کے پرچار کا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے —

اس ضمن میں میں اس امر کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ منشی پریم چند صاحب شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے اور وہ اس تمام گفتگو اور بحث سے بد دل ہی نہیں تھے بلکہ برہم بھی ہوئے - اُن کی دلی تمنا تھی کہ ہندی اردو کے جھگڑے کو مٹا کر کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے جو دونوں فریقوں میں مقبول ہو سکے - لیکن جو کارروائی وہاں ہوئی اس سے وہ بھی ایسے ہی

مایوس ہوئے جیسے ہم میں سے بعض لوگ -

اسی گفتگو میں بنگال، مہاراشٹر اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں کے نمائندوں نے یہ کہا (اور غالباً اُن کا یہ کہنا ایک حد تک درست ہے) کہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کا قائم رکھنا یا داخل کرنا ضروری ہے کیونکہ اُن سنسکرت لفظوں کا سمجھنا ہمارے لیے زیادہ آسان ہے بہ نسبت اُن ہندی اور فارسی لفظوں کے جو آپ کی سہل ہندی میں استعمال ہوتے ہیں - اس لیے کہ ہماری زبانوں میں پہلے ہی سے سنسکرت الفاظ بکثرت موجود ہیں - اِن زبانوں کی بنیاد زیادہ تر سنسکرت پر ہے - اس خیال کی تائید کاکا کالیلکر کے اڈریس سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ " میں اہل دکن کی طرف سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ہم کو آپ کی (یعنی شمالی ہند کی) ہندی سمجھنے میں مشکل پڑتی ہے - پنڈت جواہر لال کی ہندی آپ کے لیے عام فہم ہوگی مگر ہمارے لیے کٹھن ہے ...... وہ ہندی بھی جو دلی لکھنؤ کے بازاروں میں گنوار لوگ سمجھ سکتے ہیں وہ نیچرل ہندی ہے لیکن اُسے بھی ہم بہت ہی کم سمجھتے ہیں ... ... کانگریس میں جو ہندی بولی جاتی ہے اس میں فارسی شبدوں کی اس قدر بھرمار ہوتی کہ دیہات سے آنے والے نمائندوں کے لیے انگریزی اور ہندی دونوں بھاشائیں یکساں مشکل ہو جاتی ہیں " —

اسی دوران میں لغت کی بحث نکلی یعنی ایک ایسی ڈکشنری تیار کی جائے جس میں عام فہم الفاظ کے علاوہ وہ تمام الفاظ جمع کیے جائیں جو ہندی بنگالی گجراتی مرہٹی وغیرہ میں مشترک ہیں اور ان تمام الفاظ کی تعداد دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہ ہو - اس میں دو مشکلیں ہیں ایک تو یہ کہ ہندی اور خاص کر فارسی الفاظ کی صورتیں مختلف زبانوں میں بگڑ بگڑا کر ایسی ہوگئی ہیں کہ ایک لفظ ہونے پر بھی اُن کا پہچاننا مشکل ہوتا ہے - دوسرے لفظ تو ایک ہی ہے لیکن مرہٹی میں اس کے معنے کچھ ہیں اور ہندی یا بنگالی میں کچھ اور -

علاوہ اس کے ایسی ڈکشنری اُن مبتدیوں کے لیے تو کسی قدر کار آمد ہو سکتی ہے جو زبان سیکھنا چاہتے ہوں لیکن ادب کی ضروریات کے لیے بالکل کار آمد نہیں ہوسکتی۔ میں نے سنہ ۱۹۳۳ ع میں آل انڈیا اورئنٹیل کانفرنس میں جس کا اجلاس بڑودہ میں ہوا تھا، یہ تجویز پیش کی تھی اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا تھا کہ تمام ہندی ادب اور زبان کو پڑھ کر اردو فارسی عربی الفاظ اور محاورے چن لیے جائیں اور اسی طرح اردو ادب اور زبان کا مطالعہ کرکے تمام ہندی الفاظ اور محاورے نکال لیے جائیں اور اُن سب کو ایک جگہ جمع کرکے کتاب کی صورت میں شایع کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ ہماری زبان کا مشترکہ سرمایہ کیا ہے۔ اس کے بعد جن الفاظ کے اضافے کی ضرورت ہو یا جو اصطلاحات بنانی مقصود ہوں تو وہ ایک ایسی کمیٹی کے مشورے سے ہو جس میں دونوں زبانوں کے نمائندے ہوں۔ لیکن موجودہ حالات دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تمام کوششیں بے سود ہیں —

میں ایک بات کہنی بھول گیا وہ یہ کہ پہلے دن کے اجلاس میں پروفیسر محمد مجیب (جامعۂ ملیہ دہلی) کا ایک خط انگریزی زبان میں مہاتما جی کے نام وصول ہوا۔ یہ خط نہایت معقول اور مدلل ہے اور بہت ادب اور خلوص سے مہاتما جی سے یہ اپیل کی ہے کہ وہ نیشنل کانگریس کے فیصلے پر قائم رہیں جس نے ملک کی زبان "ہندستانی" قرار دی ہے۔ انھوں نے مہاتما جی کی اندور والی تقریر نیز "ہنس" والی تحریر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن میں ہندی یا ہندستانی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ہندی کے معنے ہندستانی قرار دیے ہیں جو درست نہیں۔ اردو یا ہندستانی سے بالکل قطع نظر کی گئی ہے۔ بھارتیہ ساہتیا پرشد کے قائم ہونے اور ہنس کے جاری ہونے سے ان کو بہت خوشی ہوئی تھی کہ یہ مشترکہ اور عام زبان کے بنانے میں مضبوط بنیاد کا کام دیں گے لیکن ہنس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس میں زیادہ تر سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال کیا گیا ہے اور

اس کی زبان دوسرے ہندی رسالوں کی زبان سے مشکل ہے - مجیب صاحب
ساھتیا پرشد کے ساتھہ "بھارت" کے لفظ کو بھی پسند نہیں کرتے - کیوں کہ اس
لفظ کا مفہوم آریائی ہندستان ہوتا ہے اور اس لیے اس سے نہ صرف مسلمان اور
اُن کی تمام کوششیں جو ہندی زندگی بنانے میں صرف ہوئیں بلکہ صدہا سال کے
تغیرات اور ارتقائی منازل جو ہم نے طے کیے ہیں وہ بھی خارج ہو جاتے ہیں -
اُن کی رائے میں بھارت کی بجائے ہندستانی کا لفظ زیادہ مناسب ہوتا -
مجیب صاحب نے ایک بات اور بھی لکھی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ
عربی اور سنسکرت میں اصطلاحی الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے لیکن ہماری عام
اور مشترکہ زبان کو ان میں سے کسی پر بھی منحصر نہیں کرنا چاھیے - عربی اگر
غیر زبان ہے تو سنسکرت بھی اس ملک میں کبھی عام طور پر نہیں بولی جاتی تھی-
جو لوگ ہندی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندی میں سنسکرت کے
الفاظ اصلی حالت میں نہیں پائے جاتے' تلفظ کی سہولت نے اُن کی صورتوں کو
کچھہ کا کچھہ کر دیا ہے - مثلاً گرام کا گانو ہوگیا' ورش کا برس بن گیا - اب پھر اصل
سنسکرت الفاظ کی طرف رجوع کرنا اور مروجہ الفاظ کو ترک کرنا یا تو اظہار
مشیخت ہے یا جہل یا تعصب پر مبنی ہے - اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرات اُس
زندہ زبان کی اشاعت سے کچھہ سروکار نہیں رکھتے جو عام طور پر بولی جاتی ھے
بلکہ انہیں ہندی زندگی کو آریائی بنانے کی فکر ہے - مجیب صاحب نے اُس خط
کا بھی ذکر کیا ہے جو مسٹر کنہیا لال منشی نے عاقل صاحب (جامعہ ملیہ) کے خط
کے جواب میں تحریر فرمایا تھا - اس میں مسٹر منشی لکھتے ہیں کہ گجراتیوں'
مرھٹوں' بنگالیوں اور کرالیوں نے جن روایات پر اپنی ادبی زبان کو بنایا ھے
اُن میں اردو کا عنصر تقریباً معدوم ہے - مجیب صاحب اسے تسلیم نہیں کرتے وہ
لکھتے ہیں کہ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ گجراتی' مرھٹی اور بنگالی زبانوں

میں فارسی الفاظ کی بہت بڑی تعداد موجود ہے - اور تم میں ہرگز اس امر کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ انہیں آپس میں ایک دوسرے سے نیز مسلمانوں سے قریب آنے کے لیے اپنی زبانوں کو سنسکرت آمیز بنانے کی ضرورت ہے - علاوہ اس کے صرف خالص اردو عنصر سے ہمیں بحث نہیں بلکہ ہماری بحث شمالی ہند کی زندہ زبان اور محاورات سے ہے - اگر یہ زندہ زبان مشترکہ زبان کی بنیاد قرار دی جائے تو مسلمان پوری طرح اس کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہیں لیکن سنسکرت کی طرف رجعت کرنے کے یہ معنے ہیں کہ وہ (مسلمان) اور اُن کی تمام خدمات جو انہوں نے ہندی، بنگالی اور گجراتی کے حق میں کی ہیں، ناقابل لحاظ ہیں - اِن حالات میں ہم سے شرکت کی درخواست کرنا گویا ہماری ہلاکت میں خود ہماری شرکت کی التجا کرنا ہے —

اس کے بعد انہوں نے مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کی اس تقریر کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے الہ آباد میں ہندی میوزیم کے افتتاح کے وقت فرمائی تھی اور جس میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ چینی زبان کے بعد ہندی زبان ایشیا میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے - اس کے معنے یہ ہوئے کہ عام اور مشترکہ زبان کا سوال طے ہو گیا - یعنے وہ زبان ہندی ہوگی - کیوں کہ ہندوستان میں اسی زبان کے بولنے والے سب سے زیادہ تعداد میں ہیں - لہذا ہندستانی کے حامی کسی گنتی میں نہیں - یہ 'فرقہ وارانہ تصفیہ' کی طرح ایک نئے فساد کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے —

خط کے آخر میں پروفیسر مجیب نے چند امور خاص طور پر مہاتما جی کے غور کے لیے پیش کیے ہیں اور اُن سے التجا کی ہے کہ اگر وہ مناسب خیال فرمائیں تو وہ عام اعلان کی بنیاد کا کام دے سکتے ہیں - وہ امور یہ ہیں —

۱ - ہماری مشترکہ زبان ہندستانی کے نام سے موسوم ہوگی نہ کہ ہندی کے نام سے -

۲ - ہندستانی کو کسی فرقے کے مذہبی روایات مطلق کوئی تعلق نہ ہوگا -

۳ - لفظ کا معیار اس کا رواج ہوگا نہ کہ اس کا دیسی یا بدیسی ہونا -

۴ - تمام وہ الفاظ جو اردو کے ہندو اہل قلم نے اور ہندی کے مسلمان مصنفوں نے استعمال کیے ہیں مروجہ الفاظ تسلیم کیے جائیں —

۵ - اصطلاحی الفاظ خاص کر سیاسی اصطلاحات کے انتخاب میں سنسکرت کی اصطلاحات کو ترجیح نہ دی جائے بلکہ اردو، ہندی اور سنسکرت کی مصطلحات کے فطری انتخاب کی بھی گنجائش رکھی جائے —

۶ - دیوناگری اور عربی رسم خط دونوں مسلم خیال کیے جائیں اور ان تمام اداروں میں جن کی پالیسی ہندستانی کے حامیوں کے ہاتھ میں ہو، دونوں خطوں کے سکھانے کی سہولت بہم پہنچائی جائے —

میں نے خط کا خلاصہ بیان کر دیا ہے - پورا خط پنڈت جواہر لال نہرو صاحب نے پڑھ کر سنایا - اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی اور خط داخل دفتر ہوگیا - البتہ پنڈت جواہر لال صاحب نے یہ فرمایا کہ تعجب ہے کہ مجیب صاحب جیسے تعلیم یافتہ شخص کو ٹنڈن صاحب کے بیان پر اعتراض ہے، ان کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔ ان کا کیا مطلب تھا یہ سمجھ میں نہ آیا۔ جس خلوص اور امید اور لجاجت کے ساتھ یہ خط مہاتما جی کی خدمت میں لکھا گیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ مہاتما جی اس بارے میں اپنا کوئی خیال ظاہر فرماتے اور جو بدگمانی اُن کے اور ان کے رفقا کے رویہ سے پیدا ہو گئی ہے اسے رفع کرتے - لیکن افسوس انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے ہندی کے پرچار اور اسے قومی زبان بنانے کا تہیہ کر لیا ہے -

اجلاس کے دوران میں جب کہ زبان کی بحث چھڑی ہوئی تھی مہاتما گاندھی نے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر مجھے بے حد تعجب اور افسوس ہوا - انہوں نے فرمایا کہ اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا - مسلمان چاہیں تو اسے

رکھیں اور پھیلائیں - حیرت ہے کہ جس شخص کی صحبت میں مدتوں مولانا محمد علی مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود جیسے لوگ رہے ہوں وہ اپنی زبان سے ایسی بات نکالے جو سر تا سر غلط، بے بنیاد اور بے اصل ہے - میں ہر چند یہ توجیہ کر کے اپنی تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما جی نے یہ بات نا واقفیت کی بنا پر کہی ہے لیکن دل نہیں مانتا -

مہاتما جی اپنی تقریر میں ہندی اردو یا ہندوستانی کی بحث میں بار بار ہندو اور مسلمان کے لفظ استعمال کرتے تھے - میں نے ایک آدھ بار ٹوکا کہ یہ ہندو مسلم سوال نہیں ہے بلکہ بحث ہندی اردو یا ہندوستانی کی ہے - ہزارہا ہندو ایسے ہیں جن کی زبان اردو ہے وہ اردو کے ادیب ہیں، اسی طرح ہزاروں مسلمان ہیں جو ہندی بولتے اور لکھتے ہیں - اس لیے اس بحث کو فرقہ واری رنگ نہیں دینا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کا دماغ اور خیال انحطاط پذیر ہو رہا ہے۔ اسی ضمن میں میں نے گاندھی جی سے یہ بھی عرض کیا کہ مہاتما جی آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اردو زبان میں ہندی کے الفاظ اور محاورے جس کثرت سے ہیں خود ہندی زبان میں اس قدر نہیں - یہ سن کر گاندھی جی اور دوسرے صاحبوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں نے اس پر خوب غور کیا ہے اور میں ابھی اس دعوے کو ثابت کر سکتا ہوں - گاندھی جی نے فرمایا کہ یہ کیونکر ہوا - میں نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان کی بنیاد عوام کی زبان پر ہے جو اُس وقت بولی جاتی تھی اور اس لیے اس میں وہ تمام ہندی لفظ اور محاورے آ گئے جو عام لوگوں کی زبان پر تھے - ہندی زبان کتابی ہے - عوام کی بولی سے اسے بہت کم سابقہ رہا ہے، اسے جب کسی لفظ کی ضرورت ہوتی ہے تو سنسکرت کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے - اس لحاظ سے اردو ہندی کی نسبت زیادہ ہندی ہے -

ایک دن وہ تھا کہ مہاتما گاندھی نے ہندوستانی یعنی اردو زبان اور

فارسی حروف میں اپنے دست خاص سے حکیم اجمل خاں کو خط لکھا تھا اور آج یہ وقت آگیا ہے کہ اردو تو اردو رہ تنہا ہندوستانی کا لفظ بھی سننا اور لکھنا پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں جو بر سر اجلاس تھی، ایک بار نہیں کئی بار فرمایا کہ اگر ریزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اردو سمجھا جائے گا۔ لیکن اُن کو نیشنل کانگریس کے رزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھتے ہوئے یہ خیال نہ آیا۔

آخر اس قلب ماہیت (Change of heart) کی کیا وجہ ہے؟ کون سے ایسے نئے اسباب رونما ہوئے ہیں جو اس حیرت انگیز انقلاب کا باعث ہوئے؟ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس تمام تغیر و تبدل، توڑ جوڑ اور داؤ پیچ کا باعث ہمارے ملک کا بد نصیب پالیٹکس ہے۔ جب تک مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا کو یہ توقع تھی کہ مسلمانوں سے کوئی سیاسی سمجھوتا ہو جائے گا اُس وقت تک وہ ہندوستانی ہندوستانی پکارتے رہے جو ٹھیک کر سلانے کے لیے اچھی خاصی لوری تھی۔ لیکن جب انہیں اس کی توقع نہ رہی یا انہوں نے ایسے سمجھوتے کی ضرورت نہ سمجھی تو ریا کی چادر اتار پھینکی اور اصلی رنگ میں نظر آنے لگے۔ وہ شوق سے ہندی کا پرچار کریں۔ وہ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم بھی اردو نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کو اگر اپنے وسیع ذرائع اور وسائل پر گھمنڈ ہے تو ہم بھی کچھ ایسے ہیٹے نہیں۔

ایسی صورت میں ہمارے لیے اس کے سوا اب کوئی چارہ باقی نہیں کہ ہم اپنی زبان کے بچانے اور اس کی اشاعت و ترقی کے لیے کمربستہ ہوجائیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس کے متعلق ہم ایک مفصل تجویز عنقریب پیش کرنے والے ہیں۔

شاد عظیم آبادی کا غیر مطبوعہ کلام

از

حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم

غزل

(۱)

بھول نہ اس کو دھن ہے جدھر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے
شکل نمایاں ہوگی سحر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے

آنکھیں ملتے صحن چمن میں جھوم کے اُٹھے نیند کے ماتے
دیکھ صبا نے آکے خبر کی، چونک مصافر رات نہیں ہے

نیلے نیلے رنگ کے اوپر بڑھتی ہی جاتی اب ہے سفیدی
ہوگئی رنگت زرد قمر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے

دور نہ طاقت سنگ نہ ساتھی، پاؤں سے اپنے آپ ہے چلنا
تجھ پہ ہے بھاری راہ سفر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے

پلکیں پکھیرو خواب سے چونکے، سب نے خوشی کے نعرے مارے
آئی صدا مرغان سحر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے

کوچ کی ساعت آگئی سر پر، 'شاد' اُٹھا لے جھولی بستر
....

مستزاد شاد

(۲)

میں ہوں بھی کہ ہونے کا فقط اپنے ہے دھوکا ' کچھ کہہ نہیں سکتا
لو مان لیا اس کو بھی میں ہوں تو میں ہوں کیا کچھ کہہ نہیں سکتا

زندہ ہے جو دنیا میں وہ مرتا ہے مقرر ' دیکھا ہے برابر
اس زندگی و موت سے ہے فائدہ پھر کیا ' کچھ کہہ نہیں سکتا

اچھا ' جو ہے سب ہیچ تو اس ہیچ کے معنی ' یہ بھی تو ہے مبہم
جو سلسلہ ، کیا ہے وہ پھر کیوں نہیں مٹتا ' کچھ کہہ نہیں سکتا

یہ سلسلہ کس وقت سے ہے جانے دو یہ بھی ' کس کو خبر اس کی
مذہب سے بھی اُولجھا ، یہ سلجھا کہ نہ سلجھا ' کچھ کہہ نہیں سکتا

آغاز کا اس کے نہ پتا اور نہ خبر ہے ' گو سب کی نظر ہے
کون اس کا ہے بانی ؟ یہ بنا کب سے ہے برپا ؟ کچھ کہہ نہیں سکتا

بچوں کا ہوا کھیل کہ بوجھو یہ پہیلی ' کیا اصل ہے اس کی
کھانے میں ہے؟ پینے میں ہے؟ کیا اس کا ہے نقشہ؟ کچھ کہہ نہیں سکتا

اظہار میں سچ بات کے تھی کون مضرت ' کیوں دی نہ بصیرت
کیا نفع چھپانے میں ہے کیوں سب سے چھپایا ' کچھ کہہ نہیں سکتا

حیوان و نباتات و جمادات بنا کر ' شان اپنی دکھا کر
بے حد کیے کیوں تنوں کے اقسام مہیا ' کچھ کہہ نہیں سکتا

جب عالم اسباب ہے دنیا تو سبب بھی ہے اس کا مقرر
کس شکل سے طے پہلے سبب کا ہوا جھگڑا ' کچھ کہہ نہیں سکتا

اس اگلے مسبب کا سبب پہلے بتاؤ ' دھوکے میں نہ آؤ
جب دور ہوا اس میں بھی تب کیا کوئی سمجھا ' کچھ کہہ نہیں سکتا

خیر اس میں تو کر لیجئے ہیں یوں اپنی تشفی ' یہ مسئلہ ہے بھی
دشوار بہت ' عقل سے انساں کے ہے بالا ' کچھ کہہ نہیں سکتا

غالب کا سفر کلکتہ

از

(جناب مولانا غلام رسول مہر بی - اے اڈیٹر انقلاب لاہور)

[مولانا مہر نے نہایت تحقیق اور سالہا سال کے مطالعے کے بعد مرزا غالب کی زندگی اور کلام پر ایک ضخیم جامع کتاب مرتب کی ہے - اس میں زیادہ تر یہ کوشش کی گئی ہے کہ مرزا کے واقعات زندگی خود انھیں کے کلام اور تحریروں سے استنباط کیے جائیں - اس طرح قابل مولف نے بہت سے مبہم بیانات کو خوبی سے سلجھا دیا ہے اور بہت سی غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی اصلاح مدلل اور محققانہ طور پر کر دی ہے - یہ کتاب عنقریب طبع ہونے والی ہے اور امید ہے کہ یہ اپنی نوعیت کی بے نظیر تالیف ہوگی - یہ ٹکڑا اُسی کتاب کا ہے اور مصنف کی تحقیق پر شاہد ہے - اڈیٹر] —

اگر بہ دل نہ خلد ہر چہ از نظر گزرد
زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد

سیاحت کے متعلق غالب کی اردو اور فارسی تحریرات میں دو متضاد رائیں ملتی ہیں - فارسی کے ایک مکتوب میں رائے چھجمل کو لکھتے ہیں :—

"جلائے وطن، عزم سفر و آلام غربت مصیبتے است کہ نصیب ہیچ آفریدہ مباد"

اردو کے ایک خط میں سیف الحق میاں داد خاں 'سیاح' کو تحریر فرماتے ہیں:—

"میں تم سے توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنؤ سے بنارس تک سفر کی سرگزشت لکھی ہے اسی طرح آئندہ بھی لکھتے رہوگے - میں سیر و سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں"-

ان دونوں رایوں میں تطبیق مشکل نہیں - صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ پہلی راے حالت سفر میں ظاہر کی گئی' دوسری راے حالت حضر میں مرقوم ہوئی - غالب سیر و سیاحت کو واقعی دوست رکھتے تھے - لیکن نازک مزاجی کے باعث ان شدائد کے متحمل اور ان تکالیف کی برداشت کے اہل نہ تھے جو لازمۂ سفر ہیں - اس لیے جب خود سفر میں تھے اور قدم قدم پر مختلف تکلیفیں پیش آرہی تھیں یا دوران سفر کی بے فکری اور فراغت بالی میسر نہ تھی تو پکار اُٹھے کہ غربت کے آلام خدا کرے کسی کو نصیب نہ ہوں - لیکن جب حالت حضر میں دوسرے شخص کے سفر کے دلچسپ حالات پڑھے تو آرزو پیدا ہوئی کہ ایسے حالات مسلسل و متواتر ملتے جائیں تاکہ لطف اندوزی کے سلسلے میں انقطاع پیدا نہ ہو—

سفر کلکتہ

غالب نے لمبا سفر صرف ایک کیا ہے' یعنی کلکتے کا سفر جس میں وہ کچھ کم تین برس دہلی سے باہر رہے - یہ سفر خاندانی پنشن کے سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کے لیے اختیار کیا گیا تھا - اس کی تاریخ کے متعلق ایک عجیب غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے جو خود غالب کی ایک تحریر سے پیدا ہوئی - وہ فرماتے ہیں کہ میں سنہ ۱۸۳۰ میں کلکتہ گیا تھا* تمام سوانح نگاروں نے بلا تحقیق اس بیان

* اردوے معلیٰ صفحہ ۲۷ (خط بنام منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدرآبادی) -

کو درست تسلیم کرلیا ہے اور نہیں سوچا کہ یہ بیان خود غالب کی بعض دوسری تحریرات سے مطابقت نہیں کھاتا - تاریخ کے متعلق غالب کا سہو چنداں استعجاب نہ تھا - لیکن ان کے وہ مفصل بیانات اس سہو کی بنا پر غلط نہیں مانے جاسکتے جو ان کی فارسی نثروں میں جابجا ملتے ہیں - میرا خیال ہے کہ غالب کے کسی سوانح نگار نے ان کی تصانیف بالاستیعاب نہیں پڑھی تھیں یا ترتیب سوانح کے وقت ان تصانیف سے پوری مدد نہیں لی تھی - خواجہ 'حالی' مرحوم بھی اس زمرے سے کلیۃً مستثنیٰ نہیں ہیں —

ناقابل تسلیم بیان سنہ ۱۸۳۰ والے بیان کی تغلیط کے وجوہ ذیل میں درج ہیں -

(۱) غالب دہلی سے روانہ ہوے تھے تو فخرالدولہ نواب احمد خاں مرحوم والیٔ فیروز پور جھرکہ زندہ تھے - کلکتے کے راستے میں غالب کو نواب صاحب کے انتقال کی اطلاع ملی تھی وہ خود کلکتے سے مرزا علی بخش خاں رنجور کو لکھتے ہیں : —

"میر فضل سولی خاں نام یارے داشتم او را تا گرفت در عرض راہ خبر شد ' در نورد گفتگوہا و پرس وجوہا کہ رفت از جامہ گزاشتن فخرالدولہ (نواب احمد بخش خاں) بہ من خبر داد - باز بہ کلکتہ میرزا افضل بیگ و دیگراں بر گفتند آوخ کہ چراغ روشن ایں دودماں مرد" -

نواب احمد بخش خاں کے متعلق معلوم ہے کہ ان کا انتقال اکتوبر سنہ ۱۸۲۷ ع (مطابق ربیع الاول سنہ ۱۲۴۳ھ) میں ہوا - ان کی تاریخ وفات "مہلو مقام فخرالدولہ" ہے - اس سے ظاہر ہے کہ غالب

۱۲۴۳ھ

اکتوبر سنہ ۱۷۲۷ سے چلد ماہ قبل دہلی سے روانہ ہو چکے تھے —

(۲) 'غالب' کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ میں ٹھہرے تھے - ان کی مختلف تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں معتمد الدولہ آغا میر اودھ کے نائب السلطنت اور وزیر اعظم تھے * یہ معلوم ہے کہ آغا میر غازی الدین حیدر کی وفات تک (جو ۱۹ - اکتوبر ۱۸۲۷ مطابق ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ ھ کو واقع ہوئی) برسر اقتدار رہے - اس کے بعد نصیر الدین حیدر کا عہد شروع ہوا، چلد ماہ کے اندر ہی آغا میر برطرف ہوگئے اور ان کی جگہ اعتماد الدولہ میر فضل علی نائب السلطنت ہوئے - 'غالب' بہر حال آغا میر کے اقتدار کے زمانے میں لکھنؤ سے گزر چکے تھے - اور یہ واقعہ سنہ ۱۸۲۷ سے بعد کا نہیں مانا جاسکتا —

(۳) 'غالب' نے کلکتہ پہنچ کر اپنا مقدمہ کونسل میں پیش کیا تھا تو کونسل کے ایک ممبر ولیم بیلی تھے، جن کے متعلق 'غالب' ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ ولیم بیلی سیاحت کے لیے برما چلے گئے ہیں † - مقدمہ کونسل میں پیش ہونے کے بعد 'غالب' کم و بیش دو برس کلکتے میں رہے - ولیم بیلی سنہ ۱۸۳۰ میں تمام خدمات سے سبکدوش ہو چکے تھے ‡ - ظاہر ہے کہ 'غالب' ولیم بیلی کی سبکدوشی سے کم از کم دو برس پیشتر ضرور کلکتہ پہنچ گئے ہوں گے —

(۴) 'غالب' کا مقدمہ کونسل میں پیش ہوا تھا تو اُس وقت حکومت ہند کے چیف سکریٹری مسٹر ایلڈریوز اسٹرلنگ تھے وہ 'غالب' کے خاص ہمدرد بن گئے تھے § - ان کی مدح میں 'غالب' نے پچھن شعر

---

* کلیات نثر فارسی صفحہ ۶۵ و ۱۵۷ -

† کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۹ -

‡ ڈکشنری آف انڈین بایو گرافی صفحہ ۳۱ -

§ کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۷ -

کا ایک قصیدہ کہا تھا جو کلیات نظم فارسی میں موجود ہے - مسٹر اینڈریو استرلنگ نے ۲۳ مئی سنہ ۱۸۳۰ کو وفات پائی - 'غالب' اُن کے قطعۂ وفات میں فرماتے ہیں :—

" بہ صد نشاط سی و پنج سالہ از دنیا
جریدہ رفت و جوانان چناں روند چنیں
بہ روز بست و سوم (۲۳) از مئی بہ ہنگامے
کہ بود خسرو انجم بہ برج ثور مکیں
ہزار و ہشت صد و سی (سنہ ۱۸۳۰) ز عہد عیسیٰ بود
کہ جست برق جہاں سوز ایں الم ز کمیں

'غالب' مسٹر استرلنگ کی وفات کے وقت کلکتہ سے ہو کر دہلی واپس آچکے تھے * - لہذا ان کے سفر کلکتہ کی تاریخ اس واقعے سے کم و بیش تین برس قبل ماننی چاہیئے —

(۵) خواجہ غلام غوث خاں 'بیخبر' کے نام کے ایک خط سے مستفاد ہوتا ہے کہ 'غالب' سنہ ۱۸۲۹ میں کلکتے سے واپس آئے - فرماتے ہیں —

" حضرت وہ بنگالی زبان کا شعر لو' سنہ ۱۸۲۹ میں ضیافت طبع احباب کے واسطے کلکتہ سے ارمغاں لایا ہوں صحیح یوں ہے :-

تم کہتے تھے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں
قبلہ بندہ رات بھر اس غم سے کچھہ کھائے نہیں

اس سے ظاہر ہے کہ جب وہ سنہ ۱۸۲۹ میں کلکتے سے واپس آئے تھے تو یہ بیان کیوں کر تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ وہ ۱۸۳۰ میں کلکتہ گئے — بہ ہر حال سنہ ۱۸۳۰ع میں کلکتہ جانے والا بیان قابل قبول نہیں- میرا خیال ہے کہ یہ طباعت کی غلطی کا نتیجہ ہے - اگر طباعت کی غلطی نہیں ہے

* کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۳۰ و ۱۳۱ -

تو ماننا چاہیے کہ 'غالب' کو سہو ہوا - اور چونکہ سنہ ۱۸۳۰ والا خط سفر کلکتہ سے کم و بیش چوبیس برس بعد لکھا گیا تھا اس لیے تاریخ کے باب میں سہو مستبعد نہ تھا —

صحیح تاریخ

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'غالب' کب دہلی سے روانہ ہوے- اور جو کچھہ عرض کیا جا چکا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ اکتوبر سنہ ۱۸۲۷ سے چند ماہ قبل دہلی سے روانہ ہو چکے ہوں گے - ایک فارسی مکتوب میں وہ فرماتے ہیں ۲۱ ذی قعدہ کو لکھنؤ سے چل کر ۲۹ ذی قعدہ کو کانپور پہنچا - اس خط میں سال درج نہیں - لیکن اس کا فیصلہ مشکل نہیں - نواب احمد بخش خاں کی وفات ربیع الاول سنہ ۱۲۴۳ھ میں ہوئی- اور اس وقت 'غالب' کلکتہ کے قریب پہنچے ہوے تھے - اس لیے ماننا چاہیے کہ وہ ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۲ھ میں لکھنؤ میں تھے - اس زمانے میں غازی الدین حیدر پادشاہ اودہ تھے - اغلب ہے کہ 'غالب' سنہ ۱۲۴۲ھ کی عید شوال کے بعد دہلی سے روانہ ہوے ہوں —

خواجہ 'حالی' کا بیان

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ 'غالب' کلکتہ جاتے ہوے لکھنؤ پہنچے تھے تو نصیر الدین حیدر فرمانروا اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے * - خواجہ مرحوم کا یہ سہو حد درجہ تعجب انگیز ہے - 'غالب' کی متعدد تحریرات میں صراحتاً مرقوم ہے کہ ان کے لکھنؤ جانے کے زمانے میں معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت تھے- معتمد الدولہ کے بعد اعتماد الدولہ میر فضل علی نائب السلطنت ہوے - ان کے بعد منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کو نیابت کا منصب عطا ہوا - حکیم صاحب کے بعد نومبر سنہ ۱۸۳۲ میں روشن الدولہ نائب السلطنت اور

* یادگار غالب صفحہ ۲۵ -

وزیر اعظم بنائے گئے - اس وقت غالب کو سفر کلکتہ سے واپس آئے ہوئے دو برس گزر چکے تھے - خواجہ مرحوم کو یہ سہو غالباً اس وجہ سے ہوا کہ نصیرالدین حیدر والے قصیدے میں روشن الدولہ کا بھی ذکر ہے' اگر غالب کی تمام تحریرات خواجہ مرحوم کے پیش نظر ہوتیں تو یہ سہو ان سے سرزد نہ ہوتا -

خواجہ مرحوم کا یہ ارشاد بھی درست نہیں کہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتہ جانے کے وقت غالب کی عمر "کچھہ کم چالیس برس" کی تھی - دھلی سے روانگی کے وقت غالب کی عمر سنین قمری کے اعتبار سے چند ماہ اور تیس برس کی ہوگی - اور سنین شمسی کے اعتبار سے چند ماہ کم تیس برس کی ہوگی - اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ خواجہ صاحب نے سفر کلکتہ کے متعلق سنہ ۱۸۳۰ والے بیان کو صحیح قرار دے لیا تھا تو اس حالت میں بھی غالب کی عمر زیادہ سے زیادہ ۳۲ برس کی ماننی چاہیئے تھی - سیر و سوانح کی کتاب میں تیس برس یا تینتیس برس کی مدت کو "کچھہ کم چالیس برس" سے تعبیر کرنا اچھا طریق بیان نہیں ہے -

اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ سفر کلکتہ پنشن کے متعلق قانونی چارہ جوئی کے لیے اختیار کیا گیا - ہم اس مقدمے کے حالات ایک علحدہ باب میں بیان کریں گے یہاں صرف کوائف سفر بیان ہوں گے -

قیام لکھنؤ

دھلی سے لے کر لکھنؤ تک کے منازل سفر کی نسبت کچھہ معلوم نہیں ہوسکا - خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ ابتدا میں لکھنؤ ٹھہرنے کا قصد نہ تھا -

"مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا (غالب) ایک بار لکھنؤ آئیں اس لیے کان پور

پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے " —

بہ ہر حال غالب ماہ ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۲ ھ میں لکھنؤ میں تھے۔ اکابر لکھنؤ نے ان کا پر تپاک خیر مقدم کیا۔ غالب کو امید تھی کہ بادشاہ لکھنؤ سے انہیں اچھی رقم مل جائے گی اسی وجہ سے وہ کافی دن لکھنؤ میں ٹھہرے رہے انہوں نے بادشاہ یا نائب السلطنت کے لیے کوئی قصیدہ نہیں کہا تھا۔ نائب السلطنت کے ساتھ ملنے کی صورت پیدا ہوئی تو جلدی میں انہوں نے صنعت تعطیل میں ایک نثر لکھ لی جو ان کے کلیات نثر فارسی میں موجود ہے* وہ خود فرماتے ہیں :—

" مہربانان گرد آمدند و بزرگان انجمن شدند۔ رفتہ رفتہ ذکر خاکساری ها۔ مرا بہ بزم آغا میر نامی از سادات عالیہ آں دیار کہ در آں روزها بہ آهنگ معتمد الدولگی بلند آوازہ بود وبہ تر خانیء فرمانروائے آں کشور و مدارالمهامیء آں سلطنت اشتهار داشت رسانیدند تا ازاں جانب ایمائے کششے رفت' ازیں سو نیز آشوب هوسے گل کرد۔ چوں ملازمت قرار یافت خواستم دستمایہ عقیدتے سرانجام دادن و رہ آورد عالم عبودیتے عرضہ داشتن' طبع از فکر قصیدہ شنگی کرد و سینہ بریں آرزو تنگی' جنون شوقم پیدائے بہ کنار ناپیدائے نثر انداخت وسواد عبارتے هم در صنعت تعطیل روشن ساخت " —

لیکن معتمد الدولہ سے ملاقات نہ هو سکی۔ غالب خود لکھتے هیں :—

اگرچہ وقت اقتضائے دیدن آں جاہ مند نہ کرد و آں هوس از سینہ بدر رفت اما آں مسودہ سفینہ ماند " —

---

* کلیات نثر فارسی صفحہ ۶۵ —

غالب نے ملاقات نہ ہوسکنے کی وجہ محض یہ لکھی ہے کہ :—

"آنچہ درباب ملازمت قرار یافت خلاف آئین خویشتن داری و ننگ شیوۂ خاکساری بود - تفصیل این اجمال و توضیح این ابہام جز بہ تقریر ادا نتواں کرد "—

خواجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں کہ غالب نے ملاقات کی دو شرطیں پیش کی تھیں جو منظور نہ ہوئیں اول یہ کہ نائب السلطنت غالب کی تعظیم دیں - دوم نذر پیش کرنے سے انھیں معاف رکھا جائے —

معتمدالدولہ آغا میر

غالب راے چھجمل کو معتمدالدولہ کے متعلق لکھتے ہیں :—

"ہر چہ دراں بلاد از کرم پیشگی و فیض رسانی این کدا طبع سلطان صورت یعنی معتمدالدولہ آغا میر شنیدہ می شد بعدا کہ حال برعکس است - در ابتدائے دولت ہر کرا آلت حصول مدعاے خود دید بروے پیچید - لاجرم یک دو کس بہ ہر رنگ متمتع گشتند واکنوں کہ از استحکام اساس دولت خود خاطرش جمع است دربند جمع زر افتادہ است - جملہ خاندان ہاے قدیم لکھنؤ از بیداد این بے رحم بہ سیلاب فنا رسیدہ ونازپروردگان این دیار آوارۂ جہات گیتی گردیدہ - و او خود از تردستی و اسراف خود پشیماں شدہ وازیں شیوہ برگشتہ - بالجملہ بازار بیداد گرم است مہاجنان و ساہوکاران و تاجران پلہاں پلہاں زارنالۂ خود بہ کان پدرمے رسانند و ایمن نہند - ہر کہ بود گریخت و ہر کہ ہست دربند گریختن است - چوں حال این دیار بدیں رنگ است آں خوشترکہ سخن از خود نگویم - بتاریخ

بست و ششم ذی قعدہ روز جمعہ ازاں ستم آباد (لکھنؤ) برآمدم
و بتاریخ بست و نہم در دارالسرور کان پور رسیدم۔ این جا
دو سہ مقام گزیدہ رہگرائے باندہ مے شوم" —

معتمد الدولہ آغا میر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے ذاتی ناکامی پر خفگی کا نتیجہ قرار نہ دیا جائے بلکہ یہ حرفاً حرفاً درست ہے *—

غالب کے اردو دیوان میں "د" کی ردیف میں ایک غزل جس کے آخر میں یہ قطعہ ہے —

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ یہ غزل لکھنؤ میں کہی گئی تھی۔ ممکن ہے اس زمانے کے کسی مشاعرے کی طرح پر کہی گئی ہو اور مشاعرے میں پڑھی بھی گئی ہو —

کان پور باندہ اور الہ آباد غالب ۲۶ ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۲ ھ کو لکھنؤ سے نکلے۔ ۲۹ ذی قعدہ کو کان پور پہنچے وہاں دو تین روز کے قیام کے

---

* آغا میر کا نام سید محمد خطاب "معتمد الدولہ مختار الملک ضیغم جنگ" تھا۔ وہ اصلاً کشمیری تھا۔ غازی الدین حیدر کی شہزادگی میں اس کا خان ساماں تھا۔ مسند نشینی کے سلسلے میں اس نے غازی الدین حیدر کی خاص خدمات انجام دی تھیں۔ ان خدمات کے صلے میں وزارت کا خلعت پایا۔ تین برس کے بعد معزول ہوگیا۔ جب انگریزی مصالح نے شاہان اودھ کو سلطنت دھلی کے حلقۂ اطاعت سے آزاد کرنا چاہا تو آغا میر پھر برسر اقتدار آگیا اور نائب السلطنت بن گیا۔ اس وقت سے لے کر غازی الدین حیدر کی وفات تک مختار کل بنا رہا۔ اس کے اقتدار کے زمانے کے عجیب و غریب واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ نصیر الدین حیدر نے بھی چند ماہ تک اسے بحال رکھا بعد ازاں برطرف کردیا۔ وہ انگریزوں کی پناہ میں کم و بیش دو برس لکھنؤ کے اندر خانہ نشین رہا تو کان پور آگیا اور وہیں وفات پائی۔ تفصیلی حالات تاریخ اودھ میں ملاحظہ فرمائیے —

بعد باندہ چلے گئے —

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ باندہ میں کتنی مدت قیام کیا - لیکن باندہ سے روانگی کے بعد مولوی محمد علی خاں صدرامین باندہ کو جو مکاتیب لکھے ان سے بعد کی منزلوں کا حال معلوم ہوتا ہے مثلاً باندہ سے نکل کر وہ دو روز موڈہ میں رہے ایک رات روستا میں بسر کی - پھر چلہ تارہ پہنچ گئے، فرماتے ہیں :—

روز پنجشنبہ در موڈہ رسیدہ تا یک شنبہ بر آرامش گرائید دو شنبہ کوس رحیل کوفتہ شبے بہ روستا بسر بردہ سہ شنبہ در چلہ تارا رسیدہ بامداداں اگر حیات باقی است پسیج راہ فتح پور کردہ خواہد شد —

موڈہ سے غالب نے سامان برداری کے لیے ایک گاڑی کرایہ پر لی تھی جو بڑی سست رفتار تھی - اس لیے انتظار ہی میں رات روستا میں بسر کرنی پڑی تھی - دوسرے روز غالب چلہ تارا پہنچ گئے لیکن گاڑی وہاں بھی دیر سے پہنچی- موڈہ اور چلہ تارا کی درمیانی مسافت اگرچہ بارہ کوس کی تھی، لیکن گاڑی کی سستی رفتار کے باعث یہ مسافت دو روز میں طے ہوئی - وہ خود فرماتے ہیں :—

دو شنبہ از موڈہ برآمدم گردونکے برائے بار کشیدن یافتم چوں از من ضعیف الخلقت تر افتادہ بود آں آہستہ خرام بلکہ متخرام دوازدہ کروہ را نتوانست برید - واز موڈہ تا چلہ تارا نہ رسیدہ نا چار شبے بدیہے (روستا) اتفاق اقامت افتاد - سہ شنبہ آخر شب رواں شدم من خود دو پہر روز برآمدہ بہ سرائے چلہ تارا رسیدم وآں ہیچ خرام تا ساعتے از شب نہ گزشت بہ من نہ پیوست

باندہ میں غالب سے کہا گیا تھا کہ مولوی محمد علی خاں کے نام خط بھیجنا ہو تو چلہ تارا کے تھانیدار کے حوالے کردینا۔ غالب نے چلہ تارا پہنچ کر خط لکھا۔ تھانیدار صاحب سرائے میں آئے اور اِدھر اُدھر پھرنے لگے تو غالب نے ارسال خط کے باب میں اعانت چاہی' تھانیدار صاحب نے درخواست قبول کرلی۔ لیکن انداز گفتار غالباً بہت غیر مناسب تھا۔ غالب اس انداز سے اتنے مکدر ہوے کہ خط تھانیدار کے حوالے کرنے کے بجاے ایک اجنبی مسافر کو دیا جو باندہ جا رہا تھا۔ وہ لکھتے ہیں :—

" میرزا مغل صاحب در باندہ فرمودہ اند کہ عریضہ مولوی صاحب بہ تھانیدار چلہ تارا حوالہ باید کرد کہ او خواہد رساند۔ اتفاقاً آخر روز بلکہ اول شب برکاروان سرائے چلہ تارا در انتظار گردونک و واماندگان راہ نشستہ بودم کہ ناگاہ تھانہ دار بہ کاروان سرائے رسید۔ و ہر سو خرامیدن آغاز کرد۔ درباب ارسال نامہ اعانت جستم اگرچہ پذیرفت اما پذیرفتن سخت سفیہانہ بود چنانکہ طبع ابا کرد و گوارا نہ شد مکتوب بدوے دادن۔ رہروے مجہول الاحوال چوں نام جناب از من شنود نامہ بہ عجز از من طلب کرد' —

پہلے خط میں غالب نے لکھا تھا کہ وہ چلہ تارا سے فتح پور جائیں گے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ گاڑی کی سستیِ رفتار سے تنگ آکر انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ کشتی میں سوار ہوکر دریا کے راستے الہ آباد پہنچیں وہ لکھتے ہیں :—

آخر از بیداد گردون دوں ستوہ آمدہ خود را بہ دریا انداختم۔

یعنی هم ازیں مقام کشتی به کرایه گرفته و آدم و متاع همه درو ے گنجهده و " بسم الله مجریها و مرسها " خوانده سفینه در رود جمن رانده ام - منظور ایں که اله آباد رسیده توقفے که در بنارس مے خواستم کرد هم دریں بقعه کار بندم - وروزے چند آسائشے کرده مایحتاج به امضا رسانده رهگرا شوم و دیگر جز مرشد آباد و به بنگاله در هیچ جا توقف نگزینم - حال سفر دریا نیز دریں دو سه روز پنهاں نخواهد ماند - کشتی بانان گویند که در عرصهٔ سه روز به اله آباد رسیده خواهد شد ' مے تواں دید - اینک روز چهار شنبه قریب نیم روز در کشتی نشسته دل بخدا نه به نا خدا بسته ام " —

یه معلوم نهیں هوسکا که غالب اله آباد میں کتنے روز ٹهرے اور وهاں سے بنارس پہنچ کر کتنی مدت قیام کیا لیکن انهوں نے جو یه لکها تها که میں بنارس میں نهیں ٹهہروں گا به ظاهر اس پر عمل نهیں کیا - بلکه معلوم هوتا هے که وه کافی مدت تک بنارس میں مقیم رهے - بنارس کی تعریف میں ان کی ایک مثنوی "چراغ دهر" مشهور هے جو ان کے کلیات نظم فارسی کے حصه مثنویات کی تیسری مثنوی هے —

بنارس

بنارس میں قیام کی ایک دلیل یه بهی هے که وه مولوی محمد علی خاں کو ایک خط میں لکهتے هیں :—

" عطوفت نامه در ایام خاک نشینی هاے بنارس چشم بخت را نورے و بخت چشم را عروجے بخشود " -

بنارس سے راے چهجمل کو لکهتے هیں :—

" چه نویسم که از متاع آشنوبها پر تیهد ست افتاده ام اگر از داخلیات

کلکتہ آید ہماں رنج معدہ وامعا است و ہماں برودت جگر و
حرارت قلب و ضعف قوی و اگر از خارجیات سخن راندہ
شود بیش ازیں نیست" :—

مغلوب سطوت غم دل غالب حزیں — کاندر تنش ز ضعف تواں گفت جاں نبود
گویند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است — "مارا ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود"

مناسبت مقام کا اقتضا یہ ہے کہ مثنوی "چراغ دیر" کے بعض اہم حصے پیش کردیے جائیں اس کے آغاز میں دہلی کے بعض دوستوں مثلاً شیخ فضل حق خیرآبادی، نواب حسام الدین حیدر خاں 'نامی' اور نواب امین الدین احمد خاں کی فراموشی کا شکوہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

گرفتم کز جہان آباد رفتم — مر ایشاں را چرا از یاد رفتم
دہلی

مگو داغ فراق بوستاں سوخت — غم بے مہری ایں دوستاں سوخت
جہان آباد گر نبود الم نیست — جہان آباد بادا جاے کم نیست
دہلی

پھر بنارس کی تعریف میں چند شعر لکھے ہیں۔ اس شہر کے متعلق ہندوؤں کے عقیدے کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں :—

تناسخ مشرباں چوں لب کشانید — بہ کیش خویش کاشی را ستانید
کہ ہرکس کاندراں گلشن بہ میرد — دگر پیوند جسمانی نہ گیرد
چمن سرمایۂ امید گردد — بہ مردن زندۂ جاوید گردد

لیکن غالب کی دلچسپی کا حقیقی مرکز و مرجع بنارس کا حسن تھا۔ وہ حسن جس نے شیخ علی حزیں سے کہلوایا تھا کہ :—

از بنارس نہ روم معبد عام است ایں جا — ہر برہمن بچۂ لچھمن و رام است ایں جا

اس حسن کے کیف و جوش کو غالب کی میناے سخن میں ملاحظہ فرمائیے۔

بیا اے غافل از کیفیت ناز　　نگاہے بر پریزادانش انداز
ہمہ جانہائے بے تن کن تماشا　　ندارد آب و خاک ایں جلوہ حاشا
نہاد شاں چو بوئے گل گراں نیست　　ہمہ جانند جسمے در میاں نیست
بکانش را ہیولی شعلۂ طور　　سراپا نور ایزد چشم بد دور
بیانہا نازک و دلہا توانا　　ز نادانی بہ کار خویش دانا
تبسم بسکہ در لبہا طبیعی است　　دہنہا رشک گلہائے ربیعی است
بہ لطف از موج گوہر نرم روتر　　بہ ناز از خون عاشق گرم روتر
ز رنگیں جلوہ ہا غارت گر ہوش　　بہار بستر و نو روز آغوش
بہ سامان دو عالم گلستاں رنگ　　زتار رخ چراغان لب گنگ
قیامت قامتاں مژگاں درازاں　　ز مژگاں برصف دل نیزہ بازاں

پھر فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات ایک "روشن بیان" سے جو زمانے کی گردش کے اسرار سے آگاہ تھا سوال کیا کہ جہاں سے ہر نیکی' وفا اور محبت رخصت ہوچکی ہے' ایمان کا محض نام باقی رہ گیا ہے' باپ بیٹوں کے دشمن ہیں اور بیٹے باپوں کی خونریزی کے در پے ہیں' بھائی بھائی سے سرگرم جنگ ہے' موافقت زمانے سے اٹھہ چکی ہے' گویا قیامت کی تمام علامتیں ہویدا ہوچکی ہیں پھر قیامت کیوں نہیں آتی -

بہ نفخ صور تعویق از پئے چیست　　قیامت را عنانگیر جلوں کیست
سوے کاشی بہ انداز اشارت　　تبسم کرد و گفتا ایں عمارت
کہ حقا نیست صانع را گوارا　　کہ از ہم ریزد ایں رنگیں بنا را

آخر میں اپنے اہل وعیال کی درد انگیز حالت نہایت موثر انداز میں بیان فرماتے ہیں :-

فرو ماندن بہ کاشی نارسائی است　　خدا را ایں چہ کافر ماجرائی است

به کاشی لختے از کاشانه یاد آر / دریں جنت ازاں ویرانه یاد آر
دریغا در وطن وا ماندهٔ چند / به خون دیده زورق رانده‌ٔ چند
هوس را پاے در دامن شکسته / به امید تو چشم از خویش بسته
به شهر از بیکسی صحرا نشیناں / به روے آتش دل جا گزیناں
مگو کاں قوم را در آفریده / ز سیماب به آتش آرمیده
همه در خاک چوں افگندهٔ تو / به حکم بیکسیها بندهٔ تو
ازانانت تغافل خوشنما نیست / به داغ شاں هواے گل روا نیست

تینتیس برس بعد میاں داد خاں سیاح نے بنارس پہنچ کر اس شہر کی تعریف لکھی تو اس کے جواب میں رقم فرماتے ہیں :-

بھائی بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے ' ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے اور "چراغ دیر" اس کا نام رکھا ہے - وہ فارسی دیوان میں موجود ہے اس کو دیکھنا۔

بنارس کے رہنے والے کوئی صاحب اشرف حسین خاں تھے جن کا ذکر غالباً سیاح نے اپنے خط میں کیا تھا - غالب لکھتے ہیں :-

" اشرف حسین خاں صاحب میرے دوست ہیں- فتنہ و فساد (غدر) کے زمانے سے پہلے ان کا خط اور کچھہ ان کا کلام میرے پاس آیا ہے - تم ان کو میرا سلام کہنا "-

بنارس سے روانگی

بنارس سے روانگی ہونے کے دن مدل میں آئی چاند کی نویں یا دسویں تاریخ تھی - سنہ معلوم نہیں ہوسکا غالب لکھتے ہیں :-

"امروز که آدینه به قول جمعے نهم ماه و به اظهار گروهے دهم است در بند بر بستن رخت سفرم ... فردا به روز شنبه از

بنارس می پویم"۔—

معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو کشتی کی سواری میں بہت آرام ملا تھا اس لیے ان کی آرزو تھی کہ کلکتے تک کشتی ہی میں جائیں لیکن کشتی والے کرایہ بہت زیادہ مانگتے تھے - اس لیے مجبوراً غالب خشکی کے راستے گھوڑے پر پٹنہ پہنچے وہ لکھتے ہیں :—

"ناخدایان ناخدا ترس بنارس درباب کشتی مضائقہ کردند چہ بہ ہر کس برخوردم تا کلکتہ کم از صد روپیہ نہ طلبید و تا پٹنہ افزوں از بست روپیہ خواست ناچار ہماں اسپ سوار تا بدان بقعہ صحرا خواہم پیمود" -

لیکن ان کا خیال تھا کہ پٹنہ پہنچ کر پھر کشتی کا بندوبست کریں - فرماتے ہیں :—

"ہنوز ہوائے کشتی از سر بدر نہ رفتہ در پٹنہ نیز جستجو خواہم کرد"

پٹنے تک کی منزلوں وہاں کے قیام' بعد ازاں کلکتہ تک کے مقامات کی نسبت کوئی سراغ نہیں مل سکا - غالب نے یہ حالات مختلف خطوں میں ضرور لکھے ہوں گے - لیکن وہ خط ان کے مجموعۂ مکاتیب فارسی میں شامل نہیں ہوسکے صرف اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ —

"گاہ از شدت برد لیالی افسردہ و رنجور و گاہ از سختیء گردش ایام ستم رسیدہ و نالاں روز سہ شنبہ چارم شعبان (سنہ ۱۲۴۳ھ) پارۂ از روز برآمدہ در کلکتہ رسید" -

"برد لیالی" سے ظاہر ہے کہ بنارس سے کلکتے تک کی مسافت زیادہ تر دسمبر اور جنوری میں طے ہوئی یعنی غالب نے لکھنؤ سے نکل کر جہاں سے وہ میرے اندازے کے مطابق جولائی سنہ ۱۸۲۷ میں روانہ ہوچکے تھے

باندہ، الہ آباد اور بنارس میں زیادہ وقت گزارا - وہ جون سنہ ۱۸۲۷ میں دھلی سے نکلے ہونگے - اور اواخر فروری سنہ ۱۸۲۸ میں کلکتہ پہنچے - گویا اس سفر میں کم و بیش آٹھ ماہ صرف کیے —

کلکتہ

کلکتے میں غالب نے شملہ بازار میں مکان کرایے پر لیا تھا - وہ علی بخش خاں رنجور کو لکھتے ھیں :—

"فرود آمدن جاے من کاشانہ ایست در شملہ بازار کہ آں را
راز ورود همان هنگام ورود بے زحمت جستجو یافتم" —

راے چھجمل کو اپنا پتا اس طور پر لکھتے ھیں :—

"در کلکتہ قریب چیت بازار در شملہ بازار نزدیک تالاب
در حویلی مرزا علی سوداگر بہ اسداللہ برسد" -

مکان بڑا کشادہ اور آرام دہ تھا - اس کا کرایہ صرف دس روپے ماہوار تھا - غالب مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کو لکھتے ھیں کہ اللہ کا شکر ھے کلکتہ ایسے شہر میں اس قسم کا مکان مل گیا کہ :-

"هم او را بہ اندازہ فراغ خاطر فضاے ، وهم اندر وے مانند
دهان دنیا طلباں بیت الخلاے - در گوشۂ صحن پر از آبِ شیریں
چاھے و بہ طرف بام درخور اهل تنعم آرامگاھے - بے آنکہ جستجوے
شود یا گفتگوے رود بے زحمت و بے نسبت بہ کرایہ دہ روپیہ
ماهانہ بهم رسیدہ" -

غالب کو کلکتہ اور بنگال کی آب و هوا بہت پسند آئی تھی وہ فرماتے ھیں :—

برچید یبوست از دماغم یکسر بنگالہ شگرف آب و هواے دارد

علی بخش خاں رنجور کو کلکتے کے متعلق لکھتے ھیں :—

چہ کلکتہ جہانے از ہرگونہ کالا مالا مال جز چارۂ مرگ ہرچہ گوئی پیش نظر و دانش سہل و جز بخت ہرچہ خواہی بہ بازارش ارزاں "—

مولوی سراج الدین کلکتے میں 'غالب' کے ایک نہایت عزیز دوست ہے - دہلی واپس پہنچنے کے بعد مولوی صاحب ممدوح کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ " کلکتے جیسا شہر دنیا میں کہاں ہے - اس شہر میں 'خاک نشین" رہنا دوسری سر زمین کی "تخت نشینی" سے بہتر ہے - اگر میری گردن میں اہل و عیال کا طوق نہ ہوتا تو سب کچھ چھوڑ کر کلکتے میں اقامت گزیں ہو جاتا " —

" تازیستمے درآں مینو کدہ بودمے - از رنج ہوا ہائے ناخوش آسودمے - زہے ہوا ہائے سرد' خوشا آب ہائے گوارا' فرخا بادہ ہائے ناب و خرما ثمرہائے شیریں ' —

'غالب' کو آم ویسے ہی حد سے زیادہ مرغوب تھے' بنگالہ کے آم اور بھی پسند آئے - ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں : —

ہمہ گر میوۂ فردوس بہ خوانت باشد　　'غالب' آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

ایک قطعہ 'غالب' کے کلیات نظم فارسی میں ایک قطعہ جس میں " ساقی بزم آگہی " کی زبان سے سفر کلکتہ کی غرض و غایت دہلی' بنارس' پٹنہ اور کلکتے کی کیفیت بیان کی ہے وہ ہر امر کو بہ طور سوال "ساقی" کے روبرو پیش کرتے ہیں اور "ساقی" جواب دیتا ہے - اس میں فرماتے ہیں : —

گفتمش چیست منشائے سفرم　　گفت جور و جفائے اہل وطن

گفتم اکنوں بگو کہ دہلی چیست　　گفت جان است ایں جہانش تن

گفتمش چیست ایں بنارس گفت　　شاہدے مست محو گل چیدن

گفتمش چون بود عظیم آباد گفت رنگین تر از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد گفت خوشتر نہ باشد از سوھن
حال کلکتہ باز جستم گفت باید اقلیم ھشتمش گفتن
گفتم آدم بہم رسد دروے گفت از ھر دیار و از ھر فن

اس کے بعد انگریزوں کی طرز و روش کو ان لفظوں میں بیان کرتے ھیں:

گفتم این جا چہ شغل سود دھد گفت از ھر کہ ھست ترسیدن
گفتم این جا چہ کار باید کرد گفت قطع نظر ز شعر و سخن
گفتم این ماہ پیکران چہ کس اند گفت خوبان کشور لندن

'غالب' جس مقصد کے لیے کلکتہ گئے تھے وہ پورا نہ ھوا - یاس کے عالم میں "خوبان کشور لندن" کے متعلق مزید فرماتے ھیں: —

گفتم ایشان مگر دلے دارند گفت دارند لیکن از آھن
گفتم از بہر درد آمدہ ام گفت بگریز و سر بہ سنگ مزن

ایک غزل کے مقطع میں کہتے ھیں: —

'غالب' رسیدہ ایم بہ کلکتہ و بہ مے از سینہ داغ دوریء احباب شستہ ایم

اردو میں بھی 'غالب' نے کلکتے کے متعلق ایک قطعہ لکھا ھے: —

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ھم نشیں اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ھائے ھائے
وہ سبزہ زار ھائے مطرا کہ ھے غضب وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ھائے ھائے
صبر آزما وہ ان کی نگاھیں کہ ھے غضب طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ھائے ھائے
وہ میوہ ھائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ وہ بادہ ھائے ناب گوارا کہ ھائے ھائے

ادبی ھنگامے

کلکتے میں 'غالب' کو ایک ادبی ھنگامے سے بھی سابقہ پڑا تھا - جس کی تفصیل یہ ھے کہ 'غالب' کلکتہ پہنچے تھے تو اس زمانے میں ھر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو مدرسۂ کلکتہ میں

مشاعرہ ہوتا تھا - جس میں فارسی اور اردو کے شعرا شریک ہوتے تھے - 'غالب' کے اعزاز میں ایک خاص مشاعرہ منعقد کیا گیا - انہی دنوں میں شاہزادہ کامران والیء ہرات کی طرف سے ایک سفارت کلکتہ آئی ہوئی تھی جس کے رئیس کفایت خاں نامی ایک خوش ذوق اهل علم تھے- وہ بھی مشاعرے میں شریک ہوئے - کلکتے کے شعرا نے اپنی غزلیں پڑھیں تو کفایت خاں ان کے پوچ کلام پر زیر لب تبسم فرماتے رہے - لیکن جب 'غالب' نے اپنی غزل پڑھی تو خان نے دل کھول کر داد دی - اس پر شعرا میں 'غالب' کے خلاف حسد کی آگ بھڑک اُٹھی * اور جیسا کہ فرومایہ اور تنگ حوصلہ شعرا کا دستور ہے وہ 'غالب' کے کلام میں عیب تلاش کرنے لگے - 'غالب' نے اسی مشاعرے میں اپنی مشہور غزل "جہاں برخیزد" "جہاں برخیزد' پڑھی تھی - جس کے چند اشعار یہ ہیں : —

بچہ گیرند عیار ہوس و عشق اگر　　رسم بیداد مباد' ز جہاں برخیزد
زینہار از تعب دوزخ جاوید مترس　　خوش بہاریست کزو بیم خزاں برخیزد
عمرہا چرخ بہ گردد کہ جگر سوختۂ　　چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد
گردہم شرح ستمہاے عزیزاں 'غالب'　　رسم اُمید ہمانا ز جہاں برخیزد

اسی غزل کا ایک شعر یہ تھا : —

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم　　ہم چو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

اس پر اسی مشاعرے میں یا دوسرے مشاعرے میں مختلف اعتراضات کیے گئے - مثلاً یہ کہ "ہمہ عالم" نادرست ہے - موئے ز میاں برخیز " غیر صحیح ہے - کفایت خاں نے "ہمہ عالم" کی سند میں اساتذہ کے متعدد اشعار پیش کر دیے مثلاً : —

* کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۷۰ -

گر من آلودہ دامنم چہ عجب همہ عالم گواہ عصمت اوست
(حافظ)

کلکتے کے شعرا کا مایہ ناز و افتخار اور دستاویز سند و دلیل 'قتیل' کا کلام تھا - خواجہ حالی (رح) فرماتے ھیں کہ غالب نے قتیل کا نام سن کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں فریدآباد کے کھتری بچے کے قول کو نہیں مانتا • اس پر کلکتے والے اور بھی بگڑ گئے - تقلید جب جمود کی انتہا پر پہنچ جاے تو مجددین طریق و راہ کو جن 'دھقانہ و جاھلانہ مخالفتوں سے سابقہ پڑتا ھے وہ سب غالب کے گرد و پیش کھڑی ھوگئیں - اس پر وہ بہت پریشان ھوئے - اور اپنے بعض دوستوں کے مشورے سے انھوں نے ھنگامۂ مخالفت کو فرو کرنے کے لیے فارسی میں ایک مثنوی "باد مخالف" کے نام سے لکھی جو ان کے کلیات میں موجود ھے - وہ کسی ادبی جہاد کے لیے کلکتہ نہیں گئے تھے بلکہ ان کا مقصد محض یہ تھا کہ اپنی خاندانی پنشن بحال کرائیں لہذا مخالفت پر ان کا پریشان ھوجانا طبعی تھا - مثنوی میں انھوں نے سب سے پہلے اپنی آمد کی غرض و غایت بتائی اور اپنی مصیبتوں کا حال بیان کیا ' ضمناً اعتراضات کے جواب دیے ' فارسی زبان میں اپنے مسلک و مشرب کی وضاحت کی اور آخر میں بہ طریق مصالحت قتیل کی مدح میں چند اشعار لکھے —

اعتراضات کی کیفیت بیان کرتے ھوئے فرماتے ھیں —

همہ عالم غلط کہ گفت نخست پارۂ زین غلط کہ گفت نخست
موئے را بر کمر کہ گفت غلط شعر را سر بہ سر کہ گفت غلط

پھر کہتے ھیں کہ جب اعتراضات کا شافی جواب دے دیا گیا اور یہ

• قتیل فرید آباد کے کھتری تھے - بعد میں مسلمان ھوگئے - اور لکھنؤ جاکر بڑا عروج پایا - میرزا قتیل کہلائے ' ۱۲۳۳ ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی -

ثابت ہوگیا کہ میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ بالکل درست تھا تو کیا وجہ ہے کہ آپ حضرات نے میری تائید نہ کی اور مخالفین نے میری شہرت کے دامن پر جو داغ لگائے تھے انہیں دھو نہ ڈالا - آپ کی اس حق نارسی کے باعث میری گفتگو کا انداز گلہ مندانہ ہو گیا لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ اس پر ناراض ہوگئے ہیں تو مجھے بڑی پشیمانی لاحق ہوگئی - کاش میں چپ رہتا —

نہ اُمیدم ز شاعر پیست نہ بیم   بود شائستہ و مرا تسلیم
کاش با اعتراض ساختمے   نالہ در زیر لب گدا ختمے

اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں ادبی بحث سے نہیں گھبراتا صرف یہ خوف مجھے پریشان کر رہا ہے کہ میرے جانے کے بعد لوگ کہیں گے کہ دہلی سے ایک سفیہہ آیا تھا وہ بزرگوں کے ساتھ معرکۂ ستیز گرم کرتا ہوا چلتا بنا' اس طرح میرے وطن کی عزت و آبرو' بلند نامی اور اعلیٰ تربیت کا خون ناحق میری گردن پر ڈالا جائے گا —

نہ ز آویزش بیاں ترسم   من و ایمان من کزاں ترسم
کہ پس از من بہ سالہائے دراز   بہ زباں ماند ایں حکایت باز
کہ سفیہے رسیدہ بود ایں جا   چند روز آرمیدہ بود ایں جا
با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت   زدمئے داد و راہ خویش گرفت
ہم سفیہانہ گفتگوئے داشت   ہم خراباتیانہ خوئے داشت
ننگ دہلی و سرز میںش بود   برگ دنیا نہ ساز دینش بود
آہ زاں دم کہ بعد رفتن من   خون دہلی بود بہ گردن من

کلکتے والے اس بات پر بہت بگڑے تھے کہ غالب نے قتیل کی ستائش کیوں نہ کی - غالب فرماتے ہیں کہ میں "ہما" ہوں پھر قتیل کے خوان

نعمت کی مکھی کیوں بلوں؟ میں نے قتیل کی صحبت سے استفادہ نہیں کیا، اس کی شہرت پر مجھے رشک نہیں، میں اسے برا نہیں کہتا اور جو کچھ کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا، فارسی داں جانتے ہیں کہ قتیل اہل زبان نہ تھا لہذا اس کے کلام کو درجۂ استناد نہیں دیا جاسکتا۔ فارسی اہل ایران کی زبان ہے اور سند وہی مقبول ہوگی جو اہل زبان کے کلام سے مستفاد ہو۔ اگر دوستوں کو مجھ سے شکوہ ہے کہ میں قتیل کی پیروی کیوں نہیں کرتا تو خدا را مجھے بتانا چاہیے کہ میں حزیں، طالب، اسیر، عرفی، نظیری، ظہوری وغیرہ کو چھوڑ کر قتیل کے پیچھے چلنا کیوں کر گوارا کروں —

آنکہ طے کردہ ایں مواقف را   چہ شناسد قتیل و واقف را

آخر میں قتیل کی مدح لکھتے ہیں جو حقیقتاً ہجو ملیح ہے۔ فرماتے ہیں :—

مے شوم خویش را بہ صلح دلیل   مے سرایم نوائے مدح قتیل
گرچہ ایرانیش نخواہم گفت   سعدی ثانیش نخواہم گفت
لیک از من ہزار بار بہ است   از من وہم چو من ہزار بہ است
نظمش آب حیات را ماند   در روانی فرات را ماند
نثر او نقش بال طاؤس است   انتخاب صراح و قاموس است

جامد مقلد اور حقیقت ناشناس رہرو معذرتوں اور مصالحت کوشیوں سے حق بات کو قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوے اور غالب کی عذر خواہی باوجود ادائے مصالحت اپنے اندر کئی تیز نشتر رکھتی تھی لہذا اس سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا تھا —

میرے نزدیک اس ہنگامے کو غالب کی ادبی زندگی میں خاص

اہمیت حاصل ہے - اس واقعے سے غالب کے دل پر جو ناخوشگوار اثر ہوا اس نے آئندہ چل کر "قاطع برہان" کی شکل اختیار کی - "قاطع برہان" کو فارسی دانان ہند کے درجۂ استعداد کے خلاف عام اعلان جہاد سمجھنا چاہیے - غالب کی زندگی کے آخری سات آٹھ سال اسی جہاد میں گزرے --

کلکتے سے واپسی

کلکتے سے واپسی کی تاریخ کا تعین بھی ایک اہم مسئلہ ہے اور عرض کیا جا چکا ہے کہ مسٹر اینڈرو سٹرلنگ نے ۲۳ مئی سنہ ۱۸۳۰ کو وفات پائی - اس وقت غالب دہلی آچکے تھے - اس مقدمے کو مد نظر رکھ کر غالب کے اپنے بیان پر نظر ڈالیے فرماتے ہیں :—

"یک شنبہ دوم جمادی الثانی لختے سعی آوارگی در زاویۂ دہلی پاے بہ دامن کشید" جب یہ مسلم ہے کہ وہ مئی ۱۸۳۰ میں دہلی میں تھے تو ماننا پڑے گا کہ وہ ۲ جمادی الثانی سنہ ۱۲۴۵ ھ کو دہلی پہنچے یعنی اواخر دسمبر سنہ ۱۸۲۹ میں یا اوائل جنوری سنہ ۱۸۳۰ میں -

واپسی میں وہ باندہ ضرور ٹھہرے اس لیے کہ اپنے عزیز دوست مولوی سراج الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں :—

"نامۂ نامی کہ در باندہ بہ من رسیدہ وجوابش ہم ازاں منزل مرقوم گردیدہ سطرے از نہضت لوائے جہاں کشائے گورنری داشت"

اور کسی مقام پر ٹھہرنے کے متعلق کوئی بیان نہیں مل سکا —

چکنی ڈلی والا قطعہ

کلکتے ہی میں غالب نے چکنی ڈلی کی تعریف میں ارتجالاً وہ قطعہ لکھا تھا جو ان کے اردو دیوان میں موجود ہے وہ خود فرماتے ہیں :-

"میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتے میں کہا تھا - تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین میرے ایک دوست تھے - انہوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ و بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھہ کر مجھہ سے کہا کہ اس کی کچھہ تشبیہات نظم کیجیے- میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھہ کر ان کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی ان سے لی —

نظم فانی

از

(حضرت فانی بدایونی)

اِدھر نگاہ ہے محو تصرفات جمال — اُدھر جمال تصور فریب و دیدہ فروش
نہ اعتبار شہود اور نہ غیب سے انکار — نہ عاقبت کی خبر اور نہ زندگی کا ہوش
مگر بہ ایں ہمہ غفلت یہ جانتا ہوں کہ میں — وہ ذرہ ہوں جو ازل سے ہے کائنات بدوش
نہ میری فکر کو لازم ہے اعتراف وجود — نہ میری سعی کو درکار ہست و بود کا ہوش
مرا کلام ہے بیگانۂ اشارہ و حرف — مرے پیام کا حامل سکوت ہے نہ خروش
یقین ہے مری تدبیر غم مری تقدیر — ہر ابتلا ہے مجھے یاد دوست کا آغوش

یہ سب دیا تو خدا وہ زباں وہ دل بھی دے
جو دل گلہ نہ کرے جو زباں رہے خاموش

اُردو کی چند کمیاب کتابیں

از

(الحاج محمد اجمل خاں ایم - اے سابق لکچرر عربی، فارسی و اردو،
الہ آباد یونیورسٹی و حال محقق علوم اسلامیہ، شائقی بکھتان بلکال)-

زبانوں کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ہر قسم کی تصنیفات کتاب خانوں میں محفوظ ہوں اور محقق کو آسانی سے مل سکیں۔ زبان اُردو اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی- جن یونیورسٹیوں میں اُردو کی تعلیم شروع کی گئی ہے وہاں اردو کی کتابیں بھی جمع کی جا رہی ہیں- لیکن عموماً یہ ہوتا ہے کہ دوسرے علوم و فنون کی کتابوں پر اتنا روپیہ صرف ہو جاتا ہے کہ غریب اُردو کو تھوڑی ہی سی رقم پر قناعت کرنی پڑتی ہے - اس رقم کا مصرف بھی یہ ہوتا ہے کہ اُردو کی جدید مطبوعہ کتابوں کو منگوا کر یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے - حالانکہ اُردو زبان کے کتب خانوں کو سب سے پہلے وہ نادر اور قدیم کتابیں مہیا کرنی چاہئیں جو اب عوام کی دلچسپی کا باعث نہیں ہیں —

الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ڈاکٹر ایم - ایچ سید کی ایسی ہستی ہے جنہیں قدیم اردو کتابوں سے دلچسپی ہے - اور علی گڈہ میں صدیقی صاحب بھی قابل مبارک باد ہیں کہ اُنہیں بھی قدرت نے کتابوں کی قیمت کا اندازہ کرنا اُن کی قدامت کے تناسب سے سکھایا ہے-

اور وہ اور ان کی قسم کے دیگر علم دوست اصحاب یہ سمجھتے ہیں کہ جو کتابیں عوام الناس کو اپنے مطلا و مرصع سر ورق کی وجہ سے اپنی طرف مائل کرتی ہیں' اُن کی ہمیں ضرورت نہیں ہے - بلکہ یونیورسٹیوں کے کتاب خانوں کو اُن کتابوں کی ضرورت ہے جو امہات الکتب کے نام سے موسوم کی جا سکتی ہیں- یہی وجہ ہے کہ اکثر کتاب خانے اُن بے مثل اور نایاب کتابوں سے محروم ہیں جو لکھنؤ کی نخاس اور جامع مسجد دلی کی سیڑھیوں پر کبھی کبھی نظر آ جاتی ہیں- اور گدڑی کے ڈھونڈنے والوں کو اکثر لعل سے زیادہ قیمتی معلوم ہوتی ہیں —

بہر حال عرض یہ ہے کہ خدا نے گزشتہ حج میں مجھے اپنے کرم عمیم سے اپنے گھر بلایا تھا- بمبئی پہنچ کر چند قدیم کتابوں کے ذخیروں کو دیکھنے کا موقع ملا- وہاں انگریزی کی ہزارہا پرانی کتابیں سستے داموں میں مل جاتی ہیں- اردو اور فارسی کی بھی مطبوعہ کتابیں خال خال نظر آتی ہیں - لیکن فروخت کرنے والے اُن کی قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے- بعض دفعہ معمولی کتاب کے زیادہ دام مانگتے ہیں - اور کبھی کبھی نہایت عمدہ اور نادر کتاب کو کوڑیوں کے مول فروخت کر ڈالتے ہیں —

مکۂ مکرمہ (زاداللہ شرفاً و تعظیماً) میں جتنی کتابیں نظر آتی ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر نایاب ہوتی ہیں - وجہ یہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں جو مسلمان بغرض حج جاتے تھے اُن کو سفر میں ایسے مصائب کا سامنا ہوتا تھا کہ زندہ واپس آنے کی بہت کم اُمید کرتے تھے - بادبانی جہاز کی صعوبتوں کے علاوہ ترکی سلطنت کے آخری دور میں حجاز میں فاقہ کشی سے مجبور ہو کر بیچارے بدویوں نے لوٹ مار کا پیشہ اختیار کر لیا تھا - ترک بھی عربوں پر زیادہ سختی کرنا پسند نہیں کرتے تھے - یہی وجہ تھی

که اب تک حاجیوں میں یه رسم جاری هے که روانگی کے وقت اعزا و احبا کا اسٹیشن پر هجوم هو جاتا هے - اگرچه "به سفر رفتنت مبارک باد" کے بعد صرف "بسلامت روی" هی کہا جاتا هے - "باز آئی" اس لیے نہیں کہتے که اول تو یه یقین واثق هوتا هے که مسافر ضرور واپس آ جاے گا - دوسرے یه که حرمین میں مرنا باعث نجات سمجھا جاتا هے —

جان حج کے جانے والوں اور مہاجروں کے پاس اکثر ایسی نادر و قیمتی کتابیں هوا کرتی تھیں جو وہ بطور یادگار کے مرتے دم تک اپنے ساتھ رکھنا چاهتے تھے - اُن میں سے اکثر بوجه بڑھاپے کے مکے هی میں دائمی نیند کے مزے لینے کے لیے بار حیات کو اُتار ڈالتے تھے اور زیادہ تعداد ایسے حاجیوں کی بھی هوتی تھی جو کسی وبا (هیضه، پیچش، بخار، لون) میں مبتلا هو کر "شہادت خفی" کا درجه حاصل کرتے تھے - نتیجه بهر حال یہی هوتا تھا که اُن کے همراهی نقد و جنس کے وارث تو بن جاتے تھے، لیکن کتابوں سے نه اُنہیں دلچسپی هوتی تھی نه حکومت وقت یا معلم کو - اس لیے وہ کوڑیوں کے مول کباڑیوں کے هاتھ لگ جاتی تھیں —

عہد حاضر میں سفر کی آسانیوں نے ایسے اصحاب کو بھی حج کی طرف مائل کر دیا هے - جو گناهوں کے بوجھ کو تو ضرور هلکا کرنا چاهتے هیں، لیکن مکة مکرمه یا حجاز میں مرنے کی توقع نہیں رکھتے - دخانی جہازوں کی وجه سے سفر آسان هو گیا هے - جده میں گو حکومت نے هر حاجی سے ایک مقررہ ٹیکس وصول کرنا شروع کر دیا هے - لیکن راسته پر امن هے - موٹروں کی کثرت نے غریب بدویوں کے اونٹوں کو بے کار کر دیا هے اور بھوک کے مارے هوئے هزارها مردوں عورتوں اور بچوں کی تعداد میں

اگرچہ کثیر اضافہ ہوگیا ہے لیکن حاجیوں کے سفر کی صعوبت کسی حد تک کم ہوگئی ہے - اور پٹرول، موٹر اور خارجی مصنوعات کے تاجروں کو بھی "جلالت الملک ابن سعود ملک النجد والحجاز و ملحقاتہا" کی حکومت کی امن دوستی نے کافی تجارت کا موقع فراہم کردیا ہے - حتیٰ کہ سیپ کی بنی ہوئی نہایت خوشنما فرنگی تسبیح اتنی ارزاں ملتی ہے کہ جدہ یا مکہ کی اونٹ کی ہڈی یا ریٹھوں کی لکڑی یا عقیق الیمن کی بنی ہوئی تسبیح کو کوئی پوچھتا بھی نہیں - اس لیے کہ موخر الذکر تسبیحیں ہاتھ سے بنائی جاتی ہیں اور مشین کی بنائی ہوئی تسبیحوں کے مقابلے میں گراں قیمت ہوتی ہیں —

جس طرح ہر جگہ انسانوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں اُسی طرح مکہ بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں - پڑھے لکھے حاجی تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو سب کچھ جانتے ہی ہیں - کباڑیوں کے یہاں بیٹھ کر گرد و غبار میں آلودہ ہونے سے کیا فائدہ، اس کے علاوہ ہندوستان میں علما اور تعلیم یافتہ جماعت کے افراد عوام کے ساتھ منظر عام پر بوریہ نشین ہو کر خرید و فروخت کرنا بھی معیوب سمجھتے ہیں لہذا "عزت نفس" اور "وقار ذاتی" کے ہندوستانی اصول عرب میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتے اور زیادہ سے زیادہ اس بات پر اکتفا کی جاتی ہے کہ "نیم عربی" زبان میں کسی کتاب کے نام لینے کی کوشش کی جاتی ہے - اور جب دوکاندار نفی میں جواب دے دیتا ہے تو حاجی صاحب بصد حسرت و یاس واپس تشریف لے جاتے ہیں - دوسری جماعت اُن جاہل حاجیوں کی جاتی ہے (اور یہ جماعت غالب ہوتی ہے) جو بطور تبرک کے تسبیح، رومال، کھجور، زمزم اور مصری یا ترکی چھاپے کے قرآن شریف خریدنے میں اتنی

منہمک ہوتی ہے کہ اُسے دوسری طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہیں ملتی - غرض کہ جو نایاب و نادر کتابیں ان دوکانوں یا مکانوں میں پڑی ہوتی ہیں - وہ بدستور محفوظ رہتی ہیں - لیکن اللہ کا سب سے بڑا کرم یہ ہے کہ وہاں کی آب و ہوا اتنی خشک ہے کہ کیڑے پیدا ہی نہیں ہوتے - (اگرچہ حج کے زمانے میں مچھروں اور مکھیوں کی کثرت ہوجاتی ہے)؛ اور جو کتابیں ہزار برس پہلے جس حالت میں تھیں اُن کی حالت میں بہت کم تغیر ہوتا ہے - جونپور یا الہ آباد کے کتب خانوں کی طرح یہ حشر نہیں ہوتا کہ دو چار برساتوں کے بعد سوائے دیمک کے انبار کے کچھ نظر نہیں آتا —

میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے حسب عادت پرانی کتابوں کی طرف توجہ کی اور اپنا کافی وقت خصوصیت سے اردو کتابوں کی تلاش میں صرف کیا - اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ فارسی، عربی، ترکی، جاوی کتابیں ہندوستان کے لیے اتنی مفید نہیں جتنی اردو زبان کی وہ کتابیں جو ہندوستان کے سیاسی انقلابات کی وجہ سے ناپید اور ضائع ہوگئیں اور ہو رہی ہیں - دوسری زبانوں کی ضروری اور غیر ضروری کتابوں کی اشاعت کافی ہوچکی ہے اور ایران و مصر کے باشندے خود اپنی زبانوں کی ترقی میں کوشاں ہیں - صرف اردو زبان ہی انتزاع سلطنت مغلیہ کے بعد کس مپرسی کی حالت میں پڑگئی تھی، جس کی طرف اب پھر کسی قدر توجہ شروع ہوگئی ہے - اس خیال سے مکۂ معظمہ میں مجھکو اردو کی قدیم مطبوعہ اور مخطوطہ کتابیں مل گئیں اور میں اپنے ہمراہ لے آیا اور ان کی مکمل فہرست اور سنہ تالیف یا سنہ طباعت وغیرہ درج ذیل کرتا ہوں - ممکن ہے کہ ان کتابوں میں سے بعض ایسی

ہوں جو بالکل نایاب ہوں اور کمیاب تو یقیناً سب کتابیں ہیں - بہر کیف جو تبصرہ ہر کتاب کے متعلق ہوگا وہ مختصر ہوگا - اگر ضرورت ہوئی تو آئندہ جس کتاب کے متعلق عام دلچسپی ہوگی اُسے مفصل طور پر مع نقد و تبصرہ کے شائع کردوں گا —

اردو کی کتابوں کے علاوہ چند کتابیں فارسی و عربی کی بھی مل گئی ہیں - جن میں ایک رباعیات جامی ہے جس کا ترکی ترجمہ بھی ساتھہ ساتھہ درج ہے - ایک ترکی زبان کی لغت فارسی ترجمے کے ساتھہ ہے - ایک نادر نسخہ منظومات زبان پشتو کا ہے جو قلمی ہے - چند پنجابی زبان کی بھی کتابیں ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ ذیل میں دے دیا گیا ہے —

مکۂ مکرمہ کی بعض تنگ و تاریک گلیوں میں ایسے مکانات ہیں جن میں سیکڑوں فارسی و عربی کی کتابیں دھول میں اٹی ہوئی لیکن بالکل محفوظ حالت میں رکھی ہوئی ہیں - کاش کہ مولوی عبدالحق صاحب کی علم دوستی انہیں جلد سفر حج پر تیار کردے تاکہ حسب وعدہ میں بھی اُن کے ہمرکاب دیار حبیب میں دوبارہ حاضر ہوکر تلاش خزانہ ہائے علوم کرسکوں —

اگرچہ چند ابتدائی مذہبی تعلیم کے مدارس مکۂ معظمہ میں ہیں اور اُن میں سے ایک خصوصیت سے حیدرآباد کی فیاضی کا رہین منت ہے ' لیکن سلطنت سعودیہ کو اہل حجاز کی تعلیم کی طرف بہت کم توجہ ہے - جدہ میں بھی ابتدائی جدید تعلیم نہایت معمولی ہوتی ہے - اگر دنیائے اسلام علوم و فنون کی طرف ذرا بھی توجہ کرے تو حجاز میں مرکزی یونیورسٹی کا قائم ہونا مشکل نہیں - اگر دولت سعودیہ ہر ایک

حاجی سے ۵ ریال تعلیمی ٹیکس بھی وصول کرلے تو ایک ہی سال میں ایک عالیشان جامعہ تیار ہو سکتی ہے --

۱ - تعلیم نامہ :- لوگوں کو ہندوستانی سیکھنے و تربیت حاصل کرنے کا مرتب

کیا محمد ابراہیم نے

چھپوایا ملبئی کی نیٹو ایڈیوکیشن سوسائٹی نے یعنی مکوطنوں کی

تعلیم و تربیت کے صاحبان مجلس نے

جلد دوسری

جزیرۂ معمورۂ ممبئی میں - رچرڈ پریرا کے چھاپہ خانہ میں

سنہ ۱۲۵۱ ہجریہ اور سنہ ۱۸۳۵ عیسویہ میں چھپی ہے -

۲ - رسالہ فرائض و چند دیگر اوراق قلمی :- ۲ ربیع الاول سنہ ۱۲۸۳ ھ -

۳ - لولی مجلوں نظیر - در مطبع مصطفائی طبع گردید سنہ ۱۲۹۸ ھ

در کمپ کانپور -

۴ - رد ندوہ :- الحمد اللہ کہ رد ندوۂ محذولہ

میں

حرمین شریفین کے فتوی مسمی بنام تاریخی

فتاوی الحرمین برجف ندوۃ المین

مطبع گلزار حسینی واقع بمبئی سنہ ۱۳۰۳ ھ (صفحات ۲۰۰)

۵ - جغرافیہ :- لوہے کے ٹائپ کا ، غالباً ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے

کا چھپا ہوا - تقطیع چھوٹی - صفحات ۱۷۸ -

۶ - رسائل :- رسالۂ نور احمدی -

رسالۂ شہرۂ آفاق -

رسالہ میخانۂ عشق -

مطبوعہ مطبع انصاری دہلی سنہ ۱۳۰۵ ھ -

۷ - نسخۂ حکمت و نظر مرشد :- مطبوعہ مطبع حمیدی - سنہ لا معلوم

۸ - بشارات ندوۃ العلما :- سنہ ۱۸۹۶ ع مطابق سنہ ۱۳۱۳ ھ

راقم محمد یونس خاں عفی عنہ از دتاولی ضلع علی گڈھ

۹ - ہدیۂ مرغوب :- (نظم)

اس کا پڑھنا اور سننا خوب ہے   دوستو یہ ہدیۂ مرغوب ہے

تصنیف

غلام مصطفیٰ صاحب متخلص مرغوب ساکن اظہر نگر مشہور ترچنا پلی

در مطبع شگوفہ گلزار اودھ مطبوع گردید سنہ ۱۲۹۷ ھ

مشتمل بہ حالات و کمالات معنوی و صوری شاہ عبدالحمید قادر ولی

ناگوری (صفحات ۵۴) -

۱۰ - مجموعہ لٹھہ و نصیحت نامہ :- چند اوراق مطبوعہ

۱۱ - عروس مضمون : (۱۲۹۰) معروف بہ دیوان شوم از نو افکار

آفتاب ذکائی زہرہ چشم عصمت توام

جناب عالیہ شمس النسا بیگم

از گلگونۂ مطبع گلشن محمدی نورانی گردید مصنفۂ سنہ ۱۲۷۳ ھ

۱۲ - تذکرہ آثارالشعرائے ہنود :- جلد دوم ۱۸۸۷ مطبع رضوی دہلی

۱۳ - مجموعۂ غزلیات :- مطبوعہ سنہ ۱۲۴۸ ھ اردو و فارسی ۸۹ + ۳۳ صفحات

۱۴ - باغ و بہار :- تالیف کیا ہوا میر امن دہلی والے کا

ماخذ اس کا نوطرز مرصع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے

فارسی قصۂ چہار درویش سے دارلحکومت لنڈن میں نئے

سر سے چھاپا گیا سنہ ۱۸۶۰ عیسوی مطابق سنہ ۱۲۷۶ ھ

ولیم واٹس کے چھاپہ خانہ میں چوتھی دفعہ چھاپا گیا

۱۵ - سراج الهدایت حقوق نسواں وغیرہ :- مصنفہ فلاطون زماں ڈاکٹر وزیر علی خاں صاحب - سکرٹری مڈیکل کلب لاهور - مطبوعہ گوہر پریس گوجرانوالہ ۱۸۷۰ ع صفحات ۱۰۵ -

۱۶ - نسخهٔ یوسف زلیخا هندی مسمی به عشق نامه -
مثنوی میر حسن دهلوی الموسوم به بدر منیر بولطیر سنه ۱۱۹۷ ه -
نسخهٔ مذهب عشق یعنی گل بکاؤلی هندی -
در مطبع حیدری واقع بندر بمبئی طبع یافته (صفحات ۲۳۵)

۱۷ - چهار رساله :
۱ - دارالشفا - ۲ - خیر ملکیه - ۳ - مجربات حکما - ۴ - رسائل نتھو شاہ مصنفہ در سنہ ۱۲۶۰ ھ (زبان پنجابی) نظم - ۲۰۸ صفحات -

۱۸ - طب مغربی - مشتمل به خواص ادویهٔ یورپ از فرنگی (قلمی) -

۱۹ - رسالۂ خلاصۃ الرسائل - نام تاریخی - (۱۲۸۴)
تالیف و تصنیف کی هوئی جناب مولوی عبدالقادر صاحب سوداگری (بنگالی) کی - مطبع بشیری میں ۱۲۸۷ ھ میں چھپی —

۲۰ - ریاض العارفین :- کتاب مستطاب دستورالسالکین زبدۂ حالات مقربین حضرت رب العلمین - جو تالیف ھے برگزیدۂ انفس آفاق مولوی محمد اسحق کی - مطبوعہ مطبع مظهرالعجائب سنہ ۱۲۷۹ ھ (نظم)

۲۱ - معراج نامہ قلمی :- (۳۰۰ صفحات) (سائز ۷ × ۱۰) مکمل -
نسخهٔ زبدۃالاخبار قصهٔ معراج نامه حضرت رسالت پناه سید المرسلین امام الانبیا محمد مصطفی صلی الله علیه وسلم - بتاریخ شانزدهم شهر رجب المرجب سنه ۱۲۵۹ ف و مطابق آں سنه ۱۲۴۸ هجری النبوی از دستخط حقیر پر تقصیر هیچمداں فیض الله خاں ولد سعد الله خاں

ساکن قصبہ ...... بخاطر کریم بخش ساکن موضع چلکانہ بروز جمعہ صورت اختتام داشت -

قاریاں برمن مکن چندیں عتاب	گر خطاے رفتہ باشد در کتاب

ہر کہ خواند دعا طمع دارم

زانکہ من بندۂ گنہ گارم

نوشتہ بماند سیہ بر سفید	نویسندہ را نیست فردا امید

۲۲ - ابجد نامہ براے تعلیم بچگان فارسی -

۲۳ - پند نامۂ سعدی :- معہ ترجمہ اردو - نظم (سنہ ۱۸۰۰ ع) -

۲۴ - سوال و جواب فارسی معہ ترجمہ اردو (و حکایات فارسی) -

۲۵ - یوسف زلیخا اردو :- (نظم)

بعد حمد نعت کے یہ بے جوہر کند زبان قادر علی عظیم آبادی کہتا ھے کہ قصۂ معروف یوسف و زلیخا کو ایک شخص متخلص 'نگار' نے فارسی زبان سے ریختہ بیان میں موافق بول چال اردو کے ترجمہ کیا تھا - اس وقت میں اکثر مشتاقوں خصوصاً نو آموزوں کو محاورۂ اردو کی خواہش اس پر ہوئی کہ یہ کتاب اگر چھاپی جاوے تو ہر ایک شخص فائدہ پاوے اس لیے مولوی محمد فیض اللہ صاحب نے اس بے زبان کو اشارا کیا کہ اس کی تصحیح اس ہیچمدان سے بخوبی ہو سکتی ھے - ہر چند عذر نا آشنائی کا درمیان لایا - بسبب حسن ظن منظور نہ فرمایا - ناچار کئی نسخے بہم پہنچا کر تا مقدور تصحیح اس کی کر کے شراکت میں مولوی معز اللہ کے آخر سنہ ۱۲۴۷ھ رمضان شریف میں مطبع محمدی میں چھپوایا گیا -

۲۶ - ریاض السواں :- مولفۂ صبغۃ اللہ بن محمد غوث مدراسی (نثر

زبان دکنی) - مطبوعہ - سائز ۱۲ × ۸ —

۲۷ - کتاب نقلیات هندی :- سنہ ۱۸۲۰ ع مطبع معدن فیض اکبر آباد -
۱۲۳۰ ھ

۲۸ - سیر عشرت - جامع الحکایات :- (مولفہ ——) مطبوعہ مطبع محمدی
۱۸۲۵ ع
سنہ ۱۲۸۲ ھ صفحات ۱۵۷ - (سائز ۸ × ۱۰) —

۲۹ - نسخۂ قلمی فقہ اکبر و وصیت نامہ (اردو ترجمہ) —

۳۰ - فسانۂ رنگین (نظم) مصنفۂ سید امجد علی خاں صاحب - ساکن کوزہ جہان آباد شاگرد شیخ احمد علی متخلص بہ کامل لکھنوی - سنہ ۱۲۶۰ ھ مطبوعہ لا معلوم - در زمان حضرت محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی —

۳۱ - کلیات نظیر اکبر آبادی :- در مطبع الہی واقع آگرہ مطبوع گردید (صفحات ۳۰۰) —

(نوٹ) اس کلیات میں کئی ایسی نظمیں ھیں جو مجلد اول مطبوعہ کلیات میں نہیں ھیں —

۳۲ - ناٹک مسمی پسندیدۂ جہاں معروف بہ عشق هرمز و مہر تاباں:-
سنہ ۱۸۹۳ع (نظم) مطبع لامع النور فتحپور، صفحات ۹۶ —

۳۳ - اردو فہرست جغرافیہ (طبع لا معلوم) صفحات ۹۱ —

۳۴ - رسالہ قواعد اردو :- سنہ ۱۸۸۲ ع مطبع خاص لکھنؤ صفحات ۲۴ × ۲۲

۳۵ - جغرافیہ طبعی :- چلدر پر بہا پریس سنہ ۱۸۹۱ ع صفحات ۳۲ -

۳۶ - دستور المعاش - صفحات ۱۰۰ - پریس لا معلوم

۳۷ - صفائی و تندرستی :- سنہ ۱۸۸۹ ع نولکشور پریس لکھنؤ صفحات ۴۰ —

۳۸ - کتاب منتخب اشعار احمدی :- سنہ ۱۲۷۰ھ صفحات ۳۵۶ + ۲۵ (بمبئی)

(نوٹ) یہ غزلوں کا مجموعہ ہے اور بہت سے قدیم شاعروں

کا کلام ہے - بعض غزلیں غالب سے ملسوب ہیں مگر زبان غالب کی نہیں اسی طرح بعض غزلیں دوسرے شعرا کے ناموں سے درج ہیں لیکن وہ غالب کی ہیں - بہر حال تحقیق کرنے پر مزید دلچسپ حالات معلوم ہو سکتے ہیں —

۳۹ - مراۃ گیتی نما ۔ مصنفۂ حکیم احسن اللہ خاں دہلوی ۔ (تاریخ) مؤلفہ پیشوائے اہل تسلیم و رضا ، عمدۃ الحکما ، حاذق الزماں حکیم محمد احسن اللہ خاں - در مطبع ہندو لیتھو گریفک پریس دہلی - باہتمام پیارے لال سنہ ۱۸۵۹ع مطابق ۱۲۷۵ھ طبع شد - صفحات ۵۲ - بڑی تقطیع ۱۲ × ۹ - (تاریخ شاہان ہند و انگلستان) —

۴۰ - بلنجارہ نامہ قلمی و چند مسائل قلمی : - ۴۰ صفحات -

۴۱ - قصص و مسائل مذہبی (نظم) قلمی : - ۱۲۰۴ھ صفحات تقریباً ۵۰۰ (مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا) -

۴۲ - پنجابی نظم : - مطبع نور مطلع لاہور صفحات ۳۰۸ -

۴۳ - خلاصۂ آخرت : - مطبع اسدالاخبار - اکبر آباد سنہ ۱۲۶۴ھ صفحات ۴ + ۹۸ -

۴۴ - مقالات سبحانیہ (تصوف) : - سنہ ۱۲۹۷ھ مطبع نظامی کانپور -

۴۵ - مسائل مذہبی (قلمی قدیم) : - صفحات ۳۲ -

۴۶ - رسالہ تحفۂ حنفیہ سنہ ۱۳۲۱ھ صفحات ۴۰ - مطبع حنفیہ پٹنہ -

۴۷ - کتاب المحبت والشوق : - مولفہ و مصنفہ سید مہدی علی صاحب تحصیلدار مرزا پور چھاپہ خانہ سنہ ۱۲۸۶ھ مطابق سنہ ۱۸۷۰ع صفحات ۱۱۸ ۔ (لوہے کا ٹائپ ہے اور عربی سے سلیس اردو ترجمہ ہے) -

۴۸ - تاریخ عجیب مشہور بہ تاریخ الحکما (نثر) : - مولفۂ منشی حسیب الدین

صاحب متخلص بہ 'سوزان' - مطبع مرتضوی دہلی - صفحات ۱۲۰ - ۳۰ -

۴۹ - احیاء القلوب فی مولود المحبوب :- سنہ ۱۳۰۴ھ - مصنفہ محمد اصغر حسین - مطبع احمدی (مقام نا معلوم) -

۵۰ - معلم الحساب معروف بہ مکتب نامہ - مرتبۂ و مصنفۂ مقبول الدولہ احسان الملک مرزا مہدی علی خان بہادر ثابت جنگ صفحات ۸۹ -

۵۱ - فرہنگ گلستان :- صفحات ۲۰ (مندرجۂ ذیل کتاب کے ساتھ ہے) -

۵۲ - کتاب زاد الآخرت :- مصنفہ حضرت امام غزالی - ترجمہ مولوی محمد حنیف صاحب - لشکر بنگلور کے مطبع محمدیہ میں جو متعلق مطابع اسلامیہ کے ہے چھاپی گئی (صفحات ۱۷۹) -

۵۳ - سیر انگلستان :- مطبوعہ سنہ ۱۸۲۱ء - ٹائپ - صفحات ۱۱۴ کسی مشنری جماعت نے شائع کیا ہے - پریس کا نام نہیں ہے -

۵۴ - کتاب آداب الصالحین - تالیف مولانا شیخ عبدالحق دہلوی - جب ہندی میں ترجمہ ہوئی بعضے قدر شناس صاحبوں نے کمر ہمت باندھ کر بیچ معمورۂ مدراس کے فائدے کی خاطر چھپوایا تھا - اس کو حسب الحکم مؤلف محمد مہدی صاحب 'واصف' نے عرصی سید زین العابدین نے بار ثانی مطبع عزیزیہ میں چھپوایا - سنہ ۱۲۹۹ھ (صفحات ۱۷۸) -

۵۵ - حرمت تمباکو نوشی :- سنہ ۱۹۰۸ع (طبع پنجاب) -

۵۶ - کلمات صوفیہ :- ترجمہ کردہ مولانا غلام قادر صاحب سنہ ۱۲۸۸ھ - مطبع مظہر العجائب مدراس - صفحات ۳۲ -

۵۷ - رسالہ آداب الصالحین :- مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی مطبع سلطانی - سنہ ۱۲۶۷ھ - صفحات ۳۹۲ -

۵۸ - رسالہ تحفۃ الزوجین :- مولفہ مولوی قطب الدین خاں صاحب' شاگرد مولانا شیخ محمد اسحق صاحب - مشتمل اوپر رسوم شادی غمی وغیرہ صفحات ۱۰۸ - (مطبع سلطانی) -

۵۹ - احکام العیدین :- صفحات ۳۲ (مطبع سلطانی) -

۶۰ - رسالہ چار کرسی . - در زبان دکنی (نظم) سنہ ۱۱۹۰ ھ -

۶۱ - عروس المجالس : تصنیف کی ہوئی افصح فصحا و ابلغ بلغاء العالم جناب مرحوم قاضی علام قاسم صاحب مہری نور اللہ مرقدہ - مطبع محمدی میں حلیۂ طبع سے مزین کیا - سنہ ۱۲۷۴ ھ میں اور بارہ سو نو هجری میں تصنیف کیا تھا —

۶۲ - کتاب میزان حق :- مذہب نصرانیت کی تعریف اور رد اسلام میں - تیسری دفعہ چھاپی گئی - صفحات ۲۳۹ - ٹائپ (سائز ۹ × ۲) (مطبع کا نام نہیں ہے —

۶۳ - خلاصہ صولت الضیغم علی اعداء بن مریم :- رد نصرانیت از تصنیفات مولوی عباس علی بن ناصر علی بن فضل اللہ فاروقی چاجموی - در سنہ ۱۲۵۸ ھ مطبع سنگین حلیہ طبع پوشید ۰ (سائز ۱۰ × ۷) صفحات ۱۰۶ - کاغذ قدیم - خط نستعلیق -

۶۴ - حدیقۂ شہدا : ۳ حالات جہاد مسلمانان در سنہ ۱۲۷۲ ھ از لکھنو تا فیض آباد - متعلق مولوی امیر الدین علی شہید - (نوٹ) فیض آباد میں ایک مسجد کے کھود ڈالنے کے متعلق هندوؤں سے جھگڑا ہو گیا تھا اس کا مفصل حال ہے - اور سنہ ۵۷ سے پہلے کے هندو مسلم تعلقات کافی روشنی پڑتی ہے - مصنفۂ در سنہ ۱۲۷۲ ھ (قلمی) صفحات ۱۰۲ (سائز ۷ × ۹) —

۹۵ - رسالہ جہادیہ :- از مولوی کرامت علی جونپوری - قلمی - چھوٹا سائز (۴ × ۶) صفحات ۲۵ - فارسی و اردو (نظم) —

۹۶ - عربی دعائیں معہ ترجمہ اردو :- چھوٹا سائز - ۱۵ صفحات - ترجمہ پرانی اردو میں ہے اور لفظی ہے —

۹۷ - مثنویات میر :- اس کے دو اڈیشن ہیں - ایک دہلی کا اور دوسرا بہار کا چھپا ہوا - زبان نہایت پاکیزہ ہے اور بہت پرانا' کمپنی کے زمانے کا چھاپہ ہے - یہ میر صاحب نہ تو میر تقی ہیں نہ میر درد نہ میر حسن بلکہ کوئی اور میر ہیں جو شاید صوبۂ بہار کے رہنے والے تھے - چند واقعات بھی مثنوی کی صورت میں نظم کیے ہیں - تاریخ طباعت نہیں ملی —

فضل شاہ کا ایک شاہ کار

از

(جناب میاں سلطان احمد وجودی صاحب- ایم- آر- اے- ایس)

[وجودی صاحب کی تحریر سے معلوم ہوا کہ اس مضمون کا ایک
آدھ ٹکڑا کسی دوسرے رسالے میں چھپ چکا ہے- لیکن مکمل صورت
میں پہلی بار اردو میں شایع کیا جاتا ہے- اڈیٹر]

ہمارے قدیم پنجابی شعرا میں فضل شاہ ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے- اور فضل شاہ کی سوہنی مہینوال ہوتے ہوے پنجابی زبان کو بے مایہ کہنا نا انصافی ہوگی- فضل شاہ نے سوہنی مہینوال میں وہ وہ گل افشانی کی ہے کہ داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا —

لکھا ہے کہ بخارا میں مرزا عالی نام ایک بہت مشہور سوداگر تھا- اس کے ہاں بہت منتوں کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اس نے عزت بیگ مرزا رکھا- یہ لڑکا بہت ہی خوبصورت تھا اس کے والد مرزا عالی نے اس کو بہت ہی چاؤ چوچلوں سے پالا اور اس کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا —

عزت بیگ مرزا جب جوان ہوا تو باپ کی اجازت سے تجارت کے لیے ہندوستان آیا- اور شاہجہاں کے دربار میں بھی حاضر ہوا- واپسی پر لاہور ہوتا ہوا گجرات (پنجاب) کے راستے سے وطن جانا چاہتا تھا کہ گجرات کو اچھا شہر دیکھہ کر چند دن وہاں ٹھہرنے کا ارادہ کیا —

عزت بیگ مرزا نے سنا کہ اس شہر میں ایک کمہار تلا نام بہت اچھے برتن بناتا ہے جو بہت دور دور تک مشہور ہیں۔ اس نے اپنے ملازم کو برتن لینے کے لیے بھیجا —

اس کمہار کی لڑکی، سوہنی نام نوجوان اور نہایت خوبصورت تھی۔ جب عزت بیگ مرزا کا نوکر برتن خریدنے گیا تو وہ اس لڑکی کی خوبصورتی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور واپس آکر اس نے اپنے مالک سے اس لڑکی کے حسن و جمال کی بہت تعریف کی —

عزت بیگ مرزا سوہنی کو دیکھنے کے لیے تلا کمہار کے ہاں برتن خریدنے خود گیا اور جاتے ہی اس کو دل دے بیٹھا۔ وہ ہر روز برتن خریدنے کے بہانے سے اس کے ہاں جاتا اور اس طرح وہ اپنا سب مال و دولت کھو بیٹھا اور آخر تلا کمہار کے ہاں نوکر ہو گیا۔ اور عرصے تک سوہنی کے والد کی بھینسیں چراتا رہا —

عزت بیگ مرزا بھینسیں چرانے کی وجہ سے ہی مہینوال مشہور ہو گیا۔

تلا کمہار کے پاس نوکر ہوتے ہی مہینوال نے سوہنی سے اپنا درد دل کہہ سنایا تھا اور دونوں کے تعلقات محبت آپس میں بہت بڑھ گئے تھے۔ آخر جب سوہنی کے والد کو دونوں کے تعلقات محبت کا علم ہوا تو اس نے مہینوال کو گھر سے نکال دیا اور سوہنی کی کسی دوسرے شخص سے شادی کر دی —

گو سوہنی سسرال ہی میں رہی مگر اُن کے درمیان میاں بیوی کے تعلقات پیدا نہ ہوسکے اور وہ رات دن مہینوال ہی کو یاد کرتی رہی۔ آخر ایک دن مہینوال کو اس نے پیغام بھیجا کہ جس طرح بھی ہوسکے وہ اس سے ملے۔ وہ فقیروں کا بھیس بدل کر اس کی سسرال میں

آیا اور سوھنی کے گھر کے پاس دریائے چناب کے اس پار ڈیرا ڈال دیا - رات کے وقت اپنی محبوبہ کو ملنے کے لیے دریا عبور کر کے آتا اور مچھلی کا گوشت اپنی محبوبہ کے لیے لاتا تھا —

ایک دن دریا میں طوفان کی وجہ سے اسے مچھلی نہ مل سکی خالی ہاتھ جانا مناسب نہ سمجھا' اپنی ران چیر کر گوشت نکالا اور اس کو بھون کر محبوبہ کے لیے لے گیا —

جب سوھنی کو اصلیت معلوم ہوئی اس نے مہینوال کو آئندہ آنے سے منع کر دیا - اور خود ہر روز دریا عبور کر کے اس کے پاس جاتی —

اس کی نند کو جب یہ پتا چلا تو اس نے ایک دن سوھنی کا وہ گھڑا جس پر وہ تیر کر جایا کرتی تھی بدل کر اس کی جگہ کچا رکھ دیا —

اس رات دریا بہت چڑھاؤ پر تھا مگر وہ ہمت نہ ہاری - اس کو یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ گھڑا کچا ہے' پھر بھی وہ نہ رکی آخر گھڑا بہہ گیا اور دریا میں طوفان اس زور کا تھا کہ وہ تیر کے بھی نہ جا سکی —

اس وقت کی کیفیت کا جو نقشہ شاعر نے کھینچا ہے اس کا ترجمہ ہم سلیس اردو نثر میں پیش کرتے ہیں —

سلطان احمد وجودی

سوھنی دریائے چناب میں غوطہ لگاتی ہے اور مہینوال کے فراق اور ملاقات کے شوق میں آہ و فغاں کرتی ہے —

(۱)

اس رات دریائے چناب اس قدر چڑھاؤ پر تھا کہ معلوم ہوتا تھا پانی کے نیچے زمین کہیں ہے ہی نہیں - سوھنی کا کچا گھڑا سارے کا سارا

مٹی بن کر پانی میں مل گیا - سوھنی کے سر کے بال بھی بھیگ گئے اور اس کا بہت ھی برا حال ھوا —

(۲)

موجیں چاروں طرف سے غضب ڈھا رھی تھیں لہر کے ساتھ قضا بھی پائمال ھوگئی - اب اے میرے پیارے! تم ذرا آکر میرا حال تو دیکھو کہ مجھ بد قسمت بد نصیب اور بے کس پر کیا بن رھی ھے ؟ --

(۳)

خدا کرے یہ دشمنوں کے بھی نصیب نہ ھو جو کچھ اے مہینوال! مجھ پر بیتی ھے - لاکھوں موجوں کی فوج میرے پیچھے ھے میں ذرا بھی حواس کو درست نہیں کر سکی —

(۴)

میری امید کا جہاز ڈوب گیا - میری زندگی اب خواب و خیال ھوگئی - مجھ بد نصیب نے سر کی بازی لگا کر کھیل کھیلا مگر آخر میری چال میں تین کانے پڑے —

(۵)

تم جس سوھنی کے لیے فقیر ھوئے تھے وہ موت کی چھری سے ذبح ھوگئی قدرت کی طرف سے قسمت کا تیر چلا اور اے میرے پیارے! میری جان نے ڈھال بن کر اس کو اپنے اوپر لے لیا —

(۶)

دریائے چناب لاکھوں ھی مصائب برداشت کرتا ھے، مگر مجھے کھانے سے وہ خوش ھوگیا - ھائے، ھائے! میرا حال تم سے جاکر کون کہے - میرے بال بال نے فریاد کی —

(۷)

خدا کرے وہ گھڑا تبدیل کرنے والی مرجاے جو ہم کو جدا کرکے خوش ہوگئی۔ میری روح کا باز اڑ گیا۔ عاشقوں کے ہاتھ میں مردہ جسم رہ گیا —

(۸)

اب اک بار اپنا چہرہ دکھا جاؤ۔ تمہارا چہرہ دیکھنے کی خواہش مجھے حد سے زیادہ ہے۔ خونی موت کے غنیم نے آکر ڈیرہ ڈال دیا ہے اور عاشقوں کے شہر میں ہڑتال ہوگئی ہے —

(۹)

اب تو قیامت کے دن ہی ملاقات ہوگی۔ اب تو یہی ہماری فال نکلی ہے۔ میں نے جی بھر کے تم سے باتیں بھی نہ کیں۔ میری ساری عمر مصائب سے جال کی مانند ہوگئی —

(۱۰)

مجھ بدقسمت کو کبھی بھی چین نصیب نہ ہوا، طعنوں سے میرا حال برا ہوتا رہا، میں آنکھوں کے راستے سے دل کا خون روتی ہوں، میرے آنسوؤں سے دریا لال ہوگیا —

(۱۱)

پہلے دشمنوں سے چوری چوری ملنے کا موقع مل جاتا تھا مگر اب اے دوست! وہ بھی مشکل ہوگیا۔ اے دوست فضل! سوھنی اپنے پیارے کو آوازیں دیتی تھی اور غوطوں کی وجہ سے نیم جان ہوگئی تھی —

سوھنی کی محبوب کے شوق میں دوسری فغاں -

(۱)

اے میرے پیارے ابھی وقت ہے آجاو - جدائی کا کامیاب حملہ مجھ پر کیا گیا ہے - اب جیتے جی تمہارا مجھ سے ملنا مشکل ہی ہوگا میری اس جان کنی کے وقت اگر مجھے اپنی صورت دکھا جاؤ

(۲)

فراق کا تیر میرے سینے میں آکر لگا اور وہ آر پار نکل گیا اور مجھے میری کچھ بھی سدھ بدھ نہ رہی عزرائیل وکیل بن کر میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور ایک پل بھی مجھے قرار لینے نہیں دیتا —

(۳)

مینہ کی بوچھار اور آندھی نے میرا برا حال کردیا - اولے غضب کے پڑرہے ہیں اور بجلی کی چمک مجھے مردہ بنائے دیتی ہے —

(۴)

اے پیارے! حضرت موسیٰ کی طرح یہ کالی رات آگئی ہے - سیاہ اور ڈراونے ابر غبار لیے ہوے ہیں - میری جان عذاب کے منہ میں آگئی ہے - خدا نے مجھے گنہگار سمجھ لیا ہے —

(۵)

اے پیارے! میری جان لبوں پر آگئی ہے - مجھے اک بار اپنا جلوہ دکھادو موت کا باز تیز و طرار ہے اور خونی بھی اس نے پلک جھپکنے سے پہلے میرا شکار کرلیا —

(۶)

تمہاری سوھنی چوڑے پاٹ والے دریا میں بہہ گئی ہے - اب تم ہی

آکر اس کو پار لگاؤ - مگرمچھ، کچھوے، تھندوے اور ہزاروں ہی ایسے دریائی جانور مجھے کھانے کے لیے آگئے ہیں —

(۷)

میری پیشانی پر یہی لکھا ہوا تھا جو آج مجھ پر ظاہر ہوگیا - میری جان ترستی اور التجائیں کرتی رہی کہ اے میرے پیارے! مجھ سے آکر مل جاؤ —

(۸)

میری آواز عرش سے گزر کر پار چلی گئی مگر قہر کرنے والے خدا نے داد نہ دی - میں بد قسمت تمہیں سیر ہو کر دیکھ بھی نہ سکی کہ مجھ بے بس کو موت نے آگھیرا —

(۹)

روز ازل سے ہی میرے کرم اچھے نہ تھے - میری قسمت کے لکھے نے ہی مجھے مار دے دی - میں مر کر بھی یہی پکارتی رہوں گی - بھلا مجھے تمہارا پیار کس طرح بھول جائے گا؟ —

(۱۰)

کوئی قدرتی طاقت میرے پیچھے لگی رہی، وہ تاک میں تھی اور اے میرے پیارے! راستے میں ہی اس نے مجھے لوٹ لیا - دوست فضل! اے پیارے! اے میرے غم کھانے والے، اے میرے دلدار مجھے اپنے سینے سے لگا لے —

تیسری فغاں

(۱)

تم اس دریا میں آکر مجھے کس طرح ڈھونڈو گے؟ ہر طرف پانی

ہی پانی ہوگا، کہیں کنارہ نظر نہ آے گا - بھلا تم کو کون تسلی دے گا؟ -
اے میرے مالک! تم کس سے باتیں کروگے؟ -

(۲)

جب کوئی سوھنی کا نام لے گا تو تمہارے دل میں زخم ہی نو ہوجائیں گے - خدا معلوم میری اکیلی جان تمہارا نام جپتی کہاں ہوگی -

(۳)

وہ پودا جس سے پھل کی امید تھی اے میرے پیارے! وہی پودا بغیر پھل کے نظر آئے گا - تمہارے پان سب ہی کملا گئے ہیں - تم دل دیکھہ لینا وہ بیل سوکھہ گئی ہوگی -

(۴)

جب تم میرا حال سنوگے تمہارا دل جل بھن کر کوئلہ ہو جائے گا -
اے فضل شاہ! اگر آہ و فغاں کروگے تو عرش معلی ہل جاے گا --

چوتھی فغاں

(۱)

سوھنی چلاتی تھی - اے دوست! اے دوست! اب یہاں تمہارے کون سے غم خوار ہیں؟ ایک تعلق تمہارا میرے ساتھہ تھا اور کوئی بھی یہاں تمہارا رشتہ دار نہیں ہے —

(۲)

اے پیارے! تمہارا وطن دور ہے اب تمہارے پاس تمہارے بھائی بہن نہیں ہیں - تم دریا کے کنارے پر گھبراے ہوے پھروگے - تم اکیلے کا رونا بھی کوئی نہ سنے گا -

(۳)

جب درد اور فراق تمہیں بے قرار کرے گا تو تمہارا سکھ اور چین کہاں جائے گا؟ - اے فضل! خدا کے فضل کے ساتھ، خدا کرے تم اس وقت تک زندہ رہو جب تک دنیا قائم ہے - اور تمہارے دن اور رات خوشی سے گزریں -

---

پانچویں فغاں

(۱)

میں مرچکی ہوں - میرا دم ناک میں آگیا ہے - اے دوست! تم میرے ہی لیے آجاؤ - میرے پاس میرا آخری وقت آپہنچا - اے دوست! تم میرے ہی لیے مجھے اپنے گلے سے لگالو -

(۲)

ہمیشہ میرے سینے میں جلن رہے گی - تمہارا ہی زخم - اے دوست! تم میرے ہی لیے آجاؤ - درد و فراق اور جلن والی فوج پیچھے بھاگی آرہی ہے - اے دوست تم میرے ہی لیے آجاؤ -

(۳)

میرے رونگٹے رونگٹے میں تمہارا پیارا نام سمایا ہوا ہے - اے دوست! تم میرے ہی لیے آجاؤ - تم اپنے فضل کی باگ میری طرف پھیرو - اے دوست! تم میرے ہی لیے آجاؤ -

---

چھٹی فغاں

(۱)

میری جان لینے کے لیے موت کا فرشتہ میرے پاس آیا ہے - اے میرے

پیارے! ابھی وقت ہے۔ اب بھی آجاؤ اگر تمھیں آنا ہے میرے پاس تو اے میرے مالک! آجاؤ - اے میرے پیارے! مجھے تمھارا ہی سہارا ہے ابھی وقت ہے - اب بھی آجاؤ -

(۲)

حضرت یونس والی مچھلی آپہنچی، میرا گوشت کھانے کے لیے - اے میرے پیارے! ابھی وقت ہے اب بھی آجاؤ - تمہیں کوئی پیارا راستے میں کھڑا تمھارا انتظار کرتا ہوا ملے گا - اے میرے پیارے! ابھی وقت ہے اب بھی آجاؤ -

(۳)

تم نے دریاے چناب کے اُس پار کھوں جاکر ڈیرہ ڈال دیا۔ اے میرے پیارے! ابھی وقت ہے اب بھی آجاؤ - میرے سینے میں جلن ہے - خدا کے فضل کے ساتھ جلد پہنچو، میرے پاس - اے میرے پیارے! ابھی وقت ہے- اب بھی آجاؤ -

ساتویں فغاں

(۱)

سوہنی بار بار پکارتی تھی - مجھے مل جاؤ اے دوست! ابھی وقت ہے آجاؤ - اس مشکل کے وقت آکر مجھے اپنا جلوہ دکھا جاؤ - مجھے تمھاری ہی تلاش ہے - اے دوست ابھی وقت ہے، آجاؤ -

(۲)

میری روح نے اپنے گلے سے ساری مصیبتوں کا ہار اتار کر پھینک دیا۔ اے دوست! ابھی وقت ہے - آجاؤ - میری آہ و فغاں سن کر موت کا فرشتہ بھی حیران ہوگیا - اے دوست! ابھی وقت ہے آجاؤ -

(۳)

مجھے تمہاری ہی قسم - پانی نے میرا سانس روک لیا - اے دوست! ابھی وقت ہے آجاؤ - مرنے کے وقت مجھ بد نصیب اور بے بس کو اپنی صورت دکھا جاؤ - اے دوست! ابھی وقت ہے آجاؤ -

(۴)

تم سے ملنے اور دیکھنے کے سوا مجھے اور کوئی خواہش نہیں - اے دوست! ابھی وقت ہے آجاؤ - تمہارے فضل کے بغیر اور کوئی بھی میرا غم کھانے والا نہیں ہے - اے دوست! ابھی وقت ہے آجاؤ -

(دریا میں سوھنی فغان کرتی اور سہیلیوں کو پکارتی ہے)

(۱)

اری او سہیلیو! خدا حافظ - اب تو ہمارا قافلہ کوچ کر رہا ہے - آؤ، آکر مل جاؤ - اری سہیلیو! خدا کے لیے اک بار تو تم میرے پاس آجاؤ -

(۲)

اری او سہیلیو! مجھے اپنے پیارے کی قسم، اب میرا تمہارے پاس آنا میرے بس کی بات نہیں رہی - اے سہیلیو! قہر کرنے والے خدا کی طرف سے قضا آگئی، اس کو یہی منظور تھا -

(۳)

اری او سہیلیو! تم میری ماں کو رونے نہ دینا - تم اس کا دل بہلانا - اری او سہیلیو! تم میرا آج کا کاتا ہوا سوت علحدہ کر دینا اور میرا چرخہ اُٹھا دینا -

(۴)

اری او سہیلیو! واقعی آج سے میرا سوت کاتنا ختم ہوگیا۔ اری او سہیلیو! میرا گھر گھر جاکر سہیلیوں کو بلا کر لانا بھی ختم ہو گیا —

(۵)

اری او سہیلیو! تم اس طرح جمع ہوکر آپس میں بیٹھ کر گانا - اری او سہیلیو! میرا کھاناپینا تو آج سے ختم ہوگیا - تم خوب مزے سے اپنے کھانے کھانا —

(۶)

اری او سہیلیو! جس جگہ میں بیٹھا کرتی تھی تم اس جگہ کسی بیچارے کو بٹھانا - اری او سہیلیو! تم میرا حال فضل شاہ کو بلاکر اچھی طرح سے سمجھا دینا —

(دریا میں سوہنی فغاں کرتی اور اپنی ماں کو پکارتی ہے)

(۱)

پھر سوہنی ماں کو پکارتی تھی - اے اماں! اب میرے پاس آجاؤ کہ میں تم کو دیکھوں - اے اماں! سوہنی جو بروں سے بھی بری ہے اس سے تم نے اتنے دھوکے کیوں کھائے —

(۲)

اے نادان اماں! کاش تم کبھی سوہنی کو جنم نہ دیتیں - اے اماں! یا میرا گلا ہی گھونٹ کر مار ڈالتیں یا زہر گھول کر مجھے پلا دیتیں —

(۳)

اے اماں! جو کچھ مجھ فریب پر بیتی ہے وہ کھول کھول کر مجھ سے نہ سنو - اے کچھ نہ جاننے والی اماں! موت کی سیاہ آندھی آئی

ہے - مجھے کچھہ بھی دکھائی نہیں دیتا —

(۴)

اے اماں! تم جہاں میرا پیارا دیکھو تم اس پر رحم کرکے تسلی دینا اور پیار کرنا - اے اماں! میری جان لبوں پر آگئی ہے - فضل شاہ کی طرح میں ڈگمگارہی ہوں —

(مہربان ماں کے فراق میں)

(۱)

اے ماں! تم جس کو بھول چکی ہو اس کو بھول ہی جاؤ - اے ماں! تمہارے بخشنے کا یہی وقت ہے - مجھے اپنا پلایا ہوا دودھ بخش دو —

(۲)

اے اماں! تم مجھہ بدنصیب کے پاس مہینوال کو جو فقیر ہے اور حال سے بے حال ہو گیا ہے لے کر جلد ہی آجاؤ - اے ماں! خدا کے نام پر میرے پیارے کا چہرہ جو چودھویں کے چاند کی طرح ہے کسی طریقے سے مجھے دکھا جاؤ —

(۳)

اے ماں! تم ذرا یہ تو بتاؤ کہ اس کا شریک کون ہے؟ وہ طاقت والے خدا کے لکھے ہوئے کو مٹا دے - اے ماں! مجھے تمہارا دودھ پلانا یاد آیا تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے —

(۴)

اے ماں! کسی طرح آج میرا پیارا مجھے مل جائے تو ایسی تدبیر کا کردے - اے ماں! ابھی موت کے فرشتے نے میری جان، نہیں لی، ابھی منکر

اور نکھر ھی آئے ھیں —

(۵)

اے ماں! قسمت نے میرا بس نہ چلنے دیا - میں نے ہزاروں ھی جتن کیے - اے ماں! میرا حال دیکھہ کر فضل شاہ! فقیر و پژمردہ اور حیران ہو گیا —

(سوھنی خدا تعالی سے فریاد کرتی ہے)

(۱)

اے خدا! خواہ میں تیری درگاہ کی چور ھی ھوں مگر تونے مجھہ پر اتنا قہر نازل کیا ھے کہ قابل بیان نہیں - اے خدا! اگر واقعی تو مجھے مارنا ھی چاھتا ھے تو میرے پیارے کی قبر میری قبر کے ساتھہ بنوانا —

(۲)

اے خدا! بادل اس قدر گھر کر آئے ھیں کہ یہ میری آواز میرے محبوب تک پہنچنے نہیں دیتے - اے خدا! تو نے میرا دامن مہینوال سے چھڑا دیا تو تجھسے کوئی زور تو چلتا نہیں —

(۳)

اے خدا! تونے ایک پلک جھپکنے سے پہلے میرا بیڑا دریائے چناب کے بھنور میں پھنسا دیا - اے خدا! بے کسوں کا مشکل کے وقت تیرے سوا اور کوئی سہارا نہیں —

(سوھنی کی خدا تعالی سے دوسری فریاد)

(۱)

اے خدا! تونے فقیر مہینوال کے دشمنوں کو خوش کردیا - اے خدا!

تونے خوش کردیا - اے خدا! میں روز حشر تک یہی پکارتی رہونگی -
اے خدا! توهی داد دینا - توهی داد دینا —

(۲)

اے خدا! میرا ایک ایک رواں مہندوال کو یاد کرتا ہے - اے خدا!
یاد کرتا ہے - اے خدا! میں محبوب کو پکارتی پکارتی برباد ہوگئی ہوں -
اے خدا! برباد ہوگئی ہوں —

(۳)

اے خدا! آرزو کے پورے ہوے بغیر تقدیر نے مجھے پکڑ لیا اور
میں اجڑ گئی - اے خدا! اجڑ گئی - میں اجڑ گئی - اے فضل شاہ!
سوهنی ڈوب کر مر گئی - فریاد اے خدا! فریاد اے خدا!!

تبصرے

نام کتاب	صفحہ
ادب	
مختصر تاریخ ادب اردو	۲۹۰
مثنویات	۲۹۳
منظر آنولہ	۲۹۴
یادگار حالی	۲۹۵
شعلے	۲۹۵
بہار	۲۹۷
عروس ادب	۲۹۸
تاریخ و سیر	
یاد انوار	۲۹۹
سلطان الہند (تجرب نواز)	۳۰۰
متفرقات	
مقصود حیات	۳۰۱
بھگوت گیتا (نغمۂ خداوندی)	۳۰۲
سیاسیات	۴۰۳
اردو کے جدید رسالے	
معیار	۳۰۷
سہیل	۳۱۱
سالنامے	
ادبی دنیا	۳۱۴

تبصرے

ادب

مختصر تاریخ ادب اُردو

مصنفہ سید اعجاز حسین صاحب، اعجاز، ایم۔ اے، لکچرار شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی۔ چھوٹی تقطیع، صفحات ۳۰۹۔ قیمت ۲ روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ: انڈین پریس الہ آباد۔

یہ کتاب مختصر بھی ہے اور سرسری بھی۔ تاریخ ادب اردو پر حال میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ موضوع جس قدر مشکل ہے اُسی قدر آسان سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں جابجا غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ ان سب کا ذکر اس مختصر تبصرے میں ممکن نہیں چند خاص اور اہم فروگذاشتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں نظم کی تاریخ ہے اور دوسرے میں نثر کی، اور یہ دونوں حصے ابتدا سے موجودہ دور تک پہنچتے ہیں۔ پہلے حصے کے آٹھ باب ہیں۔ پہلے حصے کے ابتدائی حصے میں زبان کے آغاز

کا حال ہے جو بہت سرسری ہے اور پڑھنے والا اس سے کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا۔ اس کے بعد ابتدائی شعرا کا ذکر ہے جو امیر خسرو سے لے کر اشرف دکھنی تک کے تذکروں پر مشتمل ہے - اس حصے کے متعلق مصنف کی اطلاعات بہت ناقص ہیں - غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ماخذ ایسی کتابیں ہیں جو جدید تحقیقات کی رو سے غلط اور ناقابل التفات ہیں - مثلاً محمد قلی قطب شاہ کا تخلص معانی لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے - وجہی کی سب رس کو میراں جی شاہ سے منسوب کردیا ہے (ص ۱۷) - شاہ برہان عالم کو شاہ برہان الدین لکھ دیا ہے - ابراہیم عادل شاہ کی نورس کی زبان کو اردو بتایا ہے —

دوسرے باب کا آغاز 'ولی' سے ہوتا ہے اور خاتمہ امیر خاں 'انجام' پر۔ لیکن اس میں بھی غلطیاں موجود ہیں - بعض مولفین نے غلطی سے میر ولی فیاض دکنی کی " دہ مجلس " کو ولی سے منسوب کردیا ہے - چنانچہ یہی غلطی احسن مارہروی صاحب سے بھی ہوئی اور انہوں نے " دہ مجلس " کی تاریخ تالیف کو جو اس کتاب کے آخر میں درج ہے ولی کے کلیات میں شامل کردیا - مصنف کتاب ہذا نے غلط در غلط اس قطعۂ تاریخ کو فضلی کی دہ مجلس کی تاریخ تالیف سمجھ لیا ہے حالانکہ احسن صاحب نے عنوان میں " دہ مجلس منظوم " لکھا ہے اور فضلی کی کتاب نثر میں ہے - اور اس غلطی کی بنا پر ولی کے سنہ وفات ۱۱۱۹ کو مشتبہ ظاہر کیا گیا ہے جو ہم نے کامل تحقیق کے بعد دریافت کیا تھا - معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے رسالۂ اردو کے اس مضمون کو غور سے مطالعہ نہیں فرمایا - انجام کے قتل کا سنہ ۱۱۵۹ ہے نہ کہ ۱۱۹۹ - 'تاباں' نے اس کی تاریخ لکھی تھی - مولف کی تنقیدی رائیں بھی محل نظر ہیں —

دوسرا حصہ نظم پر مشتمل ہے جس کے چھ باب ہیں۔ شروع میں پانچ صفحوں کی ایک مختصر سی تمہید ہے جس میں قدیم اردو نثر کی تاریخ مختلف کتابوں سے اخذ کر کے لکھی ہے - تمہید کسی قدر تشنہ ہے اور غلطیوں سے بھی پاک نہیں- حیرت ہے کہ لایق مولف سودا کی اس نثر کو جو ان کی کلیات میں ہے ترجمۂ شعلۂ عشق کا دیباچہ سمجھتے ہیں - اس تمہید کے بعد نثر کی تاریخ کا آغاز فورٹ ولیم کالج سے کیا ہے اور اس کے بعض ارکان کا مختصر ذکر کر کے اس باب کو ختم کر دیا ہے - دوسرا باب فقیر محمد خاں گویا سے شروع کر کے منشی غلام غوث خاں 'بیخبر' اور تیسرے باب کا آغاز سر سید سے لے کر پنڈت 'سرشار' پر ختم کر دیا ہے - اس دور کو لائق مولف نے ترقیء نثر کا دور بتایا ہے - چوتھا باب 'شرر' سے شروع ہوتا ہے اور ظفر علی خاں پر ختم ہوتا ہے - پانچواں باب پریم چند سے آغاز ہو کر اعظم کریوی پر ملتہی ہوتا ہے اور چھٹا باب پطرس سے لے کر شوکت تھانوی تک ہے —

اس مختصر تاریخ میں ظاہر ہے کہ صرف سرسری بحث ہو سکتی تھی لیکن مصنفین کے اسالیب بیان اور ان کی تصانیف کے موضوعات پر جو رائیں ظاہر کی گئی ہیں وہ زیادہ صائب نہیں معلوم ہوتیں —

لائق مولف نے جدید تحقیقات سے جو وقتاً فوقتاً رسالوں میں شایع ہوتی رہتی ہے پورا استفادہ نہیں کیا - تاہم یہ کتاب طالب علموں کے لیے اس لحاظ سے مفید ہے کہ انہیں ایک مختصر کتاب میں اردو ادب کے مختلف دور مرتب مل جاتے ہیں اور وہ بغیر زیادہ جستجو کے عام کیفیت اور حالات سے واقف ہوسکتے ہیں —

مثنویات -

(مولنہ محمد امیر احمد علوی صاحب بی- اے- صفحات ۱۰۲- قیمت بارہ آنے)

یہ مقالہ رسالۂ نگار میں شایع ہوا تھا اور اب کتاب کی صورت میں شایع کیا گیا ہے - اس میں فاضل مرتب نے کم و بیش ایک سو مثنویوں کے مختصر نمونے اپنی رائے کے ساتھہ پیش کیے ہیں - لیکن شاعروں کے حالات بہت مختصر اور سرسری ہیں - انتخاب میں التزاماً ان مثنویوں کو شریک نہیں کیا جو مذہبی موضوع پر لکھی گئی ہیں اور ادب کی چاشنی سے محروم ہیں - شروع میں ایک مختصر سی تمہید ہے جس میں مصنف مثنوی پر عروضی اور تاریخی حیثیت سے بحث کی ہے - دو ڈھائی صفحے کی یہ تمہید ناکافی معلوم ہوتی ہے —

بڑی ضرورت اس امر کی تھی کہ مثنویات کا انتخاب بقید سنین و ادوار کیا جاتا - فاضل مولف نے بہت ہی مفید کام پر ہاتھہ ڈالا ہے لیکن افسوس ہے کہ کماحقہ انجام نہ پاسکا - اس میں اول تو تمام بلند پایہ مثنویاں نہیں- دوسرے بعض مثنویاں اس میں ایسی ہیں جن کے صرف چند انتخابی اشعار تذکروں میں پائے جاتے ہیں' ان کو لایق مولف نے نقل کردیا ہے ' مکمل مثنویاں ان کی نظر سے نہیں گزریں - اس لحاظ سے ان کی آرا زیادہ تر قیاسی اور ناقص ہیں - جو مثنویاں ان کی نظر سے گزری ہیں ان کے حالات و سنین وغیرہ درج کرنے میں غلطیاں کی ہیں - وجدی کی مثنوی تحفۂ عاشقاں کا سنہ تصنیف ۱۰۱۵ نہیں بلکہ ۱۱۵۳ ہے - مصنف نے اس کی تاریخ تصنیف اس مصرعے سے نکالی ہے - " پچھانو اسے تحفۂ عاشقاں " - علاوہ اس کے چونکہ مولف بعض مثنویوں کے سنین وغیرہ سے ناواقف

ہیں- اس سے ترتیب و ترتیب میں تقدیم و تاخیر ہوگئی ہے جس کی وجہ سے مثنویات کے ارتقا کا اندازہ بلحاظ موضوع اور زبان و بیان صحیح طور سے نہیں ہوسکتا —

کتاب کا موضوع بلا شبہ اہم ہے - لیکن تحقیق و تنقید اور مواد کے لحاظ سے اس کا پایہ بلند نہیں ہے - اس موضوع پر اصولی اور علمی تحقیق و تنقید کے اعتبار سے مزید کام کرنے کی ضرورت ہے —

منظر آئینہ

(از جناب بیخود موہانی صاحب، پروفیسر شیعہ کالج لکھنؤ -
چھوٹی تقطیع، صفحات ۶۹ - قیمت علاوہ محصول چھ آنے)

حضرت بیخود نے جناب مسعود حسن رضوی صاحب کی کتاب "ہماری شاعری" پر جو تنقید لکھنی شروع کی ہے، اس کی پہلی جلد کی قسطیں شایع ہو چکی ہیں - پہلی قسط "جوہر آئینہ" پر اس سے قبل اس رسالے میں تبصرہ ہو چکا ہے - یہ دوسری قسط ہے جس کا انداز تنقید کم و بیش وہی ہے جو جوہر آئینہ کا ہے - لایق مصنف نے لفظی و معنوی مباحث پر بڑی قابلیت سے تنقیدی موشگافیاں فرمائی ہیں لیکن جیسا کہ ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں تنقید کا انداز کسی قدر تلخ ہے - بعض مباحث کو غیر ضروری طول دے دیا ہے - جس سے صحیح تنقیدی توازن قایم نہ رہ سکا - تاہم یہ تنقید عام شائقین ادب اور خصوصاً طلبہ کے لیے مفید اور بصیرت افزوز ثابت ہوگی —

(ن)

یادگار حالی

(مرتبہ جناب دیا نراین نگم ' بی - اے)

دسمبر ۳۵ ع میں رسالۂ زمانہ نے اپنا " حالی نمبر " شائع کیا تھا - اب وہ تمام مضامین اور نظمیں " یادگار حالی " کے نام سے کتابی شکل میں شایع کی گئی ہیں - مضامین چونکہ دلچسپ ہیں اور مولانا حالی پر مختلف حیثیتوں سے لکھے گئے ہیں اس لیے ان کا کتاب کی شکل میں محفوظ اور یک جا جمع ہونا ضروری ہے - یہ نظم و نثر کے کم و بیش بیس مضامین پر مشتمل ہے - یہ مجموعہ دلچسپ ' اور لایق مطالعہ ہے - چند تصاویر بھی ہیں ' جن میں دو مولانا حالی کی ہیں ' ایک ان کا عکس تحریر ہے ' ایک ان کے رفقا کا گروپ ہے اور ایک نواب صاحب بھوپال کی ہے —

اس مجموعے کی ترتیب و اشاعت پر ہم لایق مرتب کو مبارک باد دیتے ہیں -

(م)

شعلے

(از احمد علی صاحب - صفحات ۱۹۴ - کاغذ ' کتابت ' طباعت دیدہ زیب - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتا - نیاسنسار الہ آباد -)

بارہ افسانوں کا یہ مجموعہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کی زندگی کا اچھوتا مرقع ہے - اس کے صواب و خطا کو فنی معیار پہ نہیں جانچنا ہے - نہ ان میں اسلوب بیان کی ندرت تلاش کرنا ہے اور نہ کردار نگاری کے کمال کا اندازہ لگانا ہے - یہ زندگی کے چند سہارے ہیں جو

مجموعی اعتبار سے ایک ایسے طبقے کی چھب پیش کرتے ہیں جو بے روح بے جان اور بے عمل ہے - اس کے آگے صرف دو مسائل ہیں - بے کاری اور جنس! بے کاری کی گتھی کو سلجھانے کے بعد یہ طبقہ زندگی کی دوسری منزل کی طرف روانہ ہوتا ہے - اس مجموعے کے بیشتر افسانوں میں دکھایا گیا ہے کہ 'عورت' کی تلاش کے دوران میں اس پر کیا گزرتی ہے - مسلک اور عورت کی کشمکش کا سوال نہیں ہے کیونکہ اس طبقے کا کوئی غیر شخصی مسلک نہیں ہے - نہ عورت کی کمیابی کا شکوہ ہے کیونکہ وہ پالتو جانوروں کی طرح ارزاں ہے - عورت خود سپردگی کے لیے تیار ہے، مرد پروانہ وار اس پر گر رہا ہے - افسانے کی تان یہیں آکر ٹوٹتی ہے —

مصنف عین لذت کے وقت گدگدی دے کر پوچھتا ہے کہ کیا زندگی کے فرائض یہیں ختم ہو گئے - ایک بنگلہ، ایک موٹر، ایک بیوی اور چند عدد بچے - کیا یہی منتہائے حیات ہے؟ - ہر افسانہ تاریکی اور مایوسی کی فضا میں کھو جاتا ہے - فرد گھونگھے کی طرح اپنی خودی میں محو ہو جاتا ہے اور اس خول کے باہر ایک وسیع اور عظیم الشان دنیا بے بسی کے عالم میں تڑپ رہی ہے - مصنف کا مدعا یہ ہے کہ متوسط طبقے کی زندگی کے اوچھے پن کو ظاہر کرے اور اس کا مقابلہ عوام کی زندگی سے کرے جن پر سماج کے نظام کا دار و مدار ہے - 'تصویر کے دو رخ' 'مزدور' اور 'غلامی' میں اس تضاد کی طرف چند اشارات کیے گئے ہیں —

معلوم ہوتا ہے کہ "انگارے" کی اشاعت کے بعد احمد علی صاحب کے زاویۂ نگاہ میں ایک بین فرق پیدا ہو گیا ہے - انگارے کا آرٹ جنسی تشدد کا شکار تھا - اس کی تصویر بڑے شوخ رنگوں میں بنائی گئی تھی - لیکن 'شعلے' کا ہر صفحہ اس تنگ و تاریک زندگی پر خندہ زن ہے - مصنف اس 'سودائے

جلسی' سے بیزار ہے اور تعلیم یافتہ طبقے کے اقدار کو غم و غصہ سے دیکھتا ہے - ممکن ہے کہ سماجی روایات کی تضحیک کچھ انگلیوں کو انتظار کے عالم میں ڈاڑھی کے الجھنوں تک لے جائے اور کچھ لمبی ناکیں جو اپنے خم سے آگے دیکھنے کی عادی نہیں ہیں ان صفحات میں الحاد کی بو سونگھ لیں - لیکن سمجھ دار اور سچے آدمیوں کو ان کے مطالعے کے بعد اپنے دلوں کو ٹٹولنے کی ضرورت محسوس ہوگی اور وہ دیکھیں گے کہ ایک تیز نشتر کی ضرورت ہے جو ہمارے سماج کے جسم کے فاسد زخموں کو کاٹ کر نکال دے —

'شعلے' میں کوئی پیغام نہیں ہے - یہ گویا ایسا نشان راہ ہے جہاں رک کر راہگیر اگلی پچھلی منزلوں کا جائزہ لینے لگتا ہے —

(؟)

بیمار -

(از سجاد ظہیر صاحب - صفحات ۱۰ - کاغذ کتابت طباعت دیدہ زیب - قیمت درج نہیں - ملنے کا پتا: نیا سنسار الہ آباد) -

ایک ایکٹ کا ڈراما ہے جو چند صفحوں اور چند سو الفاظ پر مشتمل ہے - لیکن ان میں ایک بڑی حقیقت مضمر ہے - ایک خوش حال اور پڑھے لکھے صاحب جو ایک بیوی اور ایک روح کے مالک ہیں' بڑی مصیبت میں گرفتار ہوجاتے ہیں - وہ یہ کہ ان کا مہمان دم توڑ رہا ہے اور ان کی بیوی تیمارداری میں اتنی مشغول ہے کہ ان کے ناشتہ کا بر وقت انتظام نہیں کر سکتی - اس واقعے کو لے کر مصنف نے سماج کے مظالم اور متوسط طبقے کی ریاکاری کا پردہ فاش کیا ہے - انداز بیان پختہ نہ ہوتے ہوئے

بھی موثر ہے —

ہمارے خیال میں آخر میں ڈراما نگار لغزش کھا گیا ہے۔ بشیر کی موت تو خیر قرین قیاس ہے لیکن سلیمہ کی دیوانگی ذرا سمجھ میں نہ آئی۔ بشیر میاں کو مار کر ہی جب مصنف کا مقصد پورا ہو جاتا تھا تو اس بیچاری کو باؤلی نہ بنایا ہوتا —

بہر حال ڈراما اس اعتبار سے ضرور کامیاب ہے کہ اسے پڑھ کر اچھے طبقے کی بے حسی اور کم ظرفی کا احساس ہو جاتا ہے —

(ع)

عروس ادب —

(مصنفہٗ قاضی عباس حسین صاحب ظریف دہلوی۔ کاغذ کتابت طباعت عمدہ - صفحات ۳۰۰ - قیمت ایک روپیہ -
ملنے کا پتا: ساقی بک ڈپو دہلی) -

یہ افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں بطور چاشنی چند غزلیں ٹانک دی گئی ہیں۔ مصنف کا ارشاد ہے کہ "آپ واقعات کا خیال نہ کیجیے طرز تحریر ملاحظہ کیجیے"۔ یوں ان کی خواہش ہے تو خیر، ورنہ افسانہ نگاری میں طرز تحریر کو سب سے اہم حیثیت حاصل نہیں ہے۔ دستوئیفسکی اور گورکی دنیا کے بہترین ناول نگاروں میں ہیں لیکن زبان اور انشا کے اعتبار سے ان کا پایہ زیادہ بلند نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان افسانوں کی زبان بہت سلیس شستہ اور بے تکلف ہے۔ لیکن افسانے کی غایت یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ پلاٹ کا دلچسپ ہونا بھی کافی نہیں ہے —

تعارف نگار کا قول ہے کہ "ہر افسانے میں اصلاح کا پہلو نکالا گیا ہے"۔ 'فردوس تخیل' جیسے افسانے پر یہ قول صادق نہیں آتا اور پھر مصلح

ہونا کسی آرٹسٹ کے لیے خوبی کی بات بھی نہیں ہے - جب پلاٹ میں خود بخود ابھار پیدا نہیں ہوتا تو ظریف صاحب ناظرین سے صیغۂ واحد میں گفتگو کرنے لگتے ہیں اور 'راوی' کاسا انداز پیدا ہوجاتا ہے - کہیں کہیں افسانہ مضمون کی شکل اختیار کرلیتا ہے مثلاً "ریل ہٹ" میں - کردار نگاری کا پہلو بھی کم زور ہے - تاہم اس میں شک نہیں کہ مصنف میں گرد و پیش کو سمجھنے سمجھانے کی صلاحیت موجود ہے اور اس مجموعے میں تفریح کا کافی سامان مہیا کیا گیا ہے —

(ز)

—*—

تاریخ و سیر

یادِ انوار —

(مرتبۂ مولوی محمد امین زبیری صاحب - چھوٹی تقطیع صفحات ۹۹ - لکھائی چھپائی عمدہ - مطبوعۂ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ) -

یہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک محنتی اور سرگرم کارکن مولوی حاجی انوار احمد زبیری مارہروی مرحوم کا تذکرہ ہے - مرحوم کانفرنس کے کوئی بڑے عہدہ دار نہ تھے اور نہ ان کی کوئی خاص شہرت تھی - وہ کانفرنس کے سفیر اور اس کے دفتر کے اہل کار تھے' لیکن جس محنت' استقلال' دلسوزی اور محبت سے انہوں نے اپنے فرائض انجام دیے وہ ہر طرح احترام کے لایق ہے - ان کی گوناگوں خدمت کا اثر

کانفرنس کے کاموں پر بہت مفید ہوا ' جس کا اعتراف کانفرنس کے ارباب حل و عقد نے کیا ہے —

اس مختصر رسالے میں مرحوم کے سوانح حیات ابتدا سے لے کر آخر تک جامعیت کے ساتھہ قلم بند ہوئے ہیں - یہ مختصر سی سوانح عمری ان لوگوں کے لیے سبق آموز اور چراغ راہ ہے جو قومی جذبات کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانا چاہتے ہیں —

(۳)

سلطان الہند (غریب نواز) -

(مرتبۂ مولوی محمد اجمل خاں صاحب ایم - اے '
چھوٹی تقطیع ' صفحات ۱۱۹ - قیمت ۲ آنے - ناشر :-
ادارۂ نوامیس الہیہ - بہادر گنج الہ آباد) -

یہ چھوٹی سی کتاب حضرت خواجہ اجمیری کے سوانح و تعلیمات اور کشف و کرامات کے متعلق ہے - لایق مولف نے شروع میں ایک تمہید لکھی ہے جس میں اسلام اور ہندوستان اور مسلمانوں کے ہند سے ابتدائی تعلقات پر بحث کی ہے - اس کے بعد صوفیائے کرام کے پر امن تبلیغی کارناموں کا ذکر کیا ہے ' پھر مختلف اہل مذاہب سے مسلمانوں کے تعلقات کو دکھایا ہے - اس کے بعد اسلامی فاتحین کا ذکر کیا ہے - اس تمہید کے بعد اسلامی تصوف اور سلوک کی مبادیات سے بحث کی ہے ' پھر خواجگان چشت کا مختصر ذکر کرکے ان کی تعلیمات وغیرہ کو سرسری طور پر بیان کیا ہے - آخر میں حضرت خواجہ صاحب کے سوانح وغیرہ ہیں - کتاب مختصر ہے

لیکن بہت سے مفید معلومات درج ہیں —

(۲)

متفرقات

مقصود حیات—

(از جناب حافظ وکیل احمد صاحب حافظ قاری پوری - چھوٹی تقطیع' صفحات ۱۲۷ - قیمت ۹ آنے مجلد ۱۲ آنے - مصنف کے پتے پر اندرون حسن منزل الہ آباد سے مل سکتی ہے)-

مسٹر پھاکڑے پروفیسر راجا رام کالج ریاست کولہاپور نے سیکسول پرابلم ان انڈیا " کے نام سے انگریزی زبان میں ایک قابل قدر کتاب لکھی ہے ' جس میں مسئلۂ جنسی پر عقلی و نقلی دلایل کی روشنی میں بڑی قابلیت سے بحث کی ہے - مذہب ' رسم و رواج ' معاشرت و تمدن وغیرہ کے جو اثرات اس مسئلے پر پڑتے ہیں ان کو بخوبی واضح کیا ہے ' اپنی تائید میں مستند و صحیح اعداد و شمار کو پیش کیا ہے ' طبی و نفسیاتی پہلو سے بھی روشنی ڈالی ہے اور ہندو مسلم مذاہب کی کتابوں اور بزرگوں کے اقوال سے استدلال کیا ہے - غرض اس مسئلے کی اہمیت کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے —

کتاب کی اہمیت پر نظر کر کے جناب حافظ وکیل احمد صاحب نے

اس کا ترجمہ کیا ہے - ترجمہ لفظی نہیں ہے بلکہ اس میں بہت کچھ ترمیم و تبدیل سے کام لیا ہے اور ترتیب و ابواب میں کچھ رد و بدل بھی کیا ہے - اردو زبان میں اس موضوع پر یہ مفید کتاب ہے - جو حضرات اس مسئلے سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے -

(ت)

بھگوت گیتا یا نغمۂ خداوندی -

(مترجمۂ محمد اجمل خاں صاحب ایم اے - کاغذ کتابت و طباعت اوسط - صفحات ۱۷۲ - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتا - ادارۂ نوامیس الہیہ بہادر گنج الہ آباد)-

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں اس وقت گیتا کا مرتبہ سب سے اعلیٰ و ارفع ہے - گو یہ کتاب ہندوؤں میں ہمیشہ وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی لیکن اس کی اہمیت کا اعتراف اس ملک میں زمانۂ حال سے ہونے لگا - یہ امر قابل غور ہے کہ گیتا کی تعلیم کے علم برداروں اور مفسروں میں اربند گھوش اور تلک سب سے زیادہ ممتاز ہیں اور ان دونوں کو ہندو تمدن کے نشاۃ ثانیہ اور قومی زندگی کے ارتقا میں خاص رتبہ حاصل ہے -

گیتا کی تصنیف کا مسئلہ اب تک متنازع فیہ ہے - اسے کس نے کب اور کیوں لکھا، اس پر محققین متفق نہیں ہیں - لیکن اس سے گیتا کی اہمیت کم نہیں ہوتی - ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں میں قومیت کے ارتقا کے ساتھ مختلف مذہبی کتابوں کی قدر و قیمت گھٹتی جاتی ہے اور ہر فرقۂ عام اس سے کہ وہ آریا سماجی ہو یا سناتنی، برہما کا پیرو ہو یا وشنو کا

پجاری، اپنے مقصد میں یکانگت محسوس کر رہا ہے اور گیتا کو اپنی حیات تازہ کا سرچشمہ سمجھ رہا ہے —

روحانی وجدان وغیرہ سے قطع نظر کر کے کہا جا سکتا ہے کہ اس مقبولیت کے دو اسباب ہیں - ایک تو کہ یہ گیتا میں بڑا لوچ ہے - وہ وید، اپنشد، پران غرض کہ ہندو فکر کا نچوڑ ہونے کی مدعی ہے - اس نے متضاد فلسفوں اور اسکولوں کا ایسا امتزاج پیش کیا ہے جس میں ہر فرقے کے لیے تاویل کی گنجائش موجود ہے —

ہندو سماج کا سنگ بنیاد ذات پات کا نظام ہے جس کی تدوین منو نے اپنی اسمرتی میں کی تھی - اس کتاب کی تصنیف مہا بھارت سے بہت پہلے ہو چکی تھی اور اس میں صاف و صریح الفاظ میں ذات پات کے قواعد ورنے کی بنا پر بنائے گئے ہیں - اگر گیتا میں اس کے متعلق صریحی احکام موجود نہیں ہیں تو اس سے مترجم کا یہ قیاس درست ثابت نہیں ہوتا کہ اس وقت ذات پات کی شکل موروثی نہ تھی - گیتا کے مطالعے کے وقت یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ کثرت میں وحدت اور اختلاف میں اتفاق کی سعی ہے - شروع سے آخر تک وہ ایک سمجھوتہ ہے اور بکھری ہوئی کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش ہے —

ہندو فکر کو گیتا کا سب سے اہم عطیہ اس کا پیغام عمل ہے - عمل کے ثمر سے بے نیاز ہو کر ہمیشہ عمل پیرا رہنے کی تعلیم اس ملک کے لیے بڑی برکت تھی، جہاں بے عمل عبادت کو کرم کا سب سے اونچا زینہ اور جسمانی عمل و حرکت کو تناسخ کی لعنت کی علت غائی سمجھا جاتا تھا - یہی وجہ ہے کہ غدر کے بعد جب ہندوؤں میں ایک نئی روح کروٹ بدلنے لگی تو گیتا کو اپنے پیغام عمل کی وجہ سے یہ امتیاز

حاصل ہو گیا —

کیا گیتا دنیا کے موجودہ مسائل کا کوئی حل پیش کرتی ہے؟ اس کا جواب نہیں میں دیا جائے گا - ہر وہ تعلیم آج خارج از بحث ہے جو نظریۂ ارتقا کی قایل نہیں ہے - البتہ اس اعتبار سے گیتا قابل قدر ہے کہ ہندو شاستروں میں تنہا وہی انسان کو عمل اور حرکت کی ترغیب دیتی ہے اور بے لوث عمل کو کلید نجات بتاتی ہے - اس کا یہ پہلو بھی بہت روشن ہے کہ وہ قوم و فرقہ سے بالا تر ہے اور اس کا مطالعہ کسی غیر ہندو کے لیے بھی اتنا ہی سفید ہو سکتا ہے جتنا کسی ہندو کے لیے —

ترجمہ صاف اور شگفتہ ہے - ہر اشلوک کے سامنے اسلامی ادب کے ہم معنی اقتباس درج کیے گئے ہیں اور کہیں کہیں قرآن مجید اور حدیث کے حوالے بھی دیے گئے ہیں - ڈاکٹر بھگوان داس نے اس ترجمہ پر نظر ثانی کی ہے اور یہ اس کی صحت کی ضمانت ہے - مترجم کا مقصد لایق تحسین ہے اور ان کی ہمت افزائی ہندو مسلم اتحاد کے ہر حامی کا فرض ہے -

(؟)

سیاسیات -

(از محمد اجمل خاں صاحب - کاغذ، کتابت و طباعت معمولی -
صفحات ۳۳۰ - قیمت درج نہیں) -
ناشر یونانی دواخانہ پریس الہ آباد

کتابیات کی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے لکھنے میں محض ٹرائشکے، بلانشلی اور مل جیسے پیش پا افتادہ مصنفوں سے

مدد لی گئی ہے - سیاسیات کے معاملے میں جرمن فکر کا ملتہا ہمیشہ سلطنت کی پرستش رہا ہے - اور ادھر برطانوی فکر سیاسیات کو زندگی کے دوسرے شعبوں سے الگ کر کے دیکھتا رہا ہے - غیر دانستہ طور پر یہ دونوں عیب کتاب کے ہر باب پر اپنا نقش چھوڑ گئے ہیں —

سیاسیات سلطنت کا علم ہے ' اور سلطنت سماج کے مروجہ نظام کو برقرار رکھنے کا ایک جبریہ ادارہ ہے - یہ ادارہ ان لوگوں کا آلۂ کار ہوتا ہے جو جبر کر سکتے ہیں - جبر کرنے کی طاقت ان میں ہوگی جو پیداوار اور تقسیم کے ذرائع پر حاوی ہوں - سماج میں سلطنت کے ادارے کی اس وقت ضرورت ہوئی جب پیداوار کے ذرایع (زمین ' کان وغیرہ) کے لیے کشمکش شروع ہوئی - اس ادارے کا کام یہ تھا کہ مروجہ نظام کو برقرار رکھنے کے لیے قانون بنائے ' انھیں منوانے کے لیے فوج پولیس اور عدالت رکھے - سوال اس کا نہیں ہے کہ سلطنت کے فرایض کیا ہونے چاہئیں بلکہ بحث محض امر واقعہ سے ہے - مگر اس کتاب میں واقعات سے کم اور فرائض سے زیادہ بحث کی گئی ہے - اگر فاضل مولف زندگی کو اخلاقیات سیاسیات معاشیات وغیرہ کے ملنے بند خانوں میں نہ بانٹ دیتے اور اس پر غور کرتے کہ انسان کے باہمی تعاون کی شرط اول دولت آفرینی ہے اور طرز معاشرت تہذیب و تمدن عکس ہیں ان حالات کے جن میں مال پیدا کیا جاتا ہے اور بانٹا جاتا ہے تو مسائل ان کے لیے یوں بھول بھلیاں نہ بن جاتے - اپنے مقصد کی وضاحت کے لیے ہم دو چار مثالیں دیتے ہیں —

افراد کا تعلق سلطنت سے (صفحہ ۹۷) کے تحت لکھا گیا ہے : " ہر فرد ملت کا فرض ہے کہ وہ نہایت خوش دلی سے سلطنت کی مالیات کے

مطالبات کو پورا کرتا رہے - ممکن ہے کہ بعض افراد پر ناموزوں تناسب سے ٹیکس عاید کیا جائے لیکن ان کو لازم ہے کہ ان کی ادائیگی کو فرض اولین سمجھیں اور مالیات کے متعلق اور دوسری قسم کی بد دیانتوں کو راہ نہ دیں " —

ایک دوسری جگہ (صفحہ ۱۹۷) ارشاد ہوتا ہے " ہر مدبر کو اپنی ملت کی بہبودی کے خیال ہوتا ہے اور ہر فرد ملت کو سلطنت کی بہبودی مد نظر ہوتی ہے .... اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سلطنت کو اپنی ہستی قایم رکھنے کے لیے بہبودیٔ عامہ کو اس پر سے قربان کر دینا پڑتا ہے ...... " —

کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں - فرد کے حقوق کیا ہیں ؟ اگر سلطنت ان حقوق کو پامال کرے تو فرد کا رویہ کیا ہونا چاہیے ؟ اگر سلطنت کے مفاد اور مطالبات انسانیت کے مفاد اور مطالبات سے ٹکراتے ہوں تو فرد کیا کرے ؟ یہ اخلاقی سوالات نہیں ہیں بلکہ ان کے جواب تاریخ کے واقعات میں تلاش کرنے چاہئیں - دور جانے کی ضرورت نہیں ہے ایک اطالوی مزدور بجا طور پر پوچھ سکتا ہے کہ حبش کے خلاف وہ کیوں لڑے ' بے گناہ عورتوں اور بچوں پر بم کیوں برسائے - سلطنت کا یہ مطالبہ کہاں تک جائز ہے ' خصوصاً اس حال میں کہ سلطنت ایک شخص کی ملکیت ہو -

ایک جگہ یہ لکھا گیا ہے کہ مشرق کا سیاسی تخیل یکسر اخلاقی رہا ہے - اگر مولف کی نظر میں ' چانکیہ نیتی ' اور اس قماش کی کتابیں ہوتیں تو وہ یہ دعویٰ نہ کرتے - صفحہ ۴۵ پر کہا ہے کہ " ملل عالم کے سامنے ہندوستان نے سلطنت کا روحانی تخیل پیش کیا ہے - یہ فلسفہ کے تخیل سلطنت کا بہترین نمونہ ہے " - غالباً گاندھی جی کی تحریک ستیاگرہ کی طرف اشارہ ہے - ستیاگرہ سلطنت کا کوئی تخیل پیش نہیں کرتا بلکہ

وہ سوراج حاصل کرنے کا ایک روحانی طریقہ ہے۔ گاندھی جی کی نظر میں سلطنت کا کوئی منضبط تخیل نہیں ہے اور نہ ان کے پہلے کسی ہندوستانی نے اس طرف توجہ کی ہے۔ ہندو تخیل سلطنت کا نصب العین رام راج رہا ہے جسے Benevolent Despotism کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔

کتاب کی الجھی ہوئی ترتیب اور تحریر کو دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ مولف اپنے مضمون پر پوری طرح حاوی ہے بھی یا نہیں —

(ع)

اُردو کے جدید رسالے

معیار —

(مرتبہ قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا' ایڈوکیٹ'

بانکی پور پٹنہ - سالانہ قیمت چار روپے آٹھ آنے)

یہ ماہانہ رسالہ انجمن ترقیِ اردو (شاخ پٹنہ) کی طرف سے شایع ہوا ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب اس کے اڈیٹر ہیں۔ قاضی صاحب کا ادبی ذوق بلند ہے اور ادبی تحقیق سے انہیں خاص لگاؤ ہے۔ یہ انجمن جو انجمن ترقیء اردو کی شاخ ہے' انہیں کا لگایا ہوا پودا ہے اور اس کا رسالۂ معیار بھی انہیں کی سعی کا نتیجہ ہے —

یہ رسالہ خالص ادبی ہے۔ "معیار" اور "اردو" کا مقصد تقریباً ایک ہے۔ لیکن قاضی صاحب نے ایک اضافہ یہ کیا کہ اس میں "تخلیقی ادب کے نمونے بھی بالالتزام" پیش ہوتے رہیں گے۔ ہمیں تخلیقی ادب اردو میں

پیش کرنے سے عار نہیں، لیکن افسوس اس کا ہے کہ جو چیزیں ہمارے پاس کبھی کبھی اس نام سے آئیں وہ بہت گھٹیا تھیں۔ البتہ ترجموں سے یہ کمی پوری کی جاسکتی ہے۔ معیار نے زیادہ تر یہی کیا ہے —

رسالے کے لیے خاص خاص عنوانات قائم کیے گئے ہیں جو فاضل اڈیٹر کی جدت اور بالغ نظری پر دلالت کرتے ہیں۔ عام عنوانات یہ ہیں —

معروضات، التباسات، استفسارات —

آثار ادبیہ۔

اس میں ایسی قدیم نظم و نثر ہوگی جو ادبی، تاریخی یا لسانی نقطۂ نظر سے قابل قدر ہو۔

غالب۔

مستقل عنوان ہوگا جس میں مرزا صاحب کی غیر مطبوعہ نظم و نثر ہوگی یا ان کی زندگی یا شاعری کے کسی پہلو سے بحث کی جائے گی۔

افسانے —

تمثیل۔ طبع زاد یا ترجمے۔

نظم —

شعرائے حال کی غزلیں شایع نہ ہوں گی۔ دوسری نظمیں صرف ایسی ہی شایع ہونگی جن میں جدت تخیل ہوگی —

مقالات۔

ادب کے مالہ و ماعلیہ، دوسری زبانوں کے ادب اور اس کے ارتقا وغیرہ سے متعلق بھی مضامین ہوں گے۔ ایسی ادبی اور ذوقی تحریکات پر بھی بحث ہوگی جو ہندوستان یا دیگر ممالک میں رو نما ہیں۔ مصنفین اردو کے حالات بھی بالالتزام شایع ہوتے رہیں گے —

اوراق پارینہ -

اس میں کمیاب مخطوطات و مطبوعات کا ذکر ہوگا —

ہماری زبان -

اس میں زبان اردو کے متعلق ہر قسم کے تحقیقی مضامین ہوں گے -

مطبوعات جدیدہ -

اس میں کتابوں کے بے لاگ تبصرے ہوں گے —

محاکمہ -

یہ محاکمہ ہوگا ۔ پہلے اس میں اصلاح کا نازک کام انجام دیا جائے گا -

عالم ادب -

اس میں کتابوں اور مصنفوں کے متعلق ہر قسم کی اطلاعیں درج ہوں گی -

ایک ادبی رسالے کے لیے اس سے بہتر کیا عنوانات ہو سکتے ہیں - یہ عنوانات بجائے خود بصیرت افروز ہیں - اس پہلے رسالے میں سوائے ایک دو کے باقی سب عنوانات کے تحت میں کچھہ نہ کچھہ ضرور آگیا ہے - اور ہر تحریر میں تحقیق اور کاوش کے آثار نظر آتے ہیں - خصوصاً کتابوں کے تبصروں میں جس تحقیق اور دقت نظر کا ثبوت دیا گیا ہے وہ بہت قابل داد ہے - اردو کے عام رسالوں کا یہ حال ہے کہ کتاب اِدھر اُدھر سے دیکھی ' (بلکہ بعض حالات میں بے دیکھے) اور مبہم اور عام الفاظ میں چند سطریں بطور تبصرے کے لکھہ دیں - معیار کے تبصرے حقیقی تبصرے ہیں - معلوم ہوتا ہے ایک ایک سطر کا مطالعہ کیا ہے اور معمولی سی غلطی بھی تبصرہ نگار کی نظر سے نہیں بچی - بعض صورتوں میں تو معیار کے تبصرہ نگار حد سے تجاوز کر گئے ہیں اور ان کی محنت اور دیدہ ریزی کو دیکھہ کر ان پر رحم آنے لگتا ہے - مثلاً دیوان معروف کے تبصرے کے آخر

میں پورے سات صفحے اغلاط کی تصحیح میں صرف ہوگئے ہیں - تنقید دل کھول کے کی ہے مگر بے لاگ ہے اور ذاتیات سے بالکل بحث نہیں کی ہے —

اس رسالے میں ایک اور کام کی بات نظر آئی یعنی " سنہ ۳۶ ع کے ادبی مضامین " کے تحت میں ان تمام اہم اور قابل مضامین کا خلاصہ یا ذکر کردیا گیا ہے جو مختلف رسالوں میں طبع ہوئے ہیں - اس سے ادیب یا انشا پرداز کو بڑی مدد ملتی ہے —

عالم ادب کے عنوان کے تحت شاہ جارج پنجم کی وفات کا ماتم کیا ہے جو از روے عقیدت تو ٹھیک ہے لیکن عالم ادب سے اس کا جوڑ نہیں ملا - آخر کی چند سطروں میں اس عہد کے ادب کا ذکر کر کے جوڑ ملانے کی کوشش کی گئی ہے —

اردو زبان کے رسالوں میں معیار بہت بلند پایہ اور نہایت قابل قدر ماہانہ ہے - فاضل اڈیٹر نے اس کی ترتیب میں بہت محنت کی ہے اور بڑے سلیقے اور خوبی سے مرتب کیا ہے - ہماری دلی تمنا ہے کہ یہ پھولے پھلے اور جو مقصد اس نے پیش نظر رکھا ہے اس پر کامیابی کے ساتھ قایم رہے - ہمارے رسالوں میں یہ قابل قدر اضافہ ہے —

سہیل -

(سالانہ- اڈیٹر رشید احمد صدیقی صاحب- علی گڑہ- قیمت دو روپے آٹھ آنے)

انجمن اردوئے معلیٰ مسلم یونیورسٹی کا یہ علمی اور ادبی رسالہ پہلے پہل سنہ ۱۹۲۷ ع میں شایع ہوا تھا - چند ہی نمبر نکلنے پائے تھے کہ

بند ہو گیا- اب آٹھ سال بعد پھر زندہ ہوا ہے - پہلے سہ ماہی تھا اب سالانہ ہے - یہ بڑی غنیمت ہے بشرطیکہ مسلسل جاری رہے —

رسالہ اُسی شان سے نکلا ہے جیسے پہلے کبھی نکلتا تھا بلکہ بعض امور میں پہلے سے بڑھ کر ہے - لکھائی چھپائی بڑی اچھی ہے لیکن ایسی اعلیٰ درجہ کی نہیں جس کی توقع مسلم یونیورسٹی پریس سے کی جاتی تھی - بعض مضامین نہایت قابل قدر ہیں - خصوصاً ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب کا مضمون " مصوری کے میلانات نو " - اگرچہ یہ کسی قدر تشنہ اور زیادہ تفصیل اور توضیح کا محتاج ہے لیکن بڑی خوبی سے لکھا ہے - ایک مضمون قومی ادب اور ہندی سمیلن پر ہے جو ڈاکٹر محمد اشرف صاحب کے فکر کا نتیجہ ہے - اس میں ڈاکٹر صاحب نے یہ بحث کی ہے کہ قومی ادب کیونکر بنتا ہے ' اور بھارت ساہتیا پرشد جن اصول پر قائم کی گئی ہے اس کی کیا حقیقت ہے ' اس پر اُن کی تنقید مطالعے کے قابل ہے - ہندی سمیلن اور بھارت ساہتیا پرشد کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے جس اندیشے کا اظہار کیا ہے اس کی حقیقت ناگپور کے اجلاس میں آشکار ہو گئی اور ان کا خیال بالکل صحیح نکلا - اس کی کیفیت ہم نے اسی رسالے میں کسی دوسری جگہ لکھی ہے - " بہار اور اردو شاعری " پر معین الدین صاحب متعلم بی - اے (آنرز) کا مضمون بڑی بہت اچھا ہے - صدیقی صاحب نے یہ بڑا کام کیا کہ سجاد انصاری مرحوم کے ڈرامے " روز جزا " کو گمنامی سے بچا لیا - اگرچہ یہ نا مکمل ہے تاہم ایک ایسے انشاپرداز کی یادگار ہے جو اگر بے وقت نہ مرجاتا تو اردو ادب میں نام پیدا کرتا - معلوم ہوتا ہے کہ اسے لکھتے وقت برنارڈ شاو کا ڈراما (Man and Superman) ان کے خیال پر کارفرما تھا - " باب تنقید " میں

آل احمد سرور صاحب نے جو معاون مرتب ہیں سال حال کی اہم کتابوں پر تبصرہ کیا ہے - اگر چہ اس کا دائرہ انہوں نے کسی قدر محدود کر دیا ہے تاہم یہ اچھا اضافہ ہے اور ترتیب و تنقید میں سلیقے اور معقولیت سے کام لیا ہے - دوسرا جدید اضافہ تصویروں کا ہے - ان کے متعلق فاضل مرتب کی یہ رائے کہ "چالیس سال یا اس سے کم عمر والوں کے ذوق کی تشفی نہ ہو سکے تو ہم کو معذور سمجھا جائے" کچھ زیادہ معقول نہیں معلوم ہوتی - کیونکہ تصاویر جس نوعیت کی ہیں اُن کی قدر نوجوان ہی کر سکتے ہیں - اس لیے کہ بہ نسبت سن رسیدہ لوگوں کے آج کل کے نوجوان تعلیم یافتہ مصوری کے جدید میلان اور مصوری کے نکات کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں - خواجہ غلام السیدین کا مضمون "تعلیم اور اسلامی معاشرت" اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کا "حالی ایک محب وطن کی حیثیت سے" نئے نہیں ہیں - یہ عام جلسوں میں پڑھے جا چکے ہیں - سب سے آخر میں فاضل مرتب کا مضمون "کوبز" ہے جس میں اس کے سوا کوئی خوبی نہیں کہ جگہ جگہ کوب ہی کوب ہے - نہ ظرافت میں کوئی دل کشی ہے نہ مضمون میں کوئی دلآویزی —

قابل ایڈیٹر نے سہیل کے ماضی کا ذکر کرتے ہوئے شذرات میں یہ خیال ظاہر کیا ہے: "ہمارے لیے یہ اکتفا کرتا ہے کہ ہم سے جو کچھ ہو سکا کرتے رہے ، جب کچھ نہ ہو سکا تو خاموش رہے" - اس کے بعد اس سوال کے جواب میں کہ علی گڑھ اس وقت اردو کی خدمت کس طور پر کر رہا ہے یہ فرماتے ہیں: "ہم سے جو کچھ ہو سکتا ہے ہم خاموشی کے ساتھ کرتے ہیں" - فاضل اڈیٹر کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ جواب ہر کاہل و بیکار آدمی دے سکتا ہے - اس قسم کے چلتے مبہم الفاظ کہہ

دینا کافی نہیں - اصل سوال یہ ہے کہ جس کام کی آپ سے توقع کی جاتی تھی وہ آپ نے انجام دیا یا نہیں - اردو ادب کے دور جدید میں علی گڑھ نے اردو زبان و ادب کے فروغ دینے اور بڑھانے میں جو عظیم الشان کام کیا ہے اس سے ایک زمانہ واقف ہے - مسلم یونیورسٹی اگر اُسے ترقی نہ دے سکی تو کم سے کم اُسے برقرار رکھنا اس کا فرض تھا - جس صورت میں کہ مسلم یونیورسٹی کی "انجمن اردوے معلیٰ" ایک سہ ماہی رسالہ بھی چند ماہ جاری نہ رکھ سکی اور اب آٹھ سال کے بعد اُسے سالانہ بنا کر نکالا ہے ' بے نیازی سے یہ فرمانا کہ "ہم سے جو کچھ ہو سکا کرتے رہے ' جب کچھ نہ ہوسکا تو خاموش رہے ' ایک مضحکہ خیز بات ہے - اس کے بعد کسی قدر فخر سے یہ بیان کرنا کہ پچھلے سال یونیورسٹی نے اردو میں ایم - اے اور آنرز کی جماعتیں کھول دی ہیں ' ایک قسم کی ستم ظریفی معلوم ہوتی ہے - انہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ مدراس یونیورسٹی میں تقریباً پچاس سال سے اُردو کی تعلیم جاری ہے - یہ وہ صوبہ ہے جو دراوڑی زبانوں کا بابل ہے - اور اس یونیورسٹی میں ہر طالب علم انٹرمیڈیٹ ' بی - اے ' ایم - اے کے درجوں میں اردو پڑھ سکتا اور اردو میں امتحان دے سکتا ہے - اس کے علاوہ منشی فاضل' مولوی فاضل' افضل العلما کے امتحانات میں اُردو کا مضمون لازمی ہے - نیز ادیب فاضل کے درجے میں اردو کا بہت وسیع نصاب رکھا گیا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے (جسے پڑھ کر کارفرمایان مسلم یونیورسٹی کو شرمانا چاہیے) کہ وہاں کئی سال سے اُردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بھی قائم ہو چکا ہے اور ادبی تحقیق کا کام ہو رہا ہے - اس کے مقابلے میں مسلم یونیورسٹی کا یہ کارنامہ کہ اس نے پچھلے سال سے ایم - اے اور آنرز کی جماعتیں بھی کھول دی ہیں کیا

وقعت رکھہ سکتا ہے - مسلم یونیورسٹی اگر اور کچھہ نہیں کر سکتی تو اتنا ہی کرے کہ صوبۂ متحدہ میں اردو زبان کا سب سے بڑا مرکز علی گڈہ ہو اور اپنی گزشتہ عظمت اور وقار پھر قائم کرے۔ اور اگر وہ اتنا بھی نہیں کر سکتی تو اس صوبۂ غیر متحدہ میں اُردو کا خدا حافظ ہے -

— * —

سالنامے

ادبی دنیا - (سالنامہ سنہ ۳۶ ء)

(مرتبۂ منصور احمد صاحب -

کاغذ کتابت و طباعت عمدہ - صفحات ۲۰۹ - قیمت سوا روپیہ - سالانہ چندہ پانچ روپے - ملنے کا پتا : منیجر ادبی دنیا ' کامرشل بلڈنگ ' مال لاہور)-

ادبی دنیا کا شمار اُردو زبان کے موقر اور معیاری ماہ ناموں میں ہوتا ہے۔ اس کی ترتیب میں جس متانت ' سلیقہ مندی اور ذوق سلیم سے کام لیا جاتا ہے وہ اردو صحافت میں قابل تقلید ہے۔ جب سے اس کی ادارت منصور احمد صاحب کے سپرد ہوئی ہے ' اس نے نمایاں ترقی کی ہے —

پیش نظر سالنامہ بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے - اس میں تقریباً ہر مذاق کے ناظر کے لیے اہتمام کیا گیا ہے —

افسانوں میں گویٹے کا ایک ترجمہ ایڈیٹر کا کیا ہوا ہے اور بہت اچھا ہے - باقی میں سے اکثر ہندو اور ہندوستانی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں - ان کے حسن و قبح کو نظر انداز کر کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ

رجحان قابل ستایش ہے - کیونکہ یہ افسانے مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں ان سے فی الحال یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ ہندو تمدن اور معاشرت کی عکاسی صحیح طور پر کرسکیں گے —

ڈراموں میں 'سوسائٹی کے اجارہ دار' اور میٹرلنک کا ایک ترجمہ خوب ہیں - شاہد صاحب کو میٹرلنک کی ترجمانی کا خاص سلیقہ ہے —

علمی مضامین میں 'تاریخ اردو کا مطالعہ' 'اردو ادبیات پر غالب کا اثر' اور 'شاعری پر مقامی خصوصیات کا اثر' خاص طور پر قابل ذکر ہیں - مسولینی سے متعلق دو مضمون ہیں - شاید مرتب کو اس شخص سے خاص شغف ہے کیوں کہ ہر دوسرے تیسرے مہینے اس کا کچھ نہ کچھ چرچا رہتا ہے —

ادبی مضامین میں عظیم بیگ صاحب چغتائی کا مضمون دلچسپ ہے جس میں انھوں نے اپنے مخصوص موضوع یعنی دیسی میاں بیوی کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالی ہے —

نثر کے مقابلے میں نظم کا پلہ ہلکا ہے اور یہ اچھا بھی ہے - تصویریں کئی ہیں مگر صاف نہیں چھپی ہیں —

بحیثیت مجموعی سالنامہ بہت کامیاب ہے — (م)

معلومات ادبیہ

اس نمبر سے رسالۂ اردو میں یہ مستقل عنوان شریک کیا جا رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ دوسری زبانوں کی اہم ادبی معلومات کو یک جا کر دیا جائے نیز اردو کے ناظروں کو بیرونجات کی مفید ادبی تحریکوں سے باخبر رکھا جائے —

فہرست:

۱	یادگار غالب	از پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب 'کیفی'
۲	انجمن ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ	مرسلۂ سکریٹری انجمن ھذا۔
۳	انجمن بین القومی مصنفین برائے محافظت تہذیب	ادارہ۔
۴	ہمارے دیہاتی گیت	ادارہ۔
۵	ہندوستانی اکیڈمی	منشی پریم چند
۶	ادب ہند کے مسائل	

یادگار غالب

از

(جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی)

انجمن یادگار غالب

پچھلے سال جاڑوں میں جب راقم دہلی میں تھا تو حسب معمول زیارت کے لیے مزار غالب پر بھی گیا۔ وہاں کوئی نئی بات سوا تازہ کوڑے کرکٹ کے نہ تھی، جس کی ذمہ دار خدا کی ہوا اور اہل وطن کی سرد مہری تھی۔ مزار کی کس مپرسی کی حالت اپنی بے زبانی میں چیخ رہی تھی:

"تم کو بے مہریٔ یاران وطن یاد نہیں"۔

دل نے کہا اس سے تو بہتر تھا کہ اگر ہمیں توفیق نہیں تو اللہ تعالیٰ مرزا کی یہ دعا قبول کرتا:۔

"نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا"۔

میں چونکہ قنوطیت اور قطع عمل کے خلاف سخت متعصب ہوں، دہلی آکر چند احباب سے مشورہ کیا اور ۲۷ جنوری ۱۹۲۵ء کو دو سو کے قریب احباب و حضرات کو غریب خانہ پر مدعو کیا۔ گفت و شنود کے بعد ایک انجمن بہ نام "انجمن یادگار غالب" یا "غالب میموریل سوسائٹی" قائم ہوئی۔ مندرجۂ ذیل حضرات عہدہ دار منتخب ہوئے:

معاون صدر:۔ حضرت خواجہ حسن نظامی اور لالہ دیش بندھو ڈاکٹر کچلو

روز نامہ تیج -

سکریٹری :- میر محمد حسین صاحب -

معاون سکریٹری . - مسٹر آغا محمد اشرف - ایم - اے - اور مولوی عشرت رحمانی مدیر نگارستان -

فنانشل سکریٹری :- حکیم حاجی عبدالصمد صاحب - مالک ہمدرد دواخانہ-

راقم السطور کو صدر قرار دیا گیا -

ایک مجلس عاملہ بھی انتخاب کی گئی جس کے اراکین حسب ذیل منتخب ہوئے :-

مسٹر آصف علی ایم - اے - پنڈت امر ناتھ صاحب 'ساحر' - پروفیسر اکبر حیدری - پنڈت آر این - ہاکسر - ڈاکٹر سعید احمد اور ملا محمد واحدی میونسپل کمشنر دھلی -

انجمن کے مقاصد میں مزار غالب کو مرحوم کے شایان شان بنانا ' ایک کتب خانہ قایم کرنا جس میں غالب کی تصانیف اور غالبی لٹریچر کو خاص جگہ ملے ' ایک ھال بنانا اور یادگاری مشاعرے کرنا وغیرہ شامل ھیں-

ایک قطعہ اراضی جو مزار مبارک سے ملحق چونسٹھ کھمبے کے پھاٹک سے ملا ہوا اور افتادہ تھا صاحب فنانشل سکرٹری حکیم عبدالصمد صاحب نے اپنی فیاض ملتی سے انجمن کی نذر کے لیے خرید لیا - مزار کے صحن میں ایک حویلی کی دیوار ایک بدنما کھانچا ڈالتی ہے - زمین کی وہ دھجی حویلی میں سے الگ کر کے مزار کی زمین میں شامل کرا دینے کا حتمی وعدہ (منظوری کیجیے) حکیم محمد احمد صاحب نے فرمایا - کیوں کہ وہ حویلی موصوف کے ایک بزرگ کی ملکیت ہے -

الغا کچھہ ہوچکا تھا اور ہم اس بڑے کام کے سر انجام کے لیے ملک

کے سامنے جھولی پسارے التجا کرنے کو تھے کہ بعض بیرونی موانع پیش آگئے جن کی تفصیل خواجہ حسن نظامی صاحب اپنے اخبار منادی میں وقتاً فوقتاً دیتے رہے ہیں - اس وقت ان امور کی تفصیل ملتوی کی جاتی ہے —

یادگاری مشاعرہ

کم و بیش ایک مہینے پہلے انجمن کے جلسے میں یہ تجویز ہوئی کہ ۱۵ فروری مرزا غالب کے وصال کی تاریخ ہے اس روز کوئی ادبی تقریب مرتب کی جائے - خیال یہ تھا کہ مرحوم کی زندگی اور ادبی عظمت سے متعلق کچھ تحریری یا زبانی ہوں - لیکن زمانے کی حالت اور عام مذاق کو دیکھ کر یہ قرار پایا کہ تاریخ مذکور کو ایک مشاعرہ کیا جائے - اردو اور فارسی مصرعۂ طرح غالب کے دیوانوں سے لیے گئے اور نظموں کے لیے غالب موضوع رکھ گیا - یہ قرار داد اس لیے منظور ہوئی کہ اس نئی تحریک کو ہر دل عزیز اور عام پسند کیا جائے - اور یادگار غالب سے متعلق عامۃ الناس میں بیداری اور جذبۂ عمل پیدا کیا جائے - ہم اینگلو عربک دھلی کے فاضل پرنسپل کے تہہ دل سے ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنا فراخ ہال اور سامان نشست نہایت مہربانی سے اس کام کے لیے ہم کو دیا اور کالج کی اورنٹیل سوسائٹی ہمارے بے انتہا شکریے کی مستحق ہے جس کے اراکین نے جلسے کے انصرام میں کھلے دل سے ہماری امداد کی اور ہمارے انتھک سکریٹری میر محمد حسین صاحب کا کام بہت آسان ہوگیا —

مشاعرہ اور مناظمہ ۱۵ فروری کی شب کو شروع ہوکر ضروری درمیانی وقفوں کے ساتھ ۱۶ کی شب کو ختم ہوا - پھر بھی بہت سے شاعر پڑھنے سے رہ گئے - مشاعرے کا افتتاح سر گرجا شنکر سکریٹری اعظم محکمۂ تعلیمات

حکومت ہند کی صدارت میں ہوا - دوسرے روز پہلا اجلاس آنریبل سید عشرت حسین صاحب سنیر کونسل آف اسٹیٹ کی صدارت میں ہوا -
باقی نشستوں کے صدر پنڈت امر ناتھ صاحب ساحر دہلوی تھے -

ان تقریبوں میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ ہندو اور مسلمان خواتین نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی - اس کی تفصیل یہ ہے کہ بعض خواتین تو صدر چبوترے پر ہال میں رونق افروز تھیں اور بہت سی چبوترے کے پاس کے کمرے میں تھیں جہاں پردے کا پورا انتظام تھا جس کے انتظام میں بیگم ڈاکٹر ظہیرالدین محمود معلمہ آیورویدک یونانی کالج دہلی نے بہت سرگرمی سے کام کیا اور ہم سب کو ممنون فرمایا - اس کمرے میں ایک لوڈ سپیکر لگایا گیا تھا - ایک لوڈ سپیکر ہال میں نصب کیا گیا تھا اور ایک ایک لوڈ سپیکر ہال کے باہر دونوں طرف لگائے گئے تھے تاکہ شاعروں کا کلام ہر جگہ خوب سنا جاسکے - لوڈ سپیکروں نے خوب کام دیا جس کے لیے ایسٹرن ریڈیو اینڈ جنرل سپلائی کمپنی کناٹ پیلس، نئی دلی ہمارے شکریے کی مستحق ہے - سامعین کی تعداد کسی وقت بھی تین ہزار سے کم نہیں رہی - شعرا کا تو کیا ذکر ہے - عمایدِ شہر کے سوا مرکزی حکومت کے اعلیٰ افسر اکثر نشستوں میں شرکت کرتے رہے، معزز افغان کونسل بھی ایک اجلاس میں رونق افروز ہوئے -

اس میں شک نہیں کہ بعض حضرات طرح و موضوع مقررہ سے باہر بھی پڑھ گئے اور موسیقیانہ ترنم نے حاضرین کے نوجوان طبقے میں ایک دو دفعہ ہیجانی کیفیت بھی پیدا کردی لیکن سب امور کا لحاظ رکھتے ہوئے ہر خوش مذاق اور منصف مزاج تسلیم کرے گا کہ یہ یادگاری مشاعرہ نہایت کامیاب ہوا - نظمیں کم ہوئیں اور توقع بھی یہی تھی - لیکن

اکثر غزلیں ایسی ہوئیں کہ ہر سخن فہم مجبور کہہ اٹھتا کہ اب غزل کی صنف مٹ گئی - اس کے ساتھ ہی قدامت پرست حضرات یہ سمجھتے کہ غزل کے پھول ہوچکے۔ حضرت ساحر اور راقم نہایت مطمئن تھے کہ ہماری تیس سال کی کوششیں اب بار آور ہورہی ہیں اور خدا کا شکر بجا لاتے تھے --

میں یہ کہنا بھول گیا کہ اول نشست میں محترمہ صدر سر گرجا شنکر اور بلبل ہند شریمتی سروجنی نائیڈو کی تقریریں نہایت موثر اور پر جوش تھیں —

آخر میں یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی یہ فرمائے کہ اس تقریب میں فاضلانہ اور ٹھوس مضامین پڑھے جاتے اور غالب کا جو درجہ اردو ادب میں ہے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی تو ان حضرات سے یہ گزارش ہے کہ مرزا نے ۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ کو رحلت کی تھی جسے ۶۵ سال ہوئے - اب تک کوئی مہتم بالشان تحریک اس بزرگ کی رحلت کے دن کی یادگار میں کیوں نہیں ہوئی - لوگوں میں اس تحریک سے متعلق بیش از بیش بیداری پیدا کرنی تھی - اگلے سال انشاءاللہ میں کل ملک کو دعوت دوں گا کہ سب اپنی اپنی جگہ غالب ڈے منائیں - او اپنے اپنے مذاق اور مقامی حالات کے مطابق لائحۂ عمل قرار دیں —

اب یہ کہنا باقی ہے کہ خصوصی طور پر غالب کے متعلق تقریریں بھی ہوئیں جن کا انتظام دہلی کے براڈ کاسٹنگ اسٹیشن میں تھا - چنانچہ خواجہ حسن نظامی صاحب کی تقریر کا موضوع تھا " غالب کا قلمی چہرہ " - مسٹر آصف علی ایم - ایل - اے کی تقریر کا موضوع تھا " غالب کی نجی زندگی " - اور یاد رہے کہ یہ

دونوں حضرات ہماری انجمن سے تعلق خاص رکھتے ہیں - اسی سلسلے میں راقم نے جو تقریر کی اس کا موضوع تھا "اردو ادب میں غالب کا درجہ" - یہ تقریریں ۱۹ فروری کی شام کو ہوئیں اور کل ہندوستان میں نہایت اشتیاق سے سنی گئیں —

اک وقت تھا کہ باغ سخن تھا خزاں کی نذر — شعر اور ادب کا ملک میں داوار سرد تھا
اس وقت بھی تھے گرچہ ادیب اور نکتہ سنج — دور ان سے درد 'میر' تھا اور سوز 'درد' تھا
پر کوئی 'مصحفی' کی وہ 'سودا' کا وہ شکوہ — 'انشا' کی جدتوں کا بھی اب رنگ زرد تھا
'ذوق' اور 'مومن' 'آتش' و 'ناسخ' بھی تھے یہاں — ان کا سمند خامہ بھی کو دور گرد تھا
اک شخص خاص کی تھی ادب کو مگر تلاش — اس کو خیال حال نہ ماضی کا درد تھا
مستقبل اس کے سامنے تھا - تھی اسی کی فکر — آیندہ ہی کی دھن میں ادب رہ نورد تھا
تھے جو عوارض آنے کو اردو کے سامنے — بیٹے جو ان سے کوئی بھی ایسا نہ فرد تھا
'غالب' نے ایسے وقت میں پایا یہاں ظہور — جب دفتر زبان و سخن فرد فرد تھا
مورث تھا اس کا کون؟ نہیں اس سے کچھ غرض — افراسیاب شاہ تھا یا یزد جرد تھا
اس دور میں ہے اس پہ مگر سب کا اتفاق — میدان شعر کے لیے 'غالب' ہی مرد تھا
چھکے چھڑائے' پانسہ سخن کا پلٹ دیا — ایسا بساط نظم پہ وہ شاہ نرد تھا
ماضی سے کرنے کو تھا جو آیندہ عہد جنگ — سرکردگی کو اس کی وہ مہر نبرد تھا
صناعی اس نے کی ہے وہ تخئیل شعر میں — طرز قدیم جس کے تقابل میں گرد تھا
وہ اختراع طرز میں نثر اور نظم کی — بے شک وحید عصر تھا بے مثل و فرد تھا
اسلوب خاص' طبع میں جدت' قلم میں زور — تھا اس کے سر میں جوش بھرا دل میں درد تھا
تزئین نقش شعر ہوئی اس کے کلک سے — ہر مرکز اس کا ایک خط لاجورد تھا
اس کی شمیم سے ہے معطر مشام روح — کیا سر سبد ریاض بلاغت کا ورد تھا
ہمنام تھا جو شیر خدا کا اسی لیے — غالب ادب کے معرکے میں شیر مرد تھا

مغلوب کرتے کہا اسے آلام دنیوی　　وہ دشت و راغ میں بھی خیاباں نورد تھا
صوفی تھا اعتدال سے ہٹتا مزاج کہیں　　یکساں اسے زمانے کا یہ گرم و سرد تھا

' کوئی اسی کے مصرع کو تو فاتحہ میں پڑھ
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا - '

انجمن ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ

" ہمارے ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں - پستی اور رجعت پسندی کو اگرچہ موت کا پروانہ مل چکا ہے لیکن وہ ابھی تک بے بس اور معدوم نہیں ہوئی ہے - نت نئے روپ بدل کر یہ مہلک زہر ہمارے تمدن کے ہر شعبے میں سرایت کرتا جا رہا ہے —

اس لیے ہندوستانی مصنفوں کا فرض ہے کہ ملک میں جو نئے ترقی پذیر رجحانات ابھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشو و نما میں پورا حصہ لیں —

ہندوستانی ادب کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ زندگی کی تلخ اور حقیقی کیفیتوں سے جی چرانا چاہتا ہے - حقیقت اور اصلیت سے بھاگ کر ہمارے ادب نے بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی کی آڑ میں پناہ لی ہے - یہی وجہ ہے کہ اس کے عناصر و قویٰ مضمحل ہوگئے ہیں - اس کا پتا اس سے چلتا ہے کہ ہمارے ادب میں عقلیت مشکل سے پائی جاتی ہے -

ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جد و جہد کا ترجمان بنا کر اس روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس

کے لیے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے —

ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین روایتوں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، اس لیے زندگی کے جس شعبے میں رد عمل کے آثار پائیں گے انہیں اٹھا کریں گے۔ ہم اس انجمن کے ذریعے سے ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب و تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی، اور غلامی کے مسائل ہیں —

ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی، اور توہم پرستی کی طرف لے جا رہے ہیں —

ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں، تغیر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں —

انجمن کے مقاصد یہ ہوں گے: —

۱ — تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشورتی جلسے منعقد کرکے، اور لٹریچر شائع کرکے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا —

۲ — ترقی پذیر مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جد و جہد کرکے اہل ملک کی آزادی کی کوشش کرنا —

۳ — ترقی پذیر مصنفین کی مدد کرنا —

۴ — آزادیٔ رائے اور آزادیٔ خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا —

انجمن بین القومی مصنفین برائے محافظت تہذیب

International congress of writers for defence of culture

جون سنہ ۱۹۳۵ع میں پیرس میں متذکرۂ بالا انجمن کا ایک اجلاس ہوا جس میں دنیا بھر کے ادیبوں کا زبردست اجتماع ہوا تھا۔ اس کانفرنس نے جن مسائل پر غور کیا ان کی فہرست یہاں درج کی جاتی ہے تاکہ ہم اندازہ لگا سکیں کہ دوسرے ملکوں کے ادبی مسائل کس قدر وسیع ہیں۔

۱ - میراث تہذیب۔ — Cultural Heritage

روایت اور ایجاد۔ — Tradition and invention

اقدار تہذیب کی بازیافت اور محافظت۔ — Recovery, and Protection of Cultural values

تہذیب کا مستقبل۔ — Future of Culture

۲ - انسانیت۔ — Humanism

انسانیت اور قومیت۔ — Humanism and Nationality

انسانیت اور فرد۔ — Humanism and Individual

انسانیت مزدوراں۔ — Proletarian humanism

انسان اور مشین۔ — Man and Machine

انسان اور فرصت۔ — Man and leisure

مصنف اور مزدور۔ — Writer and the worker.

۳ - قوم اور تہذیب۔ — Nation and culture.

قومی تہذیبوں کے باھمی تعلقات — Relations among national Cultures.

قومی تہذیبیں اور انسانیت۔ — National cultures and humanism

قومی تہذیبیں اور — National cultures and Social classes.

سماجی طبقات -

طبقہ اور تہذیب- Class and Culture.

قومی اقلیتوں کے Literary expression of national minorities

ادبی اسالیب -

قوم پرستی قومی Nationalism as opposed to national realities

حقیقتوں کی ضد کے بطور —

جنگ اور تہذیب - War and culture

نو آبادیوں کا ادب - Literature of Colonial people.

عامی اور عالم - Broad public an l the ' initiated. ,

بکھری ہوئی شکلیں اور پیش رو - Isolated figures and precursors.

تراجم - Translations

۴ - فرد- The individual.

Relation between writer and Society – opposition or agreement ?

سماج کی حمایت یا مخالفت کی روشنی میں مصنف اور

سماج کا رشتہ —

فرد اپنے طبقے کے Individual as an expression of his class.

ترجمان کے بطور -

۵ - عظمت خیال - Dignity of thought.

فن کاروں کی آزادی کی نوعیت - Nature of the liberty of the artists.

آزادیٔ رائے — Liberty of expression

احتساب کے بالواسطہ یا Direct and indirect Forms of censorship.

بلا واسطہ طریقے —

جلا وطن مصنفین — Writers in exile.

غیر قانونی ادب — Illegal literature.

۶ - سماج میں مصنف کا منصب — Writer's role in Society.

عوام سے اس کے تعلقات — His relations with public.

سوویٹ روس کے ادب کا سبق — Lessons of Soviet literature

ادب اور مزدور — Literature and proletariat.

شباب اور مصنف — Writer and youth.

ادب کی تنقیدی اہمیت — Critical value of literature.

ادب کی حقیقی اہمیت — Positive value of literature.

ادب — سماج کے آئینہ اور تبصرہ کی حیثیت سے — Literature as a mirror and criticism of Socity

۷ - ادبی تخلیق — Literary Creation.

ادبی اسالیب پر سماجی تبدیلیوں کے اثرات — Influence of Social change on literary forms.

ادب میں تسلسل اور عدم تسلسل کی قیمت — Value of continuity and discontinuity.

ادبی سرگرمی کی مختلف صورتیں — Different forms of literary activity.

ادب کے سماجی فرایض — Social role of literature.

کرداروں کی تخلیق اور ان کی نقل — Imitation or creation of types.

اسلوب و بیان کے جدید صنعتی ذرائع — New technical means of expression.

۸ - مصنفین اور محافظت تہذیب — Writers & Defence of culture.

ان کی سرگرمیوں میں یک جہتی اور یک رنگی پیدا
کرنے کی صورت —

ہمارے دیہاتی گیت

کچھہ عرصے سے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تحریکیں دیہاتوں اور کسانوں کی طرف توجہ کرنے لگی ہیں - چنانچہ ہمارا علم پرور طبقہ بھی اب کسانوں کی زندگی سے مانوس ہونے کی کوشش کر رہا ہے - اس سرگرمی نے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں - ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر صوبے کے دیہاتی گیتوں کو جمع کیا جا رہا ہے - اس سلسلے میں یہ معلوم کرنا باعث دلچسپی ہوگا کہ اب تک ہندوستان کے دیہاتی گیتوں سے متعلق کتنی کتابیں شایع ہو چکی ہیں - نیچے ان کی فہرست چھاپی جاتی ہے :

بنگال :

۱ - Eastern Bengal Ballads مرتبۂ ڈاکٹر دینیش چندر سین مطبوعۂ کلکتہ یونیورسٹی —

۲ - کھوکو مونیر چھڑا (لوریاں) - مرتبۂ جوگیندر ناتھہ سرکار -

۳ - بنگلار برت — مرتبۂ ڈاکٹر اونیندر ناتھہ ٹھاکور -

۴ - ہارا مونی — مرتبۂ محمد منصور الدین -

۵ - بانگلار باؤل — مرتبۂ جسیم الدین -

گجرات :

۱ - رڑھیالی رات (تین جلدوں میں) مرتبۂ جھیور چندر میگھانی -

۲ - چندڑی (دو حصوں میں) مرتبۂ جھیور چندر میگھانی

۳ - لوک گیت مرتبۂ رنجیت رائے مہتا —

پنجاب :

۱ - Legends of the Punjab (تین جلدوں میں) — مرتبہ سر آر - سی - ٹیمپل

۲ - پنجابی گیت — مرتبہ سنت رام

۳ - پنجاب دے گیت (اردو رسم الخط) — مرتبہ پنڈت رام سرن ایڈوکیٹ

یو - پی اور بہار :

کویتا کومودی (ہندی) — مرتبہ پنڈت رام نریش ترپاٹھی

راج استھان :

۱ - مارواڑ کے گرام گیت مرتبہ جگدیش سنگھ گہلوت —

۲ - راج استھان را دوھا مرتبہ سروتم داس سوامی —

صوبۂ سرحد :

Chants de Afghans (فرینچ) مرتبۂ پروفیسر دارمیٹر —

بلوچستان :

Popular Poetry of the Baloches — مرتبۂ لونگ ورتھ ڈیمز —

منڈا علاقہ :

Mundas & their Country — مرتبۂ رائے بہادر شرت چندر رائے

دکن :

Folk Songs of Southern India مرتبۂ سی - آئی - گوور

ہندستانی اکیڈمی کا اجلاس

منشی پریم چند ہندی رسالہ 'ہنس' (فروری سنہ ۳۶ ع) کے شذرات میں رقم طراز ہیں :

" چار سال کے بعد گزشتہ جنوری میں ہندستانی اکیڈمی نے

اپنا سالانہ جلسہ الہ آباد میں کیا - اس کے صدر 'ہندوستان ریویو' کے مشہور ایڈیٹر سچدانند سنہا تھے - ادیبوں کا اچھا خاصا اجتماع تھا - انہیں اردو اور ہندی کے حصوں میں منقسم کر دیا گیا تھا - دونوں شعبوں میں کئی پر مغز مقالے پڑھے گئے اور خوب داد تحقیق دی گئی - لیکن اردو اور ہندی کے اجلاس الگ الگ ہونے کی وجہ سے سامعین کو ان سب کے سننے کے موقع نہ ملا - مہمانوں کے ایک جگہ رہنے کا انتظام نہ تھا ورنہ انہیں تبادلۂ خیالات کا وقت ملتا اور اس اجلاس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی - شام ہوتے ہی لوگ اپنے اپنے ٹھکانے سدھارتے تھے اور دوسرے دن کانفرنس کی کارروائی شروع ہونے کی ساعت پر دوبارہ جمع ہوتے تھے - اردو اور ہندی کے شعبے الگ کرنے سے دونوں زبانوں کا اختلاف زیادہ بڑھ گیا - اگر دونوں ایک دوسرے کی سن لیں تو کیا برائی ہو یوں انہیں اختیار ہے کہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چنیں - اس اجلاس کی کل تقریروں اور مقالوں میں ہمیں اردو کانفرنس کے صدر مولوی عبدالحق کا خطبہ سب سے زیادہ پر مغز معلوم ہوا - اس میں ولولہ اور جوش تھا اور اعتماد انگیزی تھی - ان کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ زبان و ادب کو ترقی دینے کے لیے جتنی بھی کوششیں کی گئیں یا کی جا رہی ہیں ان میں ذرہ بھی یگانگت نہیں ہے اور اس افراتفری کی وجہ سے محنت، دولت اور وقت کا بہت نقصان ہوتا ہے "—

ادب ہند کے مسائل

'بھارتیہ ساہتیہ پرشد' (جس کے متعلق ایک مضمون اسی نمبر میں شایع ہورہا ہے) کے اجلاس کے موقعہ پر یہ مسئلہ بھی زیر غور تھا کہ ادب کے مقاصد کا کوئی تعین ہوسکتا ہے یا نہیں - حسب ذیل بیان مسٹر اختر حسین رائے پوری نے ایک تجویز کی وضاحت کے لیے تیار کیا تھا جس کی حمایت پنڈت جواہر لال نہرو ' آچاریہ نریندر دیو (رکن کانگریس ورکنگ کمیٹی) منشی پریم چند اور مولوی عبدالحق کر رہے تھے - دوسری جماعت کی مرضی کا پاس کرتے ہوئے یہ تجویز پیش نہ کی گئی اور بیان ان صاحبوں کی طرف سے اشاعت کی غرض سے اخباروں میں بھیج دیا گیا - وہ یہاں درج کیا جاتا ہے ۔

" ہمارے دیس میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ مختلف زبانوں کے ادیب باہمی تعاون کی غرض سے ایک جگہ جمع ہوئے ہیں - سوال یہ ہے کہ اس تعاون کی بنیاد کیا ہو - کئی تجویزیں اس جلسہ میں پیش ہوئی ہیں لیکن ایک بہت اہم مسئلہ نظر انداز کر دیا گیا ہے جس پر سب سے پہلے غور ہونا چاہیے تھا - ہم نے یہ تو طے کرلیا کہ ادب کا قالب کیا ہو مگر یہ نہیں بتایا کہ اس کے قلب کا روپ رنگ کیا ہو - پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ کیا کہنا ہے اور کن سے کہنا ہے - 'کیسے کہنا ہے' کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے ـــ

ہمارا خیال ہے کہ ادب کے مسائل کو زندگی کے دوسرے مسائل سے علحدہ نہیں کیا جا سکتا - زندگی مکمل اکائی ہے - اسے ادب' سیاست' فلسفہ وغیرہ کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا - ادب زندگی کا آئینہ

ہے - یہی نہیں بلکہ وہ کاروان حیات کا رہبر ہے - اسے محض زندگی کی ہمرکابی ہی نہیں کرنا ہے بلکہ اس کی رہنمائی بھی کرنا ہے —

ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری زندگی کدھر جارہی ہے اور اسے کدھر جانا چاہیے - ادیب انسان بھی ہے اور اسے سماج کی ترقی کے لیے اتنا تو کرنا ہی ہے جو ہر انسان کا فرض ہے —

انسانیت کے نام پر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا آج جب ترقی و پستی کی طاقتوں میں فیصلہ کن جنگ شروع ہو چکی ہے ادب اپنے کو غیر جانب دار رکھہ سکتا ہے ؟ کیا 'حسن' 'آرٹ' وغیرہ کی نقاب پہن کر وہ کاروان حیات سے راہ فرار اختیار کر سکتا ہے ؟ کیا وہ 'واقعہ نگاری' کی فصیل پر بیٹھہ کر انقلاب و رجعت کی طاقتوں کی تصویر لے سکتا ہے ؟

احساس ہر قسم کے آرٹ کی جان ہے - تو پھر غریبوں اور مظلوموں کا حال زار ہمیں بےحس کیوں کر رکھہ سکتا ہے ؟ اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے بیکاری ' افلاس اور ظلم کے داغ دھوئے جائیں ' تو حاشا یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو ؛ وہ کیا کہے ' کن سے کہے اور کس طریقہ سے کہے -

چنانچہ ہندوستانی ادیبوں سے ہماری یہ توقع واجب اور جائز ہے کہ وہ یہ ثابت کر دکھائیں گے کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں - اور زندگی مسلسل تغیر و تبدل کی کہانی ہے - زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے ' اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے اور جملہ بنی نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے -

ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ملک کا ادب زندگی سے اپنے کو وابستہ کرے گا اور زندگی کے ارتقا کا علم بردار ہوگا - "

اردو

جلد ۱۷ | جولائی سنہ ۱۹۳۷ ع | حصہ ۶۷

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

ہے - یہی
ہم رکابی
ہم
کدھر جا
اتنا تو ک
از
طاقتوں
رکھنے سکے
سے راہ ف
کر انقلا
ا
حال زا
مسئلہ یہ
جائیں
جانب
چ
وہ یہ ا
اور زند
ہے چ
بلی نو
د
کرے گا

اردو

فہرستِ مضامین

بابتہ جولائی سنہ ۱۹۳۷ ع

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	سر سید راس مسعود مرحوم	ایڈیٹر	
۲	ہندوستان کے درویشوں کی بولیاں اور اردو	جناب الحاج محمد اجمل خاں صاحب ایم-اے محقق اسلامیات شانتی نکیتن (بنگال)	۴۸۷
۳	روسی ڈراما	جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)	۵۲۲
۴	سال وفات جرات	جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا (پٹنہ)	۵۵۷
۵	فارسی غزل	جناب فضل احمد کریم صاحب فضلی، بی لٹ (آکسفورڈ) آئی - سی - ایس (بنگال)	۵۶۱
۶	سندھ کے اردو شاعر	جناب افسر صدیقی امروہی صاحب	۵۸۸
۷	رپوٹ انجمن ترقی اردو راجپوتانہ	مولانا محمد بہلول خاں صاحب "دانا"	۶۰۴
۸	ادبی معلومات	مرتبۂ "ناخدا"	۶۱۳
۹	افکار و واقعات	ایڈیٹر	۶۵۳
۱۰	تبصرے	ایڈیٹر اور دیگر حضرات	۶۸۵
۱۱	اعتذار	منیجر	۷۲۷
۱۲	اشتہارات	مشتہرین	۷۲۸

ہے - یہی

ہم رکابی

ہم

کدھر چ

اٹھا تو

ا

طاقتور

رکھنے سے

سے راہ

کر انق

حال

مسئلہ

*چاہیے

جانہ

وہ یہ

اور

ہے

بلی

کو.

سر سید راس مسعود مرحوم

سر سید راس مسعود (نواب مسعود جنگ) کے بے وقت اور ناگہانی انتقال سے جو نقصان عظیم ملک و قوم کو اور خاص کر انجمن ترقیٔ اردو کو پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے —

مرحوم بوجہ اپنی شرافت نفس، عالی ظرفی، فیض رسانی اور ذوق علم کے ہماری قوم میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے - انجمن ترقیٔ اردو کی بڑی بڑی امیدیں ان سے وابستہ تھیں اور مرحوم نے حتمی طور پر یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ کچھ عرصے کے بعد صرف انجمن ترقیٔ اردو ہی کا کام کریں گے - اور حقیقت یہ ہے کہ ان سے بڑھ کر کوئی شخص اس کام کو نہیں کر سکتا تھا - ان کی شخصیت اور وجاہت، ان کی سحر بیانی اور ان کے اخلاق ہر شخص کو اپنا گرویدہ کر لیتے تھے - وہ جہاں جاتے کبھی خالی ہاتھ نہیں آتے تھے —

انجمن کی مالی حالت کے درست کرنے میں انہوں نے بڑی مدد دی اور آیندہ اس سے زیادہ توقعات تھیں - لیکن افسوس! صد افسوس! کہ ان کی بے وقت موت سے ہماری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا —

مرحوم کی یادگار میں اردو کا آیندہ نمبر مسعود نمبر کے نام سے شایع ہوگا جس میں مرحوم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ہوگا - ہم نے ان کے احباب سے خاص طور پر اس نمبر میں لکھنے کی درخواست کی ہے - چنانچہ سر محمد اقبال کا مرثیہ، سر ریجنالڈ گلانسی، مسٹر ای - ایم فارسٹر، ڈاکٹر کرنکو، خان بہادر خوشی محمد خاں صاحب ناظر کا مرثیہ نیز ایک دو اور مضمون وصول ہو چکے ہیں - یہ نمبر اکتوبر یا نومبر کے شروع میں شائع کیا جائے گا —

اڈیٹر

ہندوستان کے درویشوں کی بولیاں اور اردو

از

جناب الحاج محمد اجمل خاں صاحب ایم اے - محقق اسلامیات -

شانتی نکیتن (بنگال)

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

ہندوستان کی پہلے یہ حالت تھی کہ یہاں جتنے مذاہب پیدا ہوتے تھے وہ ایک دوسرے سے بر سر پیکار نہیں رہتے تھے - آریہ اور دراوڑ اقوام کے اختلاط سے ایک نئے قسم کا مذہب پیدا ہوگیا تھا جو نہ آریہ تھا نہ دراوڑ - اس کے علاوہ مختلف فلسفی اور پڑھے لکھے آدمی بھی اپنے خیالات کی بنا پر نئے نئے مذاہب ایجاد کرتے رہتے تھے ' حتی کہ بدھ مذہب کی بنا پڑی جو در حقیقت فلسفۂ ہنود کی بنا پر ایک مذہبی عمارت تعمیر ہوگئی ہے - ہندوستان میں اس کی نظر آسمان کی طرف ہے اور روحانیت کا غلبہ ہے - لیکن یہی مذہب چین میں زمین کی طرف دیکھ رہا ہے اور مادیت غالب ہے - عرصے تک بدھ مذہب اور مختلف ہندو مذاہب رواداری کے ساتھ ہندوستان میں رہے - لیکن سیاسی وجوہ کی بنا پر اختلاف ہوا اور مذہب کی تجدید کا نام لے کر شنکر نے اسے ہندوستان سے خارج کرکے چھوڑا —

مسلمانوں کی آمد نے قدیم ہندوستانی مذاہب کے تار و پود کو بالکل منتشر کردیا - لیکن خود مسلمان بھی فلسفۂ ہنود سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے - اس طرح آپس کے میل جول سے فقرا کی ایک جماعت تیار ہوگئی جو کچھہ تو محکومیت کی وجہ سے متشائم فلسفے کو ٹھیک اسی طرح ترقی دینے لگے جس طرح رومن حکومت کے تسلط سے کلبیئین اور متشائم فلسفیوں کا یونان میں وجود ہوا تھا - اور کچھہ یہ بھی وجہ تھی کہ حقیقتاً مسلمانوں کی فوجی تنظیم و اخوت و وحدت کے خیالات نے مفتوحین کو مرعوب کردیا تھا - جسے آج کل کی بولی میں احساس پستی (Inferiority Complex) کہتے ہیں - اس طرح بہت سے ہندو فقرا نے اور چند مسلمان صوفیوں نے وحدت انسانی اور توحید یزدانی کے خیالات اسی ملک کی رائج زبان میں ادا کیے . نثر میں بہت کم کہا گیا - نظم اس زمانے میں عوام پسند دی تھی اور آسانی سے حافظے میں محفوظ بھی رہ سکتی تھی - اس لیے عموماً دوھے' چوپائیاں اور بانی (یعنی فقیر کی صدائیں) کہی گئیں - اور ان میں آزادی سے نہ صرف فارسی الفاظ کا استعمال کیا گیا بلکہ اکثر تصوف و مذہب اسلام کی اصطلاحات کو بھی فہم عوام سے قریب تر کر دیا گیا ــــ

مختصر سی تمہید کے بعد' اس مضمون میں زیادہ تر سکھہ مذہب کے بانی گرو نانک اور ان کے مجموعۂ کتب یعنی گرنتھہ صاحب کے متعلق لکھا گیا ہے - کبیر' فرید' دادو اور دیگر درویشوں کے متعلق اس میں بہت کم لکھا گیا ہے - لیکن نمونے کے طور پر ان سب کے کلام کا کچھہ کچھہ حصہ' اور خصوصیت سے گرنتھہ صاحب کی صبح کی دعا جپ جی' فرید کے دوھے' اورنگ زیب کے نام فارسی زبان اور گورمکھی خط میں چند

خطوط اور فارسی کی بعض کہانیاں جو "دسویں پادشاہ کے گرنتھہ" میں ھیں ' آئندہ پیش کی جائیں گی - مشکل یہ ھے کہ گرنتھہ صاحب کی لکھائی اس طرح کی ھے کہ کوئی لفظ علحدہ نہیں اور سکھہ بھی مشکل سے پڑھ سکتے ھیں - بہر حال کوشش ھے کہ لکھاؤ کے گرد وارے سے چند نمونے اردو رسم خط میں حاصل ھوجائیں —

فلسفۂ ھنود

ستلج - بیاس - راوی - چناب - جہلم اُن دریاؤں کے نام ھیں جن سے پنجاب بنا ھے - فارسی میں آب بمعنی دریا استعمال ھوتا ھے اسی مناسبت سے یہ ملک مشہور ھوا - خشکی سے سفر کرنے والوں کے لیے دریا اور پانی خاص طور پر جاذب توجہ ھوتا ھے اور دریاؤں سے سڑکوں کا کام بھی لیا جاسکتا ھے - اس لیے ھندوستان کا قدیم تمدن دریاؤں کے کنارے پیدا ھوا ' بڑھا اور مٹ گیا —

ھندوستان آنے والوں میں جو لوگ شمال مغرب کے دروں سے خشکی کا سفر کرکے آئے اُن میں سے آریہ نسل کے غول کے غول عرصۂ دراز تک یکے بعد دیگرے پنجاب سے گزر کر شمالی ھندوستان میں پھیل گیے - اُنھوں نے ھندوستان کی قدیم تہذیب کو جسے دراوڑ اقوام نے عروج پر پہنچایا تھا بالکل مٹا دیا اور اُنھیں جنوبی ھندوستان کی طرف دھکیل دیا ' اور دھلی ' لھور ' گجرات اور بنگال میں اپنی سلطنتیں قائم کرلیں - اور جس تمدن نے گنگا کے کنارے پرورش پائی تھی وہ دریائے سندھ سے برھم پتر تک پھیل گیا —

نیچر پرستی فلسفے میں بدلی - پھر برھمنوں نے مذھب اور علم

پر قبضہ کیا - اور اس میں وہ وہ موشگافیاں کیں کہ یورپ والے اب تک اُن کا لوہا مانتے ہیں - ریاضی ' کیمیا ' طب اور موسیقی و نجوم پر اپنے تجربوں کی بنا پر وہ وہ نظریے قائم کیے جو اب تک عملی طور پر غلط ثابت نہیں ہوسکے - شمسی سال میں ایک پل کی غلطی نہیں ہوتی - چاند اور سورج کے گرہن ' موسمی پیشین گوئیاں حرف بحرف پوری ہوتی ہیں - ریاضی کے اصول تو قطعاً نا قابل تبدیل طریقے سے سچے ہیں اور بیدک طب بھی ہندوستان کی آب و ہوا کے لیے کم مفید نہیں —

مذہب میں خدا کا بلند ترین اور پست ترین تخیل موجود ہے - روح کو نا قابل فنا بھی مانتے ہیں اور لوکایتک بھی ہیں جو روح اور خدا دونوں سے بے نیاز ہیں - غرض کہ یونان کا وہ فلسفہ جو مغرب کا سرمایۂ ناز ہے ہندو فلسفے کے سامنے ہیچ معلوم ہوتا ہے - اس میں شک نہیں کہ آگ اور سورج کی بھی پرستش کی جاتی ہے - لیکن سرد ملک سے آنے والوں کے لیے ان سے زیادہ واجب التعظیم اور حیات بخش کیا چیز ہوسکتی تھی - ایران میں تو آتش پرستی تھی ہی لیکن خود سامی مذاہب میں آگ کو دیوتا مانا گیا ہے - ستراؤس نے "حیات مسیح" کے صفحۂ ۳۶۱ (Strauss, Life of Jesus.) میں لکھا ہے - کہ عہد نامۂ عتیق اور عہد نامۂ جدید میں بھی آگ ہی روح القدس کا مخصوص (Symbol) نشان ہے —

روح کی قدامت اور عدم فنائیت کے متعلق توریت کے موسیٰ یا تو خاموش ہیں یا چند مبہم الفاظ کہتے ہیں - سترابو (Strabo) تو موسیٰ کو ایک مشرک مصری پجاری کہتا ہے - (Volneys Ruins,ch. XXii,) (Section 9, note) اور یہی خیال ون وڈ ریڈ (W.Reade) " انسان کی

قربانی " (Martyrdom of man) میں ظاہر کرتا ہے - گو موسیٰ کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ روح کے فانی ہونے کے قائل تھے لیکن خود سقراط اور افلاطون بھی روح کی عدم فنائیت کو نہ سمجھہ سکے تھے (دیکھو فیڈو - سڈنہم اور ٹیلر کا ترجمہ صفحہ ۳۲۶) چہ جائیکہ توحید یزدانی کے متعلق یہ لوگ کچھہ رائے قائم کرسکتے - اُس زمانے میں بلکہ اُس سے بھی پہلے جب کہ یونانی ایک لامعلوم خدا کا نام " قسمت " یا خونخوار نیمےسس رکھتے تھے ہندوستان میں برہمہ (خالق اعظم) اور پرجاپتی کے متعلق بلند ترین تخیل کا وجود پایا جاتا تھا —

بدھ مذہب

اس میں شک نہیں کہ آواگون کے لایعنی یا پیچیدہ خیال نے (جو رامچندر جی کے گرو کی بھی عقل سے باہر تھا) روح کی عدم فنائیت کو مادیت کا جامہ پہنا دیا تھا - اور انسانوں میں اخلاقی فضائل کی ترقی کے بجائے جسمانی ریاضتیں زیادہ پھیل گئی تھیں - لیکن یہ چیزیں مہابھارت کے زمانے کے بعد کی ہیں - پراچین دھرم یعنی قدیم مذہب زیادہ واضح ' ستھرا ' معقول اور فطری تھا برھمنوں نے بعد میں جو ایجادیں کیں اُس نے مذہب کو فلسفہ بنا دیا - اور فلسفہ نام ہی ہے خیالی اور ذہنی ورزش کا - نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ذہنی انقلاب ہوا اور اُن ہی بنیادوں پر ایک نیا مذہب قائم ہوگیا جسے " بدھ مذہب " کہتے ہیں —

بدھ مذہب کے وجود میں آنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ برھمنوں نے بعض اقوام کو نہایت پست درجہ دے دیا تھا - اور

عیسائیوں کی طرح عورت میں یا تو روح کا وجود ہی نہیں مانا جاتا تھا یا انہیں اتنا ذلیل اور ناقابل اعتنا بلکہ شیطانی سمجھہ لیا گیا تھا کہ رہبانیت عام ہوگئی تھی، حتی کہ اب بھی برہم آچاری (مجرد) رہنا انسان کو خدا بنانے کا ایک زبردست ذریعہ سمجھا جاتا ہے —

لیکن انسانی فطرت کچھہ ایسی ہے کہ وہ آزادی کی جگہہ قید کو زیادہ پسند کرتی ہے، غلامی کو حریت پر ترجیح دیتی ہے - نتیجہ یہ ہوا کہ خود بدھ دیو کی زندگی میں بدھ مت کے پیرووں میں ذاتیں بننا شروع ہوگئیں - یہ دیکھہ کر گوتم بدھ خفا ہوگئے اور "سنگھہ" یا جماعت فقرا کو چھوڑ کر جنگل کی طرف چل دیے - وہ تو ہر ذات کو برابر کر دینا چاہتے تھے، نیچ اونچ کا فرق مٹا دینا چاہتے تھے، عورت کو وہی درجہ دینا چاہتے تھے جو فطرت نے اسے دیا ہے - لیکن وہ لوگ جو ہندو دھرم کی بے عنوانیوں اور بد راہیوں سے تنگ آکر بدھ مذہب کی امن پسندی اور مساوات میں پناہ لے چکے تھے، وہ خود اعلی اور ادنی کی تفریق کرنے لگے - اس کے علاوہ گوتم بدھ سے ایک بہت بڑی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے نجات کے لیے کامل تیاگ مکمل سنیاس اور ترک دنیا کا ایسا سبق پڑھایا کہ دو جماعتیں قائم ہوگئیں - بھکشوؤں کو دنیا سے کوئی واسطہ نہ تھا - لیکن گرہست کے بغیر بھکو کو بھیک دینے والا اور بن مانگے کھلانے والا بھی کوئی نہ تھا - "گرہست آشرم" ضروری ہوگیا - لیکن بھکوؤں کو ان سے کوئی واسطہ نہ تھا - لہذا ہوا یہ کہ زندگی اور موت، نروان اور "جاندار سے ہمدردی" کے مفہوم پر اختلاف رائے پیدا ہوگیا لوگوں نے جان بچانے، مریضوں کی مدد کرنے کے لیے شفا خانے بنائے سلطنت نے اس قسم کے ہمدردیء جانداراں کے کاموں میں مدد

کی- حالانکہ اصولاً زندگی اور رنج والم مترادف مانا گیا تھا- گویا جان بچانا ایسا تھا کہ کسی کو مصیبت میں گرفتار رکھنا - اور یہ کام بہر حال نیک نہیں ہو سکتا تھا- بانی مذہب نے کچھہ کہا، عوام نے کچھہ سمجھا- اور وہی کام کیا جو اصولاً فطرت انسانی یا فطرۃ اللہ سے قریب تر تھا -

مسیح کے ۹ سو برس بعد کچھہ تو مسلمانوں کے اثر سے اور کچھہ بدھ حکومت اور جماعت کے انتشار کی وجہ سے برہمنوں کو دوبارہ موقع ملا کہ وہ اپنے مذہب کو عوام کے منشا کے مطابق پھر میدان میں لا سکیں- آخر زمانے میں بدھ مذہب والوں نے شعبدہ بازی، جادو گری سلسلہ اور اسی قسم کی پر فریب یا تعجب میں ڈالنے والی چیزوں کو مذہب کا اصل الاصول بنا لیا تھا- لیکن عوام کے لیے صرف دھوکا ہی کافی نہیں کہ وہ کسی مذہب کو اچھا سمجھتے رہیں، ان کا پول کھل گیا- اور موجودہ زمانے کے پیروں اور پیرزادوں کی طرح بدھ مذہب کے بھکشوؤں کو برہمن عالم کے سامنے فرار ہونا پڑا —

احیاے مذہب ہنود

مسیح کے ۹ سو برس بعد شنکر آچاریہ نے مکمل طور پر بدھ مذہب والوں کو ہندوستان سے خارج کر دیا - بدھ مذہب کا فلسفۂ لاادریت جس میں خواہشات کو مٹانا ہی فراغت کاملہ کا مترادف تھا، فنا ہو گیا- کپل کی دہریت اور چارواک کی مادیت شکست کھا گئی - اور بت پرستی کے ساتھہ ساتھہ صفات و قویٰ (گن) کی پرستش رائج ہو گئی - مندروں میں فنا کنندۂ مخلوقات (شیو) کی قوت حیات کا مظہر لِنگم کی شکل میں رونما ہوا- اور موجودہ زمانے کے محققین کے خیال کے مطابق دراوڑ

مذہب کے دیوتا (شیو) نے برہمن دیوتاؤں کو کسی نامعلوم طریقے سے خارج کرکے اپنا تسلط کرلیا - وشنو (خالق کائنات) اور مہیش یا برھمہ یعنی خالق اعظم نے ہندو مذہب کی تثلیث کو پورا کردیا - اور مقامی رسم و رواج کے اعتبار سے ہزارہا دیوی دیوتاؤں کو پھر آزادی مل گئی کہ اپنی پرستش کرائیں - ویدوں اور پرانوں پر عقیدہ رکھنا کافی تھا - حتیٰ کہ لامذہبیت بھی ہندو دھرم میں شامل تھی بشرطیکہ ویدوں اور سمرتیوں کے تقدس کا انکار نہ ہو اور دو جنموں میں برھمنوں کو تفوق ہی حاصل ہو' بلکہ وہ دیوتا سمجھے جائیں - اس طرح آریہ اقوام کے مذہب نے گو دراوڑ مذہب سے نادانستہ شکست کھائی مگر موجودہ ہٹلر یا مسولونی کی طرح ملک میں آریوں کی ایک مضبوط فاشست پارٹی شنکر آچارج نے قائم کردی —

یاد رکھنا چاہیے کہ تقریباً دو سو سال کے بعد (بارھویں صدی میں) راما نج نے وشنو (خالق کائنات) کی پرستش جاری کی تھی - کرشن جی وشنو ہی کے اوتار مانے جاتے ہیں - اور باوجودیکہ کرشن جی نے مہابھارت کی سی عظیم الشان جنگ کرادی تھی لیکن غالباً شیو پرستوں کی ضد پر وشنو پرست قطعاً اہمسا (عدم تشدد) کے قائل ہیں اور ان کا مذہب ویشنوی کہلاتا ہے - مسٹر گاندھی اسی صاحب کل' غیر موذی مذہب کے سچے پرستار ہیں - اور بھگوت گیتا کی غلط تفسیر سمجھنے کے بعد دوسروں کو بھی اس کا پیرو بنانا چاہتے ہیں —

گرو بھگتی پر دونوں مذہب متفق تھے - اور تن من دھن سے برھمن گرو کی بھگتی کرنا ہر وفا شعار ہندو چیلے کا فرض تھا - عبادت کے لیے خاص رسمیں بھی تصنیف کرلی گئی تھیں تاکہ بندہ فلسفے کی خیالی دنیا

سے نکل کر ایک عامی ہندو کو ظواہر کی عبادت میں ذاتی تسکین حاصل ہو سکے - اسی لیے رام اور کرشن کی پرستش بھی ایزاد کردی گئی تھی - اور الفنسٹن کا خیال صحیح ہے (تاریخ ہند صفحہ ۱۸۹) کہ "ان کی انسانی صفات و افعال کی وجہ سے لوگوں کو ان سے اور ان کے مصائب سے ہمدردی ہوگئی تھی اور اسی لیے ان کی پوجا ہوتی تھی" "بعینہ یہی کیفیت کلوویس (Clovis) کی نفسیاتی کیفیت کی مظہر ہے - جب اُس نے اپنی عیسائی بیوی سے مسیح کی دردناک سولی کا حال سنا تو فوراً عیسائی ہوکر رائمز (Rheims) کے راہب کا مرید ہوگیا اور کہنے لگا کہ کاش میں اپنے بہادر فرینک سپاہیوں کے ساتھ اُس وقت موجود ہوتا تو سولی دینے والوں کو مزہ چکھا دیتا (گبن "انحطاط و زوال سلطنت روما" جلد ۲ صفحہ ۳۰۲) - اسی قسم کے الفاظ تیمور لنگ نے شہادت حسین کا حال سن کر کہے تھے اور اب تک بہت سے مسلمان مجالس عزا میں پکار اُٹھتے ہیں کہ "ہائے حسین! ہم نہ ہوئے" —

اسلام

مسیح کے ہزار سال بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا کافی اثر پھیل گیا تھا - محمود غزنوی کی موت سے پہلے مسلمانوں کا پنجاب پر قبضہ ہوچکا تھا - قنوج اور گجرات پر حملے ہوچکے تھے - اور سنہ ۱۱۸۳ ع میں غزنویوں کو غوری نکال چکے تھے - وہ ترک تھے یہ افغان تھے - غور وہ علاقہ ہے جو غزنی اور ہرات کے درمیان واقع ہے - انھوں نے غزنی کے بعد پنجاب ہندستان اور بنگالہ فتح کرلیا - اور فتح کی یاد میں قطب مینار دلی میں قائم کردیا - راجپوت جمنا اور نربدا کے درمیانی علاقے میں

چلے گئے - پھر خلجیوں نے اپنی نوبت بجائی - چتوڑ ، گجرات اور دکھن فتح کرلیا - اور بختیار خلجی اور علاءالدین خلجی نے بحیثیت جنرلوں کے وہ کار ھائے نمایاں کیے کہ سکندر بھی عالم بالا سے حیرت سے دیکھہ رھا تھا - تیرھویں صدی کے شروع میں ھندوؤں نے بغاوت کردی اور اس کا اثر دکن تک پہانچا - لیکن پنجاب کا تغلق صوبہ دار آپہنچا اور اُس نے اپنی سلطنت قائم کرکے دھلی کے بجائے تغلق آباد بسایا سنہ ۱۳۹۸ میں تیمور نے ھندوستان فتح کرکے چھوڑ دیا - اس کے بعد ۵۲ سال تک سیدوں کا دور دورہ رھا - پھر لودھی پٹھان آئے اور آخر کار سنہ ۱۵۵۵ ع میں ھمایوں نے مغل سلطنت کی بنیاد مستحکم کردی اور سنہ ۱۵۵۶ ع سے ۵۰ سال تک اکبر نے اس طرح سلطنت کی کہ بعض اسے بادشاہ سمجھتے تھے اور بعض دیوتا —

پٹھان بادشاھوں کو مذھب سے اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی محمد بن قاسم کے زمانے کے عربوں کو ھو سکتی تھی - ان بادشاھوں نے ھندوستانی رسوم کو فراخدلی سے جذب کرنا شروع کیا - تجارتی اصول ھندؤوں کے اختیار کیے - زراعتی سال بھی شمسی رائج کردیا جو اب تک فصلی سنہ کے نام سے رائج ھے - اور ان میں سے اکثر ایسے بھی پٹھان تھے جو ھندو راجاؤں کے ملازم ھوکر مسلمانوں کے ساتھہ لڑنے میں کوئی مذھبی نقیض نہیں پاتے تھے - یہ لوگ بھی ھندوؤں کے کرشن اور بھیرؤں کی بجائے پیروں اور شہیدوں کی پرستش کرنے لگے تھے اور ھندوؤں سے میل جول رکھتے رکھتے ھندی فارسی پشتو اور ترکی سے مل کر ایک نئی زبان بھی پیدا ھوچلی تھی جو بعد میں ریختہ یا اردو کے نام سے مشہور ھوئی —

علما تو ہمیشہ سے عوام الناس کی صحبت سے پرہیز رکھتے تھے - اور اب تک اپنا تقدس قائم رکھنے کے لیے اکثر سعدی کے اس شعر پر عمل کرتے ہیں کہ —

زجاہل گریزندہ چوں تیر باش   نیا میختہ چوں شکر شیر باش

لیکن غوریوں کے زمانے ہی سے ہندوستان میں کچھ ایسے روشن خیال علما بھی آگئے تھے جنہوں نے بجائے درسیات کے تبلیغ اسلام کا ایک نیا طریقہ نکالا تھا - انہوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں ان مقامات کو چنا تھا جہاں دین اسلام کو جاننے والا کوئی نہ تھا - اور عامۃالناس کی کشش کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ اپنی مجلسوں میں فارسی اور ہندی "چیزوں" کے گانے والوں کو دعوت عام تھی کہ وہ آئیں اور توحید الہی اور توحید بنی نوع انسان کے نغمے گائیں - ان کی مجالس میں اونچ نیچ کی تفریق نہ تھی' نہ ذات پات کا خیال تھا - محبت اور خدمت خلق' ذریعۂ عبادت تھی - اور اجمیر' پاک پٹن دھلی' ملتان' کڑا مانکپور' ناگور' حیدرآباد' میسور ملابار اور کرناٹک غرض کہ کوئی ہندو راجدھانی ان کے فیوض سے خالی نہ تھی - یہ لوگ تھے تو عالم دین اسلام لیکن اپنی صلح جویانہ حکمت عملی کی وجہ سے مشائخ یا اللہ والے لوگ (اولیاء اللہ) مشہور تھے —

رد عمل کا نتیجہ

اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی اور اخلاقی خیالات نے سیاسی سرپرستی میں نشوونما پائی اور عمل و رد عمل شروع ہوا - لیکن ہوا یہ کہ ہندوؤں' خصوصاً برہمنوں کی تنگ نظری کی وجہ سے

جب خود ہندو علوم سنسکرت سے محروم تھے تو بھلا مسلمان کب محرم ہو سکتے تھے - لہذا مسلمانوں کو جو کچھ معلوم ہوا وہ نتیجہ تھا ان کی ظاہری پرستش اصنام کا مسلمان عموماً سب ہندوؤں کو بت پرست سمجھنے لگے اور ہندوؤں نے اپنے برادری اور ذات کے نظام کی وجہ سے مناسب نہ سمجھا کہ وہ ترک مذہب کریں اور اسلام کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں - سنی سنائی باتوں یا مشائخ کی مجلسوں سے جو کچھ معلوم ہو سکتا تھا وہ اتنا ہی تھا کہ مسلمان ایک اللہ کو پوجتے ہیں اور ان میں چھوت چھات نہیں ہے - مسلمان یہ سمجھتے کہ سب ہندو مشرک اور بت پرست ہیں اور گوشت خوری سے ڈرتے ہیں - ان کا مذہب چھونے اور نہ چھونے کے قواعد کا نام ہے - حالانکہ جو لوگ جانتے ہیں وہ کہہ سکتے ہیں کہ —

(۱) ہندوؤں میں ایسے فلسفۂ مذہب کے ماننے والے بھی ہیں جو ادویت یا وحدت وجود کے قائل ہیں جو جیو آتما (روح انسانی) کو پرماتما (خدا) سمجھتے ہیں، اور دورنگی یا دوئی کو محض دھوکا جانتے ہیں —

(۲) ان میں اس قسم کے ادویت کے ماننے والے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ بعض اعمال (کرم) کی وجہ سے تم خدا سے جدا ہو گئے ہو، نیک اعمال کرکے پھر اسی ذات سے واصل ہو جاؤ گے اور نجات کامل حاصل کرو گے -

(۳) ان میں اس قسم کے بھی لوگ ہیں جو بالکل دُوَیْت (ثنویت) کے قائل ہیں - جیو آتما اور پرماتما کو الگ الگ تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو ممکن نہیں کہ خدا سے وصال ہو البتہ نیک

افعال کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ خدا کی قربت حاصل ہو جائے
اور پھر دوبارہ پیدا ہونے سے نجات حاصل ہو جائے —

(۴) ہاں ایسے بھی ہیں جو نہ صرف بتوں کی پرستش کرتے ہیں بلکہ جنھوں نے پست ترین جذبات میں گھر جانے ہی کا نام نجات رکھا ہے۔ شراب خوری' زنا' انسانی قربانی' ٹھگی وغیرہ مذہب کے نام پر کرنا برا نہیں سمجھتے بلکہ بام مارگی اور کالی پوجا کے حامی تو اکثر بدکاریوں کو محاسن میں شمار کرتے ہیں - اور اگر غور کیا جائے تو ان کے فلسفے میں بھی بہت سی حقیقی خوبیاں نظر آئیں گی - کیا وجہ ہے کہ ان لوگوں کو اچھا کہا جائے جو شراب کی تعریف کے راگ گاتے ہیں' غزل اور رباعی کو اس کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں لیکن اتنی اخلاقی جرأت نہیں رکھتے کہ علانیہ شراب پئیں اور ان بیچارے بام مارگیوں کو برا کہا جائے جو شراب پینا ہی سرے سے برا نہیں سمجھتے بلکہ اچھا سمجھتے ہیں اور پیتے ہیں — پھر مرد و عورت کے جنسی تعلقات پر اتنا پردہ ڈالا جاتا ہے کہ سوائے فقہ کے یا یورپ کی طلاق کی عدالتوں کے اس کا ذکر کرنا بھی خلاف تہذیب اور خلاف فطرت سمجھا جاتا ہے حالانکہ قوانین قدرت کے مطابق ایک عورت اور ایک مرد کو ہمیشہ کے لیے باندھ دینا سخت ظلم ہے - دونوں کو اپنی اپنی تجویز کو مسترد کر دینے کا کامل حق ہونا چاہیے - اسے طلاق کہیے یا خلع - پھر حال بام مارگیوں نے مسلمانوں کی ایک جماعت کے اصول کے مطابق عمل کرنا شروع کیا - اور وہ ہندو یا عیسائی جو عورت کے وجود ہی کو سر تا پا گناہ سمجھتے ہیں' جو جنسی تعلقات کو اتنا برا سمجھتے ہیں کہ کنواریوں سے پیغمبروں اور " سنتوں "

کو پیدا کرانا یا بسا اوقات بغیر عورت ہی کے پیدا کرانا مناسب سمجھتے ہیں ' وہ لگے منہ چڑانے اور گالیاں دینے - کوئی ان عقلمندوں سے پوچھے کہ اگر بام مارگی غلطی پر ہیں تو تم کہاں راستی پر ہو ' جو عورت کو ناپاک اور غیر ذی روح تو سمجھتے ہو - مگر بغیر اُس کے نہ تم وجود میں آئے نہ دوسروں کو وجود میں لانے کے بغیر چارہ سمجھتے ہو —

رہی کالی ' شکتی یا پاربتی (زوجہ شیو) کی پوجا اور اُس پر آدمیوں کی بجائے بھینسوں اور بکروں کی بلی (قربانی) چڑھانا تو کیا تم روز نہیں دیکھتے کہ ایک فرد دوسرے کے لیے ' ایک قوم دوسری قوم کے لیے مسلسل قربان ہورہی ہے اور ہوگی - جہد حیات کبھی نہ مٹ سکتی ہے نہ مٹے گی - اگر جنگ کی دیوی نے اپنے قبیلے کے دشمنوں کا خون بہتے ہوئے دیکھنا چاہا ' تو وہ سادہ لوح پرستار ہرگز قابل الزام نہیں جو قدیم زمانے سے اپنے دشمنوں کا خون اپنی پیاری دیوی کے سامنے بہاتے تھے - کیا اُنہیں یقین کامل نہ تھا کہ اسی دیوی کی عزت و پرستش نے اُنہیں فتح کامل نصیب کرائی ہے - اس کے علاوہ کیا اُن کا انسانی قربانی کرنا اس سے بہتر نہ تھا کہ سب قیدی غلام بنائے جائیں اور جیتے جی دائمی جہنم میں پڑے رہیں - میں تو یہ کہوں گا کہ غلام بنانے سے بہتر اور مناسب تر سوائے قتل کے اور کچھ نہ تھا —

آج ہندوستان میں ہزاروں نہیں لاکھوں اچھوت اپنی دائمی غلامی سے بیزار ہوکر مسیحیوں اور مسلمانوں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں - غلامی اور ذلت و مسکنت نے اُن کا یہ حال کردیا ہے کہ وہ صحیح طور پر سوچ بھی نہیں سکتے —

اس کے علاوہ اُن بیچاریوں کی حالت کو دیکھیے جنہیں ہندوؤں

میں پیدا ہونے کا فخر تو حاصل ہوا لیکن کرموں کے بھوت نے اُنہیں بیوہ کردیا - دلہن ' سہاگن ' بہو کے معزز خطابات چشم زدن میں نصیبوں جلی ' سبز قدم ' منحوس میں تبدیل ہوگئے - گویا اس غریب ہی کے مشورے سے شیو جی نے اپنا حربۂ فنا استعمال کیا تھا - سیج کو فرش زمین سے تبدیل کردیا گیا - مخمل کو ٹاٹ سے ' اور راحت ارضی اور لذائذ جسمانی کو زندہ جہنم سے - ہنسنا گناہ ہے - کھانا گناہ ہے - سونا گناہ ہے - سنگھار تو ناممکن ہے - یا شیو ! کیا تیرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اس ناکردہ گناہ پر اپنے راحت وسکون بخش ہتھیار کا پہلا وار ہوتا - کیا زندگی بھر جلنے سے چند منٹ کی چتا کی اذیت اور دائمی سکون بہتر نہ تھا - کتنا ظلم ہوا کہ ستی کی رسم مٹانے سے پہلے لارڈ ولیم بنٹنک صاحب نے یہ قانون نہ نافذ کیا کہ ہر بیوہ کی شادی لازمی ہوگی - اور جس ہندو کے یہاں بیوہ نظر آئے گی اُس خاندان کے پروہت (برہمن) کو ملزم سے دگنی سزا دی جائے گی —

نئے مذاہب کی بناء

غرض کہ مسلمانوں اور ہندؤوں کے خیالات کے تصادم نے ہندوستان میں ایک نئی تحریک اصلاح پیدا کردی - نہ تو مسلمانوں نے ہندوؤں کے مذہب کو پورے طور پر سمجھا تھا نہ ہندؤوں نے مسلمانوں کے مذہب کو جانا - لیکن عوام سے سن سناکر چند نظریات دونوں جماعتوں نے قائم کرلیے - نتیجہ یہ ہوا کہ چودھویں صدی مسیحی کے آخیر میں "راماننڈ" نے بنارس سے ایک نیا مذہب یا نئی اصلاح شروع کی - یہ "رامانج" کے شاگرد تھے - اور مسلمانوں کے خیالات اخوت و مساوات سے متاثر معلوم

ہوتے تھے - اُنھوں نے ذات پات کے جھگڑوں کو مٹاکر ہر شخص کو را
کی پرستش کے لیے بلانا شروع کیا - چونکہ رام وشنو کے اوتار مانے جاتے تھے
لہذا اس جماعت کو شیو کے پرستاروں سے نفرت سی ہوگئی تھی - حتیٰ
کہ دریائے نربدا کو عبور کرنا بھی گوارا نہ تھا - اس لیے کہ یہ دریا شیو کے
پرستاروں کے نزدیک مقدس تھا اور ممالک متوسط ہند میں یہ مثل
مشہور تھی کہ "رھوا (یعنی نربدا) کے کنکر سب شنکر (شیو)" یعنی
نربدا کے کنکر تک شیو کی مانند ہیں —

اسی زمانے میں گرو گورکھ ناتھ نے پنجاب میں جوگ (ترک لذات
کی تعلیم دینی شروع کی - انھوں نے شیو کی پرستش جاری کی - او
جسمانی ریاضتیں اور حبس دم وغیرہ کے طریقے رائج کیے جن کے ذریعہ
سے ہر ذات کا شخص وجود مطلق سے واصل ہوسکتا ہے - یہ جوگی کن پھٹے
ہوتے تھے یعنی بجائے ترسول کی علامت کے (جو پیشانی پر لگائی جاتی ہے
جوگیوں نے اپنی علامت کان میں بڑا سوراخ کرکے مقرر کی تھی - محسن
فانی مؤلف "دبستان مذاہب" نے جوگیوں اور صوفیوں میں ایک قسم
کی مماثلت بتائی ہے کہ کس طرح روح کو بقا باللہ کا درجہ حاصل
ہوسکتا ہے اور "حق" یا "ست" تک رسائی ہوسکتی ہے —

پچاس سال کے بعد کبیر نے سنہ ۱۴۵۰ ع کے قریب بت پرستی کے خلاف
جہاد شروع کردیا - اور ظاہری رسوم کو چھوڑ کر دل کی صفائی اور پاکیزگی
کی طرف ہندو مسلمانوں کو بلانا شروع کیا - جس خیال کو کبیر نے

"نا کاشی میں نا متھرا میں نا بندرابن میں
کہت کبیر سنو بھائی سادھو ہر تو تورے من میں"

کہہ کر رائج کیا تھا - اس کو اس سے بہت پہلے فارسی شعرائے ایران

ھند نے مختلف طریقوں سے ظاہر کیا - حافظ و سعدی نظیری و صائب خیام و ابوالعلاءالمعری سب وحدت انسانی' ترک رسوم اور صفائی قلب کے نغمے گا چکے تھے - آخر زمانے میں درد نے کہا :

شیخ کعبہ ہو کے پہنچا' ہم کنشت دل میں ہو
درد منزل ایک تھی کچھ راہ ہی کا پھیر تھا

اور غالب نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا :

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزاے ایماں ہوگئیں

غرضکہ کبیر کی معرفت آمیز تعلیم اور مساوات انسانی کے دوہوں نے جو نہ سنسکرت تھی نہ عربی بلکہ عام لوگوں کی سادہ اور فطری زبان میں تھی' ہندوستان میں مشرق سے مغرب تک دھوم مچادی - کبیر نے دنیا کو مایا' فریب یا ایک خوبصورت عورت سے تشبیہہ دی اور گمراہی سے دور رہنے کی تعلیم دی - لیکن کبیر نے شاید یہ غلطی کی کہ ترک دنیا اور سنیاس کی بھی تعلیم دی - محسن فانی کا بیان ہے کہ کبیر کی تعلیم سے نہ صرف ہندو بلکہ بہت سے مسلمان بھی بیراگی بن گئے - اور ترک رسوم کرکے "رام" اور "رحیم" دونوں کو لفظی ہیر پھیر سمجھنے لگے —

سولھویں صدی کے شروع میں چیتن نے بھگتی کی تعلیم (جو راما نند اور کبیر سے شروع ہوئی تھی) بنگال میں جاری کی - لیکن انہوں نے بیراگ پر زور نہیں دیا - گرہست زندگی اور شادی بیاہ کو جائز سمجھا - لیکن گرو بھگتی یا پیر پرستی کو جاری کردیا - حتی کہ ان کے پیرووں نے گرو کے نام کو خدا کے نام سے پہلے جگہ دی اور بعد میں تلنگانے کے ولبھہ سوامی نے بیراگیوں پر شادی شدہ یا گرہست گرووں کو بہتر بتایا -

اور گوسائیوں کی جماعت پیدا ہو گئی جو دین و دنیا دونوں کو ساتھہ ساتھہ لے کر چلنے لگے - انھوں نے بال گوپال (معصوم کرشن) کی پرستش کی تعلیم بھی جاری کی جس سے ایک قسم کی بت پرستی شروع ہوگئی —

رجب، کمال اور داؤد نے جو ہندوؤں میں دادو کے نام سے مشہور ہیں، اس بھگتی کی تعلیم کو ملک میں عام کیا - ان کے دوھے اب تک زبان زد خلائق ہیں - ان کے سامنے ہندو مسلمان کی تفریق نہ تھی - یہ مذہب صلح کل، عام پسند اور رسم شکن تھا - ذات پات کو مٹانا اور ظاہری مذہبی پابندیوں اور رسوم کو مٹانا اس کا مقصد تھا - گو بعد میں بعض مشرکانہ رسوم اور ایک قسم کی مورتی پوجا بھی رائج ہو گئی - لیکن اب بھی اس جماعت کے موحد کثرت سے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں - رامانندی، کبیر پنتھی، کن پھٹے جوگی، بال کرشن اور نانگے (یادگار دادو) اب تک توحید و محبت کے گیت گاتے ہیں —

گرو نانک

یہ زمانہ تھا جب کہ نانک سنہ ۱۴۶۹ ع میں لاہور کے قریب اپنی ننھیال میں پیدا ہوئے اسی وجہ سے ان کا نام نانک ہو گیا - شروع میں ایک برہمن کے زیر تعلیم رہے - لیکن وہ اس ہونہار بچے کو معقول تعلیم نہ دے سکا - پھر مولوی سید حسین نے نہایت محبت سے تعلیم دینی شروع کی - اس لیے کہ بقول صاحب سیرالمتاخرین اس کے کوئی اولاد نہ تھی - اور زمانے کے رواج کے مطابق فارسی عربی پڑھائی - ملکم :

قول ہے (سکیچ صفحہ ۱۴) کہ "نانک کے متعلق مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ انہیں کل علوم و فنون میں خواجہ خضر نے تعلیم دی تھی" - اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ وہ پیدائشی ولی تھے اور خدا نے ان کی فطرت ہی میں محبت بنی نوع انسان کے وہ اصول داخل کردیے تھے جو دنیا کی ظاہری تعلیم سے بہت کم حاصل ہوتے ہیں - سکھہ مصنفین کی عام رائے یہ ہے کہ انہوں نے بظاہر بہت کم تعلیم حاصل کی - جو کچھہ انہیں علم تھا وہ سرچشمۂ ازل ہی سے حاصل ہوا تھا —

آدی گرنتھہ وہ کتاب ہے جس میں سکھوں کے لیے بہت کچھہ اخلاقی تعلیم جمع کردی گئی ہے - اس میں کبیر اور گورکھہ ناتھہ کے دوہوں کو بھی شامل کرلیا گیا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی تعلیم کا بھی نانک پر اثر ہوا تھا - دبستان مذاہب سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان درویش نے انہیں تعلیم دی تھی - اور ملکم نے (سکیچ صفحہ ۸و۱۳ میں) تحریر کیا ہے کہ "اتفاقاً کچھہ فقیروں سے ملاقات ہوگئی ان کی صحبت کا نانک کی طبعیت پر بہت اثر ہوا" —

اس میں شبہہ نہیں کہ نانک نے نہ صرف ہندوستان کا دورہ کیا بلکہ تلاش حق میں مکے کا سفر بھی کیا - اس زمانے میں زیادہ تر پیدل حج کیا جاتا تھا اور راستہ دشوار گزار تھا اور اب بھی ہے - آج کل بھی ہزاروں مسکین فقیر پنجاب اور سندہ سے پیدل سفر کرکے مکے پہنچ جاتے ہیں - بعض تو ان میں ایسے ہوتے ہیں کہ مزدوری سے پیٹ پالتے ہیں لیکن زیادہ تعداد بھیک مانگ کر زندگی بسر کرتی ہے - لیکن حیرت ہوتی ہے کہ یہ بے مایہ اور مفلس لوگ کس قدر جری اور شوقین ہیں کہ جان پر کھیل کے ایسے سفر کرتے ہیں - چونکہ عموماً فقیر تعلیم

یافتہ ہوتے ہیں اس لیے یورپ والوں کی طرح ان کے سفر نامے مرتب نہیں ہوتے - نہ اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بیچارے کس طرح سندھی، فارسی اور عربی زبانوں پر حاوی ہو جاتے ہیں - اس قسم کے سفروں کے لیے اگلے زمانے میں ایک مثل تھی "الرفیق قبل الطریق" - یعنی راستہ چلنے اور سفر کرنے سے پہلے ایک ساتھی کی تلاش ضروری ہے - آج کل بھی یہ مثل صادق ہے - عرب کے سفر کے لیے خصوصیت سے ضروری ہے کہ ایک رفیق ضرور ہو اور اگر دو ہوں تو کیا کہنا ہے - اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایام حج میں بدوی اونٹوں کی دوڑ اور کشمکش میں اور عربی شوفروں کی جان ہار موٹر بازی میں پیدل چلنے والوں کو اپنی جان نذر کرنی پڑتی ہے - اور اگر کوئی رفیق نہ ہوا تو یہ معلوم ہونا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس کی نعش ہے - البتہ پتے کا کارڈ یا پاسپورٹ جیب میں ہو تو شاید کوئی پتا لگانے کی زحمت گوارا کرے —

غرض کہ گرو نانک نے ایک رفیق سفر کے ساتھہ عرب کا سفر کیا - یہ رفیق مسلمان تھا جو سفر کی صعوبتوں کو کم کرنے اور بہر حال ایک روحانی کیفیت پیدا کرنے کے لیے اپنے ساتھہ ایک رباب بھی رکھتا تھا - غالباً یہ یادگار ان مشائخ چشتیہ و نظامیہ کے سلسلے کی ہوگی جنھوں نے موسیقی کو اپنے حلقوں میں داخل کر لیا تھا - اور عوام و خواص دونوں بقدر ظرف و ذوق اس سے بہرہ اندوز ہوتے تھے - بہر حال مردانہ ربابی ساتھہ تھے اور دونوں فقیر نیل کے رنگے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے مصروف سفر تھے —

ہندوستان میں عموماً یہ خیال ہے کہ کعبے کی طرف پاؤں کرکے نہ لیٹنا چاہیے - ہندوؤں میں بھی بعض سمتیں متبرک سمجھی جاتی ہیں اور پکے ہندو ادھر پاؤں کرکے نہیں سوتے - اسی خیال کے ماتحت

گرو نانک کے متعلق یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ وہ حرم کے اندر کعبے کی طرف پاؤں کر کے لیٹے ہوے تھے تو کسی نے غصے سے کہا کہ خدا کے گھر کی توہین کیوں کرتے ہو - تو انہوں نے نرمی سے جواب دیا کہ بھائی جدھر خدا کا گھر نہ ہو وہ سمت بتاؤ تو میں ادھر پاؤں کرلوں - بعد میں اس پر یہ اضافہ ہوا کہ اس شخص نے ان کے پیر دوسری طرف گھمانے چاہے لیکن جدھر گھماتا تھا اسی طرف کعبہ بھی چلا جاتا تھا- اسلام کے رو سے تو کعبے کی صرف اتنی عزت ہے کہ یہ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا مکان ہے جو خدا کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا- لیکن اس طرف پاؤں کرنا یا نہ کرنا نہ تو مذہب میں داخل ہے نہ کبھی اس پر توجہ کی گئی - آج تک ہزاروں مسلمان وہاں سوتے ہیں' گپ بازی کرتے ہیں - پانی پیتے ہیں' کفن کو زمزم کے پانی میں بھگو کر سکھاتے ہیں - (یہ فعل صرف ہندوستانی کرتے ہیں) ' کبوتروں کو دانا دیتے ہیں - غرض کہ عبادت سے زیادہ تفریح کرتے ہیں - اور حرم کے باہر کوہ صفا اور مروہ کے درمیان جو سڑک ہے اس میں تو اس کثرت سے باجا بجایا جاتا ہے کہ جو لوگ عبادت میں مشغول ہوتے ہیں وہ اپنی دعائیں بھول جاتے ہیں اور بعض تو مرتے مرتے بچتے ہیں - ہوتا یہ ہے کہ اس جگہہ اس کثرت سے موٹریں دوڑائی جاتی ہیں اور سعی کرنے والوں کو موٹروں کے کریہ الصوت بھونپو (ہارن) اتنی مہلت نہیں دیتے کہ وہ دلجمعی سے عبادت کرسکیں —

جس قدر کوئی خیال قدیم ہوتا جاتا ہے اسی قدر وہ مقدس بھی ہوتا جاتا ہے - اسی نظریے کے ماتحت مسیح کے پرستاروں نے سیکڑوں معجزات ان کی طرف منسوب کردیے - حالانکہ موجودہ تنقید نے خود

انجیل مقدس کے بعض اجزا کو مہمل اور فاضل قرار دے دیا ہے اور پادری بھی معجزات کے منکر ہیں (دیکھیے سنڈر لینڈ "عروج و ترقی مسیحیت")۔ اسی قسم کے معجزات مسلمانوں نے اپنے پیغمبر سے منسوب کر دیے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں سوائے اعجاز قرآن کے اور کسی معجزہ کا ذکر نہیں۔ گرو نانک تو بالکل تاریخی زمانے کے بزرگ ہیں۔ اگر میں ذرا اور بوڑھا ہوتا تو کہتا کہ کل کی بات ہے کہ گرونانک نے فقیری لی' سیاحی کی اور ہندو مسلمانوں کے بلند فلسفے اور مہمل علم کلام سے نفرت کا اظہار کیا۔ صلح کل رہے اور اس طرح زندگی بسر کی کہ نہ ہندو انہیں ہندو کہتے تھے نہ مسلمان مسلمان۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ۔ ہندو انہیں ہندو سمجھتے تھے اور مسلمان مسلمان —

اگر کوئی قوم اپنے مذہب کو فلسفہ بنادے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مذہب اپنے اصلی خط و خال کے ساتھ باقی نہ رہے گا۔ ہندوؤں نے برہمنوں کو اتنا آرام پہنچایا کہ وہ سوائے فلسفے کے دوسری چیز ہی نہ جانتے تھے۔ ان کا مذہب' ان کی شاعری' ان کی زندگی ان کی موت سب فلسفہ تھی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ آج بھی ہندوستان کا ایک عامی سے عامی کچھ نہ کچھ مسائل کرم اور آواگون سے واقف ہے۔ مسلمانوں نے بھی جب سلطنت کی بنیادیں مضبوط کر لیں اور ملک گیری سے فرصت ملی تو ان میں بھی برہمن پیدا ہو گئے جنھوں نے علوم و فنون کو اپنی جاگیر بنانا چاہا۔ لیکن خیریت ہوئی کہ صرف مذہب تو فلسفہ بن کے ان کے پاس رہ گیا لیکن رند مشرب شعرا اور آزاد خیال معتزلہ کی بدولت زندگی کی بہت سی دلچسپ چیزیں فلسفہ بننے سے بچ گئیں۔ لیکن بہر کیف مذہبی فلسفے کا یہ اثر ہوا کہ مسلمان عوام افلاطون اور

ارسطو، جالینوس اور فیثا غورث کے ناموں سے واقف ہوگئے اور انہیں مسلمان سمجھنے لگے۔ اور علمائے کرام نے بھی اتنی فراخ دلی ضرور برتی کہ دینیات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہندو کافروں کے ریاضی و نجوم اور یونانی مشرکوں کے فلسفے اور طب کو مدارس میں جاری کرنے سے گریز نہیں کیا —

لیکن ہندو اور مسلمان صرف برہمن اور ملا ہی کو نہیں کہتے۔ اس میں ۹۹ فی صدی سے زیادہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو یہ بھی نہیں جانتے یا جانیں زندگی میں یہ جاننے کی فرصت نہیں ملتی کہ مذہب کیا ہے اور واجب الوجود اور پرجاپتی کا تخیل کیونکر پیدا ہوا اور اس کا کیا مفہوم ہے۔ پنڈتوں اور ملاؤں کی اس فلسفیت کا ایک اچھا اثر یہ ہوا کہ عوام نے اپنا ایک نیا مذہب بنا لیا۔ وہ زبانی تو یہی کہتے رہے کہ ہم ہندو ہیں ہم مسلمان ہیں، لیکن حقیقت میں وہ بالکل ایک انسانی اور فطری مذہب کو ایجاد کر چکے تھے اور اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ وہ رام لیلا میں بھی جاتے تھے اور امام باڑے کی بھی سیر کرتے تھے۔ وہ کالی کی پوجا بھی کر لیتے تھے اور شہید مرد کی قبر پر چراغ بھی جلاتے تھے۔ غرض کہ ان کا مذہب رواداری تھا۔ وہ محبت کے بندے تھے اور جب سلطنت کی طرف سے زیادہ محاصل نہ عاید ہوتے تھے تو انہیں یہ بھی پروا نہیں ہوتی تھی کہ نادر آیا یا ابدالی گیا۔ انہوں نے سنسکرت کو چھوڑ دیا تھا۔ عربی سے دلچسپی نہ تھی۔ اگر کبھی فوجی بازار میں گزر ہو جاتا تھا تو فارسی ملی ہوئی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ اور اسی زبان میں شاعری بھی کرتے تھے —

بہر حال فارسی زبان کی ابتدائی تعلیم اسلامی ممالک کا پیدل سفر اور خصوصاً ایران و عرب کی سیاحت نے مسلمانوں کی اُن مذہبی کیفیات کو جو عوام میں رائج تھیں، گرونانک کے دل و دماغ کو کافی روشن کردیا تھا - ہندوستان میں اب تک جو چھوت چھات، ذات پات کے بندھن ہندوؤں میں ہیں، اُن کی سختی کا کوئی سولھویں صدی میں اندازہ کرے تو آسانی سے سمجھہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کی عام اخوت و مساوات کا ایک پاکیزہ دل پر کتنا گہرا اثر ہوا ہوگا - بقول مکالف (Macauliffe) کے " یہ گمان غالب ہے کہ آزاد خیالی اور دوسروں کے خیالات کی رواداری کی عادت کو اس طرح مدد پہنچی ہوگی کہ نانک نے مسلمانوں کی ان تحریروں کو دیکھا ہوگا جن سے فارسی زبان بھری پڑی ہے "

گرو نانک کی تعلیم

آدی گرنتھہ * یعنی کتاب قدیم جو پہلے گرو، گرونانک سے منسوب ہے - (یہ سکھہ گروؤں کی پہلی کتاب ہے - اس میں تاریخی حالات بیان نہیں کیے گئے - اور براہ راست سولھویں اور سترھویں صدی کے

---

* مندرجۂ بالا تلخیص کننگھم کی تاریخ سکھاں سے ماخوذ ہے - اس میں بعض مقامات پر کننگھم نے جو غلطیاں کی ہیں وہ ترمیم کے اندر صحیح کردی گئی ہیں - یہ کتاب بمقام سیہور (بھوپال) سنہ ۱۸۴۸ ع میں لکھی گئی تھی - اور شائع ہونے کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے اس کی اشاعت کو جرم قرار دیا تھا - وجہ یہ تھی کہ اس میں سکھوں کی پہلی لڑائی کے سچے اور ناگوار واقعات درج کردیے گئے تھے - کننگھم ذمہ دار سیاسی ملازم کمپنی تھا - اُس کی رائے میں یہ لڑائی نامناسب تھی - بہر حال لاٹ صاحب نے اُسے بھوپال کی ملازمت سے بر طرف کردیا اور بیچارہ کننگھم دل شکستہ ہوکر مرگیا - یہ کتاب دوبارہ سنہ ۱۹۰۳ میں شائع ہوئی - اور اکثر واقعات نہایت پرلطف طریقے پر اس میں درج کیے گئے ہیں - (مؤلف) -

حالات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی - لیکن اُس زمانے کی سوسائٹی کے حالات کے متعلق اس میں بہت سی باتیں مل جاتی ہیں - اس سے اس وقت کے مذاہب کی کیفیت بھی معلوم ہوتی ہے - اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی حقیقی اور روحانی پرستش کرنی چاہیے - اور ظاہری رسوم کا عبادت سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے۔ نجات بغیر بھکتی، ایمان اور نیک اعمال کے حاصل نہیں ہوسکتی —

آدی گرنتھ میں وہ تعلیم ہے جو پہلے گرو نانک سے منسوب ہے - اور نویں گرو تیغ بہادر تک کی تعلیم بھی اس میں شامل ہے - لیکن اس میں چھٹے ساتویں اور آٹھویں گرو کی تعلیم نہیں ہے - اس میں گرو گووند نے بھی کچھ اضافہ کیا ہے —

اس کے علاوہ اس میں کچھ بھکتوں کی بھی تصنیفیں شامل ہیں - یہ بھگت عموماً ہندو تھے - ان کی تعداد سولہ ہے - اس کے بعد کچھ بھاٹوں کی کبتائیں ہیں - جو یا تو نانک کے سکھ تھے یا دوسرے گروؤں کے سکھ تھے - (سکھ بمعنی مرید،اور گرو بمعنی مرشد استعمال ہوتا ہے - اور یہ اصطلاح مشائخ اسلام سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے) - بھکتوں کی تعداد اور بسا اوقات اُن کے نام تک مختلف گرنتھوں کی نقلوں میں ایک نہیں ہیں - لہذا موجودہ مؤلفین نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جس تحریر کو چاہا رکھا، جسے چاہا خارج کردیا - سولہ بھکتوں میں ڈوم بھی شامل ہیں - یہ گرو ارجن کے سامنے گایا کرتے تھے - اور ان میں گرو ارجن کی صفات کا اثر ہوگیا تھا - اس کے بعد ایک ربابی کے گانے ہیں، یہ بھی صوفی ہوگیا تھا —

گرنتھ صاحب میں کبھی کبھی ایک ضمیمہ ہوتا ہے جس میں ایسی

تصنیفیں ہوتی ہیں جن کی صحت مشکوک ہوتی ہے یا دوسرے اسباب کی وجہ سے اُن کو شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا —

گرنتھہ صاحب کو پہلے ارجن نے جمع کیا - یہ پانچویں گرو ہیں - لیکن بعد میں جو گرو ہوئے انہوں نے بھی کچھہ اضافے کیے ہیں —

پوری گرنتھہ صاحب نظم میں لکھی ہوئی ہے - اس میں مختلف قسم کی بحریں ہیں - زبان عموماً پوری شمالی ہند کی ہندی ہے - پنجاب کی بولی نہیں ہے - اخیر کے بعض حصے سنسکرت میں ہیں ' طرز تحریر پنجابی ہے جو ہندوستان کی بہت سی تحریروں میں سے ایک ہے - چونکہ اسے سکھہ گروؤں نے استعمال کیا اس لیے اسے گور مکھی بھی کہتے ہیں - موجودہ سکھوں کا خیال ہے کہ گرو نانک کی زبان وہی ہے جو لاہور کے جنوب مغربی خطے کی ہے - ارجن کی بولی نہایت خالص سمجھی جاتی ہے —

عموماً گرنتھہ صاحب ۱۲۳۲ صفحوں کی ایک چھوٹی تقطیع کی کتاب ہوتی ہے - ہر صفحے میں ۲۴ سطریں اور ہر سطر میں ۳۵ حروف ہوتے ہیں - زائد کتابوں کی وجہ سے صفحات ۱۲۴۰ تک ہوجاتے ہیں —

آدی گرنتھہ کے مضامین

۱ - " جپ جی یا صرف جپ " جسے گرو منتر بھی کہتے ہیں - یہ خاص دعا سات صفحوں میں ہے ۔ اس میں ۴۰ اشلوک ہیں جنہیں پوڑی کہتے ہیں ۔ بعض میں دو اور بعض میں کئی مصرعے ہیں - جپ کے معنی یاد کرنے کے ہیں (تصوف کی اصطلاح میں اسے ذکر کہتے ہیں) یہ گرو نانک کی تصنیف ہے جس کا ہر صبح کو پڑھنا فرض ہے ۔ یہ سوال جواب کی صورت میں ہے - سکھوں کا خیال ہے کہ سوال کرنے والے انگد تھے —

۲ - " سودر یا سودر واس " :- سکھوں کی شام کی دعا - یہ گرونانک کی تصنیف کردہ شام کی دعا ساڑھے تین صفحوں میں ہے - اس میں رام داس ارجن اور بقول بعض) گرو گووند نے اضافے کیے ہیں - گرو گووند نے جو اضافے کیے ہیں وہ ایسی کتاب میں ضرور شامل کردیے جاتے ہیں جس میں یہ یہ دعا علحدہ لکھی جاتی ہے - سودر ایک خاص قسم کی نظم کو کہتے ہیں ریہہ نصیحت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے - اور راس کرشن جی کے کھیل یا کتھا کو کہتے ہیں - اسے کبھی کبھی روہ راس بھی کہتے ہیں - روہ (راہ) پنجابی میں راستے کو کہتے ہیں —

۳ - " کیرت سوہیلا " :- یہ دعا سونے سے پہلے پڑھی جاتی ہے (گویا یہ مسلمانوں کی عشا کی نماز کی قائم مقام ہے) یہ ایک صفحہ اور ایک یا دو مصرعوں پر مشتمل ہے - یہ گرو نانک کی تصنیف ہے - لیکن اس میں رام داس اور ارجن کے اضافے ہیں اور ایک مصرعہ گرو گووند کا بھی ہے - کیرت سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی تعریف یا ثنا کے ہیں اور سوہیلا شادی کے گانے کو کہتے ہیں (اردو میں سوہیل بمعنی خوشی کے گیت کے ہیں) —

۴ - گرنتھہ کا دوسرا حصہ ۳۱ حصوں میں تقسیم ہے جو اپنی مخصوص قسم کی نظم کے اعتبار سے مندرجۂ ذیل طریقے پر تقسیم ہے (ہر حصے کے شروع میں راگ یا راگنی کا نام ہے جو

(۱) سری راگ (۲) مجھہ (۳) گوڑی (۴) آسا (۵) گوجری (۶) دیو گندھاری (۷) بہاگ (۸) ود ھنس (۹) سورٹھہ (۱۰) دھنا سری (۱۱) جیت سری (۱۲) ٹوڈی (۱۳) بیراڑی (۱۴) تہلنگ (۱۵) سودھی (۱۶) بلاول (۱۷) گوڑ (۱۸) رام کلی (۱۹) نٹ نرائن

(۲۰) مالی گورا (۲۱) مارو (۲۲) تکھاری (۲۳) کدارا (۲۴) بھیروں
(۲۵) بسنت (۲۶) سارنگ (۲۷) ملہار (۲۸) کانرا (۲۹) کلیان
(۳۰) پربھاتی (۳۱) جے جے ونتی —

یہ سب ۱۱۵۴ صفحوں میں ہے - یعنی مکمل گرنتھہ کا بہت بڑا حصہ بھی ہے - اس کے ہر ایک حصے کو ایک یا کئی گروؤں یا بھگتوں نے تصنیف کیا ہے - مندرجۂ ذیل گروؤں کی نظمیں اس میں شامل ہیں —

(۱) نانک (۲) انگد (۳) امر داس (۴) رام داس (۵) ارجن (۶) تیغ بہادر اور شاید کچھہ حصہ گووند کا بھی ہے —

(گرنتھہ صاحب کے جو بھگت (یا صوفی) اور دوسرے مصنف ہیں ان کے نام یہ ہیں) :-

(۱) کبیر (مشہور مصلح) - (۲) تریلوچن برہمن - (۳) بینی - (۴) راؤ داس چمار - (۵) نام دیو چھیپا (۶) دھنّا جاٹ (۷) شیخ فرید ایک مسلمان پیر (جو بابا فرید گنج شکر کی نسل سے تھے) - (۸) جے دیو برہمن (۹) بھیکن - (۱۰) سین نائی (۱۱) پیپا جوگی - (۱۲) سدھنا قصاب - (۱۳) رامانند بیراگی (ایک مشہور مصلح) - ۱۴ پرمانند - (۱۵) سور داس نابینا - (۱۶) میرن بائی بھگتنی - (۱۷) بلوند - (۱۸) ستّا ڈوم (۱۹) سندر داس ربابی (یہ بھگتوں میں شمار نہیں کیا جاتا) —

۵ - بھوگ :- سنسکرت میں اس لفظ کے معنی ہیں کسی چیز کا استعمال کرنا - لیکن عام طور سے ہندو اور سکھہ اسے کسی مقدس تحریر کے خاتمے کے لیے استعمال کرتے ہیں - اس کے ۹۶ صفحے ہیں - اور نانک ' ارجن ' کبیر شیخ فرید اور دوسرے مصنفوں کے علاوہ اس میں نو بھاٹوں کی تصنیفیں بھی ہیں -

یہ بھاٹ اَمّہر داس' رام داس اور ارجن کے ساتھہ رہا کرتے تھے —

بھوگ سنسکرت کے پانچ اشلوکوں سے شروع ہوتا ہے جو نانک صاحب کی تصنیف ہیں - اس کے بعد ۶۷ سنسکرت کے اشلوک ہیں جو ارجن نے ایک ہی بحر میں لکھے ہیں - اور پھر ۲۴ اشلوک ارجن ہی کی تصنیف سے دوسری بحر میں ہیں - اس میں ۲۳ اشلوک پنجابی اور ہندی میں ارجن کے ہیں جس میں امرتسر کی تعریف ہے - اس کے بعد ہی کبیر کے ۲۴۳ اشلوک اور شیخ فرید اور دوسروں کے ۱۳۰ اشلوک ہیں جن میں ارجن کے کچھہ اقوال ہیں - اس کے بعد کل بھاٹ اور دوسرے بھاٹوں کے گانے ارجن کی نظموں کے ساتھہ ملے ہوئے آخر تک ہیں —

جن نوبھاٹوں نے بھوگ کی تالیف میں حصہ لیا وہ یہ ہیں : —

(۱) مہیکا - اَمّہر داس کا ملازم ۲ - کل رام داس کا ملازم - ۳ - کل سہر ۴ - جالپ ' ارجن کا ملازم ۵ - سل ' ارجن کا ملازم ۶ - نل ۷ - متھرا ۸ - بل ۹ - کیرت —

یہ نام بظاہر خیالی و فرضی ہیں - ' گرو بلاس ' نامی کتاب میں صرف آتھہ بھاٹوں کے نام ہیں - اور ' نل ' کے علاوہ جتنے نام ہیں وہ سب گرنتھہ سے مختلف ہیں —

گرنتھہ کا تتمہ یا ضمیمہ

۱ - " بھوگ کا بانی یا خاتمہ کا تتمہ " : - اس کے تقریباً ۷ صفحے ہیں - پہلے کچھہ تمہیدی اشلوک ہیں جنمیں " اشلوک مہل پہلا " کہتے ہیں - یعنی پہلی صورت کا گانا - دوسرے نمبر پر " ملہار راجہ کو نانک کی نصیحت " ہے - تیسرا نمبر نانک کی " رتن مالا " کا ہے جسے چتراؤ ھار

کہہ سکتے ہیں، جس میں اصلی درویشوں کے صفات بتائی گئی ہیں -
چوتھے نمبر پر " حقیقت " ہے جس میں لنکا کے راجہ شیو ناب کے واقعات
ہیں جو ایک کتاب موسومۂ " پران سنگھلی " سے متعلق ہیں - اسے
بھائی بھلّو نے گووند کے زمانے میں تصنیف کیا تھا —
رتن مالا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اصل میں یہ ترکی (یا مسلمانوں
کی زبان) میں لکھی گئی تھی یا کسی ترکی تصنیف سے ماخوذ ہے —

دسویں بادشاہ کا گرنتھہ

یا

دسویں گرو یعنی گرو گووند سنگھہ کی کتاب

نوٹ - آدی گرنتھہ کی طرح یہ کتاب بھی نظم میں ہے - لیکن بحریں
اکثر بدلتی گئی ہیں —

یہ ہندی بولی میں ہے - رسم خط پنجابی ہے - اگرچہ آخری حصہ فارسی
ہے لیکن رسم خط گورمکھی ہی ہے - گرو گووند کی ہندی تقریباً ویسی ہی
ہے جیسی وادیٔ گنگا میں بولی جاتی ہے - اور اُس میں پنجابی بولی کی
بہت کم خصوصیات ہیں —

اس کتاب کی ایک فصل بھانیہ یا تاریخی سمجھی جا سکتی ہے -
یعنی " وچتر ناٹک " جسے خود گووند نے لکھا ہے - لیکن فارسی حکایات
یا کہانیاں بھی تقریباً اسی قسم کی ہیں - اور جو استعارے اس میں
درج ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص حالات کے ماتحت وہ لکھی گئی تھیں
اس کتاب کے دوسرے حصے، پہلی فصل کے مقابلے میں زیادہ اساطیری ہیں
اس کا طرز دنیاوی سا ہے - اگرچہ اس میں توحید باری تعالے اور اُس
کی عظمت و رحمت کا بھی اکثر مقامات پر شاندار تذکرہ ہے —

پانچ فصلیں اور چھٹی فصل کی ابتدا گووند سے منسوب ہیں - باقی حصہ (جو بہت زیادہ ہے) چار منشیوں نے لکھا ہے جو گرو کے ملازم تھے، جو شاید کسی حد تک گرو کے کہنے کے مطابق لکھا گیا ہے - دو فصلوں کے مصنفوں کا نام شام اور رام درج ہے - لیکن حقیقت میں اس کے مصنفوں کے متعلق بہت کم معلومات ہے - (ممکن ہے کہ شام سے مراد سری کرشن جی اور رام سے مراد رامچندر جی ہوں - اور ان کی تعلیم عمل و محبت کو اس طرح شام اور رام کے عنوانوں سے ظاہر کیا گیا ہے) —

دسویں بادشاہ کا گرنتھہ چھوٹی تقطیع کی ۱۰۶۶ صفحوں کی کتاب ہے - ہر صفحے میں ۲۳ مصرعے - اور ہر مصرعے میں ۳۸ سے ۴۱ تک حروف ہیں —

" دسویں بادشاہ کے گرنتھہ " کے مضامین

(۱) - " جاپ جی " یا مختصراً جاپ جو گرو نانک کی جپ جی کا پہلا یا آخری ضمیمہ ہے (یعنی سابقہ یا لاحقہ ہے) - یہ صبح کی دعا ہے (اور تقریباً مسلمانوں کی نماز صبح کے مقابلہ میں ہے) اس میں ۱۹۸ شعر ہیں اور سات صفحوں میں لکھی ہوئی ہے - یہ دعا گورو گووند جی کی تصنیف ہے —

(۲) - " اکال ستت " حمد باری تعالی - یہ ایک بھجن ہے جو عموماً صبح کو پڑھا جاتا ہے - ۲۳ صفحے ہیں، اور صرف نظم کی ابتدا گرو گووند کی تصنیف ہے —

(۳) - " وچتر ناٹک " یعنی حیرت انگیز قصہ - یہ گووند کی تصنیف ہے - اس میں اُنہوں نے پہلے اپنے خاندان کی فرضی تاریخ لکھی ہے - پھر اپنے اصلاحی کام کا تذکرہ ہے - اس کے بعد ہمالیہ کے سرداروں اور شہنشاہی افواج کے درمیان جو لڑائیاں ہوئی ہیں ان کا تذکرہ ہے - اس کے چودہ

حصے ہیں - پہلے حصے یا باب میں حمد ہے - آخری بھی اسی قسم کا ہے - اور اس میں ایک اضافہ ہے جس میں بتایا ہے کہ میں اپنے گزشتہ خوابوں کا حال اور موجودہ تجربات کو آئندہ لکھوں گا - وچتر ناٹک گرنتھہ کے ۲۴ صفحوں پر مشتمل ہے —

(۴) "چنڈی چرتر" اس میں چنڈی دیوی کی کرامتیں درج ہیں کہ کس طرح اُس نے آٹھہ دیووں (شیطانوں) کو فنا کیا - کہتے ہیں یہ کسی سنسکرت قصے کا ترجمہ ہے جو خود گرو گووند نے کیا ہے - یہ قصہ بیس صفحوں میں ہے —

جن شیطانوں یا دیوؤں کو چنڈی دیوی نے تباہ کیا ان کے نام یہ ہیں - (۱) مدھو کیٹب - (۲) مید کھسور - (۳) دھومر لو چن - (۴) چنڈ - (۵) منڈ (۶) رکت بیج - (۷) نشمبھہ (۸) شمبھہ —

(۵) "چنڈی چرتر (خرد)" اس میں وہی قصے ہیں جو چنڈی چرتر (بزرگ) میں ہیں - البتہ نظم کی بحر دوسری ہے - ۱۴ صفحے ہیں —

(۶) "چنڈی کی وار": یہ چنڈی کی کہانیوں کا مجموعہ ہے - ۶ صفحے ہیں -

(۷) "گیان پر بودھ" معرفت و عقل کی خوبیاں - اس میں خدا کی حمدیں ہیں - اور مہابھارت کے راجاؤں کی طرف بھی کچھہ کچھہ اشارہ ہے - ۲۱ صفحے ہیں —

(۸) "چوپائیاں چوبیس اوتاران کیاں" - یعنی چوبیس اوتاروں کے متعلق رباعیاں - یہ رباعیاں ۳۴۸ صفحوں میں ہیں - اور شام کی تصنیف سمجھی جاتی ہیں اوتاروں کے نام درج ذیل ہیں - (یہ اوتار سوائے نمبر ۲۲ کے سب ہندو اوتار ہیں) —

(۱) مچھہ (مچھلی) - (۲) کچھہ (کچھوا) - (۳) نر (شوہر) - (۴) نرائن -

(۵) موھلی - (۶) ورہ (سؤر) - (۷) نرسنگھ - (۸) (بون (بونا) - (۹) پرسرام - (۱۰) برھمہ - (۱۱) رُدر (رعد) - (۱۲) جالندھر - (۱۳) وشنو (۱۴) (نام نہیں ھے) (۱۵) ارھت دیو (جینیوں کا بانی مذھب) - (۱۶) من راجا - (۱۷) - دھنتر (ڈاکٹر یا وید) - (۱۸) سورج - (۱۹) چندر مان - (۲۰) رام - (۲۱) کرشن - (۲۲) نر (یعنی ارجن) - (۲۳) بودھ ۲۴ - کلکی جو کلجگ کے اخیر میں ظاھر ھوگا جب کہ انسانوں کے گناہ حد سے زیادہ بڑھ جائیں گے —

(۹) - " مہدی مہر " (کوئی نام درج نہیں ھے لیکن ' مہدی مہر " کے نام سے مشہور ھے) - یہ ۲۴ اوتاروں کا ضمیمہ ھے کہتے ھیں کہ جب کلکی اوتار کا کام ختم ھوجائے گا تو مہدی ظاھر ھوں گے - یہ نام اور خیال مسلمانوں سے لیا گیا ھے - یہ ایک صفحہ سے بھی کم ھے —

(۱۰) - " برھمہ کے اوتار " (حالانکہ عنوان پر کوئی نام درج نہیں ھے) - اوتاروں کے نام درج ذیل ھیں —

(۱) والمیک - (۲) کشپ - (۳) شکر - (۴) بشیس - (۵) ویاس - (۶) ششٹ ریشی یا چھہ بزرگ - (۷) کل داس —

راجاؤں کے نام درج ذیل ھیں :—

(۱) من - (۲) پرتھہ - (۳) سگر - (۴) بن - (۵) مندھاتا - (۶) دلیپ - (۷) رگھہ - (۸) آج —

(۱۱) " ردر یا شیو کے اوتار " - (حالانکہ یہ نام درج عنوان نہیں ھے) یہ ۵۹ صفحوں میں ھے - اور صرف دو اوتاروں کے نام درج ھیں یعنی " دت " اور " پرسناتھہ " —

(۱۲) - " شستر نام مالا " (ھتھیاروں کے ناموں کی زنجیر) گرو

گووند ھتھیاروں کو گرو مانتے ھیں اور اُن کی مدح کرتے ھیں - حالانکہ یہ تصنیف گرو گووند سے منسوب نہیں ھے - ۶۱ صفحے ھیں —

(۱۳) - " سری مکھہ واک سوتیا بتیس " (۳۲ مصرعوں میں گرو گووند کی آواز) یہ نظم گرو گووند کی تصنیف ھے اس میں وید ' پران اور قرآن کی برائی کی گئی ھے - ۳ $\frac{1}{2}$ صفحوں میں ھے —

(۱۴) هزارہ شبد (هزار الفاظ) ۱۰ مصرعے ھیں - دو صفحوں میں ھے خدا کی تعریف اور شرک اور پھر پرستی کی برائی میں ھے —

(۱۵) استری چرتر (عورتوں کے قصے) ۴۰۴ کہانیاں ھیں جس میں عورتوں کے چال چلن اور عادات کا تذکرہ ھے - ایک سوتیلی ماں اپنے سوتیلے بیٹے پر عاشق ھو جاتی ھے - جب وہ لڑکا اس کی خواھشات کی طرف توجہ نہیں کرتا تو وہ راجا سے کہتی ھے کہ تمہارے ولی عہد نے مجھہ پر ھاتھہ ڈالا ھے - راجا اس کے لیے موت کا فتویٰ صادر کرتا ھے - لیکن وزرا نے درمیان میں پڑ کر کچھہ دنوں کی مہلت لی - پھر انھوں نے کہانیوں کا ایک سلسلہ شروع کردیا جس میں راجا کو یہ معلوم ھو گیا کہ میرا لڑکا بے قصور اور میں جلد باز ھوں - یہ کہانیاں ۴۴۶ صفحوں (یعنی نصف گرنتھہ) میں ھیں - ان کہانیوں کے لکھنے والوں میں شام کا نام بھی ھے —

(۱۶) حکایات - بارہ کہانیاں ھیں جو ۸۶۶ اشعار پر مشتمل ھیں - یہ فارسی زبان اور گورمکھی رسم خط میں ھیں - یہ گووند کی تصنیف ھیں اور اورنگ زیب کو نصیحت کے طور پر ھیں - یہ حکایات شہنشاہ کے پاس دیا سنگھہ اور چار سکھہ لے گئے تھے - اس کے ساتھہ ایک خط بھی تھا جو گرنتھہ میں شامل نہیں ھے - یہ حکایات ۳۰ صفحوں میں ھیں اور گرو گوند سنگھہ

کا گرنتھہ ان پر ختم ہو جاتا ہے —

دسویں پادشاہ کا گرنتھہ اردو زبان کے نقطۂ نظر سے اس لیے زیادہ دلچسپ ہے کہ عوام میں فارسی کی حکایتوں اور فارسی الفاظ نے زبان اور خیالات میں ایک قسم کی تبدیلی پیدا کردی ہے - یہ اس قلبی احساس کو بھی ظاہر کرتا ہے جو عموماً کل ہندوستانیوں اور خصوصاً سکھوں کو مسلمانوں کے مذہب ' تصوف ' زبان اور طرز حکومت سے تھا - اس کا ثبوت یہی کافی ہے کہ انھی درویشوں کے مقولے ان ھی کی زبان سے ادا کردیے جائیں اور اُن کا ترجمہ بھی دے دیا جاے - آئندہ صحبت میں اس دلچسپ موضوع سے بحث ہوگی —

روسی ڈراما

از

جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب بی - اے (آکسن)

(اوس تروف سکی سے انقلاب تک)

اوس تروف سکی کے ہم عصر انشاپردازوں میں سے کئی نے ڈراما نویسی کے میدان میں طبع آزمائی کی، لیکن اس فن کی قدرتی استعداد کسی میں نہیں تھی اور کسی نے مشق اور محنت بھی جیسی کہ چاہیے نہیں کی- تور گینف نے ۱۸۴۸ اور ۱۸۵۱ کے درمیان کئی فرحیہ ڈرامے لکھے جو زبان کے لحاظ سے بہت اعلیٰ ہیں، مگر فن ڈراما نویسی کے اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتے- الکساندر تالستائی کے تین تاریخی ڈرامے، " آورن ہیبت ناک کی موت " " بوریس گودو نوف " اور " زار فیوڈر اوانوویچ " اس صنف کے خاصے نمونے ہیں اور روسی دربار کے جو مناظر ان میں دکھائے گئے ہیں وہ اسٹیج پر بہت شاندار اور موثر بنائے جاسکتے ہیں - الکساندر تالستائی زار الکساندر دوم کا قریبی دوست تھا، درباری زندگی سے خوب واقف تھا، اور وہ دشواریاں جو روس جیسے ملک کے بادشاہ کو گھیرے رہتی تھیں، وہ قوتیں جو اسے راہ راست پر آنے

سے روکتی تھیں سب تالستائی کی نظر میں تھیں ۔ اس وجہ سے وہ تاریخی ڈرامے لکھنے کے لیے بہت موزوں تھا ، اور اپنی واقفیت اور تجربے سے اس نے فائدہ بھی اُٹھایا - مگر اور تاریخی ڈراموں کی طرح تالستائی کی تصانیف میں بھی رومانیت اور مصنف کے اپنے خیالات اور تخیل نے ذرا زیادہ دخل دے دیا ہے اور معاشرتی حیثیت سے ان کی قدر کچھہ کم کردی ہے ـــ

مقبولیت اور جدت خیال کو دیکھا جاے تو اوس تروف سکی کے ڈراموں کے بعد ناول نویس پی سم سکی کے ڈراما " بدبختی " کا درجہ آتا ہے - ڈراما کا موضوع ۱۸۹۱ کی اصلاح سے پہلے کے زمینداروں اور کسانوں کے تعلقات ہیں - قدرت نے نہ زمیندار کو اخلاقی حس سے محروم رکھا ہے نہ کسان کو ، دونوں میں معقول زندگی بسر کرنے کی صلاحیت موجود ہے ، لیکن " بدبختی " میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک وحشیانہ قانون سب کی سیرتوں کو اس طرح بگاڑ دیتا ہے کہ وہ نیم مجرم ہوکر رہ جاتے ہیں اور انتہائی بداخلاقی کی حرکتیں کرتے ہیں - ڈراما کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک کسان نے ، جو قانون کے روسے غلام تھا ، اتنی آزادی حاصل کرلی ہے کہ گانو چھوڑ کر دارالسلطنت میں اپنی قسمت آزمانے کو جاسکے ۔ وہ کئی سال وہاں رہ کر واپس آتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی کا زمیندار آقا سے ناجائز تعلق ہوگیا ہے ، اور آقا سے اس کے ایک بچہ بھی ہوا ہے - کسان غصے میں آکر بچے کو مار ڈالتا ہے اور پھر اسے اپنے جرم کی سزا بھگتنا پڑتی ہے - جو لوگ غلامی کے قانون سے نفرت کرتے تھے انھیں یہ ڈراما بہت پسند آیا ، ہم بھی کسی ایسے قانون کو نفرت ہی کی نگاہ سے دیکھیں گے ، لیکن " بدبختی " کے بارے میں یہی خیال ہوگا کہ اس

میں نفاست اور شائستگی نہیں' اور اس کی دلچسپی کا دارومدار ایسی واردات پر ہے جو حد درجہ ناگوار ہوتی ہیں اور یہ ذرا مشکل سے یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ عام حقیقت کا آئینہ ہیں —

" بد بختی " کے علاوہ اور بہت سے ڈرامے اسی زمانے میں لکھے گئے جن کا محرک خالص ادبی شوق تھا یا اصلاح کی خواہش - کوبی لن' پالم (۱۸۲۲ - ۱۸۸۵) اور پوتھے خن (۱۸۲۹ - ۱۹۰۲) ان ڈراما نویسوں میں سب سے ممتاز مانے جاتے ہیں - کوبی لن کا انداز طنزیہ ہے' اور اس کے ڈرامے جن میں " کرش چن سکی کا نکاح " سب سے زیادہ کامیاب ہوا ' سرکاری ملازموں کی رشوت ستانی اور دوسرے عیبوں کو ظاہر کرتے ہیں - پالم کا مقصد روسی زمینداروں کی سیرت اور فلسفۂ حیات واضح کرنا تھا' اور اس طبقے کے جو نمونے اس نے پیش کیے وہ تور گینف کی مشہور سہرتوں سے کچھ کم حقیقت نما نہیں - پوتھے خن کا موضوع وہی ہے جو کوبی لن کا ' فرق بس یہ ہے کہ اس کے ڈراموں میں جن سرکاری ملازموں کی قلعی کھولی گئی ہے وہ ۱۸۶۱ کی اصلاحوں کے بعد کے ہیں - وہ رشوت نہیں لیتے مگر کسی کا کام بھی نہیں کرتے ' اور " ایمانداری " نے ان کی خود پسندی اور خود غرضی کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ وہ ملک کے لیے اپنے پیش روؤں سے بھی بد تر ثابت ہوئے ہیں —

ان تمام ڈراما نویسوں اور ڈراموں کو دیکھتے ہوئے بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اوس تروف سکی کے مرنے پر جو عہدہ خالی ہوا اس کا کوئی حقدار ثابت نہ ہوا' اور جب ۱۸۹۸ میں ماسکو آرٹ تھیٹر نے چخوف کا پہلا ڈراما دکھایا تبھی لوگوں نے محسوس کیا کہ روس کو اوس تروف سکی کا ایک جانشین نصیب ہوا ہے - یورپ کے اہل ذوق

میں اوس تروف سکی سے بہت پہلے چخوف کا چرچا ہوا' اور یورپ میں چخوف ہی خاص روسی طرز کا موجد اور استاد مانا جاتا ہے لیکن اگر اس کے ڈراموں کا اوس تروف سکی کے آخری کام سے مقابلہ کیا جاے تو ظاہر ہوجاے گا کہ چخوف نے کوئی نیا طرز ایجاد نہیں کیا بلکہ اوس تروف سکی کے طرز کو ایک نیا رنگ دیا ہے - اسی طرح ماسکو آرٹ تھیٹر کو بھی ایک بالکل ہی نیا مظہر نہ سمجھنا چاہیے - ایکٹنگ کا جو مسلک اس تھیٹر نے اختیار کیا اس میں پہلا قدم اوس تروف سکی نے رکھا تھا' اور اس تھیٹر کے وہ اوصاف جو یورپ میں نئے اور بہت نرالے سمجھے گئے ان ایکٹروں میں موجود تھے جنھوں نے اوس تروف سکی سے سبق لیا تھا اور جو گفتگو اور واقعات کے سہارے اس خاص فضا کو بھی پیدا کرسکتے تھے جس میں ڈراما کی سیرتیں ڈوبی ہوئی ہوتیں - چخوف کے ڈراموں کا پورا اثر اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اسٹیج پر دیکھے جائیں' اس لیے کہ وہ اسٹیج ہی پر جاکر مکمل ہوتے ہیں' اور انھیں ایکٹر ہی تکمیل کو پہنچاسکتے ہیں - ایکٹروں کو فن کے وہ بھید بتانا کہ بھیس بدلنے کے ساتھ ان کی کایا بھی پلٹ جائے اوس تروف سکی کا کام تھا' اور اس کی رہبری کے بغیر روسی ایکٹروں میں وہ مہارت ہرگز پیدا نہ ہوسکتی تھی جو چخوف کے ڈراموں میں جان ڈالنے کے لیے درکار ہے —

چخوف کے ڈراموں کی سب سے نمایاں خصوصیت' جس پر یورپی نقادوں کی سب سے پہلے نظر پڑی' پلاٹ کی عدم موجودگی ہے - یہ خصوصیت ہم بیان کرچکے ہیں کہ اوس تروف سکی میں بھی پائی جاتی ہے' چخوف نے ذرا مبالغہ کر کے اپنے آپ کو قصہ سنانے کی پابندی سے بالکل آزاد کرلیا' جس زندگی کے مناظر وہ دکھانا چاہتا تھا اسے انتہائی وسعت

دے دی، اور ان سیرتوں اور روحانی کیفیتوں کو جو اس کا موضوع تھیں اپنی اصلی اور مکمل صورت میں پیش کیا۔ اس کے زمانے تک وہ تمام مسائل جن پر اوس ترونسکی بحث کرنا ضروری سمجھتا تھا اپنی اہمیت کھو چکے تھے، معاشرت میں جو تبدیلیاں ہو سکتی تھیں، ہو چکی تھیں، اب ایسی رکاوٹیں نہیں رہی تھیں جو حوصلے کو دبا کر ابھارتی ہیں بس سپاہی غلامی باقی تھی اور اس سے حوصلے ٹکراکر پاش پاش ہوتے رہتے تھے، روس ایک جنگل تھا جسے باغ بنانے کی خاطر لوگ درختوں کو کاٹ کر برابر کرچکے تھے، لیکن جب ایک صاف سپاٹ میدان نکل آیا تو اسے زرخیز اور شاداب بنانے کی مہم سے سب جی چرانے لگے، اور روسی زندگی کو ویرانی کی ہوا لگ گئی۔ چیخوف کا زمانہ شدید مایوسی اور پست ہمتی کی فضا میں ڈوبا ہوا تھا اور زندگی کی چہل پہل پر بھی سناٹا چھایا رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں چیخوف کے ڈراموں میں انفرادی زندگی کے چھوٹے مقاصد بھی نہیں ملتے، اور اس کشمکش کا تو نام و نشان بھی نہیں جسے پیش کرنے کے لیے ڈراما کا فن ایجاد کیا گیا —

چیخوف کا کمال اس میں ہے کہ اس نے ایسی سیرتوں اور ایسی زندگی کو جو مقاصد ہی نہیں بلکہ شکل سے محروم تھی ڈراما کی شکل دیدی۔ قصہ سنانا، نصیحت کرنا، اصلاح کو مد نظر رکھ کر عام زندگی کے بصیرت افروز نمونے منتخب کرنا آسان ہے، ایسے لوگوں کے حالات کو جو نہ کچھ ہونا چاہیں اور نہ کچھ کرنا چاہیں، ایسی معاشرت کو جس میں کوئی تحریک باقی نہ رہی ہو ایک موثر ڈراما بنا دینا نہایت ہی نازک خیال، نکتہ بیں اور اپنے فن میں کامل آرٹسٹ کا کام ہو سکتا ہے۔ بظاہر چیخوف کے سامنے ڈراما کے لیے کوئی سامان ہی نہ تھا، لیکن اس نے اپنے ہم وطنوں

کی بود باش ' ان کی ناکامیوں اور حسرتوں کو لے کر ایک پوری دنیا آباد کردی ' ان کی سیرتوں کے اس پہلو کو جو سب سے زیادہ عمومیت رکھتا تھا خاص انداز سے نمایاں کر کے ان کی سرگزشت اور ان کی کیفیتوں کو ایک لطیف مناظرہ بنادیا - چیخوف کے ڈرامے اپنے زمانے کی حقیقت یعنی ایک نسل اور اس کی تہذیب کو فنا ہوتے ہوئے دکھاتے ہیں ' مگر ناکامی اور زوال کی یہ کیفیت عام انسانی احساسات کا عکس ہے ' روسی تاریخ کا ایک دور ہی نہیں ' ہماری آپ بیتی کا ایک ٹکڑا ہے —

چیخوف کے ڈراموں میں پلاٹ نہیں ہوتا ' بلکہ غور کیا جائے تو فضا کے سوا کچھہ ہوتا ہی نہیں۔ چیخوف نے حقیقت کا خیال کرکے معاشرتی مقاصد اور ان سطحی اور گہرے تعلقات کو جو یہ مقاصد لوگوں کے درمیان پیدا کرتے ہیں نظر انداز کیا ' اور آدمی آدمی کے رشتے کو بالکل ہی توڑ دیا - اس کے ڈراموں میں ہر سیرت ایک بالکل جدا ہستی رکھتی ہے ' نگاہوں کے ملنے پر بھی دل دور رہتے ہیں ' اور محبت کی تیز آنچ بھی دو ہستیوں کو گلاکر ایک نہیں کرسکتی - وہ سمجھتا تھا کہ انسان اتنا تنگ نظر ' خود غرض اور سرد مہر ہوتا ہے کہ اس کے وہ اعلیٰ جذبات جن پر وہ ناز کرتا ہے ' یا وہ حوصلے جو زندگی میں ربط اور ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں اس کی سرشت کے ان عیبوں پر غالب نہیں آسکتے - چیخوف کے ڈراموں کی گفتگو اکثر بے سروپا ہوتی ہے ' ہر شخص اپنی بات کہے جاتا ہے ' دوسرے کی سمجھے کیا ' سنتا ہی نہیں ' ہر شخص اپنی ذات میں محو رہتا ہے ' اور اپنی آرزوؤں اور حسرتوں کے آگے کچھہ دیکھتا ہی نہیں - یہ بیگانگی جانوروں کی سی بے تعلقی نہیں ہے ' ایک مجبوری معلوم ہوتی ہے ' ایک سزا جسے سب کو یکساں بھگتنا

پڑتا ہے اور جس کا سب کو صدمہ ہوتا ہے ۔ سب ذات کی اس کال کوٹھ
سے نکلنا چاہتے ہیں ، ایسی جماعت بننا چاہتے ہیں کہ جس پر وہ اپ
انفرادیت نثار کرسکیں ، لیکن انھیں نہ اپنی ذات میں ثبات اور استح
نظر آتا ہے اور نہ جماعت میں ، وہ نہ درخت کی طرح زمین کو مضب
پکڑ سکتے ہیں نہ پانی کے قطروں کی طرح دریا بن کر بہ سکتے ہیں
بس ایک غبار ہیں کہ جس کا اٹھنا بیٹھنا اس کے اپنے اختیار میں نہ
بلکہ بے مقصد حادثات کا سب سے حقیر اور بے معنی پہلو ہے —

چیخوف کے نقطۂ نظر کی تمام خصوصیات اس کے پہلے ڈرامے " اوانوف
میں پائی جاتی ہیں - اوانوف ایک حوصلہ مند نوجوان ہے جو خا
مفید کام میں مشغول ہے اور روسیوں اور یہودیوں کے درمیان تعص
کو مٹانے کے خیال سے اس نے ایک یہودن سے شادی کی ہے - سیر
کی ناموافقت سے دونوں میں ناچاقی پیدا ہوجاتی ہے ، جس کے صد
سے اوانوف کی بیوی کو دق ہوجاتی ہے - بیوی کی بیماری اور
دن کی مالی دشواریاں اوانوف کی زندگی کو بالکل بے لطف کردی
ہیں اور اس کا مزاج بہت بگڑ جاتا ہے - پہلے تین ایکٹ میں میاں بیو
کے تعلقات کا یہ رنگ ہی بس ڈراما کا موضوع ہے ، اور باقی جو سیرتیں ہ
وہ اپنے اپنے خیال میں محو اور ایک دوسرے سے بے خبر رہتی ہیں
بیوی کی بیماری کے زمانے میں اوانوف اور ایک لڑکی ساشا کے درمی
ہمدردی اور ایک نئی زندگی تعمیر کرنے کا اشتیاق خاص لگاؤ پیدا کرد
ہے ، اور (چوتھے ایکٹ میں) جب اوانوف کی بیوی کا انتقال ہو ج
ہے تو ساشا اوانوف کو خوش رکھنے اور اس کے دل سے گزشتہ غموں کی ی
مٹانے کا بیڑا اٹھاتی ہے - لیکن بیوی کے مرنے پر اوانوف کی طبیعت م

ایک اور انقلاب رونما ہوتا ہے ' پہلے وہ ہمدردی کی تلاش میں تھا تو اب اپنی سرشت کی خرابیوں کا ہر وقت ذکر کرتا رہتا ہے ' اور پچھلی غلطیوں اور ناکامیوں کا اس کی اپنی طبیعت سے جو تعلق تھا اسے بیان کرتا رہتا ہے - ساشا کا نوجوان دل جو ایثار پر آمادہ ہوگیا تھا اس قسم کی ایذا رسانی کو برداشت نہیں کر پاتا ' وہ اپنے مستقبل سے بہت مایوس ہو جاتی ہے مگر اوانوف سے شادی کرنے کے ارادے پر قائم رہتی ہے - ڈراما کے آخری سین اس بے تعلقی کو جو تمام اشخاص کے درمیان تھی بالکل واضح کردیتے ہیں ' سب محسوس کرتے ہیں کہ کوشش کرنے پر بھی وہ ایک دوسرے کی طبیعت کو سمجھ نہیں سکتے ' اور یہ احساس سب میں ایک عجیب سی بے چینی پیدا کر دیتا ہے - آخر میں اوانوف ' جو یہ نہیں چاہتا کہ اس کی اپنی زندگی کو سدھارنے کی امید میں ساشا کا مستقبل خطرے میں ڈالا جائے ' خود کشی کر لیتا ہے ' اور ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے حالات اور ایسی صورتیں زندگی میں جو گتھیاں ڈال دیتی ہیں انہیں موت کے سوا کوئی سلجھا نہیں سکتا —

" اوانوف " میں بہت صفتوں کے ساتھ وہ خامیاں بھی موجود ہیں جن کے تجربے اور مشق کی کمی کا پتہ چلتا ہے - مختلف اشخاص میں جس طرح کی بے تعلقی دکھائی گئی ہے اس پر مبالغے کا شبہ ہوتا ہے ' اوانوف کی صورت اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی ' اور نفسیات کے معمے پیش کرنے میں سبب اور نتیجے کا اصول کچھ نظر انداز کیا گیا ہے - چخوف کی ڈراما نویسی کے تمام اوصاف اس کے دوسرے ڈرامے " بگلے " میں پائے جاتے ہیں اور انسان کی طبیعت اور اس کی زندگی کی فضا کا ایک دوسرے سے جو تعلق ہے وہ بھی صاف ظاہر ہو جاتا ہے - " اوانوف " کے مقابلے میں

یہ ہم کو کہیں زیادہ افسردہ اور اداس کرتا ہے ' اور اگر پہلے ڈرامے میں ایک اوانوف تھا جسے زندگی کی دشواریوں نے عاجز اور دیوانہ کردیا تھا تو " بگلے " میں کئی سیرتیں ہیں جن کی یہی کیفیت ہے ' اور جنھیں چند روز کے لیے بھی ساشا کی طرح کا کوئی قدردان اور غم میں شریک ہونے والا نہیں ملتا - لیکن بعد کے تینوں ڈراموں " وانیاماموں " " تین بہنوں " اور " باغ " کی طرح یہ بھی چخوف کے فن کا کامل نمونہ ہے ' اس میں کوئی بات ادھوری ' کوئی رنگ ہلکا یا پھیکا نہیں رہ گیا ہے —

" بگلے ' میں کوئی مرکزی شخص یا سیرت نہیں ' ہر ایک کا اپنا الگ دکھ ہے ' اور سب یکساں بےبسی میں تڑپتے رہتے ہیں - آرکاڈینا ایک سن سے اُتری ہوئی ایکٹرس ہے جو دن رات بس اپنی شہرت اور کامیابیوں کے خیال میں ڈوبی رہتی ہے ' یہاں تک کہ اسے اپنے بیٹے کونستان تن سے بھی ' جو ایک ہونہار ' حوصلہ مند اور شاعرانہ مزاج کا نوجوان ہے کوئی مطلب نہیں - کونستان تن سے آرکاڈینا کے داروغہ کی لڑکی ماشا کو ایسی محبت ہے کہ اس کا نام ہی پکارنے میں ماشا کو بڑا مزہ آتا ہے' مگر کونستان تن کو اس سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ' اور اس کو اسی سے الجھن ہوتی ہے کہ ماشا اس کا نام لیا کرتی ہے - خود کونستان تن کو پڑوس کے ایک زمیندار کی لڑکی نینا سے محبت ہے ' مگر جب نینا کی آرکاڈینا کے یہاں ایک مشہور انشاپرداز تری گورن سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ کونستان تن اور اس کی دوستی کو بالکل بھول جاتی ہے اور تری گورن پر عاشق ہوجاتی ہے - نینا کو شہرت حاصل کرنے کی ہوس ہے ' وہ تھیٹر میں نام پیدا کرنا چاہتی ہے ' اور شاید اسی امید میں

که ترو گورن کی سرپرستی اسے جلد کامیاب کر دے گی' وہ کونستان تن کو چھوڑ دیتی ہے- لیکن ترو گورن کچھہ دنوں اس کی محبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے بعد اپنا برتاو بدل دیتا ہے اور دوسری عورتوں کے پیچھے لگ جاتا ہے' اور تھیٹر میں بھی نینا کو قابلیت کی داد دینے والے نہیں ملتے' حسن کے خریدار ہی ملتے ہیں - نینا کا باپ خفا ہو کر اسے گھر سے نکال دیتا ہے اور شریف عورتیں اسے دیکھہ کر منہ پھیرلیتی ہیں' پھر بھی نینا اپنی شکست کو تسلیم نہیں کرتی' اور آخری ایکٹ میں کونستان تن کو اپنا سارا ماجرا سنا کر کہتی ہے که میں یہ اور ایسے اور صدمے برداشت کرتی رہوں گی - وہ جانتی ہے که کونستان تن کو اس سے سچی محبت ہے' یہ بھی جانتی ہے کہ دنیا میں بس وہی اس کی تمام لغزشوں کو معاف کر سکتا ہے اور اس کی قدر بھی کر سکتا ہے' مگر یہ سب جانتے ہوے بھی وہ ترو گورن کو نہیں چھوڑتی' اور برا برتاؤ اس کی محبت کو گھٹاتا نہیں بلکہ اور بڑھا دیتا ہے - اس آخری گفتگو کے بعد کونستان تن اپنے افسانوں وغیرہ کے مسودے جلا دیتا ہے اور اپنے گولی مار لیتا ہے —

" بگلے " میں جذبات کا جو الجھاؤ ہے اسے سلجھانا خالی ارادے کے بس کی بات نہیں - ایک موقع پر ماشا ڈاکٹر دورن سے کہتی ہے —

" میری مدد کیجیے ' ورنہ میں کوئی بے تکی حرکت کر بیٹھوں گی اپنی جان لے لوں گی ' تباہ ہوجاوں گی --- مجھے بڑا دکھہ ہے ' میرے دکھہ کا حال کوئی بھی نہیں جانتا ' کوئی بھی - (دورن کے سینے پر سر رکھہ کر) میں کونستان تن کو چاہتی ہوں ' بیچارے ڈاکٹر کے پاس اس بیماری کی کوئی دوا نہیں - وہ جواب دیتا ہے —

" تم سب کے اعصاب کیسے کمزور ہیں ! .. اور محبت کی بھی کیا

بھرما رہے! ... (نرمی سے) مگر، میری بچی، میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟" —

ماشا نے خود ایک تدبیر سوچی ہے، جو وہ ترو گورن سے بیان کرتی ہے —

"میں یہ سب آپ کو اس خیال سے بتا رہی ہوں کہ آپ انشاپرداز ہیں ... دیکھیے میں نے بیٹھے بیٹھے طے کیا ہے کہ کونستان تن کی محبت کو اپنے دل سے نکال دوں گی، جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دوں گی ... محبت کرنا جب کوئی امید نہ ہو، برسوں انتظار کرنا کہ شاید کچھ ہو جائے .. لیکن جب میں شادی کر لوں گی تب محبت کرنے کی مہلت ہی نہ ہوگی، نئی فکریں اور ذمہ داریاں سب گزرے ہوئے زمانے کی یاد کو مٹا دیں گی۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ ذرا تبدیلی ہو جائے گی" —

ماشا شادی کر لیتی ہے اور اس کے ایک بچہ بھی ہو جاتا ہے، مگر کونستان تن کی محبت اسے دیوانہ بنائے رکھتی ہے۔ اسے یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر اس کے شوہر کا کسی اور شہر میں تبادلہ ہو جائے تو شاید اس کی حالت سنبھل جائے گی، مگر اس کے انداز سے ظاہر ہوتا رہتا ہے کہ یہ بھی خالی بہلاوا ہے —

چیخوف کے تیسرے ڈرامے "وانیا ماموں" میں جذبات کا وہ الجھاؤ نہیں ہے جو روسی معاشرت نے پیدا کیا تھا، لیکن اس وجہ سے اس کو پڑھ کر دل پر اور بھی زیادہ سخت چوٹ لگتی ہے۔ سے ریب ریاکوف، ایک پروفیسر اور انشاپرداز، جس کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے، دوسری شادی کرتا ہے اور بیوی کے ساتھ اس مکان میں جا کر رہتا ہے جو اس کی پہلی بیوی کو جہیز میں ملا تھا۔ مکان کے ساتھ تھوڑی سی

جائداد بھی ہے جس کا انتظام شروع سے اس کے سالے (پہلی بیوی کے بھائی) ووئی نیت سکی کے سپرد رہا ہے' اور سریب ریاکوف کی لڑکی سونیا بھی ہوش سنبھالنے کے بعد سے جائداد کے کام میں اپنے ماموں کی مدد کرتی رہی ہے - ماموں بھانجی دونوں خوش اور مطمئن تھے' اور چونکہ انھیں خیال تھا کہ سریب ریاکوف علمی اور ادبی دنیا میں بڑی حیثیت رکھتا ہے اس لیے وہ اس کی خدمت کرنا ضروری اور اچھا سمجھتے تھے - مگر جب پروفیسر اپنی نوجوان اور خوبصورت بیوی کے ساتھ مکان میں آکر رہنے لگتا ہے تو دونوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں - سونیا شروع میں اپنی سوتیلی ماں سے بات تک نہیں کرتی' ووئی نیت سکی کو یقین ہوجاتا ہے کہ پروفیسر اوچھے علم اور کمینی طبیعت کا آدمی ہے' وہ اسے خوبصورت بیوی رکھنے کا مستحق نہیں سمجھتا' اسے موقع بے موقع برا بھلا کہتا ہے اور اس کی بیوی سے ایسی باتیں کرتا ہے جو کوئی شریف عورت گوارا نہیں کرسکتی - ووئی نیت سکی کو سب سے زیادہ شکایت اس بات کی ہے کہ وہ ۴۷ برس کا ہوگیا ہے قابلیت میں کسی سے کم نہیں' مگر ایک غلط فہمی کی وجہ سے اس کی عمر کا بہترین حصہ ضایع ہوچکا ہے اور اب اس کے لیے زندگی کا لطف اٹھانے کا موقع نہیں - سریب ریاکوف کو عورتیں نہ معلوم کیوں پسند کرتی ہیں' وہ واقعی نہایت خود غرض اور تکلیف دہ مزاج کا ہے' اور ہمیں اس پر مطلق افسوس نہیں ہوتا کہ ووئی نیت سکی اسے طعنے دیکر گھر سے بھگا دیتا ہے - لیکن اس کے چلے جانے سے کوئی مشکل آسان نہیں ہوتی - ووئی نیت سکی کے شکوہ شکایت کا انداز وہی رہتا ہے اور بیچاری سونیا کو دنیا سے کوئی امید ہی نہیں رہتی - جب تک

پروفیسر مکان میں رہا، آستروف، ایک ڈاکٹر، اسے اکثر دیکھنے آیا کرتا تھا۔ سونیا کی ڈاکٹر سے پہلے بھی ملاقات ہوتی تھی، اور سونیا کو اس سے بڑی محبت تھی، مگر سونیا کی صورت شکل اچھی نہیں تھی، اس لیے ڈاکٹر نے کبھی اس کی محبت کی پروا نہیں کی - باپ کی موجودگی کے زمانے میں سونیا نے ایک مرتبہ اپنی سوتیلی ماں سے کہا کہ آستروف سے باتوں باتوں میں دریافت کرلے کہ وہ شادی پر راضی ہوگا یا نہیں، اسے کیا خبر تھی کہ اس درمیان میں آستروف اس کی سوتیلی ماں کا گرویدہ ہوگیا ہے، اور وہ بھی اپنے اصولوں کے باوجود ڈاکٹر سے بالکل بے التفاتی نہیں برت سکی ہے - وہ گفتگو جس میں سونیا کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا ڈاکٹر کے لیے اپنے جذبے کے اظہار کا موقع بن جاتی ہے اور ڈاکٹر کو سونیا کی سوتیلی ماں کے میلان کا بھی پتہ چل جاتا ہے - گفتگو کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سونیا کی سوتیلی ماں کو دو چار مرتبہ پیار کرلیتا ہے، اور وہ شوہر کے ساتھ جانے لگتی ہے تو یادگار کے طور پر ڈاکٹر کی ایک پنسل اپنے پاس رکھ لیتی ہے - آخر میں جب سب چلے جاتے ہیں تو سونیا اور اس کے ماموں کے لیے کسی نہ کسی طرح دل کو سمجھا بجھا کر تنہائی اور بے لطفی کی زندگی برداشت کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا - چیخوف نے ڈرامے کے آخری سین میں اپنے دل کا سارا درد بھر دیا ہے :-

وونی نیٹ سکی (سونیا کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے : میری بچی میرے دل پر بڑا بوجھ ہے، تجھے کیا بتاؤں کیسا بوجھ ہے! سونیا : کیا کریں، جینا تو پڑے ہی گا! (خاموشی) تو کیا ہوا، وانیا ماموں، پھر جئیں گے - دنوں کا ایک لگاتار سلسلہ، شام کا گراں وقت، گزار دیں گے

قسمت ہماری جس طرح پر بھی آزمائش کرے، ہم اسے صبر کے ساتھ بھگت لیں گے - اب، اور بڑھاپے میں ہم دوسروں کے لیے محنت کریں گے آرام کا نام نہ لیں گے، اور جب ہماری گھڑی آئے گی تو عاجزی کے ساتھ مر جائیں گے، اور قبر کے اس پار پہنچ کر ہم کہیں گے کہ ہم نے مصیبتیں جھیلی ہیں، روئے ہیں، ہم کہیں گے کہ ہمارے لیے زندگی تلخ تھی، خدا کو ہم پر رحم آئے گا اور تب، ماموں، میرے پیارے ماموں، ہم پر ایک روشن حسین، پر لطف زندگی کا دروازہ کھلے گا، اس وقت کے غم پر ہم کو حیرت ہوگی، اس کا خیال کر کے ہم مسکرائیں گے - اور تب ہمیں آرام ملے گا - مجھے یقین ہے، دل و جان سے یقین ہے ... (گھٹنوں پر کھڑی ہو کر ماموں کے ہاتھوں پر سر رکھہ دیتی ہے؛ تھکی آواز سے) ہم کو آرام ملے گا! ... مجھے یقین ہے یقین ہے ... (ماموں کے آنسو پونچھتی ہے) میرے بیچارے، بیچارے ماموں، آپ رو رہے ہیں ... (خود رو کر) زندگی میں تو آپ کو کوئی خوشی نصیب نہیں ہوئی، مگر ٹھہرئیے، وانیا ماموں، ٹھہرئیے، ہم کو آرام ملے گا ... (ماموں کو لپٹ کر) آرام ملے گا ... آرام ملے گا - "وانیا ماموں" کے آخر میں ان آنسوؤں کے ساتھہ تھوڑا بہت غم بھی بہ جاتا ہے، اور طبیعت کچھہ ہلکی ہو جاتی ہے "تین بہنوں" میں تسلی کا یہ بہانہ بھی کام نہیں آتا، اور شروع سے آخر تک ایک ایسی اداسی چھائی رہتی ہے کہ جس سے دم گھٹتا ہے - ڈراما کی مرکزی سیرتیں تین بہنیں، اولگا، ماشا اور ایرینا ہیں - پہلے ہی سین میں ان کی ساری کیفیت معلوم ہو جاتی ہے، ان کے ارمان، ان کی مصیبتیں، اور وہ غم جو ہر ایک کے دل میں گھر کیے ہوئے ہے - ان کا باپ فوج میں کسی بڑے عہدے پر ملازم تھا، اور کسی زمانے وہ سب دارالسلطنت ماسکو میں

رہتی تھیں - لیکن باپ کا انتقال ہو گیا ' مالی دشواریوں نے ان کو ایک قصبے میں جاکر رہنے پر مجبور کیا ' جہاں رہتے انہیں گیارہ برس ہو گئے ہیں - اولگا اسکول میں پڑھاتی ہے مگر اس کام میں اس کا جی نہیں لگتا ' اور اسے اتنی محنت کرنی پڑتی ہے کہ اس کے ہر وقت سر میں درد رہتا ہے - غالباً اس خیال سے کہ اس کی عمر بہت زیادہ ہو گئی ہے وہ شادی کا حوصلہ نہیں کرتی ' مگر اس کے دل میں محبت اور انسانی ہمدردی کا جذبہ اتنا قوی ہے کہ اپنا اور پرایا دکھہ درد اسے ہر وقت بے چین رکھتا ہے - دوسری بہن ماشا کی ایک اسکول کے استاد سے شادی ہو گئی جسے وہ پہلے بہت لائق سمجھتی تھی اور اس سے ڈرتی دبتی بھی تھی - لیکن ساتھہ رہنے نے شوہر کی قلعی کھول دی ہے ' اور ماشا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی ذہانت اور علمی قابلیت معمول سے بھی کم ہے ' اور وہ ایک دبو ' خوشامدی اور بدمذاق آدمی ہے - ماشا نے اس کا ادب اور لحاظ کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے ' اپنے آپ کو بالکل آزاد رکھتی ہے مگر اس کی سمجھہ میں نہیں آتا کہ اس آزادی کو کرے کیا - سب سے چھوٹی بہن ایرینا کو اس کا حوصلہ ہے کہ ماسکو جاکر وہاں رہے اور اسے یقین ہے کہ وہ ایسا کرسکی تو اس کی تمام مصیبتیں ختم ہو جائیں گی ' اور اسے جینے میں وہ مزا ملے گا جس کو وہ اب تک ترستی رہی ہے - وہ صرف بڑے شہر میں رہنے ' شائستہ لوگوں سے ملنے ' اچھا کھانے اور اچھا پہننے کی خاطر ماسکو نہیں جانا چاہتی وہ ایک موقع پر کہتی ہے کہ " محنت کرنا چاہیے ' محنت - ہم خوش اس وجہ سے نہیں رہتے زندگی کو ہم ایسی اداس نظروں سے اس لیے دیکھتے ہیں کہ ہم محنت کرنا نہیں جانتے ' ہم ایسے لوگوں کی اولاد ہیں جو محنت کو حقیر جانتے

تھے " - وہ خود مصلحت کرکے عمل اور خیال میں مطابقت قائم رکھتی ہے ' مگر اس کے دل میں یہ بات بیٹھہ گئی ہے کہ اگر وہ ماسکو نہ جاسکی تو سب کچھہ ہیچ ہوگا ' اور اس لیے مصلحت کرنے پر بھی اس کی طبیعت پژمردہ رہتی ہے - ایک فوجی افسر توزن باخ ' جو ایریلا سے محبت کرتا ہے ' مصلحت کرکے روٹی کمانے کے شوق میں ملازمت سے استعفاء دے دیتا ہے - ایریلا جانتی ہے کہ وہ بڑی خوبیوں کا آدمی ہے اور دل سے اس کی قدر کرتی ہے ' مگر اُسی دل کو اس کی طرف سے ٹھنڈا بھی پاتی ہے ' اس سے شادی کرنے پر راضی ہوجاتی ہے مگر جو محبت اس کے خیال میں عورت کو مرد سے ہونا چاہیے اس سے اپنے سینے کو خالی دیکھتی ہے - شادی کی نوبت نہیں آنے پاتی ' اس لیے کہ توزن باخ کا ایک ملاقاتی فوجی افسر رشک میں اسے مار ڈالتا ہے اور ایریلا ہاتھہ مل کر رہ جاتی ہے - ماشا پر اس سے بھی زیادہ سخت مصیبت آتی ہے - وہ ایک فوجی افسر سے ملتی ' دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند آتے ہیں ' لیکن پھر محبت کی آگ بجھانے کی تدبیریں کرنا پڑتی ہیں ' کیونکہ فوجی افسر بیوی بچوں والا آدمی ہے ' اور اس کی شاعرانہ گفتگو بے بسی اور مظلومیت کا ترانہ ہے —

" تین بہنوں " کو پڑھنے کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ روسی سوسائٹی زیادہ دن قائم رہنے والی نہیں ' اور چیخوف نے اپنی طرف سے اس کے عنقریب فنا ہوجانے کی پیشین گوئی " باغ " * میں کی - اس ڈراما میں مرکزی حیثیت ایک شریف خاندان کی عورت لیوبوف آندریے یفنا کو دی گئی ہے - اس نے اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف ایک وکیل سے شادی

* ڈراما کا پورا عنوان " چری کا باغ " ہے —

کرلی تھی جو طبیعت کا بہت اچھا مگر بہت گیا گزرا شرابی تھا اور اسی لت کی وجہ سے جلد مرگیا - اس کے مرنے پر لیوبوف آندرے یفنا کی ایک اور شخص سے آشنائی ہوگئی جس کی خاطر اس نے اپنی ساری جائداد گنوادی اور پھر اس کے قریب رہنے کے لیے پیرس میں جاکر پڑرھی - ڈراما کا قصہ جب شروع ہوتا ہے تو وہ پانچ برس کے بعد پہلی دفعہ گھر واپس آئی ہے - اپنا پیدائشی گھر دیکھہ کر اسے جو خوشی ہوتی ہے ' جس محبت سے وہ ہر ایک سے ملتی ہے اس سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ وہ دل کی بہت اچھی ہے ' مگر ہم یہ بھی دیکھہ لیتے ہیں کہ اسے اپنی طبیعت پر ذرا بھی قابو نہیں اور نہ وہ یہ سمجھتی ہے کہ دنیا میں گذر بسر کرنے کے لیے کیسی احتیاط اور عاقبت اندیشی درکار ہے - اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مکان اور باغ نیلام ہونے والا ہے تو اسے بچانے کی وہ خود کوئی فکر نہیں کرتی اور کسی دوسرے کو بھی کچھہ کرنے نہیں دیتی - لیکن جب مکان اور باغ نیلام ہوجاتا ہے تو وہ ہر شخص اور ہر چیز سے اس طرح رخصت ہوتی ہے کہ آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں —

لیوبوف آندرے یفنا کا بڑا بھائی گایف اپنی طبیعت میں کچھہ کم تباہی کا سامان نہیں رکھتا - وہ ذہین تو ہے مگر ساری عمر بیکاری میں گزارنے سے پچاس برس کی عمر میں اس کا یہ حال ہوگیا ہے کہ اس کی بچوں کی طرح دیکھہ بھال کرنا اور اسے بات بات پر ٹوکنا پڑتا ہے - معاملے کی کوئی بات اس کی سمجھہ میں نہیں آتی ' وہ ہر وقت یا تو تقریر کرتا ہے یا بلیرڈ کے ہاتھہ دکھاتا ہے - اسی ذہنیت اور مزاج کا ایک اور نمونہ تروفی موف ہے ' جو کسی زمانے میں لیوبوف آندرے یفنا

کے بچے کو پڑھایا کرتا تھا ، اور اس کے انتقال کے بعد بھی گھر میں پڑا رہا - اس کی تقریریں سن کر خیال ہوتا ہے کہ وہ نہایت بلند حوصلہ اور مضبوط ارادے کا آدمی ہے اور ضرور کچھہ کر دکھائے گا ' دراصل اس کے تخیل کی بلند پروازی کایف کی تقریروں کی طرح ایک لت ہے ' جس نے اس کو بالکل نکما کر دیا ہے - ڈراما کی سیرتوں میں اگر کوئی ہے جس میں زندہ رہنے کی استعداد ہے تو وہ ایک تاجر کا لڑکا لوپوخن ہے - وہ ڈنڈے کھا کھاکر پلا ہے ' یورپی تہذیب سے بے بہرہ ہے ' مگر اپنے فائدے نقصان کو سمجھتا ہے اور اس میں اتنی چستی اور دوڑ دھوپ کا مادہ ہے کہ اپنے منصوبے پورے کرلے - اوس تروف سکی کو روسی سوسائٹی کی فلاح اسی طبیعت کے آدمی پیدا کرنے میں نظر آئی تھی' چخوف نے بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا' لیکن وہ جانتا تھا کہ تعلیم یافتہ روسی دنیا سے رخصت ہوجانا اپنی وضع بدلنے سے زیادہ آسان سمجھیں گے —

چخوف کو رونے اور رلانے کے ساتھہ ہنسنے اور ہنسانے میں بھی کمال حاصل تھا - اس کے فرحیہ ڈرامے' جو بہت مختصر ہیں اپنے طرز میں بے مثل ہیں - لیکن ان کا مزہ سیرتوں کی خصوصیات میں نہیں بلکہ گفتگو میں ہے ' اور بغیر ڈراموں کو پڑھے حاصل نہیں ہوسکتا —

چخوف کا خاص طرز بہت مقبول ہوا ' لیکن چخوف استاد کا حق ادا نہ کرسکا ' اس لیے کہ اس کے طرز کی نقل کرنا ممکن نہیں - اس کے اور ان استعاریت پسندوں کے درمیان جن کا جنگ عظیم سے پہلے چرچا تھا صرف گورکی کا ڈراما " قعر مذلت " ذکر کے لائق ہے ' جس پر چخوف کا اثر نظر نہیں آتا بلکہ دستہ ئف سکی کا - روسی نقادوں نے تو اس میں کوئی خاص خوبی یا جدت نہیں پائی ' کیونکہ ان کے نزدیک

گورکی اور دوسرے انشاپرداز ایسے فلسفیانہ مزاج کے خانہ خراب لوگوں کو جن کی ذهنیت اور حالات اس ڈراما کا موضوع هیں' بهتیری تصانیف میں پیش کرچکے هیں ' مگر یورپ میں یہ ڈراما بہت پسند کیا گیا' اور واقعی وہ هزار خوبیوں کی چیز هے - اس کا پس منظر ایک سراے هے جس میں بے روزگار اور جرائم پیشہ لوگ رات کو پناہ لیتے هیں' اور ایک چور' ایک شرابی' ایک مفلس خطاب یافتہ زمیندار' ایک لوهار اور اس کی مدقوق بیوی' سراے کی بهٹیارن' اس کی ایک رشتہ دار جوان لڑکی شاشا' اس کی خادمہ ناستیا ڈراما کی ممتاز سیرتیں هیں- ان سب کے دن کسی نہ کسی طرح کٹ رهے هیں کہ اچانک لوکا' ایک فقیر آکر ان کی طبیعتوں میں انقلاب پیدا کردیتا هے - کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کون هے اور کہاں سے آیا هے' لیکن اس میں معاملے کو سمجھنے اور سلیقے سے بات کرنے کی ایسی حیرت انگیز قدرتی صلاحیت هے کہ وہ فوراً اعتبار حاصل کرلیتا هے اور سب کا راز داں بن جاتا هے - اس کے لہجے میں کچھہ ایسی نرمی' اس کی زبان میں ایسا جادو هے کہ سب اُس کی بات کو سنتے هیں اور اسی کو سننا چاهتے' دنیا ان سے جو برتاؤ کرتی رهی هے اسے معاف نہیں کرتے مگر لوکا کے سامنے سر جھکالیتے هیں - لوهار کی مدقوق بیوی' جس نے ساری عمر میں ایک لمحہ بغیر تکلیف کے نہیں گزارا هے خدا کے رحم وکرم اور جنت کے سکون اور آرام کی کہانی سنتے سنتے آخر کو مسکراتی هوئی اپنی آنکھیں همیشہ کے لیے بند کرلیتی هے' شرابی کو' جس کے قویٰ آهستہ آهستہ جواب دے رهے هیں لوکا ایک هسپتال کا قصہ سناتا هے جہاں شرابیوں کا مفت علاج کیا جاتا هے اور ان کی مہلک عادت سے نجات دلائی جاتی هے - هسپتال کا

ذکر سن کر شرابی کی ڈھارس بندھ جاتی ہے' اور یہ امید کہ وہ ہسپتال تک پہنچ جائے گا اس کی زندگی کا ایک اکیلا سہارا بن جاتی ہے' ایسا سہارا کہ جب لوگ شرارت میں اس سے کہتے ہیں کہ یہ ہسپتال فقیر کی ایجاد ہے اور کوئی اصلیت نہیں رکھتا تو شرابی مایوس ہوکر خود کشی کرلیتا ہے - فقیر کی خاص توجہ چور اور شاشا کی طرف رہتی ہے' اور انہیں وہ نئی اور پاک صاف زندگی کی رغبت دلانے کی بڑی کوشش کرتا ہے - چور دراصل خاصا اور نیک دل ایماندار آدمی ہے' جس کا باپ چور تھا اور جسے لوگوں نے چور کہتے کہتے باپ کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کردیا - اس کا چوری کرنا اور مذہب اور اخلاق کو ڈھکوسلا سمجھنا اس کی اخلاقی حس کا پتا دیتا ہے' اسے عیب اور ریاکاری پر غصہ آتا ہے' نیکی پر ہنسی نہیں آتی - ایک موقع پر وہ فقیر سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ خدا ہے یا نہیں' اور فقیر جواب دیتا ہے کہ "مانتے ہو تو ہے اور نہیں مانتے ہو تو نہیں" - یہ جواب سن کر چور ایسا چپ ہوتا ہے کہ دیر تک اس کے منہ سے کوئی بول نہیں نکلتا اور وہ فقیر کا دل سے معتقد ہوجاتا ہے - لیکن فقیر کا حوصلہ کہ چور اور شاشا ایک دوسرے سے محبت کریں پورا نہیں ہوتا' اس لیے کہ چور کا بھٹیارن سے یارانہ ہے اور وہ اسے شاشا کی طرف مائل دیکھ کر ایسا فتنہ برپا کرتی ہے کہ چور اور فقیر دونوں غائب ہوجاتے ہیں —

"قعر مذلت" کے علاوہ گورکی نے اور کئی ڈرامے لکھے جو کوئی خاص خوبی نہیں رکھتے - ویاچلاف او'نوف نے چیخوف کے طرز میں طبع آزمائی کی لیونند آندریے یف نے ڈراما کو اعصابی دیوان پن میں رنگنے کی کوشش کی' الکسے ئی تالستائی نے نفسیاتی پیچیدگیوں اور روحانی امراض

کے مطالعے کو چھوڑ کر صحیح العقل یورپی انشاپردازوں کی طرح قصے اور کشمکش کو نمایاں کرنا اور استعاریت پسندوں نے ڈراما میں اپنے خاص انداز کو کھپانا چاہا - ان میں سے کسی میں اتنا مادہ نہیں تھا اور کسی کے پاس علم، تصورات اور عقائد کا اتنا ذخیرہ نہیں تھا کہ ایک نیا ڈھب اختیار کیا جاسکے اور انشا پردازی کی دوسری قسموں کی طرح انقلاب سے پہلے کی ڈراما نویسی بہت سے رنگوں کی یک جائی ہے جسے تصویر نہیں کہا جاسکتا - ان کوششوں میں اگر کوئی قابل ذکر ہیں تو استعاریت پسندوں کی، جن میں سب سے ممتاز شخصیت الکساندر بلوک کی ہے —

بلوک کے ڈرامے بہت انوکھے اور نرالے ہیں، ان کی زبان بہت فصیح ہے، اور ان میں سے جو اسٹیج پر دکھائے گئے وہ خاصے مقبول ہوے - لیکن زندگی کو بلوک جس رنگ میں دکھاتا ہے، انسانی کھنچتوں کو جس انداز سے وہ پیش کرتا ہے اسے سمجھنا ذرا مشکل ہے، اور نتیجے کے طور پر جو حقیقت آخر میں واضح ہوتی ہے - وہ ہمیں ایسی بلند اور بصیرت افروز نہیں معلوم ہوتی کہ جس کی خاطر روز مرہ زندگی کا نقشہ اس طرح بگاڑا جائے جیسے کہ استعاریت پسند چاہتے ہیں - مثلاً بلوک نے اپنے ڈراما "انجان عورت" میں اس حجاب کو اپنا موضوع بنایا ہے جو دیدار کے مشتاق شاعر کو حسن کامل سے جدا رکھتا ہے - حسن کامل کا مجسمہ ایک انجان عورت ہے جو آسمان پر ایک ستارہ تھی، اور زندگی اور جذبات کی پیچ وتاب کا مزہ اٹھانے کے شوق میں زمین پر اتر آئی - چونکہ شاعر میں اتنی حس نہیں کہ اس کے قرب کو محسوس کرے نہ آنکھ میں اتنی قوت کہ اسے پہچان سکے، انجان عورت کا کوئی پرسان حال نہیں - پہلے وہ ایک شراب خانے کے دروازے پر جس کے اندر

اور لوگوں کے ساتھہ شاعر بھی بیٹھا شراب پی رہا ہے منظر کھڑی رہتی ہے ' پھر ایک میدان میں نازل ہوتی ہے جس میں سے کچھہ پہلے دو آسی مست اور بے خبر شاعر کو پکڑ کر لیجا چکے ہیں- شاعر کو کچھہ تو خیال ہوتا ہے کہ وہ کہیں قریب آئی ہے' مگر جب تک اس کا نشہ اترے اترے ' انجان عورت کو ایک بوالہوس لے اڑتا ہے- تیسرا منظر ایک مکان ہے جس میں بہت سے مہمان جمع ہیں ' انہیں میں شاعر بھی ہے ' اور اس وقت جب وہ اپنی ایک نظم سناتا ہوتا ہے' انجان عورت بھی آ پہنچتی ہے - شاعر اسے پہچان تو لیتا ہے' مگر خاکساری اور بے مائگی کا احساس اسے انوکھے مہمان سے دور رکھتا ہے ' انجان عورت مایوس ہوجاتی ہے اور پھر آسمان پر جاکر ستارے کی طرح چمکنے لگتی ہے - اس ڈراما کا وہ پہلو جو استعاریت پسندوں کے نزدیک اس کی جان ہے سچ پوچھا جاے تو بہت کمزور ہے' البتہ وہ حصے جن میں عام زندگی کی بیہودگی اور لغویت ظاہر کی گئی ہے' یعنی اس میں حقیقت نگاری کا جو پہلو ہے' وہ بہت موثر ہے' اور واقعی دنیا کو شائستہ اور پاک کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے —

۱۹۱۰ تک سمجھنا چاھیے چیخوف کے طرز کا دور ختم ہوگیا اور استعاریت کی ادبی تحریک کمزور پڑ گئی- اسی کے ساتھہ ایکٹنگ کے وہ اصول جن کے مطابق حقیقت نگاری اور ڈراما کی فضا ستیج پر پیدا کرنا فن کا اصل مقصد تھا چھوڑے جانے لگے- خود ستانسلاف سکی' ماسکو آرٹ تھیٹر کے بانی نے پرانے مسلک سے ہٹ کر نئی راہیں تلاش کرنا شروع کیا' اور انقلاب' جو تھیٹروں کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا' نئے تجربے کرنے کی تحریکوں کی سرپرستی کرتا رہا- ان مظاہر پر

یہاں بحث نہیں کی جاسکتی ، اس لیے کہ ایسی بحث بالکل اصطلاحی ہوجاے گی ، اور پھر یہ بھی ہے کہ نئی تحریکوں میں سے کوئی بھی پائدار یا مقبول عام ثابت نہیں ہوئی ہے - آگے تھیٹر اور ڈراما کی قسمت میں کیا لکھا ہے یہ خدا جانتا ہے - اندیشہ تو یہ ہے کہ سنیما نے تھیٹر کو کاری ضرب لگائی ہے اور اب وہ شاید ہی پنپ سکے —

انگریزی میں اردو الفاظ

از

(جناب شیخ محمد اسمعیل صاحب سکرٹری اورنٹیل پبلک لائبریری پانی پت)

اردو زبان کی مقبولیت ، ہردلعزیزی اور وسعت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ صدیوں کی نشو و ترقی کے بعد بھارت کی اس بھٹی کے حسن و شباب کی کرنیں اب سمندر پار کے دور دراز ممالک میں بھی پڑنے لگی ہیں - تمدن و تہذیب کے اس دور جدید میں شاید ہی دنیا کا کوئی ملک ایسا باقی رہ گیا ہو جہاں اردو سمجھنے والے اور ہندوستانی بولنے والے افراد موجود نہ ہوں - دنیا کا کوئی براعظم ایسا نہیں جہاں بالعموم اردوداں اور اردوخواں اصحاب نہ پائے جاتے ہوں - بعض ممالک میں تو (جیسے جاپان وغیرہ) حکومت کی طرف سے یونیورسٹی کے طلباء کو اردو پڑھانے کا نہایت معقول انتظام ہے - اور وہاں کی لائبریریوں میں بہت بڑا ذخیرہ اردو لٹریچر کا پایا جاتا ہے - انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں جس قدر عظیم‌الشان ذخیرہ اردو کتابوں کا مہیا کیا گیا ہے ہندوستان کی شاید کسی لائبریری میں ہوں - ہندوستان سے باہر دنیا کے اکثر ممالک میں اس کثرت سے اردو جاننے والے اشخاص موجود ہیں کہ ہندوستان کے کسی آدمی کو وہاں جاکر زبان کے لحاظ سے کوئی دقت پیش نہیں آسکتی - اور قدم قدم پر اس کو اردو جاننے والے

اصحاب مل جاتے ہیں —

اردو کی اس عالمگیری کو نظر انداز کرتے ہوئے آج ہم اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا ایک دوسرا دلچسپ ثبوت پیش کرتے ہیں۔

قاعدہ ہے کہ فاتح قوم کے غلبہ اور اثر کی وجہ سے مفتوح قوم کے عادات و اطوار اور رسم و رواج پر بہت گہرا اثر پڑا کرتا ہے - اور سب سے زیادہ یہ اثر محکوم قوم کے لٹریچر اور اس کی زبان پر پڑتا ہے - چنانچہ دیکھہ لو کہ آج کل اردو انشا پردازی میں انگریزی کا کس قدر تتبع کیا جاتا ہے اور انگریزی کے کس قدر بکثرت الفاظ اردو میں رائج ہوگئے ہیں - لیکن اس کے برعکس ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ فاتح قوم مفتوح اقوام کے رسم و رواج اختیار کر لے اور مفتوح قوم کے لٹریچر کا اثر فاتح قوم کی زبان و ادب پر پڑے - مگر آپ کو یہ بات کس قدر متعجب معلوم ہوگی کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کی آپس میں بہت کچھہ مغائرت اور علحدگی کے باوجود ہندوستان میں رہنے کے باعث انگریزی زبان میں اردو کے بہت سے الفاظ شامل ہوگئے ہیں جنہیں ہندوستان میں رہنے والے انگریز افسر بلا تکان بولتے اور آسانی کے ساتھہ سمجھتے ہیں - اور یہ صورت حال بلا شبہ اردو کی عظیم الشان فتح اور اس کی آئندہ ہر دلعزیزی، مقبولیت اور وسعت کی بین دلیل ہے - کیونکہ جب ہندوستان میں رہنے والے انگریز اپنے ملک کو واپس جاتے ہیں تو اردو کے یہ الفاظ جو ان کی زبانوں پر چڑہ جاتے ہیں اپنے ساتھہ لے جاتے ہیں - اور اس طرح بہت قریب زمانہ میں اردو کے یہ تمام الفاظ آہستہ آہستہ انگریزی زبان کا ایسا جزو بن جائیں گے کہ بہت مشکل سے پہچانے جاسکیں گے —

ہم یہاں ناظرین کی دلچسپی کے لیے ایسے الفاظ کی جو هندوستان میں رهنے والے انگریزوں کی زبان پر بالعموم چڑھ گئے هیں اور جنهیں یہاں کے یورپین عام طور پر استعمال کرتے هیں ایک مختصر فہرست پیش کرتے هیں - جو هم نے عرصہ کی تلاش و انتخاب کے بعد مختلف اصحاب اور ڈکشنریوں کی مدد سے مرتب کی هے - سب سے زیادہ امداد اس کام میں همیں اس جدید لغت سے ملی جو گزشتہ دسمبر میں سٹیٹسمین کلکتہ نے شائع کی هے اور جسے ایک فاضل پرنسل Mr A. M. Williams M. A نے پروفیسر Ernest Weekley M. A کی اعانت سے بڑی لیاقت کے ساتھہ مدون کیا هے اس بالکل تازہ اور جدید ترین لغت کا نام New Standard Illustrated, Dictonary هے —

اردو میں یہ ایک بالکل نیا مضمون هے - اور امید هے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا - هم نے آسانی کے لیے هر اردو لفظ کا انگریزی تلفظ بھی لکھہ دیا هے جو انگریزوں میں مستعمل هے - اور یہ تلفظ غیر ملک کے آدمیوں کی زبان پر چڑھنے کی وجہ سے اکثر جگہہ لہجے اور طرز ادا کے اختلاف کی وجہ سے اردو تلفظ سے مختلف بھی هوگیا هے - مگر تاهم اس بدلے هوے لہجے میں بھی اصلی اردو لفظ کی شان پورے طور پر نظر آتی هے - اور لسانیات کا ماهر فوراً پہچان جاتا هے کہ اس لفظ کی اصل شکل و هئیت کیا هے ؟ —

اس مختصر تمہید کے بعد اب هم ان اردو الفاظ کی فہرست هدیہ ناظرین کرتے هیں جو انگریزوں کی زبان پر رائج هوکر انگریزی میں شامل هوگئے هیں —

ابا	Abba
الماری	Almira
امین (عدالتی)	Ameen
امیر (سردار کے معنی میں)	Ameer Emir
ابدال (بمعنی پیر - درویش)	Abdal
آبدست (ہاتھ دھونا)	Abdest
امیر البحر	Admiral
اسلام	Islam
الجبرا	Algebra
الپکا	Alpaca
الکحل	Alcohol
امیدوار	Umedwar
آنہ	Anna
امام	Imam Imaum
بابو	Babu
بدمعاش	Badmash
بہادر	Bahadur
بنیا	Baniah
برسات	Barsat
باورچی	Bawarchi
بیگار	Begar
بہشتی	Bihisti Bheesty
بندوبست	Bundobast
بڑا (جیسے بڑا صاحب)	Burra
بستی	Bustee
بخشش	Baksheesh
بھتہ (الاؤنس کے معنوں میں)	Batta
(بی بی بیوی)	Beebee
بھنگ	Bang
بسم اللہ	Bismillah
بند	Bund
پالکی	Palki
پان	Pan
پیسہ	Pies Pice
پنجراپول	Pinjrapole
پیر	Pir
پوجا	Puja
پکا	Pukka Pucka
پاپوش (سلیپر - جوتی)	Pabouche

Pashm	پشم
Pergunnah	پرگنہ
Peri	پری
Pindaree	پنڈاری
Pipul	پیپل
Pugaree	پگڑی
Punchayet	پنچایت
Pundit	پنڈت
Punkah	پنکھا
Tamasha	تماشا
Tehsil	تحصیل
Terai	ترائی (ہمالیہ کی وادی)
Thana	تھانہ
Carcass / Carcase	ترکش
Tael / Tola	تولہ
Jampani	تام جہام (رکشا)
Taj	تاج
Taluk / Talook	تعلقہ (ضلع - علاقہ)
Jatha	جتھا

Talukdar / Talookdar	تعلقہ دار
Tanjib	تن زیب (کپڑا)
Tap	تپ (بخار)
Tariff	تعریف
Tash	تاش (زرین دو پٹہ)
Teapoy	تپائی
Toddy	تاڑی
Tonga	تانگہ
Trisul / Trisula	ترسول
Talwar	تلوار
Tat	ٹٹو
Tattie / Tatty	ٹٹی (پھونس یا سرکنڈوں کی)
Thug	ٹھگ
Tom tom	ٹن ٹن (گھنٹہ یا گھڑیال کی آواز)
Tusser	ٹسر
Jadu	جادو
Jagir	جاگیر
Jagirdar	جاگیر دار
Jamadar	جمعدار

Jheel	جھیل
Jilhmill	جھلمل
Jirga	جرگہ (کونسل - عدالت)
Gymkhana	جمخانہ (کلب گھر)
Jihad	جہاد
Julep / Julap	جلاب
Chalaan	چالان
Chick	چق (چلمن)
Chit	چٹ (مختصر چھٹی)
Chiz	چیز
Chota	چھوٹا (جیسے چھوٹی حاضری - چھوٹا صاحب)
Chowdhry	چودھری
Chowk	چوک
Chowkidar	چوکیدار
Charpoy	چارپائی (یعنی پلنگ)
Chattah	چھاتا - چھتری
Chowry	چوری
Chutney	چٹنی
Shooldarry	چھولداری
Chithi	چٹھی

Hafiz	حافظ (قرآن مجید کا)
Havildar	حولدار
Hazri	حاضری (کھانا)
Hukum	حکم
Huzoor	حضور
Hadj	حج
Hadji	حاجی
Hakem	حکیم (طبیب)
Harem	حرم
Hookah / Hooka	حقہ
Khansama	خانساماں
Khas	خس (گرمی کے موسم میں جس کی ٹٹیاں یا چلمنیں بنتی ہیں)
Khassadar	خاصہ دار
Caliph	خلیفہ
Khan	خان (سردار یا سرائے کے معنوں میں)
Khitmatgar	خدمتگار
Chushy	خوشی
Daffadar	دفعدار
Dafter	دفتر
Daftari	دفتری

دائی	Dai
داروغہ	Daroga
درشن	Darshan
دسہرا	Dasehra
دیکھہ یا دیکھو	Dek Dekko
دیوالی	Dewali
دیوان (وزیر)	Dewan
دھتورہ	Dhatura
دھوتی	Dhoty
دق (یعنی پریشان ہونا)	Dik
دربار	Durbar
دربان	Durwan
دستور	Dustoor
دیودار	Deodar
دوآبہ	Dooab
دوسوتی	Doosootee
درہ	Durra
دھوبی	Dhobi
ڈاک	Dak Dawk
ڈاک بنگلہ	Dak Bangalow

ڈالی	Dolly
ڈھاک	Dhak
ڈولي	Dooly
ڈاکو	Dakoit
ذیابیطس	Diabetes
رئیس	Rais
رمضان	Ramzan
رانی	Rani
رکشا	Rickshaw
راج	Raj
راجا	Raja Rajah
رمضان	Ramadhan Ramadan
رانا	Rana
ریم (کاغذوں کے بیس دستوں کو ریم کہتے ہیں) عربی لفظ 'رزمۃ' سے بنایا گیا ہے - جس کے معنی گٹھری یا بنڈل کے ہیں	Ream
رسالدار (فوج کا ایک عہدہ دار)	Ressaldar
رومال	Rumal
روپیہ	Rupee

Zabardasti	زبردستی
Zemindar / Zamindar	زمیندار
Zemindari / Zemindary	زمینداری
Zenana / Zanana	زنانہ
Zendik	زندیق
Zumbooruk	زمبورک (توپ)
Sepoy	سپاہی
Sanad	سند
Sanyasi	سنیاسی
Sardar	سردار
Satyagraha	ستیاگرہ
Seer	سیر (وزن)
Swadeshi	سودیشی
Swaraj	سوراج
Syce	سائیس
Circar	سرکار (آقا۔ افسر۔ گورنمنٹ)
Salaam / Salam	سلام
Santer	سنتر (بربط ۔ باجا)
Sarab	سراب (دھوکا)
Seetulputty	سیتل پاٹی (چٹائی)
Serai	سرائے
Sicca	سکہ
Simoor / Simoom	سموم (سخت گرم ہوا)
Soneri	سنہری
Sujee	سوجی (روا)
Sultan	سلطان
Sultana / Sultaness	سلطانہ
Sun	سن
Sunn	(درخت کا وہ ریشہ جس سے رسیاں وغیرہ بٹی جاتی ہیں)
Surma	سرما (جو آنکھوں میں لگایا جاتا ہے)
Sabre	سیف (تلوار)
Shabash	شاباش
Shamiana	شامیانہ
Satan / Shaitan	شیطان
Shah	شاہ
Shaheen	شاہین

شیخ	Sheikh Sheik
شربت	Sherbet Sorbet
شراب	Shrab
صوفا (دراصل عربی لفظ صفه هے)	Sofa
صفر	Cipher
صوفی	Sofi Sufi
صاحب	Sahib
ضلع	Zillah
طربوش (پهندنے دار ٹوپی)	Tarboosh Tarbouche
طبل (ڈهول)	Timbal Tymbal
ظرف	Zarf
ظلم	Zoolum
علمدار	Alemdar
عماری	Ambarie
عنبر	Amber
عطر	Attar

عید	Id
عزت	Izzat
علماء (عالم کی جمع)	Ulema
عسکری (لشکری)	Askari
غزال	Gazelle
غربال (چهلنی)	Garble
فرنگی	Firenghi
فقیر	Fakir
فرمان	Firman
قلندر	Calender
قند (چینی یا شوگر)	Candy
قوس	Coss
قرمزی	Crimson
قلی	Cooly
قبله	Keblah
قسمت	Kismet
قرآن	Koran
قلعه دار (محافظ قلعه)	Quilladar
کباب	Cabob
کچهری	Cutchery
کالا پانی (جزائر انڈمان)	Kala Pani

Godown	گودام
Gomastal	گماشتہ
Gora	گورا
Gurdwara	گوردوارہ
Ghat / Ghaut	گھات
Guzzy / Guzzie	گزی (گاڑھا)
Lashkar	لشکر
Lac	لاکھہ (سو ہزار)
Loot	لوت
Langur	لنگور
Machan	مچان
Mahajan	مہاجن
Maidan	میدان
Maulvi	مولوی
Maund	من (وزن)
Mehtar	مہتر (حلال خور - خاکروب)
Manji	منجی (ملاح)
Mofussil	مفصل (مرکز کے قریب کے اضلاع)
Muktear	مختار
Mollah	ملا

Khadi	کھادی یا کھدر
Khadder	
Kirpan	کرپان
Kotwal / Cutwal	کوتوال
Kutcha	کچا
Kapoc	کپاس
Caravan	کاروان (قافلہ)
Caravansary	کاروان سرائے
Coffee	کافی (قہوہ)
Cot	کھات (چارپائی)
Kafir / Kaffir	کافر
Kimcob	کمخواب
Kohl	کحل (سرمہ)
Khata	کھاتہ
Kothi	کوٹھی
Coi hai	کوئی ہے
Gaddi	گدی (دوکانداروں کی یا سلطنت)
Gharry	گاڑی
Ghee	گھی
Girja	گرجا

مہاوت	Mahout
منتر	Mantra
مسجد (انگریزی کا لفظ Mosque بھی 'مسجد' کی بگڑی ہوئی شکل ہے)	Masjid
ممبر	Mimbar
مینار	Minar
مہر (اشرفی)	Mohur
مولا (آقا)	Mollah
منشی	Munshi / Moonshee
میم صاحب	Mem Sahib
مسلم	Muslem
موذن (اذان دینے والا)	Muezzin
مفتی	Mufti
ممی (فارسی لفظ ہے یعنی وہ لاشیں جو خشک شدہ حالت میں مصر میں موجود ہیں)	Mummy
مندیل (دستار)	Mundil
منصف (حاکم)	Munsiff
مرشد (ہادی - رہنما)	Murshid
مسند	Musnud
مشعل	Mussal / Mussaul
مست (ہاتھی کے لئے بولا جاتا ہے)	Must
نمبر دار	Lumbardar
نائب	Naib
نائک (ہندوستانی فوج کا ایک افسر)	Naik
نوکر	Naukar
نواب زادہ	Nawabzada
نذر	Nazar
نیم کا درخت	Neem
نالہ	Nullah
نواب (امیر یا رئیس کے معنوں میں)	Nabob / Nawab
نادر	Nadir
ناچ	Nautch
ناظر (عدالتی عہدہ دار)	Nazir
نیل گائے	Nilghai
نارنج	Orange
ولایت (انگلستان)	Bilayat
وکیل	Vakil / Vakeel

وزیر	Vazir Visier Vizier
وزارت	Vizierate Vizerate
وادی	Wady Wadi
ہودہ	Houdah Howdah
یکہ	Ekka

سال وفات جرات

از

(جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹرایٹ لا (پٹنہ)

جرات کی سال وفات کے متعلق آزاد* لکھتے ھیں:

"آخر عمر تک لکھنؤ ھی میں رھے اور وھیں ۱۲۲۵ ھجری میں فوت ھوے، شیخ ناسخ نے تاریخ کہی:

'جب میاں جرات کا باغ دھر سے گلشن فردوس کو جانا ھوا
مصرع تاریخ ناسخ نے کہا ھاے ھندوستان کا شاعر موا'"

ھندستان کو ھندوستان بنادینے کی داد خواہ آزاد کو دی جاے خواہ کاتب آب حیات کو، اس اصلاح کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ مصرع آخر سے اضافۂ واو کی بدولت ۱۲۲۵ کی جگہ ۱۲۳۱ مستخرج ھوتا ھے، جو صریحاً غلط اور ناسخ اور آزاد دونوں کے منشا کے خلاف ھے —

ناسخ جرات کے ھم عمر نہ تھے، لیکن جرات اور ناسخ دونوں نے لکھنؤ کو اپنا وطن بنالیا تھا، جرات و ناسخ میں ذاتی تعلقات بھی ھوں تو عجب نہیں ناسخ گو عمر میں کم تھے، لیکن جرات کی زندگی ھی میں صاحب طرز استادوں میں ان کا شمار ھونے لگا تھا ناسخ کی عمر کا کچھہ حصہ لکھنؤ سے باھر بھی بسر ھوا ھے، مگر یہ ۱۲۲۴ - ۱۲۲۵ ھ کے بعد کی بات ھے ان امور کا لحاظ رکھتے ھوئے اگر کوئی شخص ناسخ کے قول

---

* آب حیات طبع نہم ص ۲۳۹ —

کو صحیح سمجھے، تو اسے الزام نہیں دیا جاسکتا، لیکن ۱۲۲۴ ھ کے حق میں اتنی قوی شہادتیں ہیں کہ ہمیں ۱۲۲۵ ھ کو ناچار مسترد کرنا پڑتا ھے - سب سے پہلے شیخ مصحفی کا قطعۂ تاریخ ملاحظہ ہو یہ قطعہ ان کے دیوان ششم* میں موجود ھے - مصحفی جرات کے دوست اور ہم چشم تھے کچھہ دنوں دونوں بہ یک وقت سلیماں شکوہ کے ملازم بھی رھے تھے - مصحفی ۱۱۹۸ ھ میں لکھنؤ پہنچے اور مرتے دم تک وھیں رھے :-

جب قلندر بخش جرات مر گیا ریختے کے خوں نے کھایا دل میں جوش
ہو گئی تختہ دکان نظم و شعر اٹھہ گیا بازار سے گوھر فروش
سال رحلت اس کے بعد از یک دو ماہ مصحفی سے کہ گیا پھر یوں سروش
سو وو ھے یہ مصرع بے بیش و کم 'ہو گئی کیا بلبل نالاں خموش'

واضح رھے کہ مصحفی نے 'گئی' کے ۴۰ عدد لیے ھیں، اور کوئی قاعدہ ایسا نہیں جس کے روسے ۳۱ لیے جاسکیں —

مصحفی کے بعد راجا جسونت سنگھہ پروانہ ھیں یہ لکھنؤ کے باشندے اور مہاراجا بینی بہادر، نائب شجاع الدولہ کے بیٹے تھے - اردو میں مصحفی کے اور فارسی میں دیوانہ کے شاگرد تھے - وہی دیوانہ جو جرات کے استاد حسرت کے استاد تھے - ان کے دیوان† میں قطعۂ ذیل پایا جاتا ھے جسے کریم الدین نے بھی اپنے تذکرے‡ میں نقل کیا ھے - اس قطعے کے آٹھویں اور دسویں مصرعے سے سال وفات الگ الگ نکلتا ھے :-

جو کہ کرتا ھے فکر شعر و سخن اس زمانے میں وہ غنیمت ھے

---

* قلمی کتب خانۂ مشرقیہ بانکی پور - † قلمی ایشیاٹک سوسائٹی -
‡ تاریخ شعراے اردو ص ۲۰۵ کریم الدین کے نزدیک بھی ۱۲۲۴ ھ ھی سال وفات ھے —

کہ نہ اگلے سے لوگ باقی ہیں　　نہ وہ مجلس ہے اور نہ صحبت ہے
اک سخن گو جو تھا قلندر بخش　　نام جرات سے جس کی شہرت ہے
کر چکا کوچ اس مقام سے حیف　　آج منزل نشین حسرت ہے
ہے یہ تاریخ اول اور ثانی　　کہو' جنت نصیب جرات ہے

تیسری شہادت گنگا پرشاد رند کی ہے - یہ بھی لکھنؤ کے باشندے تھے اور بہ قول بعض جرات کے شاگرد - ان کا قطعۂ تاریخ تذکرۂ خیراتی لعل بے جگر * میں منقول ہے - 'جرات ہاے جرات' سے تاریخ نکالی ہے - بے جگر نے بھی قطعات تاریخ لکھے ہیں جو تذکرے میں مندرج ہیں -

ناسخ کو ہم غیر معتبر نہیں سمجھتے' لیکن قانون شہادت کے مسلمہ اصول کی بنا پر تین معتبر گواہوں کے بیان کو ایک معتبر گواہ کے بیان پر ترجیح دینا ضروری ہے —

اس سوال کا جواب کہ ناسخ سے غلطی کیوں ہوئی مشکل ہے - دانستہ غلط بیانی تو خارج از بحث ہے' یہ بھی بعید از قیاس ہے کہ ناسخ سے حساب میں غلطی ہوئی ہو' اس لیے کہ وہ بہت محتاط آدمی تھے ہمارا قیاس † یہ ہے کہ جرات کا انتقال ۱۲۲۴ ھ کے آخری ایام میں

---

* قلمی انڈیا آفس - † جرات ۱۱ ربیع الاول سنہ ۱۲۲۵ ھ سے قبل مر چکے تھے ان کے شاگرد حقیقت نے ایک مثنوی گلزار حقیقت لکھی ہے جو ۱۱ ربیع الاول سنہ ۱۲۲۵ ھ کو تمام ہوئی ہے - اس کی تکمیل کے قبل جرات انتقال کر چکے تھے - اشعار ذیل ملاحظہ ہوں :-

جیتا رہتا اگر مرا استاد　　سرہ و نا سرہ کا وہ نقاد ص ۱۰۷
ایسا آوازہ کس کا تھا سمجھا　　یعنی یحیی امان جرات کا "　　"

(بقیہ بر صفحہ ۵۹۰) —

ہوا ہوگا۔ ناسخ کو جو اطلاع ملی اس میں ایک دن دو دن کی غلطی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ہی بدل گیا —

(سلسلہ از صفحہ ۵۵۹)

نامۂ نامی جب ہوا یہ طے سن تھے پچھس اور بارہ سے ص ۱۰۸

ختم جس روز مثنوی یہ ہوئی گیارھوین تھی ربیع الاول کی " "

یہ مثنوی کرناٹک میں لکھی گئی ہے (ص ۴) اور ظاہر ہے کہ اس زمانے میں وفات کی خبر کرناٹک پہنچنے میں کچھہ وقت گزرا ہوگا۔ مثنوی مطبع مصطفائی لکھنؤ میں سنہ ۱۲۶۷ ھ میں طبع ہوئی ہے —

فارسی غزل

از

(جناب فضل احمد کریم صاحب فضلی ، بی - لٹ

(آکسفورڈ) آئی - سی - ایس) -

گزشتہ سے پیوستہ

(۴)

گذشتہ باب میں غزل کے ان نقائص کا ذکر کیا گیا تھا جو اس کی ساخت اور ماہیت کا نتیجہ ہیں - یہاں ان نقائص سے بحث کی جائے گی جو خارجی اسباب سے رونما ہوئے —

غزل کے اوپر ایک بہت اہم اور سنگین اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس کا محبوب صنف قوی کا فرد ہے - اس سے اہل مشرق کے مذاق ذہنیت، اخلاق اور کردار کے متعلق طرح طرح کے نتائج نکالے گئے ہیں - چونکہ میری نظر سے کسی مغربی زبان میں کوئی ایسا مضمون نہیں گزرا جس میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہو اس لیے میں نے اپنے انگریزی کے مقالے میں اس سے بہت تفصیل کے ساتھ بحث کی تھی مگر خوش قسمتی سے ہماری زبان میں اس موضوع پر کافی مواد موجود ہے - اکثر کتابوں میں اس سے بحث کی گئی ہے - مولانا حالی کی

حیات سعدی اور مقدمہ شعر و شاعری ' مولانا شبلی کی شعرالعجم اور مولوی مسعود حسن رضوی کی ہماری شاعری اس سلسلے میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں لہذا یہاں اس کے متعلق کچھہ مختصراً عرض کردینا کافی ہے —

پہلی بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ فارسی زبان میں تذکیر و تانیث کا چنداں جھگڑا نہیں جہاں تک افعال ' ضمیر اور صفت کا تعلق ہے کوئی چیز اس امر کی ظاہر کرنے والی نہیں ہوتی کہ جس کا ذکر کیا جارہا ہے وہ صنف نازک کا فرد ہے یا صنف مخالف کا - لہذا جب تک کوئی بات کسی مخصوص صنف کی طرف اشارہ نہ کرے ایک شعر کا اطلاق دونوں صنفوں پر یکساں طور سے کیا جاسکتا ہے - ایسے اشعار کی تعداد کم سے کم پچہتر فی صدی ہوگی ' بقیہ پچیس فی صدی میں بہت سے ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب صنف نازک کا فرد ہے مثلاً —

جز پردہ نہ خواہم کہ کسے روئے تو بیند
جز خویش نہ خواہم کہ کسے کوئے تو آید

(نظامی گنجوی)

ایسے اشعار جن میں محبوب کو حور ' پری ' محبوبہ ' و معشوقہ یا لیلیٰ شیریں عذرا کہا گیا ہے اسی زمرے میں شامل ہیں مثلاً —

معشوقہ کہ او چابک و چالاک نہ باشد
آرام دل عاشق غمناک نہ باشد

(حکیم سنائی)

ایسے اشعار کی تعداد کم نہیں مگر محبوب کے صنف مخالف کی

طرف اشارہ کرنے والے اشعار کی تعداد مقابلۃً زیادہ ہے - ان اشعار کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے —

(الف) وہ جو صراحتاً معشوق کو صنف قوی کا فرد ظاہر کرتے ہیں —

(ب) وہ جن سے اشارتاً یہ بات ظاہر ہوتی ہے —

(ب) اخرالذکر کی تعداد اول‌الذکر سے کہیں زیادہ ہے - ان میں محبوب ہر طرف بے تکلف بے پردہ گھومتا پھرتا نظر آتا ہے ' ہر جگہ شمع انجمن ہے اور عاشقوں کی تعداد برساتی پروانوں سے بھی کہیں زیادہ ' سر محفل وہ بے حجابیاں یا در پردہ لگاوٹیں ہوتی ہیں کہ محفل مقتل بن جاتی ہے ' وہ "خانہ بر انداز چمن" ہر طرف گل و ثمر پھیلکتا جاتا ہے مگر اس طرح کہ کسی کو بھی نہیں ملتا اور ہرایک "کچھ تو ادھر بھی" کی صدا لگایا کرتا ہے - وہ کہیں ساقی ہے ' کہیں مطرب ' کہیں ترک جنگجو ' کہیں محبوب نیک خو ' الغرض سارے عالم کا منظور نظر ہے - اس لیے یا تو شاعر کی نگاہوں میں سارا جہاں تاریک ہے اور ہر شخص رقیب روسیاہ کا مصداق یا پھر اسے سارے جہاں سے محبت ہے اور ہر چیز اس کی ہمراز - اس قسم کے اشعار میں خود کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جس سے محبوب کا مذکر ہونا لازمی طور سے ظاہر ہو - چنانچہ اگر ان کا مغربی زبانوں میں ترجمہ کردیا جائے تو کسی کو بھولے سے بھی یہ خیال نہ آئے گا کہ محبوب صنف نازک کا فرد نہیں ہے - مگر مشرق میں جہاں پردے کی رسم سختی سے رائج ہے (یا کم سے کم تھی) متذکرہ بالا باتوں کا وقوع پذیر ہونا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ محبوب کا مذکر ہونا تسلیم کیا جائے - اس لیے یہ خیال ہوتا ہے کہ محبوب مذکر ہے —

(الف) ایسے اشعار کی تعداد جن میں محبوب کا مذکر ہونا با التصریح پایا جائے بہت کم ہے - بمشکل ۵ فی صدی ہوگی - ان اشعار میں عموماً معشوق کی جسمانی تصویر نظر آتی ہے - اس وقت تک کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی جب تک شاعر اس کی نرگس چشم، غنچۂ دہن، برگ لب، گل عارض، سیب ذقن، زلف گرہ گیر، * اور دوسرے ایسے اعضا کی تعریف کرتا ہے جو دونوں اصناف میں مشترک ہیں - مشکل کا سامنا اس وقت ہوتا ہے جب شاعر سبزہ و خط کی توصیف شروع کرتا ہے یا محبوب کو غلام و پسر کے القاب سے ملقب کرتا ہے - ایسے اشعار کو پڑھ کے کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ شاعر کا محبوب صنف قوی کا فرد ہے - انہی اشعار کی بنا پر لوگوں نے یہ خیال کیا کہ بقیہ اشعار کے محبوب کا بھی یہی حال ہے - یعنی فارسی شاعری کا معشوق ہی مرد ہے —

اس سلسلے میں کئی باتیں قابل غور ہیں —

(الف) پہلی بات تو فارسی عشقیہ شاعری کی وہ خصوصیت ہے جو خود ہدف ملامت ہے یعنی اس میں شاعر اپنے ذاتی احساسات جذبات خیالات تجربات اور واقعات زندگی کو بیان نہیں کرتا بلکہ خیالی باتوں کا ذکر کیا کرتا ہے - اس کے چند وجوہ گذشتہ باب میں بیان کیے جا چکے ہیں، ان کے علاوہ مشرقی سوسائٹی اور تہذیب بھی اس کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے اور بالخصوص صوفیانہ شاعری کا مذاق - ایران میں کچھہ تو آب و ہوا کچھہ جائے وقوع کچھہ تاریخی واقعات اور کچھہ ایرانیوں کی افتاد طبع کی وجہ سے اس تہذیب و تمدن نے جسے مشرقی کہا جاتا ہے سب سے پہلے ترقی کی اور ایران اس تہذیب کا علمبردار بن گیا -

* پرانے زمانے میں مرد بھی زلف گرہ گیر رکھتے تھے -

شرم و حیا جو اس تہذیب کی اجزاے ترکیبی میں سمجھی جاتی ہے سب سے پہلے ترقی پذیر ہوئی - غالباً جس قوم میں سب سے پہلے پردے کی رسم پیدا ہوئی وہ اسی خاک پاک ایران کے فرزندوں کی تھی - ممکن ہے کہ فارسی زبان میں تذکیر و تانیث کی عدم موجودگی اسی جذبۂ شرم و حیا کی مرہون منت ہو - هندوستان میں مسلمانوں کی تہذیب ایرانی تہذیب کا چربہ ہے - اس لیے اول الذکر کی مدد سے آخرالذکر کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے - ہمارے ہاں مرد عورت کے صنفی تعلقات پر جتنا زور دیا گیا ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں - بہتوں کو اس کا تکلیف دہ احساس ہوگا - حدود جواز کے باہر کسی شریف عورت سے داستان حسن و عشق چھیڑنی اپنے سر بلاے بے درماں مول لینی ہے - اپنی محترمہ سے عشق کا حال معلوم' اور اگر ہو بھی تو اول تو قابل ذکر بات نہیں دوسرے مذموم - اب بیچارہ شاعر جس کی نگاہوں میں دنیا پریخانہ ہے اور جو خواہ مخواہ اس کا دیوانہ' نہ محض دیوانہ بلکہ اظہار دیوانگی کے 'جذبۂ بے اختیار شوق' سے بھی مجبور' کیا کرے اپنے جذبات کو کہاں لے جاے کیسے چھپاے - 'اگر گوید زباں سوزد' ورنہ 'مغزاستخواں' - مجبوراً اپنے پردہ نشین محبوب پروہ اتنا گہرا پردہ ڈالنا چاہتا ہے کہ اس کے عزیز اقارب بھی اسے پہچان نہ سکیں - یہ امر نہ محض تقاضاے تہذیب ہے بلکہ تقاضاے مصلحت بھی - اگر عاشق بدنام کو بالفرض اپنے ننگ و نام کی پروا نہ بھی ہو تو کم سے کم محبوب کے ننگ و نام کی پروا اس وقت تک تو ضرور ہوتی ہے جب تک وہ سچ مچ فرہاد و مجنوں نہ بن جائے - اس پردہ پوشی کا بہترین و موثر ترین طریقہ شاعر کے پاس بقول مولانا روم کے یہ ہے کہ —

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

یہ تو ان شاعروں کا ذکر ھے جو واقعی کسی مخصوص معشوق کے تیر نظر کے گھایل ھوتے ھیں مگر ایسے شاعر بھی (متشاعر نہیں) بکثرت ھیں جو کسی خاص لیلیٰ کے مجنوں نہیں لیکن جن کی چشم مجنوں صفت میں ساری کائنات لیلیٰ ھے - پوچھیے تو کسی سے بھی عشق نہیں دیکھیے تو سب سے ھے - در حقیقت انہیں جذبۂ عشق ھی سے عشق ھوتا ھے - وہ اپنی ایک خیالی دنیا بنائے رھتے ھیں ان کا معشوق ان کی رعنائی خیال کا ممنون احسان ھوتا ھے اور اسے ان کے ارد گرد کی دنیائے واقعات سے چنداں سرو کار نہیں ھوتا - ایسے شعرا کے انداز بیان میں وہ جامہ زیبی ھوتی ھے کہ عشق کے ھر قد موزوں پر راست آئے - لہذا جب شاعر محبوب کو غلام وپسر کہتا ھے تو اس کا مقصد ان الفاظ کے لغوی معنی نہیں ھوتے بلکہ وہ انہیں محض بطور محبوب کے مترادف کے استعمال کرتا ھے - وہ عشق مجرد کا خیال کرتا ھے نہ ان افراد کا جن کے مابین یہ جذبہ کار فرما ھوتا ھے - اسی طرح جب وہ خط کا ذکر کرتا ھے تو اس کی مراد سچ مچ کسی خاص شخص کی بڑھتی ھوئی ڈاڑھی سے نہیں ھوتی بلکہ ایک ایسی چیز سے جو مثل ڈاڑھی کے چہرے کے حسن وزیبائش کا سبب ھو - اس سلسلے میں گب (Gibb) کے حسب ذیل الفاظ کی نقل بیجا نہ ھوگی ....

"The poet rarely deals with external objects exclusively on their own merits. When he sings, as he *constantly does*, of wine and beauty, of roses and nightingales, it is not to tell of these as they are in themselves. What seems to strike him first and with the greatest force is not the effect which they produce upon his senses but the suggestions they evoke in his mind". (The Poetry of the Ottomans Vol. I. P. 28.).

جو حال گل و بلبل کا ہے وہی غلام، پسر اور خط کا - اس کے علاوہ شاعر عموماً ان الفاظ کو متصوفانہ انداز میں استعمال کرتا ہے - سنائی عطار اور مولانا روم جیسی مقدس ہستیوں کے کلام جن میں یہ الفاظ خاص طور سے پاے جاتے ہیں اس امر کا ثبوت ہیں (یہ الفاظ خصوصاً غلام وپسر فارسی شاعری کے ابتدائی دور میں عموماً نظر آتے ہیں بعد میں ان کا استعمال رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ گذشتہ تین صدیوں میں قریب قریب معدوم ہو جاتا ہے لہذا اس عہد کے اشعار عموماً وہی ہوتے ہیں جن کے معشوق کو ہر شخص اپنے خیال کے مطابق جس صنف کا چاہے تصور کر سکتا ہے) —

شعرا محبوب کی متذکرہ بالا تصویر اکثر اس وجہ سے بھی کھینچتے ہیں کہ ایسی رسم چلی آئی ہے اور یہ باتیں خیالی محبوب کے لازمی صفات میں شمار کی جاتی ہیں جن کا بیان شاعر کے لیے ناگزیر ہے بقول غالب —

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام　　چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

اس رسمیت کے چند وجوہ بیان کیے جا چکے ہیں - مولانا حالی نے اس نظریہ کو بڑے پر زور طریقے سے حیات سعدی میں پیش کیا ہے، فرماتے ہیں —

"فارسی زبان میں ہمیشہ سے شاعری کا یہ طریقہ رہا ہے کہ شاعر مرد ہو یا عورت، رند ہو یا صوفی، خدا کا عاشق ہو یا مخلوق کا، مرد کا عاشق ہو یا عورت کا، بلکہ سرے سے عاشق ہو یا نہ ہو، ہمیشہ غزل ایسے عنوان سے لکھتا ہے جس

سے معلوم ہوکہ شاعر کسی پر عاشق ہے اور وہ اور اُس کا
معشوق دونوں مرد ہیں ۔ اسی طرح ہندی میں شاعر مرد
ہو یا عورت . . . . . مرد کا عاشق ہو یا عورت کا ہمیشہ عاشقانہ
نظم ایسے طور پر لکھتا ہے جس سے ثابت ہوکہ شاعر عورت ہے
اور اس کا معشوق مرد - اسی طرح عربی میں شاعر اپنے تئیں
مرد اور معشوق کو عورت فرض کرلیتا ہے - اگر بالفرض کوئی
شخص تینوں زبانوں میں شعر کہنے پر قادر ہو تو اس غریب
کو ہر زبان کے دستور کے موافق کہیں آپ کو مرد اور معشوق
کو عورت اور کہیں آپ کو عورت اور معشوق کو مرد کہیں
آپ اور معشوق دونوں کو مرد قرار دینا پڑے گا - حضرت
امیر خسرو دہلوی کی فارسی کی غزلوں سے صاف پایا جاتا
ہے کہ وہ کسی سادہ رخ لڑکے پر مفتوں ہیں اور ان کے ہندی
دہروں سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی عورت اپنے پیارے خاوند
یا دوست کے عشق یا جدائی میں بیتاب ہے اور عربی قصائد
کی تشبیب سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرد اپنی زوجہ یا
محبوبہ کی یاد میں مضطر و بےقرار ہے - اس سے صاف ظاہر
ہے کہ یہ تمام فرضی اور اصطلاحی عنوان بیان ہیں جن کو
حقیقت واقعی سے کچھہ علاقہ نہیں ہے - جس طرح ہزاروں
پارسا اور پرہیزگار شاعر جنہوں نے نہ کبھی شراب کا مزہ
چکھانہ اُس کی صورت دیکھی نہ اُس کی بوسونگھی صدہا شعر
شراب و کباب کے مضمون کے لکھتے ہیں اسی طرح ہزاروں
پاکباز اور صاحب عفت شعر لکھتے وقت تھوڑی دیر کو

اسود پرست اور شاهد باز بن جاتے هیں " (صفحه ۲۳۳ - ۲۳۴) —

ایسا کیوں هے اس کے اسباب کو اچھی طرح ذهن نشین کرنے کے لیے ایک خاص امر پر غور کی ضرورت هے - ایرانی ادب میں ڈرامہ اور ناول کا پہلے وجود نہ تھا - اور نثر کا فسانوی ادب قریب قریب نہ هونے کے برابر تھا سارا ادب شاعری کے زیر نگین تھا اور شاعری غزل کی مترادف - لہذا وہ حضرات بھی جنھیں فطرت نے ڈرامہ نگاری کی صلاحیت ودیعت کی تھی اپنے جوهر قابل کو غزل هی کے پیرایہ میں استعمال کرنے پر مجبور هوے - ڈرامہ نگار کی سب سے بڑی صفت یہ هے کہ وہ هر کردار کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرے یہ نہ معلوم هو کہ اس کے کردار " هز ماسٹرس وائس " کا کام کر رهے هیں - وہ انھیں جتنا زیادہ زندہ بنا سکے گا اتنا هی بڑا ڈرامہ نگار سمجھا جائے گا اس کی اس امر میں کامیابی محض اس کی اس صلاحیت کی ممنون احسان هوتی هے کہ وہ اپنے آپ کو هر حالت میں رکھہ کے هر شخص کی حالت کا اس کے مخصوص کردار کے مطابق اندازہ کر سکتا هے - ایک ڈرامہ نگار کی عظمت کا انحصار اسی صلاحیت کی کمی یا زیادتی پر هوتا هے - همارے بہت سے شعرا بھی اکثر اپنی شاعری میں ڈرامہ نگار کی اس صلاحیت کو کام میں لاتے هیں - وہ چاهے خود عاشق هوں یا نہ هوں یا خود کامیاب عاشق هوں اور دل ان کا واقعی یہ کہہ رها هو کہ —

اے بخت سرکش تنگش بہ برکش گہ جام زر کش گہ لعل دلخواہ (حافظ)

مگر جب وہ حرمان زدہ عاشق کی کیفیت بیان کرنا چاهیں تو اس کا یہ کہہ کے سچا نقشہ کھینچ دیں کہ —

جاناں چہ گویم شرح فراقت چشمے و صد نم جانے و صد آہ (حافظ)

اس لیے ان کے کسی شعر کو ان کے ذاتی خیالات و جذبات کا آئینہ دار سمجھنا بالکل ویسا ہی ہے جیسے کسی ڈرامہ نگار یا ناول نویس کے مختلف کرداروں کے مکالموں کو خود اس کی گفتگو سمجھنا - اس طرح عموماً ان کے اشعار میں مولانا حالی کی تحریر مندرجہ بالا کے مطابق مفروضہ انسانوں کی مفروضہ حالتوں کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے عرفی نے اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں اس کی بہت خوب توجیہ کی ہے —

ملکر نتواں گشت اگر دم زنم از عشق
ایں نشہ بمن گر نہ بود بادیگراں هست

ہماری شاعری کے اس پہلو پر نظر کم گئی ہے اگر یہ بات مدنظر رکھی جائے تو ایک دیوان غزل کے متضاد اشعار کا معمہ حل ہو جائے اور وہ فسانوی ادب کی ایسی کتاب معلوم ہو جس میں مختلف و متضاد کردار اور مواقع مختلف اور متضاد خیالات اور جذبات کے ذمہ دار ہیں اور ان متضاد خیالات و جذبات میں مصنف کے اپنے ذاتی خیالات و جذبات یوں شیر و شکر ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علحدہ کرنا آسان کام نہیں —

یہ سب صحیح ہے لیکن اس قسم کی رسم کا پیدا ہونا ہی قابل اعتراض امر ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کا کسی قدر اور تجزیہ کیا جائے تاکہ اس کے اسباب و علل ٹھیک سے سمجھ میں آئیں —

مولانا حالی نے اس کی ایک بڑی لطیف توجیہ کتاب مذکورہ بالا میں کی ہے - فرماتے ہیں —

" فارسی زبان میں عربی اور ہندی زبان کی طرح تذکیر و تانیث

کا تفرقہ نہیں ہے اس میں ضمیریں اور افعال اور صفات مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں لائی جاتی ہیں - پس ممکن ہے کہ قدیم فارسی میں بھی ہندی کی طرح شعرا اپنے تئیں عورت اور معشوق کو مرد باندھتے ہوں لیکن اس سبب سے کہ شاعر عموماً مرد ہوتے تھے اور ضمائر یا افعال وغیرہ سے ثابت نہ ہوتا تھا کہ شاعر نے اپنے تئیں مرد فرض کیا ہے یا عورت رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہوگیا ہو کہ فارسی میں عاشق و معشوق دونوں مرد فرض کیے جاتے ہیں " (صفحہ ۲۳۹) مولانا کی اس رائے کی ابن رشیق کی کتاب العمدہ کے ان الفاظ سے پرزور تائید ہوتی ہے کہ " عربوں کی رسم یہ ہے کہ شاعر (مرد) عاشق ہوتا ہے برعکس اس کے عجمیوں میں عورت مرد کی طالب اور عاشق ہوتی ہے * ' یہ توجیہہ بعید از قیاس نہیں - لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ فارسی شاعری کے مرد معشوق کی ابتدا یوں ہوئی پھر بھی اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس شاعری کے ابتدائی دور میں صورت حالات کچھہ ایسی ہوگئی تھی کہ یہ رسمی مرد معشوق بڑی حد تک اصلی بن گیا تھا - مولانا شبلی نے ان حالات کو بالتفصیل شعرالعجم میں بیان کیا ہے † - مولانا کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ عربوں کو یہ بری عادت پہلے تو مستورات کی عدم موجودگی کی وجہ سے پڑی پھر ترک غلاموں کے حسن نے اس کا چسکا ڈال دیا —

اگرچہ ترکان شیرازی اس عادت قبیح کے پھیلانے میں سب سے پیش

* مولانا حالی نے بکثرت کتاب العمدہ کا حوالہ دیا ہے مگر تعجب ہے کہ ان کی نظر اس اقتباس پر نہیں گئی کیونکہ وہ اس کا کوئی حوالہ نہیں دیتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس توجیہہ کو وہ طبعزاد ظاہر کرنا چاہتے ہیں -

† ملاحظہ ہو شعرالعجم حصہ چہارم صفحہ ۱۸۴ - ۱۷۹ -

پیش تھے تاہم وہ تنہا اس کے ذمہ دار نہیں - ایران کی جائے وقوع' اس کی تاریخی اہمیت اور اُس کے تمدن نے اُسے مرجع حسینان جہاں بنا دیا تھا ۔ اُسی نے حافظ سے یہ شعر کہلایا —

شہرے پر از کرشمہ و خوباں ز شش جہت
چیزیم نیست ورنہ خریدار ہر ششم

مگر ان ترکوں مغبچوں اور برهمن زادوں کے حسن کی تعریف میں نغمہ سنجی کے یہ معنی هرگز نہیں کہ شاعر کی نیت زبردستی خراب ہے بلکہ واقعہ اس کے برعکس ہے - مرد معشوق خالص بے لوث اور غیر نفسانی محبت کے لیے صنف نازک کے معشوق سے زیادہ موزوں خیال کیے جاتے تھے - وجہ ظاهر ہے - اول تو عورتیں پردے میں تھیں' دوسرے ان سے عشق میں نفس پرستی کا شائبہ ضرور رهتا تھا اس لیے وہ نا مناسب بھی تھا اور اخلاق سوز بھی - حسین لڑکے البتہ هر جگہ بکثرت پائے جاتے تھے ان سے عشق میں نفس امارہ کا اتنا دخل نہ تھا - کم سے کم خیال یہی کیا جاتا تھا اور اس سے جذبۂ عشق کی پاکی و برتری ظاهر هوتی تھی لهذا عشق مجازی کی مشق کے لیے صوفیان باصفا نے ان هی نوخطوں کو تجویز کیا - ایسی مثالیں بکثرت پائی جاتی هیں کہ پیر نے مرید سے اس بات کی تاکید کی کہ پہلے جا کے کسی سے عشق کرے تاکہ اس کے دل میں اتنا سوز و گداز پیدا هو جائے کہ گرمئی عشق حقیقی کی تاب لا سکے - پھر کہا تھا —

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزلها

مگر یہ پیر و مرید عموماً شیخ سعدی کے اس شعر کے مصداق هوتے تھے کہ -

مارا نظر بخیر است از حسن ماہ رویاں
هر کو بہ شر کند میل او هم بشر نہ باشد

اس میں شک نہیں کہ اس پاک محبت کی تتی کی آڑ میں اکثر بزرگ دل کھول کر شکار کھیلتے تھے مگر ایسے بزرگوں کی کسی قوم و ملک میں بھی کمی نہیں - خدا کے یہ مقبول بندے ہر ملک و قوم میں برابر پیدا ہوتے رہے ہیں اور شاید پیدا ہوتے رہیں - ایرانیوں ہی نے کیا قصور کیا ہے —

بہر حال یہ اسباب تھے جن کی بنا پر فارسی شاعری کا محبوب ابتدائی دور میں مرد قرار پایا - مگر سوائے ان بد مذاقوں کے جو ہر ملک و قوم میں پائے جاتے ہیں کوئی شخص بھی معشوق کو جیتا جاگتا مرد تصور نہیں کرتا - عموماً وہ عشق مجرد کے اظہار کا آلہ خیال کیا جاتا ہے تاہم ان لوگوں کے سامنے جو محبوب کی ایک تصویر پیش نظر رکھنا چاہتے ہیں وہ صنف نازک کا ایک پیکر جمیل بن کر آتا ہے —

خود یہ امر کہ ایرانیوں نے اپنی عشقیہ نظم کو غزل کے نام سے موسوم کیا جس کے لغوی معنی ہیں " عورتوں سے باتیں کرنیں اور ان کے عشق کا ذکر کرنا " اصل صورت حالات کو ظاہر کرتا ہے —

(۲) - مولانا حالی غزل کے ایک اور نقص کو یوں بیان کرتے ہیں —

" اس بادہ ہوش ربا یعنی غزل سے سوسائٹی کے اخلاق خیالات اور معاشرت پر کچھہ اچھے ثمرے مترتب نہ ہوئے - شعر کو خواہ وہ عاشقانہ ہو خواہ اخلاقی ایک پوشیدہ تعلق اخلاق کے ساتھہ ہوتا ہے اور جو اشعار کسی قوم میں زیادہ شائع ہو جاتے ہیں اور مجالس و محافل میں پڑھے اور گائے جاتے ہیں

وہ اندر ہی اندر تمام جماعت پر اپنا اثر اس طرح کرتے ہیں کہ جماعت کو اصلاح شعور نہیں ہوتا اور جس قدر شعر میں نمک اور حسن زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اس کی تاثیر جلد اور پائدار ہوتی ہے - شیخ سعدی خواجہ حافظ امیر خسرو ...... وغیرہ کی غزلیں ممالک اسلامیہ کے ایک بڑے حصے میں پڑھی اور گائی جاتی ہیں - اگرچہ ان بزرگواروں کا کلام زیادہ تر حقائق اور معارف .. پرمبنی ہے لیکن اس میں مجاز و حقیقت کے دونوں پہلو موجود ہیں - جس طرح اس سے ایک صوفیء خدا پرست روحانی کیفیت اٹھاتا ہے اُسی طرح ایک بوالہوس صورت پرست کے نفسانی جذبات اس کے سالنے اور پڑھنے سے برانگیختہ ہوتے ہیں - سب سے زیادہ خواجہ حافظ کی غزل مجالس و محافل میں گائی جاتی ہے اور اُس کے مضامین سے اکثر لوگ واقف ہیں - وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے - عشق حقیقی کے ساتھہ ہی عشق مجازی اور صورت پرستی و کامجوی کو بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں اور فضیلتوں سے افضل بتاتی ہے - مال و دولت علم و ہنر نماز و روزہ حج و زکوٰۃ زہد و تقویٰ غرض کہ کسی شے کو نظر بازی و شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی - وہ عقل و تدبیر مآل اندیشی تمکین و وقار ننگ و ناموس جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی رہے اور آوارگی رسوائی بدنامی بدمستی بے سروسامانی وغیرہ کو جو کہ عشق کی بدولت حاصل ہو تمام حالتوں سے

پھر ظاہر کرتی ہے - دولت دنیا پر لات مارنا عقل و تدبیر سے کبھی کام نہ لینا ...... کفایت شعاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا جو کچھہ ہاتھہ لگے اس کو فوراً رائگاں کھو دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں اس سے مستفاد ہوتی ہیں - ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو نوجوانوں اور بے فکروں کو بالطبع مرغوب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا اور شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مطرب و رقاصہ کی خوش آوازی اور حسن و جمال اور مزامیر کی لے ان کو لے اُڑتی ہے اور ان کی تاثیر کو دس بیس گنا کردیتی ہے اور جب باوجود ان سب باتوں کے سامعین کو یہ بھی اعتقاد ہوتا ہے - کہ اس کلام کے قائل اکابر صوفیہ و مشائخ کرام ہیں ...... جن کا شعر شعریت کا لب لباب اور طریقت کا رہنما اور عالم لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین اور بھی زیادہ دلنشین ہوتے ہیں ...... جب ہم مسلمانوں کے اخلاق و معاشرت پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو اکثر ان صفات سے موصوف پاتے ہیں جن کی اس مجموعہ غزلیات سے ترغیب ہوتی ہے " (حیات سعدی ۱۷۸ - ۱۸۰) —

یہ در حقیقت غزل کی خرابی نہیں ہے بلکہ غزل خوانوں کی - شاعری بجلی کی طرح ایک زبردست قوت ہے - اس سے روح کی جلا بھی کی جاسکتی ہے اور اس کا کام بھی تمام کیا جاسکتا ہے - استعمال کرنے والے پراسکا انحصار ہے - جب یہ ہے تو بقول سعدی " چشمۂ آفتاب را چہ گناہ " —

(۳) غزل پر ایک اور اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کی تشبیہیں تمثیلیں استعارے اور تلمیحیں سب محدود ہیں وہی گل و بلبل، وہی شمع و پروانہ، وہی سرو شمشاد، وہی نرگس و نسترن وغیرہ وغیرہ - گزشتہ باب میں یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ خود غزل کی ساخت اس امر کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے - ہماری زبان کی بہت سی کتابوں میں اس موضوع پر کافی مواد ملتا ہے اس لیے یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ —

سمجھتا نہیں کوئی طرز کلام پھڑکتا ہے وہ سن کے بلبل کا نام

(۴) غزل پر ایک اور الزام یہ عاید کیا جاتا ہے کہ اس میں زیادہ تر رنج و غم حزن و ملال کے مضامین پائے جاتے عالم کی بے ثباتی، قسمت کی ناسازگاری چرخ کج رفتار کے مظالم، انسان کی بے بسی، محبوب کی بے اعتنائی، غم ہجراں، رقیب روسیاہ کی خوش بختی، عاشق صادق کی بدبختی وغیرہ وغیرہ کا عموماً رونا رویا جاتا ہے - فرط انبساط کے نعرہائے مستانہ شاذ ہیں - اس کے اسباب کچھہ تو سیاسی اور تاریخی ہیں اور کچھہ یہ کہ شعرا شیلی (Shelley) کے الفاظ میں اس راز سے واقف تھے کہ —

"Our sweetest songs are those
That tell of saddest thought."

اس لیے انھوں نے اپنی شاعری کو دنیا کی سب سے زیادہ غمگین اور شیریں بنا دیا —

(باب سویم)

ابھی تک غزل کے معائب کا ذکر رہا اب "هنرش نیز بگو" - غزل کے محاسن کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے -

(۱) غزل کے محاسن بحیثیت صنف سخن کے اور (۲) غزل کے داخلی محاسن -

(۱) - پہلی چیز جو قابل لحاظ ہے وہ غزل کی ساخت ہے - پہلے شعر یعنی مطلع کے دونوں مصرعوں کے اخیر میں ردیف و قافیہ کی موجودگی اور پھر ان کی ہر شعر کے اخیر میں تکرار بہت بھلی معلوم ہوتی ہے - ایک مستقل ردیف کے ساتھہ بدلتے ہوئے قافیوں کی آمیزش نظم میں ایک خاص موسیقیت پیدا کردیتی ہے - یہ آمیزش بہت سے ایسے لطیف خیالات اور معانی کے پہلو شاعر کو سمجھاتی ہے جو غالباً یوں نہ سوجھتے - پرانے مضامین میں ترقی کے امکانات کی تلاش انہیں نئے نئے انداز سے بیان کرنا یا نئے مضامین پیدا کرنا شاعر کے لیے آسان ہو جاتا ہے - یہی وجہ کہ بقول گب (Gibb) —

" Persian poetry ... ... shows extraordinary fertility of imagination and not infrequently almost super-gracefulness both of thought and expression ,,
(Poetry of the Ottomans Vol, I, P. 29.)

باستثناے اردو کے غالباً دنیا کی کسی زبان میں ایک خیال کے گونا گوں لطیف و نازک پہلو کا بیان اس تفصیل کے ساتھہ نہیں پایا جاتا جتنا کہ فارسی زبان میں - خزانۂ عامرہ کے یہ الفاظ بہت صحیح ہیں —

" ردیف مخصوص زبان فارسی است کہ ابیات را طرفہ آرائش
می دهد ... وبسبب ردیف تلوع اشعار فارسی از دائرۂ انحصار
بیرونست " —

ردیف و قافیہ کی آمیزش شاعر کے جذبات خفتہ کو اس طرح گدگداتی ہے کہ وہ انگڑائیاں لینے لگتے ہیں - ایک شاعر کی زندگی میں ایسے خوش قسمت لمحات کم ہی ہوتے ہیں کہ اس کے سامنے کوئی

محرک جذبات چیز وقوع پذیر ہوئی اور فوراً "بادل سے چلے آتے ہیں مضمون مرے آگے" کی کیفیت پیدا ہوگئی جب شاعر کے جذبات بہت زیادہ برانگیختہ ہوجاتے ہیں تو عموماً اس کی قوت ناطقہ جواب دے جاتی ہے - انگریزی کی ایک مثل (When heart is full words are few) کسی محبوب کی عارضی یا دائمی جدائی ' کوئی دل ہلا دینے والا حادثہ قدرت کے ہوشربا مناظر ' مستانہ گھٹاؤں کی گرج ' بجلی کی تڑپ ' یکا یک "دست برسینہ نظر بر لب بام" بن جانا اور اسی قسم کے واقعات سے جب شاعر دو چار ہوتا ہے تو وہ فوراً شعر کہنے نہیں بیٹھ جاتا ' بلکہ عموماً مبہوت و مسحور ہو جاتا ہے اور دم بخود - مگر ان کے مرتعش نغمے اس کے ساز ہستی میں جذب ہو جاتے ہیں - ردیف و قافیہ وہ مضراب ہے جس سے شاعر اس ساز کو بجاتا ہے اور وہ سب نغمے بیتاب ہو کے تاروں سے نکلنے لگتے ہیں - بقول مرزا غالب "زخمہ بر تار رگ جاں می زنم" - یہی وہ نغمہائے منظوم ہیں جنہیں الہامات کہا جاتا ہے اور جو شاعر کو تلمیذالرحمٰن بنا دیتے ہیں - یہیں پر یہ کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کا یہ عام خیال حقیقت پر مبنی نہیں کہ شاعر کو خیالات و جذبات ردیف و قافیہ سجھاتے ہیں اور متشاعر کو ردیف و قافیہ مضامین - اگر ایسا ہوتا تو نہ آج دیوان حافظ کا وجود ہوتا نہ کلیات سعدی کا نہ کسی ایسی نظم کا جس میں ردیف خواہ قافیے کی پابندی لازمی خیال کی جاتی ہے - حافظ شیرازی اور حافظ حلوای دونوں ردیف و قافیے کی مدد سے شعر کہتے ہیں ایک لسان الغیب بن جاتا ہے دوسرا سارق و تک بند - Mathew Arnold نے شاعری کی تعریف "Emotions recollected in tranquillity" بہت صحیح کی ہے —

غزل کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ایک مختصر چیز ہے اس لیے اسے پڑھکے قصیدہ کی طرح ردیف و قافیے کی ترتیب ترتیب لا محالہ ہی تکرار سے جی نہیں اکتاتا - پھر ہر شعر بذاتہ مکمل ہوتا ہے اور ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے - اس کا لازمی نتیجہ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے یہ ہوتا ہے کہ شاعر کو چست و معنی خیز ترکیبیں و بندشیں استعمال کرنی پڑتی ہیں اور انداز بیان میں اکثر کنایہ سے کام لینا پڑتا ہے جو یوں بھی لطیف چیز ہے - چونکہ ہر شعر کی انفرادی حیثیت ہوتی ہے - اس لیے شاعر اس کے ہر ٹکڑے کو علحدہ علحدہ سوچ سکتا ہے اور اس کی تکمیل اس باریک بینی اور تفصیل کے ساتھہ کرسکتا ہے جو ایک طویل اور مسلسل نظم میں بمشکل ممکن ہے - غزل نے جس قدر فارسی ادب کو اعلیٰ درجے کے اشعار و تراکیب سے مالا مال کیا ہے اس کا اندازہ آسان نہیں اور فارسی ادب اس امر کے لیے اس کا جس قدر ممنون احسان ہو کم ہے —

موضوع غزل کو عشق اور اس کے متعلقہ مضامین تک محدود کردینے کی وجہ سے چند مفید نتائج بھی مترتب ہوے - ایک تو یہ کہ اس " ہردلعزیز" جذبے اور اس کی گونا گوں نیرنگیوں کا بیان اس تفصیل و تکمیل کے ساتھہ کسی ایسے ادب میں نہیں پایا جاتا جس کے اصناف سخن میں غزل شامل نہیں - دوسرے بہت سے اخلاقی فلسفیانہ اور مذہبی مضامین جنہیں حدود غزل میں لانے کے لیے شاعر لباس حسن و عشق میں جلوہ گر کرتا ہے وہ اس نئے لباس میں اپنی اصلی حالت سے کہیں زیادہ دلاویز اور موثر بن جاتے ہیں - فارسی زبان اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہے لکھنے کی ضرورت نہیں —

غزل کی زبان کے لیے جیسا کہ لکھا جاچکا ہے خاص شیرینی نزاکت

و لطافت کی ضرورت ہے - اس لیے شاعر کی توجہ ہمیشہ اسی طرف رہتی ہے اس امر نے فارسی کو بقول Sir W. Jones کے —

— " The softest and one of the richest in the world "

بنادیا اس میں شک نہیں کہ فارسی زبان میں خود نرم و شیریں ہونے کی صلاحیت تھی لیکن غزل نے شعرا کی توجہ خاص طور سے اس طرف مبذول کرکے اس صلاحیت کو پوری طرح اجاگر کردیا - یہ امر قریب قریب یقینی ہے کہ اگر غزل کا وجود نہ ہوتا تو فارسی زبان کی موجودہ لطافت و شیرینی میں بہت کافی کمی ہوتی —

غزل کی ساخت کے چند اور محاسن کا ذکر اس کی ہردلعزیزی کے اسباب کے سلسلے میں کیا جائے گا —

(۲) غزل کے داخلی محاسن ہمارے مقالے کے حصہ دوم میں پوری طرح واضح ہوں گے یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ غزل فارسی ادب کے بہترین جواہر ریزوں کا خزانہ ہے اس کے اشعار عموماً طویل نظمیں ہوتی ہیں جن کے دریا کو شاعر نے دو مصرعوں کے کوزوں میں بھر دیا ہے اور اس میں حیات انسانی کا ہر پہلو ارفع خواہ ادنیٰ نظر آتا ہے —

باب چہارم

(غزل کی ہردلعزیزی کے اسباب*)

غزل کی ہردلعزیزی کے بہت سے اسباب خود اس کی ساخت اور خمیر میں مضمر ہیں —

(الف) - اس کے خمیر کا جزو اعظم عشق ہے - کون ہے جو اس بادۂ سرخوش کو کم سے کم چکھنا نہیں چاہتا - لہذا جتنا غزل کہنے اور

* نوٹ نمبر ۱ - اس کے تاریخی اسباب مقالے کے دوسرے حصے میں بیان کیے جائیں گے -

پڑھنے میں لطف آتا ہے اتنا کسی اور صنف سخن میں نہیں آتا - پھر بقول مولانا شبلی کے "یہاں (ایران میں) مدت دراز کے تمدن نے انسانی جذبات کو نہایت لطیف اور زود اشتعال بنا دیا تھا اس لیے ذرا سی تحریک سے یہ شعلہ بھڑک اُٹھتا تھا اور دل و دماغ کو آتش فشاں بنا دیتا تھا - (شعرالعجم حصہ پنجم صفحہ ۳۳) —

تصوف کی ترویج نے اس ذوق عشق کی آگ کو اور بھڑکایا - ہم بیان کر چکے ہیں کہ صوفیان باصفا نے عشق مجازی کو بام عشق حقیقی کا زینہ قرار دیا اور اس امر پر خاص طور سے زور دیا ' ان کے تقدس نے اس دل پذیر حکم پر مہر تبریک ثبت کی اور ہر شخص کو ' درسر ہوس ساقی در دست شراب اولیٰ ' کا مصداق بنا دیا عشق و محبت کے دار دورے کے ساتھہ ساتھہ غزل کا دار دورہ لازم تھا —

(ب) غزل کے اشعار کی دلکشی ان کی انفرادی حیثیت ' اختصار اور جامعیت بھی اس کی ہر دلعزیزی کا بہت بڑا سبب ہیں ' غزل کے اشعار کو یاد کرنا جتنا آسان ہے اتنا کسی اور صنف سخن کے اشعار کو نہیں ' قطعہ و رباعی وغیرہ کو عموماً پورا پورا یاد کرنا پڑتا ہے غزل کا ایک شعر یاد کرنا کافی ہے - غزل کے اشعار اپنی نوعیت کی وجہ سے ہر موقع محل پر جس قدر چست بیٹھتے ہیں اتنے کسی اور صنف سخن کے نہیں - یہی وجہ ہے کہ ان اشعار میں جو زبان زد خلق ہیں تقریباً نوے فی صدی غزل کے اشعار ہیں - مشرق میں مناسب موقع شعر پڑھ دینا ایک بڑی صفت سمجھی جاتی ہے - ایسے واقعات بکثرت منقول ہیں کہ اس صفت نے لوگوں کی نہ محض جانیں بچائی ہیں بلکہ ان کے منہہ کو زر و جواہر سے بھر دیا ہے اس لیے بھی غزل گوئی و غزل خوانی

ضروری چیز سمجھی جاتی تھی —

(ج) اہل مشرق کو کنایہ خاص طور سے مرغوب ہے اور جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کسی صنف سخن کے اشعار کے انداز بیان میں کنایہ کا استعمال اس قدر نہیں ہوتا جس قدر کہ غزل کے اشعار میں —

(د) غزل کے اشعار کا تنوع بھی اس کی ہردلعزیزی کے بڑے اسباب میں سے ہے - عموماً ایک غزل میں جتنے مختلف اشعار ہوتے ہیں اتنے ہی مختلف مضامین بھی - یہ اہل مغرب کے نزدیک نقص ہو تو ہو لیکن اہل مشرق کو اس کی یہی ادا بھاتی ہے - پڑھنے والا ایک شعر کو جتنی دیر چاہے پڑھ کے لطف اٹھائے سلسلۂ خیالات کے ٹوٹنے کا کوئی ڈر نہیں کیونکہ وہ سرے سے غائب ہے - یہ بات کسی اور صنف سخن میں ممکن نہیں —

چونکہ ہر شعر کا مضمون الگ ہوتا ہے اس لیے پڑھنے والے کا جی نہیں اکتاتا بلکہ یہ احساس کہ دیکھیں آگے کے شعر میں کیا مضمون ہے اس کے شوق کو اکسایا کرتا ہے - پڑھنے والا جس شعر کو جی چاہے پڑھے یا چھوڑ جائے کوئی ہرج نہیں - جہاں سے جی چاہے دیوان غزل کھول کے پڑھنا شروع کردے اور جہاں جی چاہے بند کردے - اس مسلسل توجہ اور طویل وقت کی غزل کے پڑھنے کے لیے ضرورت نہیں جس کی مثنوی یا قصیدے کے لیے ہے —

(ر) مختصر اور مفرد خیالات کے اظہار کے لیے بھی غزل کے اشعار سے زیادہ موزوں کوئی اور چیز نہیں اور چونکہ اسی قسم کے خیالات زیادہ تر سوجھتے ہیں اس لیے غزل کی ضرورت بھی مقابلتاً زیادہ ہوتی ہے —

(س) مسلسل غزل اور قطعہ بند اشعار نے تلنگانۓ غزل میں کافی وسعت پیدا کردی تھی اور طویل واقعات کے علاوہ ہر چیز اس میں نظم کی جاسکتی تھی - غزل کے اختصار کی وجہ سے دیوان غزل کا مطالعہ بار خاطر نہیں ہوتا - ردیف و قافیہ و بحر کا جلد جلد بدلنا خاص لطف رکھتا ہے —

(ش) غزل کہنے کی سہولت بھی اس کی ہردلعزیزی کا بہت بڑا سبب ہے - ہر وہ شخص جو طبع موزوں رکھتا ہے بہ آسانی غزلوں کا انبار لگا سکتا ہے اور بہت کم وقت میں - ایسی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں کہ شاعر صاحب بیت الخلا سے ایک کافی لمبی چوڑی غزل تصنیف کیے ہوئے نکل آئے - وہ مستقل اور مسلسل توجہ و کوشش جو ایک طویل و مسلسل نظم کی تصنیف کے لیے ضروری ہے اس کی غزل کے لیے ضرورت نہیں —

(ص) اگر غزل کہنے کی سہولت اسے تک بندوں میں ہردلعزیز بناتی ہے تو اس کی برعکس وجہ بلند حوصلہ شاعروں میں اس کی مقبولیت کا سبب ہے - ہم یہ دیکھہ چکے ہیں کہ اچھی غزل کہنا کس قدر دشوار ہے اور کہاں تک غزل کے اشعار کی انفرادی حیثیت بلند ہمت شاعروں کو مرصع سازی میں اپنا کمال دکھانے کا موقع دیتی ہے - جزئیات کی تکمیل کا شوق مشرقی دماغ کا خاصہ ہے - غزل میں اس شوق کو پورا کرنے کی جتنی گنجائش ہے اتنی کسی اور صنف سخن میں نہیں —

(ض) ردیف و قافیہ کی موجودگی کو بھی غزل کو ہردلعزیز بنانے میں بڑا دخل ہے - اس نے شاعروں کے لیے آپس میں زور قلم آزمانا

آسان بنادیا - بحر و ردیف و قافیہ مقرر ہوتا ہے - بحر و ردیف تو بدلتی نہیں ہم قافیہ الفاظ صرف بدلتے رہتے ہیں - اس لیے مقابلے اور مسابقے کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا ہے اور سارا زور طبع ایک قافیہ کو بہتر سے بہتر طریقے سے استعمال کرنے میں صرف کیا جا سکتا ہے - عموماً ایک شاعر کی عظمت کا اسی امر سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس نے کس قافیہ کو کتنے عمدہ طریقے سے استعمال کیا ہے اس بات نے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس کی ہردلعزیزی محتاج بیان نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد مشق غزل گوئی فن شاعری کی تربیت کے لیے لازمی قرار پاگئی - اور یہ خیال کیا جانے لگا کہ جب تک شاعر غزل کہنے میں مشاق نہ ہو جائے کسی اور صنف سخن کو اچھی طرح نہیں نباہ سکتا اور جو غزل کہہ سکتا ہے وہ سب کچھہ کہہ سکتا ہے بقول ہلالی —

آں کہ نظم غزل تواند گفت مثنوی راچو در تواند سفت

(ط) ردیف و قافیہ اور بحر کے موسیقی اثر اور اپنے موضوع کی دلاویزی کی وجہ سے غزل گانے کے لیے سب سے زیادہ موزوں قرار پائی اور ہر محفل میں چاہے وہ رقص و سرود کی ہو چاہے سماع کی اسی کے اشعار زیادہ تر گائے جانے لگے - اس امر نے بھی اس کے دائرۂ مقبولیت کو بہت وسیع کیا —

(ظ) - باوجود ان سب صفات کے غزل آج غزل نہ ہوتی اگر صوفیائے کرام نے اپنے جذبات اور خیالات کے اظہار کے لیے اسے انتخاب نہ کیا ہوتا - درحقیقت غزل کے مندرجۂ بالا صفات اسی وجہ سے نمایاں ہوئے اس انتخاب کے بہت سے اسباب تھے - اول تو غزل اور تصوف دونوں کا

موضوع ایک تھا یعنی عشق - صوفیوں کا عشق حقیقی عشق مجازی کی زبان میں آسانی سے بیان کیا جاسکتا ھے - اس بھیس میں وہ زیادہ دلاویز بھی بن جاتا تھا اور لوگوں کے دلوں میں چپکے چپکے گھر بھی کرتا جاتا تھا اگر صوفیانہ خیالات اپنی اصلی آب و تاب میں جلوہ پیرا ھو کے نگاہ عقل و ھوش کو خیرہ کرتے تو وہ اتنے زیادہ مقبول عام نہ ھوسکتے تھے جتنے کہ اس صورت میں ھوئے - پھر یہ بات بھی تھی کہ علماے ذوالاحترام کے خطرناک حملوں سے محفوظ رھنے کا یہ عمدہ طریقہ تھا - غزل جیسا کہ ابھی ذکر کیا جاچکا ھے محفل سماع میں گانے جانے کے لیے بھی سب سے زیادہ موزوں تھی اور حلقۂ صوفیاں میں تربیت روح و تذکیۂ نفس کے لیے اس محفل کا انعقاد ضروری سمجھا جاتا تھا - یہ چند اسباب تھے جن کی بنا پر صوفیان کرام نے غزل گوئی اختیار کی - ان حضرات صوفیہ میں چند بلند ترین فطری شاعر تھے - عشق حقیقی کی دھکتی ھوئی آگ نے انھیں شعلہ افشاں بنا دیا تھا - ان کی تصانیف میں وہ خلوص جوش زور اور سرمستی تھی جو دوسرے شاعروں کے کلام میں نہ پائی جاتی تھی لہذا یہ ناممکن تھا کہ ان کا کلام مقبول عام نہ ھوجاتا - ان کے تقدس اور مرتبہ کا بھی ان کے کلام پر اثر پڑنا لازمی تھا چنانچہ بہت جلد ان کا کلام صوفیوں کے لیے کتاب مقدس کا کام دینے لگا - ھر وہ شخص جسے تصوف سے ذوق تھا (اور ایسے اشخاص کی تعداد بہ کثرت تھی کیونکہ تصوف سے دلچسپی کا اظہار فیشن بن گیا تھا) ان غزلوں کو پڑھنا اور اگر ممکن ھو تو کچھ خود بھی اسی انداز میں کہنا اپنا فرض سمجھتا تھا ' اس طرح تصوف کی روز افزوں ترویج (جو کچھ تو انھیں غزلوں کی وجہ سے تھی اور کچھ تاریخی اور تمدنی اسباب سے) غزل کے دائرۂ مقبولیت کو روز

بروز وسیع کرتی گئی —

(ع) - حضرات صوفیہ بلند پایہ فلسفی اور معلم اخلاق بھی تھے اس لیے انھوں نے اپنی غزلوں کو فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین سے بھر دیا - غیر صوفی شاعروں نے بھی اس کی تقلید کی ' کچھہ تو اس وجہ سے کہ انھیں صوفی شعرا کی نقل منظور تھی اور کچھہ اس وجہ سے کہ شاعر کے فرائض میں درس اخلاق بھی سمجھا جاتا تھا - اس کے لیے غزل کے مفرد ' آسانی سے یاد ہوجانے والے اور روز افزوں ہردلعزیز اشعار سے زیادہ اور کون چیز موزوں تھی - اس کا نتیجہ جیسا ہم بیان کرچکے ہیں یہ ہوا کہ غزل چہار مقالہ کی اس عبارت کا مصداق بن گئی کہ —

" چنانکہ شعر در ہر علمے بکار ہمی شود
ہر علمے در شعر بکار ہمی شود "

یہاں تک کہ ممدوح کی تعریف میں قصیدہ خوانی بھی اسی کے ذریعہ سے ہونے لگی - لہذا لوگوں کو بالعموم کسی اور صنف سخن کی ضرورت باقی نہ رہی - شعرا علاوہ مندرجہ بالا اسباب کے جملہ " سخنہاے گفتنی " غزل ہی کے پیرائے میں اس لیے بیان کرتے تھے کہ لوگ عموماً غزل ہی پڑھتے تھے اور لوگ عموماً غزل علاوہ اور اسباب کے اس لیے بھی پڑھتے تھے کہ ہر چیز اس میں پائی جاتی تھی —

ان سب چیزوں نے مل کے غزل کو شاعری کا قریب قریب مترادف بنا دیا اور مذاق شعر گوئی کو اتنا عام کردیا کہ ہر کس و ناکس اس کا دلدادہ نظر آنے لگا - شاعر ہونا یا مذاق شعر و سخن رکھنا طغرۂ امتیاز سمجھا جانے لگا - جسے دیکھئے لہو لگا کے شہیدان سخن میں داخل ہونے پر تیار ہے چاہے اس کے لیے اسے شعر کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے -

اس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوا کہ فارسی شاعری دنیا کے لطیف ترین ادب میں شمار کیے جانے کے لائق ہوگئی اور دوسری طرف بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہوئیں جن کا ذکر کیا جاچکا ہے - یہاں ہم ایک خرابی کا اور ذکر کرتے ہیں جو اس ہردلعزیزی کا براہ راست نتیجہ تھی یعنی اس نے اوسط درجہ کے عمدہ ادب کی تخلیق کو سخت نقصان پہنچایا - ہم بیان کرچکے ہیں کہ اچھی غزل کہنا اچھی نظم کہنے سے بہت زیادہ مشکل ہے - اوسط درجہ کے شعرا جو یوں اچھی نظم کہہ لیتے یا اوسط درجہ کے عمدہ ادب کی کسی دوسری صورت میں تخلیق کرسکتے فنافی الغزل ہوکے رہ گئے ایسے اصناف سخن جن میں تسلسل خیال کی ضرورت ہے وہ کبھی اتنے مصنوعی اور رسمی نہیں ہوسکتے تھے جتنی کہ متاخرین کی غزلیں بن گئیں پھر ایک مسلسل نظم کہنا معمولی غزل کہنے سے مشکل ہے - اس کے علاوہ وہ مستقل توجہ اور کوشش جو ایک نظم کی تصنیف کے لیے ضروری ہے ان متشاعروں کو شعر گوی سے باز رکھتی جنھیں غزل گوئی کی آسانی نے "پانچویں سواروں" میں شامل کردیا - لہذا اگر غزل اتنی ہردلعزیز نہ ہوگئی ہوتی تو فارسی ادب میں غالباً اب سے زیادہ تنوع ہوتا اور اتنا رطب و یابس بھی نہ ہوتا جتنا کہ اب ہے —

سندھ کے اردو شاعر

از

جناب افسر صدیقی امروھی صاحب

(یہ مضمون افسر صدیقی صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے اردو اجلاس میں پڑھا تھا - اڈیٹر)

حضرات !

جو مضمون میں اس وقت آپ کی خدمت میں پیش کررھا ھوں وہ دراصل انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد کی تحریک جائزہ زبان اُردو کی صدائے باز گشت ھے اور غالباً کئی سال کے بعد شرمندۂ تکمیل ھوئی ھے مجھے اگرچہ اپنے زمانۂ ورود کراچی ھی سے سندھ میں آغاز و ارتقائے اُردو کی بابت تحقیق کا خیال پیدا ھو چلا تھا لیکن اس خیال کو عملی صورت میں لانے والی چیز وہ استفسارات ھوئے جو انجمن مذکورہ نے مختلف حصص ملک کے ھمدردان اردو کے نام روانہ کیے تھے —

اولاً شاید سنہ ۱۹۲۸ ع میں مجھے سندھ کے دو قدیم اُردو شاعروں کا پتہ چلا تھا جن میں سے ایک بارھویں صدی کے وسط میں گزرے ھیں اور دوسرے تیرھویں صدی کے آغاز میں لیکن جب جلوں تحقیق و تفتیش نے مقالات الشعرائے 'قانع' کے حصول میں کامیاب کیا تو معلوم ھوا کہ

سندھ کا علاقہ اس قدر فصل و بعد کے باوجود تقریباً اسی زمانے میں اردو کی طرف متوجہ ہوچکا تھا جو اس قومی و ملکی زبان کے آغاز کا شرف رکھتا ہے اور یہ زبان اُردو کی خدا داد شہرینی و موزونیت کا بہت بڑا ثبوت ہے —

تضیع اوقات تو ہوگی لیکن مجھے اجازت دیجیئے کہ میں 'قانع' اور ان کے تذکرۂ شعرا کا مجمل سا ذکر بھی کرتا چلوں - میر علی شیر ساکن تھتھہ جو قانع کے نام سے مصنفین میں ممتاز ہیں سندھ کے ان افراد میں سے ہیں جن کے کمالات علمی بہت زیادہ توجہ طلب ہیں- 'قانع' مرحوم نے اپنے بلند پایہ ذخیرۂ نظم کے علاوہ دو کتابیں ایسی یادگار چھوڑی ہیں جو ان کی حیات جاوید کے لیے ضامن ہیں ایک تحفۃالکرام جو بمبئی سے شائع ہوچکی ہے اور دوسری مقالات‌الشعرا ' جس سے اردو داں طبقہ ابھی تک روشناس نہیں - مقالات‌الشعرا' میں تقریباً سات‌سو ان فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے جو سندھ سے تعلق رکھتے ہیں - ان میں کچھہ تو ایسے ہیں جو ہندوستان سے ایران جاتے ہوئے یا ایران سے ہندوستان آتے ہوئے کچھہ مدت سندھ میں مقیم رہے کچھہ ایسے ہیں جو حکومت وقت کی طرف سے سندھ کے مختلف عہدوں پر تعینات ہوئے اور ایک خاص تعداد ایسے شعرا کی ہے جنھوں نے سندھ میں تعلیم و تربیت حاصل کرکے یہیں اپنی زندگی گزاری —

مقالات‌الشعرا کو مصنف نے سنہ ۱۱۶۸ ھ میں لکھنا شروع کیا اور پانچ برس کی مدت میں یہ تذکرہ تکمیل کو پہنچا - مجھے جو نسخہ بالکل اتفاقیہ طور پر دیکھنے کے لیے دستیاب ہوا وہ مصنف کا اصلی مسودہ تھا جس میں جا بجا حذف و اضافہ بھی کیا گیا تھا نیز ہر حرف

کے آخر میں کچھ جگہہ چھوڑ دی گئی تھی جس میں بعد میں اضافہ کرنا مقصود تھا - معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دوسری مصروفیات کے باعث یہ تملا پوری کرنے کا موقع نہ ملا —

مقالات دراصل فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے لیکن ان میں جو حضرات اردو بھی کہتے تھے ان کے حالات میں جا بجا اس کے اشارے کیے گئے ہیں اور یہ حصہ ہمارے لیے بہت زیادہ قیمتی ہے - مقالات الشعرا کے مطالعہ اور دیگر تصنیفات پر نظر ڈالنے کے بعد سندھ میں اردو کی تدریجی ترقی کی جو تاریخ مرتب ہوتی ہے اس کا ماحصل یہ ہے —

جس وقت 'ولی' اورنگ آبادی شاہ سعداللہ گلشن کی ترغیب و ہدایت سے دہلی میں ادب اردو کی بنیادیں مضبوط کر رہے تھے سندھ میں علامہ عبدالجلیل واسطی بلگرامی کی ذات گرامی بارش علم و فضل میں مصروف تھی - موصوف سنہ ۱۱۱۷ ھ میں سیوستان و بھکر متعلقات سندھ کی وقایع نگاری و بخشی گری و سوانح نویسی پر مامور ہوئے اور سنہ ۱۱۲۹ ھ میں سبک دوش ہوکر وطن مالوف کی طرف سدھارے - ظاہر ہے کہ اہل‌سندھ کو دس سال کے قیام سے علامہ ممدوح نے کہاں تک متاثر کیا ہوگا - میرا تو یقین ہے کہ شاہ محمد معین 'تسلیم' اور میر حیدرالدین 'کامل' جن کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا یا اس زمانے کے دیگر ہندی گو اصحاب جنھوں نے مستقل قریب میں اس طرف توجہ کی یہ انہیں کے فیضان کا نتیجہ تھا -

علامہ عبدالجلیل کے سبک دوش ہونے کے بعد ان کے عالی مرتبت فرزند علامہ سید محمد شاعر اپنے والد بزرگوار کے جانشین ہوئے اور سنہ ۱۱۳۳ ھ سے سنہ ۱۱۴۳ ھ تک فرائض مذکورہ بالا کی ادائیگی کے بعد اپنا چارج علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی کو دے گئے - موصوف نے

سنہ ۱۱۴۵ ھ میں دوبارہ سندھ کو رونق بخشی اور سنہ ۱۱۵۵ ھ تک متمم رہے - علامہ عبدالجلیل واسطی اور علامہ سید محمد شاعر بلگرامی عربی فارسی ترکی کے ماسوا ھندی کے بھی بہترین شاعر تھے - علامہ سید محمدشاعر کے معاصرین میں ایک صاحب جعفر علی 'بھلوا' گزرے ھیں جو نواب مہابت خاں کاظم کی صوبیداری یعنی سنہ ۱۱۳۲ ھ تا سنہ ۱۱۳۵ ھ میں وارد تھتھہ ہوئے - میر 'قانع' لکھتے ھیں —

"از ھند بہ تتہ رسیدہ بود گویند طرفہ مشربے داشت و
از ما سوا بکلّی پرداختہ - صحبتش خالی از حالتے نبود " -

کتب تواریخ کی اوراق گردانی سے 'بھلوا' تخلص کے ایک شاعر کا پتہ چلتا ھے جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کے آغاز عہد سلطنت میں دھلی پہنچے تھے شیخ قیام الدین 'قایم' نے مخزن نکات میں ان کا تذکرہ کیا ھے لیکن نام نہیں لکھا - میر حسن نے تقریباً اسی کیفیت کی نقل کی ھے - نواب علی ابراھیم خاں 'خلیل' نے بھی گلزار ابراھیم میں خان 'آرزو' کی بیاض سے 'بھلوا' کے دو شعر دیے ھیں اور باشندۂ قصبۂ سلام اور معاصر خان 'آرزو' و شاہ 'آبرو' لکھ کر بیان کو ختم کر دیا ھے - گردیزی میں 'بھلوا' کا ذکر نہیں ھے چونکہ محمد شاہ بادشاہ کا عہد حکومت سنہ ۱۱۲۸ھ / ۱۷۱۵ سے شروع ہوا اس لیے 'قایم' نے اوائل سلطنت محمد شاہ میں جس 'بھلوا' کا دھلی وارد ہونا بیان کیا ھے غالباً یہی میر جعفر علی بھلوا ھیں جو دھلی سے کسی بنا پر تھتھے میں آئے اور میرعلی شیر قانع نے زبانی روایات کی بنیاد پر "از ھند بہ تتہ رسیدہ بود" تحریر کردیا - 'بھلوا' فارسی کے بھی شاعر تھے اور اردو کے بھی، ان کے صرف دو شعر ھیں جو فرداً فرداً تمام تذکروں میں درج ہوئے ھیں، مقطع خوب لکھا ھے —

' بھنوا ' ھوں زکواۃ حسن کی دے او میاں مالدار کی صورت

علامہ سید غلام علی آزاد بلگرامی نے جیسا کہ تاریخوں سے ثابت ہے ... ... سال تک سندھ میں وقائع نگاری و سوانح نویسی کے ساتھہ ساتھہ تصنیف و تالیف اور درس و افادہ کا دریائے بیکراں جاری رکھا اور یہیں "ید بیضا" ترتیب دیا - آزاد مرحوم عربی و فارسی کی طرح اردو کے بھی بلند پایہ شاعر تھے - سخن شعرا میں مولوی عبدالغفور خاں ' نسّاخ ' نےاور خمخانۂ جاوید میں لالہ سری رام - ایم - اے ' نے ان کے اردو اشعار درج کیے ھیں - ان کے چند فیض یافتہ بھی تھے جن میں سے میر مرتضیٰ کا تذکرہ مصنف مقالات الشعرا نے کیا ہے —

میر غلام علی ' آزاد ' کا زمانۂ قیام سندھ نہایت زریں ہے یہی وہ وقت ہے کہ شیخ محمد علی ' حزیں ' ایران سے تشریف لائے اور ھندوستان جاتے ہوئے ٹھٹھہ میں چند ماہ قیام کیا - ملّا باقر ' شہید ' صفاھانی المتوفی رجب سنہ ۱،۷۸ ھ اورنگ آباد سے آکر شیخ کے تلمذ اور صحبت سے یہیں بہرہ ور ہوے - 'شہید' صفاھانی نے فارسی کی طرح اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے اُن کے جو اشعار مولوی عبدالجبار خاں آصفی نے تذکرۂ شعرائے دکن جلد دوم میں دیے ھیں ان میں یہ شعر سب سے زیادہ پسند خاطر ہو سکتا ہے —

شہید اُس نفس کافر کیش کو مار حقیقت کا مظفر جنگ ہو جا

تقریباً اسی زمانے میں آفتاب رائے ' رسوا ' ھندوستان کی گشت کرتے ہوئے وارد سندھ ہوئے اور چند شعرائے سندھ کے ساتھہ جن میں ملّا محمد باقر قاضی عبدالقادر اور شیخ محمد کریم کے نام معلوم ہو سکے ھیں بزم شعر و سخن منعقد کی - صاحب مقالات لکھتے ھیں کہ ایک روز ' صائب ' کی غزل کو

مخمس کہا گیا جس کی زمین "خریدار تو نیست" ہے - مذکورۂ بالا شرکائے مجلس نے مقابلتاً غزل مرقومہ کے ایک ایک شعر کو انتخاب کر کے تضمین کی جس پر 'رسوا' رنجیدہ ہوگئے اور مندرجۂ ذیل مقطع کہہ کر سلسلۂ سخن مسدود کر دیا —

وعظ کم کن تو بہ ایں مردم کودن صائب
بکش از صحبت ایں سلسلہ دامن صائب

حرف 'رسوا' شنو و شور میفگن صائب
پیش ارباب حسد مہر بلب زن صائب

گوش ایں بد گہراں لایق گفتار تو نیست

یہ تضمین مقالات الشعرا میں درج ہے —

ملا محمد باقر غالباً وہی بزرگ ہیں جن کا ذکر 'شہید' تخلص کے نام سے اوپر کیا گیا ہے اور جن کے فیض تربیت نے بقول 'مصحفی' مرزا قتیل جیسا نغز گو فارسی شاعر پیدا کیا —

اس عہد کے ایک سندھی نژاد اور قابل ذکر شاعر اور ہیں جن کا تخلص مصنف مقالات الشعرا نے 'ورد' تحریر کیا ہے - ان حضرت نے قاضیٔ شہر تھٹھہ کی ہجو میں بہت سی اردو نظمیں کہی تھیں جن میں سے ایک 'حافظ' شیرازی کی مشہور غزل "الایا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا" کی زمین میں تھوڑے سے تغیر کے ساتھہ کہی گئی تھی اس غزل کا مطلع یہ ہے جو بطور مزاح کہا گیا تھا —

الا یا ایہا المفتی شدہ ریش تو جنگلہا
اُکھاڑوں بال یک یک کر بناؤں خوب کنّلہا

شیخ 'ورد' نے بقول صاحب مقالات الشعرا سنہ ۱۱۴۳ ھ کے قریب

ایک خون کے الزام میں پھانسی پائی —

اس عہد کے ایک اور اردو کے شاعر محمد سعید صاحب 'راهدر' گوالیاری ہیں جو نواب سیف الله خاں متعهنه سنه ۴۳ - ۱۱۲۷ ھ کے عہد میں تھٹھے میں آئے تھے مقالات الشعرا میں تحریر ہے " شعر هندی بسیار می گفت " لیکن کوئی شعر درج نہیں کیا گیا جس سے مرتبۂ سخن کا اندازہ ہوتا -

علاوہ سندھی شعرا میں ایک صاحب تھے جن کا نام میر غلام مصطفیٰ اور تخلص محزوں لکھا ہے یہ زیارت عتبات عالیات سے واپس آتے ہوئے کچھ مدت تھٹھے میں ٹھہرے میر قانع ان کے تعارف کلام میں کہتے ہیں -

" در واقعہ حضرت امام مرثیہ ہائے زبان هندی و پارسی بسیار دارد " -

غالباً محزوں مذکور نے شیخ عبدالسبحان فائز کے مکان پر قیام کیا تھا کیونکہ مقالات الشعرا کے مصنف نے 'محزوں' کا کلام فائز مذکور کی بیاض سے نقل کرکے درج تذکرہ کیا ہے - خود 'فائز' بھی نہایت بذلہ سنج شاعر اور اپنے وقت کے 'انشا' تھے - مقالات کے مصنف نے ان کی حاضر جوابی کی بہت تعریف کی ہے' کہتے ہیں —

" در ظرافت گوئی بے مثل بود حتیٰ کہ سخنش بہ سبب بذلہ گوئی از لطف شعری عاری ماندہ' ایہام هندی خوب می بندد - شعر هندی و پارسی بسیار گفتہ و اکثر آں در مناقب و مرثیہ واقع " —

اس دور کا حال نا تمام رہے گا اگر سندھ کے دو خاص اور بے مثال بزرگوں کے نام پیش نہ کیے جائیں - ان میں سے ایک مخدوم محمد معین 'تسلیم' تھے اور دوسرے میر حیدرالدین 'کامل' - ابو تراب میر حیدرالدین 'کامل' فقیر صاحب دل اور مرجع ارباب کمال تھے' عزلت گزینی و گوشہ گیری میں عمر گزاری - میر علی شیر قانع کو انہیں سے فیض پہنچا تھا - فارسی

کے دو بڑے دفتر اپنے شاگرد میاں محمد پناہ 'رجا' کو ترتیب کے لیے دیے تھے اور ابھی مبیضہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ خود ان کا سنہ ۱۱۹۴ ھ میں انتقال ہوگیا - موصوف فارسی کے علاوہ ہندی کے بہترین شاعر تھے ' میر 'قانع' نے اردوگوئی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے —

"هرچه اشعار هندی ایشان عالمگیر است اما آنچه
فقیر یاد می دارد می نویسد" —

اس کے بعد دس اشعار نقل کیے ہیں جن میں سے یہ تین قابل شنید ہیں —

لیوں دلبر کے میرے قتل پر بیڑا اٹھایا ہے
الہی خون سے میرے تو اس کو سرخرو کرنا

خال رخسار پر اچنبھا ہے	گال کے کھیت میں اُگا ہے تل

دوست بخشیگا دوست سب کے سب	گرچہ عاصی ہوں اُس کا آسی ہوں

جن حضرات نے کامل مرحوم سے استفادۂ سخن کیا ان کا ذکر آئندہ آتا ہے —

مخدوم محمد معین 'تسلیم' ٹھٹھوی تمام علوم معقول و منقول کے جامع تھے - فقر میں بے مثال اور صاحب حال و قال گزرے - میاں ابوالقاسم نقشبندی ٹھٹھوی اور شاہ عبدالطیف نازک بھٹائی سے ارادت رکھتے تھے - میر نجم الدین عزلت رضوی بھکّری اور مولوی محمد صادق خاص شاگردوں میں تھے میر سعداللہ سورتی اور ان کے درمیان مراسلات اخلاص و محاکمات علمی ہوتے تھے - مدت تک مسند علم پر متمکن رہے سنہ ۱۱۶۰ ھ میں وفات پائی - شہر کے اکثر ارباب فکر نے وفات کی تاریخیں کہیں جو مقالات الشعرا میں ہیں - فارسی میں 'تسلیم' اور ہندی میں 'بیراگی'

تخلص کرتے تھے - مصنف مقالات کا بیان ہے —

" در ہندی از قسم دوہرہ و کبت ' بیراگی ' تخلص داشتند " —

افسوس نمونۂ کلام دستیاب نہ ہوسکا —

میں نے اس وقت تک بارہ اردو شاعروں کا ذکر کیا جن کا تعلق سندھ سے ثابت ہوتا ہے ان میں سے میر عبدالجلیل تو یقیناً ولی کے معاصر اور دور اول کی یادگار ہیں ' بقیہ حضرات کو دوسرے دور کا شاعر کہا جاسکتا ہے - بہر حال یہ امر ثابت ہے کہ اردو نے اپنے آغاز ہی میں دوسرے صوبوں کی طرح سندھ کو بھی اپنی طرف ملتفت کرلیا تھا -

اب تیسرے دور کے چاند شعرا کے نام سن لیجیے یہ تعداد میں ۸ ہیں -

میر محمود 'صابر' رضوی استرابادی دلی میں پیدا ہوئے زیارت عتبات عالیات کے لیے گئے تھے سنہ ۱۱۴۰ ھ میں واپس آکر تھٹھے میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور تاہل کی زندگی گزارنے لگے - بہت پرگو تھے اور سنہ ۱۱۷۳ ھ تک بقول صاحب مقالات الشعرا تقریباً ایک لاکھ اشعار تصنیف کر چکے تھے - مرثیہ گوئی میں خاص مزاولت تھی ' روضۃ الشہدا کے مصنف ہیں - تحفۃالکرام کی تکمیل سے چند ماہ پہلے فوت ہوئے - " بزبان ہندی و پارسی دیوانہائے متعدد در مرثیہ و بعضے در غزلیات و مناقب درست کردہ " سے اُردو گوئی کی تصدیق ہوتی ہے —

محسن الدین شیرازی سورت سے سندھ کو آتے ہوئے قانع کے ہمسفر رہے تھے ' اس لیے ان کے حالات معلوم کرنے کا موقع ملا —

" اگرچہ ولایت را بود اما ہندو فصیح یاد داشت " —

میر حفیظ الدین علی میر حیدرالدین ' کامل ' مسبوق الذکر کے بھتیجے تھے ان کی بابت تو مقالات الشعرا کی پوری عبارت پڑھ دینا ضروری ہے —

" باوجود کم سوادی و بصارت بصرو کڑی گوشها در زمین لطائف و غرائب شعر بزبان هندوی خسرو ثانی است - معانیها که وے در دوهرہها وکبت و ابیات و نکات هندی می بندد و فهم آں برهمه کس از قبیل دشوار ' اغلب کلام در هندوی طرز ایهام واقع اماچه ایهام که از دو سه وچهار و پنج معنی هم گاہ گاهے تجاوز دارد " —

اس کے بعد دو عام فہم بیتیں ایہام بندی کی مثال میں درج کی ہیں جن کو رسم الخط خراب ہونے کے باعث میں اچھی طرح پڑھ نہ سکا ان میں سے ایک شعر کا ایک مصرع یہ ہے —

پہلی ہے کیوں کناری سونا نہیں " لہرکا "

اور دوسرے شعر کا ایک مصرع یوں ہے —

سر کا بنا تو آکے سوئے سلونے اچھے

سید فضائل علی ' بیقید ' اصلاً سندھی نہ تھے بلکہ اولاً عمدۃالملک نواب امیر خاں کی نیابت میں اور بعدہ بالاصالت ٹھٹھہ کے صوبیدار ہوکر سندھ میں پہنچے تھے میر علی شیر نے ان کو دیوان لکھا ہے ' مرزا عبدالغفار ' صہبا ' تبریزی کے ذکر میں ہے —

" همراہ نواب رضی محمد خاں در بلدہ آمدہ نسبت دامادی بہ دیوان فضائل علی خاں درست کردہ - همیں جا در اواخر عهد نواب سیف اللہ خاں از صهبائے کل من علیها فان نوش کردہ " —

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فضائل علی خاں نے ٹھٹھہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی - فضائل علی خاں اُردو کے اچھے شاعر تھے '

اُن کی ایک مثنوی اپنے عشق و محبت کی داستان سے لبریز پانچسو اشعار کی ہے جس کا انتخاب میر حسن اور علی ابراھیم خاں کے تذکروں میں دیا گیا ہے جوان محمد شاھی تھے لیکن اس وجہ سے کہ گردیزی و قائم کے تذکروں کے بعد نام و نمود حاصل کی میں نے اُن کو دوسرے دور میں شامل کیا ہے —

عماد الملک غازی الدین خاں 'نظام' فیروز جنگ بہادر - احمد شاہ کے عہد میں بخشی الممالک اور عالمگیر ثانی کے عہد میں وزیر الممالک کے خطابات سے سرفراز ہوے - سنہ ۱۱۹۵ ھ میں حسب قول صاحب گلزار ابراھیم اطراف سندھ میں تشریف لے آئے تھے اُردو فارسی دونوں زبانوں کے شاعر ہیں —

سید ضیاءالدین 'ضیا' - مصنف مقالات الشعرا میر علی شیر 'قانع' کے برادر عمزاد تھے میر تھارا خاں رفیق سوم والیء ریاست میر پور خاص متوفی سنہ ۱۲۴۵ ھ کے مصاحب اور درباری شاعر تھے اُن کا قلمی دیوان فارسی اُن کے اخلاف کے پاس موجود ہے جس کے دیباچے میں لکھا ہے " بالفعل دیوان بزبان ھندی تصنیف نمودہ " - دیوان ھندی میں غزلیات ' مستزاد ' ترجیع بند ' قصائد ' مخمس ' مسدس وغیرہ تمام اصناف سخن موجود ہیں - رنگ کلام کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے —

کس کی طاقت نہیں ہے دیکھے اُسے جن نے دیکھا ہے بے قرار آیا
باریک ہوا برگ سمن کا زخجالت جب ذکر ہوا اُس کے کبھی موئے میاں کا
ہے وہ خلوت نشین محفل قدس عاشقاں میں جو پانباز ہوا

میر علی شیر 'قانع' مصنف مقالات الشعرا بھی اسی دور کے شاعر

میں اُنھوں نے میر حیدرالدین 'کامل' کے فیضان تلمذ سے اُردو شاعری کی طرف توجہ کی تھی چنانچہ خود کہتے ہیں —

" فقیر نیز در حضور آں اُستاد کامل گاہے گاہے فکر ہندی می کرد " —

اور اس کے ساتھہ مندرجۂ ذیل شعر بھی درج کیا ہے —

مجھہ شہادت کی جگت میں تھی پیاس
کیوں نلہاوے نیلے انکھیاں کربلا

شعر کا مطلب خدا جانے کیا ہے میں نے مقالات الشعرا سے بجنسہ نقل کرکے آپ کے سامنے پیش کردیا ہے - ان کے شاگردوں میں منشی پرسرام 'مشتری' ایک فارسی گو شاعر تھے انھیں اُردو لکھنے کا بھی شوق تھا 'بیربل' تخلص کرتے تھے اور میر محمود 'صابر' رضوی سابق الذکر سے اصلاح لیتے تھے سنہ ۱۱۷۳ ھ میں مبتدی تھے —

سندھ کی قدیم اُردو تاریخ کے سلسلے میں جو معلومات مجھے بہم پہنچی تھیں پیش کردی گئیں جتنے شعرا کا ذکر اب تک کیا گیا اُن کا زمانۂ حیات زیادہ سے زیادہ تیرھویں صدی کے آغاز تک ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد موجودہ صدی کے اوائل میں اُردو گو شعرا ملتے ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ نواب عبداللہ خاں 'ضیغم' نے اپنی تصنیف " یادگار ضیغم " میں کیا ہے اور کچھہ اصحاب کے حالات و کلام میں نے دیگر ذرائع سے فراہم کیے ہیں - اب رہا درمیانی وقفہ جو سو برس سے کچھہ ہی کم ہوگا وہ ابھی تک تشنۂ تحقیق ہے - دور چہارم کے بعد اور دور ہشتم کے آغاز تک یقیناً متعدد شعرائے اُردو ہوے ہوں گے لیکن مجھے صرف پانچ نام معلوم ہوسکے ہیں - ان میں سب سے مقدم العصر سید ثابت علی زوار سیوستانی تھے جن کو فارسی و سندھی کے سوا اردو لکھنے کا شوق

بھی تھا باکمال شاعر اور عدیم النظیر تاریخ گو مخدوم نورالحق مستانی سیوستانی اور غلام علی 'مداح' تھتھوی سے استفادہ کیا تھا' سنہ ۱۲۲۵ ھ میں وفات پائی - ان کے بعد میر صوبیدار خاں 'میر' خلف میر فتح علی خاں رئیس حیدرآباد سندھ خوش گو شاعر اور شعرا کے قدرداں تھے سنہ ۱۲۶۴ ھ میں فوت ہوے - مخدوم عبدالکریم 'کرم' خلف غلام حیدر ساکن تھتھہ نے سنہ ۱۲۷۴ ھ میں انتقال کیا - غلام حسین 'افضل' سبزپوش تھتھوی شاعر نازک خیال اور قدر شناس سخن تھے نثر نویسی میں بھی مہارت رکھتے تھے تنبیہ المعاندین' مثنوی نان و نمک' نظم نوروز اور انشاء افضل یادگار چھوڑ کر ۱۴ جمادی الآخر سنہ ۱۲۷۸ ھ میں وفات پائی - آخر میں 'اسد' تخلص کرلیا تھا —

یہ سلسلۂ شعرا سید غلام محمد 'گدا' ہاشمی پر ختم ہو جاتا ہے جو علوم معقول و منقول میں اخوند احمدی و اخوند روشن حیدرآبادی سے مستفید تھے - میروں کی حکومت کے خاتمے پر بھی عزت سے گزاری اور ہزہائینس میرحسین علی خاں بہادر کے وظیفہ خوار و مصاحب رہے - میر صاحب کو سندھی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں پوری قدرت حاصل تھی ان کا سندھی ترجمۂ سکندر نامۂ نظامی مطبوعہ موجود ہے - تفصیل کے لیے ماہنامۂ تنویر اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ ع ملاحظہ فرمائیے —

ساتویں دور کے شعرا میں سب سے مقدم العصر تو مخدوم محمد ابراہیم 'خلیل' تھتھوی ہیں جو اپنے والد بزرگوار مخدوم عبدالکریم صدیقی نقشبندی سے تعلیم و تربیت حاصل کرکے میاں محمد زاہد شاکرانی کے شاگرد ہوئے اور مسکین کے بدلے 'خلیل' تخلص سے شہرت پائی زبان فارسی کے علاوہ اردو سے بھی نابلد نہ تھے' خود لکھتے ہیں کہ "بزبان ہندی

ہر چہ کردہ ام درآں ہم تخلص مسکین است وزبان ہندی را فقیر نداند مگر از سبب اثر صحبت سید غلام محمد 'گدا' تخلص کہ چار پنج روزہ در بلدہ (ٹھٹھہ) بود و دیوان 'ناسخ' و 'آتش' و آباد را دیدہ شد ازاں این قدر اثرے شد کہ چلد غزل گفتہ" - ان کی قابل قدر تصنیف مقالات الشعرا کا تکملہ ہے جس میں سنہ ۱۳۰۶ ھ تک کے حالات درج کیے گئے ہیں - افسوس یہ ہے کہ تکملہ کا قلمی نسخہ جو موصوف کے اخلاف کے پاس محفوظ ہے مجھے دیکھنے کے لیے نہ مل سکا اگر مل جاتا تو دور چہارم و ہفتم کے درمیان اس قدر بے ربطی باقی نہ رہتی —

'خلیل' مذکور کے شاگردوں میں ایک تو ان کے صاحبزادے محمد زماں 'حبیب' تھے جن کا انتقال سنہ ۱۳۰۶ ھ میں ہوا اور دوسرے قاضی غلام علی جعفری خلف یحییٰ جعفری طیاری ٹھٹھوی ان کا انتقال سنہ ۱۳۰۳ ھ میں ہوا ہر سہ حضرات کو دور ششم کی یادگار کہا جاسکتا ہے - مخدوم محمد ابراہیم 'خلیل' کے مفصل حالات تنویر ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۶ ع میں شائع ہو چکے ہیں —

ساتویں دور میں میر حیدر علی 'افسر' میر غلام حیدر 'تاب' اور سیٹھہ محمد اسمعیل 'مغموم' رئیس مدراسی ہیں ان میں سے 'مغموم' کے حالات یادگار ضیغم میں دیے گئے ہیں بقیہ دو حضرات کے صرف نام ہیں' حالات و نمونۂ کلام مہیا کرنے میں مصنف یادگار ضیغم کو کامیابی نہیں ہوئی - اسی دور کے ایک اور سندھی نژاد شاعر محمد یوسف خاں 'ظہیر' تھے جنھوں نے ملازمت کی وجہ سے سندھ کو ترک کردیا تھا اور یو - پی کے علاقے میں آگئے تھے - غلام محمد خاں 'خبیر' کے شاگرد تھے کلام اردو کا نمونہ یادگار ضیغم میں موجود ہے - مذکورۂ بالا حضرات کے

علاوہ اس دور کے شعرا میں منشی دولپت رائے 'بیکس' قاضی محمد ھاشم 'مخلص' شیر علی خاں 'اسد' سعداللہ 'نیازی' انصاری' ولی محمد 'ولی' ولیم برویت 'ولیم' - پیر بخش 'اثر' اور منشی محمد ملہر 'ملہر' وغیرھم ھیں جن کا کلام میں جمع کر چکا ھوں اور تدوین حالات میں ساعی ھوں - اُن میں سے اکثر حضرات کی منظومات اس وقت کے ماھانہ گلدستوں میں شائع ھوتی تھیں —

سندھ میں اردو کا آٹھواں دور نہایت حوصلہ افزا ھے خصوصاً اس حالت میں کہ آغا 'حشر' کا شمیری مرحوم منشی عبدالعزیز 'ذائق' فرخ آبادی' منشی عبداللہ 'فضا' حیدرآبادی وغیرہ نے مدت تک ھنگامۂ شاعری برپا رکھا - خواجہ ولایت حسین 'صغیر' مرحوم کی تحریک سے سیٹھہ فدا علی صاحب رئیس کراچی نے ڈھائی ھزار کے عطیہ سے انجمن ترقیٔ اردو کی بنیاد رکھی - اور میونسپل بورڈ کراچی نے اردو داں پبلک کے لیے پرائمری اسکول جاری کیے - خدا کا فضل ھے کہ موجودہ زمانے میں تقریباً (۶۰) سرکاری ؛ غیر سرکاری مدارس اردو اردو کی اشاعت کر رھے ھیں اور ایک درجن سے زیادہ کتب خانے اور دارالمطالعہ قایم ھیں اور یہ اس امر کی بین دلیلیں ھیں کہ اب اشاعت اردو کا دریائے مواج کسی عارضی و عصبی بندش سے آسانی کے ساتھہ نہیں روکا جا سکتا —

اردو شعرائے سندھ کے دو قلمی تذکرے اس وقت میری تحویل میں ھیں ایک میں نے مرتب کیا ھے جس میں سنہ ۱۱۳۵ ھ سے سنہ ۱۳۳۵ ھ تک اردو شعرا جمع کیے گئے ھیں - دوسرا میرے عزیز دوست و شاگرد سید محمد ارشاد حسین 'شاد' صابری کا مرتب کیا ھوا ھے جس میں صرف اِن پچاس شعرا کا تذکرہ ھے جو سنہ ۱۹۳۰ ع میں کراچی میں موجود

تھے، نہیں کہا جاسکتا کہ کب طبع ہوں —

یہاں یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ شاہی زمانے میں ٹھٹھہ - سیوستان اور بھکر کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور موجودہ سلطنت نے کراچی کو صدر مقام مقرر کیا ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دونوں حالتوں میں صرف مرکزی مقامات ہی میں اردو کی اہمیت جاذب قلوب ہوئی اور ہے' مفصلات و اضلاع میں نہ پہلے کوئی چرچا تھا نہ اب پایا جاتا ہے - اگر ایسا نہ ہوتا اور سندھ کے اطراف میں رغبت اردو یکساں طور پر ہوتی تو مجھے ماهنامۂ تنویر کے اجرا سے اب تک جس کو تقریباً تین سال کی مدت منقضی ہوتی ہے اس اردو رسالے کی اشاعت کے سلسلے میں نقصان برداشت کرنا نہ پڑتا —

ضرورت ہے کہ ایک منظم و موثر لائحہ عمل سے کام لے کر سندھ کے گوشے گوشے کو آوازۂ اردو سے معمور کر دیا جائے —

مقامی اعتبار سے اشاعت و ترویج اردو میں کون کون سی مشکلات حائل ہیں اور وہ کون کون سے وسائل و ذرائع ہیں جن سے مقصد اشاعت میں عاجلانہ کامیابی ہوسکتی ہے یہ تمام باتیں انشااللہ ماهنامہ تنویر کراچی کے صفحات سے ہمدردان و بہی خواہان اردو کے سامنے وقتاً فوقتاً پیش ہوتی رہیں گی - مضمون ختم ہوگیا اب مجھے صرف آپ کا دلی شکریہ ادا کرنا باقی ہے کہ مجھے اس اہم اجتماع کے موقع پر جب کہ بہتر سے بہتر مضامین و تقاریر بالیدگیٔ ذوق کی موجب ہوسکتی تھیں یہ مقالہ پڑھنے کی اجازت عطا فرمائی اور میرے طول طویل بیان کو جس میں کسی قسم کی ندرت و شگفتگی کا شائبہ تک نہیں نہایت دلجمعی و اطمینان و سکون کے ساتھ سماعت فرمایا —

رپوٹ انجمن ترقیء اردو راجپوتانہ

از

(مولانا محمد بہلول خاں صاحب "دانا")

[یہ رپوٹ محمد بہلول خان صاحب دانا صدر جمعیت افاغنہ جوموں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی میں پیش کی - محمد بہلول خان صاحب انجمن ترقیء اردو راجپوتانہ کے بانی اور اردو کے بڑے حامی ھیں - انھوں نے اپنے علاقے میں اردو کی اشاعت میں جس سرگرمی اور مستعدی سے کام کیا ھے وہ اس رپوٹ سے ظاھر ھے - اڈیٹر]

راجپوتانہ میں (۲۰) ریاستیں ھیں - ان ریاستوں میں قدیم الایام سے سرکاری دفاتر کی زبان اردو تھی جب سے اردو زبان کے خلاف تحریک شروع ھوئی اردو زبان ریاستوں کے دفاتر سے مفقود ھونے لگی یہاں تک کہ سوا جے پور کے تمام ھندو رجواڑوں کے دفاتر سے اردو نکال دی گئی —

میں نے دیکھا کہ جے پور سے بھی اردو آھستہ آھستہ مٹ رھی ھے دفاتر سرکاری میں جہاں صرف اردو رواج پائے ھوئے تھی بتدریج ھندی بھی جگہہ پارھی ھے اور دیہاتی مدارس میں عام طور پر نری ھندی پڑھائی جارھی ھے تو میں سمجھہ گیا کہ اگر فوری حفاظتی تدابیر کام میں نہ لائی گئیں تو راجپوتانہ کی اس چوٹی کی ریاست سے بھی ھم اردو کو خارج ھوا دیکھہ لیں گے —

میں نے صورت حال سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو مطلع

کہا اور ایسا مفید مشورہ طلب کیا جس سے راجپوتانہ میں اردو زبان کی حفاظت ہوسکے اور وہ فروغ پاسکے - مجھے خبر دی گئی کہ عنقریب علی گڈہ میں انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد (دکن) کا جلسہ ہونے والا ہے - میں اس میں شریک ہونے کی کوشش کروں، مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ میں تحفظ و ترقیء اردو کے سلسلہ میں جناب مولوی عبدالحق صاحب بی - اے (علیگ) سکریٹری انجمن ترقیء اردو سے خط کتابت کروں - میں نے جناب مولوی عبدالحق صاحب کی خدمت میں ایک تفصیلی خط لکھا اور اس میں اردو زبان کی راجپوتانہ میں کس مپرسی کا حال ظاہر کیا - مولوی صاحب نے بھی مجھے انجمن ترقیء اردو کی آل انڈیا اردو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی اور میں ۲۵ اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ ع کو اس کانفرنس کے آخری اجلاس میں شریک ہوا تبادلہ خیالات کے بعد مجھے جناب سکریٹری صاحب نے "انجمن ترقی اردو راجپوتانہ" قایم کرنے کی ہدایت کی - میں نے اس خدمت کو بسروچشم اٹھایا اور اپنے وطن میں پہنچ کر انجمن ترقی اردو راجپوتانہ کی بنیاد رکھی - اور اردو زبان کی حفاظت اور ترقی کے لیے حسب ذیل تدابیر اختیار کیں —

(۱) اردو کی حمایت میں پرزور مضامین لکھے اور متعدد اخبارات میں انہیں اشاعت دی ان مضامین میں ظاہر کیا کہ —

(ا) اردو تمام ہندوستان کی واحد مشترکہ زبان ہے اور کسی ایک فرقہ اور ایک علاقہ کی زبان نہیں ہے —

(ب) اردو کو ہمیشہ سے ہندؤں مسلمانوں اور گورنمنٹ نے آل انڈیا حیثیت کی زبان مانا ہے اور اردو کے سوا کسی دوسری زبان کو یہ درجہ نہیں دیا ہے چنانچہ اس دعوے کی دلیل میں گورنمنٹ کے روپیہ

کو پیش کیا گیا ہے جس پر صرف ہندوستان کی ایک زبان اردو میں " یک روپیہ " منقش ہے اور یہ زبان اردو کے تمام ہندوستان کی واحد مشترکہ زبان ہونے کا بین ثبوت ہے —

(ج) اردو ہندو مسلم اتحاد کی زندہ یادگار ہے -

(د) اردو ہندو مسلم اختلافات کے دور کرنے کا ذریعہ ہے -

(ھ) اردو ہندو مسلم مفاہمت کا واسطہ ہے -

(و) اردو ہند کے اجزاے مختلفہ کو دولت مشترکہ میں ڈھالنے کا بہترین سانچا ہے -

(ز) بیرون ہند کی تمام مہذب دنیا نے بھی اردو ھی کو ہندوستان کی عام زبان تسلیم کیا ہے -

(ح) اردو وہ زبان ہے جو ہندوستان سے باہر افغانستان، ایران، عراق، حجاز، عمان، بحرین، کویت، یمن، عدن، زنجبار، سمالی لینڈ، سنگاپور، جاوا، وغیرہ دور دراز مقامات تک میں سمجھی جاتی ہے -

(ط) اردو وہ زبان ہے جس کا رسم الخط افغانستان اور وسط ایشیا اور ایران اور عرب اور تمام شمالی اور مغربی افریقہ اور سوڈان وغیرہ میں پڑھا جاسکتا ہے -

(ی) اردو وہ زبان ہے جس کی نشر و اشاعت ہندو مسلمان دونوں نے مل کر کی ہے اور آج بھی اس کام میں یہ دونوں اپنا سرمایہ اور محنت برابر لگا رہے ہیں - سوا اردو کے کسی اور ہندوستانی زبان کو یہ بات حاصل نہیں ہے -

(ک) اردو وہ زبان ہے جسے (۱۲) کرور ہندوستانی اور کروروں غیر ہندوستانی بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں، یہ مقبولیت ہندوستان کی کسی اور زبان کو حاصل نہیں ہے -

(ل) اردو وہ زبان ہے جسے تمام ہندوستان کے مسلمان اپنی مشترکہ زبان تسلیم کرتے ہیں —

(م) اردو وہ زبان ہے جسے ہندو مسلمان قدیم الایام سے اپنی واحد مشترکہ زبان سمجھتے آئے ہیں —

(ن) اردو وہ زبان ہے جسے ہندوستان کی مشترکہ زبان اور واحد مشترکہ زبان آئندہ بھی رکھنا ضروری ہے یہ وہ حقایق ہیں جن پر متعدد مضامین میں مختلف اخبارات کے ذریعہ روشنی ڈالی گئی —

(۲) اردو کی حفاظت اور ترقی کے لیے دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ہندوستان کے با اثر اور مقتدر لوگوں سے نامہ و پیام کے ذریعہ سے اردو کی اہمیت پر توجہ دلا کر اس کی حفاظت اور ترقی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی - اور دکھلایا گیا کہ اردو کی مقبولیت کا راز اس کی شیرینی اور پاکیزگی میں ہے اس کے ساتھ یہ باتیں اور ہیں کہ یہ کم از کم جگہہ گھیرتی ہے یہ جلد از جلد لکھی اور پڑھی جاتی ہے اور یہ مختصر نویسی کا نہایت آسان طریقہ ہے اور ہندوستان کے ارد گرد کے ممالک میں اس کے رسم الخط کا رواج ہونے سے یہ ہندوستان کی تجارت کو فروغ دینے کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے —

ہند کے ارباب سیاست سے یہ کہا گیا کہ وہ ہند کے مختلف المذہب مختلف القوم افراد کے جوڑنے والے رشتہ کو نہ توڑیں اور یہ رشتہ اردو زبان اور اردو رسم الخط ہے اردو کی مخالفت ہندو مسلم مغائرت کی خلیج کو بہت گہرا کردے گی اور انجام کار ناقابل عبور بنادے گی کیونکہ ہند کی دو زبردست اقوام ہندو مسلمانوں کی جب زبانیں بھی دو ہوجائیں گی اور وہ ایک دوسرے کی بات سمجھہ نہ سکیں گے تو

ظاہر ہے کہ افہام و تفہیم کی راہیں مسدود ہو جائیں گی —

جب مہاتما گاندھی جی کو اردو کی طرف توجہ دلائی گئی تو انہوں نے سودیشی کاغذ پر جو خاص جے پور ہی کا بنا ہوا ہے مجھے یہ لکھا کہ "بھائی محمد بہلول خان! میری طرف آپ کبھی ڈر نہ رکھیں کہ میں اردو کی مخالفت کروں —

سیگاؤں وردھا $\frac{11}{36}$ ۱۲ م - ک - گاندھی
آپکا

جب میں نے مہاتماجی کو پھر لکھا کہ مخالفت نہ کرنا کوئی بڑی بات نہیں وہ تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان "اردو" کی ترقی میں کوشش کیوں نہ کریں؟ تو انہوں نے یہ جواب دیا :—

بھائی محمد بہلول خاں! مجھے پتا نہیں اردو کی ترقی میں میں کیا کوشش کروں یا کرسکتا ہوں میرا خیال ہے میں مخالفت نہ کروں وہی میری کافی کوشش ہے اس سے زیادہ میری شکتی کے باہر ہے - آپ اچھے ہوں گے —

م - ک - گاندھی

سیگاؤں وردھا ۳۶ - ۱۲ - ۲۳

یہ دونوں خط گاندھی جی نے اپنے قلم سے اردو میں لکھے ہیں اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ اردو لکھنے کی مشق کر رہے ہیں اور اردو کی مخالفت کبھی نہ کرنے کا وعدہ کرتے ہیں - میں اسے بڑی کامیابی سمجھتا ہوں جو مجھے خلاف توقع اتنی جلد حاصل ہوئی ہے مجھے مہاتما جی سے قوی امید ہے کہ وہ اپنے بچن پر قایم رہیں گے اور جب ہند کی مشترکہ زبان کے تعین میں اختلاف کرنے والوں کی صفیں ان کے سامنے کھڑی ہوں گی تو وہ ان میں ہرگز نہ کھڑے ہوں گے - انجمن ترقی اردو راجپوتانہ ان کا پہلے ہی سے شکریہ ادا کرتی ہے -

اس سلسلہ میں مہاتما پوگندر پوری جی نے جو شنکر یہ اچاریہ کی سمپرداے کے بڑے مہنت ہیں جو خط مجھے لکھا ہے اس کا تذکرہ بھی ضرور کروں گا وہ لکھتے ہیں کہ اردو زبان کی بنیاد ہندوں نے رکھی کیونکہ شاہی فوج میں جو راجپوت ایرانیوں مغلوں اور ترکوں اور عربوں کے ساتھہ رہتے تھے وہ درباری زبان سے جو کہ فارسی تھی نا آشنا تھے وہ اپنی زبان میں کچھہ فارسی عربی کے الفاظ ملا ملاکر مطلب برآری کرلیتے تھے عرصہ دراز تک یہ سلسلہ جاری رہا اور ایک مستقل زبان کی صورت پکڑ گیا اس زبان کے بولنے والے فوج میں دراصل راجپوت ہی تھے ان کے مسلمان ساتھی بھی ان کی خاطر سے اُس زبان میں جو راجپوت فوجی بولتے تھے بات چیت کرنے لگے اور اس مخلوط زبان کی شیرینی اور فائدہ رسانی کو سمجھہ کر اسے اپنا بیٹھے - انگریزی دور میں اس زبان نے وہ فروغ پایا کہ ہندوں کے وید شاستر اور علوم فنون سب اس میں ترجمہ ہوگئے اور مسلمانوں نے بھی قرآن حدیث اور اپنے علوم و فنون کو اس میں ترجمہ کرلیا - ایسی حالت میں کون کہہ سکتا ہے کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان نہیں ہے اردو کے سوا کوئی بتائے کہ کس زبان کو ہندوستان میں یہ باتیں حاصل ہیں ؟ —

(۳) اردو کی حفاظت اور ترقی کی تیسری تدبیر جو اختیار کی گئی وہ یہ تھی کہ چوموں میں ایک شبینہ مدرسہ بالغوں کو اردو پڑھانے کے لیئے کھولا گیا اور اس غرض کے لیے ابتدا میں ایک جلسہ کیا گیا جس میں ہندوں کو بہ کثرت بلایا گیا اور سمجھایا گیا کہ اردو چونکہ ریاست جے پور کی سرکاری زبان ہے اس لیے ہندو ہو کہ مسلمان سب ہی کو اس کا پڑھنا ضروری ہے ' اس شبینہ مدرسہ میں (۲۰) کے قریب

ہندو طلبہ اردو کی تعلیم پا رہے ہیں - علاوہ ازیں چوموں کے سرکاری مدرسہ میں جو اردو پڑھانے کا انتظام کیا گیا تھا اس کو اور بھی ترقی دلائی - چوموں کے اردگرد کے دس دس میل فاصلے کے دیہات میں قرآن شریف اور اردو پڑھانے کے مکاتب کھولے گئے —

دارالعلوم ماجدیہ میں اردو خوان طلبہ کا شمار بڑھاتے بڑھاتے (۱۵۰) تک پہنچا دیا —

ریاست جے پور اور الور کے باشندوں کو اردو مکاتب و مدارس کے قیام پر ترغیب دلائی گئی چنانچہ ریڈگس - کھیجڑولی ' ڈونگری ' دائرہ تگھریہ ' کانوت ' پراگ پورہ پاوٹہ ' ھنگونیا ' اودے پور گوبند گڑہ ' گوھالہ ' وغیرہ میں اردو مکاتب قائم کردیے - اور اعلیٰ حضرت نظام خلداللہ ملکہ ' کی سلور جوبلی کے موقعہ پر جب دارالعلوم ماجدیہ چوموں میں جمعیۃ افاغنہ ' اور انجمن ترقی اردو کا مشترکہ جلسہ ہوا تو یہ طے پایا کہ راجپوتانہ کے لیے ایک پنج سالہ پروگرام ابتدائی لازمی تعلیم کا راجپوتانہ اسٹیٹس ایجوکیشنل کانفرنس مرتب کرے اور اسے عملی جامہ پہنائے - چنانچہ پروگرام عنقریب مرتب کیا جاکر انشااللہ کام شروع کردیا جاےگا وما توفیقی الاباللہ —

(۴) اردو کی حفاظت اور ترقی کی چوتھی تدبیر یہ اختیار کی کہ راجپوتانہ میں اردو زبان کا جائزہ لینا شروع کردیا اور انشااللہ دو ماہ اندر اندر یہ کام تکمیل کو پہنچ جاے گا اور رپورٹ انجمن ترقی اردو کے صدر دفتر کو بھیج دی جاے گی —

(۵) چونکہ اردو زبان مہاراجہ مان سنگھ اور ان کے دادا مہاراجہ بہارمل کے عہد سے راجپوتانہ میں عموماً اور ریاست جے پور میں خصوصاً

رائج ہوگئی تھی اس لیے اس ریاست میں بہت پرانا ذخیرہ اردو کی کتابوں اور فرامین کا جمع ہو سکتا ہے جو اردو زبان کی تواریخ میں شاندار اضافہ کردے گا اس لیے وہ نادر کتابیں قدیمی کتب خانوں سے دارالعلوم ماجدیہ کے کتب خانہ میں جمع ہو رہی ہیں جنہیں بعد میں انجمن ترقی اردو راجپوتانہ کو دیدیا جائے گا ایسی چند کتابوں کے نام یہاں درج ہوتے ہیں جو فراہم ہو چکی ہیں : —

(۱) معراج نامہ قلمی - (۲) رسالہ کفایہ قلمی —

(۳) دیوان ولی قلمی - (۴) مورکھہ سمجھاونی قلمی —

(۵) چھند روشن راسا قلمی —

(۶) اردو کی حفاظت اور ترقی کی چھٹی تدبیر یہ اختیار کی کہ چوموں کے کتب خانہ مظہرالعلوم میں پندرہ اخبار جاری کرادیے —

(۷) اردو کی حفاظت اور ترقی کی ساتویں تدبیر یہ اختیار کی کہ انجمن ترقی اردو راجپوتانہ کے ممبروں کی تعداد روز بروز بڑھانے کی کوشش ہو رہی ہے جن کی مکمل فہرست مرتب کی جاکر پیش ہوگی۔

(۸) راجپوتانہ میں (۲۰) ریاستیں ہیں اور کوشش ہو رہی ہے کہ ہر ریاست میں ایک شاخ انجمن ترقی اردو راجپوتانہ کی قایم ہوجائے۔ اس کام کے سر انجام کے لیے دورہ کی اشد ضرورت ہے —

(۹) اردو کی حفاظت اور ترقی کی بہت بڑی تدبیر یہ ہے کہ مخلص کارکن کے ہاتھہ میں کافی سرمایہ ہو جس سے وہ پروپیگنڈا کر سکے اور دورہ کر سکے نہایت افسوس کے ساتھہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کی کمی حوصلہ شکن بننے کی دھمکی دیتی ہے - اس مد میں آل انڈیا مسلم ایجو کیشنل کانفرنس کی طرف سے ۲۵ روپیہ کی امداد ملی ہے - جس کے لیے انجمن ترقی اردو

راجپوتانہ شکریہ ادا کرتی ہے —

اب تک مصارف انجمن ترقی اردو راجپوتانہ کے حسب ذیل ہوئے ہیں :-

سفر	۴۰ روپے
ڈاک	۵۰ روپے
ڈوپلی کیٹر	۲۲ روپے
اسٹیشنری	۵ روپے
	۱۱۷ روپے
اخبارات	مفت

اب تک جو کچھہ انجمن ترقی اردو راجپوتانہ نے کیا وہ آپ کے سامنے ہے - جناب سکریٹری صاحب نے رسالہ "اردو" بابت جنوری سنہ ۱۹۳۷ع میں جو رائے میری ناچیز اور حقیر خدمت گزاری کے بارے میں اظہار فرمائی ہے اس ہمت افزائی کا میں ممنون و مشکور ہوں اور میں امید کرتا ہوں کہ انجمن ترقی اردو راجپوتانہ وہ ٹھوس اور مفید کام کرکے دکھاے گی جس کا مطالبہ ملک و ملت کی طرف سے ہو رہا ہے - بزرگان قوم سے اپیل ہے کہ وہ راجپوتانہ کے حال کو خاص توجہ سے دیکھیں اوراپنے گرانقدر مشوروں سے اہل راجپوتانہ کی عقدہ کشائی میں مدد دیں - ربنا اتنا من لدنک رحمۃ و ہئی لنا من امرنا رشدا و صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و الہ و اصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین —

ادبی معلومات

مرتبۂ " ناخدا "

(۱) ہندی، اردو اور ہندوستانی	از ڈاکٹر تارا چند
(۲) ہندی اور اردو کا مستقبل	از منشی پریم چند
(۳) ادب کا مستقبل	از پنڈت جواہر لال نہرو
(۴) ہندی جاتری منڈل	از کاکا کالیلکر

ادبی معلومات

هندی، اردو اور هندوستانی

از

ڈاکٹر تارا چند

عموماً موجودہ هندوستانی زبانوں اور خصوصاً اس علاقے کی زبان کے ادب سے تعلق رکھنے والے بعض مسئلوں کا چرچا اخباروں میں زور شور سے هو رها هے - یہ مسئلہ نیا نہیں هے - انیسویں صدی کے آغاز میں جب فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی طرف سے گل کرائیسٹ صاحب نے للو جی لال، سدل مسرا، میر امن، میر بہادر علی، حیدر بخش حیدری، کاظم علی جوان، مظہر علی خاں ولا، نہال چند، شیر علی افسوس وغیرہ کو فارسی اور برج بھاشا سے ترجمہ کرنے کے لیے بلایا، تو ترجمے کی زبان کے نام اور انشاء و اسلوب وغیرہ کا سوال پیدا هونا ناگزیر تھا - پوری انیسویں صدی میں اس مسئلے پر لوگوں کا دھیان لگا رها اور کبھی کبھی اس کی وجہ سے بڑے بڑے مباحثے بھی چھڑ گئے - سنہ ۱۸۹۰-۷۰ میں جون بیمس (John Beams) اور گراؤز (Growse) کے مابین مشہور علمی رسالوں میں اسی پر بحث بھی هوتی رهی - راجہ شیو پرشاد ستارۂ هند نے بیمس کی تائید کی جو زبان میں عربی اور فارسی عناصر کی حمایت

* یہ ڈاکٹر صاحب کے انگریزی مقالے کا اردو ترجمہ هے - (اڈیٹر)

کر رہا تھا - لیکن راجہ لچھمن سنگھہ نے ان کی مخالفت میں گراؤز کا ساتھہ دیا جو کہتا تھا کہ ان زبانوں کی جگہہ سنسکرت کو ملنا چاھیے - یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اس رجحان کو پرچانے میں عیسائی پادریوں کا بڑا ھاتھہ تھا - هندوستانی لسانیات کے مشہور ماهر سر جارج گریرسن اپنی کتاب (Linguistic Survey of India) کی نویں جلد میں لکھتے ھیں :-

"بد نصیبی یہ ہے کہ اس زمانے میں انگریزوں کا سارا اثر سنسکرت پسندوں کی پشت پر رہا - پادریوں نے سنسکرت آمیز هندی کو خوب اچھالا اور انجیل کے ترجمے اسی میں کیے - تھوڑے بہت مصنف عام فہم هندی میں لکھتے رہے لیکن اس غلط روی کے سیلاب میں ان کی دال نہ گلی" —

بیسویں صدی کی ابتدا سے یہ جھگڑا پھر چھڑ گیا ہے - یہ ماننا پڑے گا کہ جس سوال کو لے کر ڈیڑھ سو سال سے لوگ حجت کر رہے ھیں وہ معمولی نہیں ہو سکتا - ضروری ہے کہ ہم ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں اور اپنے فیصلے میں انصاف کا دامن نہ چھوڑیں —

مسئلے کے تجزیہ سے پہلے میری رائے میں یہ درست ہوگا کہ ہم ان ناموں کو طے کرلیں جن کا استعمال کرنا ہے کیونکہ اس معاملے کو گول مول رکھنے کی وجہ سے بھی بدگمانیاں پیدا ہوئی ھیں - اس سلسلے میں بہت سے نام آئے ھیں جن میں یہ خاص ھیں : بھاشا 'هندوی' هندی 'هندوستانی' زبان دهلوی' کھڑی بولی' مدھیہ دیش کی بولی' ریختہ' زبان اردوئے معلیٰ' اردو - ان میں سے هندی' هندوستانی اور اردو سب سے زیادہ اہم ھیں اور سارا جھگڑا انھیں کے استعمال کی نوعیت

سے شروع ہوا ہے —

ہندی

سب سے پہلے ہندی کو لیں - ہندوستانی لسانیات کے ہر جان کار کو معلوم ہے کہ ہندی یا ہندوی کا استعمال مختلف معنوں میں ہوتا رہا ہے - ان میں سے تین جو سب سے اہم ہیں حسب ذیل ہیں:—

(۱) ہندی یا ہندوی سے عام طور پر ہر وہ دیسی چیز مراد ہے جو غیر ہندوستانی نہیں ہے - یہ مطلب اسی وقت ظہور میں آگیا تھا جب مسلمان پہلے پہل اس دیس میں آئے اور دلی اور لاہور میں بسنے لگے اور وہاں کی بولی کو اپنانے لگے - اس کی کچھہ مثالیں لیجیے - سنہ ۱۲۲۸ ع میں محمد عوفی نے ایک مجموعہ مرتب کیا جس میں وہ خواجہ مسعود سعد سلمان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے ہندوی زبان میں ایک دیوان تیار کیا ہے - علاؤالدین خلجی کے زمانے میں فخرالدین مبارک غزنوی نے ایک لغت تیار کی جس میں فارسی کے ہم معنی 'ہندی' الفاظ جمع کیے - شاہ میراں جی شمس العشاق جن کا انتقال سنہ ۱۴۹۵ میں ہوا اپنی نظم کی زبان کو ہندی کہتے ہیں - دکن میں 'ہندی' کا استعمال 'دکنی' کے ساتھہ عام طور پر ہوتا تھا - نصرتی نے بھی اپنی زبان کو 'ہندی' کا لقب دیا ہے - شاہان مغلیہ کے دربار میں بھی جب 'دکنی' کی شاعری کا چرچا ہونے لگا تو دلی والے اسے ہندی ہی کہتے تھے - شاہ حاتم سے لے کر غالب تک اور پرانے سے پرانے نثر نگار سے لے کر سر سید احمد تک اس استعمال کے نمونے ملتے ہیں - اس معنی میں ہندی کا وہی مفہوم ہے جو اردو کا -

(۲) لفظ ہندی کا دوسرا مطلب ہے وہ بولیاں جنہیں من جملہ 'نئی انڈو آرین زبانیں کہتے ہیں - یہ جس علاقے میں بولی جاتی ہیں وہ پچھم میں سرہند سے لے کر پورب میں بنارس اور اُتر میں ہمالیہ کی ترائی سے لے کر دکن میں نربدا کی گھاٹی تک پھیلا ہوا ہے - یہ بولیاں پچھمی اور پوربی ہندی کے کلموں سے نکلی ہیں - لہذا 'ہندی' سے حسب ذیل بولیاں مراد ہیں: بندیلی' کنوجی' برج بھاشا' بانگرو' ہندوستانی (گریرسن) یا کھڑی بولی یا دہلوی اودھی' بگھیلی' اور چھتیس گڑھی - کچھ عالموں نے اس گروہ میں راج استھانی اور ماگھی کو بھی شامل کر لیا ہے - یوں دیکھو تو شمالی ہند کی تمام بولیاں 'ہندی' میں ضم ہو جاتی ہیں —

(۳) ہندی سے جو تیسرا مفہوم پیدا ہوتا ہے' وہ موجودہ زبان ہے جو ہندوستانی' کھڑی بولی یا دہلوی کی ادبی شکل ہے - ہر لحاظ سے موجودہ ہندی پچھمی اور پوربی ہندی کی بولیوں سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اور معنی نمبرا کی ہندی یا اردو کی ہم معنی ہے —

ہندی (۱) کے معنی میں اردو کا استعمال غالباً مصحفی نے سب سے پہلے کیا - میر نے نکات الشعرا میں اسے 'زبان اردوئے معلیٰ' سے موسوم کیا ہے - قایم کے مخزن نکات (سنہ ۱۷۵۴) میں بھی اردو کا نام آتا ہے - دکن کے شاعر باقر آگاہ نے سنہ ۱۷۷۲ میں اور تذکرہ گلزار ابراہیم کے مصنف علی ابراہیم خاں نے ۱۷۸۳ میں لفظ اردو کا استعمال کیا ہے عطا حسین تحسین (۱۷۷۰ یا ۱۷۹۷) نے زبان اردوئے معلیٰ' لکھا ہے - میر امن اپنی کتاب باغ و بہار کی زبان کو اردو بتلاتا ہے -

انیسویں صدی میں یہ نام مقبول ہوا اور اب اس سے ہندوستانی کھڑی بولی یا دہلوی کی ادبی صورت مراد ہے ۔ صوریاتی و صوتیاتی اعتبار سے اردو اور موجودہ ہندی میں کوئی فرق نہیں۔ جو فرق ہے وہ پرانی زبانوں سے لیے ہوے الفاظ کے ذخیرے کا ہے —

"زبان ہندوستان" کا لفظ وجہی (۱۶۳۵) کی کتاب کی تاریخ فرشتہ (سنہ ۱۶۰۵) اور عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ (۱۶۵۰) میں ملتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سولھویں اور سترھویں صدی میں ہماری زبان کا یہ نام رائج تھا اور اس زمانے کے یورپین سیاحوں نے بھی اسی کا استعمال کیا ہے۔ ٹیری (۱۶۱۶) اور فریو (۱۶۱۳) نے اسے (Indostan) کہا ہے ۔ امادوزی (۱۷۰۴) نے (Indostani) کی ایک لغت کے مسودہ کا ذکر کیا ہے اور کیٹلیر نے (Lingua Hindostanica) کی پہلی گرامر اور ذخیرۂ الفاظ تقریباً سنہ ۱۷۱۵ میں مرتب کیا تھا۔ لفظ 'ہندوستانی' اٹھارھویں صدی میں چل پڑا تھا۔ میر امن نے باغ و بہار میں ٹھیٹھ ہندوستانی' کو اپنی زبان بتلایا ہے۔ گل کرسٹ نے اپنی کتابوں کے عنوان میں ہندوستانی' کا ہی استعمال کیا ہے مثلاً "انگریزی ہندوستانی ڈکشنری"۔ گارساں د تاسی نے پیرس میں ہندوی' اور 'ہندوستانی' کی تاریخ پر متعدد تقریریں کیں۔ 'ہندوستانی' کا استعمال کھڑی بولی' کے معنی میں بھی کیا گیا ہے۔ اکثر مصنفوں نے اسے 'اردو' کا مترادف لکھا ہے اور بعض نے 'جدید ہندی' کے لیے استعمال کیا ہے —

معاملے کی صفائی کے لیے نیچے ہم گریرسن کی تعریفات نقل کرتے ہیں:

"ہندوستانی خاص طور پر بالائی دوآبہ کی زبان ہے اور ساتھ ساتھ ہندوستان کی قومی زبان بھی ہے۔ اردو اور ہندی دونوں

رسم الخطوں میں لکھے جانے کی صلاحیت اس میں ہے اور ادب میں سنسکرت یا فارسی الفاظ کے کثرت استعمال سے بھی وہ بچی ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے اردو سے ہندوستانی کی وہ صورت مراد ہے جس میں فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ ہوتا ہے اور اسی طرح ہندی ہندوستانی کی وہ شاخ ہے جس میں سنسکرت الفاظ کی کثرت ہے" —

اس سے یہ ثابت ہوا کہ 'ہندوستانی' کوئی ایسا نام نہیں جو ہندی اور اردو کو نکالنے کے لیے گھڑا گیا ہو بلکہ ایک پرانا جانا پہچانا نام اس بولی کا ہے جو ہندی اور اردو دونوں کی مشترکہ بنیاد ہے —

نام کے متعلق غلط فہمی کی وجہ سے زبان کے متعلق بھی عجیب عجیب بدگمانیاں پھیل گئی ہیں - زبان و ادب کے بڑے بڑے ماہر ہندی، اردو اور ہندوستانی کی ابتدا اور نشو و نما کے بارے میں غلطی کر جاتے ہیں - ان غلطیوں کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ ہمارے ادب کی مختلف صورتوں سے ناواقف ہیں یا یہ کہ ہندی کے مختلف معنوں (خصوصاً ۲ اور ۳) کے سمجھنے میں دھوکا کھا جاتے ہیں - جو لوگ ہندی کی اُتھان کا ذکر کرتے ہیں وہ اکثر بھول جاتے ہیں کہ ہندی کی تاریخ برج بھاشا، اودھی وغیرہ کی تاریخ سے الگ ہے - اور وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ہندی اور اردو کی تاریخ میں بہت سی باتیں مشترک ہیں —

ہندوستانی کی تاریخ

ہندوستانی یا کھڑی بولی کا ارتقا نئی انڈو آریا بولیوں کی کسی ایک شاخ سے ہوا اور تقریباً دسویں صدی سے اس کی تاریخ کم و بیش مسلسل چلی آتی ہے - سب جانتے ہیں کہ یہی بنیادی بولی پہلے بھی اور اب بھی دوآبہ اور پڑوس کے علاقوں کی بول چال کی زبان ہے —

بارھویں صدی کے لگ بھگ جب مسلمان دھلی میں بسنے لگے تو یہ بولی خود بخود ان میں رائج ھوگئی- ان لوگوں نے کھڑی بولی کی صوتیات میں نئی نئی آوازیں پیدا کیں جو پہلے انڈو آریا زبانوں میں بالکل ناپید تھیں- مسلمانوں کے ذخیرۂ الفاظ کا اثر لامحالہ اس بولی پر پڑنا ھی تھا- یہ بول چال کی زبان رفتہ رفتہ ادبی زبان کے مرتبہ کو پہنچ گئی- کہتے ھیں کہ خسرو نے چودھویں صدی میں اس میں بہت کچھہ لکھا- لیکن اس زمانے کی تحریروں کی عدم دستیابی کی وجہ سے یہ امر مشتبہ ھے- لیکن دکن میں یہ بولی نظم و نثر دونوں میں رواج پاگئی اور چودھویں و اتھارھویں صدی کے درمیان وھاں ایک شاندار ادب کو فروغ ھوگیا- اس زبان میں جو ادب پیدا ھوا وہ بول چال کے الفاظ سے مالا مال ھے اور ادب پر غیر ملکی اثرات کا زیادہ اثر نہیں ھے- دکنی مصنفوں کا یہ دعویٰ بالکل حق بہ جانب تھا کہ ان کی زبان ھندی ھے —

مگر شمالی ھند کی حالت عجیب تھی- گو کھڑی بولی یا ھندوستانی کا بول چال میں چلن تھا لیکن اسے ادبی زبان کی حیثیت دکن نے ھی دی کیونکہ شمال میں سترھویں صدی سے پہلے کی ایسی کوئی قابل توجہ تحریر نہیں ملتی جسے اس نام سے موسوم کرسکیں- شاید اس کا سبب یہ ھے کہ جب کھڑی بولی تیرھویں صدی میں سنور نکھر کر تیار ھوئی تو اسے راج استھانی کا مقابلہ کرنا پڑا جو اس زمانے میں شمال کی مقبول عام ادبی زبان تھی اور اس میں جینیوں کی تصانیف لکھی گئیں اور نرپتی نلہا اور دوسرے شاعروں نے رزمیہ اور دیگر اصناف کی نظمیں لکھیں —

پندرھویں صدی میں 'بھکتی' تحریک نے تین نئے فرقوں کا ڈول ڈالا: نراکار بھکتی' کرشنا بھکتی' اور رام بھکتی - پہلے فرقے کے علمبردار مثلاً کبیر' نانک اور دادو اپنے خیالات کی اشاعت کے لیے کھڑی بولی یا ہندوستانی کو کام میں لائے - دوسرے فرقے کے حامی سورداس' نند داس وغیرہ نے برج بھاشا کو لیا اور تیسرے فرقے نے تلسی داس کی سرکردگی میں اودھی کو بڑھایا —

پندرھویں صدی سے لے کر بہت بعد تک ادب برج بھاشا اور اودھی کی گود میں پھولتا پھلتا رہا - ہندوؤں نے ہی نہیں بلکہ مسلمانوں نے بھی انہیں کو اختیار کیا - چنانچہ برج بھاشا میں خان خاناں' رس لین اور رس خاں کا درجہ بہت بلند ہے - اور یہ سب مانتے ہیں کہ اگر ملک محمد جائسی پہلے اودھی میں پدماوت نہ لکھتا تو تلسی داس جی کی راماین کو ہرگز یہ مرتبہ نصیب نہ ہوتا —

کھڑی بولی

اس زمانے میں موجودہ ہندی یا سنسکرت آمیز ہندوستانی کسی کونے کھدرے میں پڑی ہوئی تھی - بول چال تو کھڑی بولی میں ہی ہوتی تھی لیکن ادب کی تخلیق یا تو ہندوی (فارسی آمیز ہندوستانی) یا برج بھاشا اور اودھی میں ہی ہوئی یہ سلسلہ اٹھارھویں صدی تک قائم رہا - ہندی ادب کے کچھ نئے مورخوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ ہندی اٹھارھویں صدی سے بھی بہت پہلے موجود تھی لیکن یہ دعویٰ بالکل بے حقیقت ہے - سولھویں صدی میں گنگا بھٹ نے سولہ صفحے کا ایک رسالہ ' چند چھند برنن کی مہما ' کے نام سے لکھا تھا جسے موجودہ ہندی نثر کا پہلا نمونہ بتلایا جاتا ہے - سو ڈیڑھ سو سال

بعد جاٹ مل کی ایک کتاب 'گورا بادل کی لڑائی' ملتی ہے - پہلا رسالہ برج بھاشا سے مرکب کھڑی بولی میں لکھا گیا ہے اور دوسری کتاب کے متعلق یہ طے ہوچکا ہے کہ وہ انیسویں صدی میں لکھی گئی اور ایک راج استھانی نظم کا ترجمہ ہے - کہتے ہیں کہ اٹھارھویں صدی میں کھڑی بولی کی دو تین کتابیں اور لکھی گئی تھیں مثلاً منڈوور کا ورنن' چکتا کی پت سیاھی کی پرم پرا - لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان میں کوئی ادبی خوبی نہیں اور وہ فارسی آمیز ھندوستانی ' برج بھاشا یا اودھی کی ہم عصر تصانیف سے مقابلہ نہیں کرسکتیں —

اس تمام عرصے میں 'ھندوستان کی قومی زبان اور ھندو مسلمان شرفاء کی بولی فارسی آمیز ھندوستانی ھی تھی ' سنسکرت آمیز ھندوستانی نہیں ' - سنہ ۱۸۷۱ ع کو زیادہ دن نہیں گذرے جب بھارتیندو ھریشچندر نے اپنی ایک کتاب 'اگروال جاتی کی ابتدا' کے دیباچے میں لکھا تھا کہ "ان کی بولی 'استری اور پرش سب کی' کھڑی بولی ارتھات اردو ہے" - اکیلی اگروال جاتی ھی نہیں بلکہ شمالی ھند کی تمام جاتیوں کی زبان اردو ھی تھی —

موجودہ ھندی کی زندگی انیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتی ہے - منشی سدا سکھہ لال نیاز ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے پنشن لے کر الہ آباد میں رہنے لگے تھے - انہوں نے بھاگوت پران کا ایک آزاد ترجمہ کیا تھا اور اس کا نام 'سکھہ ساگر' رکھا ۔ اسی زمانے میں انشاللہ خاں نے 'رانی کیتکی کی کہانی' لکھی - پھر سدل مسرا اور للو لال کو فورٹ ولیم کالج کے انگریز استادوں نے حکم دیا کہ ایک ایسا ادبی اسلوب ایجاد کرو جو فارسی آمیز ھندوستانی کی جگہ لے کر

ہندوؤں میں مقبول ہو سکے - مسٹر کے (Keay) اپنی انگریزی تصنیف (History of Hindi literature) میں فرماتے ہیں: " لیکن اردو کا ذخیرۂ الفاظ عربی اور فارسی سے مستعار تھا اور خاص طور پر اسلام سے وابستہ تھا - ہندی بولنے والوں کی ایک ایسی ادبی زبان کی اشد ضرورت تھی جو ہندوؤں کے لیے پسندیدہ ہو - یہ کام اس طرح انجام پایا کہ اردو سے فارسی و عربی کے الفاظ نکال کر ان کی جگہہ سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ بھر دئے گئے ... للوجی لال کی ہندی ایک نئی ادبی بولی تھی " - پنڈت چندردھر شرما گلیری ' سنہ ۱۹۲۱ میں ناگری پر چارنی سبھا کے آرگن میں لکھتے ہیں: " ہندوؤں کی رچی ہوئی پرانی کوتا جو ملتی ہے وہ برج بھاشا یا پوربی بیسواری ' اودھی ' گجراتی آدی میں ملتی ہے ' ارتھات ' پڑی بولی ' میں پائی جاتی ہے - کھڑی بولی یا پکی بولی یا ریختہ یا ورتمان (موجودہ ہندی کے آرمبھہ کال (ابتدائی زمانہ) کے گدیہ اور پدیہ (نظم و نثر) کو دیکھہ کر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اردو رچنا میں سے فارسی عربی شبدوں کو نکال کر سنسکرت یا ہندی شبد رکھنے سے ہندی بنالی گئی ہے " - موسیو ژول بلوک نے بھی ان دونوں بیانوں کی تصدیق کی ہے - وہ لکھتے ہیں: " ڈاکٹر گل کرسٹ کی ترغیب سے للولال نے پریم ساگر کو لکھہ کر یہ سب کچھہ بدل دیا - اس کتاب کی نثر اردو ہی ہے ' فرق اتنا ہے کہ فارسی کے الفاظ کی جگہہ انڈو آرین ' الفاظ نے لے لی ہے ... یہ نئی بولی آگے چل کر ہندوؤں کی قومی زبان بن گئی " —

ہندی ۱۳۵ سال پرانی ہے

ہندی کے کچھہ نئے لکھنے والوں نے ہندی کی تاریخ کے اس نظریہ

سے اختلاف کیا ہے - لیکن میری رائے میں ان کے اختلاف کی کوئی بنیاد نہیں ہے - میرا خیال ہے کہ موجودہ هندی کی پیدائش اور ارتقا کا مطالعہ اگر انصاف سے کیا جائے تو صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ یہ هندی ۱۳۵ سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے اور شاید اتنی بھی نہیں - کیونکہ سدل مسرا اور للو لال نے هندی کا جو راگ چھیڑا تھا وہ فوراً فضا میں گم ہو گیا اور غدر سے پہلے بالکل نہ سنائی دیا - غدر کے بعد راجہ شو پرشاد، راجہ لچھمن سنگھہ اور بابو هرشچندر نے اس بھولے ہوئے گیت کو پھر الاپنا شروع کیا اور هندی کے لیے ایک مستقل راستہ بنا دیا —

غلط فہمی سے بچنے کے لیے میں چند امور بیان کرتا ہوں جس کی تصدیق ہماری زبان کا ہر انصاف پسند محقق کرے گا —

(۱) اندو آریائی کنبے کی پوربی بھنتی "ماگھی" کا ادب آٹھویں صدی سے شروع ہوتا ہے —

(۲) اسی کنبے کی دوسری بھنتی راج استھانی کا ادبی ذخیرہ ۱۲ سے لے کر ۱۹ ویں صدی تک مالا مال رہا لیکن اب بالکل تلاش ہو گیا ہے —

(۳) برج بھاشا کو ۱۵ اور ۱۹ ویں صدی کے درمیان بڑا عروج حاصل ہوا لیکن موجودہ هندی کی ترقی کے بعد اس میں نثر کا نشان بھی نہ رہا اور اب اس میں شاعری بھی بہت کم لوگ کرتے ہیں —

(۴) اودھی کو پندرھویں صدی میں مقبولیت ہوئی لیکن وہ برج بھاشا کی رقیب کبھی نہ بن سکی اور اب اسے ادبی زبان کی حیثیت سے کوئی نہیں جانتا —

(۵) پوربی اور پچھمی ھندی کی مختلف شکلوں میں ۱۴ سے لے کر ۱۹ ویں صدی تک ادبی تصلیفیں پیدا ہوتی رھیں لیکن اب ان میں کوئی کچھہ نہیں لکھتا —

(۶) کھڑی بولی یا ھندوستانی کی دو ادبی صورتیں ھیں - پرانی شکل پہلے ھندی کے نام سے اور اب اردو کے نام سے معروف ھے - اس کی تاریخ چودھویں صدی سے لے کر آج تک مسلسل چلی آتی ھے - دوسری شکل ھے موجودہ ھندی جس نے ادبی شکل انیسویں صدی کے آغاز میں اختیار کی اور غدر کے بعد سرعت سے ترقی کی —

ھندی ، اردو اور ھندوستانی

ھندی ، اردو اور ھندوستانی کے باھمی تعلق کے متعلق بھی بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ھے - اس امر میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان تینوں ناموں سے مراد صرف ایک ھی زبان ھے - زبانوں کے باھمی تعلق کو سمجھنے کے لیے تین چیزوں کے تقابلی جانچ کی ضرورت ہوتی ھے : (۱) صوتیاتی پہلو - (۲) صوریاتی یا نحوی پہلو - (۳) ذخیرۂ الفاظ —

ان تینوں میں پہلے دو کی اھمیت زیادہ ھے - لسانیات کے سب ماہر مانتے ھیں کہ ھر زبان کے عناصر میں نحوی ساخت سب سے زیادہ مستحکم چیز ھے اور نسلاً بعد نسل تمام ارتقائی تبدیلیوں میں اپنی اصلی صورت میں برقرار رھتی ھے - اسی طرح صوتیات کا نظم بھی اگرچہ ایسا مستقل نہیں ہوتا ، تاھم کم و بیش یک ساں رھتا ھے - لیکن ذخیرۂ الفاظ میں بے ڈھب تبدیلیاں ہوتی رھتی ھیں - زبان کے بہت بڑے ماہر موسیئے میلے (A. Meillet) ایک جگہہ لکھتے ھیں : " تلفظ اور گرامر مستقل عناصر ھیں

اور ان دونوں کے تمام اجزا آپس میں گھل مل جاتے ھیں - صوتیاتی اور صوریاتی نظام میں کسی دوسری جگہ سے مستعار لینے کی صلاحیت نہیں ہوتی - اس کے برعکس الفاظ کسی نظام کے تحت نہیں آتے - زیادہ سے زیادہ وہ گروھوں میں منقسم رہتے ھیں ورنہ ھر لفظ منفرد ھوتا ھے اور یکہ و تنہا رهتا ھے ... .. کسی خاص زبان کو بولنے کی مسلسل خواهش لسانیاتی اعتبار سے زیادہ تر تلفظ اور گرامر میں ھی ظاھر ھوتی ھے —

فارسی زبان میں عربی الفاظ کی بہتات ھے تو کیا ھوا - اس کا شمار آریائی زبانوں میں ھی ھوتا ھے - انگریزی ٹیوٹانی زبان ھی رھیگی خواہ اس میں لیٹن کے کتنے ھی الفاظ موجود ھوں - انگریزی زبان کا ایک حصہ اگر لیٹن الفاظ کو ترجیح دیتا ھے اور دوسرا انگلوسکسن کو ' تو اس سے یہ مراد نہیں کہ انگریزی دو زبانوں میں بٹ گئی - اپنے گھر میں دیکھو - سندھی اور پنجابی میں عربی کے الفاظ کس کثرت سے گھل مل گئے ھیں لیکن ان کی صوتیات اور گرامر پکار پکار کر کہہ رھی ھیں کہ وہ آریائی قبیلے میں سے ھیں —

ذخیرۂ الفاظ کا انحصار بڑی حد تک تاریخ پر ھوتا ھے - اس کی ایک مثال گذشتہ جنگ عظیم ھے - انگلنڈ میں امرا کے جرمن نام بدل کر انگریزی کر دیے گئے ' حتی کہ House of Hanover کو House of Windsor کہا جانے لگا - فرانسیسی جو غیر زبان کے الفاظ کو اپناتے ھوئے ناک بھوں سکیڑتی ھے اب انگریزی الفاظ کو سر آنکھوں پر لینے لگی - روسیوں نے اپنے شہروں کے نام سے جرمن لاحقہ Burg کو نکال کر سلاوک لاحقہ Grad جوڑ لیا - تاریخی اسباب قومی تعصبات اور دوسرے سماجی تغیرات ذخیرۂ الفاظ پر برابر اثر پذیر ھوتے رھتے ھیں —

ان اصولوں کی روشنی میں ہم کیا دیکھتے ہیں ؟ ہندی، اردو اور ہندوستانی کی صوتیات میں کوئی فرق نہیں - سب میں آواز کی وہی تین قسمیں ہیں : قدیم انڈو آریائی حروف صحیح و حروف علت ؛ جدید انڈو آریائی حروف صحیح و حروف علت اور سامی اصوات - نحویوں نے بھی گھما پھرا کر اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے مثلاً کامتا پرشاد گرو نے ہندی ویاکرن میں، ڈاکٹر دھرندر ورما نے اپنے 'ہندی بھاشا کا اتہاس' میں اور مولوی عبدالحق نے قواعد اردو میں 'صوتیاتی اعتبار سے ہندی اردو اور ہندوستانی میں یگانگت ہے لیکن اور دوسری آریائی و سامی زبانوں مثلاً سنسکرت، برج بھاشا، اودھی، فارسی اور عربی سے مختلف ہیں —

پھر یہ بھی ہے کہ تینوں کی گرامر تقریباً ایک ہے - گریرسن کا بیان ہے کہ اردو اور ہندی کی تصریف یا گردان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے - بقول مسٹر بیمس " ہندی اور اردو کو دو مختلف زبان بتانا، لسانیات کی کم علمی اور اس مسئلے کی نوعیت کے متعلق سخت غلط فہمی کی دلیل ہے " —

البتہ ذخیرۂ الفاظ کے معاملے میں دونوں میں فرق ہے - ہر زبان کے الفاظ کے ذخیرے میں اس کے اصلی یا بول چال کے بھی الفاظ ہوتے ہیں اور بہت سے پرانی زبانوں کے بھی جو اس میں کھپ گئے ہیں - جہاں تک ہندی اور اردو کا تعلق ہے، ان کے اسما، افعال، حروف عطف، حروف ربط اور حروف فجائیہ وغیرہ مشترک ہیں - جہاں تک اسم اور صفت کا تعلق ہے، دونوں نے بول چال کے علاوہ سنسکرت، پراکرت، عربی اور فارسی وغیرہ سے بکثرت الفاظ مستعار لیے ہیں - اس قرض کی صحیح نوعیت نامعلوم ہے کیونکہ ایسی لغات موجود نہیں جو جدید اصولوں پر

مرتب کی گئی ہوں - سید احمد دہلوی نے اپنی مشہور لغت ' فرہنگ آصفیہ ' میں اُن الفاظ کا تجزیہ کیا ہے جنہیں وہ جمع کر سکے - الفاظ کی کل تعداد ۵۰ ہزار ہے - ان میں عربی کے ۷۵۸۴ ' فارسی کے ۶۰۴۱ سنسکرت کے ۵۵۴ ' انگریزی کے ۵۰۰ اور دوسری زبانوں کے ۱۸۱ الفاظ ہیں - باقی الفاظ ملکی ہیں - اب ہندی شبد ساگر کو دیکھئے جو ہندی کی سب سے بڑی لغت ہے - اس میں عربی کے وہی ۷۵۸۴ اور فارسی کے ۶۰۴۱ الفاظ تقریباً اسی طرح موجود ہیں - اس سے صاف ظاہر ہے کہ غیر ملکی زبانوں کے الفاظ کے متعلق ہندی اور اردو میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے - اب مرکب اور مشتق الفاظ کے لیے ان دونوں کے گراموں کو دیکھیے تو پتا چلے گا کہ ان کے سابقے اور لاحقے بہت بڑی حد تک ایک ہی ہیں —

دلائل سنسکرت آمیز ہندی کے حق میں

اگرچہ ہندی اور اردو کے ذخیرۂ الفاظ کے مشترک پہلوؤں کا تذکرہ ضروری ہے لیکن یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ اس معاملے میں دونوں میں بڑا اختلاف بھی ہے اور اگر مناسب تدبیر نہ اختیار کی گئی تو یہ اختلاف بڑھتا ہی جائے گا - ہندی اور اردو کے مصنف دو گروہوں میں بٹے ہوے ہیں - ایک کا خیال ہے کہ کلاسکل زبانوں کے الفاظ کا چلن کثرت سے ہونا چاہیے ' لیکن دوسرا ان کے استعمال کو محدود کرنا چاہتا ہے - اپنی اپنی تائید کے لیے وہ یکساں دلیلیں پیش کرتے ہیں - مثال کے لیے ہندی کے اس اسکول کو لیجیے جو سنسکرت کے اصل الفاظ کے کثرت استعمال کا حامی ہے اور فارسی و عربی الفاظ کو چن چن کر نکالنا چاہتا ہے - اس کے دلائل حسب ذیل ہیں —

(۱) ہندی ایک انڈو آریائی بولی ہے اور اپنے قبیلے کی دوسری زبانوں سے مثلاً بنگالی ، گجراتی اور مرہٹی سے اس کا تعلق بہت گہرا ہے - فطرتاً یہ سب اپنی جنم سوت یعنی سنسکرت کے الفاظ مستعار لیں گی - ان سب میں سنسکرت کے اصل الفاظ کا جتنا زیادہ استعمال ہوگا اور اصطلاحات میں سنسکرت کے مادے جتنے زیادہ آئیں گے ، ان سب کا باہمی تعلق اتنا ہی بڑھتا جائے گا اور ان زبانوں کے بولنے والوں کو ہندی سیکھنے میں اتنی ہی آسانی ہوتی جائے گی - اس طریقے سے بین صوبجاتی زبان کی حیثیت اختیار کرنے میں ہندی کو سہولت ہوگی —

(۲) الفاظ کے ساتھہ تمدنی روایات وابستہ ہوتی ہیں - سنسکرت الفاظ میں قدیم ہندوستانی تمدن کی روح سمائی ہوئی ہے - لیکن فارسی و عربی الفاظ میں غیر ملکی بو باس پائی جاتی ہے - اس لیے ایک ہندوستانی زبان کے لیے لازم ہے کہ وہ پردیسی الفاظ کے مقابلے میں دیسی الفاظ کو رواج دے —

یہ دلیلیں وزنی ہیں - دل پر ان کا اثر بھی ہوتا ہے - اچھا ہو اگر ان کو غور سے پرکھا جائے —

دلائل فارسی آمیزش کے حق میں

جو لوگ مستعار الفاظ (Loan Words) کا تنہا ماخذ عربی کو بنانا چاہتے ہیں وہ بھی تقریباً ایسی ہی باتیں کہتے ہیں - ان کا بیان ہے کہ عربی ایک بہت بڑے فرقے کی مذہبی زبان ہے اور ایسی روایات کی حامل ہے جو انہیں نہایت محبوب ہیں - پھر یہ بھی ہے کہ عربی زندہ زبان ہے اور مغرب کے جدید علوم کو تیزی سے ضم کر رہی ہے - اس لیے جدید علوم کی ترجمانی کی اس میں بڑی صلاحیت ہے - ہندوستان بھر کے مذہبی حلقوں میں بڑے شوق سے اس کا مطالعہ

کہا جاتا ہے اور اس کی مخصوص آوازیں و محاورے لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں - اس نے ہندوستانی یا کھڑی بولی کو ہمیشہ متاثر کیا ہے - اس کے صوتیاتی و نحوی نظام اور ذخیرۂ الفاظ کو اس کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے - عہد ماضی کے مشہور مصنف مثلاً سورداس اور تلسی داس بھی اپنے دوھوں اور گیتوں میں بے تکلف عربی الفاظ کو جگہہ دیتے ہیں - اور سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کے ہزاروں بول زبان کے رگ و ریشہ میں گھل مل گئے ہیں - اس کی شہادت ہندی شبد ساگر سے مل سکتی ہے —

ان دلائل کا تجزیہ

کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ دلیلیں بالکل بیکار ہیں - لیکن انہیں اچھی طرح جانچنے کے بعد اس نتیجے پر آنا پڑتا ہے کہ اس معاملے میں میانہ روی ہی راہ راست ہے —

ہندوستانی کو سنسکرت آمیز بنانے کے خلاف سر جارج گریرسن اور جے - بیمس جیسے مشہور یورپین عالموں نے ہی نہیں بلکہ راجہ شوء پرشاد پنڈت بال کشن بھٹ، پنڈت گردھر شرما، پنڈت پرم سنگھ شرما اور پنڈت اجودھیا سنگھ اپادھیائے جیسے نامور حضرات نے بھی آواز بلند کی ہے - میں یہاں صرف پنڈت گردھر شرما کا قول نقل کرتا ہوں - فرماتے ہیں :

" سنسکرت جنیے بناکر آپ نے بلکال مہاراشٹر آدی میں ہندی کا پرچار شیگھر (جلدی) کر لیا کنتو (لیکن) وہ کیول سکچھتوں (پڑھے لکھوں) کی بھاشا بن گئی - سرو سادھارن (عوام الناس) اسے بالکل نہ سمجھہ سکے تو کیا لابھہ ہوا - لابھہ کیا بڑی ہانی (نقصان) ہو گئی ... ہندی بھاشا میں ہندی بھاشا کے شبد ہی پرتھم (پہلے) لینے چاہیئیں، پھر جب ان سے اوشیکتا پوری نہ ہو

تب سنسکرت بھاشا سے سرل شبد لینے چاہیئیں " —

دوسری طرف سید علی بلگرامی مولوی وحیدالدین سلیم اور مولانا عبدالحق جیسے عالموں نے عربی پسند طبقے کے جوش کو سلامت روی کی طرف لانے کی کوشش کی ہے - مولوی وحیدالدین " وضع اصطلاحات " کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

" ہم کو اس دھوکے سے بچنا چاہیے اور ہندی زبان کے الفاظ و حروف سے جو ہماری زبان کی فطرت میں داخل ہیں' ناک بھوں چڑھانا نہیں چاہیے - ہم جس طرح عربی فارسی سے اصطلاحات لیتے ہیں اسی طرح ہندی سے بھی بے تکلف وضع اصطلاحات میں کام لینا چاہیے " —

مشکل یہ ہے کہ ان دونوں ہم خیال گروہوں میں اشتراک عملی کی صورت نہیں نکلی اور اسی وجہ سے ان کے مشورے کا زبان پر اثر نہ ہوا - انجام یہ ہوا کہ ہندی اور اردو دونوں علما کی مخصوص بولی ہوتی جاتی ہیں اور عوام کی بولی سے ان کا بعد بڑھتا جاتا ہے - ان کا فرض تھا کہ پڑوسیوں میں بھائی چارے کا ناتا جوڑتیں لیکن اس کے برعکس وہ ان میں خلیج پیدا کر رہی ہیں' اپنی افادیت کے دائرہ کو تنگ اور اپنی مقبولیت کو محدود کر رہی ہیں —

" تہذیبی تعلق "

تہذیبی تعلقات کی دلیل پر خواہ مخواہ زور دیا جارہا ہے - تہذیب' روحانی اخلاقی سماجی اور جمالیاتی اقدار سے تعلق رکھنے والی چیز ہے - یہ اقدار کچھہ تو قدرت سے جد و جہد کرنے سے پیدا ہوتے ہیں جس سے انسانی نسلیں اپنے آپ کو قائم رکھہ سکتی ہیں - اور کچھہ انسان کی باطنی کشاکش سے پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں آگے بڑھنے

اور ترقی کرنے کی ترغیب ہوتی ہے - غرض یہ کہ تہذیب حیاتی و نفسی عناصر سے عبارت ہے - اسی لیے جغرافی تہذیبیں - رونما ہوتی ہیں مثلاً فرینچ' انگلش' چینی یا ایرانی - اور طبقاتی تہذیب بھی مثلاً سامنتی' سرمایہ دارانہ یا مزدورانہ —

ہم هندوستانی تہذیب کا بھی ذکر کرتے ہیں - لیکن یہ 'اردو تہذیب' یا 'هندی تہذیب' کیا بلا ہے ؟ - اردو (فارسی آمیز هندوستانی) میں هندوؤں کے مذهبی خیالات کا پرچار ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہوتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ بھی نہ ہو - اسی طرح هندی (سنسکرت آمیز هندی) نے مسلمانوں کی بھی خدمت کی ہے - اور کیوں نہ ہو ؟ - جب چینی' فارسی' پشتو' جاوی - اودھی اور بنگالی وغیرہ بیسیوں زبانیں جنہیں عربی سے دور کا تعلق بھی نہ تھا' مسلمانوں کے مذهبی خیالات کو تحریر و تقریر میں ادا کرسکتی ہیں' تو هندوستانی میں سنسکرت الفاظ کے استعمال سے مذهب پر کیوں آفت آنے لگی ؟

هندوستانی تہذیب ابھی حال هی کی چیز ہے' اور اس کی ٹکسال میں اس ملک کے سب بسنے والے اپنا اپنا هدیہ لاکر دیتے ہیں - صداقت اور قدر کے متعلق اس کا نصب العین صوبوں' فرقوں یا عقیدوں کے بندھنوں کو توڑ کر قومیت کی رفعت کو پہنچتا ہے - یہ تہذیب جن حیاتی اور سماجی حالات میں پروان چڑھ رهی ہے وہ گذرے ہوئے زمانے سے یکسر مختلف ہیں - اور هماری باطنی اور خارجی کشاکش کی نوعیت اب بالکل الگ ہے - پرانے اقدار کو اب هم نئی کسوٹیوں پر کستے ہیں اور اس کے لیے اظہار و ترجمانی کا نیا پیرایہ درکار ہے - ایک مشترکہ

تہذیب کے احساس ہی کو ہندوستان کی تمام ادبی کاوشوں کا محرک ہونا چاہیے، خواہ ان کا ذریعۂ اظہار ملک کی کوئی بھی زبان ہو —

ان سب باتوں کو مد نظر رکھ کر ہمیں اردو اور ہندی کی دو الگ الگ تہذیبی فضاؤں کو بیجا اہمیت نہ دینا چاہیے - اس کے برعکس ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اگر وہ خیال عام ہوگیا جو ذیل کی اصطلاحات وضع کرنے والوں کے ذہن میں تھا تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا —

انگریزی	اردو	ہندی
Abscissa	فصلہ یا مقطع	بھُج
Absolute term	رقم مطلق	پرم پد
Accelerate	اسراعِ حرکت	گتی وردھی کارن
Algebra	جبر و مقابلہ	بیج گنت
Alternando	تبدیل	ایکانتر نشپتی
Antecedent	مقدم وغیرہ	پورو پد وغیرہ

عملی دشواریاں

یہ الفاظ میں نے ناگری پرچارنی سبھا، اور انجمن ترقیٔ اردو کی لغات اصطلاحات سے چنے ہیں - یہ الجبرا کی بعض اصطلاحات کا نمونہ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی کی ان دونوں شاخوں میں کتنی دوری پیدا ہوگئی ہے - جب تک انگریزی ذریعۂ تعلیم تھی ہندوستانی طلبا کو اس کا فکر نہ تھا کہ ہندوستانی زبان میں اصطلاحات کی کتنی شکلیں ہیں - لیکن اب جب کہ ثانوی درجوں کے لیے ہندوستانی کو ہی ذریعۂ تعلیم بنایا جارہا ہے اور وہ دن دور نہیں جب اعلیٰ تعلیم بھی ہندوستانی زبانوں میں دی جائے گی، تو خاص طور پر شمالی ہند میں (بنگال کو

چھوڑ کر) اصطلاحات کا یہ دو دھارا بڑی الجھن پیدا کر دیتا ہے ۔ کیونکہ اس علاقے میں ہندی اور اردو دونوں کے رسیا رستے بستے ہیں - اگر اردو اور ہندی طلبا کے لیے ناقابل فہم بن جائیں تو پھر اس کے سوا کیا کیا جاسکتا ہے کہ اسکولوں میں دوہری تعلیم کا انتظام کیا جائے - اس سے یا تو معیار تعلیم پر اثر پڑے گا یا خرچ بڑھ جائے گا - اور یونیورسٹی میں تو یہ دشواری حد سے زیادہ بڑھ جائے گی - تحقیق و اشاعت علم اور حصول تعلیم کی راہ میں سیکڑوں رکاوٹیں پڑ جائیں گی - کیا ہمیں ہر یونیورسٹی میں ہندی اور اردو کے پروفیسر الگ الگ رکھنے ہوں گے ' اور نہیں تو کیا ایک مقام پر دودو یونیورسٹیاں ایک ہندی اور ایک اردو کے لیے قایم کرنا ہوگی —

اور حکومتوں اور کونسلوں کی زبان کیا ہوگی ؟ - اس مسئلے پر پنجاب میں بحث شروع ہوچکی ہے - اور وہ دن دور نہیں ' جب یو - پی بہار اور آخر میں دہلی کو بھی اس سوال کا جواب دینا ہوگا - ریڈیو سینما ' ناٹک ' بین صوبجاتی بیوپار اور بیوہار کی زبان کی صورت کیا ہوگی - انگریزی کی جگہہ کون سی دیسی زبان قرار پائے گی ؟ - میں یہ باور کرلیتا ہوں کہ ہم سب کم از کم اس معاملے میں متفق ہیں کہ انگریزی مستقبل میں یہ فرائض انجام نہیں دے گی —

یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ مستعار الفاظ کی خاطر ہم ایک ہی زبان کی دونوں شاخوں کو مختلف راستوں پر لے جارہے ہیں اور سرکاری اور تعلیمی مسائل کے حل کو زیادہ مشکل بنا رہے ہیں —

ہندوستانی کی حمایت میں چند باتیں

میں نے اوپر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستانی کوئی

مصنوعی بولی نہیں ہے - ہزار برس سے زبان کے اعتبار سے اسے خاص حیثیت حاصل ہے - اس کے ادب کا ذخیرہ بھی کچھ کم نہیں ہے - کیونکہ دکن میں نظم اور نثر کے جتنے نمونے ملتے ہیں ان سب کو میں ہندوستانی میں شامل کرتا ہوں - شمال میں، پردیس کی نقل پر ادیبوں نے زیادہ توجہ کی، تاہم نظم کا بہت سا حصہ ایسا بھی ہے جو صاف، سلیس اور عام فہم ہے - کسی زمانے کا بھی دیوان اتھا لیجیے اس کی مثالیں ملیں گی - حالی کی 'مناجات بیوا' اور 'برکھارت' اس اردو کے بہترین نقش ہیں جسے ہم جذبات اور محاورہ دونوں کی رو سے ہندوستانی کہہ سکتے ہیں - ڈھونڈنے سے نئی ہندی میں بھی ہندوستانی کی جھلکیاں مل جاتی ہیں - میں صرف ایک مصنف کا ذکر کروں گا، لیکن وہ ایسا ہے کہ نئے ہندی ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتا - میرا اشارہ پریم چند کی طرف ہے —

اصل حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک ادبی عبارت کا تعلق ہے، موجودہ ہندی اور اردو، ہندوستانی ہی کے دو اسالیب ہیں - اور علمی تحریروں میں ان کا اختلاف مستعار الفاظ کی حد تک ہے - میرا خیال ہے کہ اگر ایمانداری سے کوشش کی جائے تو یہ امتیاز بھی دور ہوسکتا ہے - ذاتی طور پر مجھے اس کی کامیابی پر پورا یقین ہے اور میں ان لوگوں کے آگے اسی نیت سے چند تجویزیں ذیل میں پیش کرتا ہوں، جو چاہتے ہیں کہ ان دونوں کے تفرقے کی خلیج پٹ جائے :-

(۱) ایسی تدبیریں اختیار کرنا کہ اردو بولنے والے نئی ہندی سیکھیں اور ہندی بولنے والے اردو سیکھیں —

(۲) اردو اور ہندی کے مانے ہوئے مصنفوں نے جن الفاظ کا استعمال کیا

ہے، ان کی ایک لغت تیار کرنا —

(۳) جدید اصولوں پر ایک گرامر مرتب کرنا جس میں ہندی اور اردو کے صوتیاتی و صورِیاتی طریقوں کا تجزیہ ہو اور ترکیب و تصریف کے قاعدوں کو لکھنے میں فراخ دلی سے کام لیا جائے —

(۴) ہندی اور اردو کے مصنفوں کے استعمال کے لیے اصطلاحات کی لغت تیار کرنا —

(۵) مترجموں کے لیے ایک انگریزی ہندوستانی ڈکشنری تیار کرنا —

(۶) اردو اور ہندی ادب کے ایسے نمونوں کا مجموعہ جو سلیس اور عام فہم ہوں —

ان تجویزوں میں سے بعض ایسی ہیں جن پر افراد یا ادارے عمل کر سکتے ہیں - لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جن کے لیے حکومت کی مدد ضروری ہے - مثلاً اسکولوں میں ہندی اور اردو کی مشترک تعلیم کا انتظام حکومت ہی کر سکتی ہے - اسی طرح اصطلاحات کی لغت کی ترتیب کے لیے ہندی اور اردو کے عالموں کا تعاون ضروری ہے - اس تجویز کا اثر کئی صوبوں اور ریاستوں پر ہوگا - اس لیے وہاں کی حکومتوں کے اشتراک کے بغیر یہ کام آسانی سے نہیں ہو سکتا - لیکن مسئلے کی اہمیت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس طرف متوجہ ہوں - فرانس کی اکیڈمی کی طرح یہاں کوئی انجمن نہیں ہے - اس لیے تعلیم گاہوں، حکومت کے نمائندوں اور ادبی و علمی انجمنوں کے نمائندوں کی ایک ایسی کمیٹی ہونا چاہیے جو مشترک اصطلاحات کے مخصوص مسئلوں پر غور کرے اور اس کی رائے قطعی حیثیت رکھتی ہو —

اگر سائنس و حرفت کی اصطلاحات کا جھگڑا طے ہوگیا تو اردو

اور هندی کی نزاع کی جڑ کٹ جائے گی اور ایک هی علاقے میں دو دو زبانوں کے وجود سے پیدا هونے والی مشکلات رفع هونے لگیں گی - اور هندی اردو کا بہاو ادب اور بول چال دونوں میں ایک هی سمت هو جائے گا —

هندی اور اردو کا مستقبل

منشی پریم چند مرحوم کی ایک تقریر

میں یہاں هندی زبان کی اُٹھان اور اُبھار کی داستان نہیں سنانا چاهتا - اُس موضوع پر متعدد کتابیں موجود هیں - صرف یہ کہہ دینا کافی هے کہ آج یہ پندرہ سولہ کروڑ هندوستانیوں کی زبان هے - البتہ یہ دو رسم الخطوں میں لکھی جاتی هے اور اسی اعتبار سے اسے کہیں هندی اور کہیں اردو کہتے هیں، لیکن در اصل یہ هے ایک - بول چال میں ان میں فی الواقع کوئی فرق نہیں هوتا، لیکن ادب میں تمیز ضرور بڑھ جاتی هے - مگر یہ امتیاز هندی کے لیے مخصوص نہیں - گجراتی، بنگالی اور مرهٹی وغیرہ زبانوں میں بھی کم و بیش ایسا هی فرق پایا جاتا هے - هر زبان کے ارتقا میں وقتی تمدن کو بھی دخل هوتا هے اور تمدنی اختلاف کی وجہ سے زبانوں میں بھی بال پڑنے لگتا هے - هم لوگ جس زبان کا استعمال کرتے هیں وہ صوبۂ دهلی کی زبان هے، اسی طرح جیسے 'برج بھاکھا'، اودھی، میتھلی، بھوج پوری اور مارواڑی وغیرہ مختلف علاقوں میں بولی جاتی هیں اور ان سب کو کبھی ادبی زبانوں کا مرتبہ حاصل تھا - بولی کی مہذب شکل' زبان هے - سب سے زیادہ اثر برج بھاکھا کا هوا، کیونکہ وہ صوبۂ آگرہ اور بندیل کھنڈ کی زبان هے - اودھی اودھ

میں بولی جاتی ہے - بھوج پوری پوربی یو-پی میں بولی جاتی ہے اور میتھلی بہار کے بعض اضلاع میں - برج بھاکھا کی شاعری ہندی ادب کی جان ہے - اودھی تصانیف میں تلسی داس کی راماین اور ملک محمد جائسی کی 'پدماوت' بہت مقبول ہوئیں - غرض کہ ادب میں برج بھاکھا اور اودھی کا استعمال زیادہ ہوا - ہندی کے ابتدائی دور میں برج بھاکھا کو خاص فوقیت حاصل تھی اور صرف بنارس ہی نہیں بلکہ گیا (بہار) تک کے شعرا اسی زبان میں شعر کہتے تھے —

بعد ازآں یک بیک ان مقامی بولیوں کا تختہ اُلٹ گیا اور ہندی نے ان سب کا نمبر چھین لیا - برج بھاکھا کو اب بھی تھوڑے سے لوگ سینے سے لگائے ہوئے ہیں ورنہ اور دوسری بولیوں کو ادب سے دور کا واسطہ بھی نہیں - ہندی کو یہ امتیاز مسلمانوں نے بخشا تھا - صوبۂ دہلی کی اس بولی کو مسلمانوں نے ہی نوازا' اسے سنوار نکھار کر دربار کی زبان بنایا اور ان کے امرا اور سپاہی جہاں گئے اسے اپنے ساتھ لے گئے - انہیں کے ساتھ یہ دکن پہنچی اور وہیں اس نے اپنا بچپن گذارا - دہلی میں عرصۂ دراز تک افراتفری رہی اور اس زبان کو ترقی کا موقع نہ ملا - لیکن دکن میں یہ پھولتی پھلتی رہی - گول کنڈہ' بیجاپور وغیرہ کے درباروں میں یہ پروان چڑھتی رہی - مسلمان سلاطین بالعموم ادب کے رسیا ہوتے تھے - بابر' ہمایوں' اکبر' جہاں گیر وغیرہ کو ادب سے بڑا لگاؤ تھا - دکن کے بادشاہوں میں بہتیرے سخن گو اور سخن سنج تھے - آپ کو معلوم ہوگا کہ اس ہندی کا بابا آدم امیر خسرو ہے جو خلجیوں کا ہم عصر تھا —

مسلمانوں کے عہد میں ہندی کی تین شکلیں ہوں گی - ایک ناگری

خط میں ٹھیٹھ ہندی جسے بھاکھا یا ناگری کہتے تھے - دوسری اردو یعنی فارسی خط میں لکھی ہوئی فارسی آمیز ہندی اور تیسری برج بھاکھا - ہندی زبان کو موجودہ صورت میں آتے آتے صدیاں لگ گئیں - یہاں تک کہ سنہ ۱۸۰۳ ء سے پہلے کی کوئی تصنیف دستیاب نہیں ہوتی - اس کتاب کا نام ' چندراوتی ' ہے - اور اسے سدل مسرا نے لکھا تھا - اس کے بعد ہی للوجی لال ' انشاءاللہ خاں وغیرہ کا نام آتا ہے - مقام حیرت ہے کہ سوا سو سال پہلے جس زبان کے نثر کا پتہ نہیں چلتا وہ آج ہندوستان کی قومی زبان بن رہی ہے - مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے تعاون کے بغیر اسے یہ درجہ ہرگز نہ مل سکتا تھا —

زبان کی تفہیم

ہندوؤں کی خاص تعداد اب تک اردو پڑھتی ہے لیکن یہ تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے - مسلمانوں نے ہندی سے کوئی سروکار نہ رکھا - کیا اس سے یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ شمالی ہندی میں آئندہ ہندی اور اردو دو زبانیں رہیں گی اور وہ اپنے اپنے تمدن کے سایہ میں دو مختلف راستوں پر چلتی رہیں گی اور ان میں اتحاد کی کوشش بے سود اور بے کار ہے ؟ یا یہ ممکن ہے کہ ان دونوں زبانوں کو اس قدر قریب لے آیا جائے کہ ان میں رسم خط کے علاوہ کوئی فرق نہ رہے —

اس اندھیر نگری میں اب بھی تھوڑے سے لوگ موجود ہیں جن کا خیال ہے کہ ان میں گنگا جمنا کا پریاگ بھی مل سکتا ہے اور ان میں یگانگت پیدا ہوسکتی ہے - لیکن ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی صدا کی طرح ہے - یہ لوگ ہندی اور اردو ناموں کا استعمال نہیں کرتے کیونکہ اس سے دونوں کی خلیج بڑھتی ہی جائے گی - یہ لوگ دونوں کو

هندوستانی کہتے هیں - ان کا مقصد یہ ہے کہ حتی الامکان' لکھی جانے والی زبان اور بول چال کی زبان کی صورت ایک هو اور وہ مٹھی بھر پڑھے لکھے لوگوں کی زبان نہ هوکر تمام قوم کی زبان هو - جو کچھہ لکھا جاے اس سے عوام بھی بہرہ مند هوسکیں اور همارے ملک میں علم پرور طبقے کی جو ایک الگ جماعت قائم هو رهی ہے اور عوام سے دور هٹتی جاتی ہے وہ عوام سے قریب تر هوجاے اور علما و جہلا میں ایسا رشتہ پیدا هوجائے جس سے قوم میں تازگی اور طاقت پیدا هو —

چونکہ اردو زبان عرصہ سے عدالتوں اور شریفوں کی واحد زبان رهی ہے' لہذا اس میں عربی و فارسی کے هزاروں الفاظ اس طریقے سے گھل مل گئے هیں کہ دیہاتی بھی انہیں آسانی سے سمجھہ سکتے هیں - ان الفاظ کو بالارادہ هندی سے نکالنے کی کوشش کو هم قوم و ملک کے ساتھہ بے انصافی سمجھتے هیں - اسی طرح هندی سنسکرت یا انگریزی کے جو بگڑے هوے الفاظ اردو میں گھل مل گئے هیں انہیں متروک کرنے اور ان کی جگہہ ان کہنہ عربی و فارسی ترکیبوں کو رائج کرنے کی کوشش بھی غیر مستحسن ہے - دونوں طرف سے اس کھینچا تانی کی وجہ صرف یہ ہے کہ همارا تعلیم یافتہ طبقہ جنتا سے الگ هوتا جارها ہے اور اسے اس کی مطلق خبر نہیں کہ عوام اپنے جذبات و خیالات کو کس طریقے سے ادا کرتے هیں - ایسی زبان جس کے لکھنے اور سمجھنے والے لوگ تھوڑے سے هوں یقیناً بے جان مصنوعی اور بوجھل هوگی - اس میں وہ قوت کہاں سے آے گی جو عوام کے نبض پر هاتھہ رکھہ سکے - وہ اس تالاب کی طرح ہے جس کے گھاٹ سنگ مرمر کے هوں جس میں کنول کھلے هوں لیکن پانی کے لیے نکاس اور بہاؤ کا راستہ نہ هو - قوم کی زبان وہ ہے جسے قوم سمجھے

جس میں قوم کی روح ہو اور اس کے جذبات ہوں- اگر تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان قومی زبان ہے تو کیوں نہ ہم انگریزی کو قومی زبان بنائیں ۔ کیونکہ میرا تجربہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات جس بے تکلفی سے انگریزی لکھہ پڑھ سکتے ہیں اس روانی سے نہ ہندی یا اردو لکھہ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں - بڑے بڑے دفتروں اور اونچے طبقوں میں برسوں ہندی یا اردو بولنے کی ضرورت نہیں ہوتی - خانساماں اور خدمت گار بھی ایسے رکھے جاتے ہیں جو انگریزی سمجھہ لیتے ہیں- جو لوگ اس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لیے ہندی اردو اور ہندوستانی کا جھگڑا ہی نہیں رہتا- وہ اتنی بلندی پر رہتے ہیں کہ دنیا کی گرد ان تک پہنچ ہی نہیں سکتی - وہ معلق ہوا میں لٹکے رہتے ہیں- لیکن ہم غریب لاکھہ پر ماریں وہاں تک نہیں پہنچ سکتے- ہمیں تو اسی گرد و باد میں جینا ہے —

یہ یاد رکھو کہ علما کی قوت کا مخزن عوام الناس ہیں- ان سے الگ رہنے کی صرف یہ صورت ہے کہ ان پر حکومت کی جاے- لیکن عوام اور حاکم یہ دو متضاد چیزیں ہیں- عوام میں رہنا ہے تو ان کے خادم بن کر رہو- ایسے اہل علم کی آواز عوام کے کانوں تک نہیں پہنچتی - وہ آپ اپنے نمائندے ہیں- عوام کی نمائندگی سے انہیں کوئی تعلق نہیں -
ہندوستانی

یو- پی کے ایک سابق گورنر سر ولیم میرس نے ہندوستانی اکیڈمی کے افتتاح کے موقع پر ہندی اور اردو کے مصنفوں کو جو مشورہ دیا تھا اسے دھیان میں رکھنے کی آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی اس وقت تھی ' شاید اور زیادہ انہوں نے کہا تھا کہ اردو لکھنے والوں کو یہ سمجھہ کر

لکھنا چاہیے کہ ان کی چیزیں ہندو پڑھیں گے اور اسی طرح ہندی لکھنے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے ناظر مسلمان ہیں —

یہ ایک سنہری مشورہ ہے - کاش ہم اسے اپنے دلوں پر نقش کرلیں تو زبان کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہوجاے - میرے مسلمان دوست مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ اس معاملے میں وہ ہندو مصنفوں سے زیادہ خطاوار ہیں - مثلاً یو-پی کی کامن لینگویج ریڈروں کو دیکھئے آپ سہل قسم کی اردو پائیں گے - ہندی کی ادبی کتابوں میں عربی و فارسی کے صدہا الفاظ مل جائیں گے لیکن اردو ادب روز بروز فارسیت کی طرف زیادہ مائل ہوتا جاتا ہے - اس کا سبب یہی ہے کہ مسلمانوں نے ہندی سے کوئی تعلق نہیں رکھا اور نہ رکھنا چاہتے ہیں - شاید ہندی سے خفیف سی واقفیت بھی ان کے لیے کسر شان ہے حالانکہ ہندی ایک ہفتے میں سیکھی جاسکتی ہے —

جب تک دونوں زبانوں کا میل نہ ہوگا ہندوستانی زبان کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی - یہ ساری کرامات فورٹ ولیم کالج کی ہے جس نے ایک زبان کے دو ٹکڑے کردیے - ہم کہہ نہیں سکتے کہ کسی سیاسی مقصد کی وجہ سے ایسا ہوا یا اسی وقت یہ زبانیں الگ الگ ہوگئی تھیں - لیکن یہ حقیقت ہے کہ جن ہاتھوں نے ہماری زبان کے دو ٹکڑے کردیے انھوں نے ہماری قومی زندگی کے بھی دو ٹکڑے کردیے —

اپنے ہندو دوستوں سے بھی میری درخواست ہے کہ جن الفاظ نے عوام میں اپنی جگہ بنالی ہے ' انھیں نکالنے کے لیے سنسکرت لغت کی طرف رجوع ہونا مضر ہے - 'موجود' کے لیے 'اپستھت' - 'ارادہ' کے لیے 'سنکلپ' - 'بغاوتی' کے لیے 'کرتترم' کو کام میں لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے -

اسی طرح مستعمل الفاظ کے اصلی سنسکرت ماخذوں کی تلاش بھی بے معنی ہے —

ہندوستانی کو رائج کرنے کی دوسری تدبیر یہ ہے کہ میٹرک تک ہندی اور اردو دونوں کی تعلیم سب کے لیے لازمی قرار دی جائے - اس طرح ہندوؤں کو اردو میں اور مسلمانوں کو ہندی میں کافی مہارت ہو جائے گی اور باہمی بد گمانیوں کا سد باب ہو جائے گا - چونکہ تعلیم کا صیغہ دیسی منسٹروں کے ہاتھہ میں ہے اور نصاب میں اس تبدیلی سے زائد خرچ نہ ہوگا، اس لیے اگر ہندو اور مسلمان دونوں کا متحدہ مطالبہ ہو تو حکومت کو کوئی انکار نہ ہوگا -

ادیب کے فرائض

ادیب کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ملک میں ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں جو ہمیں زندگی کے ہر پہلو میں ترقی کرنے کا موقع دے - ادیب ازلی حسن پرست ہوتا ہے - وہ زندگی کے ہر شعبے میں حسن کو ڈھونڈتا ہے - لیکن حسن وہیں ہے جہاں ہم آہنگی ہے - وہیں حقیقت بھی ہے - حسن وہ شے ہے جو زندگی کو ترقی دیتی ہے اور اس کی حفاظت کرتی ہے - در اصل یہ ہماری روح کا لباس ہے - اگر ہماری روح صحت مند ہوتی ہے تو وہ بے اختیار حسن کی طرف دوڑتی ہے - کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ نفاق اور حسد، بد گمانی اور کشمکش، ہماری زندگی کے لیے مہلک ہیں اور اس وجہ سے مکروہ ہیں؟ ادب نے ہمیشہ ان برائیوں کے خلاف احتجاج کیا ہے - دنیا میں انسانیت کی بھلائی کے لیے جتنی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں - ادب نے ان کے لیے صرف زمین ہی تیار نہیں کی بلکہ ان کی تخم ریزی اور آبیاری بھی کی - ادب

سیاست کے پیچھے چلنے والی چیز نہیں اس کے آگے آگے چلنے والا نشان بردار ہے - ادب اس بغاوت کا نام ہے - جو انسان کے دل میں ظلم ، بے انصافی اور غرض پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے - ادیب اپنے خوبصورت پیرایہ میں اسی بغاوت کی ترجمانی کرتا ہے - دوسروں کے دلوں میں بھی درد ہوتا ہے لیکن وہ اپنی چوٹ کو دل ہلا دینے والے الفاظ میں ظاہر نہیں کرسکتے - ادب ان زخموں کی گہرائی کو اس طریقے سے ظاہر کرتا ہے کہ دوسرے بھی درد کی شدت سے چیخ اٹھتے ہیں —

کسی نے ' روما رولاں ' سے پوچھا تھا کہ " آپ کن کے لیے لکھتے ہیں " - اس کا جواب یہ مشہور عالم مصنف ان الفاظ میں دیتا ہے : " میں ان کے لیے لکھتا ہوں جو بڑھتی ہوئی فوج کے پیشوا ہیں - میں ان کے لیے لکھتا ہوں جو اس بین اقوامی جنگ میں شریک ہیں جس میں فتحیاب ہونے کے بعد ایک ایسے سماج کی بنیاد رکھی جائے گی جس میں نہ اونچ نیچ کا فرق ہوگا اور نہ جغرافی حدود ہونگی - ہم جو ادیب ہیں پیسٹی لوگوں سے کہتے ہیں کہ بڑھے چلو لیکن ہم ان کا انتظار نہیں کرتے - یہ ان کا فرض ہے کہ دوڑ کر ہمارے پاس آئیں - چڑھتا ہوا دریا کسی کا انتظار نہیں کرتا —

ادب بدگمانیوں کو مٹانے والی چیز ہے - اگر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ادب سے زیادہ آشنا ہوں تو ممکن ہے کہ وہ زندگی میں بھی ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہو جائیں - ادب میں ہم نہ ہندو ہیں نہ مسلمان اور نہ عیسائی - ہم انسان ہیں اور ہم میں صرف انسانیت کا رشتہ ہے - کیا یہ شرم کا مقام نہیں کہ ہم ایک ہزار سال سے ایک ہی ملک میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور پھر بھی ایک دوسرے کے ادب سے بے خبر

ھیں ؟ - یورپین مصنفوں کو دیکھے - انہوں نے ہندوستان سے متعلق ہر مضمون کی تحقیق کی اور وہ ہمیں جتنا جانتے ہیں ہم خود اپنے کو اتنا نہیں پہچانتے - اس کے برعکس ہم ایک دوسرے سے نا آشنا ہونے ہی میں مگن ہیں - ادب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہماری انسانیت کی اصلاح کرتا ہے یعنی ہم میں ہمدردی اور رواداری کے جذبات پیدا کرتا ہے - جس ہندو نے معرکۂ کربلا کی تاریخ پڑھی ہے ناممکن ہے کہ اس کا دل نہ پسیج جائے - جس مسلمان نے رامائن پڑھی وہ یقیناً ہندو سے ہمدردی کرنے لگے گا - کم از کم شمالی ہند میں ہر اس تعلیم یافتہ مسلمان کو اپنے کو نیم جاہل سمجھنا چاہئے جو ہندو ادب سے ناآشنا ہے اور اگر ہندو ہے تو مسلم ادب سے ناواقف ہے - دونوں کے لیئے دونوں زبانوں اور دونوں رسم الخطوں کا علم لازمی ہے جب ہم زندگی کے پندرہ سال انگریزی کے لیے قربان کر سکتے ہیں تو کیا ماہ دو ماہ اس رسم الخط اور ادب کے لیے نہیں دے سکتے جس پر ہماری قومی ترقی کا ہی نہیں بلکہ قومی زندگی کا بھی انحصار ہے ؟ —

ادب کا مستقبل

از

پنڈت جواہر لال نہرو

[پنڈت جی کا ایک ہندی مضمون زبان کی تھوڑی سی تبدیلی کے بعد ذیل میں درج کیا جاتا ہے]

کچھہ عرصے سے پھر ہندی اور اردو کی بحث چھڑ گئی - اور لوگوں کے دلوں میں وسوسہ پیدا ہونے لگا ہے کہ ہندی والے اردو کو دبا رہے ہیں اور اردو والے ہندی کو - اس مسئلے پر غور و فکر کی زحمت کوئی گوارا

نہیں کرتا - جوشیلے مضامین لکھے جاتے ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ جتنا ہم دوسرے پر حملہ کریں اتنا ہی ہم اپنی پیاری زبان کو فائدہ پہنچائیں گے - لیکن ٹھنڈے دل سے ذرا دیر سوچو تو یہ کوشش بے سود معلوم ہوتی ہے ادب کو بڑھانے کے یہ طریقے نہیں ہیں —

دوسری بات یہ بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ اکثر ادب کا مطلب ہم کچھ اور ہی سمجھتے ہیں - ہم زبان سے متعلق چھوٹی موٹی باتوں میں پھنس کر بنیادی باتوں کو بھول جاتے ہیں - ادب کن کے لیے ہوتا ہے؟ وہ تھوڑے سے خوش پوش و خوش خوراک 'بالادست' حضرات کے لیے ہوتا ہے یا عوام الناس کے لیے ؟ جب تک ہم اس کا جواب نہ دیں' ہمیں ادب کے مستقبل کا راستہ نہیں سجھائی دے سکتا - اگر ہم اس کا تصفیہ کرلیں تو شاید ہمارے دیگر اختلافات (مثلاً ہندی اردو وغیرہ کے) بھی حل ہوجائیں —

پہلی بات جو ہمیں یاد رکھنی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا موجودہ ادب بہت پچھڑا ہوا ہے - یورپ کی کسی بھی زبان سے مقابلہ کیا جائے تو ہم نرے پھسڈی نکلیں گے - جو نئی کتابیں ہمارے یہاں نکل رہی ہیں وہ اول درجہ کی نہیں ہوتیں - اگر کوئی آدمی آج کل کی دنیا کو سمجھنا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ غیر ملکی زبانوں کا مطالعہ کرے - ہمارے ادب میں نئے رجحانات کا خفیف سا پرتو بھی نہیں ملتا - تاریخ' سائنس' اقتصادیات اور سیاست وغیرہ پر ہماری زبانوں میں بہت کم معقول کتابیں ملیں گی - ہمیں اس طرف فوری توجہ کرنا چاہئے ورنہ ہماری زبانیں ترقی نہیں کر سکتیں - جو لوگ ان مضامین کے شائق ہیں انہیں مجبوراً کہیں اور جانا ہوگا —

کئی سوال پیدا ہوتے ہیں - ان سب پر میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا - لیکن چند ضروری مسائل کی طرف بہت اختصار سے دو چار باتیں کہتا ہوں :—

(۱) مجھے کامل یقین ہے کہ ہندی اور اردو کے مقابلہ سے ان دونوں کو نقصان ہوگا - یہ دونوں باہمی تعاون سے ہی ترقی کرسکتی ہیں - ایک کے بڑھنے سے دوسری کو بھی فائدہ ہوگا - خواہ وہ کبھی کبھی الگ الگ راستوں پر ہی چلیں' لیکن انہیں ایک دوسرے کی کاٹ نہیں کرنا چاہئے - ایک کو دوسرے کی ترقی سے خوش ہونا چاہئے کیونکہ اس سے انہیں آگے چل کر فائدہ ہی ہوگا - یورپ کے نئے ادب (انگریزی' جرمن اور فرانسیسی) ایک دوسرے کو دباکر نہیں بڑھے بلکہ ساتھہ ساتھہ بڑھے —

(۲) اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر زبان کے شائق اپنی زبان کی انفرادی ترقی کے لیے کوشاں نہ ہوں - لیکن ایک دوسرے کے اختلاف کے بغیر بھی یہ کام ہوسکتا ہے —

(۳) صرف ہندی اور اردو کے لیے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تمام اہم زبانوں — بنگالی مرہٹی' گجراتی' تامل' تیلگو' کناڑی اور ملیالم — کے لیے بھی یہ تصفیہ ہوجانا چاہیے کہ ہم ان سب کی ترقی کے خواہاں ہیں اور باہمی مقابلے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا - ہر صوبے میں وہاں کی زبان کو فوقیت دی جائے گی - ہندی یا ہندوستانی قومی زبان ضرور ہے - لیکن وہ صوبجاتی زبان کے بعد میں آتی ہے - اگر یہ فیصلہ ہوجائے اور صاف صاف کہہ دیا جائے تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہوجائیں اور زبانوں میں

کسی قسم کے اشتراک کی صورت نکل آئے —

(۴) گو ہندی اور اردو کا تعلق بہت قریب کا ہے، تاہم ان میں اختلاف پیدا ہوجاتا ہے - اس سے دونوں کو نقصان ہوتا ہے - گویا ایک دھڑ پر دو سر رکھے ہوے ہیں جو ایک دوسرے سے پیہم ٹکرا رہے ہیں - ہمیں دو باتیں سمجھنی ہیں اور گو وہ بادی النظر میں متضاد معلوم ہوتی ہیں، پھر بھی ان میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے - ایک تو یہ کہ ہم ایسی زبان ہندی اور اردو میں لکھیں اور بولیں جو میں میں ہو اور فارسی اور سنسکرت کے مشکل الفاظ سے معرا ہو - عام طور پر اسی کو ہندوستانی کہتے ہیں - اس پر ایک اعتراض یہ ہوتا ہے (اور کسی حد تک یہ صحیح بھی ہے) کہ اس درمیانی زبان میں ہندی اور اردو کی خوبیاں تو آتیں نہیں خرابیاں البتہ آجاتی ہیں اور دونوں کی کھچڑی سے ایک ایسی دوغلی زبان بن جاتی ہے جسے کوئی پسند نہیں کرتا کیونکہ اس میں نہ حسن ہوتا ہے اور نہ زور - یہ اعتراض اپنی جگہہ پر صحیح ہوتے ہوے بھی سطحی ہے - میرا خیال ہے کہ ہندی اور اردو کے میل سے رفتہ رفتہ بہت زور دار اور خوبصورت زبان پیدا ہوسکتی ہے - اس میں جوانی کی قوت آسکتی ہے اور وہ دنیا کی باعزت زبانوں میں خاص مرتبہ حاصل کرسکتی ہے —

لیکن یہ نکتہ یاد رکھنے کا ہے کہ زبانیں زبردستی نہ بن سکتی اور نہ بڑھ سکتی ہیں - ادب پھول کی طرح کھلتا ہے اور دباؤ ڈالنے سے مرجھا جاتا ہے - اس لیے اگر کچھہ عرصے تک ہندی اور اردو کا ارتقا دو مختلف منزلوں کی طرف ہو تو مایوسی کی

کوئی وجہ نہیں ہے - ہمیں دونوں کو سمجھنا چاہیے کیونکہ - ہماری زبان کے الفاظ کا ذخیرہ جتنا زیادہ ہو اتنا ہی اچھا ہے -

(۵) رسم خط کے متعلق قطعی طور پر فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ ہندی اور اردو دونوں خط ہمیشہ رائج رہیں گے اور ہر آدمی کو اختیار ہوگا کہ دونوں میں سے جسے چاہے پسند کرے - اکثر چرچا ہوتا ہے کہ فلاں صوبے میں ہندی رسم خط پر تشدد ہو رہا ہے (مثلاً صوبۂ سرحد میں) یا دوسرے صوبے میں اردو خط پر بیجا دباؤ ڈالا جا رہا ہے (مثلاً صوبۂ بہار میں — اڈیٹر) - ہمیں ناجائز طور پر کسی ایک فریق کی تائید نہیں کرنا چاہیے اور دونوں کو مساوی آزادی دینا چاہیے - ہندی اور اردو دونوں کے موئدوں کو اس اصول پر عمل کرنا چاہیے —

(۶) یہ سوال دراصل ہندی اور اردو دونوں کے حدود سے آگے جاتا ہے - میری رائے میں ہر زبان اور ہر رسم خط کو پوری آزادی دینا چاہیے — بشرطیکہ اس کے بولنے اور لکھنے والوں کی تعداد کافی ہو - مثلاً اگر کلکتہ میں تامل بولنے والوں کی خاص تعداد ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کے اسکول کا ذریعۂ تعلیم تامل نہ ہو - ظاہر ہے کہ ایک صوبہ کے سیاسی اور دیگر فرائض مختلف زبانوں میں انجام نہیں پا سکتے - ان کے لیے صوبے کی خاص زبان کا انتخاب کرنا ہی ہوگا - شمالی اور متوسط ہند میں ہندوستانی عوام کی زبان ہے - یہاں دونوں رسم خط اور ایک زبان کے چلن میں کوئی دقت پیدا نہیں ہو سکتی - یہ مدعا نہیں کہ ہر آدمی کے لیے دونوں رسم خطوں کا حصول ضروری ہوگا - اس سے بچوں پر

بار پڑے گا- رسم خط کا انتخاب یا تو وہ خود کریں یا ان کے والدین -
اگر کچھہ لوگ دونوں رسم خطوں میں مہارت حاصل کرسکیں
تو بہت اچھا ہو —

(۷) 'ہندی' اور 'ہندوستانی' پر بہت بحث ہوئی ہے اور ان الفاظ کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں- یہ بحث بے معنی ہے- اپنی قومی زبان کے لیے ہم ان دونوں الفاظ کا استعمال کرسکتے ہیں' دونوں سلنے میں بولے لگتے ہیں' ہمارے ملک اور 'جاتی' سے تعلق رکھتے ہیں- لیکن اچھا ہو اگر اس بحث کو بند کرنے کے لیے ہم زبان کو ہندوستانی کہیں اور رسم خط کو ہندی یا اردو کہیں اس سے خلط مبحث کا امکان نہ رہے گا —

(۸) یہ ہندوستانی زبان کیا ہو؟- دہلی یا لکھنؤ والے کہتے ہیں کہ ہماری بولی عام فہم ہے- اسی کو ہندوستانی بناؤ- لیکن بنارس اور پٹنہ یا راجپوتانہ کی طرف جاؤ تو کافی فرق ملتا ہے - اگر شہروں کو چھوڑ کر دیہاتوں میں جاؤ تو یہ فرق زیادہ بڑھ جاتا ہے- اس صورت میں ہماری زبان کا معیار کیا ہو؟ —

ہماری زبان کو مہذب ہونے کے ساتھہ ساتھہ زیادہ سے زیادہ عام فہم ہونا چاہیے- دو چار لغات کی مدد سے اس کی تدوین نہیں ہوسکتی اور نہ اردو ہندی کے دو چار ادیب مل کر اسے پیدا کرسکتے ہیں- اس کی بنیاد اسی وقت مضبوط ہوگی جب لکھنے والے عوام کے لیے لکھیں گے اور تقریر کرنے والے انہیں کے لیے بولیں گے- پھر یہ دفتری بحثیں — کتنی فی صدی اردو اور کتنی فی صدی ہندی — ختم ہوجائیں گی- فیصلہ چلتا کرے گی -

جو اس کی سمجھ میں آے گا سمجھے گی اور جو سمجھ میں نہ آیا نہیں سمجھے گی —

لہذا ہمارے آگے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہم عوام کے لیے ادب پیدا کریں اور جب لکھیں تو اپنی نظر کے آگے انہیں رکھیں - ہر ادیب کو اپنے سے سوال کرنا چاہیے کہ " میں کس کے لیے لکھ رہا ہوں " —

ہندی جاتری منڈل

از

کاکا کالیلکر

ہندی ساہتیہ سمیلن نے ایک پرچار سمتی (کمیٹی) بنائی ہے ' جس نے ایشیا کے کچھ ممالک کو ایک " جاتری منڈل " بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے - اس گروہ میں کاکا کالیلکر ' سیٹھ جمنا لال بجاج ' بابو پرشوتم داس ٹنڈن ' بابو راجندر پرشاد وغیرہم کے نام نامی نظر آتے ہیں - کالیلکر صاحب نے ایک ہندی پرچے میں اپنی جاترا کے متعلق چھوٹا سا مضمون لکھا ہے جس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے :-

" سمیلن نے جو ہندی پرچار سمتی قایم کی ہے - اس نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک جاتری منڈل لنکا ' برما ' ملایا ' جاوا ' بالی ' سیام وغیرہ کو بھیجا جائے - اس کے متعلق ابھی سے غلط فہمیاں شروع ہو گئی ہیں - اخباروں نے اس ' منڈل ' کو ' تہذیبی سفارت ' کا لقب دیا ہے - ' تہذیب ' کا نام آتے ہی ہندوستان کے فن رقص و سرود ' مصوری وغیرہ کی ترجمانی کے پیام بھی آنے لگے ہیں —

بعض حضرات کہتے ھیں کہ اس ھندی پرچار منڈل کو 'وشال بھارت (Greater India) یعنی وہ ممالک جہاں کاکا صاحب تشریف لے جانے والے ھیں - ایڈیٹر) کے ساتھہ مشرقی و جنوبی افریقہ ماریشس' فجی وغیرہ میں بسنے والے ھندوستانیوں کو پہلے لینا چاھیے —

جاتری منڈل کے ارکان کے انتخاب پر بھی اعتراض کیا گیا ہے - ان سب کو ھندی سمیلن کے صدر سیٹھہ جمنالال بجاج نے نامزد کیا ہے اور یہ اصول مدنظر رکھا ہے کہ صرف وہ اصحاب اس میں لیے جائیں جن کا ھندوستان کے "قومی اتحاد" میں کچھہ حصہ ہے اور اس کے ساتھہ وہ راشٹر بھاشا کے پرچار میں بھی دلچسپی لیتے ھیں —

جہاں تک اس منڈل کے مقاصد کا تعلق ہے میں یہ واضح کردینا چاھتا ھوں کہ ھندوستان کی تہذیب کا سندیسہ ٹیگور دیس بدیس میں پہنچا چکے ھیں - بھارت کے ناچ رنگ کا پرچار وہ جتنے اچھے ڈھنگ سے کرچکے ھیں' اس میں یہ ھندی جاتری منڈل خواہ مخواہ رخنہ نہیں ڈالنا چاھتا —

جن ممالک کے سفر کا تہیہ کیا گیا ہے' انہیں ھندوستان سے قدیمی تعلق ہے - پرانے زمانے میں انہوں نے سنسکرت سیکھہ کر ھندوستان سے بڑی قرابت حاصل کرلی تھی - بودھوں کے عہد میں انہوں نے پالی کے ذریعے سے ھندوستان سے اپنا رشتہ قائم رکھا - اب ھمیں انہیں سمجھانا ہے کہ وہ بھارت کو انگریزی کی عینک سے نہ دیکھیں' بھارت کی آتما ھندوستانی زبانوں میں ھی نمایاں ھوسکتی ہے اور پھر ان میں بھی ھندی وہ زبان ہے جسے تمام ھندوستان نے متفقہ طور پر قومی زبان تسلیم کرلیا ہے - لہذا اپنے پڑوسی ھندوستان کو وہ اسی زبان کے وسیلے سے پہچانیں -

ہندوستان کی قومی زبان صرف ایک ہے - ہم نے اس کے نام کا جھگڑا ہی نہیں رکھا - اسی قومی زبان کو ہمالیہ اور پورب سمندر (بحر عرب کا نیا نام — ایڈیٹر) سے لے کر بنگال کی کھاڑی تک پھیلانے کا بیڑا ہم نے اٹھایا ہے —

ماریشس وغیرہ میں جو ہندوستانی جاکر بس گئے ہیں' وہ تو ہندی کو ہر صورت میں اختیار کرلیں گے - وہاں کے خاص حالات کے مطابق وہاں کام کرنا چاہیے - یہ کام ہمارے لایحۂ عمل میں نہیں آتا - اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں ہندی پرچار کی اہمیت کا ہمیں اندازہ نہیں ہے " —

نوٹ :- ہندی کے مشہور رسالہ' وشال بھارت ' نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی ہے اور اسے مضحکہ خیز بتلایا ہے —

افکار و واقعات

(از ایڈیٹر)

(۱) بہار کمیٹی کی روئداد	۶۵۳
(۲) مسٹر شکلا وزیر تعلیم صوبۂ متوسط سے گفتگو	۶۶۷
(۳) گاندھی جی اور اردو ہندی	۶۷۰
(۴) بابو پرشوتم داس ٹنڈن اور ہندی اردو	۶۷۳
(۵) پروفیسر جھا اور اردو ہندی	۶۷۵
(۶) پنڈت جواہر لال نہرو اور مسئلۂ زبان	۶۷۷

افکار و واقعات

(از اڈیٹر)

(۱) بہار کمیٹی کی روئداد

صوبۂ بہار میں ہندی اردو کا تنازع زمانۂ دراز سے چلا آرہا ہے اور غالباً اس تنازع کی ابتدا اول اول بہارھی سے ہوئی —

سنہ ۱۸۳۷ ع میں جب فارسی زبان عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے خارج کی گئی تو صوبۂ بہار میں (جو اس زمانے میں صوبۂ بنگالہ میں شامل تھا) فارسی کی جگہ اردو نے لے لی - لیکن اس کے کچھہ عرصے بعد ملک میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی جو اردو زبان اور اردو رسم خط کی مخالفت شد و مد سے کرنے لگی - اس جماعت کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت بنگالہ نے سنہ ۱۸۸۱ ع میں ایک اعلان کے ذریعہ سے صوبۂ بہار میں اردو رسم خط کی جگہ ہندی رسم خط جاری کردیا - باوجود اس کے اردو زبان اور اردو رسم خط عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے بالکل خارج نہ ہوا - زبان تو وہی (اردو) رہی لیکن رسم خط بدل گیا - قانونی اصطلاحات وہی ہیں جو سابق میں تھیں - سنسکرت آمیز ہندی کا عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں اب تک رواج نہیں ہوا - لیکن ایسا سننے میں آیا ہے کہ ایک جماعت اس کوشش میں ہے کہ قانونی اصطلاحات بھی سنسکرت سے بنا کر رائج کی جائیں - امید نہیں کہ یہ کوشش بار آور ہو —

اب سے چند سال قبل تک ۸۰ فی صدی وثائق جو رجسٹریشن کے محکمے میں آتے تھے، اردو رسم خط میں آتے تھے - لیکن سر گنیش دت سابق وزیر بہار و اڑیسہ کے ایک حکم کی بنا پر ہندی لکھے ہوئے وثائق کی تعداد بڑھ گئی ہے - رفتہ رفتہ سرکار دربار میں اردو گھٹتی گئی اور ہندی بڑھتی گئی —

اردو داں طبقے نے بہت کچھ ہاتھ پانو مارے اور اپنی سی کوشش کی، لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی - چار بار یہ مسئلہ لیجس لیٹو کونسل میں آیا اور چاروں بار ناکامی ہوئی - ملک کی بد نصیبی کہ اسے مذہبی، سیاسی اور فرقہ داری رنگ دیا گیا اور ایک معمولی سے معاملہ نے جو بآسانی طے ہو سکتا تھا ہماری شامت اعمال سے ایک ناگوار صورت اختیار کر لی —

آخر غالباً سنہ ۱۹۲۹ ع میں حکومت نے ایک اعلان کے ذریعے سے تین سال کے لیے بطور تجربہ صرف قسمت پٹنہ کی دیوانی عدالتوں میں اردو رسم خط کے استعمال کی اجازت دی - حامیان اردو اس سے مطمئن نہ ہوئے اور برابر مطالبہ کرتے رہے کہ فوجداری عدالتوں وغیرہ نیز صوبۂ بہار کے اور حصوں میں بھی اردو رسم خط کو اختیاری رسم خط قرار دیا جائے —

مئی سنہ ۱۹۳۷ ع میں حکومت نے ان مطالبوں کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ منظور کر لیا اور یہ قرار پایا کہ عرضیاں اور بیانات تحریری وغیرہ اردو ہندی دونوں خطوں میں داخل کیے جائیں یعنی یہ کہ اگر عرضی اردو میں ہے تو اس کی نقل ہندی میں، اور اگر ہندی میں ہو تو اس کی نقل اردو میں ہو - البتہ سنتھال پرگنہ اور قسمت چھوٹا ناگپور

کو یہ رعایت حاصل نہ ہوئی —

حامیان ہندی کی طرف سے اس کی بڑی مخالفت ہوئی اور حکومت نے دوسرا اعلان شایع کیا جس کے رو سے اعلان سابق منسوخ ہوگیا اور یہ حکم جاری ہوا کہ اردو رسم خط کل عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں جہاں جہاں پہلے کبھی رائج تھا، اختیاری رسم خط ہوگا۔ قسمت چھوٹا ناگپور اور سنتھال پرگنہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں —

اس کے چند روز بعد ہی حکومت کی طرف سے ایک اعلان شایع ہوا کہ اگر کوئی عرضی یا تحریری بیان اُردو میں داخل ہو تو فریق مخالف کے مطالبے پر اُسے اس کی ہندی نقل ملنی چاہیے۔ اس کا مطلب عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ یہ رعایت صرف ہندی والوں کے لیے ہے، اُردو داں اس سے محروم رہیں گے۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے ۱۳ جولائی سنہ ۱۹۳۷ ع کو ایک اور اعلان شایع ہوا جس کا منشا یہ تھا کہ یہ رعایت صرف ہندی داں فریق ہی کے لیے نہیں بلکہ اس میں اردو داں بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ معاملہ حکومت کے طے کرنے کا نہیں ہے، ہائی کورٹ اس کا فیصلہ کرے گا جس کی توجہ اس طرف منعطف کرائی گئی ہے —

اب یہ معاملہ ہائی کورٹ میں پیش ہے۔ دیکھیے وہاں سے کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ جہاں تک وہاں لوگوں سے گفتگو کرنے کا موقع ہوا، اس میں کچھ زیادہ کامیابی کی توقع نہیں معلوم ہوتی —

ہندی اردو کی بحث مدارس کی تعلیم میں بھی آگئی ہے جو بہت اہم ہے۔ چند سال ہوئے پٹنہ یونیورسٹی اور بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن نے ایک کمیٹی اس امر پر غور کرنے کے لیے بنائی کہ امتحان میٹریکولیشن

کے نتائج اس قدر خراب کیوں ہوتے ہیں اور بہتر نتائج کیونکر حاصل ہوسکتے ہیں - اس کمیٹی نے منجملہ دیگر امور کے ایک تجویز یہ پیش کی کہ علوم کا ذریعۂ تعلیم بدل دیا جائے - یہ سفارش منظور کرلی گئی - اور جب ۲۴ نومبر ۱۹۳۹ ع کو سنڈیکیٹ کا جلسہ ہوا تو بابو بل دیو سہائے نے ایک تحریک یہ پیش کی کہ میٹریکولیشن کے امتحان کے لیے سوائے انگریزی کے ہر مضمون کا ذریعۂ تعلیم ہندی، اردو، اڑیا، بنگالی یا نیپالی ہونا چاہیے اور ہر مدرسے میں ان زبانوں میں سے کسی ایک زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا انتظام کیا جائے - لیکن اگر کسی طالب علم کی مادری زبان ان میں سے کوئی زبان بھی نہ ہو تو ایسے طلبہ کو انگریزی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے اور ان طلبہ کا ذریعۂ امتحان بھی انگریزی ہو —

محترک نے اس تجویز میں جو سنڈیکیٹ کی منظور کردہ تھی یہ ترمیم پیش کی کہ ہندی اردو کے بجائے "ہندستانی" کا لفظ رکھا جائے - جس کی تعریف انہوں نے ان الفاظ میں کی کہ :

"ہندستانی سے اس دفعہ میں وہ زبان مراد ہے جو بہار کے ہندو مسلمان عام طور پر بولتے ہیں اور جو ناگری یا اردو رسم خط میں لکھی جاتی ہے" —

ہندستانی کے لفظ پر بہت بحث اور رد و کد ہوئی - بعض ارکان کی بحث یہ تھی کہ ہندستانی کوئی زبان نہیں ، اردو ہندی البتہ زبانیں ہیں - جسے مشترک زبان کہا جاتا ہے اُس میں علمی ادب مطلق نہیں ، ایسی زبان کیونکر ذریعۂ تعلیم ہوسکتی ہے —

غرض بہت کچھ گفتگو کے بعد کثرت رائے سے ترمیم منظور ہوگئی —

لیکن انجمن ترقیء اردو صوبۂ بہار اور خاص کر انجمن کے قابل معتمد قاضی عبدالودود صاحب نے صوبے کے اہل الراے اصحاب کی ایک کانفرنس اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے منعقد کی اور اپنے مطالبات پیش کیے - اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) ہندستانی کی جو تعریف کی گئی ہے وہ بالکل ناکافی اور مبہم ہے - (۲) چونکہ اردو کا مسئلہ سارے ہندستان کا مسئلہ ہے لہذا حکومت بہار ہندستانی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے متعلق انجمن ترقیء اردو ہندستان سے دریافت کرے کہ وہ موجودہ زبان میں کس حد تک تغیر قبول کرنے کے لیے آمادہ ہے - اور کوئی فیصلہ جو اس انجمن کو جو اردو بولنے والوں کی واحد مسلمہ انجمن ہے منظور نہیں ' بہار کے حامیان اردو کو منظور نہ ہوگا —

جب نئی حکومت قائم ہوئی تو ایک عام جلسے میں جو انجمن ترقیء اردو صوبۂ بہار کی طرف سے ۲۷ مئی سنہ ۱۹۳۷ ع کو منعقد ہوا یہ تجویز منظور ہوئی اور اس کی ایک نقل وزیر تعلیم کو بھیج دی گئی —

(۱) یہ جلسہ اس امر کا مخالف نہیں کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم دیسی زبانوں کے ذریعہ سے دی جاے لیکن بوجہ اس کے کہ سینٹ کے رزولیوشن میں لفظ "ہندستانی" کی تعریف مبہم ہے یہ ضرور تھا کہ قبل اس کے کہ متذکرہ بالا تجویز منظور کی جاے ' اردو داں طبقے کے اطمینان کے لیے مفصلہ ذیل سوالات کا جواب دیا جاتا —

(۱) سائنس کی اصطلاحات کس زبان سے لی جائیں گی —

(۲) سائنس کی اُن اصطلاحات کا کیا حشر ہوگا جو روز مرہ کی زبان میں داخل ہوچکی ہیں —

(۳) الفاظ کے داخل یا خارج کرنے کا کیا معیار ہوگا —

(۴) بہت سے ایسے الفاظ اور محاورات ہیں جو ہندی کے رو سے بالکل صحیح ہیں لیکن اردو انشا پردازوں نے انہیں کبھی استعمال نہیں کیا اور یہی حال اس کے برعکس ہندی انشا پردازوں کا ہے۔ ایسی صورت میں ان الفاظ و محاورات کے متعلق کیا عمل کیا جائے گا۔

(۵) اگرچہ بنیادی لحاظ سے اردو اور ہندی ایک ہیں لیکن بعض اوقات صرف و نحو میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اختلاف کی صورت میں کسے ترجیح دی جائے گی —

(۶) ہندستانی زبان کے بنیادی قواعد کونسی جماعت وضع کرے گی —

(ب) اس جلسے کا یہ مطالبہ ہے کہ اگر گورمنٹ حسب سفارش سہنت ذریعۂ تعلیم کے مسئلے کے حل کرنے کے لیے کسی کانفرنس کا انعقاد کرے تو اس میں صدر انجمن ترقیء اردو اور صوبۂ بہار کی انجمن کے نمایندے بھی مدعو کیے جائیں۔ یہ جلسہ گورمنٹ کو آگاہ کرتا ہے کہ اگر متذکرۂ بالا انجمنوں کے مشورے کے بغیر اردو زبان میں کچھ تغیرات کیے گئے تو وہ بہار کے اردو داں طبقے کےلیے ناقابل قبول ہوں گے'' -

اس کے علاوہ صوبۂ بہار میں اردو کی درسی کتابوں کی حالت بھی قابل اطمینان نہیں اور بہت کچھ قابل اصلاح ہے - یہ سب امور فیصلہ طلب تھے۔ صوبۂ بہار کی انجمن نے اس بارے میں جو جد و جہد کی وہ بہت قابل ستایش ہے —

اس اندیشے سے کہ نئی حکومت اس مسئلے کے متعلق جلد کوئی فیصلہ صادر نہ کردے ' انجمن ترقیء اردو ہندستان نے قاضی عبدالودود صاحب کی تحریک پر ان مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی کے منعقد کرنے کی تجویز کی اور ایسے اصحاب کو مدعو کیا جو ان حالات سے واقف

ہیں یا ان مسائل کے متعلق مفید مشورہ دے سکتے ہیں - معتمد انجمن ترقیء اردو (ہندستان) نے دعوت کے نامے کے ساتھ ان مسائل کی مختصر تاریخ بھی طبع کر کے بھیج دی تھی —

کمیٹی کے جلسے ۲۸ ' ۲۹ اگست کو بہ مقام پٹنہ شاہ رشید اللہ صاحب ایڈوکیٹ کے دولت خانے پر ہوے -

حسب ذیل اصحاب شریک جلسہ ہوے

پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی - مولوی سید سلیمان ندوی صاحب خواجہ غلام السیدین صاحب ایم - اے پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈہ پروفیسر محمد مجیب بی - اے (آکسن) جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی - مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی - مولوی ظفرالملک علوی اڈیٹر الناظر - قاضی عبدالودود صاحب بی- اے (کینٹیب) بیرسٹرایٹ لا معتمد انجمن ترقیء اردو صوبۂ بہار - مولوی نظام الدین حسین نظامی اڈیٹر ذوالقرنین و سکرٹری پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صوبۂ متحدہ - مولوی رشید احمد صدیقی ایم - اے صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ - آل احمد سرور صاحب ایم - اے لکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ - سید الطاف علی صاحب بی - اے ' ہیڈ اسسٹنٹ دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس - مسٹر محمد یونس صاحب بیرسٹر ایٹ لا ' ایم - ایل - اے پٹنہ - مسٹر سید محمد حفیظ ایڈوکیٹ ایم - ایل - سی ' وکن سنڈیکیٹ پٹنہ یونیورسٹی - عبدالحق سکرٹری انجمن ترقیء اردو (ہندستان) -

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی آنے کے لیے بالکل تیار تھے لیکن عین وقت پر کچھ ایسے واقعات پیش آگئے کہ وہ شریک نہ ہوسکے - نواب صدر یار جنگ بہادر (مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی) بھی کسی مجبوری کی

وجہ سے نہ آسکے - مگر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے انہوں نے سید الطاف علی صاحب ہیڈ اسسٹنٹ دفتر کانفرنس کو شرکت کے لیے بھیجا - میاں بشیر احمد صاحب بی - اے (آکسن) شملہ میں تھے اور بوجہ ناسازی طبع شریک نہ ہوے - ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب بعض مجبوریوں کی وجہ سے نہ آسکے —

میری تحریک پر مولانا سید سلیمان صاحب بالاتفاق کمیٹی کے صدر منتخب ہوے -

سب سے پہلے صاحب صدر کی یہ تحریک منظور ہوئی -

(۱) انجمن ترقیء اردو کا یہ جلسہ نواب سر راس مسعود کی وفات پر اپنے دلی جذبات رنج و غم کا اظہار کرتا ہے - مرحوم کے انتقال سے ملک و قوم اور خصوصاً انجمن ترقیء اردو کو جس کے وہ صدر تھے ایسا نقصان عظیم پہنچا ہے جس کی تلافی نہیں ہوسکتی -

یہ جلسہ ان کی والدہ ماجدہ اور دوسرے متعلقین سے دلی ہمدردی ظاہر کرتا ہے —

اس کے بعد میں نے قاضی عبدالودود صاحب سے درخواست کی کہ وہ اُن معاملات کو پیش کریں جو کمیٹی کے سامنے زیر بحث آنے والے ہیں - قاضی صاحب کی مختصر تقریر کے بعد عام طور پریہ محسوس کیا گیا کہ کمیٹی اس وقت تک ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی جب تک " ہندستانی " زبان کے حدود متعین نہ کرے - چنانچہ طویل گفتگو اور مباحثے کے بعد ہندستانی کی یہ تعریف بالاتفاق منظور کی گئی —

(۲) ہندستانی سے مراد وہ زبان ہے جو اس ملک کی ہندو مسلمان

قوموں کے میل جول اور ایک دوسرے کی تہذیب سے متاثر ہونے سے بنی ہے؛ جسے شمالی ہند کے باشندے عام طور سے بولتے ہیں ' اور ہندستان کے دوسرے حصوں کے رہنے والے سمجھتے ہیں؛ جو عربی ' فارسی اور سنسکرت کے نامانوس لفظوں سے خالی ہے ؛ اور جو اردو' دیوناگری یا کسی دوسرے رسم خط میں لکھی جاتی ہے —

بہار ٹکسٹ بک کمیٹی اور ابتدائی جماعتوں کی مشترکہ ریڈروں کے متعلق کمیٹی نے یہ تجویزیں منظور کیں :—

(۳) اس کمیٹی کی رائے میں ابتدائی چار جماعتوں کے لیے کتابیں ایسی عام فہم اور آسان ہندستانی زبان میں لکھی جائیں جو اردو اور ہندی رسم خط کے اختلاف کے علاوہ یکساں طور پر اردو ہندی جاننے والوں کی سمجھ میں آسکیں —

ایسی کتابوں کے انتخاب اور منظوری کے متعلق جو طریق عمل جاری ہے وہ قابل اطمینان نہیں ہے - حصۂ نثر میں کم اور حصۂ نظم میں زیادہ بے عنوانیاں اس قسم کی ہیں جن کی اصلاح ہونی ضروری ہے - تفصیلات سے قطع نظر اس اصول کو سامنے رکھنا لازم ہے کہ ہندی اور اردو طلبہ کی ذہنیت اور مذاق پر ایسا اثر نہ پڑے جو آگے چل کر اُن کے ادبی مذاق میں حائل ہو - یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ ایسی کتابوں کا حصۂ نظم لازمی طور پر مشترک نہ رہے —

ٹکسٹ بک کمیٹی کی تدوین کے متعلق اس وقت ہماری طرف سے کسی تجویز کا پیش کرنا بر محل نہیں معلوم ہوتا ' لیکن یہ کمیٹی بہت زور سے حکومت کی خدمت میں سفارش کرتی ہے کہ کتابوں کے انتخاب میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے - اس سلسے میں ماہرین اور ریویو

کرنے والوں کے تقرر میں انجمن ترقی اردو سے استصواب کرنا قرین مصلحت ہے " —

(۴) اس کمیٹی کی رائے میں ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے لیے ذریعۂ تعلیم ہندستانی ہونا چاہیے - لیکن ثانوی جماعتوں کے لیے ادبی ریڈروں کا اردو ہندی میں الگ الگ ہونا ضروری ہے (با شرائط بالا) —

(۵) اس کمیٹی کی رائے میں یہ نہایت ضروری ہے کہ ہندستانی زبان کے قواعد ' اصطلاحات ' لغات کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جائے جس میں انجمن ترقیٔ اردو (ہندستان) اور ہندی کی کسی نمائندہ جماعت کے قائم مقام مساوی تعداد میں ہوں - اس کمیٹی کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو اتفاق سے کام لیا جائے - لیکن اختلاف کی صورت میں اصولی حیثیت سے یہ تسلیم کرلینا چاہیے کہ ہندستانی کی اردو کتابوں کے متعلق انجمن ترقیٔ اردو کے قائم مقاموں اور ہندستانی کی ہندی کتابوں کے متعلق ہندی انجمن کے قائم مقاموں کی رائے فیصلہ کن سمجھی جائے گی - سر دست کامل اتحاد کو ضروری سمجھنا لازمی نہ ہوگا —

(۶) اس کمیٹی کی رائے میں یہ نہایت ضروری ہے کہ اردو داں طلبہ کے لیے ہندی اور ہندی داں طلبہ کے لیے اردو جاننا ثانوی جماعتوں کے لیے لازمی کر دیا جائے ' جیسا کہ صوبۂ متحدہ میں ہے —

(۷) عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں رسم خط کے رواج اور دوسرے مقامی مسائل کے متعلق کمیٹی نے یہ طے کیا کہ انجمن ترقیٔ اردو صوبۂ بہار مقامی ضرورتوں کا لحاظ کر کے خود ہی تجاویز منظور کرے -

ان تجاویز کے علاوہ یہ بھی مناسب سمجھا گیا کہ ارکان کمیٹی بابو راجندر پرشاد صاحب سے مل کر بہار میں اردو کے مسئلے پر خصوصاً اور ہندی، اردو، ہندستانی کے مسئلے پر عموماً تبادلۂ خیالات کریں - چنانچہ ۲۸ اگست کو ۳ بجے دن کے بابو راجندر پرشاد مع بابو بلدیو سہاے ایڈوکیٹ جنرل اور بابو متھرا پرشاد سکرٹری بہار پراونشل کانگریس کمیٹی ہمارے کمیٹی میں تشریف لاے، جہاں تقریباً دو گھنٹے تک تمام متعلقہ مسائل پر نہایت خوشگواری سے بحث ہوتی رہی - حاضرین نے یہ محسوس کیا کہ چونکہ تمام اہم مسائل پر قریب قریب اتفاق ہوچکا ہے اس لیے ایک متفقہ اعلان سکرٹری انجمن ترقیء اردو (ہند) اور بابو راجندر پرشاد کی طرف سے شایع کیا جاے جس سے ملک میں ایک بہتر فضا قائم ہوجانے اور خوشگواری پیدا ہوجانے کا امکان ہے - چنانچہ دونوں صاحبوں کے دستخط سے حسب ذیل بیان شایع کیا گیا —

" بہار کی اردو کمیٹی کے جلسے منعقدہ ۲۸ اگست سنہ ۳۷ ع کے زمانے میں ہمیں ہندستانی زبان کے مسئلے پر بحث و گفتگو کرنے کا موقع ملا - ہمیں فکر تھی کہ " اردو، ہندی، ہندستانی " کے مناقشے میں جو افسوسناک غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں انہیں دور کیا جاے اور خوشی کی بات ہے کہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس باب میں جن مباحث پر گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ اُن میں بڑی حد تک ہم متفق الراے ہیں —

چنانچہ ہم کو اس پر اتفاق ہے کہ ہندستان کی مشترکہ زبان ہندستانی ہونی چاہیے اور یہ اردو رسم الخط اور دیوناگری دونوں میں تحریر اور جملہ دفتری اور تعلیمی اغراض کے لیے (سرکاری زبان)

تسلیم کی جانی چاہیے - ہندستانی سے ہم وہ زبان مراد لیتے ہیں جو شمالی ہند کی بولی میں سب سے بڑا مشترکہ عنصر ہے - اور ہماری دانست میں اس ذخیرے میں الفاظ کے شمول و انتخاب کا معیار بھی یہی عام استعمال یا رواج ہونا چاہیے - مزید برآں ہماری راے ہے کہ هندی اور اردو دونوں کو بحیثیت ادبی زبانوں کے ترقی کرنے کے پورے مواقع دیے جانے چاہیں —

هم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ اردو اور هندی اهل علم کے اشتراک عمل سے هندستانی الفاظ کی ایک اساسی لغت تالیف کرنے کی کوشش کی جاے - اس لغت کی تدوین اور اس قسم کے حل طلب مسائل کے واسطے جیسے اصطلاحی الفاظ کا انتخاب ہے، ایک مختصر نمایندہ کمیٹی کا انعقاد کسی قریبی تاریخ میں ہونا چاہیے - جس میں اردو اور هندی کے ایسے ذی اثر حامی شامل ہوں جو ان دونوں زبانوں کو قریب تر لانے کی ضرورت مانتے ہیں اور هندستانی زبان کو ترقی دینے کے قائل ہیں، تاکہ اس طرح ان دونوں زبانوں کے بولنے والوں میں حسن ظن پیدا کیا جاے —

اسی اثنا میں بابو بل دیو سہاے صاحب ایڈوکیٹ جنرل سے جو گفتگو فرمائی اُس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے - اس کی نقل قاضی عبدالودود صاحب نے بابو صاحب کی خدمت میں بھیجی تھی انہوں نے اس کی صحت کو تسلیم کیا اور نمبر (۹) کا اضافہ فرمایا —

۱ — هم انگریزی کو ذریعۂ تعلیم نہیں رکھنا چاہتے - اپنی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا چاہتے ہیں - رہا یہ سوال کہ یہ سب کے لیے هندستانی ہو یا اردو والوں کے لیے اردو اور هندی والوں کے لیے هندی، آپ جس طرح

چاہیں طے کر سکتے ہیں —

۲ - اس وقت اردو ہندی کی کشمکش ہمارے یہاں نہیں ہے - میں نے مولوی حفیظ صاحب کے ساتھہ دورہ کیا تو معلوم ہوا کہ اکثر اسکولوں میں ایک ہی استاد اردو اور ہندی بولنے والوں کو ساتھہ ساتھہ پڑھاتا ہے - اردو والے اردو کی کتاب اور ہندی والے ہندی کتاب سامنے رکھہ کر پڑھتے ہیں اور سبق اور استاد کی باتیں سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی —

۳ - ہمارے ٹریننگ کالج میں امیدواروں کے داخلے میں ایسوں کو ترجیح دی جاتی ہے جو ہندی اردو دونوں زبانیں جانتے ہیں —

۴ - ہمارے ٹریننگ اسکولوں میں دونوں زبانیں پڑھائی جاتی ہیں —

۵ - استادوں کے تقرر میں ایسے اُستادوں کو ترجیح دی جاتی ہے جو دونوں زبانوں سے واقف ہوں —

۶ - ہندی یا اردو جاننے والے طلبہ کی مشترک جماعت ہونی چاہیئے —

جب درسی کتابوں کی اصطلاحات کے متعلق گفتگو آئی تو بابو راجندر پرشاد صاحب نے فرمایا کہ اصطلاحیں جہاں تک ممکن ہو ہندوستانی سے لی جائیں اور جو عام طور پر رائج ہیں وہ بجنسہ رہنے دی جائیں اور جو موجود نہ ہوں ان کے لیے اردو ہندی کی عام فہم اصطلاحوں کو ایک ساتھہ استعمال کیا جائے - اردو رسم خط میں جو کتابیں ہوں اُن میں ہندی اصطلاحیں قوسین کے اندر لکھہ دی جائیں اور اسی طرح ہندی کی کتابوں میں اردو کی اصطلاحیں درج کی جائیں —

اس موقع پر انجمن ترقیء اردو صوبۂ بہار نے صوبے کے ممتاز

حامیان اردو کی ایک کانفرنس بھی منعقد کی جس کا جلسہ ۲۸ اگست کی شب کو اردو کتب خانہ بانکی پور میں مسٹر محمد یونس کی زیر صدارت ہوا۔ اس جلسے میں سکرٹری انجمن ترقی اردو (ہند)، مولوی ظفرالملک علوی، مولوی رشید احمد صدیقی اور قاضی عبدالودود صاحب نے تقریریں کیں - جناب صدر نے انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کرنے پر زور دیا - اس جلسے میں کوئی تجویز منظور نہیں کی گئی، لیکن جو اظہار خیال کیا گیا اس سے صاف ظاہر تھا کہ شرکاے جلسہ کو انجمن ترقیء اردو ہند کی مقرر کردہ کمیٹی پر اعتماد ہے —

انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار نے اس موقع سے فائدہ اٹھاکر یہ انتظام بھی کیا تھا کہ ہندوؤں مسلمانوں کے تہذیبی تعلقات پر لکچر دیے جائیں- چنانچہ وہیلر سینٹ ہاوس میں ۲۹ کی شب کو ایک بڑے مجمع کے سامنے، اصحاب ذیل نے اس موضوع پر لکچر دیے - پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب - مولانا سید سلیمان ندوی صاحب، خواجہ غلام السیدین صاحب، رشید احمد صدیقی صاحب - ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم صوبۂ بہار صدر جلسہ تھے —

ارکان کمیٹی کے قیام وغیرہ کا انتظام کرنے کے لیے اہل پٹنہ نے خان بہادر سید ابراہیم حسین صاحب کے زیر صدارت ایک استقبالی کمیٹی قائم کرلی تھی - اس کمیٹی کی طرف سے کمیٹی کے ارکان کو ۲۹ کی شب کو دعوت دی گئی جس میں شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز حامیان اردو شریک تھے - مسٹر سچدانند سنہا وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی نے کمیٹی کے ارکان کو ایٹ ہوم دیا - ڈاکٹر سید محمود نے صبح کے کھانے پر بلایا، اور مسٹر شرف الدین حسن ایم - ایل - اے نے لنچ کی دعوت دی-

کمیٹی کا کام ۲۹ اگست کو ختم ہوگیا تھا لیکن میں ایک روز اس فرض سے اور ٹھہر گیا کہ بہار کے دیہات میں جہاں مسلمان آباد ہیں اور ان کی اردو تعلیم کا کوئی انتظام نہیں وہاں ابتدائی مدرسے قائم کر کے اس کا انتظام کیا جائے - چنانچہ اس کے متعلق پٹنے کے بعض احباب اور اضلاع بہار کے بعض اصحاب سے گفتگو کی ۰ ان صاحبوں نے اس پر پوری آمادگی ظاہر کی - بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ سید ضمیرالدین احمد صاحب وکیل نے جن کی مستعدی اور خلوص کو سب تسلیم کرتے ہیں سیاسی تعلقات کو ترک کر کے اپنے فرصت کے اوقات اسی کام کے لیے وقف کردیے ہیں - ولی الحق صاحب نے بھی جو مستعد نوجوان ہیں وعدہ کیا ہے کہ وہ اس کام میں پوری مدد دیں گے - قاضی عبدالودود صاحب اب انجمن کی تنظیم و تشکیل اور شاخیں قائم کرنے اور اردو مدارس کھولنے کی تدبیروں میں مصروف ہیں —

مجھے اہل بہار سے کامل امید ہے کہ وہ اس کام کو پوری مستعدی اور انہماک سے انجام دیں گے —

(۲) مسٹر شکلا وزیر تعلیم صوبۂ متوسط سے گفتگو

بہار کمیٹی سے فارغ ہو کر میں ناگپور پہنچا اور صوبۂ متوسط (سی-پی) کے وزیر اعظم مسٹر کھرے اور اس کے بعد خان بہادر حافظ ولایت اللہ صاحب بی - اے ، ایل ایل - بی ، سابق ڈپٹی کمشنر اور نواب محی الدین خاں صاحب ایم - ایل سی کی معیت میں مسٹر شکلا وزیر تعلیم سے ملاقات کی -

وزیر تعلیم سے جن امور پر گفتگو ہوئی وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) - صوبۂ متوسط میں پرائمری مدارس کے لیے اردو ریڈروں کے متعدد سلسلے منظور کیے گئے ہیں اور اس لیے مختلف مدارس میں مختلف سلسلے پڑھائے جاتے ہیں حالانکہ دوسری زبانوں کے لیے ریڈروں کا ایک ہی سلسلہ ہے - یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سارے صوبے کے لیے اردو ریڈروں کا ایک ہی سلسلہ منظور کیا جائے ــــ

اردو ریڈروں کے موجودہ طریقے سے بہت سی دشواریاں پیش آتی ہیں خصوصاً جب طالب علم کو ایک مدرسہ چھوڑ کر کسی دوسرے مدرسے میں داخل ہونے کی ضرورت پڑتی ہے - یا جب امتحان کے پرچے میں سے یہ تلاش کرنا پڑتا ہے کہ سوالات مندرجۂ پرچہ میں کون سے سوالات ان ریڈروں سے تعلق رکھتے ہیں جو اس نے اپنے مدرسے میں پڑھی ہیں - اس سے طالب علم کی پریشانی کا اندازہ ہو سکتا ہے ــــ

(۲) میونسپل حلقوں کے اکثر سپرنٹنڈنٹ تعلیم اردو سے ناواقف ہیں - اس وجہ سے ایسے حلقوں کی اردو تعلیم ناقص رہ جاتی ہے - یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انسپکٹروں کے لیے اردو کا جاننا بھی ایک ضرور شرط قرار دیا جائے ــــ

(۳) ہماری راے میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمام اردو پڑھنے والے طلبہ کے لیے ہندی کا جاننا اور ہندی خواں طلبہ کے لیے اردو کا جاننا لازمی قرار دیا جائے مڈل اسکولوں میں اس طریقے کا رائج کرنا زیادہ مناسب ہوگا ــــ

(۴) ابتدائی تعلیم کے لیے اس صوبے میں جو نیا طریقہ یا نئی تجاویز اختیار کی جائیں، ان میں اردو کے حقوق کو نظر انداز نہ کیا جائے ــــ

(٥) ناگپور یونیورسٹی سے درخواست کی جاے کہ وہ اردو کے امتحانات کا نصاب متعین کرکے شایع کرے —

اس گفتگو کی یاد داشت میں نے لکھہ کر بھی وزیر تعلیم کی خدمت میں بھیج دی تھی کہ وہ اس کی توثیق فرمادیں —

انھوں نے اپنی مہربانی سے جو جواب عنایت فرمایا اس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے —

" جناب من -

آپ کا خط (بلا تاریخ) پہنچا اور اس کے ساتھہ وہ اموریادداشت بھی وصول ہوے جو آپ نے ۳ ستمبر کو ناگپور میں بوقت ملاقات پیش کیے تھے - عنقریب کونسل ایک مستقل مجلس تعلیم مقرر کرنے والی ہے اس وقت آپ کی یاد داشت اس کے سامنے پیش کردی جائے گی - اس کی رپورٹ پر تعلیم کی اس پالیسی کے ساتھہ غور کیا جائے گا جو اس صوبے کے لیے آئندہ دو تین مہینے کے عرصے میں مقرر کی جائے گی - اس وقت میں آپ کو آپ کے مطالبات کے متعلق حکومت کے فیصلے سے باقاعدہ اور سرکاری طور پر مطلع کرسکوں گا —

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کانگریس کی یہ پالیسی ہے کہ وہ تمام اقلیتوں کی زبان اور تہذیب (کلچر) کی حفاظت کرے - آپ کے مطالبات کا مناسب لحاظ کیا جائے گا اس وقت اس سے زیادہ میں کچھہ نہیں کہہ سکتا " —

آپ کا نیاز مند
آر - شکلا

یہ معلوم کرکے ہمارے ناظرین کو ضرور خوشی ہوگی کہ وزیر اعظم مسٹر کھرے اور وزیر تعلیم مسٹر شکلا بہت صاف اور بلا تکلف اردو (یا ہندستانی) بولتے ہیں، اور لطف یہ ہے کہ اردو شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتے ہیں ۔ یہی وہ زبان ہے جس کی حفاظت اور بقا کے ہم متمنی ہیں —

(۳) گاندھی جی اور اردو ہندی

جولائی کے ابتدائی ہفتے میں ہندی پرچارک ادھیا پن مندر (یعنی ٹریننگ اسکول وردھا کا افتتاح کرتے وقت جو تقریر فرمائی اس میں یہ بھی فرمایا :—

"انہیں (مدرسین) کو اُس ہندی زبان پر پورا عبور حاصل کرنا پڑے گا جس کی تعریف ساہتیہ سمیلن اندور میں کی گئی تھی، یعنی وہ زبان جسے شمالی ہند میں ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں اور دیوناگری یا فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے ۔ اس زبان پر قدرت حاصل کرنے کے معنی صرف یہ نہیں ہوں گے کہ اس آسان ہندی ہندستانی کو سیکھ لیا جائے جسے عوام بولتے ہیں بلکہ اس فصیح و بلیغ ہندی کو جس میں سنسکرت الفاظ کی بھر مار ہوتی ہے نیز اس فصیح و بلیغ اردو کو بھی جس میں فارسی عربی الفاظ بکثرت استعمال ہوتے ہیں، سیکھنا لازم ہوگا ۔ ان زبانوں کے علم کے بغیر انہیں زبان پر قدرت حاصل نہیں ہوسکتی، جیسے کوئی

شخص انگریزی زبان پر عبور حاصل کرنے کا دعوی نہیں کرسکتا جب تک وہ چاسر، سوفسٹ اور جانسن کی انگریزی پر قادر نہ ہو یا کوئی شخص سنسکرت زبان کا عالم نہیں ہوسکتا جب تک وہ والمیک اور کالیداس کی سنسکرت کا علم نہ رکھتا ہو"۔ (ہریجن، ۱۷ جولائی) —

گاندھی جی کی یہ تجویز نہایت معقول اور قابل ستایش ہے۔ لیکن ایک دوسرے مقام پر (ہریجن ۳ جولائی) فرماتے ہیں کہ "ہندی، ہندستانی اور اردو تینوں لفظوں سے ایک ہی زبان مراد ہے جسے شمالی ہند میں ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا فارسی حروف میں لکھی جاتی ہے" اسی تحریر میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

" میں نے ایک لحاظ سے اردو کی حمایت کی، اگر اسے ہندی سے الگ سمجھا جاے، جب ہندی ساہتیہ سمیلن کے جلسۂ اندور میں میرے تحریک پر وہ تعریف منظور کرلی گئی جو دفعہ (۱) میں دی گئی ہے (جو ہم نے اوپر نقل کی ہے - اڈیٹر) اور جب بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے جلسۂ ناگپور میں بھی میری تحریک پر یہ تعریف قبول کرلی گئی اور صوبجاتی تعلقات کی مشترک زبان کو ہندی یا ہندستانی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس طرح ہندؤں اور مسلمانوں کو پورا موقع دیا گیا کہ وہ اس کوشش میں شریک ہوکر مشترک زبان کو ترقی دیں اور اپنے اپنے صوبے کے اعلی خیالات کو اس زبان میں ظاہر کریں " —

گاندھی جی کی تعریف سے زبان کی نوعیت نہیں بدل سکتی - اُن

کا یہ فرمانا کہ ہندی ' ہندستانی اور اردو تینوں لفظوں سے ایک ہی زبان مراد ہے ہرگز صحیح نہیں - جس ہندی کا پرچار گاندھی جی اور اُن کے شریک اور پیرو اس وقت ملک میں کررہے ہیں وہ نہ ہندستانی ہے اور نہ اردو - اور گاندھی جی کی اس تعریف کو کوئی زباندان قبول نہیں کرے گا کیونکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے - لفظوں کی آڑ میں پناہ لینے اور منطقی حجتوں سے حقیقت کو چھپانے سے کام نہیں چلتا - سارا ہندستان جانتا ہے کہ گاندھی اور اکثر کانگریس لیڈر کس زبان کی اشاعت کی کوشش کر رہے اور کس طرح زبردستی یہ زبان لوگوں کے سر منڈھ رہے ہیں - غور کرنے کی بات ہے کہ صوبۂ مدراس میں جسے ہندی سے دور کی نسبت بھی نہیں ہندی کی اشاعت کے لیے لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جارہا ہے - اور اگر کچھہ کہو تو گاندھی جی کی تعریف پیش کی جاتی ہے کہ ہندی ' ہندستانی اور اردو ایک ہی تو ہیں - کیا جھوٹ کی طرح سچ کہنے کے بھی مختلف ڈھنگ ہیں —

گاندھی جی نے ہندی پرچارکوں کے لیے جو یہ تجویز کی ہے کہ وہ فصیح و بلیغ ہندی اور اردو سیکھیں' اس کے مفہوم کو ہریجن کے قابل اڈیٹر نے کھول کے بیان کیا ہے - وہ کہتے ہیں کہ " پرچارک کے لیے یہ شرط اس لیے لازم کی گئی ہے کہ وہ غیر اردو داں اور غیر ہندی داں صوبوں کے لیے ایک ایسی زبان پیدا کرے جو آسانی سے سمجھہ میں آسکے - جس طرح اسلامی فتوح کے زمانے میں آسانی کے لیے سمو کر ایک زبان بنالی گئی تھی ' اسی طرح قومی اتحاد کی خاطر ایک ایسی زبان بنالی جاے جسے گاندھی جی ہندی ہندستانی سے موسوم کرتے ہیں اور جس کی شدید ضرورت ہے " —

فاضل اڈیٹر نے جو مثال پیش کی ہے وہ صحیح ہے - اسلامی زمانہ میں جو زبان بنی وہ اقتضائے زمانہ اور اقتضائے ضرورت کی وجہ سے خود بخود بن گئی ' اور خود بخود پھلی پھولی اور پھیلی اور آج تک قائم اور جاری ہے - آج کل کی طرح احکام و فرامین ' جلسوں اور کمیٹیوں ' پراپیگنڈے ' لاکھوں روپیے کے صرف اور حکومت کے زور سے نہیں پھیلائی گئی تھی - یہ فرق بہت بڑا فرق ہے - ایک چیز کا قدرتی طور پر بننا اور بڑھنا اور کسی چیز کا زبردستی حلق میں اتارنا ' دو ایسی باتیں ہیں جن کا کسی طرح مقابلہ نہیں ہو سکتا - اس کے علاوہ پرچارک کو اجازت ہے کہ بنگال ' آسام ' مدراس میں دل کھول کے سنسکرت چھانٹے اور گجرات اور مہاراشٹر میں اردو فارسی کے صرف وہی لفظ بولے جو پہلے سے رائج ہیں - سارا انحصار پرچارک پر ہے ' اس کی زبان کون پکڑ سکتا ہے - اور یہ ظاہر ہے کہ وہ کس زبان کی اشاعت کرے گا - ہم منطقی حجتیں کرتے رہیں گے اور وہ اپنا کام کرتا رہے گا کیونکہ اس کی پشت پر دولت ' اثر اور ایک حد تک حکومت ہے - ہم بدگمانی نہیں کرتے اور نہ کسی کی نیت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں بلکہ اُس ذہنیت سے بحث کررہے ہیں جو آج کل پیدا کردی گئی ہے اور جس کے ذمہ دار بڑی حد تک گاندھی جی ہیں - انہوں نے ناحق یہ جھگڑا چھیڑ کر ملک میں پریشانی اور نفاق پیدا کردیا ہے —

---

(۴) بابو پرشوتم داس ٹنڈن اور ہندی اردو

بابو پرشوتم داس ٹنڈن صاحب جو ہندی ساہتیہ سمیلن کے روح و رواں ہیں انہوں نے ڈاکٹر اشرف کو ایک خط لکھا ہے جس میں اردو

ہندی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے - فرماتے ہیں کہ :

"ذاتی طور پر میں ہندی کے لفظ کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ اس سے وہ خیالات وابستہ ہیں جو قدیم اور خوش کن ہیں، اور اس میں ہندو اور مسلم تہذیبوں کا نچوڑ ہے - "ہندی" "ہند" سے نکلا ہے جو ہمارے ملک کا نام ہے اور میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ یہ لفظ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے - اس میں اُس زبان کی کئی بولیاں اور شکلیں داخل ہیں - اردو اس کی صرف ایک خاص صورت ہے - ہندی کا لفظ سب سے پہلے خسرو نے اس زبان کے لیے استعمال کیا تھا اور خسرو کے بعد کثرت سے مسلمان مصنفین نے اس لفظ کو نہ صرف قدیم دیسی زبان کے لیے بلکہ فارسی آمیز زبان کے لیے بھی استعمال کیا" - اس کے بعد انھوں نے باقر آگاہ اور میر تقی میر کے نام پیش کیے ہیں کہ انھوں نے اپنے کلام کو ہندی کے نام سے موسوم کیا —

یہ وہی منطقی اور ملایانہ دلیل ہے - خسرو نے ہرگز ہندی کا لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں کیا جن معنوں میں اس وقت استعمال کیا جاتا ہے - اور نہ باقر آگاہ اور میر نے ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں خسرو نے استعمال کیا تھا - لفظ گو بے جان سہی لیکن وہ بھی انسان کی طرح ایک زندگی رکھتا ہے - جس طرح حالات اور زمانہ کا انسان پر اثر پڑتا ہے اسی طرح لفظ بھی ان تمام حالات سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا مفہوم بھی بدلتا رہتا ہے - کسی لفظ کی اصل تحقیق کرنا اور اس کے بعد یہ کہنا کہ اس کا مفہوم یہ ہونا چاہیے، بچوں کی سی

بات هے - بیشک هندی کا لفظ ایک زمانے میں اردو کے لیے استعمال هوتا تھا- اور یه استعمال فارسی کے مقابلے میں تھا - چونکه اس زمانے میں فارسی کا عام رواج تھا، مدرسوں، مکتبوں اور دفتروں میں اسی کا بول بالا تھا، اس لیے نئی زبان جسے بعد میں اردو کہنے لگے فارسی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی - محض فارسی سے امتیاز کرنے کے لیے اسے هندی کہنے لگے - جب اس نے علمی اور ادبی حیثیت حاصل کرلی تو نام بھی بدل گیا اور مفہوم بھی بدل گیا - کیا ٹنڈن اور ان کے هم خیال یه کہه سکتے هیں که هندی کے آج کل وهی معنے لیے جاتے هیں جو میر اور مصحفی کے زمانے میں لیے جاتے هیں؟ یه اور بات که ٹنڈن صاحب کو یه لفظ پسند هے اور وہ چاهتے هیں که یہی لفظ سب زبانوں اور سب معنوں پر هوجاے - ذاتی پسند یا ناپسند سے عام رواج اور عام مفہوم نہیں بدل سکتا - هندی کے معنے اب نه اردو هیں اور نه هندستانی، خواه ٹنڈن صاحب اور گاندهی کچھه هی کہا کریں —

---

(۵) پروفیسر جھا اور اردو هندی

پروفیسر جھا نے اخبار لیڈر میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے اس امر پر بحث کی هے که اردو اور هندی کو الگ الگ ترقی کرنے دینا چاهیے - هندستانی کوی زبان نہیں اور نئی زبان محض فضول هے - اسی مضمون کے دوران میں وہ فرماتے هیں —

" صاف بیانی هر حال میں بہتر هے - کسی ایک سال کو لیجیے اور اُن هندو طلبه کی فہرست دیکھیے جو یونیورسٹی یا بورڈ کے امتحانات میں اردو لے کر شریک هوئے هیں اور

نیز ان ہندو طلبہ کی تعداد دیکھیے جنہوں نے فارسی لی ہے
اور اس کے مقابلے میں ان مسلمان طلبہ کی تعداد کو دیکھیے
جو ہندی لے کر شریک ہوے ہیں اور اگر کسی مسلمان نے
سنسکرت لی ہے تو اسے معجزہ سمجھنا چاہیے - یا ہندو ہوسٹل
میں جائیے وہاں کے مطالعہ خانے میں ہمیشہ اردو رسالے اور
اخبار پائیے گا - مسلمان اقامت خانے جاکر دیکھیے وہاں کوئی
ہندی رسالہ یا اخبار نظر نہ آے گا " —

اس سے تو اردو کی فوقیت پائی جاتی ہے - ہندو طلبہ اردو اس لیے نہیں پڑھتے کہ وہ مسلمانوں پر احسان کرتے ہیں بلکہ اس لیے پڑھتے ہیں کہ وہ اس زبان کو پسند کرتے ہیں - اس میں جو دلکشی اور فصاحت ہے وہ انہیں دوسری زبان میں نظر نہیں آتی - اردو بھی تو آخر دیسی زبان ہے - اگر وہ طلبہ کو زیادہ تر پسند ہے تو اس میں کیا برائی ہے - اب رہا یہ الزام کہ ہندی کی طرف سے مسلمان بے پراوئی کرتے ہیں تو یہ بھی صحیح نہیں - اب بھی بہت سے مسلمانوں میں بہت سے ہندی کے شاعر موجود ہیں - جامعۂ عثمانیہ میں ہر اردو پڑھنے والے طلبہ کے لیے ہندی کا پڑھنا لازم ہے - اور ایم - اے میں تو یہ قید لگادی گئی ہے کہ اگر ہندی میں تیس فی صدی سے کم نمبر آئیں تو سارے امتحان میں ناکامیاب سمجھا جاے - کیا بنارس یونیورسٹی ' ودیا پیٹھہ یا کوئی گروکل ایسی کوئی مثال پیش کرسکتا ہے —

انجمن ترقیِ اردو نے حال میں ہی شکنتلا کا راست سنسکرت سے اردو میں ترجمہ کرایا ہے اور زیر طبع ہے - اسی انجمن کی سر پرستی میں ہندی اردو لغت تیار ہو رہا ہے - یہی انجمن کبیر کے کلام کا انتخاب

بھی مرتب کرا رہی ہے - اس کے علاوہ اور بھی کئی ترجمے زیر تجویز ہیں- اس سے قبل تلسی داس کی رامائن فارسی رسم خط میں مع ترجمہ کے شائع ہوئی تھی- اور بہت سے سنسکرت کتابوں کے ترجمے اردو میں شایع ہوچکے ہیں- آئندہ ہم کسی وقت اس کی مفصل فہرست شایع کریں گے —

۶- پنڈت جواہر لال نہرو اور مسئلۂ زبان

کانگرس کے صدر جناب پنڈت جواہر لال نہرو نے (The Question of Language) کے نام سے انگریزی میں ایک رسالہ شائع کیا ہے اور گاندھی جی نے اپنے پیش لفظ میں ان کے خیالات کی "عمومی" تصدیق فرمائی ہے- نظر برایں یہ امید کرنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ کانگرسی طبقوں میں یہ تحریر کافی پر وزن تسلیم کی جائے گی - اگر جدید ہندی زبان کے طرف دار بھی پنڈت جی کی مصالحانہ روش اختیار کریں اور زبان اردو کی مخالفت سے فی الواقع باز رہیں تو کم سے کم انجمن ترقی اردو کے ساتھ کسی مناقشے کی نوبت نہ آے گی کیونکہ انجمن کا مسلک صرف زبان اردو کی ترقی اور جائز حقوق کی حفاظت کرنا رہا ہے اور وہ کسی دوسری زبان سے اُلجھنا نہیں چاہتی - اس مسلک کو یہاں تفصیل سے دہرانے کی ضرورت نہیں- ہم اس وقت صرف پنڈت جواہر لال صاحب کے رسالے پر ایک تنقیدی نظر ڈالیں گے :—

پنڈت جی نے شروع ہی میں اس "جاہلانہ" قول کی کہ ہندوستان بھانت بھانت کی بولیوں کا ملک ہے، تردید فرمائی ہے اور لکھا ہے کہ یہاں صرف چند زبانیں اور وہ بھی باہم متحد پائی جاتی ہیں اور

ایک زبان سب پر حاوی ہے جس کے عقیدت مندوں کی تعداد قریباً دس کرور ہے (صفحہ ۲) - کچھ آگے چل کر (صفحہ ۵) اس ہمہ گیر زبان کو وہ 'ہندوستانی' کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس کے بولنے والوں کا شمار بارہ کرور اور سمجھنے والوں کی تعداد مزید برآں دو کرور کے قریب تحریر فرماتے ہیں :—

پنڈت جی کی حب وطن میں شک کرنے والا' کافر - لیکن اس بحث کو محض "علمی" سمجھ کر ہم اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ "ہندوستان کی تحقیقات لسانی" (Linguistic Survey of India) کے ضخیم مجلدات میں ہماری کثرت السنہ کے متعلق جو حقائق جمع کیے گئے ہیں' ان کے بطلان کے لیے حب وطن کے سوا کچھ اور مواد بھی درکار ہے اور محض خیال کی بلند پروازی سے واقعات نہیں بدل سکتے - رہی ہندوستانی زبان' جس کے بولنے' سمجھنے والوں کی تعداد کہیں دس' کہیں چودہ کرور بتائی گئی ہے' تو اگر 'ہندی' اور 'اردو' میں اختلاف بلکہ صرف امتیاز بھی جائز رکھا گیا تو ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ خود بخود باطل ہو جائے گا :—

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں تعلیمی اور سرکاری اغراض کے لیے پنڈت جی وہاں کی بڑی زبانوں کو تقویت دینے کے حامی ہیں اور ان زبانوں کی یوں تصریح کرتے ہیں :—

'ہندوستانی' جس کی دو صورتیں ہیں' 'ہندی' اور 'اردو' - اور جس میں اس کی چند شاخیں شامل ہیں - پھر 'بنگالی' 'مرہٹی' اور 'گجراتی' جو ہندی کی بہنیں اور اس سے قریبی اتحاد رکھتی ہیں - جنوب میں' 'تامل' 'تلنگی' 'کنڑی' 'ملایلم' - ان کے علاوہ 'اُڑیا'

'اسامی' اور 'سندھی'۔ اور شمال مغرب میں 'پشتو' اور 'پنجابی' بس یہی درجن بھر زبانیں سارے ہندوستان پر محیط ہیں۔ (صفحہ ۴) —

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی صرف ان زبانوں کو قابل شمار سمجھتے ہیں جن میں کچھہ نہ کچھہ ادبی سرمایہ موجود ہے۔ لیکن پنڈت جی کی جمہوریت پرستی مسلم ہے اور اس رسالے میں بھی عوام' خاص کر دیہاتی آبادی کے حقوق زبان و تعلیم پر کافی زور دیا گیا ہے۔ اب اگر دیہات والوں کو مادری زبان میں تعلیم دینے کے اصول پر واقعی انصاف اور سچائی کے ساتھہ عمل کیا جائے گا تو پھر زبانوں کی تعداد کسی طرح ایک درجن تک محدود نہیں رہ سکتی۔ شمالی ہند ہی میں' مثلاً' 'کشمیری' 'لہندا' 'ملتانی' 'باگڑی' 'راجستانی' 'اودھی' 'بہاری' وغیرہ کئی بولیاں موجود ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد لاکھوں سے زیادہ ہے اور جو ایک دوسرے سے کم و بیش اتنا ہی اختلاف رکھتی ہیں' جتنا باہم 'اسپینی' 'فرانسیسی' اور 'اطالوی' میں پایا جاتا ہے —

تمام صوبوں میں تبادلۂ خیالات کا مشترک ذریعہ بنانے کے لیے پنڈت جی ہندوستانی زبان کو پیش کرتے ہیں۔ ان کا یہ فرمانا درست ہے کہ انگریزی جو بالکل اجنبی زبان ہے یہ رتبہ نہیں پاسکتی اور نہ ہندوستان کے لاکھوں باشندے اس کی تعلیم حاصل کرسکتے ہیں۔ پھر انہوں نے 'ہندوستانی' کی تعریف یہ کی ہے کہ اس میں ہم سرسری طور پر 'ہندی' اور 'اردو' دونوں کو شامل کرتے ہیں جو 'دیوناگری' اور فارسی' رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ پنڈت جی کی خواہش ہے کہ گجراتی' مرہٹی' بنگالی اور ممکن ہو تو جنوبی ہند کے رسوم خط

بھی 'دیوناگری' یا اس کے مماثل کردئیے جائیں اور اسی طرح سندھی کے لیے اردو رسم الخط اختیار کیا جاے - بہر حال ' وہ 'اردو' کے (فارسی) رسم الخط کو فی الحال قائم رکھنے کے موید ہیں —

'اردو' اور 'هندی' کی ابتدا اور بعد کے مناقشوں پر بھی فاضل مقالہ نگار نے کچھہ تاریخی' کچھہ لسانی اور کچھہ سیاسی بحث کی ہے لیکن آخر میں ایک عجیب نتیجہ یہ نکالا ہے کہ " آج کل 'اردو' اور 'هندی' میں اصلی فرق صرف یہ ہے کہ 'اردو' شہروں کی اور 'هندی' دیہات کی زبان ہے - 'هندی' تو یقیناً شہروں میں بھی بولی جاتی ہے لیکن اردو قریب قریب کلیتاً شہری ہے " (صفحہ ۱۰) —

اس میں شک نہیں کہ 'اردو' شمالی هندوستان کے تمام شہروں اور قصبات میں 'لاهور' سے 'پٹنے' تک یکساں بولی اور لکھی پڑھی جاتی ہے لیکن ان شہروں کے نواحی دیہات میں 'پنجابی' سے لیکر 'بہاری' تک جو بولیاں مروج ہیں' ان سب کو کسی ایک ہی زبان (هندی) سے موسوم کرنا ' قطعاً اور صریحاً غلط ہوگا - ممکن ہے پنڈت جی اپنا مطلب صاف طور پر نہ بیان کرسکے ہوں اور یا ہم اسے سمجھنے سے قاصر رہے - بہر کیف ظاہر ہے کہ اگر ان دیہاتی بولیوں کو شہروں میں رائج کیا گیا تو موجودہ یکسانی بھی غارت ہو جائے گی - بخلاف اس کے اگر شہری زبان اپنے اپنے حلقے کے دیہات میں پھیلائی جاے تو زبان کی یکسانی کا مقصد بخوبی حاصل ہوجاے گا - لیکن افسوس ہے کہ یہی وہ مفید' قومی مقصد ہے جسے نئی هندی کے پرچارک ناسمجھی سے مٹانے کے درپے ہو گئے ہیں —

'هندی' اور 'اردو' کے اختلاف اور جداگانہ راستوں پر گامزن

ہونے سے ' فاضل مقالہ نگار مطلق خوف زدہ نہیں بلکہ قوی امید رکھتے ہیں کہ زمانے کی ضروریات اور وطن پرستی کا تقاضا انہیں قریب لائے بغیر نہ رہے گا اور آخر میں یہ دونوں اصولاً ایک زبان بن جائیں گی - ہم اس آرزو میں دل سے پنڈت جی کے شریک ہیں - اگرچہ فراق کی تائید اور وصال کی امید میں ایک دلچسپ تضاد ضرور پایا جاتا ہے —

پنڈت جی کی ایک تجویز یہ ہے کہ ممکن ہو تو (Basic English) کے طرز پر ایک " مجمل ہندوستانی " مرتب کی جائے جسے غیر ہندوستانی صوبوں میں تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بنانا آسان ہو - تجویز بہت اچھی ہے اور اگر 'ہندی' اور 'اردو' والوں میں اشتراک نہ ہو سکے تو بھی دونوں اپنی اپنی زبان کا ایسا سہل و مختصر مجموعہ تیار کر سکتے ہیں جس میں کم سے کم تعداد میں ضروری اور مقبول عام الفاظ شامل ہوں اور صرف اسی کو سیکھہ کر غیر زبان والے معمولی گفتگو کرنے اور سمجھنے کے قابل ہو جائیں - اسی سلسلے میں پنڈت جی نے اصطلاحی الفاظ کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ علحدہ علحدہ اصطلاحیں وضع کرنے سے بہتر ہے کہ ہندوستان کی سب زبانوں میں جہاں تک ہو سکے فرنگی اصطلاحات بجنسہ اختیار کرلی جائیں تاکہ ہماری علمی کتابوں میں یک رنگی پیدا ہو جائے - لیکن یہ تجویز جیسی نظر آتی ہے ' حقیقت میں ایسی سہل اور قابل عمل نہیں ہے - ہم بخوف طوالت یہاں صرف اس قدر کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ یہ پیچیدہ علمی مسئلہ بہت کچھہ غور و بحث کا محتاج ہے - نیز یہ کہ خود یورپ و امریکہ میں اب بین الاقوامی اصطلاحات کی وہ یکسانی قائم نہیں رہی جس کا بیس تیس برس پہلے تک ہر ملک میں خاص اہتمام کیا جاتا تھا —

رسالے میں سب سے اہم بحث سرکاری اور تعلیمی زبان کی ہے - پنڈت جی کی راے ہے کہ ہر صوبے میں سرکاری' اور ابتدا سے انتہا تک تعلیم کا ذریعہ وہیں کی زبان ہونی چاہیے - صوبوں کی ان (بارہ) زبانوں کی فہرست ہم پہلے نقل کر چکے ہیں - اگر چہ ' پنجابی' اور ' پشتو' کے علاقے میں فاضل مقالہ نگار کا خیال ہے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ 'ہندوستانی' کو بنانا بہتر ہوگا - دوسرے صوبوں کے ثانوی مدارس میں "مجمل" اور کالجوں میں مکمل ہندوستانی کی تعلیم لازمی ہونی چاہیے اور بہ حیثیت پورے ملک کی زبان ہونے کے' عدالتوں وغیرہ میں بھی اس کا استعمال جائز قرار دیا جانا چاہیے - ہندوستانی کے لیے ہر منزل پر دونوں رسم الخط روا رکھے جائیں گے اور خود ہندوستانی کے علاقے میں بھی طالب علم 'دیوناگری' یا ' اردو ' رسم الخط پسند کر سکے گا —

لیکن اس موقع پر یہ بات پنڈت جی نے صاف طور پر تحریر نہیں کی کہ اردو اور ہندی زبان کی کتابیں بھی جداگانہ ہوں گی یا ایک ہی کتاب کو صرف دو خطوں میں چھاپ دیا جاے گا ؟ یہ صراحت کی جانی ضروری ہے کیونکہ خاص 'ہندوستانی' کے صوبے میں ہم یہ شکایت سن رہے ہیں کہ نصاب کی تازہ اردو کتابوں میں مصنوعی ہندی الفاظ کی بھر مار ہوتی جاتی ہے اور ہماری ادبی زبان کا معیار گر گیا ہے - ہمیں یقین ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کا ہرگز یہ منشا نہ ہوگا کہ محض رسم الخط کے بہانے میں ' اردو ' والوں کو کوئی دوسری زبان پڑھنے پر مجبور کیا جاے بلکہ وہ خوشی سے اس دشواری کا یہ حل قبول کریں گے کہ اردو کی کتابیں اسی زبان کے مستند ادیب تیار کریں

اور " ہندی " نصاب ' ہندی ' کے انشا پرداز تحریر فرمائیں - بہر حال ہم چاہتے ہیں کہ اس خلش کو جو ان کے اجمالی بیان سے پیدا ہوگی ' پنڈت جی جلد سے جلد دور کرنے پر توجہ فرمائیں —

رسالے کا بغور مطالعہ کرتے وقت ہم جا بہ جا یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے کہ فاضل مقالہ نگار بھی کچھہ نہ کچھہ اس ہنگامے سے متاثر ہیں جو " ہندی ' کے مدعیوں نے ملک میں مچا رکھا ہے - لیکن پنڈت جی کے ایسے خیالات پر گرفت کرنا ' ہم اُن کی صلح جوئی اور نیز ممتاز شخصیت کی قدر شکنی سمجھتے ہیں اور اس جگہ نئی " ہندی " کے دعاوی پر بھی کوئی جرح کرنا نہیں چاہتے - البتہ ہماری اس قدر گزارش ضرور ہے کہ زیادہ تحقیق و تفحص نہ سہی ' کم سے کم ایک بار جناب موصوف الہ آباد کے کسی دیہاتی کی ' ضلع آگرہ یا دہلی کے کسی گاؤں والے سے ملاقات کراکے دیکھیں کہ ان دونوں کی مقامی اور اصلی بولیوں میں کس قدر یکسانی یا تفاوت پایا جاتا ہے —

تبصرے

ادب

غالب نامہ ۶۸۵

نورس ۶۹۰

مرقع سخن جلد اول و دوم ۶۹۰

سحر گولکنڈہ ۶۹۱

انتخاب تہذیب الاخلاق ۶۹۲

نگارستان ادب حصہ اول و دوم ۶۹۳

بیاض سخن ۶۹۴

مبادی خط شکستہ اردو ۶۹۵

قاعدہ تعلیم بالغاں ۶۹۹

سخنوران ایران در عصر حاضر - جلد دوم ۷۰۲

متفرقات

معاشیات کے ابتدائی اصول ۷۱۹

اسلامی طب ۷۲۳

اردو کے جدید رسالے

ہندوستانی ۷۲۴

نور ۷۲۴

مشیر العلاج ۷۲۴

بہارستان ۷۲۵

صنعت و حرفت ۷۲۵

خاص نمبر

ساقی کا فسانہ نمبر ۷۲۵

شاعر کا سالنامہ ۷۲۶

سالنامۂ کابل ۷۲۶

تبصرے

ادب

غالب نامہ -

(تالیف شیخ محمد اکرام صاحب ایم - اے - آئی سی ایس) -

مولانا غلام رسول صاحب 'مہر' کی کتاب "غالب" کی سیاہی سوکھنے نہ پائی تھی کہ پنجاب ھی کے ایک نوجوان فاضل کی یہ کتاب غالب اور کلام غالب پر صوبہ بمبئی سے شایع ہوئی جہاں لائق مولف آج کل افسر حصہ ضلع ھیں - کتاب کے تین حصے ھیں - اول ' تذکرہ ' - جس میں مرزا صاحب کے سوانح زندگی ، حالات خاندانی وغیرہ زیادہ تر انہی کے خطوط اور تصانیف کی مدد سے مرتب کیے گئے ھیں - اس کے بعد ان کی ذاتی سیرت و کردار اور شاعری پر مفصل ' تبصرہ ' لکھا ھے اور آخر میں ان کا منتخب اردو اور فارسی کلام ترتیب زمانی کے ساتھ جمع کیا گیا ھے - نوجوان مولف نے جس محنت و شوق سے کئی سال تک اس مضمون کا مطالعہ کیا اور جس اھتمام سے یہ کتاب ترتیب دی وہ نہایت قدر و تحسین کے قابل ھے لیکن سوانحی حالات میں وہ ' یادگار غالب ' اور پھر ' مہر ' کی تازہ اور ضخیم تالیف پر کوئی خاص اضافہ نہیں

کرسکے ہیں - ان کتابوں میں جزئی واقعات یا سنین و اسما کی کوئی غلطی رہ گئی تھی تو انھیں اپنی تمہید میں صاف کردینا بالکل کافی ہوتا - اس سے تصحیح کی غرض پوری ہوجاتی اور نوجوان مولف کی تحقیق و تدقیق کا بھی ناظرین کو بخوبی اندازہ ہوسکتا تھا - موجودہ صورت میں دقت یہ پیدا ہوگئی ہے کہ مقابلے میں ایک طرف نثر اردو کے استاد کامل 'حالی' کی کتاب ہے اور دوسری طرف ایک پختہ کار انشا پرداز 'مہر' کی ضخیم تالیف رکھی ہے - ان کے سامنے شیخ محمد اکرام صاحب کی تحریر' ہمیں خوف ہے کہ نکتہ چینوں کو مبادا لوزات اور فیرنی کے دسترخوان پر گڑ کا دلیا نظر آے —

البتہ 'تبصرہ' میں لائق مولف نے بعض مباحث' جیسے غالب کا فلسفہ' مذہب وغیرہ عنوانوں پر بہت مفید و پر مغز بحث کی ہے - وہ اس عام خیال کی کہ غالب کی اپنے زمانے میں کافی قدر نہیں ہوئی' تردید کرتے ہیں اور ذاتی اخلاق و عادات کی نسبت بھی جو خوش اعتقادیاں پھیل گئی ہیں' انھیں مرزا صاحب کے مسلمہ حالات زندگی کی بنا پر غلط یا مبالغہ آمیز بتاتے ہیں - اردو' فارسی کلام کے مختلف دور' نیز محاسن و مدارج کلام کے متعلق فاضل مولف کا تبصرہ ان کے وسیع مطالعے اور عمدہ فہم و مذاق کی بین دلیل ہے اگرچہ ظاہر ہے کہ ایسے مباحث میں انفرادی ذوق کی بنا پر قیل و قال کی بہت کچھہ گنجائش رہ جاتی ہے - مثلاً غالب کے اس شعر کو لائق مولف بہترین کلام کا نمونہ سمجھتے ہیں —

بوادیے کہ دراں خضر را عصا خفت است
بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست

حالانکہ عصا خفتن سرے سے بے معنی ہے اور مرزا صاحب نے اعتراض کا جو جواب دیا تھا ' اُس نے غلطی کو اور بھی فاحش بنا دیا ہے -

لیکن شیخ محمد اکرام صاحب کا اصلی کارنامہ کلام غالب کی تاریخی تدوین ہے جس کے لیے انہوں نے سالہا سال محنت و دیدہ ریزی کی اور ہندوستان سے زیادہ انگلستان کے کتب خانوں میں کتب گردانی کرتے رہے - مرزا غالب کا زمانہ اتنا قدیم نہیں ہے نہ وہ ایسے غیر مقبول و گمنام رہے کہ ہندوستان میں ان کی تصانیف اور تذکرے نہ مل سکتے اور ولایت کے کتب خانوں کے بغیر کام نہ چلتا - اسی لیے نوجوان مولف نے اپنی ولایت کی تحقیقات کو جو اہمیت دی ہے اس پر لاہور کے ایک طالب علم نے ان کا مذاق اڑایا اور لکھا ہے کہ ہجری سال و ماہ سے عیسوی اور عیسوی سے ہجری تاریخ کا تعین کرنے کے لیے مسٹر محمد اکرام نے ' بوڈلین لائبریری ' کی جس جنتری کا حوالہ دیا ہے وہ کوئی بہت نایاب چیز نہیں - ہندوستان میں بھی بہت لوگ اس حسابی طریق سے واقف ہیں مگر " مسٹر اکرام کا تو خیال یہ تھا کہ آکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری کا نام لوگوں پر ... ہیبت طاری کردے گا* " -

بہر حال ؛ اول تو کتب خانہ انڈیا آفس میں دو ایک بہت کام کی نادر کتابیں نوجوان مولف کو مل گئیں دوسرے ولایت کے قیام کے زمانے میں انہیں اپنی تعلیم کے بعد جو کچھہ فرصت ملی اس کا یہ بہترین مصرف تھا کہ وہ غالب کے متعلق تحقیق و تفحّص کرتے رہے - ان کا یہ قول بالکل بجا ہے کہ غالب کی شاعری کی عظمت اور اس کا تاریخی ارتقا سمجھنے کے لیے مرحوم کے فارسی کلام کا مطالعہ ناگزیر ہے - چنانچہ

* اسلامیہ کالج کا رسالہ فروغ مشرق (سنہ ۱۹۳۷ ع) صفحہ ۶۰ -

فاضل مولف نے اس شاعری کے جو چار دور قائم کیے ہیں ان میں سے تیسرا دور تمام تر غالب کے فارسی کلام پر مشتمل ہے - تفصیلی دلائل کو تو اصل کتاب میں مطالعہ کرنا چاہیے لیکن شیخ محمد اکرام صاحب کی ترتیب کا خلاصہ یہ ہے : —

دور اول جس میں سنہ ۱۸۲۱ یعنی شاعر کی پچیس برس کی عمر تک کا کلام ہے - لائق مولف نے اسے 'ریختہ' موسوم کیا اور اس کے بھی " رنگ بیدل " اور "بادۂ نیم رس " کے نام سے دو حصے قرار دئے ہیں - (ہمیں اقرار ہے کے بادۂ نیم رس' کے مفہوم تک ہماری رسائی نہ ہوسکی) یہ پورا دور 'نسخۂ حمیدیہ' کے متن پر مبنی ہے جو ۱۲۳۷ ہجری (یعنی ۱۸۲۱ ع) میں قلمبند ہوا تھا —

دوسرا دور ' ۲۱ سے ۱۸۳۲ ع تک گیارہ سال کے کلام کا حامل اور " خمخانۂ شباب " کے شاعرانہ نام سے موسوم کیا گیا ہے - اس میں غالب کا وہ اردو کلام درج ہے جو نسخہ حمیدیہ کے متن میں تو موجود نہیں لیکن دیوان غالب کی طبع اول کے وقت ۱۸۴۲ ع میں چھپا تھا - لائق مولف کو مطبوعہ دیوان کا جو نسخہ خان بہادر ابو محمد صاحب سے مستعار ملا ' اگرچہ اس کا سرورق ضائع ہوگیا ہے لیکن وہ اسے (سید المطابع کی) طبع اول ہی کا نسخہ سمجھتے ہیں - یہ وہ منتخب دیوان تھا جس میں دوستوں کے مشورے سے ابتدائی ریختہ کے بہت سے اشعار حذف کردیے گئے تھے - شیخ محمد اکرام صاحب کی یہ تحقیق کہ انتخاب چھپنے سے کئی سال پہلے تکمیل کو پہنچ گیا تھا ' درست ہے لیکن ہمارے خیال میں اسے ۱۸۳۲ ع کی بجائے ۱۸۳۸ ع تک بڑھا دینا زیادہ قرین صواب ہوگا جس سنہ میں نواب ضیاءالدین خاں نے اس اردو دیوان کے لیے تقریظ تحریر کی —

تیسرا دور ''بہار عجم" ۱۸۲۷ سے شروع ہوکر ۱۸۴۷ ع پر ختم ہوتا ہے - گویا دور دوم کے بھی چند سال اس میں داخل کر لیے گئے ہیں - اس میں مرزا صاحب کا فارسی کلام تین فصلوں میں پیش کیا گیا ہے لیکن یہ اردو سے بھی مختصر انتخاب ہے اگرچہ اس میں جملہ اصناف سخن کے نمونے شامل ہیں - آخری دور ۱۸۴۶ سے شروع ہوکر ۱۸۵۵ ع پر ملتھی ہوتا ہے مگر اُسی میں بطور ضمیمہ ۱۸۶۷ یعنی زمانۂ رحلت تک کے اشعار

شریک ہیں - اس دور کا نام " اردوے معلّی " تجویز کیا ہے گو اس میں آخر زمانے کا فارسی کلام بھی داخل ہے —

فاضل مولف کی علمی تحقیق کی هم مکرر داد دیتے ہیں اگرچہ ہمیں کسی قدر افسوس ہوا کہ ترتیب و تعئین زمانی کی اتنی محنت اٹھانے کے بعد بھی انھوں نے صرف انتخاب کردینا کافی سمجھا حالانکہ کم سے کم سارے اردو کلام ہی کو جسے وہ بھی غالب کا کلام سمجھتے ہیں ' اسی ترتیب کے ساتھہ یکجا کردیتے تو یہ بجاے خود نہایت مفید تالیف ہوتی اور لوگوں کو ان کے انتخاب کے متعلق بھی کسی اختلاف کرنے کی گنجائش نہ نکلتی —

آخر میں یہ عرض کیے بغیر چارہ نہیں کہ ایسے ادبی موضوع کے لیے نوجوان مصنف کی دفتری طرز نگارش کچھہ بہت موزوں نہیں نظر آتی - "فرمائشاً" "مفید پڑا" ''ہمیں سمجھہ نہیں آتا" اس قسم کے بعض الفاظ اور جملے بھی ذوق سلیم کو ناگوار گزرتے ہیں - کتابت کی جا بجا غلطیاں رہ گئی ہیں اور ان کی درستی کے لیے اب بھی صحت نامہ چھاپ کر کتاب میں لگا دیا جائے تو بہتر ہوگا - مگر ان سب اسقام کے باوصف غالب کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کے واسطے شیخ محمد اکرام

صاحب کا 'غالب نامہ' بے شبہہ نہایت مفید کتاب ہے جس سے شاعر کے ذاتی حالات نیز کلام کے بعض پہلو سمجھنے میں اور سب سے بڑھ کر اس کے تاریخی ارتقا کا مطالعہ کرنے میں گراں قیمت مدد ملے گی - حجم ۴۴۲ صفحات - قیمت مجلد تین روپے غیر مجلد ڈھائی روپے - مسلم گجرات پریس' سورت یا قومی کتب خانہ - ریلوے روڈ' لاہور سے طلب کی جائے —

(ش)

نورس

(مصنفہ حامد اللہ صاحب افسر - بھارگو اسکول بک ڈپو

امین آباد پارک - لکھنؤ - قیمت ایک روپیہ) —

یہ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جس میں زیادہ تر ادبی مضامین ہیں - مصنف ہماری زبان کے مشہور شاعر اور مستعد ناثر ہیں - سب سے پہلا مضمون لاعلمی پر ہے جو بہت پر لطف ہے - باقی مضامین میں ادبی اور تنقیدی خیالات ظاہر کیے گئے ہیں جو ان طلبہ اور اصحاب کے لیے جو ادب سے ذوق رکھتے ہیں بہت دلچسپ ہوں گے - مصنف نے اپنے خیالات بہت متین اور شگفتہ نثر میں ظاہر کیے ہیں - کتاب قابل مطالعہ ہے —

مرقع سخن جلد اول و جلد دوم

(مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور' صفحات

تقریباً چار سو' فی جلد پانچ روپے)-

یہ دونوں کتابیں " سلسلہ ادبیات اردو " میں داخل ہیں - پہلی

جلد جشن سیمین اعلی حضرت حضور نظام خلداللہ ملکہٗ کی تقریب میں شایع ہوئی —

اس جلد میں عہد آصفیہ کے شعرا کا ذکر اور ان کے کلام کا انتخاب ہے - اس عہد کو پانچ دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر دور پانچ پانچ شعرا کا تذکرہ ہے - پہلے کل پچیس شاعروں کا تذکرہ اور منتخب کلام آگیا ہے - اگرچہ ان شعرا پر لکھنے والے مختلف اصحاب ہیں لیکن تاہم یک رنگی پائی جاتی ہے - ہر شاعر کے حالات کے ساتھ اس کا منتخب کلام اور کلام پر تبصرہ ہے —

دوسری جلد میں بھی دور آصفیہ کے پچاس شعرا کا تذکرہ اور کلام ہے - اور اس کی ترتیب بھی اسی ڈھنگ پر ہے جیسی پہلی کی ہے - تصویروں نے جو کثرت سے ہیں کتاب کا حسن بڑھا دیا ہے —

اردو شاعری کا فروغ اعلی حضرت میر محبوب علی خاں مرحوم کے زمانے سے شروع ہوا اور روز بروز ترقی پر ہے - اس وقت بھی حیدرآباد میں بہت سے خوشگو شاعر موجود ہیں - ان دونوں جلدوں سے حیدرآباد کی گزشتہ اور موجودہ شاعری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے —

سیر گولکنڈہ

(مولفہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور - قیمت ۱۵ آنے) -

یہ بہت دلچسپ کتاب ہے اور دلچسپ طرز میں لکھی گئی ہے - اس میں تاریخ اور فسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ قطب شاہی دور کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے -

بڑی بڑی تاریخوں کے پڑھنے سے وہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں جو اس چھوٹی سی کتاب میں ہے اور نہ وہ لطف اور کیفیت ہے جو اس میں ہے - اس وقت کی معاشرت کا رنگ بھی اس میں نظر آتا ہے —

اس میں اس زمانے کے بعض بادشاہوں ' شعرا اور مشاہیر کی تصویریں بھی ہیں جن سے کتاب کی دلکشی بڑھ گئی ہے —

انتخاب تہذیب الاخلاق

(نول کشور پریس صفحات ۱۲۸ قیمت ۱۰ آنے)

نول کشور پریس نے حال میں رسالہ تہذیب الاخلاق کا یہ انتخاب شایع کیا ہے - اس میں سر سید ' مولوی ذکاءاللہ ' سید کرامت علی ' مولوی عنایت رسول ' اور محمد عنایت اللہ کے قلم سے نو مختلف مضامین ہیں کتابت وطباعت ویسی ہی ہے جیسی درسی کتابوں کی ہوتی ہے یعنی غنیمت ہے —

یہ معلوم نہیں کہ کس جماعت یا مذاق کے طلبا کے لیے انتخاب کیا گیا ہے - اگر زیر نظر مضامین تہذیب الاخلاق کی انشا و طرز تحریر کی نمایندگی کی غرض سے لیے گئے ہیں تو یہ غرض اچھی طرح پوری نہیں ہوتی - "علوم طبیعہ کی تحقیقات جدید" "حرکت زمین کا معاینہ میں" "ہربرٹ اسپنسر کی فلاسفی ' " ...... کی نظم میں طوفان کا ذکر" یہ سب عوام کی دلچسی کے مضامین نہیں ہیں - علاوہ بریں ' جس مقصد کے تحت یہ مضامین لکھے گئے تھے وہ پورا ہو چکا ہے - اس لیے طلبا کے لیے تہذیب الاخلاق سے ایسے مضامین لینے چاہئیں جو سر سید ' محسن الملک ' ذکاءاللہ '

چراغ علی، وغیرہ کے طرز تحریر کے اچھے نمونے ہوں اور جو عام موضوعات پر لکھے گئے ہوں - سر سید اور ان کے ادبی رفقا کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنے گرد و پیش کے دھندلکے میں مغربی علوم کی روشنی پھیلائی اور شخصی اور ذاتی قدروں کو پوجنے والوں کے سامنے ایک وسیع ذہنی محاذ پیش کیا - اسی نقطۂ نظر سے اُن کے مضامین کا انتخاب کرنا چاہیے —

بہر حال اس کتاب سے کم از کم یہ تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ تہذیب الاخلاق میں علمی موضوعات پر بھی اچھے اچھے مضامین شایع ہوتے تھے جو اس زمانہ کی معلومات کے مطابق کہلائے جاسکتے تھے —

(س)

نگارستان ادب حصہ اول و دوم

(مرتبہ حامد اللہ افسر صاحب قیمت ایک روپیہ اور ایک روپیہ آٹھ آنے)

یہ کتاب جناب حامد اللہ، افسر، بی - اے نے صوبۂ متحدہ کے ہائی اسکول کلاسوں کے لیے مرتب کی ہے - حصہ اول نثر کے لیے ہے، اور حصہ دوم نظم کے لیے موضوعات، اور ایک بڑی حد تک شعرا اور نثاروں کا انتخاب بورڈ خود کرتا ہے، بیچارے مرتب کا صرف یہ کام ہے کہ مناسب مضامین اور نظمیں جمع کردے اور ضروری حواشی تحریر کردے - بہت سی کتابوں میں یہ بھی سلیقے سے نہیں ہوتا - حامد اللہ افسر صاحب ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اس لیے اُن سے یہ شکایت تو نہیں کی جاسکتی مگر ان کی کتاب میں وہی نقص ہے جو عام طور پر درسی کتابوں میں پایا جاتا ہے پہلی حصہ نثر کے اکثر مضامین اور

حصہ نظم کے اکثر منظومات ' وہی ہیں جو دوسری تالیفوں میں پائے جاتے ہیں - کہا جاتا ہے کہ ذراسی ترتیب بدل دینے سے ساری دنیا بدل جاتی ہے - کم از کم ہمارے مولفین و مصنفین تو ایسا ہی سمجھتے ہیں - آخر سر سید نے رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات کے علاوہ بھی تو کچھ لکھا تھا ' اور نذیر احمد مرزا ظاہر دار بیگ کے علاوہ دوسرے کردار پیش کرنے میں بھی کامیاب ہوے ہیں ' اسی طرح " موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ " ' " بزم قدرت " اور خان خاناں کی فیاضی ' کے علاوہ ان کے مصنفین کے یہاں دوسرے ایسے مضامین بھی مل سکتے ہیں جو نمونے اور مثال کے طور پر پیش کیے جاسکیں —

حصۂ نظم میں یہ بات کم ہے اور اس میں اچھی اچھی نظمیں غالباً پہلی دفعہ شامل کی گئی ہیں - شعرا اور نثاروں کے متعلق حواشی اور نوٹ بھی غور سے لکھے گئے ہیں اور ان سے مرتب کے مذاق سلیم کا ثبوت ملتا ہے - طلبا کی رہنمائی کے لیے یہ نوٹ کافی ہوں گے —

(س)

بیاض سخن -

(مولفہ عبدالشکور صاحب شیدا - قیمت دو روپے ملنے کا پتہ نائب محاسب عدالت العالیہ) —

یہ اردو کے شعرا کی غزلوں کا انتخاب ہے جو عبدالشکو صاحب شیدا نے حیدرآباد سے شایع کیا ہے - اس میں علاوہ ابتدا سے دور حاضر تک کے شیدا کے نمونۂ کلام کے ہم قافیہ وہم مضمون اشعار کا بھی نمونہ ملتا ہے - مزید دلچسپی کے لیے ہندی ابیات کا ایک سرسری انتخاب

بھی شامل کردیا گیا ہے —

آج کل انتخابات کی ایک ہوا چل گئی ہے اور ایسی بہت سی کتابیں بازار میں ملنے لگی ہیں جو سو دو سو صفحوں کی محدود دنیا میں ساری اردو شاعری کا احاطہ کرنے کی دعویدار ہیں - تذکرے ' بیاضیں ' منتخب کلام ' سبھی کے نمونے ملتے ہیں - دراصل یہ سب غمازی کرتے ہیں ہمارے دور کے اُس عام رجحان کی جس کی وجہ سے آج کل کسی کو اپنے محبوب شاعر یا نثر نگار کے شاہکاروں کے مطالعہ کی بھی فرصت نہیں - اسی وجہ سے چند صفحوں میں موتی موتی باتیں بتادینے کا فن آج کل بہت عام ہوگیا ہے اور اس کا مظاہرہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہو رہا ہے - یہ طرز مفید بھی ہے اور مضر بھی - بہر حال اس کتاب میں مختلف شعرا کے کلام کا نمونہ جو اکثر ایک دو شعر سے زیادہ نہیں' اور چند تمہیدی کلمات ' مل جائیں گے —

انتخاب عام طور پر اچھا ہے ' اس لیے کہ اُس میں کہیں شاہراہ عام سے گریز نہیں کیا گیا - مشہور مشہور اشعار دئے گئے ہیں کتابت و طباعت اچھی ہے —

(س)

" مینوئل خط شکستہ اردو " -

(برائے امتحان ہائی اسکول ممالک متحدہ آگرہ و اودھ)

محترم ہندو بھائیوں کے زبان و دہان اور دست و قلم نے جس طرح مشترکہ زبان اردو یا ہندوستانی کے بناو ' سنوار اور پرچار میں زیادہ حصہ لیا ہے اسی طرح اُن کے مطبع " نول کشور " نے اس زبان کی بنیادی

ترقی و اشاعت میں ہندو مسلمان دونوں کا ہاتھ بٹایا ہے جس سے کسی کو انکار نہیں اسی مطبع سے ایک مجلد تصنیف مندرجہ عنوان مطبوعہ سنہ ۱۹۳۶ ع صفحہ ۱۵۸ قیمتی ایک روپیہ ۲ آنے نہایت خوش خط و خوش نما بابو کیسری داس سیٹھہ سپرنٹنڈنٹ کے زیر اہتمام شایع ہوئی ہے -

اس کتاب میں عربی فارسی کے فن کتابت پر قسم قسم کے خطاطی نمونے اور عجیب و غریب طغرے نہایت قرینہ اور سلیقہ سے جمع کیے گئے ہیں —

اس فن خاص کے نامی گرامی موجد اور ماہر و مشاق کی مفصل فہرست بھی درج ہے ہر ایک خطاطی کا نام معہ اصول و ضابطہ نہایت وضاحت سے ظاہر کیا گیا ہے ' تعلیمی اصول کے تحت اردو شکستہ خط کی مناسب مشقیں بھی دائم کی گئی ہیں خطوط ' لین دین ' بیوپار اور سرکاری کارروائی کے طرح طرح کے ضروری اور کار آمد نمونے شکستہ خط اردو میں دیے گئے ہیں —

اس کے علاوہ یہ کتاب فن کتابت پر ایک اجمالی تاریخ ہے کتاب کا اصل موضوع کتب ' اردو ' خط شکستہ ہے جس کے مختلف اقسام خط ' سادہ ' خط ' دیوانی ' خط ' محرّف ' خط ' شفیعا میز ' وغیرہ بتلاتے ہوے تعلیمی نقطۂ نظر سے اس کے قواعد و ضوابط بھی درج کردیے ہیں --

معقول دلائل و شواہد سے یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ اس فن (خط شکستہ) کی ایجاد و مہارت میں ہندو مسلمان دونوں برابری کے حصہ دار ہیں چنانچہ اس خصوص میں شاہ جہانی وزیر اعظم سعد اللہ خاں اور چندر بھان برہمن کو ہم عصر اور ہم سواد بتلایا گیا ہے بلکہ مشاہدہ کے وثوق پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ خط شکستہ کی مہارت میں ہندوؤں

کو نسبتاً خاص امتیاز حاصل ہے اس میں بھی برہمنوں اور کایستھوں کا درجہ خاص الخاص ہے —

حسن اتفاق سے یہ ایجاد (خط شکستہ) جو ہندو مسلمان دونوں کی متحدہ بنیادی جد و جہد اور عملی اشتراک کا انجام کار ہے دراصل یہ بنیادی اتحاد عہد اکبری کی ایک نہ مٹنے والی یادگار ہے اسی کی توثیق میں آگے چل کر جو زبانی اتحاد ہوا ہے وہ شاہ جہانی یادگار ہے —

بلحاظ ترتیب "نوشت و خواند" ہندوستان میں مشترکہ زبان "ہندوستانی" سے پہلے مشترکہ کاروباری رسم خط 'ہندوستانی' تیار ہو گیا اس لیے اس مشترکہ خط اور زبان پر یا تو ہندو مسلم "ہندوستانی" یا فقط "ہندوستانی" کا اطلاق ہوگا نہ کہ علحدہ علحدہ ہندو پانی ' مسلمان پانی کی طرح ہندو "ہندوستانی" اور مسلم ہندوستانی یا اردو "ہندوستانی" اور ہندی "ہندوستانی" کہا اور سمجھا جائے گا —

ہاں ہندو مسلم قوموں کے دماغی و مادی اشتراک نہ ہونے کی صورت میں خط یا زبان کا مفہوم کسی ایک پانی کی تعریف میں داخل ہوجائے گا -

جس ضرورت کے تحت خط شکستہ کی ایجاد ہوئی ہے ابتداً وہی ضرورت زود نویسی اس کی مختصر نویسی کی باعث ہوئی ہے لیکن جب اس نستعلیقی آرائش نے اس کی تیزی کو مدھم کردیا تو پھر ضرورت یہ محسوس ہوئی کہ ہر دو خوبیاں 'خوشنویسی' اور 'زود نویسی' اس میں پائی جائیں تو نستعلیقی ضوابط کے ساتھ قلم کے قط کی طرح اس خط کو بھی شکستہ کردیا گیا' اس لیے اس کتاب میں یہ بجا طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ "ہر چند کہ خط شکست کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر شخص خط شکستہ لکھ سکتا ہے مگر یہ رائے غلط ہے - جس وقت تک

کہ قواعد نستعلیق سے کامل واقفیت نہ ہو اس وقت تک شکستہ خط صحیح نہ ہوگا کیونکہ عہد اکبری میں خط نستعلیق اور تعلیق کو ملا کر شکستہ ایجاد کیا گیا ہے" —

دلیل مذکورۂ بالا کی تصدیق خود اس خط شکستہ کی 'نوشت و خواند' کے تجربہ سے بخوبی ہوسکتی ہے کہ جس میں پہلی شکل (نوشت) رواں ہے تو دوسری صورت (خواند) کی دواں ورنہ جو شکستہ خط کہ طبعی ہوتا ہے وہ تیز لکھا جاسکتا ہے مگر خوش نما ہوتا ہے نہ صحیح پڑھا جاتا ہے بلکہ موسیٰ لکھے خدا باچے کا مصداق ہوتا ہے —

اس کا صحیح تجربہ تو عدالتی اجلاسوں کی قلمی تجاویز کی نقل کے وقت ہوتا ہے کہ بیچارے نقل نویس خاصی عمر صرف کرنے پر بھی حرف شناس نہیں ہونے پاتے کیونکہ پہلے حاکم کے طبعی شکستہ خط کی حرف شناسی ابھی قابل اطمینان نہیں ہونے پاتی کہ دوسرا نیا حاکم آپہنچتا ہے - " ہر کہ آمد عمارت نو ساخت " کبھی یہ دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے کہ خود مجوز صاحب بھی اپنے طبعی خط کی حرف شناسی میں ناکام رہے کیونکہ ایسی شکستہ نویسی کسی ضابطہ کی پابند نہیں ہوتی۔

اس لیے مناسب ہوگا کہ مبذول خط شکستہ اردو زیر تنقید کا امتحان جو ہائی اسکول کے لیے مخصوص ہے وہ ہائی کورٹ کے لیے بھی مشروط کردیا جائے کیونکہ دستور جدید کے تحت آئندہ ہندوستان کی تمام عدالتوں میں ناگری ' اردو یعنی دونوں رسم خط جاری رہیں گے —

کسی سیاسی مقصد یا اسی زود نویسی کے مد نظر مرہٹہ پیشوائی راج میں بھی بالبودھ کا شکستہ خط "موڑی" (شکستہ) کے نام سے جاری ہوا تھا جو فائز مرام نہ ہوسکا - کیونکہ اردو یا فارسی کی شکستہ نویسی

تو مختصر نویسی کے بعد وجود میں آئی ہے اس کا قلمی ذخیرہ نقش و نگار ہندو مسلم قوموں یا وسط ایشیا کے بچھڑے اور بکھرے ہوئے تانڈوں کی متحدہ یکجائی اور اُن کی مشترکہ دستکاری کے مظاہرہ کی ایک ناقابل فراموش عہد اکبری کی یادگار ہے نہ کہ زبردستی کی المہ اکبر —

اسی کی ایک ادھوری نہ نقل اور زبردستی کی رام رام بالبودھ یا دیوناگری کی موزوں (شکستہ) ہے جو ہندو پانی کی تعریف میں داخل ہو کر 'ہندوستانی' کے مقابل ہندو 'ہندوستانی' شکستہ خط متصور ہوسکتا ہے -

---

قاعدہ

تعلیم بالغاں -

(مولفہ ایس - ایم شاہ ولی صاحب یمینی بی - اے آنرز
ہیڈ ماسٹر گکھڑ (پنجاب))

اس کا مقصد یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ "جوانوں اور بوڑھوں کو صرف دو ماہ میں، اردو پڑھنا سکھادے" اسی لیے جس اصول پر یہ قاعدہ لکھا گیا ہے وہ اصول ہے 'پڑھو اور پڑھاو' (ص ۳) -

یہ قاعدہ طریقہ تعلیم ترکیبی پر نہیں لکھا گیا جو بچوں کے لیے مخصوص ہے بلکہ عمر اور سمجھ بوجھ کے لحاظ سے طریقہ تعلیم تحلیلی پر لکھا گیا ہے یعنی حرفوں سے الفاظ اور الفاظ سے عبارت تک پہنچنے کے بجائے عبارت سے الفاظ اور الفاظ سے حروف کی شناخت طریق الصوۃ میں کرادی گئی ہے پھر پڑھے ہوے الفاظ کے مختلف اجزا کی ترکیب سے یا جدید سابقہ یا لاحقہ کے ذریعہ مزید نئے الفاظ کا اضافہ کر دیا گیا

ہے اخیر پر تمام آموختہ الفاظ سے مشقی جملے بنائے گئے ہیں —

اس طریقہ تحلیلی کے مد نظر عام استعمالی الفاظ کو بنیاد (مفردات) قرار دیتے ہوے طریق الصوۃ کے ذریعہ تین کہانیوں میں چوبیس اسباق کا سلسلہ قایم کیا گیا ہے اس کے علاوہ (۱۲) صفحوں پر ضروری اور کار وباری روزمرہ کی تحریرات ہیں —

دیباچے سے ظاہر ہے کہ اس کی کامیابی میں جو کچھہ تجربہ ہوا ہے اس کی توسیع پنجاب کے مختلف دیہات میں ہونے والی ہے ' اگر اس تجربے میں کامیابی ہوجائے تو یہ قاعدہ ضرور اس قابل متصور ہوگا کہ اس کا رواج پنجاب کے باہر بھی ہو کیونکہ فی الحال اس سعی و عمل کی سخت ضرورت ہے —

یہ قاعدہ خوش خط ' جلی قلم - تقطیع مناسب - چھپائی صاف ستھری حجم (۵۱) صفحے - قیمت درج نہیں -

چند امور مولف صاحب کی نظر ثانی کے محتاج ہیں :

۱ - حرف کی آواز کے مستقل عنوان کے محاذی اسباق مقررہ کے تحت جن حروف کی شناخت طریق الصوۃ کے ذریعہ کرائی گئی ہے ان کی تعداد (۲۴) سے زیادہ نہیں حالانکہ ما بقی متعدد حروف کا استعمال قاعدہ کے اسباق میں ہوا ہے برخلاف اس کے جن اسباق کے تحت ' شین ' اور ' غین ' (ش ' غ) حروف کی شناخت کرائی گئی ہے وہ اسباق حروف مذکورہ کے استعمال سے بالکل خالی ہیں شناخت کے بعد بھی ان حروف کا باقی اسباق میں بالکل استعمال نہیں - (سین یا شین) کی دوسری آسان لمبی (ــس) شکل کا بھی قاعدہ میں کہیں استعمال نہیں —

جس سبق کے تحت حرف 'ی' کی آواز کی شناخت میں الفاظ کی فہرست دی گئی ہے اس میں اور سبق متعلقہ میں بصورت لاحقہ صرف یای معروف کے الفاظ میں جیسے دادی' گالی وغیرہ باقی مختلف اشکال کا استعمال نظر انداز ہے اس کی ابتدائی اور درمیانی حرفیت کے مختلف اشکال کی نمایش بھی غیر ضروری سمجھی گئی قریب قریب یہی حال حرف 'واو' کی آواز کی شناخت کا ہے جس میں 'واو' کی حرفیت اور حرفانیت (اعرابیت) کے جداگانہ امتیاز میں کوئی استعمالی تصور نہیں دلایا گیا —

اسی طرح (ہ) 'ہا' کی حرفیت اور حرفانیت اور اس کی لاحقہ صورت ہونے میں اس کے غیر معمولی تغیر پذیر استعمال کا تصوّر دلانے کے لیے کوئی تعلیمی سبق قایم کیا گیا ہے نہ کسی سبق میں یا اس کے تحت اس الفاظی فہرست میں جو شناخت آواز کی خاطر التزاماً قایم کی گئی ہے اس کا تصور دلایا گیا ہے حتیٰ کہ قاعدہ کے جملہ اسباق میں چھوٹے سے چھوٹا استعمالی لفظ 'کہہ' اور 'کہ' (امر واحد اور کاف بیانیہ) ... ... اور بمقابلہ ('وہ' اور 'وہ'' یہہ' اور 'یہ' کہیں پایا نہیں جاتا اس طرح اسی قاعدے کے عناصر (حروف مفردہ) کا اجتماع کہیں نظر نہیں آتا - یہی حال حروف ہندی و عربی ('ڑھ' - 'لھ' - 'مھ' - 'نھ' - 'ط' - 'ظ') اور الفاظ کہا' کہوں - سوامی - خود وغیرہ کا ہے کہ کسی سبق یا اس کے تحت شناخت آواز کی الفاظی فہرست میں ان کا مطلق استعمال ہی نہیں ہوا —

۲ - اس قاعدے کا رسم خط کسی اصول کے تحت قایم نہیں : —

پیار، پیاس وغیرہ الفاظ میں پہلے حرف ساکن کو مکسور لکھا گیا ہے :—
"پِیار، پِیاس"

الفاظ مندرجۂ ذیل بلا لحاظ امتیار تلفظ ایک ہی رسم خط میں لکھے گئے ہیں جو سب کے سب اسم ہیں :—
ماؤں، پاؤں، گاؤں، بھاؤ، تائی - تیکہ، چیچک ایک لفظ گیا ہے، ہونا کا ماضی = (ہُوا) یہ علامتوں کے ہجوم میں خواہ مخواہ ہوّا بن گیا ہے - حالانکہ اسی کے ساتھہ اس کی جمع کا لفظ بھی موجود ہے جو اتنا گودڑ نہیں :- (ہوے)

صفحہ ۳۵ پر پان دان کے ساتھہ خاندان کو پان دان کی طرح 'خان دان' لکھا گیا ہے یہ اسی اصول کے تحت کہ "پڑھو اور پڑھاؤ" جس سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ قاعدہ "نوشت و خواند" کے پہلے جزو کی تعلیم سے بالکل بری الذمہ ہے یا اس کی تعلیم اس کے مقصد سے خارج ہے لیکن بلحاظ تجربہ اور اصول تعلیم کے ایسی خواندگی اور اس کی تعلیم "نقش بر آب" متصور ہوتی ہے —

سخنوران ایران در عصر حاضر - جلد دوم -

مولفہ جناب پروفیسر محمد اسحاق صاحب کلکتہ یونیورسٹی

چار پانچ سال پہلے جناب پروفیسر محمد اسحاق صاحب نے جو کلکتہ یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر ہیں اس سلسلہ کی پہلی جلد پیش فرماکر ملک کے فارسی دان طبقہ کو مرہون منت کیا تھا - وہ جلد نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں بھی بہت مقبول ہوئی، اور فاضل مولف کو وزارت معارف ایران کی طرف سے "نشان علمی" عطا

ہوا۔ زیر تبصرہ جلد کی اشاعت میں کسی قدر تاخیر ضرور ہوئی ہے، جو یقیناً اُن ارباب ذوق کو شاق ہوئی ہوگی جو اس لاجواب سلسلۂ تالیفات کو جلد از جلد مکمل دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن اس تھوڑی سی تعویق نے اس جلد کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے، اس دوران میں 'ایران' نے "جشن ہزار سالہ فردوسی" ترتیب دیا تھا، اور حکومت ایران کی دعوت پر فاضل مولف نے بھی اس میں شرکت فرمائی تھی۔ اس با موقع سیاحت سے انھیں عصر حاضر کے ایرانی سخنوروں سے ملاقات کرنے، اور ان کے حالات اور ان کا کلام خود انھی سے حاصل کرنے کا جو موقع ملا، اس نے جلد زیر تبصرہ کی قدر و قیمت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ جلد اول ۳۳ شعراء کے حالات پر مشتمل تھی۔ جلد زیر تبصرہ میں ۱۵ شعرائے عصر حاضر کے حالات مع ان کے کلام کے نمونوں اور تصویروں کے، موجود ہیں، طباعت اور تہذیب کا معیار بھی پہلی جلد کے مقابلہ میں کچھہ بلند ہی ہے، اور مطبع جامعہ ملیۂ دہلی، اس پر جس قدر فخر کرے بجا ہے —

جلد اول کی طرح، جلد زیر تبصرہ بھی انگریزی اور فارسی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ فارسی حصہ میں آقائی میرزا محمد علی خان ' فروغی ' ذکاء الملک سابق وزیر اعظم ایران کا "سر نامہ" اور خود جناب مولف کا "مقدمہ" ہے۔ انگریزی حصہ میں فاضل مولف کے مختصر دیباچہ کے علاوہ، سرتیج بہادر سپرو کا نوشتہ پیش لفظ ہے اور خود قابل مولف کا انگریزی مقدمہ بھی ہے جس میں متذکرہ شعرا کے مختصر حالات بیان کئے گئے ہیں، اور آخر میں جدید ایرانی شاعری کے عام رجحانات پر مختصر مگر جامع انداز سے تبصرہ کیا گیا ہے۔ کتاب کو انگریزی اور فارسی کے دو حصوں میں منقسم کرنے سے اس کی افادیت بہت بڑھ گئی

ہے - شعرا کے تذکرے فارسی میں ہیں ' اور ایسی پاکیزہ ' جدید فارسی میں کہ خود اہل زبان بھی اس کی بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہوگئے ہیں - فارسی حصے کے آخر میں ان اشخاص 'مقامات ' قبائل اور ملل کی ' جن کا ذکر کتاب میں آیا ہے ' مکمل ہجائی فہرستیں نہایت سلیقہ کے ساتھہ مرتب کر کے شریک کی گئی ہیں - ہندوستان صدیوں تک فارسی تہذیب اور فارسی شاعری کا خوشہ چیں رہا ہے - اس کی طرف سے یہ ارمغان عقیدت جو فاضل مولف نے ایران جدید کو پیش کیا ہے ایک حد تک ان احسانات کا بدلہ ہے —

جلد اول کی طرح اس جلد کی تالیف میں بھی فاضل مولف نے یہ اصول پیش نظر رکھا ہے کہ صرف شعرائے عصر حاضر کے مختصر حالات بیان کر دیے جائیں اور ان کے کلام کے چیدہ نمونے پیش کر دیے جائیں - کلام کی تنقید یا شعرا میں سے ایک کو دوسرے پر تفوق دینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے - بقول ان کے : —

" چوں در ایں کتاب از سخندران عصر حاضر سخن رانده می شود ' سزاوارتر آں دید کہ در طرز تالیف آں روش اخیر را بر گزیند و مبحث انتقادی را بہ دیگراں و اگزارد

... ...

مابدون اینکہ ' اشعار ایں را بہ آں سنجیم ' و آں را بر ایں ترجیح نہیم ' بہتریں اشعار ہر یک را بر گزیدہ درج کردہ ایم " —

زیر تبصرہ جلد میں عصر حاضر کی ایرانی شاعری کے جو نمونے سامنے آتے ہیں ' وہ عام خصوصیات کے اعتبار سے ویسے ہی ہیں

حصے جلد اول میں پیش کیے گئے تھے' وہی قدامت اور جدت کی کشمکش' وہی خیالات کی بے چینی' وہی وطنیت' بقول حالی کہیں "پیالے وہی ہیں' لیکن شراب اور ہے" اور کہیں پیالے بھی بدلے جا رہے ہیں نئے اصناف سخن مثلاً تصنیف (Ballad) اور نئی طرز کے مسمّط لکھے جاتے ہیں اگرچہ پرانے اصناف سخن' غزل' قطعہ' رباعی' مثنوی' اب بھی اسی طرح رائج اور مقبول ہیں' لیکن موضوعات سخن بدلے ہوے ہیں' 'پردہ' 'تعدد ازدواج' 'مناظر قدرت' 'آزادی نسواں' 'اتحاد لباس' 'ورزش' 'انتخاب رفیق' 'ثروت طبقۂ ایران' 'کشاورزی' 'حمام عمومی' — غرض کہ ایرانی معاشرت کے جملہ مسائل' ایرانی شعر میں بھی زیر بحث آتے ہیں - جو حضرات شاعری کو فن لطیف سمجھتے' اور اسے "محض بحیثیت فن لطیف" دیکھنا چاہتے ہیں وہ شاید ایرانی شاعری کی اس افادیت پسندی سے منغض ہوں' لیکن کیا کیا جاے' شاعری بہر حال احوال ملت کا آئینہ ہوتی ہے' اور جس کشمکش سے ملت ایرانی دو چار ہے' اس کا اثر ایرانی شاعری پر بھی پڑنا فطری اور ضروری ہے - ایرانی طبائع شعر و شاعری میں ڈوبے ہوے ہیں' اس لیے وہاں ابھی تک "پیشہ ور شعراء" کا طبقہ' مع "پیشہ کی پنچایت" اور "اصطلاحات پیشہ" پیدا نہیں ہوا ہے - وہاں ہر قسم کے لوگ شعر کہتے ہیں' وزراے دولت' اعیان سلطنت' افسران فوج' علماء' ملوک التجار سب ہی صف شعراء میں موجود ہیں —

اکثر و بیشتر حکمت مغرب کے خوشہ چیں ہیں' کچھہ ایسے ہیں جنھوں نے اپنے سیاسی عقائد کی پاداش میں قید بھی بھگتی ہے زیادہ تر نوجوان ہیں۔ ان سب کی تصویریں دیکھئے تو شبہہ ہوتا ہے کہ کیا یہ وہی ایرانی

ہیں جن کا تخیل ہمارے ذہنوں میں صدیوں سے موجود ہے؟ دو شاعرہ خواتین کا حال بھی اس کتاب میں موجود ہے، ایک تو " خانم پروین اعتصامی" اور دوسری " فصل بہار خانم جلمت " ان کا از سرتاپا انگریزی لباس جدید ایرانی تمدن کے انقلاب کا پتا دیتا ہے - جیسا کہ خود فاضل مولف نے اپنے انگریزی مقدمے میں بیان کیا ہے - جلد اول کی طباعت کے وقت ان میں سے ایک خاتون نے ہزار منت سماجت کے باوجود اپنی تصویر دینے سے انکار کر دیا تھا، لیکن ایک سال بعد خود اپنی خوشی سے انھوں نے تصویر بھیج دی، اور اس کے شایع کرنے کی اجازت دی! عرض کہ ایک پوری ملت نیا جنم لے رہی ہے، اور بیداری اور آزادی کی نئی ہوا میں سانس لینے کے لیے بے چین ہے —

پروفیسر براؤن آنجہانی نے تاریخ ادبیات ایران جلد چہارم میں ایک موقع پر شکایت کی تھی کہ قدماء کے کلام میں ایسے اشارے جن سے ان کے زمانے کے معاشری اور سیاسی حالات پر روشنی پڑے ڈھونڈے بھی نہیں ملتے، آج کل اس بارے میں کسی کو کوئی وجہ شکایت نہیں ہو سکتی - عصر حاضر کی ایرانی شاعری احوال ملّی کا آئینہ ہے، اور پوری قوم اس آئینے میں اپنا عکس دیکھتی، اور بناؤ سنگھار کی کوشش کرتی ہے - دورۂ انقلاب کی شاعری جو ناصرالدین شاہ قاچار کے زمانے سے شروع ہوکر قیام مشروطہ تک نظر آتی ہے پھر بھی ایک حد تک وقتی اور عارضی تھی، اس پر سیاسیات کا عنصر بہت غالب تھا، اس لیے وہ جلد جلد کروٹیں بدلتی تھی، لیکن اب دورۂ استقلال ہے - سیاسی بنائیں استوار ہوچکی ہیں، معاشری مسائل حل طلب ہیں - " اس لیے ترانہ ملی " اب " جارحانہ " نہیں ہے - اب اس کی تانیں

"بزن ! بزن !! کی بجاے بساز ! بساز !! پر توتتی ہیں - بقول مرزا حسین خاں دانش اصفہانی : —

تو آم شد انقلاب ابا جشن پہلوی ایلک دو عہد فرخ صوری و معنوی
بر ساز بزم عیش ، کہ نوروز و انقلاب بستند بر جہان کہن زیور نوی
من مژدہ ات ززندگی جاوداں دہم داری اگر توپاے دریں رہ کہ میروی

جدید ایرانی شاعری کا وہ حصہ جو تبلیغی اور معاشری ہے اب تک کسی قدر نیم پختہ ہے ، لیکن پختگی کی کوشش بھی نمایاں ہے - مثال کے طور پر "پردہ" کے مسئلہ کو لیجیے ، یہ مسئلہ ایران اور ہندوستان میں ایک حد تک مشترک تھا - ہندوستانی شعراء میں سے بعض نے ترک پردہ کی مذمت توکی ، لیکن کسی شاعر کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس کی تائید میں زبان کھولے ، ایران میں مخالف اور موافق دونوں آراء کے نمائندے صف شعراء میں موجود ہیں - جلد زیر تبصرہ میں کم از کم دس شعراء ایسے ہیں جنھوں نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے ، بعض مثلاً "پژمان" ایسے ہیں جو مغربی رو میں بہ گئے ہیں اور پردے کو بیخ و بن سے کھود ڈالنا چاہتے ہیں ، بعض مثلاً مرزا حسین خاں دانش اصفہانی ، پردہ شکنی کی یہ شدت گوارا نہیں کرتے اور اس طرح زبان طعنہ دراز کرتے ہیں :—

اُفتاد پردہ از حرم عصمت زناں امروز مرد و زن ہمہ باہم چریدہ اند
چوں شیر مادہ حملہ بہر رہگزر کنند وقتے اگر بخانہ چو موشاں خزیدہ اند

'دانش خراسانی' کی پردہ شکنی کی تبلیغ کسب علم و فضل کی تلقین کے ساتھہ ہے :—

حب وطن پیشہ کن و مردمی میہن خود دار گرامی ہمی
بہ کار بہ مرداں ہم دوش باش با ہنر و فضل ہم آغوش باش

'شاہزادہ محمد ہاشم میرزا افسر' کی نظر اس بارے میں زیادہ حکیمانہ اور حقیقت شناس ہے —

گفتم بزنے رخ نکشائی زچہ روے ؟ خوش نیست رسر بروں کن ایں عادت وخوے
گفتا پوشم زچشم بد' روے نکوے
زن بود گر ایمن زنظر بازیٔ مرد نے پیچہ برخ داشت' نہ روبند' نہ کرد
گر چارہ تواں چارۂ آں باید کرد !

راقم سطور ہذا کی راے میں جدید ایرانی شاعری کا وہ حصہ جو مناظر قدرت سے متعلق ہے ادب میں ایک پائدار اور جمیل چیز ہے' اور اس وقت بھی باقی رہے گا جب معاشرت کے مختلف فیہ مسائل حل ہوجائیں گے' اور جس قسم کے اشعار اوپر نقل کیے گئے وہ محض تاریخی حیثیت کے ہو جائیں گے - طبع لطیف ایرانی منظر نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتی' جلد اول کے تبصرہ میں "رشید یا سمی" کے بعض اشعار نقل کیے گئے تھے - جلد زیر تبصرہ میں مرزا یحیی خان 'ریحان' میرزا صادق خاں 'سرمد' میرزا لطف علی خاں 'صورتگر' مرزا عبدالحسین خاں 'احمدی' بختیاری کے اشعار یورپی شعراء کی بہترین "نیچورل شاعری" سے کسی طرح کم نہیں ہیں - اُن کا موقلم ہر لحظہ بدلنے والے الوان فطرت کو اس چابکدستی کے ساتھ اشعار میں جذب کرلیتا ہے کہ وہ "گلہاے ہمیشہ بہار" بن جاتے ہیں' اور 'ورق زورتھ' کے "ڈیفوڈلس" کی طرح جب کبھی پردہ تخیل پر منعکس ہوتے ہیں

تو تخیل لہرا اٹھتا ہے ، اور جھومتے والے پھولوں ، اور لچکنے والی ڈالیوں کے تال پر ناچتا ہے: احمدی " افکار یک شب تابستان " میں کہتا ہے :

پروردہ چنیں لطیف و رعنا	ایں برگ قشنگ را طبیعت
بنہادہ دریں جمال زیبا	ایں جلوہ و ناز را ودیعت

تا آنکہ بخویش گل بہ بالد
ویں بلبل بے نوا بنالد

اے برگ گل از کجانہانی	شد باتو نسیم صبح محرم
فاش است میان باغ ، دانی	ایں بوسہ کہ دادہ بہ شبنم!

انکار تو موجب فسوس است
کایں سرخی گونہ جاے بوس است

' سرمد ' کی نظم " آئینۂ فلک ' کے دو بند ملاحظہ ہوں :

از نقش اختران	ایں سقف لاجورد
سرخ و سفید وزرد	چوں خیل دختران

هر یک بروے باز
ناز و کرشمہ ساز

پہناور فلک	چوں بحر بیکران
قرص قمر بتک	کشتی صفت دران

و آنرا کہ ناخداست ؟
ایں قصہ با خداست -

صورتگر ' کی نظم ' دریا ' کی ' روانی ' اور تشبیہات ملاحظہ ہوں :

ز آنچہ پوشند دختران ظریف	هیچ بر تنش جز پرندے نہ

و آں دو نازندہ ساعدین لطیف   هیچشان ناز دست بندے نہ
نہ پزیرفتہ بار پیراهن   شانہ و سینہ بلوریش
و آں دل افروز چہرہ روشن   غازہ هرگز ندادہ آذینش

کشتی دریا میں بہتی ہوئی چلی جارہی ہے، یہاں تک کہ اب بالکل سکوت کا عالم ہے۔

هرچہ بیش از کنارہ دور افتد   وز بشر و آں هم تکاپوشان
بهر ما بیشتر فرو خفتند   جنبش و کوشش وهیاهوشان
تا بدآن جاکہ آن خموشی را   نشکند جز نوائے دل کش آب
موج رقاص پردہ پوشی را   بفگند برفراز خاک حجاب

کشتی میں سوائے شاعر اور اس کے 'دلبر' کے اور کوئی نہیں ہے لیکن عاشقانہ گرمجوشی اور والہانہ اختلاط کی اس منظر میں گنجائش نہیں ہے —

دوش بر دوش هم نشستہ بر آب   گرم عشقے کہ خالی از هوس است
دوستی جو، و شادمانی یاب،   فارغ از آنکہ در زمانہ کس است
گیسوان معنبرش از ناز   بار بنهادہ روے شانہ من
کردہ گاهے سوالهاے دراز   از دیار من و ز خانۂ من
کہ چگونہ است کشورے کہ در او   پرورش کردہ سعدی و خیام؟
بر نهشتہ جهان کشور جو   نام وے را بہ دفتر ایام؟

نصرت اللہ خان کاسمی 'نصرت' کی نظم "یک ستارہ" ملاحظہ ہو یہ 'ناصر خسرو' کے مشہور قصیدے "اے گنبد گردندۂ بے روزن خضرا" کے طرز پر ہے۔ شاعر فراز آسمان پر ایک ستارے کو دیکھتا ہے، جو کبھی لرزتا ہے، کبھی طلوع ہوتا ہے، کبھی غروب ہوتا ہے اس سے سوال کرتا ہے۔

آرام نگیری زچہ در جائگہ خویش — گاہے بہ نشیب اندری و گاہ بہ بالا؟
دل باختۂ کیستی اے دختر گردوں — کز غم نبود دلت یکے لحظہ شکیبا؟
گر باختۂ دل بہ فلک پس چہ ہر شب — بر روے زمین دو ختۂ دیدہ جویا؟
گر باختۂ دل بزمین خود زچہ نآی — از جائگہ خویش یکے بار بدیں جا؟
یا آں کہ ترا گم شدہ دل دار و ندانی — دلدار ترا ہست کجا مسکن و ماوا؟
یا دانی و خواہی کہ نداندش دگر کس — تا رہ نبرندش کسی ایں کار بعمدا؟

مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ قیاس نہ کرنا چاہیے کہ آج کل کی ایرانی شاعری میں عشقیہ اور تصوفانہ غزل کی گنجائش نہیں ہے - غزل اب بھی ایرانی شعر کا جزو اعظم ہے، لیکن اس کے خیال کے سانچے بدل گئے ہیں، تصوف اب بھی ایرانی طبیعت پر غالب ہے لیکن اب اس میں اصطلاحی دقت پسندی کی جگہہ سادگی آگئی ہے۔ 'عبرت' نائینی کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں —

چوں نور کہ از مہر جدا ہست و جدا نیست — عالم ہمہ آیات خدا ہست و خدا نیست
ما پرتو حقیم و نہ اوئیم و ہم اوئیم — چوں نور کہ از مہر جدا ہست و جدا نیست
ہر جا نگری جلوہ گہ شاہد غیبی است — او را نتواں گفت کجا ہست و کجا نیست
در آئینہ بیند اگر صورت خود را — آں صورت آئینہ شما ہست و شما نیست
از جانب ما شکوہ و جور از قبل دوست — گر نیک ببینیم خطا ہست و خطا نیست

بے مہری و لطف از طرف یار نہ 'عبرت'
از چیست ندانم کہ روا ہست و روا نیست

جلد اول کے تبصرے میں راقم الحروف نے اس امر پر اظہار افسوس

کہا تھا کہ اکثر ایرانی شعرا کا کلام عرب اور عربی تمدن کی مخالفت میں ڈوبا ہوا ہے، اور ان چیزوں پر علانیہ تبرا بازی ہوتی رہتی ہے، خوشی کی بات ہے کہ اس جلد میں ہمیں کسی شاعر کے کلام میں یہ چیز نہیں ملتی، اور یہ غالباً نتیجہ ہے ان خوشگوار سیاسی تعلقات کا جو رضا شاہ پہلوی کے حسن تدبّر کی بدولت مختلف دول اسلامی کے مابین قائم ہوگئے ہیں - بعض شعرا کے کلام میں "زرتشتیت" کی جھلک کہیں کہیں نظر آجاتی ہے، خصوصاً 'پور داؤد' اور 'حسین دانش اصفہانی' کو اس بارے میں نہایت توغّل ہے، لیکن بحیثیت مجموعی اب یہ مذہبی تشکیک شعرائے عصر حاضر کے کلام میں نظر نہیں آتی - بلکہ بعض شعرا مثلاً 'دہقان' اور 'لاہوتی کرمانی' کے کلام میں تو جمال الدین افغانی مرحوم کی "پان اسلامزم" کی جھلک بھی نظر آتی ہے - علیٰ ہذا فارسی زبان کو عربی الفاظ سے "پاک" کرنے کی کوشش جس کا بیڑا "پور داؤد" اٹھائے ہوئے ہیں اب اتنی "جارحانہ" نہیں ہے، زبان کی سلاست اور صفائی کی طرف بے شک توجہ ہے، لیکن نہ اس حد تک کہ صدیوں کے اچھے پچھے عربی الفاظ کو نکال باہر کر کے ان کی جگہ غیر معروف "پہلوی" الفاظ داخل کیے جائیں - اب زیادہ تر توجہ زبان کی سادگی اور عمومیت کی طرف ہے - ایک ادارہ موسوم بہ "فرہنگستان" سرکاری طور پر قائم ہے جو خالص ایرانی لغات کی تدوین کر رہا ہے، ان کوششوں پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا - 'ہادی حائری' نے ایک نظم "خزانیہ" لکھی ہے، اس میں آپ کو نہ عربی الفاظ کی بھر مار ملے گی اور نہ ژند واوستا کے الفاظ کو خواہ مخواہ رائج کرنے کی کوئی کوشش نظر آئے گی، پوری نظم نہایت سلیس اور شگفتہ فارسی میں ہے، اور اصل

میں بھی سلامت اور شگفتگی آج کل ایران کی لسانی تحریکات کا مقصود ہے ' اور اس پر کسی کو مجال حرف گیری نہیں ہوسکتی —

باز شد پدید در جہاں خزان ' شد تہی زبرگ شاخ گلستاں
نو شگفتہ گل از میان باغ ' پشت پردہ رفت ' کرد رخ نہاں
گشتہ بے نگار سر بسر زمین ' خندہ را شدہ گریہ جانشین
رفت از میاں باد فرودیں ' چہرہ شد بران باد مہرگان

... ...

خواہی ار رسی ' در جہاں بکام ' کن بروں زسر نام ننگ و نام
بادہ کہن ' نوش کن بجام ' یاد خاک جم ' کشور کیاں
لشکر خزاں چونکہ رو نمود رفت نوبہار از میانہ زود
گفت بے درنگ ' ' ہادی ' ایں سرود ' بہر دوستان ' بردار مغان

جب تک خاص طور پر کوشش نہ کی جاے معلوم بھی نہیں ہوتا کے یہ اشعار عربی الفاظ سے خالی ہیں - کاش خالص " کھلی ہوئی " اردو میں بھی ایسی ہی نظمیں زیادہ نظر آئیں —

اخیر میں ہم جدید ایرانی ظرافت کا ایک نمونہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں ' دیکھئے ' قلزم ' نے " دلبر غرب کی " " ٹھنڈی گرمیوں " اور " تجارتی " ناز و ادا اور بدلنے والے فیشن کی تعریف میں بحر فکر سے کیسی کیسی نئی تشبیہیں نکالی ہیں ہمیشہ کی طرح آج بھی ظرافت ایرانی خمیر میں داخل ہے "

در غرب دیدم دلبرے از دلبر کنگو (*) بتر
در دل ربودن ماہرے ' از دزد شیکا گو (†) بتر

(*) کانگو (افریقہ) - (†) شکا گو (امریکہ) -

یک لحظہ گرم و آتشیں گیرا تر از کوہ وزو (*)
یک بار ہم سرد و خنک از دشت اسکیمو (+) بتر

گہ در تبسم بالبے نازکتر از شوخ حبش
گہ چین نخوت بر جبین از لعبت توکیو (‡) بتر

یک وقت با زلف عجب کوتاہ تر از ریش بز
یک روز باموے دراز از دم ہر یابو بتر

گفتم بفرما کیستی، دیوی، پری ای، چیستی؟
کز نسل انساں نیستی اے یار از لولو بتر

فرمود من آزادہ ام، شوخے تمدن زادہ ام
من شرقی اخمو نیم از زنگی کج خو بتر

گفتم تمدن زادہ جان، قربانت اے آزادہ جان
نے شرق نے غرب ایں بہ آں، او از تو تو از او بتر

شرقے جہالت پرورد غربے رذالت گسترد
وین ہر دو نکبت آورد از نکبت جادو بتر

ہم 'سخنوران ایران در عصر حاضر' کی اس وجہ سے اور زیادہ قدر کرتے ہیں کہ ہم اسے جدید ایرانی ادبیات کا اردو ادبیات کے نام ایک تازہ پیام سمجھتے ہیں - ہماری ساری کائنات شعر قدماء ایران کی "قند پارسی" کی "شکر شکن" ہے - ان کے استعاروں سے ہمارا رنگ تغزل مستعار ہے، اُن کی تشبیہات و طرز ادا سے ہماری غزلیں مالا مال ہیں، لیکن

(*) وسوویس (کوہ آتش فشاں) - (†) قطب شمالی کا باشندہ -
(‡) توکیو، (جاپان کا دارالخلافہ) -

اب زمانہ بدل گیا ہے ' اور ہماری شاعری کی لے بھی پرانی ہوچکی ہے ' کیا تاریخ اپنا اعادہ نہ کرے گی ' اور کیا اردو شعرا ایک مرتبہ پھر "ایران جدید" کے نغمہ سنجوں کا تتبع نہ کریں گے ' ضرورت ہے کہ ہم بھی نوا پیرایان ایران کے ہمنوا ہوکر اپنے نغموں میں ویسی ہی تڑپ ' اور قیود و رسوم سے ویسی ہی بیزاری پیدا کریں - ہماری فکر رسا بھی اپنی جولانی کے نئے میدان تلاش کرے ' اور انتخاب موضوعات ' اصناف سخن ' تشبیہات ' سادگی بیان غرض کہ ہر جہت میں ویسی ہی جراءت رندانہ پیدا کرے تاکہ ہماری شاعری بھی ہماری قومی خصوصیات کی حامل ہو ' اور ہماری بیداری کا خود سبب بنے اور پھر خود ہی اس کا نتیجہ ہو جاے —

ہم فاضل مولف کو اس کتاب کی تالیف و اشاعت پر صمیم قلب سے مبارک باد دیتے ہیں - ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کا کوئی کتب خانہ ' اور کئی خوش ذوق کا ذاتی ذخیرۂ کتب ' اس کتاب سے خالی نہ ہوگا —

کتاب کلکتہ میں عبدالعلیم صاحب نمبر ۱۵۷ چاندنی چوک اسٹریت اور بمبئی میں ڈی - بی - تارپور والا ' کتاب محل ' ہارنبی روڈ سے مل سکتی ہے ' قیمت درج نہیں ہے ' لیکن غالباً بائیس روپیہ ہے ' جو کتاب کی اہمیت طباعت اور تصاویر کے مدنظر کچھہ زیادہ نہیں ہے —

ہمیں اس سلسلہ کی تیسری جلد کا ' جو ایران جدید کے نثر نگاروں کے حالات پر ہوگی بہت اشتیاق کے ساتھہ انتظار رہے گا —

متفرقات

معاشیات کے ابتدائی اُصول -

مصنفهٔ مسٹر پریم چند بی - اے (کھاتب)

جیسا که کتاب کے نام سے ظاهر هے مسٹر پریم چند پروفیسر معاشیات وی - بی کالج ڈیرہ اسمعیل خاں نے اس کتاب میں معاشیات کے ابتدائی اُصول بیان کئے هیں - کتاب کی لکھائی چھپائی بہت پاکیزہ اور دیدہ زیب هے لیکن افسوس هے که مصنف نے موجودہ معاشی نظام زندگی کی جا و بیجا حمایت کر کے کتاب کا معیار بہت پست کر دیا - کتاب پڑھو تو یه نہیں معلوم هوتا که کالج کا کوئی پروفیسر موجودہ معاشی نظام زندگی پر اپنی بے لاگ رائے ظاهر کر رها هے بلکه یه معلوم هوتا هے که لنکا شائر یا احمد آباد کے کارخانوں کا کوئی پبلسٹی آفیسر اپنے کارخانوں اور کارخانه کے مالکوں کی ثنا خوانی میں مصروف هے - کتاب کے دیباچه میں مصنف نے اس کتاب کی اصل غرض و غایت یه بیان کی هے که اردو زبان میں معاشیات پر کوئی عام فہم کتاب موجود نہیں "اسی خیال سے میں نے یه کتاب لکھی هے - اس کتاب میں کوئی نئی بات نہیں بتائی گئی - بلکه جو اصول که معاشیین نے بیان کیے هیں ان کو اپنی زبان میں سادہ پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی هے" - یه ماننا پڑتا هے که مسٹر پریم چند کو اپنے مقصد میں پوری کامیابی هوئی هے - انہوں نے معاشیین کے بتائے هوئے اصول در اصل اپنی زبان میں اور بہت سادہ اور

عام فہم پیرایہ میں بیان کردیے ہیں - لیکن پوچھنے والا پوچھ سکتا ھے کہ مصنف نے کن معاشیئین کے بنائے ہوئے اصول بیان کیے ہیں اور کیا ان کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ ان معاشیین کے اصول کی جانچ کرتے اور دیکھتے کہ آیا یہ اصول زندگی کے حقائق پر ٹھیک اترتے ہیں یا نہیں - ان دونوں سوالوں کے جواب میں ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ مسٹر پریم چند نے ارادی یا غیر ارادی طور پر ان فرائض سے پہلو تہی کی ھے -

علم معاشیات کا جو پہلو مسٹر پریم چند نے پیش کیا ھے وہ اپنی جگہ پر مکمل سہی لیکن صرف ایک پہلو ہی ھے - اور بڑے افسوس کی بات ھے کہ ہمارے ملک میں طلبا کو صرف یہی ایک پہلو بتایا جاتا ھے اور ان سے کہا جاتا ھے کہ یہی علم معاشیات کی جان ھے - ممکن ھے کہ ہمارے پروفیسر انگستان کے بعض معاشیین کی تقلید میں خود بھی یہی یقین رکھتے ہوں لیکن اصل حقیقت یہ نہیں ھے ایڈم سمتھ ' مالتھس ' ریکارڈو اور مارشل ہی وہ چار معاشیین ہیں جن سے کسب فیض کیا جاتا ھے اور خیال کیا جاتا ھے کہ ان کے بعد دریائے ٹیمس کا پانی ساکت اور منجمد ہو گیا - اور بحر اطلانتک میں جوار بھاٹے آنا بند ہو گئے - مسٹر پریم چند نے بھی انہیں معاشیین کے اصول بیان کیے ہیں اور اپنے دل کو تسکین دے لی ھے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے —

مسٹر پریم چند نے سب سے زیادہ پروفیسر مارشل سے اکتساب فیض کیا ھے - حتی کہ ابواب کی ترتیب میں بھی انہیں کے قدم کے نشان کی تقلید کی گئی ھے - نتیجہ یہ ہوا کہ مارشل صاحب کی طرح مسٹر پریم چند نے بھی زندگی کی تلخ حقیقتوں کی طرف سے منہہ پھیر کر صرف ان لوگوں کی حمایت کی ھے جن کو موجودہ معاشی نظام سے نفع حاصل

ہوتا ہے - ۲۷۸ صفحوں کی پوری کتاب پڑھ جائیے لیکن آپ کو اس لوٹ کے خلاف ایک لفظ بھی نہ ملے گا جس پر موجودہ معاشی نظام کا ڈھانچہ قائم ہے - معاشیات کے اصول معاشی زندگی کی حقیقتوں سے مرتب کیے جاتے ہیں - معاشی زندگی کی موجودہ حقیقتیں یہ ہیں کہ ساری دنیا میں تھوڑے لوگ دولت مند ہیں اور پچانوے فی صدی مفلس اور محتاج - یہی دولت مند ان مفلسوں کی محنت سے فایدہ اُٹھاتے ہیں اور اپنی تجوریاں بھرتے ہیں - ساری دنیا میں بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے - بڑے بڑے سرمایہ دار چاء اور گیہوں کے جہاز خرید کر انہیں جلا دیتے ہیں تاکہ ان چیزوں کا نرخ بڑھے اور نفع کی شرح میں اضافہ ہو - لیکن مسٹر پریم چند کی کتاب میں ان تلخ حقیقتوں کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا —

موجودہ معاشی نظام سرمایہ دارانہ نظام کہلاتا ہے - اس نظام میں تمام دولت اس لیے پیدا کی جاتی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جائے - چنانچہ اس معاشی نظام کے اصول بھی اسی نقطۂ نظر سے مرتب ہوتے ہیں - اور کوشش کی جاتی ہے کہ ان اصولوں کو ناقابل تغیّر ثابت کیا جائے - مسٹر پریم چند نے بھی یہی رویہ اختیار کیا ہے - اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دولت پیدا کرنے اور تقسیم کرنے کے جو طریقے اس وقت رائج ہیں وہ بالکل قدرتی اور جائز ہیں لیکن اگر مسٹر پریم چند نے ان اصولوں پر نقادانہ نظر ڈالی ہوتی تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ نہ تو تاریخ ان کی حمایت کرتی ہے اور نہ زندگی کے واقعات، دولت کی غلط تقسیم سے دنیا میں اس وقت جو تباہیاں آ رہی ہیں اس سے ہر شخص واقف ہے اور جس نے سماجی ارتقا کا تھوڑا بہت

مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ موجودہ معاشی نظام (سرمایہ داری) کی عمر صرف ڈیڑھ سو سال ہے اور وہ زوال پذیر ہے - دنیا کے $\frac{1}{9}$ حصہ میں جس کی آبادی سولہ کروڑ ہے اس معاشی نظام زندگی کو مسترد کر دیا گیا ہے اور اس وقت دنیا کا کوئی ایسا ملک موجود نہیں جہاں ایک زبردست اقلیت اس معاشی نظام زندگی کو تباہ کرنے کے درپے نہ ہو - ایسی حالت میں ان حقائق سے بے پروا ہو کر موجودہ معاشی نظام کو قدرتی نظام کا رنگ دینا کسی معاشیات کے پروفیسر کے شایان شان نہیں —

اُصولی طور پر یہ بتا دینے کے بعد کہ یہ کتاب موجودہ معاشی نظام زندگی اور اس کے اصولوں کی حمایت میں لکھی گئی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کتاب کے بعض ابواب پر بھی ایک نظر ڈال لیں - اس کتاب میں کل چھہ باب ہیں - پہلا باب "تمہید کے طور پر" لکھایا گیا ہے - اس باب میں بتایا گیا ہے کہ معاشیات کے اصل متحرک کیا ہیں - معاشیات سائنس ہے یا آرٹ' دولت کسے کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ —

دولت کے ضمن میں بعض نہایت گمراہ کن باتیں بتائی گئی ہیں - "جب دولت کا لفظ 'عام' زبان میں استعمال کیا جاتا ہے تو لوگ اس سے مراد عالیشان مکانات' ہیرے جواہرات' بہت سا روپیہ' موٹر کاریں' اور گھوڑے گاڑیاں وغیرہ سمجھتے ہیں - گویا لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ دولت امیر آدمیوں کے پاس ہی ہوتی ہے - لیکن معاشیات میں دولت سے مراد صرف یہی چیزیں نہیں ہیں بلکہ "ہر وہ چیز دولت ہے جس کا تبادلہ کسی اور چیز سے ممکن ہو --- دولت صرف امیر آدمیوں کے پاس ہی نہیں بلکہ غریبوں کے پاس بھی ہوتی ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ

امیر کے پاس دولت زیادہ ہوتی ہے اور غریب کے پاس کم" - (صفحہ ۱۹) - هنری فورڈ ' راکفلر اور روشچائیلڈ نے بھی اپنے مفلس اور فاقہ کش مزدوروں کو قناعت پسندی کی اتنی پُر فریب تلقین نہ کی ہوگی خود مارشل صاحب بھی جو سرمایہ دارانہ معاشیات کے علم بردار ہیں اتنی کھلم کھلا غلط بیانی سے کام نہیں لیتے - دولت کی تعریف اب تک یہی کی جاتی تھی کہ دولت وہ شے ہے جس سے انسان کی خواہشیں اور ضرورتیں پوری ہوتی ہوں - لیکن مسٹر پریم چند نے دولت کے لیے یہ لازم قرار دیا ہے کہ اُس کا تبادلہ بھی ہوسکے - یعنی اُس معاشی دور میں جس میں کہ تبادلہ کا طریقہ رائج نہ تھا کوئی دولت مند نہ ہوتا تھا - اگر مسٹر پریم چند کو یہ معلوم ہوتا کہ انسان نے رسم تبادلہ کے رائج ہونے سے قبل ہی دولت پیدا کرنی شروع کردی تھی تو شاید وہ دولت کی اتنی مضحکہ خیز تعریف نہ کرتے رہ گیا یہ سوال کہ "غریب" بھی "امیر" ہے یا نہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے آج تک کسی کو یہ کہتے نہیں سنا ہے - ممکن ہے سرحد میں یہ محاورہ رائج ہو — ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ غریبوں کی دولت اُن کی محنت کرنے کی قوت ہوتی ہے جسے وہ کسی سرمایہ دار کے کار خانے میں پیٹ بھر روٹی کے بدلہ صرف کرتے ہیں - اسی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ دولت مندوں کے پاس "عالیشان مکانات ' ہیرے جواہرات ' بہت سا روپیہ ' موٹر کاریں" ہوجاتی ہیں اور اس "دولت مند" مزدور کو جس نے محنت کی دوسرے دن کے لیے روٹی کا سہارا بھی نہیں ہوتا -

دوسرے باب کا عنوان صرفِ دولت ہے - یہ عجیب بات ہے کہ موجودہ معاشی نظام کو سراہنے والے معاشیین دولت کی پیدائش سے قبل ہی صرفِ دولت پر غور کرنے لگتے ہیں - اس کا راز یہ ہے کہ دولت کو صرف کرنے

والے وہ لوگ نہیں ہوتے جو دولت پیدا کرتے ہیں - دولت مزدور اور کسان پیدا کرتے ہیں اور صرف سرمایہ دار اور ان کے ہوا خواہ کرتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ وہ پیدائش دولت سے زیادہ صرف دولت کو اہمیت دیتے ہیں - تیسرا باب پیدائش دولت سے متعلق ہے - اس باب کی تیسری فصل میں مصنف نے عاملان پیدائش سے بحث کی ہے - اور بتایا ہے کہ عاملان پیدائش کل چار ہیں - زمین' محنت' سرمایہ اور اہتمام' - زمین سے مستفید ہونے والے زمین دار کہلاتے ہیں - سرمایہ سے مستفید ہونے والے سرمایہ دار' محنت سے مستفید ہونے والے مزدور اور اہتمام سے مستفید ہونے والے متوسط طبقہ کے لوگ - مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ تقسیم نہایت معقول ہے اور ان تمام عاملان پیدائش کو ان کا پورا حق مل جاتا ہے - کاش ہمارا معاشی نظام اتنا ہی منصف مزاج ہوتا جتنا کہ مسٹر پریم چند ہمیں باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں البتہ ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ زمیندار کی حمایت میں نہ کوئی اخلاقی اور مذہبی دلیل دی جاسکتی ہے اور نہ معاشی اور سیاسی - اُس کی حمایت صرف ایک نامعقول قانون سے ہوتی ہے اور وہ قانون وراثت کا قانون ہے - زمیندار اس وجہ سے معاوضہ کا مستحق نہیں ہوتا کہ اس نے محنت کی ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ ایک حادثہ کے بنا پر اپنے باپ کے گھر پیدا ہوگیا ہے - صفحہ ۱۰۷ پر مصنف نے سرمایہ کی ایک عجیب و غریب تعریف کی ہے - فرماتے ہیں "سرمایہ ہم ان چیزوں کو کہتے ہیں جو براہ راست ضروریات کو پورا کرنے کے لیے طلب نہ کی جائیں بلکہ جن کی مدد سے مزید دولت پیدا کی جائے" اس تعریف کی رو سے تو لکڑھارہ کی کلہاڑی اور چریمار کا

جاں بھی سرمایہ ہو جاتے ہیں - کاش لکوھارہ اور چویمار کو معلوم ہو جاے کہ وہ بھی سرمایہ دار ہے - سرفیروز سٹھنا اور سرکاوس جی جہانگیر کے قبیلہ کا!—

جو کچھہ اوپر لکھا گیا ہے اس سے مصنف کے سیاسی اور معاشی عقاید صاف معلوم ہوجاتے ہیں - اور ثابت ہو جاتا ہے کہ مصنف نے غیر جانب دارانہ غور و فکر سے مطلق کام نہیں لیا ہے بلکہ تجارتی اور کاروباری مقاصد کو پیش نظر رکھہ کر یہ کتاب لکھی ہے - کسی پروفیسر معاشیات کا اس نقطۂ نظر سے کوئی کتاب لکھنا افسوس ناک بھی ہے اور نقصان دہ بھی - اس قسم کی تصنیفات سے علمی تصنیف و تالیف کا معیار پست ہو جاتا ہے اور اگر یہ تصنیفات کالجوں کے نصاب میں داخل ہوگئیں تو طلباء کے سیاسی اور معاشی عقاید کا حشر معلوم - غرض یہ کتاب اپنی تمام ظاہری خوبیوں کے باوجود معنوی اعتبار سے ایسی نہیں جس پر اُردو زبان کی ترقی چاہنے والے خوش ہو کر مصنف کو مبارک باد دیں - کہیں کہیں زبان کی بھی غلطیاں موجود ہیں (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۳۰ ' ۱۳۱) لیکن انہیں نظر انداز کیا جاسکتا ہے - کتاب کے آخر میں بارہ صفحوں کی ایک فرہنگ اصطلاحات بھی دی گئی ہے جو بہت جامع اور مفید ہے -

کتاب میں آٹھہ تصویریں بھی ہیں جو سب کی سب ہندوستان کی معاشی زندگی سے متعلق ہیں - کتاب مجلد ہے اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی کلکتہ اور مدراس سے مل سکتی ہے - قیمت درج نہیں —

(س - ح

اسلامی طب —

(مرتبۂ ابن مظہر قاضی معین الدین رہبر فاروقی صاحب
صفحات ۲۰۹ - ملنے کا پتہ سن برج ہاوس، عابد بلڈنگ
حیدرآباد دکن)

عربی اور اسلامی ممالک، ہند اور دکن کے مسلمان سلاطین و اطبا کے علمی و فنی کارناموں کا یہ مختصر تذکرہ، جناب معین الدین صاحب 'رہبر' فاروقی نے حیدرآباد سے شایع کیا ہے - طب کی ابتدا و ارتقا کی تاریخ صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں بیان کی گئی ہے - رہبر صاحب نے اس کتاب کی تیاری میں کافی محنت کی ہے اور جو اشاریہ انہوں نے ابتدا میں درج کیا ہے اور جسے وہ اپنے موضوع کا "نچوڑ" کہتے ہیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے —

محرک وہی جذبہ ہے جو علامہ شبلی کا تھا - یعنی "طب اسلامی" کی گرتی ہوئی حالت کو دیکھ کر حاملین فن کے سامنے ان کے بزرگوں کے کارنامے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے - اسی لیے کہیں کہیں اس میں سبق آموزی سے رنگ پیدا ہوگیا ہے لطایف و ظرایف سے کتاب کو دلچسپ بنانے کی بھی کوشش کی گئی ہے - دکن میں طب کی داستان کافی تفصیل سے بیان کی گئی ہے —

(س)

اُردو کے جدید رسالے

هندوستانی -

(اڈیٹر رشید کمالی صاحب ایم - اے - چندہ سالانہ تین روپے مراد آباد) -

مراد آباد کا ماهوار رسالہ ہے - سر محمد یعقوب کی سرپرستی میں شایع هوا ہے - ۴۸ صفحے میں ۲۵ مضمون هیں - جن میں ۸ نظمیں اور غزلیں هیں دو افسانے، دو تمہیدیں - باقی مضامین سوائے دو ایک کے اس رنگ میں هیں جسے آج کل ادب لطیف کہتے هیں - یہ پہلا پرچہ ہے، امید ہے کہ آیندہ یہ اور ترقی کرے گا —

نور -

(اسداللہ خاں صاحب ناظم مدیر - سالانہ چندہ ایک روپیہ)

یہ ماهانہ جالندهر سے شایع هوا ہے - عنوان پر لکھا ہے "علمی، ادبی، اخلاقی، اجتماعی، تفریحی، صنعتی، تجارتی" - لیکن "مذهبی" رہ گیا ہے کیونکہ شروع هی مذهبی مضمون سے هوتا ہے اور اس کے بعد بھی کئی خالص مذهبی مضمون هیں - غرض کہ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں - کیا اچھا هوتا کہ اگر قابل اڈیٹر کسی خاص شعبے کو اپنا موضوع قرار دیتے - همارے رسالوں کے لیے یہ امر قابل غور ہے —

مشیرالعلاج -

(اڈیٹر - حکیم و ڈاکٹر سید محمد اکبر علی صادق - ڈنگہ ضلع گجرات)

ماهانہ طبی رسالہ ہے - گجرات پنجاب کے ایک قصبے سے شایع هوا

ہے - اس لحاظ سے قابل قدر ہے ۔ اردو متعدد طبی رسالے شایع ہوتے ہیں اور بعض ان میں سے درحقیقت بہت خوبی کے ساتھہ مرتب کیے جاتے ہیں اور کارآمد مضامین اور سہل مجرب نسخے درج ہوتے ہیں - یہ رسالہ اس پایہ کا نہیں تاہم اس میں بہت سی مفید باتیں پای جاتی ہیں -

---

بہارستان -

(اڈیٹر اختر وارثی صاحب - سالانہ چندہ چار روپے چار آنہ - جالندھر)

اچھا رسالہ ہے - زیادہ تر فسانے ہیں ' لیکن بعض ادبی مضامین بھی مطالعہ کے قابل ہیں - نظمیں بھی پڑھنے کے لایق ہیں - قابل اڈیٹر نے قابل انشا پرداز اور شاعر بھی ڈھونڈھ نکالے ہیں —

صنعت و حرفت -

(اڈیٹر پروفیسر جسونت سنگھ - سالانہ چندہ دو روپے لاہور)

یہ رسالہ ایک بورڈ کے مشورے سے مرتب ہوتا ہے اور اس بورڈ میں کئی قابل اصحاب شریک ہیں - ایسے رسالوں کی ہمارے ملک کو بہت ضرورت ہے - مختلف پیشوں اور صنعتوں کے متعلق مفید مضامین شایع کیے گئے ہیں جن کے پڑھنے سے معلومات میں ضرور اضافہ ہوتا ہے ۔ امید ہے کہ اس رسالے کی سرپرستی کی جاے گی اور خاص کر مدارس میں خریدا جاے گا —

خاص نمبر

ساقی کا فسانہ نمبر -

۲۶۷ صفحے پر ہے - اس میں بعض بڑے اچھے فسانے شایع ہوئے ہیں -

ساقی بلا شبہ ترقی کر رہا ہے اور اس کی ادبی خدمت قابل ستایش ہے - دلی سے اب تک کوئی ایسا رسالہ نہیں نکلا تھا - بڑے سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے اور لکھائی چھپائی بھی بہت اچھی ہوتی ہے - اس کا یہ نمبر پڑھنے کے قابل ہے —

شاعر کا سالنامہ —

پورے سوا پانسو صفحہ کا ہے - اس سالنامے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے ہے - جو حجم اور گوناگوں مضامین کے مقابلے میں کچھہ بھی نہیں - اس میں ۲۱۱ شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام کا انتخاب اور ایک سو پانچ شاعروں کی تصویریں ہیں - اس کی تیاری میں بلا شبہہ غیر معمولی محنت کے علاوہ بہت کچھہ صرف کرنا پڑا ہوگا - علاوہ ان تذکروں کے ۲۷ مضامین مختلف موضوعوں پر ہیں جن میں غزلیں اور افسانے وغیرہ بھی ہیں - ہم اس کے قابل اڈیٹر کو اس کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں —

سالنامۂ کابل —

حسب معمول بہت ضخیم اور پر از معلومات ہے - اب کے تو مجلد شایع کیا گیا ہے - اس میں ساتھہ ستر مضامین اور سیکڑوں تصاویر ہیں - آرٹ پیپر پر بہت اچھے ٹائپ میں چھپا ہے - 'کابل' بڑی خوبیوں کا رسالہ ہے اور اس کے سالنامہ میں افغانستان کے حالات اور معاملات پر مستند مضامین ہوتے ہیں —

اعتذار

اردو کے اپریل نمبر میں گارساں دتاسی کا جو خطبہ شائع ہوا ہے، اس کے مترجم جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نہیں بلکہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پروفیسر جامعۂ عثمانیہ ہیں چونکہ مضمون پر مترجم صاحب کا نام درج نہ تھا اس لیے پروف ریڈر کو جناب ایڈیٹر صاحب کے اس نوٹ سے جو اس مضمون کے شروع میں درج ہے، خواہ مخواہ یہ غلط فہمی ہوئی کہ اس کے مترجم خود جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ہیں اور انہوں نے دریافت کیے بغیر مترجم کی جگہ ڈاکٹر صاحب موصوف کا نام لکھ دیا اور اس طرح یہ غلطی ہوگئی، جس زمانے میں یہ مضمون شائع ہوا میں بمبئی میں مقیم تھا بہر حال اس افسوسناک غلطی کا مجھے بہت افسوس ہے، تمام ناظرین سے استدعا ہے کہ وہ اس کی تصحیح فرمالیں، اسی طرح اپریل نمبر میں جناب مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ سکریٹری انجمن ترقی اردو کا جو خطبۂ صدارت شائع ہوا ہے اُس میں بھی پروف ریڈر صاحب کی کوتاہی سے جابجا اوقاف (Punctuations) کی غلطیاں رہ گئی ہیں، میں ان غلطیوں کے لیے ہر دو اصحاب سے معذرت خواہ ہوں اب ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ آئندہ اس قسم کی غلطیوں کا انشاءاللہ کوئی امکان باقی نہ رہے گا مضمون نگار حضرات کی خدمت میں بھی التماس ہے کہ وہ از راہ کرم مضمون خوش خط اور کاغذ کے صرف ایک طرف تحریر فرمایا کریں تاکہ کمپوز کرنے اور پروف ریڈنگ میں دقت واقع نہ ہو فقط —

مظفر حسین شمیم
منیجر انجمن ترقی اردو (ہند)
اورنگ آباد دکن

بیادگار سید عظیم

عالی مرتبت نواب سر سید مسعود جنگ بہادر رحمۃ اللہ علیہ

اردو لائبریری دارالاقبال بھوپال

سے

ماہنامۂ مسعود

اپنی صوری و معنوی ضوفشانیوں اور تابانیوں کے ساتھ ملک کی سنجیدہ اور منظم جماعت کے زیر اہتمام عنقریب منصۂ شہود پر جلوہ ریز ہوگا۔

ماہنامہ "مسعود" ایک عالی مرتبت محسن ادب کی یادگار ہونے کے باعث اپنے معیار کی رفعت و بلندی میں بھی دوسروں کے لیے قابل رشک ہوگا۔

ایجنٹ حضرات جلد خط و کتابت کریں نیز مشتہرین حضرات بھی ابھی سے اپنے لیے جگہ رزرو کرالیں جملہ خط و کتابت پتہ ذیل پر ہونی چاہیے —

سید احترام سیکریٹری اردو لائبریری - بھوپال

ہندوستانی موسیقی

ہندوستانی موسیقی پر نایاب کتب اور مخطوطات مطلوب ہیں۔ کتب و مخطوطات کے نام کے ساتھ ان کی قیمت بھی لکھی جائے۔

خط و کتابت کا پتہ :- رمیش چندر ایم ساناوتی "ساگر ولاس" نمبر ۱۰' اے سانڈھرسٹ برج بمبئی نمبر ۷ —

اردو

جلد ۱۸	اپریل سنہ ۱۹۳۸ ع	حصہ ۷۰

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

دی اسٹینڈرڈ انگلش - اردو ڈکشنری

مرتبۂ

انجمن ترقی اردو (ہند)

جس قدر انگلش اردو ڈکشنریاں اب تک شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے - اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے - چند خصوصیات ملاحظہ ہوں :-

(۱) یہ بالکل جدید ترین لغت ہے - انگریزی زبان میں اب تک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام اس میں آگئے ہیں -

(۲) اس کی سب سے بڑی اهم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی، مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنی بھی شامل ہیں جن کا تعلق علوم و فنون کی اصطلاحات سے ہے - اسی طرح ان قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کیے گئے ہیں جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوئے ہیں -

(۳) ہر ایک لفظ کے مختلف معانی اور فروق الگ الگ لکھے گئے ہیں اور امتیاز کے لیے ہر ایک کے ساتھ نمبر شمار دے دیا گیا ہے -

(۴) ایسے الفاظ جن کے مختلف معنی ہیں اور ان کے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا - ان کی وضاحت مثالیں دے دے کر کی گئی ہے -

(۵) اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہے کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کے لیے ایسا اردو مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کر سکے اور اس غرض کے لیے تمام اردو ادب، بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کی گئی ہے - یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی -

(۶) ان صورتوں میں جہاں موجودہ اردو الفاظ کا ذخیرہ انگریزی کا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کیے گئے ہیں جو اردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں -

(۷) اس لغت کے لیے کاغذ خاص طور پر باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا تھا جو بائبل پیپر کے نام سے موسوم ہے - طباعت کے لیے اردو اور انگریزی ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کیے گئے ہیں - جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے -

(ڈمائی سائز - صفحات ۱۵۱۳ + ۳۳) قیمت سولہ روپے کلدار علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

دفتر انجمن ترقیء اردو (ہند) اورنگ آباد (دکن)

حسب ذیل کتابیں بھی انجمن کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہوسکتی ہیں

— (نظامی پریس بدایوں) —

خطوط سر سید	تین روپے
لیتھو گرافی	دو روپے آٹھ آنے
دیوان غالب مع شرح	دو روپے آٹھ آنے
دیوان غالب اردو	ایک روپیہ آٹھ آنے
قاموس المشاہیر	چھ روپے
غزلیات ذوق	ایک روپیہ آٹھ آنے
دیوان جان صاحب مجلد	ایک روپیہ آٹھ آنے
انتخاب زریں مجلد	دو روپے
مراثی میر انیس جلد اول مجلد	دس روپے
مراثی میر انیس جلد دوم قسم دوم	پانچ روپے
مراثی میر انیس حصہ سوم قسم اول آرٹ پیپر	آٹھ روپے
مراثی میر انیس حصہ سوم قسم دوم	چھ روپے
انقلاب دھلی	ایک روپیہ آٹھ آنے
رباعیات شاد	ایک روپیہ
دیوان درد	ایک روپیہ چار آنے
قصائد ذوق	ایک روپیہ آٹھ آنے
سکہ اور شرح تبادلہ	ایک روپیہ

-(تصانیف نور الٰہی و محمد عمر صاحبان)-

تین ٹوپیاں	آٹھ آنے
قزاق	آٹھ آنے
ناٹک ساگر (یعنی دنیائے ڈراما کی تاریخ) مجلد	تین روپے
غیر مجلد	دو روپیہ آٹھ آنے
ناٹک کتھا	آٹھ آنے

- (مطبوعات ہندستانی اکاڈیمی الہ آباد) -

عرب و ہند کے تعلقات	چار روپے
کبیر صاحب	دو روپے
اردو زبان و ادب	ایک روپیہ
ناتن	دو روپے آٹھ آنے
فریب عمل	دو روپے
قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب	چار روپے
ہندی شاعری	دو روپے
فلسفۂ نفس	ایک روپیہ
عالم حیوانی	چھ روپے آٹھ آنے
معاشیات ؛ مقصد اور منہاج	ایک روپیہ

— (کتابستان الہ آباد) —

مثنوی ناسخ	بارہ آنے
بس کا روکھ	ایک روپیہ
تاریخ اسلامی حصہ اول	آٹھ آنے

انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد دکن

کا

کتب خانہ

انجمن ترقیء اردو (ہند) اورنگ آباد دکن نے اپنا ایک عظیم الشان کتب خانہ حیدرآباد دکن میں عابد شاپ پر قائم کیا ہے ؛ ہندوستان کے مشہور و معروف اردو کے اشاعت خانوں کی جملہ مطبوعات اور انجمن کی تمام کتابیں اس کتب خانے سے دستیاب ہوسکتی ہیں -

المشتہر

مینیجر انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد (دکن)

اردو

فہرستِ مضامین

بابت اپریل سنہ ۱۹۳۸ ع

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	کنول پھول، اور تمدن میں اس کی اہمیت	جناب امین الدین خاں صاحب بی۔ اے	۲۳۳
۲	اردو زبان کے قدیم کتبے	عبدالحق اڈیٹر "اردو"	۲۷۶
۳	بنگالی اور اردو	جناب محمد اجمل خاں صاحب ایم۔اے ایل ایل۔ بی محقق اسلامیات شانتی نکیتن (بنگال)	۲۸۲
۴	فارسی غزل	جناب فضل احمد کریم صاحب فضلی بی لٹ، (آکسفورڈ) آئی۔ سی۔ ایس	۳۶۹
۵	میر انیس کے غیر مطبوعہ اشعار	جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا، پٹنہ	۳۱۵
۶	لکھنؤ کا ایک لطیفہ	جناب پنڈت کشن پرشاد کول صاحب	۳۱۹
۷	ادبی معلومات	"ناخدا"	۳۲۷
۸	افکار و واقعات	اڈیٹر	۳۳۵
۹	تبصرے	اڈیٹر و دیگر حضرات	۳۸۱
۱۰	اشتہارات	منیجر انجمن ترقیٔ اردو (ہند) اور دیگر مشتہرین	

اقبال مرحوم

اقبال کی موت ایک بہت بڑا قومی سانحہ ہے - ایسا بلند خیال اور عالی فکر شاعر صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کے ساتھ ہی ہندستان سے شاعری بھی اُٹھ گئی - مولانا 'حالی' کے بعد شاعری سے اگر کسی نے حقیقی کام لیا تو وہ اقبال تھا —

اس کے کلام نے دلوں میں گرمی اور خیالات میں انقلاب پیدا کردیا تھا - اس نے قومی اور ملّی مسائل میں خیال و فکر کی رو بدل دی تھی - بیسیوں لفظ' خاص خاص ترکیبیں اور بعض خاص خیال اور افکار ہندستان کے اردو ادیبوں اور شاعروں میں محض اقبال کے کلام کی بدولت سکۂ وقت کی طرح رائج ہوگئے تھے —

اس کے کلام نے اردو زبان کا رتبہ بڑھا دیا اور یہ ثابت کردیا کہ اس میں کتنی وسعت و قوت اور صلاحیت ہے جب تک اردو زبان زندہ ہے اس کا کلام زندہ رہے گا اور پڑھنے والوں کے دلوں میں ولولہ' فکر میں بلندی' جذبات میں درد اور تخیّل میں پرواز پیدا کرتا رہے گا —

عبدالحق

کنول پھول، اور تمدن میں اس کی اهمیت

از

(جناب امین الدین خاں صاحب بی اے)

انسان، باوصف اپنے دعوائے همه دانی و همه گیری کے ابھی تک ویسا هی چلا آتا هے، جیسا که حضرت آدم کے وقت میں تھا - وہ اپنی پیش پا افتادہ چیزوں کو ٹھکراتا چلا جاتا هے، اور حملے کرتا هے تو آسمان کے ستاروں پر - اس سے کہا جاتا هے که

برگ درختان سبز در نظر هوشیار

هر ورق دفترے است معرفت کردگار!

مگر وہ اپنے غرور عالم گیری میں ایک نہیں سنتا؛ دوڑتا چلا جاتا هے اور نہیں دیکھتا که کتنی بیش بہا دولتیں اس کی غفلت اور اس کے تبختر پر نثار هوی چلی جاتی هیں - وہ چیزیں، جن کو وہ حقیر و ذلیل سمجھتا هے، دست حال سے اس کا دامن پکڑ کر اس کو متوجه کرتی هیں، مگر اسے اتنی فرصت کہاں که نگاہ بھر کر بھی ان کو دیکھ لے - دنیا کی لاتعداد چیزوں میں سے کسی نے اسے جب ایسا پکڑا که اسے متوجه هوتے هی بنا تب تو اس نے اس چیز کی طرف توجه کی، اس کی ماهیت پر غور کیا، اور اس سے کام لینا شروع کردیا - پھر اسی پر بس نہیں کرتا - اکثر ایسا هوا هے که اس سے کام لیتے لیتے انسان خود اسی کا غلام بن

جاتا ہے - ان ہی چیزوں میں سے ایک وہ نباتی چیز ہے جو ہمارا زیب عنوان ہے، یعنی کنول پھول —

کنول ایک مشہور و معروف پھول ہے، اہل ایران اسے نیلوفر، نیلوفل، نیلفر، نیلوپر، نیلوپل اور نیلوپرگ * کہتے ہیں - بعض کا خیال ہے کہ "نیلوفر" ہندی لفظ نیلوپھل † ہی کا معرب ہے، کیوں کہ "نیل ہندی زبان میں پانی ‡ کو کہتے ہیں اور پھل ثمر ہے" - صاحب غیاث اللغات نے رسالۂ § معربات کے حوالے سے لکھا ہے کہ نیلوفر لفظ نیلوپل کا معرب ہے - ایک اور قول یہ ہے کہ نیلوفر ایک فارسی اسم ہے $ جس کے معنی ہیں نیلے پروں والا (نیل، پر) - یہ قیاس غالباً اس قیاس پر مبنی ہے کہ فر اور پر میں صوتی مناسبت ہے، اور فر کو فارسی پر کی معرب صورت سمجھ لیا گیا ہے - صاحب ہفت قلزم کا خیال ہے کہ نیلوفر وہی چیز ہے جسے عربی میں ناتل النحل کہتے ہیں ¶ - ابن سیرین نے نیلوفر کا نام لیلوفور لکھا ہے، ** ہندی میں اس کو کنول اور کمل کہتے ہیں، مگر کنول

---

* آئندہ صفحوں میں ہندی منتھیا کے سلسلے میں "نیلوت پل" (नीलोत्पल) کا ذکر ہوگا - یہ لفظ اسی ایرانی تلفظ سے متعلق معلوم ہوتا ہے - ممکن ہے کہ یہ ایرانی تلفظ اسی ہندی (دراوڑی ؟) لفظ ہی کی ایک صورت ہو! —

† مخزن الادویہ از میر محمد حسین خراسانی سنہ ۱۱۷۸ ھ، نیلوفر -

‡ اصلی سنسکرت میں نیر (ی معروف سے नीर) ہے - اسی سے "نیرا" ہے - جنوبی ہند کی تامل زبان میں پانی کو تنّیر (اور مخفف کر کے تنی) کہتے ہیں -

§ غیاث اللغات، نیلوفر -

$ جامع المفردات از ابن بیطار، نیلوفر -

¶ ہفت قلزم از مولوی مقبول محمد، نولکشور کانپور سنہ ۱۸۹۱ م، نیلوفر -

** منتخب الکلام فی تفسیر الاحلام (تعطیر الانام کے حاشیے پر) از محمد ابن سیرین، ص ۲۳۲ -

(ی سے) غلط ہے - مولوی رشید احمد * سالم کا خیال ہے کہ کیول اصل میں (بقول ان کے "حقیقتاً") کیوا (ی مجہول سے) ہوگا - اس کی شہادت میں مولوی صاحب نے جائسی (ملک محمد ؟) کا یہ قول نقل کیا ہے :-

سورگ سور بھوئیں سرور کیوا   بن کھنڈ بھنور ہور ہوے رس لیوا

صاحب تاج العروس کا بیان ہے کہ اہل مصر کے ہاں بھی اس پھول کا نام نوفر ہے † —

ماہیت | یہ پھول جھیلوں ' تالابوں اور دلدلوں میں گرمی کے زمانے میں ' جب کہ بارش کا موسم ہوتا ہے ' پیدا ہوتا ہے - اس کے پودے کی جڑیں چھوتی ' سیدھی ' گول اور نلکی دار ہوتی ہیں - اس کا تنا نرم ' چکنا ' مجوف اور طولانی ہوتا ہے ' زیادہ موتا نہیں ہوتا - اس کی ڈنھلاں پانی میں ڈوبی ہوئی لمبی لمبی ہوتی ہیں ' پتے چوڑے اور دو سے چھہ فت تک لمبے ہوتے ہیں - پتوں کے کنارے پیچ دار اور کٹے ہوے ہوتے ہیں اور پانی کی سطح پر تیرتے رہتے ہیں - اس کے پھول دو سے دس انچ تک کے قطر ‡ کے ہوتے ہیں - کنول کی ایک قسم § کو انگریزی میں (Nelumbium Speciosum) کہتے ہیں اور اس میں پچیس سینٹی میٹر کے قطر کے پھول لگتے ہیں - پھول کی پنکھڑیاں بیضوی شکل کی اور مجوف ہوتی ہیں ' اس میں ایک وقت میں صرف ایک ہی پھول لگتا ہے —

---

* جوا ہر خسروی از امیر خسرو مصححہ رشید احمد سالم (علی گڈھ سنہ ۱۹۱۸ ع) ' نوهنگ خالق باری ' ص ۳۱ -

† تاج العروس ' مصر سنہ ۱۳۰۶ ھ لفظ نیلوفر -

‡ Glossary of Batanic Terms by R. L. Heining ' بیان Nymphaeceae -

§ The Natural History of Plants by kerner and Oliver ' ج ۲ ؛ ص ۱۸۵

کہتے ھیں کہ * یہ پھول طلوع آفتاب کے ساتھہ پانی سے سر باھر نکلتا ھے اور پھر غروب آفتاب کے ساتھہ پانی میں ڈوب جاتا ھے - ایک اور روایت ھے کہ نیلوفر کے پانی میں ڈوبتے وقت ایک پرند آتا ھے اور اس کے بیچ میں بیٹھہ جاتا ھے - صبح کو جب نیلوفر پانی کے اوپر آتا ھے اور منہ کھولتا ھے، تو وہ پرند اڑ جاتا ھے اور رات کو پانی سے کوئی زحمت نہیں اٹھاتا - یہ تو عام روایت ھے جو صاحب "برھان" نے بیان کی - اتفاق ملاحظہ ھو کہ کاوش کرنے والوں نے حضرت شاہ جہاں بادشاہ شاھنشاہ ھند کے سوانح میں بھی ایک نہج کا واقعہ ڈھونڈہ نکالا ھے، جس میں کسی شاعر نے اس نوعیت کی مضمون آفرینی کی ھے - مہر جی بھائی کوکا نے فارسی زبان کے لطائف و ظرائف بیان کرتے ھوے بادشاہ موصوف کے حرم کا ایک واقعہ یوں قلمبند کیا ھے کہ:
ایک بار† حرم شاھی کی ایک خاتون کے لب کا مصنوعی تل شاہ جہاں بادشاہ کے بوسے سے محو ھوگیا - اس نے ظریفانہ طور پر کہا کہ 'زاغ ازدھاں پرید' دوسرے دن بادشاہ نے درباری شعرا سے اس جملے کو موزوں کرنے کی فرمایش کی - ایک بدیہہ گو نے کہا:

نیلوفری چو دوش دھن گرد آورید — زنبور مست بود کہ آمد دراں خلید
چوں آفتاب دید دھن خندہ را کشاد — در عین خندہ بود کہ زاغ ازدھاں پرید

صاحب بہار عجم کا قول ھے کہ نیلوفر کی دو قسمیں‡ ھیں : آفتابی

---

* نیلوفر در برھان قاطع، مطبع افضل المطابع، کلکتہ، سنہ ۱۲۵۱ ھ مطابق سنہ ۱۸۳۶ ع -

† Wit, Humour and fancy of Persia از مہر جی بھائی نوشیرواں جی کوکا، بمبئی سنہ ۱۹۲۳ ع، صفحہ ۱۲ -

‡ بہار عجم، نیلوفر

یا شمسی ' اور ماهتابی یا قمری - آفتابی نیلوفر سرخ هوتا هے ' اور طلوع آفتاب کے وقت کھلتا هے - هندی میں اسے کنول کہتے هیں - ماهتابی کی دو قسمیں هوتی هیں : ایک سفید محض هوتا هے اور دوسرا نیلاهٹ کے ساتھہ سفید هوتا هے - یہ دونوں قسمیں شام کے وقت کھلتی هیں - شاعر حسین ثنائی نے اس کو خوب بیان کیا هے :

هوائے سولٹی حلم تو گر برو بوزد کبود رنگ شود همچو نیلوفر آتش

اسی شاعر کا ایک اور قول هے :

زبسکہ بے تو بتن نیلوفر همی کارم فضاے سینه با طراف آسماں مانند

محقق پٹری * (Petric) نے اس کی تین قسمیں بیان کی هیں :

(۱) گلابی نیلوفر (Nelumbium Speciosum) ' جس کی پنکھڑیاں کلی کی حالت میں تہ بہ تہ اور محراب دار هوتی هیں —

(۲) سفید (Nymphaea Lotus) ' جس کی پنکھڑیاں نس دار ' اور کھل جانے پر گول هوتی هیں —

(۳) نیلا (Nymphaca Caerulae) ' جس کی پنکھڑیاں چکنی اور نوک دار هوتی هیں - صاحب مخزن الادویہ نے اس کی ایک اور قسم زرد رنگ کی بھی بیان کی هے لیکن وہ بہت کمیاب هے - سفید کنول بکثرت پایا جاتا هے ' اس سے کم نیلے رنگ کا ' اور اس کے بعد سرخ ارغوانی بہترین کنول سفید اور نیلا هوتا هے —

کنول کے پودے میں سیب † کے برابر گول سا پھل لگتا هے - اس کے

---

* Encyclopaeadia of Religion and Ethics' لفظ Lotus

† مخزن الادویہ ' نیلوفر -

اندر سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے بیج ہوتے ہیں - بیج کے اوپر کا حصہ سرخی مایل ہوتا ہے، اور نیچے کا حصہ سیاہ لمبا ؛ بعض گول اور کڑوا ہوتا ہے - جب پھل میں کیڑے نہیں لگتے تو وہ پک جاتا ہے اور استعمال میں لایا جاسکتا ہے —

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نیلوفر ایک پھل * بھی ہوتا ہے - خان آرزو نے چراغ ہدایت میں لکھا ہے کہ † نیلوفر علاوہ اس مشہور و معروف پھل کے، جو پانی میں ہوتا ہے، ایک دوسرا پھول بھی ہے جس کی بیل دوسرے درخت پر لپٹی ہوتی ہے، اور وہ نیلے رنگ کا ہوتا ہے - صاحب غیاث نے قاسم گون آبادی کا یہ قول (شاہنامہ اسمعیل صفوی سے) نقل کیا ہے :

پسر محکم بدوش نیک بختاں چو نیلوفر کہ پیچد بر درختاں

یہ پھول ہندوستان، فارس اور مصر میں بکثرت پایا جاتا ہے - ہندوستان کے لیے سرخ کنول مخصوص ہے - مصر میں سرخ آج کل سوا ان چند مقامات کے جہاں خاص طور پر اس کی کاشت ہوتی ہے، کہیں نہیں ملتا - اہل روما جب مصر میں پہنچے ہیں، اس زمانے میں یہ پھول وہاں پایا جاتا تھا چنانچہ اس کا ثبوت یونانی مصنفوں کی تحریروں میں ملتا ہے - علاوہ اس کے یہ پھول اب بھی ہوارا کے قبرستان میں نظر آتے ہیں اتھنے اوس (Athenaous) کا بیان ہے کہ " کنول دلدلوں میں اُگتا ہے، اور گلاب کی طرح کا ہوتا ہے - اس کے گوندھے ہوئے مالے کو انتی نس (Antinous) کا مالا کہتے ہیں - ایک دوسری قسم نیلے رنگ کی ہوتی ہے، اور اس کے مالے کو کنول کا مالا کہتے ہیں - " اس وقت سے قبل ہرودت

* غیاث اللغات، نیلوفر

† Encycl. Relig. Eth. ' تحت Lotus

کے زمانے میں بھی یہ پھول موجود تھا - چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ " کنول دریا میں اُگتا ہے - اس کا پھل ایک پوٹلی میں ہوتا ہے - اس کے اندر بہت سی بھریاں ہوتی ہیں ' جو کھائی جاتی ہیں " - تاہم اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ سرخ کنول کبھی مصر میں پیدا ہوتا تھا - گو بعض مصنفوں نے اس کی نظیریں پیش کی ہیں ' مگر وہ عموماً صحت سے دور ہیں - مثلاً ' سیاح لورے (Loret) لکھتا ہے کہ وہ کنول ' جو ' هورس دیوتا ' کی مورت میں سہارا دیے ہوئے نظر آتا ہے ' سرخ رنگ کا ہے - لیکن اس کی پنکھڑیاں صاف کنارے کی ہیں - وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ وہی کنول بادشاہ نفرتوم (Nefertum) کی تصویر کے سر پر بھی بنا ہوا ہے - لیکن وہ سفید رنگ کا معلوم ہوتا ہے - وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ سرخ کنول مصری مقبروں یا روضوں میں کہیں نہیں ہے - جو ستون ممفس (Memphis) میں ملا ہے ' اس میں قدیم تر ستونوں کے کنولوں کی طرح سفید کنول ہی بنا ہوا ہے —

علاوہ ہند ' فارس اور مصر کے یہ پھول چین ' جاپان ' جاوا ' جزائر ملایا ' جزائر فلپائن وغیرہ ممالک میں بھی پیدا ہوتا ہے ' لیکن بہت کم - یورپ میں هنگری میں اس کی ایک قسم پائی جاتی ہے - آسٹریلیا میں بھی یہ پیدا ہوتا ہے - شمالی اور جنوبی امریکہ میں بھی ہوتا ہے ' مگر شاذ ہے —

افعال و خواص

کنول ایک بہت ہی فائدہ مند شے ہے - اس کے ڈنٹھل ' پھول اور بیج کھائے جاتے ہیں - بیج گرم بالو میں بھون کر کھایا جاتا ہے - بھوننے کے بعد بیج سفید رنگ کا اور کھیلوں کی طرح ملائم ہوجاتا ہے - اس کو هندی میں تال مکھانا کہتے ہیں - اس کے پودے

کے بہت سے حصے ویدک اور یونانی ادویہ میں استعمال ہوتے ہیں۔ اطبا کا عقیدہ * ہے کہ کنول کا مزاج سرد اور تر ہے' اور اس بارے میں وہ بنفشے سے بڑھا ہوا ہے۔ اس کی جڑ گرم اور خشک' اور اس کا بیج سرد اور خشک ہے۔ اس کی قوت ایک برس تک باقی رہتی ہے۔

کنول دل اور دماغ کے لیے مقوی ہے۔ اور نہ صرف ان کی حرارت کے لیے مُسکن ہے' بلکہ سر اور سینے کی تشنگی کو بھی تسکین دیتا ہے۔ اس کے پھول کو سونگھنا گرم مزاج مریض کے دل و دماغ کے لیے مقوی ہے' اور نیند لاتا ہے۔ گرمی کی وجہ سے درد سر اور خشکی دماغ کے لیے بھی مُسکن ہے۔ اس کا پینا امور مذکور کے لیے اور نیز نزلہ' خشونت سینہ' گرم کھانسی (سرفہ حار) اور بیرونی و اندرونی زخموں کے لیے بہت مجرب ہے۔ اگر اس کو زعفران اور دار چینی میں ملا کر پیا جائے تو تقویت دل اور خفقان کے لیے موثر ہے۔ اس کی جڑ کو منہ میں رکھنا حلق کے ورموں کو کم' اور خناق کو رفع کرتا ہے۔ سر پر اس کی مٹی کا لیپ اس کی جلن اور بخار کے لیے مُسکن ہے۔ اس کی مٹی کو یا اس کی جڑ کو پینا پرانے اسہال کو روکتا ہے' اور آنتوں کے زخم کو اچھا کرتا ہے۔ اگر اس کی جڑ کو روغن زفت کے ساتھ پیس کر پیا جائے تو داءالثعلب یعنی' بال خورے کو مفید ہے؛ اور تیز بخار کو ہلکا کرتا ہے۔ اس کی مٹی کو تنہا یا مناسب قسم کی پکی ہوئی دوائیوں یا اس کے عرق کے ساتھ پینا۔ چیچک اور پتھری کے واسطے مفید ہے' اور جگر اور دل کی گرمی اور بخار کی تپش کے لیے مُسکن ہے' مثانے کے لیے

---

* طبی خواص و افعال کا یہ بیان جامع‌المفردات ابن بیطار' اور مخزن‌الادویہ پر مبنی ہے۔

مضر ہے، اور اس کا مُصلح شہد اور مصری ہے - باہ کے لیے بھی مضر ہے، اور اس کے مصلح شہد اور لعوبات ہیں - اس کا بدل بنفشہ اور خطمی سفید ہے - اگر اس کی جڑ کو پانی میں ملاکر پیا جائے تو پرانی پیچش کو، آنتوں کے زخم کو، اور طحال کے ورم کو نفع ہوتا ہے - اس کا لیپ معدے اور مثانے کے درد اور ورم طحال کے لیے مفید ہے - صاف پانی میں ملاکر لیپ کرنا برص اور بہق کو دور کرتا ہے - اس کو سرکے میں ملاکر گرم ورموں کو دھونے سے فائدہ ہوتا ہے - اس کا لیپ نزف الدم اور درد مثانہ کے لیے نافع ہے - نیلوفر کا شربت طبیعت کو نرم کرتا ہے اور گرمی کی وجہ سے دردِ سر، گرمی اور صفراء کے پت، کھانسی، ذات الجنب، ذات الریہ اور سینہ کے کھرکھرے پن کے لیے نافع ہے - اس کے تیل کا مزاج بنفشے کے تیل سے زیادہ سرد اور تر ہے —

کنول خواب میں

یہاں یہ بیان کردینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کنول کو خواب میں کیا درجہ حاصل ہے - بعض جید عرب مصنفوں نے نباتات اور حیوانات کے احوال و خصائص میں اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ اگر اس کو خواب میں دیکھا جائے تو دیکھنے والے کے لیے اس کے کیا معنی ہوں گے - گو یہ بذات خود ایک جدا اور عظیم موضوع ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ مطالعہ بہت کچھ دلچسپ ہے - نیلوفر کے بارے میں عرب معبر ابن شاہین نے لکھا ہے * کہ اگر کوئی عورت خواب دیکھے کہ اس نے نیلوفر کو توڑا ہے اور اپنے خاوند کو دیا ہے، تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کا خاوند اسے طلاق دے دے گا -

---

* نیلو فودر، الاشارات فی علم العبارات، از ابن شاہین مصر سنہ ۱۳۰۷ ھ، (تعطیرالانام از عبدالغنی النابلسی کے حاشیے پر) جلد ۲ ص ۱۷۱ -

اسی طرح اگر کوئی دیکھے کہ اس نے نیلوفر توڑ کر اپنے غلام کو دیا ہے تو دلالت یہ ہے کہ وہ اس غلام کو آزاد کردے گا - اور اگر کوئی نیلوفر کی جڑ دیکھے تو اس سے بد خلق باندی مراد ہے - ابن سیرین † نے لکھا ہے کہ اگر کوئی نیلوفر دیکھے تو اس سے مراد مال حلال ہے ، یہ مال حلال ذریعے سے جمع کیا گیا ہے ' اور حلال طور پر ہی خرچ بھی ہوگا —

کنول مذہب اور متھیا میں

انسان اپنی زندگی کے آغاز میں کائنات کی اکثر اشیا میں خدا کا جلوہ دیکھتا تھا ' اور اسی بنا پر ان کو خدا یا خدا کا براہ راست نمائندہ سمجھتا تھا - ایک طرف اجرام فلکی اور دوسری طرف خود اس کے وطن یعنی زمین کے پہاڑ ' دریا ' نباتات اور حیوانات ' کوئی اس کے اس ہمہ گیر تخیل سے نہیں بچا - خود ہمارے وطن میں آج تک نباتات اور حیوانات کے اکثر انواع کی باقاعدہ پوجا ہوتی ہے - لیکن اس میں کچھ ہندوستان ہی کی خصوصیت نہیں ہے - قدیم تاریخ و آثار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی ملک جہاں کبھی انسان آباد تھا اس "ہمہ اوست" قسم کے عقیدے اور اس ہمہ پرستی کے عمل سے خالی نہیں رہا - کنول بھی ان خوش نصیب نباتات کے زمرے میں شامل ہے ' جسے نہایت نہایت قدیم زمانے سے (الاماشاءاللہ) اب تک خدائی یا خدا کی نمائندگی کا بلند رتبہ حاصل ہے —

ابھی اوپر ہم نے مصر قدیم کے بعض آثار قدیم کا ذکر کیا ہے جس میں کنول کا وجود بتایا جاتا ہے - جیسا کہ اوپر تریلے ہی سے ظاہر ہے '

---

† منتخب الکلام فی تفسیرالاحلام (تعطیرالانام کے حاشیے پر) از ابن سیرین جلد اول ' ص-۲۳۴-

یہ ایک مشکوک امر هے کہ کنول اس قدر پرانے زمانے میں فی الواقع مصر کی سر زمین میں موجود تھا - جیسا کہ ان قدیم عمارات کے ملاحظے سے معلوم هوا هے ' یہ تو ضرور ممکن هے کہ کنول پھول کو اهل مصر نے آرائش کے لیے استعمال کیا هو ' لیکن اس کا باور کرنا بعید از قیاس معلوم هوتا هے کہ اس پھل کو مصر قدیم کی متھیا سے کوئی خاص تعلق یا رابطہ تھا - اوپر کے بیان میں بادشاہ نفرتوم ' جو کنول اپنے سر پر پہنے هوے هے ' بعد کے زمانے کا دیوتا هے - اسی طرح هوروس * جو کنول پر بیٹھا هوا نظر آتا هے ' محض حبشہ اور اس کے بعد کے زمانے میں ملتا هے - ولکنسن † (Wilkinson) نے لکھا هے کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں هے کہ مصریوں کے نزدیک کنول ایک معزز اور متبرک شے هے —

مصر سے چل کر کنول غالباً بحرروم میں سے هوتا هوا هسپانیہ اور اندلوسیہ پہنچا ' جہاں عیسائیوں نے اس کا اس زور سے استقبال کیا کہ یہ ان کے عقاید کا ایک جزو هو کر ان کی عبادت گاهوں میں دخیل هو گیا - ' برن هارت ' اور ' دهوشا ' نے اپنی کتاب " عربی هسپانیہ " میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس مضمون سے بحث کی هے - اس کی دلچسپی اور اهمیت کے لحاظ سے مناسب معلوم هوتا هے کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے :—

" اب همیں اس اشبیلی مذهب کو فن لطیف کی تاریخ کی اس خصوصی کیفیت کی طرف متوجہ هونا چاهیے جس کے سبب سے اس میں

---

* (۱) Mytho. of Ancient Egypt از L. Spence ' ص ۲۹۹ '
اور (۳) Encycl. Relig. Eth. میں Lotus کا بیان -
† حسب (۲) اوپر -

اور مصر میں ایک قرابت قریبہ پیدا ہو جاتی ھے - زمانۂ قدیم سے ھم یہاں اس وضع کو رائج پاتے ھیں جو مریم عذرا کا خاص نشان کہلاتی ھے - یہ ایک برتن یا گھڑا ھے ' جس میں سے ایک پودا اگتا ھے اور اس کے دونوں طرف ایک پھول قرینے سے متوازی طور پر رکھا نظر آتا ھے - دیگر ممالک (مثلاً اطالیا) کی فنی صناعتوں میں یا تو اس کنول کو چھوٹا فرشتہ اٹھائے ہوتا ھے یا یہ مریم کے قریب ھی ایک برتن میں رکھا ہوتا ھے اور اس سے یہ سمجھا جاتا ھے کہ یہ اس لڑکی کے کنوارپن کی پاک دامنی پر محض ایک شاعرانہ دلالت ھے جس کو فرشتے نے اس نجات دلانے والے کی بشارت دی تھی —

لیکن اشبیلیہ میں یہ علامت خود مریم عذرا کے تصور کی طرف اشارہ کرتی ھے کیوں کہ سانتا کلارا * کی خانقاہ کے گرجے میں ایک منبت پتھر ھے جو اس اونچے مذبح کے پشت کی دیوار کا ایک حصہ ھے جس میں سانت انّا اور سانت جوخم کو ایک تھالیے ہوئے دکھایا گیا ھے جو ھر ایک کے سینے سے لگا ھے اور جس کے سرے مل کر کنول کی طرح کا ایک پھول بناتے ھیں اور اس پھول کے اندر مریم عذرا متمکن ھیں - ھم نے صوبۂ اشبیلیہ کے دیہات کے ایک سے زیادہ گرجوں میں اسی قسم کی شکلیں دیکھی ھیں —

فردنند اور ازابلا کے زمانے کے بعد سے نقش کی یہ وضع ھمیں برابر ملتی چلی جاتی ھے ' اور اسے کنواری کا جرہ (یعنی گلدان) کہتے ھیں - لیکن

---

* Arabic Spain, Sidelights on Her History and Art, by Bernhard and Ellen M. Whishaw. لندن سنہ ۱۹۱۲ م -

یہ امر کہ ' یہ خیال بہت ہی پرانا ہے ' اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی کے آخر تک یہ پھول ایسے رسمی سے ہوگئے تھے کہ ان میں سے اکثر کسی نباتاتی نمونے سے مشابہت نہیں رکھتے - اور اس بات کا تاریخی ثبوت موجود ہے کہ یہ علامت بہت کچھہ پرانی ہے کیوں کہ یہ لکھا ہے کہ ۱۴۰۳ میں ' انتی کویرا ' کے فرنندونے ' جو بعد میں ارافون کا بادشاہ ہوگیا تھا ' اشبیلیہ کی سانت ماریا (حضرت مریم) کی یادگار میں میں فروسوت (نائٹ) کی ایک جماعت قائم کی تھی جو کنول کے گلدانوں یا آنکھہ کی پتلیوں کی جماعت کہلاتی تھی ' جس کے نشان کو اشبیلیہ کے پادریوں کی جماعت نے اختیار کرلیا تھا —

اشبیلیہ کے بڑے گرجے میں کنولوں کا یہ مٹکا کئی جگہہ دکھائی دیتا ہے - اونچے مذبح کے نیچے کے مرمری فرش کے تمغوں میں یہ مٹکا موجود ہے اور اس کنواریوں کے گرجے کے پھاٹک کے اوپر بھی کچے لوہے میں بنا ہوا رکھا ہے جس کی بنیاد سولھویں صدی کے شروع میں پڑی تھی اور جس میں غریب لڑکیوں کے لیے جہیز مہیا کرنے کا سرمایہ جمع کیا گیا تھا - اس پھاٹک کے اوپر بشارت کی لوہے کی ایک تمثیلی تصویر ہے جس کے ساتھہ کنولوں کا مٹکا کنواری اور فرشتے کے درمیان رکھا ہوا ہے - اسی طرح یہ سترھویں صدی کے تمام خوبصورت بیل دار لباسوں میں ' جو بڑے تہواروں کے موقع پر استعمال کیے جاتے تھے ' یہ کسی نہ کسی شکل میں نظر آتا ہے —

مصر میں دریاے نیل کا سوسن ' جسے علم نباتات داں نہیں تو شعرا ضرور کنول کہتے ہیں ' ہر درجے کے زیور میں شامل ہے - پروفیسر فلنڈرس پٹری کا قول ہے کہ " یہ اس کثرت سے پھیلا ہوا ہے کہ

بعض لوگوں نے اس کو هر نوع کے زیور کا ماخذ خیال کیا هے "- مصر قدیم میں کنول ' خیم ' کی ایک نشانی هے ' جو عنصر زندگی هے اور جو وہ شراب هے جس سے اوسیریس (Osiris) نے دنیا کو زر خیز کیا - اس واسطے یہ مصری مذبحوں پر رکھا گیا تھا جہاں اس کی نوک دار پنکھڑیاں مرجع عبادت کی طرف شعلے کی طرح اٹھتی تھیں اور اس طرح اس کو 'مذبح کا چراغ' بنایا گیا' کیوں کہ یہ اس ابدی آگ کی علامت هے' جس سے اوسیریس دیوتا زمین کو از سر نو زرخیز بناتا هے —

شاید کنول کو زرخیز کرنے والی شراب کی علامت سمجھنے میں اس پرانی 'اندلوسیہ' کی روایت کی ابتدا هوئی هو کہ جو عورت کنول کی جڑ کو کھائے وہ کراماتی طور پر حاملہ هو جائے گی* - اسی لیے روایت یہ هے کہ کنول کو کنواری ماں مریم کا' جو خود بغیر انسانی وسیلے کے پیدا هوئی تھیں' نشان قرار دیا گیا تھا - لیکن یہ مخصوص مصری کنول اور خیم کی روایت اگر قبطیوں کے هاں سے نہیں تو کہاں سے آئی کیوں کہ قبطی هی اپنے پرانے مصری اعتقادات کو عیسائی ناموں کا باریک سا لباس پہنا کر لائے تھے —

... دریائے نیل کا تاریخی کنول ' جو کہ مصریوں کے مذبح کا چراغ تھا' آهستہ آهستہ پندرھویں صدی کے کنول کے مٹکے میں موسوم هوگیا اور پھر ... اس نے ان پھولوں کی شکل اختیار کر لی جو کسی قدرتی پھول سے مشابہت نہیں رکھتے - ایسے نمونے موجود هیں جن سے اندلوسیہ کی موجودہ دست کاری میں کنول سے نفرت (Nefert) کے سر پیچ کی نمود کا حال کھلتا هے - لیکن هو "روایت" کے غیر معمولی ثبات کی مثال کے طور پر یہ کہہ سکتے

* هم اوپر ابن شاهین اور ابن سیرین کی تعبیریں بیان کر چکے هیں -

ہیں کہ ہم نے حال ہی میں سنا کہ اشبیلیہ کے ایک بھلے مانس نے اٹھارھویں صدی کی ایک گل نما چیز کو پورے یقین کے ساتھ 'کنول' بتلایا اور دریافت کرنے پر اس نے یہ کہا کہ خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے اس کا یہ نام کیوں رکھا - واقعہ یہ ہے کہ یہ پھول کسی قدرتی پھول سے مطلق مشابہ نہ تھا ... ...

ممکن ہے ہمارا یہ خیال غلط ہو کہ کنواری نشان' جو اس کے حمل باکرہ کی طرف اشارہ ہے' شاید ہسپانیہ کے اس حصے سے مخصوص ہے کیوں کہ ہمیں اشبیلیہ میں مسیحی بتوں کے تذکرے اور ان کی علامات کی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں - لیکن شاید ہمارا یہ فرض کرلینا درست ہے کہ لیس اور ریشمی کپڑوں میں "جرہ" کے ان نقوش کی مصری اصل کو لوگ عموماً تسلیم نہیں کرتے کیوں کہ جتنی مستند کتابیں ہماری نظر سے گذری ہیں ان میں سے کسی میں ان کا اس طرح سے ذکر نہیں ہے' اور اس کی اصلیت پر بہت بحث و تکرار ہونے پر یہ طے پایا ہے کہ اس کی ابتدا نا معلوم ہے - سترھویں صدی کے آنٹ ورپ پوتن کانت (Antwerp Potten Kant) کے نقش' مع ان کی دو جدا شاخوں کے' اور پندرھویں اور سولھویں صدی کے اشبیلیہ میں ملنے والے کنواری کے مٹکوں میں قریبی مشابہت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ پہلا خیال ان نشیبی ملکوں میں اس وقت پھیلایا گیا جب وہ ہسپانیہ کی حکومت میں تھے - مس شارپ لکھتی ہے کہ "بعض مصنف پوتن کانت کو ایک پرانے نقش کی یادگار سمجھتے ہیں جس میں کنواری اور بشارت کی تصویر شامل ہے -" جیسا کہ مس شارپ کی راے ہے' یہ یقیناً ایک رسمی نقش ہے جو کنواری سے متعلق ہے؛ لیکن اشبیلیہ میں اس نے خود مریم ہی

کی معجزانہ پیدائش ہونے کی وجہ سے' نہ کہ بشارت کی تصویر میں شامل ہونے کے سبب سے' بہت زیادہ اہمیت حاصل کی ہے —

دریاے نیل کا کنول اندلوسیہ کے اس حصے میں عموماً نہیں دکھائی دیتا - زرد رنگ کا چھوٹا کنول وادی آرا * (Guadaira) میں' جو اشبیلیہ سے دو یا تین میل دور ہے' ایک محدود تعداد میں پیدا ہوتا ہے - لیکن سفید کنول یقیناً اس خطے کا ملکی پھول نہیں ہے' اور نہ یہاں کے باغوں میں اس کی کاشت ہوتی ہے - پس اس پھول کے نقاشیوں میں استعمال ہونے کو ہم کسی مقامی اثر پر محمول نہیں کر سکتے - اور نہ یہ فرض کرنا چاہیے کہ اس کا ابتدائی مطلب ان لوگوں کے دماغ میں موجود ہے جو مصری مذہبی کی شمع کے خاکے اب بھی بناتے ہیں - ان لوگوں کے نزدیک تو پھول ... ... خصوصی طور پر پھول ... ... صرف اسی کا نام ہے - ان کو اس بات کی تحقیق کرنے کا کبھی گمان بھی نہیں ہوتا کہ ایسا کیوں ہے - وہ اس پھول کو اب اپنی مصنوعات میں محض اس وجہ سے ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے آبا و اجداد نے ان سے پہلے ایسا کیا - اندلوسیہ کا دہقانی رسوم کا بہت احترام کرتا ہے - وہ گذشتہ لوگوں کی عزت کرنے کے لحاظ سے گویا مصری ہے ... ... جن لوگوں نے ہمارے کنول' کنول کے پودے اور کنول کے مذہبی شمع کی صنعتی تصویروں کے ذخیرے کو دیکھا ہے جو تعداد میں ایک سو سے زیادہ اقسام کے ہیں وہ ہماری ہی طرح روایت کے حیران کن ثبات سے متاثر ہوتے ہیں کیوں کہ یہ پھولوں کی رسمی یا غیر رسمی اقسام میں سے ایک بھی نہیں ہے - شاید یہ کہنا

* وادی آرا یا وادیارا ایک چھوٹا سا دریا ہے جو شہر اشبیلیہ کے قریب وادی الکبیر میں شامل ہو جاتا ہے (ملاحظہ البلاد اندلس کا تاریخی جغرافیہ ' ص ۳۸۸) -

مبالغہ نہ ہوگا کہ " وہ پھول " پھولوں کے تمام اقسام میں ' جو اشبیلیہ ' ' حلوا ' قادیس کے صوبہ جات میں اور المغرب کے ضلع میں پائے جاتے ہیں ' تقریباً نوے فی صدی ہے خواہ وہ مادہ ' جس سے تصویر بنائی جاتی ہے ' کچھہ بھی ہو - اور یہ قدیم و جدید مصنوعات میں یکساں ہے ۰ یہ اپنی خالص شکل میں ہمیشہ مصری کنول ہوتا ہے یونانی کبھی نہیں ہوتا - زندگی کے قدیم تصور کی اس مسلسل ساخت میں سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ ہم اس کو پچاس یا سو برس قبل کی بنی ہوئی چیزوں ' مثلاً فرنیچر ' میں پوری شکل میں مگر الٹا رکھا ہوا پاتے ہیں - جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مصور کو اس شکل کے بنانے کی غرض کا ' جس سے وہ اس قدر محظوظ ہوتا ہے ' قطعی علم نہیں ہے ... ... "

ایران قدیم کے مذہب اور متھیا بھی کنول کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے - البتہ اہل ایران جشن نیلوفر کے نام سے ہر سال ایک جشن مناتے تھے - یہ جشن عموماً ماہ تیر کی چھٹی تاریخ کو ہوتا تھا - یہ امر محقق نہیں ہے کہ اس جشن کا یہ نام کیوں رکھا گیا - قیاس چاہتا ہے کہ یہ جشن نیلوفر کے پھولنے کی رت میں ہوتا رہا ہوگا —

کنول پھول کو جو عظمت اور اہمیت اس کے سب سے بڑے اور غالباً اصلی وطن ہندوستان کی سرزمین میں حاصل ہوئی وہ کہیں اور نظر نہیں آتی - ہندی متھیا * میں دیوتاؤں اور دیویوں کو کنول پھول سے براہ راست تعلق ہے - ہمارے قدیم بتوں اور مجسموں میں برهما ' شیو اور وشنو اور ان کی دیویاں سرسوتی ' پاروتی اور لکشمی کنول پر بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہیں - قدیم ہندیوں کے ہاں کنول گویا

* Encycl. Relig. Eth.

نارایں اور برھما کا رحم مادر تھا - شاید یہی وجہ ہے کہ برھما جی اکثر مورتوں میں کنول پر جھکے یا اس پر بیٹھے ہوے نظر آتے ہیں - وشنو دیوتا کی اکثر مورتوں میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس کے کسی ایک ہاتھہ میں ایک کنول ہے - آگ کا دیوتا اگنی ، ہوا کا دیوتا پون ، خداے عقل گنیش ، وشنوجی کے اوتار سری رام چندر جی اور ان کے حریف بد بخت راون راکشس بھی اسی حالت میں نظر آتے ہیں - اس طرح اندر ، وشنو اور ان کے تمام اوتار ، اور سورج دیوتا بھی کنول پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں - لنکا میں بھی شِو اور پاروتی ، اور دولت کا دیوتا کُبیر ، اور قوّت سمع علم کی دیوی سرسوتی کی مورتیاں بھی اسی انداز میں پائی جاتی ہیں - اسی طرح جین مذہب کی پرانی عمارتوں اور مندروں میں بھی کنول پھول کو خداؤں سے قریب ترین قربت حاصل ہے - عام طور سے مورتوں میں وشنو کے چار ہاتھہ دکھائے جاتے ہیں جن میں سے ایک میں وہ کنول لیے ہوتا ہے ؛ اور اس کی سواری کا جانور* گرڑ (गरुड़) بھی جو آدھا پرند ہے ، اسی کنول کے سامنے جھکا ہوا دکھائی دیتا ہے - کنول وشنو کے ان چار اسلحہ میں سے بھی ایک ہے جو اس کو دیووں کے خلاف بچاتے ہیں † وشنوجی ‡ کی تسبیح بھی کنول کے بیجوں کی بنی ہوئی ہے — قسمت کی دیوی لکشمی وشنو دیوتا کی بیوی ، اور کام کی ماں ہے -

---

* **Iconography of Buddhist and Brahmanical sculptures in the Dacca Museum, by N. K. Bhattasali.** ص ۷۸ -

† **The Rites of the Twice-Born, by Mrs. S. Stevenson.** ص ۲۲۴ -

‡ **The Religions of India, by E. W. Hopkins.** ص ۵۰۲ -

راماین میں لکھا ہے کہ جب دیوتاؤں اور دیوتاؤں اور اسوروں نے منتروں کی جاپ کی تو وہ ہاتھہ میں کنول لیے ہوے اپنے پورے جمال کے ساتھہ سمندر سے ظاہر ہوئی - ایک دوسری روایت کے مطابق وہ پیدائش کے وقت کنول پھول پر تیر رہی تھی - کنول ہی کی مناسبت سے اس کو پدم کہتے ہیں - پرانوں کا بیان ہے کہ وہ بھرگو کی بیٹی ہے - وشنو پران میں لکھا ہے کہ جب ہری ایک بونے کی شکل میں پیدا ہوا تو لکشمی ایک کنول سے ظاہر ہوئی - لکشمی کے چار ہاتھہ ہوتے ہیں جن میں سے ایک میں کنول ہوتا ہے * —

سفیدی مائل سیاہ پتھر پر بنی ہوئی چھہ فٹ چار انچ اونچی وشنو کی ایک مورت ، جس کی لکشمن کاتی ، صوبۂ بکر گنج میں پوجا ہوتی ہے ، بابو گرو پرسام گھوش کے مکان پر ملی ہے - یہ مورت اب تک بالکل صحیح و سالم ہے - اس میں وشنو کی سواری کا جانور گرڑ ایک کنول پر ایک پیر کے بل ہاتھہ جوڑے ہوے کھڑا ہے - وشنو اس کے پھیلے ہوے بازوؤں پر بیٹھا ہوا ہے ، اور اس کے داہنے ہاتھہ میں ایک کنول ہے جس میں " کملا " دیوی بیٹھی ہوئی اپنے داہنے ہاتھہ سے خیرات کر رہی ہے اور بائیں ہاتھہ میں ایک کنول لیے ہوے ہے - اس کے دونوں طرف دو ہاتھی کنولوں پر کھڑے ہوے اپنی سونڈوں میں گھڑے لیے اس دیوی پر پانی برسا رہے ہیں - اسی طرح سے دیوتا کے بائیں ہاتھہ میں بھی ایک کنول ہے جس پر سرسوتی دیوی بیٹھی ہوئی ستار بجا رہی ہے † -

لکشمی نارائن کی سیاہ پتھر پر ایک مورت 'بسنہ' کے بھاو مکاس کے

---

* A Classical Dictionary of Hindu Mythology and Religion, by J. Dawson. ص ۱۷۲ -

† Icon. of Buddhist and Brahmanical Sculptures. ص ۸۶ -

مکان میں ملی ہے - اس مورت میں نارائن جی ایک کنول پر بیٹھے ہوے ہیں، اور ان کے ایک ہاتھہ میں پدم ہے - لکشمی دیوی اپنی داهنی ٹانگیں دهرائے ہوے وشنو جی کے زانو سے لگی بیٹھی ہیں اور ان کا داهنا ہاتھہ وشنو جی کی گردن میں پڑا ہوا ہے - گرڑ جھکا ہوا اس کنول کو اٹھائے ہوے ہے جس پر یہ دونوں بزرگ بیٹھے ہوے ہیں * -

"سور جلم" کی ایک خوبصورت سیاہ پتھر پر بنی ہوئی مورت ڈھاکہ میں دستیاب ہوئی ہے جس کی وشنوی خانقاہوں میں پوجا ہوتی ہے - اس دیوتا کے چار ہاتھوں میں سے ایک میں کنول ہے، اور اس کے نیچے دو "ناگ" جن کے سر انسان کی طرح کے ہیں، پیروں میں لپٹے ہوئے ہیں - ان میں سے ایک کنول لیے ہوے ہے † —

وشنو ‡ دھرم تار میں لکھا ہے کہ ورُن کو ایک ایسے رتھہ پر سوار ہونا چاہیے جس کو سات ہنس کھینچتے ہوں - اس کا رنگ ویدریا (ایک قیمتی جوہر) کے رنگ کا ہوتا ہے، اور اس کو سفید پوشاک پہنے ہوے، موتیوں کے زیور اور مالے سے مزین، اور اس کا پیٹ کسی قدر لٹکا ہوا ہونا چاہیے - اس کے چار بازو ہوتے ہیں؛ اس کے سر پر ایک سفید چتر اور بائیں طرف مچھلی کا جھنڈا ہوتا ہے - ورن کے داهنے ہاتھوں میں ایک پدم اور پاس اور بائیں ہاتھوں میں سنکھہ اور رتن پتر ہوتا ہے - اندر $ دیوتا کے ہاتھہ میں وجر اور انکوش یا نیلوت پل ہوتا ہے - بعض لوگ

* Icon. of Buddhist and Brahmanical Sculptures. ص ۸۸ -

† The Heart of Jainism by Mrs. S. Stevenson. ص ۱۰۶ -

‡ Elements of Hindu Iconography. از گوپی ناتھہ راؤ، ص ۵۳۰ -

$ Elements of Hindu Iconography. از گوپی ناتھہ راؤ - ص ۵۱۹ - ۵۲۰ -

کہتے ہیں کہ اندر کا رنگ سفید ہوتا ہے - اس کے چار بازو، اور پیشانی کے بیچ میں ایک تیسری آنکھ بھی ہوتی ہے - اس کے داہنے ہاتھوں میں سے ایک میں وجر اور دوسرے میں پدم ہوتا ہے؛ اور اس کے بائیں ہاتھوں میں سے ایک اندر رانی کے گرد ہوتا ہے اور دوسرے میں انکوش ہوتا ہے - نیل کنٹھہ * کی ایک مورتی 'بری سال' سے چند میل کے فاصلے پر کاشی پور میں پائی گئی ہے - اس مورت میں نیل کنٹھہ کی بیویاں، گنگا اور گوری، اس کے دونوں طرف کھڑی ہیں اور دونوں کے بائیں ہاتھوں میں ایک ایک کنول ہے - گوری دیوی † کی پوجا دنیاوی مقاصد کے حصول کے لیے کی جاتی ہے - روپ منڈن ‡ نے ساوتری کا حال یوں لکھا ہے کہ اس کے چار سر اور چار ہاتھہ ہوتے ہیں - ہاتھوں میں اکش مالا (अक्षमाला)، (پستک کتاب)، پدم اور کمنڈل (कमण्डलु) ہوتی ہے —

جنوبی هندوستان میں بھی کنول کو بڑے زور شور سے نوازا گیا ہے - وہاں کے متعدد دیوتاؤں کی مورتیاں کنول کی کسی نہ کسی صورت اور وضع سے مزین ملتی ہیں - سبرامنی $ کی بچپن کی تصویر کو بال سوامی (बालस्वामी) کہتے ہیں - اگر مورت میں ان کو ان کے والدین کے بغل میں کھڑا دکھانا منظور ہو، جیسا کہ شوجی کی سوما سکند (सोमास्कन्द)

* Iconography of Buddhist and Brahmanical Sculptures in the DaccaMuseum
از نلنی کانت بھٹا سالی، ص ۱۱٦ - ۱۱۷ -

† ایضاً، ص ۱۹۹ -

‡ Elements of Hindu Iconography از گوپی ناتھہ راو - ص ۵۰٦ -

$ Elements of Hindu Iconography، ص۴۳۹، Subrahmanya
by T. A. Gopi Nath Rao.

مورت میں هے، تو ان کو ایک ایسے بچے کی طرح بناتے هیں جس کے هر هاتھ میں ایک کنول هو اور جس کا بایاں هاتھ پٹھے پر رکھا هو۔ اس تصویر کا رنگ بھی لال هوتا هے ۔ برهم چاری سبرامنی کے دو آنکھیں اور دو بازو هوتے هیں اور وہ پدم پر کھڑا هوتا هے ۔ اس کے سر پر کھلے بال، یجنو پویت * (यज्ञोपवीत)، مونجی (مونج کا کمر بند) اور کوپن (कौपिन) هوتا هے ۔ داهنا پیر پدم پر مضبوطی سے ٹکا هوتا هے اور بایاں کسی قدر خم دار اس پر رکھا هوتا هے ۔ داهنے هاتھ میں ایک ڈنڈا اور بائیں میں ایک وجر (वज्र) هوتا هے ۔ اس کا رنگ بھی لال هوتا هے ۔ سبرامنی کی دیویوں کا بیان کمارتنتر † میں اس طرح سے هے که مهاولی (महावल्ली) کو کالے رنگ کی اور هنس مکھ هونا چاهئے ۔ اس کو داهنے پیر کے بل زمین پر کھڑا هوا اور اس کا بایاں پاؤں داهنے پاؤں پر ٹکا هوا هونا چاهیے ۔ اس کے بائیں هاتھ میں ایک پدم (کنول) اور داهنا هاتھ لٹکا هوا هونا چاهیے —

شاستان کاٹ ٹی ‡ (تراونکور میں) کے مندر میں شاست (Sasta) کی ایک مورت هے جس میں اس کے دو بازو هیں جن میں دهنش (کمان) اور بان هیں: اور وہ سیدها کھڑا هوا هے ۔ پربھاولی (प्रभावल्ली) کے دو مزین ستونوں پر شاست کی دو دیویاں بھی بنی هوئی هیں ان میں سے داهنی والی کے هاتھ میں ایک پدم اور بائیں والی کے هاتھ میں نیلوت پل (नीलोत्पल) هے ۔ جین $ مذهب کے ایکیسویں تیرتھنکر،

* Elements of Hindu Iconography، ۴۴۲
† ایضاً، ص ۴۴۵ —
‡ ایضاً، ص ۴۹۲ ؛ Sastankattai
$ The Heart of Jainism، ص ۵۷ ۔

نامی ناتھہ ' کی علامت نیلا کنول ھے - چھٹے تیرتھنکر کی ماں ' سوسانہ * (सुसाना)' کو لال کنول کے بستر پر لیٹنے کا بہت شوق تھا جس کا نتیجہ یہ ھوا کہ اس کے بیٹے نے سرخ کنول اپنی علامت رکھی - شری چکر سانبھارا تنتر میں چکر مہاسکھہ کی مورتی کا حال یوں لکھا ھے کہ وہ ایک آٹھہ پنکھڑیوں والے کنول میں بند ھے - اس کنول کی چار پنکھڑیوں پر ڈاکنیوں کی مورتیں بنی ھوئی ھیں اور باقی چار پنکھڑیوں پر آب حکمت سے بھرے ھوے ظرف ھیں جن پر کھوپری کی وضع کے پیالے ھیں - ان پیالوں میں پانچ قسم کے آب حیات ھیں - خاص دیوتا کے پاؤں کنول پر ٹکے ھوے ھیں - ان آٹھہ متحرک پنکھڑیوں کے نیچے کئی چھوٹی چھوٹی ساکت پنکھڑیاں بھی بنی ھوئی ھیں - یہ پھول ایک موٹے سے تنے نکلا ھے اور اس کے دونوں طرف دو جوان دو هری ناگ لڑکیاں بنی ھوئی ھیں جن کے بدن ایک ھی اُٹھی ھوئی دم سے نکلے ھیں - یہی لڑکیاں کنول کی چھوٹی پتیوں کو سنبھالے ھوے ھیں ..... اس مورت کی مجموعی ھیئت میں چند اور جانور — نیولا ' بندر ' ھاتھی ' ھرن ' خرگوش اور ایک شیر — بھی نظر آتے ھیں ؛ اور هر چیز کی تہ میں کنول پھول اپنی مختلف حالتوں میں آشکارا ھے —

زمانہ قدیم میں اکثر بندگان خدا "کنول پوجا" ‡ کیا کرتے تھے (اور اب بھی کرتے ھیں !) جس میں انھیں اپنی جان تک کو قربان کرنا پڑتا تھا - کہا جاتا ھے کہ اس قربانی کے اثرات کی کوئی انتہا ھی نہ تھی -

---

* The Heart of Jainanism ؛ ص ۵۲ -

† Tantric Tents by Avalon ' جلد ۷ ' ص ۲۱ - ۳۱ ' مذکور در Icon. of Buddhist and Brah. Sculp. in Dacca Museum. از نلنی کانت بھٹاسالی -

‡ The Rites of the twice-Born by Mrs. S. Stevenson ' ص ۳۹۸- ۴۰۰

پدم شلا * (पद्मशिला) (کنول کی سل) ھر اس عمارت کے سنگ بنیاد کو کہتے ھیں جو ھندو مراسم کے مطابق تعمیر کی جاتی ھے؛ کیونکہ اس پر ایک آٹھہ پنکھڑیوں والا کنول کندہ ھوتا ھے - اس کنول پر زعفرانی رنگ کا ایک سواستیک بنایا جاتا ھے -

زرد تار † کی ایک قسم وجرتار ھے - اس کی مورتیں کلکتہ کے عجائب گھر میں رکھی ھوئی ھیں لیکن ان میں سب سے زیادہ دل چسپ ایک آٹھہ انچ اونچا کنول ھے ' جو ایک پایدان ' ایک پھول اور ایک ٹوپی نما سی چیز سے مل کر بنا ھے - پایدان کے اوپر آٹھہ پنکھڑیوں کا ایک کنول ھے جس کی ھر پنکھڑی پر ایک دیوی بنی ھے - بیچ میں بھی ایک ایک دیوی بیٹھی ھوئی ھے ' جو شاید بودھ مت کی دیوی تارا ھے - اس کے آٹھہ بازو ھیں اور اس کے سر پر ایک استوپ بنا ھوا ھے - یہ کنول ایک مشین کے ذریعے سے بند ھوجاتا ھے اور اسی سے کھل بھی سکتا ھے - جب تمام پنکھڑیاں سمٹ کر بند ھوجاتی ھیں تو وہ ایک کنول کی کلی معلوم ھوتی ھے —

پوجا کرنے میں جو مختلف ارکان عبادت ھیں ' ان میں بھی کنول کو دخل ھے - چنانچہ کمل مدر حالت میں "پجاری ‡ اپنے دونوں ھاتھہ جوڑ کر ایک کھلے ھوے کنول کی شکل بناتا ھے" - اھل ھند نے اسی سب پر اکتفا نہیں کی ' بلکہ انسان کے جذبات میں سے ایک کا نام ' کنول کے نام پر

---

* The Rites of the Twice - Born by Mrs. S. Stevenson. ص ۳۵۵ -

† The Heart of Jainism by Mrs. S. Stevenson. ص ۴۵ - ۴۶ -

‡ The Rites of the Twice - Born by Mrs. S. Stevenson. ص ۲۲۴ -

پدم لیسیا (पद्मलेश्या) رکھا ہے - اس نام کی وجہ استعمال یہ بتائی جاتی ہے کہ اس حالت میں انسان ہر اچھی شے کی طرف اسی طرح راجع ہوتا ہے جس طرح کہ کنول سورج کی طرف کھلتے ہیں * —

کنول بدھ مذہب کا بھی ایک مقدس پھول ہے - چونکہ یہ پھول کیچڑ میں اُگتا ہے، پانی میں بڑھتا ہے اور ایسے غلیظ اور گندے مبدا سے پیدا ہونے کے باوجود ایسی عمدہ خوشبو دیتا ہے؛ اس لیے اس کو ایک نیک بندے سے تشبیہہ دیتے ہیں جو اس دنیاے دنی میں رہتا ہے - سر مونیر ولیمز نے لکھا ہے کہ "اس پھول کا علامتی استعمال اس وجہ سے ہے کہ اس کی ساخت بالکل ایک پہیے کی طرح کی ہوتی ہے - اس کی پنکھڑیاں تیلیوں کی جگہ لیتی ہیں اور اس طرح سے ہستی کے ابدی چکر کی تعلیم دیتی ہیں" - ہم اکثر مہاتما بدھ کو ایک سنہرے کنول پر بیٹھا یا کھڑا ہوا دیکھتے ہیں؛ اور اس سے ہمیں وہ بودھی سوتر یاد آتا ہے جسے اصطلاح عام میں "شریعت حقہ کا کنول" کہتے ہیں —

بودھ مت کی سکھاوتی کی جنت میں جہاں عورتوں کا بالکل وجود ہی نہیں ہے، ہر شخص ایک دیوتا کی شکل میں کنول کے پھول سے پیدا ہوتا ہے جسے سد دھرم پنڈریک (सद्धर्मपुण्डरीक) کہتے ہیں - بدھ مذہب کا ایک اور عقیدہ ہے کہ زمین پر جہاں جہاں مہاتما بدھ کا قدم پڑتا تھا اُن کے قدم کے نشانات کنول کی شکل کے ہوتے تھے - پالی شرع میں اس کے بے شمار حوالے ملتے ہیں؛ مگر مہا پدن سُتانت میں جس میں، مہاتما کے پہلے سات قدموں کا ذکر ہے، اس کا

---

* The Heart of Jainism by Mrs. S. Stevenson. ص ۱۰۳ - ۱۰۴ .

کوئی ذکر نہیں ملتا ' یہ سب تفصیل بعد کی کتابوں اور تحریروں کی ہے -

زمانہ قدیم میں کنول اور سورج میں ایک علاقۂ وحدت مانا جاتا تھا - بہت ممکن ہے کہ اس کا سبب یہ قانون فطرت تھا کہ کنول طلوع آفتاب کے ساتھ سر پانی سے نکالتا ہے اور پھر اس کے غروب کے ساتھ غائب ہوجاتا ہے - اس سے پرانے زمانے کے لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ پھول سورج کا شبستان ہے ' یا یہ کہ وہ سورج کو روزانہ از سر نو روشنی بخشتا ہے اور سطح فلک پر چڑھاتا ہے - کنول کی تصویر سورج کے ساتھ ہم گندھار کی عمارتوں میں پاتے ہیں -

ہاتھ میں کنول ہونے سے نہ محض یزدانی پیدائش بلکہ حیات جاودانی پر قابو رکھنا بھی مقصود ہے - اس کی مثال آریوں کی آسمانی ملکہ ' ہندوؤں کی دیوی شری اور بودھ مذہب والوں کی تارا ہیں - جیسا کہ اوپر تحریر ہوا بودھ مذہب سے قبل ویدوں کے زمانے میں کنول رحم مادر کا نشان تھا اور غالباً بودھ مذہب کی دعا "اوم منی پدم ہوم" میں اس معنی کا بھی لحاظ کیا گیا ہے ! اور بہت ممکن ہے کہ تارا کے منگیتر اولوکتا کے ہاتھ میں کنول ہونے سے اس معنی کا بھی کوئی تعلق ہو —

ذیل میں بودھ مذہب کے ان دیوی دیوتاؤں کی تفصیل ہے جن کے ہاتھ میں کنول ہے :

(۱) ہاتھ میں کسی قسم کا کنول ہونا تارا ' اولوکتا ' پدم پنی اور کبھی کبھی میترے کی علامت ہے -

(۲) کنول کے اوپر ایک تلوار کا ہونا اسوگھہ پاش ' کھگر بھہ ' سمہناد ' تارا ' پدماپنی ' اولوکتا اور میترے کا نشان ہے —

(۳) کنول اگر بجلی کے ہمراہ ہو تو منجسری اور وجر پان (वज्रपाणि) کی علامت ہے —

(۴) کنول اور کتاب ساتھہ ہوں تو منجسری اور پرجن پرمت (प्रज्ञापारमित) کا نشان ہے —

(۵) گوھر کی معیت میں کنول کشتی گربھ اور ایکجات (एकजात) کی علامت ہے' اور —

(۶) سورج کے ساتھہ سامنت بھدر (सामन्तभद्र) کا نشان ہے - تبت کے سادھوؤں کے واسطے کنول لاما کے طایفے کے بانی کا خاص نشان ہے اور پدم کار (पद्मकार) (یعنی' کنول سے پیدا شدہ) سونگ کھاپ (زرد ٹوپی والے مصلح فرقہ کے بانی) اور کلوگ لاما کا نشان دو کنول ہے —

بودھ متھیا میں پالی شرع کے بدھ نام کے پہلے چوبیس مہاتماؤں میں سے دو کے نام کنول پر ہیں' یعنی پدم اور پدو متر! اور بہت سے ناگ سورماؤں کے نام' مثلاً پدو متر اور پنڈریک' اور بدھ مت کی کئی دوزخ' پدم' مہا پدم اور پنڈریک کے نام بھی کنول پر ہیں -

آئیے اب جاپان اور چین کی بھی سیر کریں اور دیکھیں کہ وہاں کنول پھول کس رنگ میں جلوہ گر ہے - جاپانیوں کے ہاں یہ روایت* بہت مشہور ہے کہ بدھ جی ڈنڈک پہاڑ پر اپنا مراقبہ ختم کرنے کے بعد پہاڑی راستوں سے گذرتے ہوے شہر کی طرف روانہ ہوے - رات سخت تاریک تھی - ہر طرف ہر چیز پر خاموشی طاری تھی - اپنی منزل مقصود کے قریب پہنچ کر مہاتماجی نے کسی کی آواز سنی جو یہ کہتا تھا " شبو جبو سو جبو'

* Myths and Lengeds of Japan by F. H. Davis. ' ص ۸۰ - ۸۲-

(یعنی' ظاہری اطوار باطنی کیفیات کی ہمیشہ ترجمانی نہیں کرتے)۔ یہ الفاظ سن کر بدھ جی بہت خوش ہوے۔ بار بار یہ الفاظ سن کر ان کا جی چاہا کہ معلوم کریں کہ ایسی عاقلانہ باتیں کون کر رہا ہے۔ اسی دھن میں آگے بڑھے۔ ایک چٹان کے کنارے پہنچ کر انہوں نے نیچے وادی میں دیکھا کہ ایک بد صورت اژدہا غضب آلود نگاہوں سے ان کو گھور رہا ہے۔ مہاتما جی ایک چٹان پر بیٹھ گئے اور اژدہے سے دریافت کیا کہ "تو نے بدھ مذہب کی یہ نفیس تعلیمات کہاں سے سیکھیں" پھر بدھ جی نے اس سے اسی قسم کے اور عمدہ اقوال اور نصائح دریافت کیے۔ اژدہے نے چٹان کے گرد لپٹ کر بلند آواز سے کہا: زی شیو متسوپو (یعنی' تمام جاندار بدھ جی کی شریعت کے خلاف ہیں)۔ اس کے بعد اژدہا تھوڑی دیر تک خاموش رہا' اور مہاتما جی کی درخواست پر پھر یوں گویا ہوا کہ "شیو متسو متسوای" (کل نفس ذائقۃ الموت) یہ کہنے کے بعد اژدہا پھر خاموش ہوگیا۔ اس کی شکل سے بھوک کے آثار ظاہر ہورہے تھے۔ اس نے کہا کہ میری آخری نصیحت اس قدر بیش بہا ہے کہ میں اس کو اس وقت تک نہیں بتا سکتا جب تک کہ میرا پیٹ نہ بھر جاے۔ یہ سن کر بدھ جی نے فرمایا کہ "میں تیرے واسطے کسی چیز سے دریغ نہ کروں گا' مگر مجھے چوتھی نصیحت بتادے"۔ پھر آپ نے اس سے یہ بھی دریافت کیا کہ "تجھے کس چیز کی حاجت ہے"؟ جب مہاتما جی کو یہ معلوم ہوا کہ اپنے چوتھے قول کے بدلے میں اژدہا انسان کے گوشت کا خواہاں تھا تو انہوں نے فرمایا کہ "گو مذہب میں جیوھتیا کی سخت ممانعت ہے تاہم میں اپنی اُمت کے واسطے اپنی جان تک قربان کروں گا"۔ اژدہے نے اپنا منہ کھولا اور یہ کہتے ہوے کہ

"جاکو، متسوای راکو" (یعنی، سب سے بڑی خوشی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب روح تن سے جدا ہوتی ہے) مہاتما کو اپنا نوالہ بنا لیا۔ جوں ہی مہاتماجی اژدھے کے منہ میں پہنچے ان کے آٹھہ حصے ہوگئے اور چشم زدن میں وہ سنہرے کنول کی آٹھہ پنکھڑیاں بن گئے!

ذیل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پھول میں جادو کی طاقت بھی ہے جس کی مدد سے یہ بد ارواح کو دور رکھتا ہے*:-

ایک دفعہ شہر کیوتو میں ایک وبا پھیلی جس نے ہزاروں آدمیوں کو موت کے منہ میں پہنچا دیا۔ بڑھتے بڑھتے یہ وبا ادزومی (Idzumi) تک پھیل گئی جہاں کوریاما کا بادشاہ بود و باش اختیار کیے ہوئے تھا؛ اور کوریاما اپنی بیوی اور بیٹے سمیت اس مرض میں مبتلا ہوگیا۔ اس کے محل کے ایک افسر اعلیٰ تادا سامون (Tada Samon) نے ایک سنیاسی سے ملاقات کی جو بادشاہ کی علالت کے وجہ سے بہت متفکر تھا - اس نے سامون سے کہا کہ یہ تمام مصیبت یہاں بد ارواح کے آجانے سے پیدا ہوگئی ہے اور وہ یہاں اس لیے آگئی ہیں کہ اس عمارت کے گرد کی نہریں خشک ہوگئی ہیں اور ان میں کنول نہیں رہے - اگر ان نہروں میں پھر وہی مقدس پھول لگا دیے جائیں تو یہ بری ارواح یہاں سے چلی جائیں گی، اور ہمارے بادشاہ، مع بیوی بچے کے، صحت یاب ہوجائیں گے - سامون یہ سن کر بہت خوش ہوا اور اس سنیاسی کو اجازت دلا دی کہ وہ اس محل کے گرد کنول کی کاشت کرے - اس کام کے ختم ہونے پر سنیاسی غائب ہوگیا؛ اور ایک ہفتے کے اندر ہی کوریاما، اس کی بیوی اور بیٹا اس قابل ہوگئے کہ اپنے فرائض حیات انجام

* Myths and Legends of Japan. ص ۱۷۰ -

دینے لگے، کیونکہ اس وقت تک دیواروں کی مرمت کی جا چکی تھی اور صاف پانی پہنچایا جا چکا تھا جس پر جھومتے ہوے کنولوں کا عکس پڑتا تھا —

کئی سال کے بعد، جب شاہ کوریاما مرچکا تھا، اتفاق سے ایک سمورائی (Samurai) اس محل کے قریب سے گذرا - ابھی وہ حیرت سے ان پھولوں کو دیکھہ ہی رہا تھا کہ اس نے پانی کے کنارے دو حسین لڑکے کھیلتے ہوے دیکھے - وہ چاہتا ہی تھا کہ ان کو کسی محفوظ جگہ میں پہنچا دے کہ یکایک دونوں لڑکے اچھل کر پانی کے اندر گر پڑے - متحیر سمرائی یہ سوچ کر، کہ میں نے کاپا (Kappas، دریائی ارواح) دیکھی ہے، فوراً محل کو واپس گیا؛ اور وہاں سارا واقعہ بیان کیا - اس کا بیان سن کر نہر کو صاف کروایا گیا لیکن فرضی ارواح کا کہیں پتہ نہ ملا - کچھہ عرصے کے بعد ایک دوسرے سمرائی، مورت اِپائی (Murata Ippai)، نے بھی اسی کنول کے پاس کئی خوبصورت لڑکے دیکھے - اس نے اپنی تلوار کھینچ کر ان کا سر قلم کر ڈالا - اپنے قتل کا شمار کرنے کے واسطے جب اپائی نے اپنے گرد دیکھنا چاہا تو اس کے گرد رنگین بادل چھا گئے اور وہ کچھہ نہ دیکھہ سکا - مجبوراً تمام رات اپائی وہیں پڑا رہا - صبح کو جب آنکھہ کھلی تو اسے معلوم ہوا کہ اس نے محض کنول کے پھول توڑ ڈالے تھے - اسے یہ معلوم کرکے اور بھی افسوس ہوا کہ انھیں پھولوں نے کوریاما، اس کی بیوی اور بچے کی جان بچائی تھی - اپائی سخت نادم اور پشیمان ہوا اور دعائیں پڑھ پڑھ کر توبہ و استغفار کیا —

لفکیڈیو ھرن (Lafcadio Hearn) نے جاپان کے بہشتی کنول کا حال

یوں بیان کیا ہے کہ ''یہ دل پسند ہستیاں باغ لگاتی ہیں' کنول کی کلیوں کی حفاظت کرتی ہیں؛ اور ان کی پنکھڑیوں پر ایسی آسمانی شے چھڑکتی ہیں جس سے ان کو کھلنے میں مدد ملتی ہے۔ کلیاں کسی قدر خوبصورت ہیں: ان کے رنگ اس دنیا کے نہیں ہیں۔ ان کے روشن دلوں کی صبح کی سو چمک میں چھوٹے چھوٹے ننگے بچے بیٹھے ہوے ہیں' اور ہر ایک کے گرد ایک چھوٹا سا ہالہ ہے - یہ ارواح نئے نئے بدھ اور 'ہوتوکے' (Hotoke) ہیں' جو خوشی میں پیدا ہوئے ہیں - کچھ بہت ہی چھوٹے ہیں اور کچھ بڑے بڑے۔ ہر ایک ظاہرا بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کی دایائیں آب حیات کا سا اثر رکھنے والی چیزیں ان کو کھلاتی ہیں۔ ان میں سے ایک نے اپنا کنول کا ھنڈولہ چھوڑ دیا ہے اور ایک جیزو (Jizo) کی رہنمائی میں عالم بالا کی روشنی کی طرف جارہے ہیں'' —

اہل چین * کی متھیا میں تو'مو' شمالی ستارے کی دیوی ہے - بدھ مت اور تاؤ مت دونوں کے پیرو اس کی پوجا کرتے ہیں - تو'مو' دیوی کی مورتی میں دیوی کے سر پر ایک تاج ہے - اور وہ کنول کے تخت پر بیٹھی ہوئی ہے - اس کے تین آنکھیں اور اٹھارہ بازو ہیں - یہ دیوی موت و حیات کی کتاب پر موکل ہے اور جولوگ عمر طویل کے خواہشمند ہیں وہ اس کی پوجا کرتے ہیں۔—

اہل چین کنول نوازی میں کچھ اور آگے بڑھ گئے ہیں - انہوں نے اپنے بعض مقامات کے نام کنول کے نام پر رکھے ہیں - چنانچہ ان کی متھیا†

* چین کی متھیا ' ورنر ؛ ص ۱۴۳ -

† چین کی متھیا ' ورنر ؛ ص ۳۴۴ - ۳۴۵ -

میں بلدر دیوتا کے متعلق (جو ایک مہتم بالشان ہستی ہے) ایک طول طویل کہانی ہے، اس کی واردانوں کے مقامات میں سے ایک پہاڑ ہے، جس میں ایک غار ہے جسے 'کنول غار' کہتے ہیں؛ اور اس غار میں دیووں کا ایک جتھا رہتا ہے —

چین * میں بدھ مذہب کے دیوتاؤں میں ایک مسئلۂ تثلیث بھی ہے میں مہاتما بدھ، ان کی تعلیم اور پوجا شامل ہے؛ اور جسے وہ لوگ شیکیا فو (شاکیہ)، اومی توفو (امیت) اور جولائی فو (تتھا گاتا)؛ اور کبھی کبھی فوپاؤ، فے پاؤ اور سینگ پاؤ (سین پاؤ یعنی، تین نادر ہستیاں— مہاتما بدھ، جو اس دنیا میں دھرم بتانے کے لیے آئے؛ دھرم اور سنگھ) کہتے ہیں - پروهتوں کے واسطے یہ محض بدھ جی — گذشتہ، موجودہ اور آئندہ — ہیں - ان تینوں بزرگوں کو نقش یا مورتی میں اس انداز سے دکھایا جاتا ہے کہ وہ کنول پر بیٹھے ہوے ہیں —

اہل یونان بھی کنول کی عالم گیر اور سخت گرفت سے آزاد نہ تھے - چنانچہ قدیم یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ جنگل † اور سڑکوں کے کنارے پر کا ہر درخت ایک خاص دیوتا کی حفاظت میں رہتا ہے جس کو وہ ہمدریاد (Hamdryad) کہتے تھے - اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ دیوتا اسی درخت پر رہتا تھا اور اپنی جان بھی اسی پر قربان کر دیتا تھا - کچھ لوگوں کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ بعض انسانی ہستیاں اپنی وفات کے بعد ہمدریاد کی شکل اختیار کرلیتی تھیں - چنانچہ روایت ہے کہ

---

* چین کی متھیا، ورنر ص ۱۱۹ - ۱۲۰ -

† یونان اور روم کی متھیا مصنفہ ہ، ا، گربر (H. A. Guerber) ص ۲۶۱ - ۲۶۳ -

ایک نوجوان شہزادی، جس کا نام دریوپ (Dryope) تھا، سن بلوغ کو پہنچتے ہی اپنے واسطے ایک مناسب شوہر کی متلاشی ہوئی: اور بڑی جد و جہد کے بعد اس کی شادی اندریمان (Andraeman) نامی ایک شاہزادے سے قرار پائی - قصہ مختصر، شادی ہوئی اور خدا نے اس کو ایک بیٹا بھی دیا - شہزادی دریوپ ہر روز اس بچے کو منزل کے قریب ہی ایک تالاب پر لے جایا کرتی جس میں رنگ برنگ کے پھول اُگے ہوے تھے - ایک دن جب وہ حسب معمول وہاں خرام ناز میں مشغول تھی، اس نے ایک کنول کا پھول دیکھا، اور اپنے بچے کو بھی دکھایا - پھول کو دیکھتے ہی بچے نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا - اس کو خوش کرنے کے لیے دریوپ نے پھول توڑ کر بچے کو دے دیا - پھول کے توڑتے ہی ٹوٹی ہوئی ٹہنی سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے اور دریوپ نقش حیرت بن کر رہ گئی - دفعتاً اس نے ایک آواز سنی جس نے اس پر لوتس (Lotis) نامی ایک ارواح کو مار ڈالنے کا الزام لگایا جس نے سایہ کے دیوتا پرائی پوس سے بچنے کے واسطے ایک پھول کی شکل اختیار کرلی تھی - دریوپ نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کے قدم زمین میں گڑے رہ گئے - اس کی حیرت و یاس کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ درخت کی چھال اس کے پیروں پر بہت تیزی سے چڑھتی جا رہی ہے: یہاں تک کہ اس کا پورا جسم چھال اور پتوں سے ڈھک گیا اور انسانی ہیئت کا کوئی اثر تک باقی نہ رہا: وہ ایک درخت میں منتقل ہوگئی —

یونان کی قدیم تاریخی روایات میں شہر صور (ترواے) اور ہیلن کے واقعے کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ذکر اور تکرار سے مستغنی ہے - لطف

یہ ہے کہ اس تمام واقعے میں بھی کنول کار فرما ہے - راوی جادو بیان روایت کرتا ہے کہ ترائے سے واپس ہو کر یولی سیس * اپنے ہمراہیوں کے ساتھہ سفر کی تکلیفیں برداشت کرتا ہوا ایک ملک میں پہنچا جن کی خاص خوراک کنول کا پھل (تال مکھانا ؟) تھی؛ اور اسی سبب سے اس کو "کنول خوروں" کا ملک کہتے تھے - یولی سیس نے اول اپنے تین ہمراہیوں کو وہاں کے باشندوں سے ملاقات کرنے کے لیے روانہ کیا - اندر پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ وہاں کے چند بے فکرے اپنے محبوب درخت کے نیچے بیٹھے ہوے اسی کے پھل کھا رہے ہیں - انہوں نے نہایت ہی احترام سے اجنبیوں کا خیر مقدم کیا، اور کنول کے پھل سے ان کی خاطر تواضع کی. اس پھل کے کھاتے ہی ان کے دماغ سے اپنے وطن اور اہل وطن کا خیال بالکل جاتا رہا ان پر مدہوشی سی طاری ہوگئی —

یولی سیس نے بڑی بے چینی سے ان کا انتظار کیا اور آخر کار کسی نئے حادثے کے وقوع سے خوف زدہ ہو کر وہ چند مسلح آدمیوں کو ساتھہ لیتا ہوا آگے بڑھا - اپنی امید کے برخلاف زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھنے کے بجاے، اس نے ان لوگوں کو کنول خوروں کے ساتھہ رنگ رلیاں مناتے پایا - اُن کی نظروں سے مدہوشی ٹپک رہی تھی - ان کی یہ حالت دیکھہ کر اس کو شبہہ ہوا - اسی وقت چند کنول خوروں نے نو وارد مہمانوں سے بھی دعوت میں شامل ہونے کی درخواست کی - فوراً ہی یولی سیس نے اپنے رفیقوں کو اس سحر آمیز غذا کو کھانے سے روکا اور اپنے دوستوں کو زبردستی گرفتار کر کے جہاز پر لے گیا - تھوڑی دیر بعد ان کا نشہ ہرن

---

* یونان اور روم کی متھیا، باب ۲۸، ص ۳۰۱ - ۳۰۳ ؛ یولی سیس کی مہمات۔

ہوگیا اور سب لوگ استقلال کے ساتھہ مغرب کی طرف چلے گئے —

هندوستان کے هتھہ یوگی فلسفے میں بھی کمول کو بہت بڑی اهمیت حاصل ہے شت چکر نرپلم (षतचक्रनिरपुणम) نام کے تن تری رسالے میں لکھا ہے کہ آدھار کنول کا بیرونی پردہ ایک مثلث ہے اور اس مثلث کے اندر لنگ ہے جسے سویمبھہ کہتے ہیں - انسان کے بدن میں سر سے زیر ناف تک چھہ نقاط ایسے ہیں جن کی باقاعدہ اور صحیح ورزش ونگہداشت سے نہ صرف یہ کہ صحت قائم رهتی اور ترقی کرتی ہے بلکہ انسان لیل و نہار کے عدد و شمار سے آزاد ہوکر حیات ابدی بھی حاصل کرسکتا ہے اور اس کائنات میں دانائے کم و کیف اور واقف اسرار موت و حیات بن سکتا ہے - ان نقاط کو عموماً چکر کہتے ہیں اور کنول سے تشبیہہ دیتے ہیں - ان میں سے ہر ایک چکر کی تربیت اور صحیح ورزش سے مختلف اور متعدد حیران کن نتائج پیدا ہوتے ہیں جن سے انسان اپنی جسمانی اور روحانی زندگی میں نامحدود اور بے انتہا ترقی کرسکتا ہے - هتھہ یوگ میں جسمانی ریاضت اور ورزش کی متعدد تدبیریں بتائی گئی ہیں - جسمانی صحت کے حصول' قیام اور دوام کے لیے جو ریاضتیں مقرر ہیں ان کو مجموعی طور پر پرانا یام (प्राणायाम) کی ریاضت کہتے ہیں - پرانایام میں طرح طرح کے آسنوں میں یعنی نشستوں سے کام لیا جاتا ہے - ان آسنوں میں ایک کا نام پدم آسن (पद्मासन) یعنی نشست نیلوفری ہے - پدم آسن بناکر سانس کو زور سے اندر کھینچنے کی تلقین کی جاتی ہے اور اس بارے میں هتھہ یوگ پر دیپک (हठयोग प्रदिपिका) میں یہ تاکیداً بتایا گیا ہے کہ سانس کے ساتھہ ہوا کو دل کے کنول تک بھر لینا چاهیے - اس کی تعریف میں لکھا ہے کہ " جب پیٹ ہوا سے پوری

طرح بھر جاتا ہے تو بدن گہرے پانی میں اس طرح تیرنے لگتا ہے جیسے کنول کی پتی * " —

پر دیپک میں جسم کے چھ ' چکروں " (یعنی ' مرکزوں) کو کنول کے پھولوں سے تشبیہہ دی گئی † ہے - اہل شاستر کا عقیدہ ہے کہ سوم (सोम - یا چندر चन्द्र) انسانی دماغ میں ایک ہزار پتیوں والا کنول ہے اور یہ وہی چیز ہے جو تصویروں میں شیو دیوتا کے سر پر لگا نظر آتا ہے - اس کنول میں سے ایک قسم کا عرق ہر وقت ٹپکا کرتا ہے ؛ اور اگر کوئی شخص اس عرق کے روک لینے پر قادر ہو جائے تو وہ ابد تک زندہ رہ سکتا ہے ‡ چنانچہ پردیپک کے پچاسویں دو ہے میں یہ الفاظ ملتے ہیں : —

" جو کوئی چاند (چندر یا سوم) کی شراب کے ان صاف شفاف قطروں کو پیتا ہے جو دماغ سے دل کے اندر سولہ پتیوں والے کنول پر ٹپکتے ہیں اور جن کو پران (प्राण) کے ذریعے اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ زبان کو حلق کے کوّے سے لگا دیا جاے اور اس حالت میں اس بڑی طاقت پر مراقبہ کیا جائے وہ ہر مرض سے آزاد ہوجاتا ہے اور اس کا بدن کنول کی ڈنڈی کی طرح نازک اور ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے ؛ اور ایسا کرنے والا یوگی بہت بڑی عمر پاتا ہے $ " —

اصل یہ ہے کہ ایشیا کی آریہ اقوام کے عقیدے میں کنول کو قدیم الایام سے بذات خود ایک خدا ' یا کم از کم ایک فوق الانسان

---

* ہتھا یوگ پردیپک ' انگریزی ترجمہ از پنچم سنگھ (الہ آباد ' ۱۹۱۵ ع) ' ص ۲۶ —
† ہتھا یوگ پردیپک ' انگریزی ترجمہ از پنچم سنگھ (الہ آباد ۱۹۱۵ ع) ص ۲۸ -
‡ ایضاً ' ص ۳۴ - $ ایضاً ' ص ۳۶ -

اور پھر فانی هستی، تسلیم کیا گیا هے - اسی پران کا یه عقیده بیان کرتا هے که کنول نجس زمین سے نہیں پیدا هوتا بلکه پانی کی سطح پر سے اُگتا هے اور همیشه پاک و صاف رهتا هے، خواه جھیل کا پانی کتنا هی گدلا هو - اس سے اس کی فوق العادت پیدائش کا اظہار هوتا هے !—

کنول ادبیات میں

کنول کو مشرقی ادب و صنعت اور دست کاری میں بھی بہت کچھه دخل هے - هندوستان نے جو جو اهمیت اور عزت کنول کو دی هے شاید هی کسی دوسرے پھول کو کسی ملک میں حاصل هو - لیکن دیگر ممالک، مثلاً مصر اور فارس، نے اس کی اس قدر عزت افزائی نہیں کی - شاید اس کی وجه یه هو که یه پھول ان ممالک میں به نسبت هندوستان کے کم یاب هے، مثلاً سرخ کنول مصر میں کہیں نہیں ملتا - البته اس کی دیگر دو قسمیں "سفید اور نیلی" کہیں کہیں پیدا هوتی هیں - لورے (Loret) نے اس پھول کے کئی ایک مصری نام لکھے هیں - سرخ کنول کا نام نہیب هے، جس کو دوسرے تلفظ کے ساتھه نخیب اور نشیب بھی کہتے هیں؛ سفید کا نام ساشنی اور نیلے کا سرپیت (شربت ؟) هے - لیکن ایسا معلوم هوتا هے که سرخ نیلوفر ایران یا هندوستان سے مصر میں پہنچا تھا، اور اسی سبب سے اس کا کوئی عام نام نہیں هے، اور نه اس کا حواله مصری ادب میں کہیں ملتا هے - ایران میں علاوه ان تشبیهات اور استعارات کے، جو فارسی ادیبوں نے نیلوفر سے اخذ کیے هیں، اس کا نام اور کسی سلسلے میں ادب سے منسوب نہیں هے —

البته هندوستانی ادب میں اس کے حوالے بکثرت ملتے هیں -

هندی شاعری میں معشوق کے بدن کو حسن کے لحاظ سے کنول سے تشبیہہ دیتے ہیں ؛ مثلاً :—

کونول * کنول سوگندھ سریرو سملدر لہر سوهی تن چہرو

بدن کی تشبیہہ کنول سے بلحاظ کیف کے هے نه بلحاظ صورت کے چہرے کے حسن کو کنول کے پتے کے حسن سے مشابه بتاتے ہیں - مثلاً :—

نین چتر دے روپ چتر سے کنول پتر پر مدھ کر پھیرے

معشوق † کے آنکھیں کھولنے کو کنول کے کھلنے سے تعبیر کرتے ہیں - اس کے اعضا کو کنول کا ڈنٹھل ، اور دست نازک ‡ کو کنول بتاتے ہیں - اس کے علاوہ هندو مذهب کی کتابوں میں جا بجا اس کے تذکرے آئے ہیں - رگ وید $ میں اس کا ذکر هے اور اس سے بعد سمہتاؤں (संहिता) میں بھی اس کا بیان موجود هے - رگ وید میں سفید کنول کو پنڈریک کے نام سے یاد کیا گیا هے - اتھرون وید میں انسان کے دل کا کنول سے مقابله کیا هے - پنچ ونس براهمن (पंचवंश ब्राह्मण) میں اس کو تارا منڈل کی روشنی سے پیدا شده لکھا هے - یجر وید کے تیتری (तैत्तरीय) نسخے میں اس قسم کے کنول کے گندھے هوئے ایک مالے کا ذکر هے جس کا نام پنڈری سرج (पुण्डरीकस्रज) هے - نیلے رنگ کا کنول ، جس کا نام پشکر هے ، رگ وید اور اس کے بعد کے ویدوں میں کئی جگه آیا هے ، اور اول الذکر میں لکھا هے که یه پھول جھیلوں میں پیدا هوتا هے - پرانے زمانے میں لوگ اسے سنگار کے لیے بھی استعمال کرتے تھے - صبح کے

* جذبات بھاشا از نیاز فتح پوری (مطبوعه جے اینڈ سنز الکٹرک پریس دهلی ، ۱۹۱۵ ع) -
† وکرم اروسی ، اردو ترجمه از محمد عزیز مرزا (الناظر پریس لکھنؤ سنه ۱۹۲۳ ع) ، ص ۷ -
‡ وکرم اروسی ، ص ۵۱ -

$ Encycl. Relig. Eth. ص ۱۴۲ - ۱۴۳ -

دیوتا اسون کو نیلے کنولوں کا مالا پہنے ہوے دکھایا گیا ہے - اس مالے کا نام پشکر سرج ہے - کنول کی ایک اور قسم کو اتھرون وید میں کمد (कुमुद) کہا گیا ہے - وہ یقیناً سفید کنول ہے - براھمنوں میں کنول پہلے پرجاپتی کے ساتھہ ملتا ہے - تیتریا براھمن میں لکھا ہے کہ جب پرجاپتی نے دنیا کو' جو پانی کی طرح مائع تھی' پیدا کرنے کی خواھش کی تو اسے ایک کنول پانی کی سطح پر دکھائی دیا - اس نے یہ خیال کیا کہ یہ ضرور کسی چیز پر ٹکا ہے - یہ سوچ کر اس نے سور کی شکل میں پانی پر غوطہ لگایا - نیچے پہنچ کر اس نے پاؤں تلے زمین پائی - اس نے ایک شاخ توڑی اور اسے لے کر سطح پر آیا' اور پھیلا دیا - پھر تیتریا ارنیک (आरण्यक) میں لکھا ہے کہ جب دنیا پانی کی طرح تھی تو صرف پرجاپتی کنول کے پتے پر پیدا ہوا - مہابھارت * میں لکھا ہے کہ خالق کائنات برھما وشنو جی کے مراقبے کے وقت میں اس کنول سے پیدا ہوا تھا جو وشنوجی کی ناف میں سے اگتا تھا - اسی وجہ سے برھما کا ایک لقب ابجج یا ابججن' یعنی کنول سے پیدا شدہ' ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کنول کا تعلق اصل میں وشنو دیوتا سے ہے' اسی وجہ سے اس کا ایک نام پدم نابھہ' یعنی کنول کی ناف والا' بھی ہے - اس کے علاوہ کنول کو وشنو کی بیوی لکشمی سے بھی نسبت ہے جو قسمت اور حسن کی دیوی ہے - مہابھارت میں لکھا ہے کہ وشنو کی پیشانی سے ایک کنول پیدا ہوا جس سے شری (لکشمی کا دوسرا نام) پیدا ہوئی' اسی لیے لکشمی کا ایک لقب پدم بھی ہے - مہابھارت میں جہاں دولت کے دیوتا کبیر (कुबेर) کی جاے قیام کوہ کیلاش کا ذکر

* A Classical Dictionary of Hindu Mythology and Religion از جے' ڈاسن' ص ۵۸ -

ہے ' وہاں اس کی جھیل نلنی (नलिनी) اور اس کے دریا منداکنی کے بارے میں لکھا ہوا ہے کہ وہ سنہرے کنولوں سے ڈھکے ہوئے ہیں —

کنول کے پتوں پر پانی اور شبنم کے قطرے دھوپ کی روشنی میں چمکتے ہوئے بڑے بڑے آبدار موتیوں کی آب کو شرماتے ہیں - کیا عجب ہے کہ چین اور تبت کے مہاتماؤں نے ان ہی قطروں سے متاثر ہوکر 'اوم منی پدم ہوم' (یعنی' خدا کنول پھول میں ایک گوہر ہے) کا عقیدہ قائم کیا ہو - اس کے علاوہ بودھ مذہب والوں کے اعداد و شمار پدم اور پنڈریک' جو کنول کے نام ہیں؛ سب سے بڑے اعداد ہیں - مہایانا بودھ مذہب والوں کی ایک شرعی کتاب کا نام بھی کنول پر ہے جس کو سد دھرم پنڈریک (सद्धर्म पुण्डरीक) کہتے ہیں -

ایران کی سرزمین میں کم یاب ہونے کے باوجود نیلوفر نے فارسی ادب پر اپنا اثر قائم کر لیا تھا - ایرانی شعرا نے بھی نیلوفر کی تشبیہات سے کام لیا ہے - سحاب اصفہانی کا شعر ہے :—

• بچشم قطرہ بارم مردم چشم — چو در دریا یکے نیلو فرستی

خواجو کرمانی نے لکھا ہے :—

† اے خط سبز تو ہمچوں برگ نیلوفر در آب
قند مصر از شور یاقوت تو چوں شکر در آب
برگ گل خود روی رویت کاب روے حسن از وست
سبزۂ سیراب را بنگر چو نیلوفر در آب

• منقول از Wit, Humour and Fancy of Persia از مہرجی بھائی کوکا' بمبئی سنہ ۱۹۲۳ ع' ص ۵۳ —

† خواجوی کرمانی' باهتمام ح' کوهی‌کرمانی' طهران چاپخانۂ خاور' تیر ماه ۱۳۰۷' ص ۱۰ - ۱۱

کنول صنعت اور دست کاری میں

صنعت اور دست کاری میں بھی کنول نے خاص اہمیت حاصل کی ہے - سفید کنول کے مالے آمس ' امن ہتپ اول اور رامیز ثانی کی مومیائیوں پر رکھے ہوئے تھے ' اور ' جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے ' یہی پھول ہے جس پر ہورس بیٹھا ہوا نظر آتا ہے - یہ مورت آٹھویں صدی قبل مسیح کی بنی ہوئی ہے - مصر میں بہ نسبت سفید کے نیلے کنول زیادہ ملتے ہیں - عام طور پر وہاں کے پرانے مقبروں میں ان کی تصویریں نظر آتی ہیں - ستونوں کے اوپر کے حصے کو کنول کی شکل کا بنانے کی ابتدا غالباً یہیں سے ہوتی ہے - م ' ا ' اسٹائن (M. A. Stein) کا بیان ہے کہ اس نے ایران میں ایک ایرانی بودھی ستو کی مورت دیکھی ہے ' جس میں بدھ کو ایک کنول سے سجی ہوئی نشست پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے - یہ تصویر ایک چوبی دروازے پر بنی ہوئی ہے * ایرانی دست کاری میں کنول کے استعمال کی ایسی اور کوئی قابل ذکر مثال نہیں ملتی —

ہندوستانی صنعت میں ہم کنول کو سنہ ۲۰۰ ق م کے بعد کی بنی ہوئی عمارتوں میں پاتے ہیں - سانچی ' برہٹ ' امراوتی اجنتا اور بودھ گیا کی عمارتوں میں کھلے ہوئے کنول جا بجا کندہ کیے ہوئے نظر آتے ہیں - مغربی ہندوستان میں چٹانوں پر بنے ہوئے بودھ مندروں کے ستونوں ' دروازوں اور چھتوں میں بھی کنول زینت و زیبائش کے لیے تراشے گئے ہیں - لنکا میں زینوں پر آدھے کنول بہت ہی صفائی سے بنے ہوئے ہیں - تھلیوں پر کھلے ہوئے کنول گندھار اور متھرا کی عمارتوں میں جا بجا بنے ہوئے ہیں ' اور سانچی کے ستونوں اور امراوتی کے دروازوں پر نہایت خوبصورت

* Encycl. Relig. Eth.

کنول کندہ کیے ہوئے بکثرت ملتے ہیں —

اس کے علاوہ قدیم زمانے کی مورتوں اور مجسموں میں ہندی دیوی دیوتا اکثر کنول کے اوپر بیٹھے یا کھڑے دکھائی دیتے ہیں - اس کی سب سے پرانی اور عمدہ مثالیں اودے گری' برہت' اور خاص کر سانچی میں' جہاں بڑے اسٹوپ کے دروازوں پر ہندو دیوی لکشمی کی مورت کندہ ہے' ملتی ہے - ان مقامات کی نقاشیوں میں لکشمی کنول پر یا تو کھڑی یا بیٹھی ہوئی بنی ہے اور اس کے ہر ہاتھ میں کنول کا ایک پھول ہے' جس پر دو ہاتھی اپنی سونڈیں اٹھائے ایک برتن سے پانی برسا رہے ہیں- اس قسم کی مورتیں ہندوستان میں ہر جگہ ملتی ہیں' اور لنکا میں پولن روا کی پرانی عمارتوں میں بھی پائی جاتی ہیں - جب سے مہاتما بدھ کی مورتیں عمارتوں میں بنائی جانے لگی ہیں' اکثر کنول پر بیٹھے یا کھڑے نظر آتے ہیں - اس قسم کی مورتیاں ہمیں راجگیر (بہار)' کنھیری غار (بمبئی کے قریب)' اور گندھار (شمال مغرب میں) ملتی ہیں - آہستہ آہستہ یہ رواج غیر ممالک میں بھی پھیل گیا اور اس قسم کی مورتیں نیپال' برما' چین اور جاپان میں بھی تراشی جانے لگیں - اگر کسی تصویر میں مہاتما بدھ کنول پر بیٹھے یا کھڑے نہیں ہیں تو اس حالت میں دو یا تین اور کبھی کبھی چار کنول ان کے سامنے پڑے ہوئے ہیں جیسے گندھار میں - مہاتما بدھ کے علاوہ دیگر بودھی ستو بھی کنول پر بیٹھے یا کھڑے' نہ محض ہندوستان بلکہ غیر ممالک میں بھی' ملتے ہیں- مثلاً منجسری کو کنول پر بیٹھے ہوئے ہم علاوہ سارناتھ (بنارس کے قریب) کے جاوا اور تبت میں پاتے ہیں - تبت کی ایک نئی تصویر میں ہم میترے کو کنول پر بیٹھے ہوئے پاتے ہیں - چین میں بودھی ستو اولوکتیشور

(बोधिसत्व अवलोकितेश्वर) بھی کنول ھی پر براجمان دکھائی دیتے ھیں- اس بودھی ستو کو کنول سے ایک خاص تعلق ھے' کیونکہ بودھ مذھب کے عقیدے کے مطابق وہ کنول سے پیدا ھوا تھا اسی وجہ سے اس کا لقب پدم پنی ھے - مزید برآں بودھ مذھب والوں کی دعا' اوم منی پدم ھوم' اسی سے متعلق ھے - کنول کا ھر دل عزیز ھونا اس سے بھی ثابت ھوتا ھے کہ هم پیتل کی مورتوں میں نہ محض هندو دیوی دیوتا بلکہ انیسویں صدی عیسوی کے بڑے بڑے مہاراجاؤں کو بھی کنول پر بیٹھے ھوے پاتے ھیں —

ایک عجیب بات یہ ھے کہ حالانکہ مسلمانوں نے نیلوفر کو اپنی عمارتوں میں جگہ نہیں دی' تاهم گور میں ایک مسجد ھے جس کو سنہری مسجد یا خواجہ سراؤں کی مسجد کہتے ھیں اور اس کے اندرونی اور بیرونی حصوں میں خوبصورتی سے تراشے ھوے هندوستانی * کنول بنے ھوے ھیں- شاید یہ هندوستانی صنعت کے اثر کا نتیجہ ھے —

مختصر یہ کہ کنول پھول ایک نہیں کئی وجوہ سے نہایت اهم پھول ھے' اور یہ کہنا تو کسی طرح غلط نہیں ھے کہ وہ مقدس ھے!

* Medieval India از ایشوری پرشاد (انڈین پریس الہ آباد)' ص ۹۱۱ -

اردو زبان کے قدیم کتبے

(۱)

(از اڈیٹر)

اسلامی عہد کی قدیم عمارتوں پر اکثر کتبے فارسی زبان میں ہیں اور قدیم عمارتوں ہی پر کیا موقوف ہے، بہت سی حال کی عمارتوں پر بھی فارسی کتبے نظر آتے ہیں - عموماً کتبے اس وقت تک کسی زبان میں نہیں لکھے جاتے جب تک اس کا رواج عام نہ ہو - فارسی کا رواج اس ملک میں جیسا کچھہ تھا اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں - ہمارے ہاں کے طبیب اب تک اپنے نسخے فارسی میں لکھتے ہیں - رواج بہت سخت جان ہوتا ہے، یہ مٹتے ہی مٹتے مٹتا ہے - میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے بعض قدیم عمارتوں پر قدیم اردو یا ہندستانی زبان کے کتبے نظر آئے - اس زبان کا سب سے قدیم کتبہ مجھے احمدآباد کی ایک چھوٹی سی مسجد میں ملا —

سب سے پہلے شمالی ہند سے ہندستانی زبان گجرات اور دکن میں پہنچی اور وہیں اسے ادبی حیثیت حاصل ہوئی - علاءالدین خلجی نے سنہ ۶۹۶ ھ میں گجرات پر تسلط کرلیا اور اپنی طرف سے صوبیدار مقرر کردیا - صوبیداری کا یہ سلسلہ برابر قائم رہا، یہاں تک کہ جب دہلی

پر تیمور کا لشکر پہنچا اور وہاں کی حکومت میں ضعف آگیا تو صوبیدار ظفر خاں کے تاتار خاں نے خود اپنی حکومت قائم کرلی اور محمد شاہ کا لقب اختیار کرکے تخت پر بیٹھ گیا (سنہ ۸۰۹ ھ) - خلجیوں کے تسلط اور تغلقوں کے زمانۂ حکومت میں علاوہ لشکر کے ہر پیشے اور ہر مشرب کے لوگ دلی سے گجرات پہنچے اور ان کی زبان دکن کی طرح گجرات میں بھی رائج ہوگئی - شاہان گجرات کی حکومت اکبر کے عہد تک رہی' اس کے بعد گجرات کا صوبہ اکبر کی سلطنت میں شامل ہوگیا - غرض دھلی کا اثر اس علاقے پر امیر خسرو کے زمانے سے لے کر آخر تک رہا —

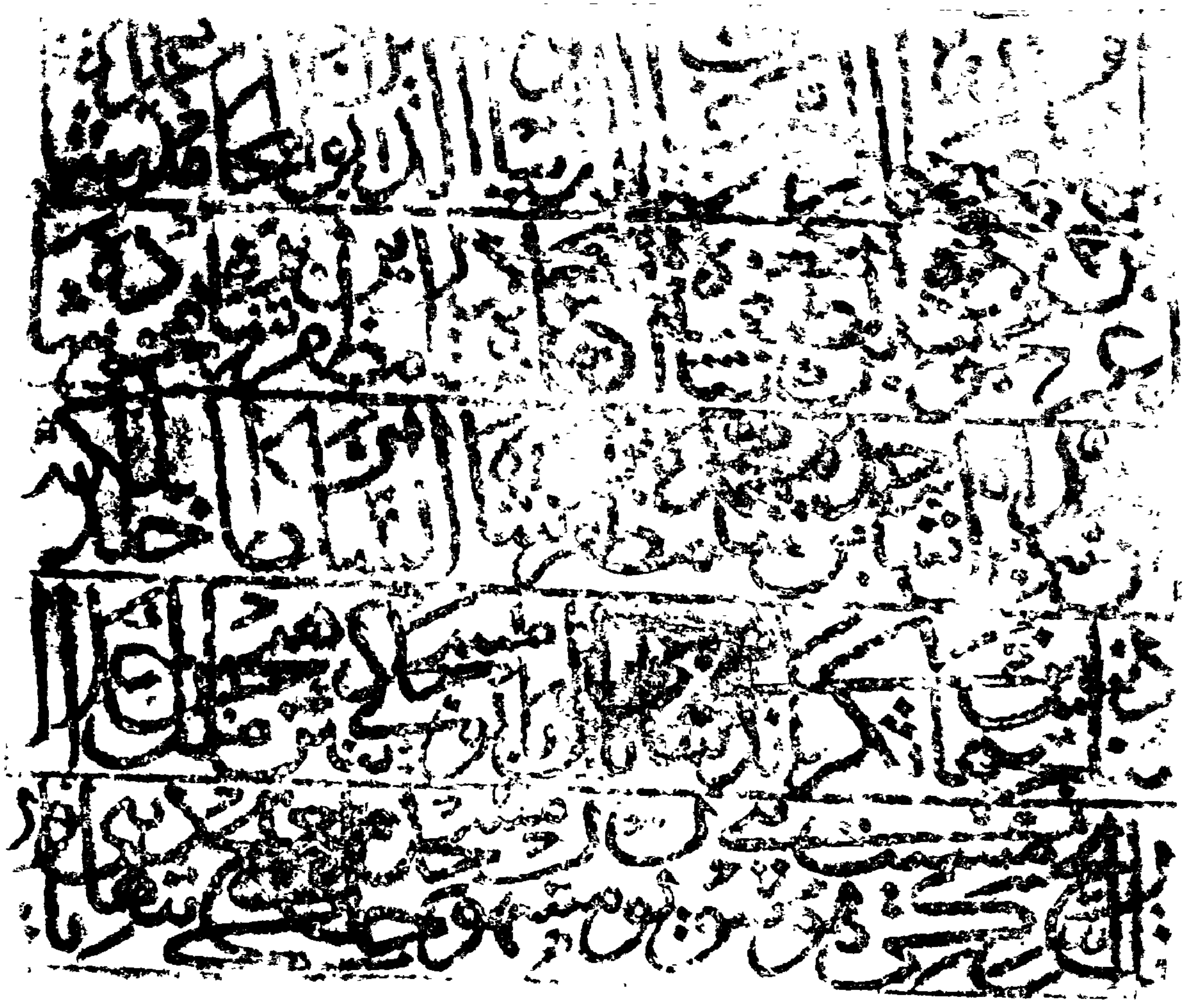
لیکن حکومتوں اور بادشاہوں سے بڑھ کر فقرا اور صوفیا نے کام کیا جو اس زمانے میں' بلکہ اس سے قبل' وہاں پہنچ گئے تھے - صوفیا کا کا مسلک صلح کل ہوتا ہے اور وہ اپنے پیغام کی تلقین اس ڈھنگ سے کرتے ہیں کہ لوگوں کو ان کی طرف ایک کشش سی ہوتی ہے - منجملہ اور طریقوں کے جو وہ اس غرض کے لیے استعمال کرتے تھے ایک یہ بھی تھا کہ باوجود صاحب علم و فضل ہونے کے وہ تلقین و تعلیم عام لوگوں کی زبان میں کرتے تھے - اگرچہ زبان و ادب کی اشاعت سے براہ راست انھیں کوئی تعلق نہ تھا لیکن چونکہ ان کی تعلیم کسی خاص فرقے یا طبقے سے مخصوص نہیں ہوتی اور ان کا فیض عام ہوتا ہے بلکہ طبقۂ عوام کے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور طالب فیض ہوتے ہیں' اس لیے ان کے سمجھانے کے لیے انہیں کی زبان میں ان سے باتیں کرتے اور انہیں کی زبان میں تعلیم و تلقین کرتے تھے - گجرات و دکن میں ان کی بدولت اس زبان کو' جسے ہم آج کل اردو یا ہندستانی کہتے ہیں' بہت کچھ فروغ ہوا —

گجرات کے ان بزرگوں میں سے بعض کا کلام اور حالات ہم تک پہنچے ہیں - مثلاً حضرت قطب عالم (ولادت سنہ ۷۹۰ ھ' وفات سنہ ۸۵۰ ھ) اور اُن کے فرزند حضرت شاہ عالم (ولادت سنہ ۸۱۷ ھ' وفات سنہ ۸۸۰ ھ) اپنے زمانے کے اولیاءاللہ میں سے تھے - ان کے متعدد هندی اقوال اب تک محفوظ ہیں —

شیخ وجیہ الدین احمد علوی احمد آباد کے بڑے عالم اور صاحب باطن بزرگ تھے (سنہ ۹۱۰ ھ - سنہ ۹۹۸ ھ)- ان کے ملفوظات کتاب کی صورت میں جمع کیے گئے ہیں جس کا نام بحرالحقائق ہے - اس میں جگہ جگہ ان کے هندی اقوال درج ہیں —

سید شاہ هاشم (متوفی ۱۰۵۹) گجرات کے مشہور اولیا میں سے ہیں - آپ کے ایک خاص مرید نے آپ کے اقوال وغیرہ ایک کتاب میں جس کا نام مقصودالمراد ہے' جمع کیے ہیں - اس میں جا بجا کثرت سے شاہ صاحب کے هندی اقوال و ابیات و نظمیں درج ہیں —

ایسے اور بہت سے بزرگ ہیں جن کے هندی اقوال وغیرہ ہم تک پہنچے ہیں - لیکن ان بزرگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا مستقل مرتب کلام بھی موجود ہے - مثلاً قاضی محمود دریائی کا مکمل دیوان محفوظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان کی ابتدائی صورت کیا تھی - قاضی صاحب کا سنہ وفات ۹۴۱ ھجری ہے - دوسرے بزرگ شاہ علی محمد جیو گام دھنی ہیں جن کے دیوان کا نام جواہر اسرارالله ہے - دیوان کے مرتب شاہ صاحب کے ایک معتقد ہیں جو اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ "بطریق نظم بالفاظ گوجری بزبان مبارک خود فرمود" - گوجری سے یہاں وہی زبان مراد ہے جو دلی



سے آکر گجرات میں رائج ہوئی اور اس میں گجراتی کی آمیزش ہوئی - قاضی محمود دریائی اور شاہ علی محمد جیو کے کلام میں خاص گجراتی زبان کے الفاظ اکثر جگہ آتے ہیں - ان دونوں بزرگوں کے کلام کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس زبان میں وہ لکھتے ہیں وہ ہندی اور گجرات کی آمیزش ہے جس میں کہیں کہیں عربی فارسی الفاظ بھی آجاتے ہیں - شاہ صاحب کا سنہ وفات ۹۷۳ ہجری ہے -

ایک دوسرے صاحب تصانیف بزرگ میاں شیخ خوب محمد چشتی ہیں - وہ اپنی زبان کے متعلق خود لکھتے ہیں کہ " من بزبان گجرات کہ بہ الفاظ عربی و عجمی آمیز است گفتہ ام " ان کی زبان قدیم گجراتی اردو کا اچھا نمونہ ہے - قطع نظر اس کے کہ کہیں کہیں کوئی خاص گجراتی لفظ آجاتا ہے وہ اچھی خاصی پرانی اردو ہے جس میں ہندی کے ساتھ فارسی عربی کے لفظ بلا تکلف استعمال کیے گئے ہیں - نسبتہً ان کا کلام بہت صاف اور سلیس ہے ان کا سنہ وفات ۱۰۲۳ ہجری ہے -

یہ مختصر سی تمہید میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ زبان کی ابتدائی صورت ذہن میں رہے - دوسرے جو کتبہ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں اس کا تعلق بھی ایک گونہ انہیں بزرگوں میں سے ایک سے ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے - یہ کتبہ جس کا چربہ آپ کے سامنے ہے احمد آباد کی مسجد رائے کھڈ میں ہے - یہ مسجد شاہ علی محمد جیو گام دھنی کے مزار کے مغرب جانب کم و بیش پچاس قدم کے فاصلے پر اسی احاطے میں ہے - اس مسجد کی تعمیر بالکل مختصر سی ہے - مینار اچھے طرز کے اچھے ہیں - مسجد میں چھوٹا سا صحن ہے اور اس کی قبلہ رو دیوار میں تین محرابیں ہیں اور ہر محراب میں ایک

ایک کتبہ ہے جن کی تفصیل یہ ہے —

۱ - درمیانی کتبے پر یہ آیت ہے : -

"وان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ آحداً" -

۲ - داھنی جانب کا کتبہ :-

محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم -

یہ شجرۂ طیبہ معلوم ہوتا ہے - اس کے آخر میں سنہ احدی و ستین و تسعمأتہ یعنی ۹۶۱ ہجری ثبت ہے -

۳ - تیسرا کتبہ جو بائیں طرف ہے وہ اصل مقصود ہے - اس کے اوپر کے حصے میں احمد شاہ بادشاہ گجرات کا شجرہ ہے جس کے عہد میں یہ مسجد تعمیر ہوئی ' اور اس کے نیچے دو شعر پرانی اردو یا ہندستانی میں ہیں جن کے آخری مصرع سے تعمیر مسجد کا سنہ تاریخ نکلتا ہے - اوپر کی تین سطروں میں بادشاہ کا شجرہ یہ ہے :-

۱ - المعتصم باللہ الرحمن غیاث الدنیا والدین ابوالمحامد احمد شاہ -

۲ - ابن عم محمود شاہ بن لطیف شاہ اخ بہادر شاہ بن مظفر شاہ بن محمود شاہ -

۳ - ابن محمد شاہ بن احمد شاہ بن محمد شاہ بن مظفر شاہ السلطان خلد ملکہ'

آخری دو سطروں میں یہ دو شعر ہیں -

فلا دنیں سمجھاکر باندھے شاجی پال بانو مسجود کے تئیں ہیجیں ملک جلال
تاریخ اس مسجت کی ہوئی سو یوں مشہور مسجد جامع کے بیچ دتھایا پے نور

آخری مصرع سے سنہ ۹۶۳ ھ نکلتا ہے —

احمد شاہ گجرات کے آخری بادشاہ سلطان بہادر مظفرثانی کا پیشرو تھا - اس کے بعد سلطنت کا خاتمہ ہوجاتا ہے - یہ دونوں اپنے امرا کے ہاتھ میں مثل کٹھ پتلی کے تھے - احمد شاہ سنہ ۹۶۱ ھ میں تخت نشین ہوا اور سنہ ۹۶۸ ھ میں قتل کردیا گیا - یہ مسجد اُسی کے زمانے میں تعمیر ہوئی اور اس پر جو کتبہ ہے اُس زمانے کی اردو کا نمونہ ہے - اس لحاظ سے یہ کتبہ بہت قابل قدر ہے اور اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ یہ زبان جسے ہم اردو یا ہندستانی کہتے ہیں ملک کے اطراف و جوانب میں صدیوں پہلے پوری طرح پھیل چکی تھی - یہاں تک کہ اس میں کتبے تک لکھے جاتے تھے -

بنگالی اور اُردو

از

(جناب محمد اجمل خاں صاحب - ایم - اے - ایل ایل - بی - محقق اسلامیات - شانتی نکیتن (بنگال)

غریب اردو کے سوا ہر زبان کے بولنے والے اپنی زبان پر فخر کرتے ہیں - اور اس غلط فہمی میں سب مبتلا ہیں کہ اُن کی زبان سے بہتر دنیا میں شاید ہی کوئی زبان ہو - دوسرے الفاظ میں اس کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ اپنی زبان سے انسان کو فطرتاً محبت ہوتی ہے - اور فراوانیء محبت یقیناً، جذبات کی شدت کی وجہ سے، انداز نگاہ پر اثر ڈالتی ہے - حب الشیء یعمی و یصم -

لیکن اردو بولنے والے، یعنی وہ جن کی مادری زبان اردو ہے، کیوں اس فطری میلان سے محروم ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بسا اوقات محبت کی لذتوں اور الفت کی کیفیتوں کو کسی نہ کسی ترکیب سے عقل کی ماتحتی میں لایا جاسکتا ہے، اور محبت کے بہتے ہوئے دھارے کا رخ بدل دیا جاسکتا ہے - یعنی یہ نہیں کہا جاتا کہ اپنی زبان سے محبت نہ کرو - بلکہ ایسی زبان سے کرو جو "اپنی" تو ہو - سوال ہوتا ہے کہ اردو اپنی نہیں تو کس زبان کو اپنی سمجھیں - جواب ملتا ہے کہ "اپنی" زبان وہ ہے جس میں اپنا مذہب ہے، اپنا تمدن ہے، اپنی روایات ہیں - غرضکہ جس میں اپنا سب کچھ ہے - بہت سے سادہ لوح

اس فریب میں آجاتے ھیں اور اردو کی بجاے مذھب سے محبت کرنے لگتے ھیں یعنی اردو سے بہت دور ھوجاتے ھیں - اسی قسم کی منطق ھوتی ھے جس سے اکثر "والدین" اپنی اولاد کو دوسرے مشاغل کی محبت سے باز رکھتے ھیں اور کہتے ھیں کہ "میاں چند روز کی بات ھے' بی - اے - پاس ھوجاؤ پھر دل کھول کے زندگی کی دلچسپیوں سے بہرہ اندوز ھو لینا" - اور ھم نے تو یہی دیکھا ھے کہ اکبر کا قول اکثر صادق آتا ھے - یعنی :—

امتحان پیش نظر اور عاشقی بالاے طاق

لیکن کہاں وہ مصحف روئے یار' اور کہاں یہ اوراق تیرہ و تار کہاں وہ زندگی و تابندگی' کہاں یہ مردنی و پژمردگی - وہ بہار کی صورت' یہ خزاں کا نمونہ' وہ جان بخش یہ جاں ستاں - بیچارہ طالب علم دیکھتا تو کتاب ھی کو ھے مگر حروف کی شکلیں کسی کے چہرے سے بدل جاتی ھیں - اور کانٹ اور ارسطو کی موشگافیوں میں اُسے کسی کے الجھے ھوے گیسو نظر آنے لگتے ھیں - اور آخرکار جب لیلا کی ماں کو مجنوں کے بی - اے پاس کرنے سے ناامیدی ھوتی ھے تو دیکھنے والے بے اختیار پکار اُٹھتے ھیں کہ ھم نہ کہتے تھے کہ —

کہاں عاشق' کہاں کالج کی بکواس!
ھرن پر لادی جاتی ھے کہیں گھاس!

منشا اس گزارش کا صرف یہ ھے کہ زبان کی محبت ھو یا مذھب کی' اگر اُسے غیر فطری طریقوں سے غلط راستوں پر ڈالا جاے گا تو یقیناً نتیجہ وھی ھوگا جو ھندستانی زبان کو ھندی بنانے اور اُلٹی گنگا بہاکر مذھبی خدمت کرنے کے نام سے آج کل ھورھا ھے - یعنی ترقی معکوس!

کوئی ان نقل محبت کرنے والوں سے پوچھے کہ زبان اساس مذہب و تمدن ہے یا مذہب اساس و بنیاد زبان ؟ جاننے والے بتائیں گے کہ زبانوں کے ذریعہ سے مذاہب نے ترقی ہے لیکن کسی مذہب نے آج تک کوئی زبان نہیں بنائی - آوستا مردہ ہوگئی لیکن مذہب زرتشت باقی ہے - عبرانی کے سمجھنے والے دنیا میں خال خال ہیں لیکن یہودیت کے نام لیوا جرمن اور روسی زبانیں بول رہے ہیں اور احیاے مذہب و تمدن کے پردے میں جامع فاروقی کی اذان کو "دیوار گریہ" کے نقارخانہ کے شور و ہنگامہ میں طوطی کی آواز سے بھی کم وقعت کردینا چاہتے ہیں - نصرانیت کا غلبہ جیسا کچھہ ہے ظاہر ہے - لیکن آج کون ہے جو دعوے کرسکے کہ میں یسوع مسیح کی زبان سمجھتا ہوں' جب کہ خود ناصرہ میں سیکڑوں سال سے عربی رائج ہے اور آرامی کا کوئی نام بھی نہیں لیتا - بدھ اور ہندو مذہب کے متعلق بعد میں عرض کروں گا - اس لیے زرا اسلام کا بھی قصہ سن لیجئے —

لاریب کہ قرآن کی زبان عربی ہے - اور ہندستانی مسلمانوں کو دنیا میں سب سے زیادہ اُس زبان اور اپنے مذہب سے محبت کا دعوے ہے - ایک حد تک ہندوستان میں عربی کی تعلیم بھی رائج ہے - حتیٰ کہ بنگال کے اسکولوں میں اردو اور عربی کو برابر کا درجہ دیا گیا ہے - فارسی کا کہیں تذکرہ نہیں - ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں عربی کی طرف خاص توجہ تھی - لیکن اکثر کتابوں کی تعلیم فارسی کے ذریعہ سے ہوتی تھی - وہاں اب آزاد مدارس بہت کم رہ گئے ہیں' اور جو ہیں بھی اُن طرف عامۃ الناس کی توجہ کم ہوتی جاتی ہے - اس لیے کہ جب سے عربی اور فارسی تعلیم کی حمایت سرکار دولت مدار نے شروع کی ہے اور منشی و دبیر

عالم و فاضل کے امتحانات رائج ہوئے ہیں اُس وقت سے تعلیم کا مقصد تعلیم نہیں رہا - بلکہ مقصد ملازمت ہوگیا ہے ' کیفیت کم ' کمیت زیادہ ہوگئی - لیکن وہ طبقہ جو انگریزی مدارس کی طرف رجوع ہوا اور اُس میں سے کسی نے زبان ثانوی کے طور پر عربی لے لی تو گویا اُس نے عالم اسلام پر ایک احسان عظیم کا بوجھ ڈال دیا - اللہ اللہ ! ! مقصد نوکری ' مولوی صاحب کے احسان و مروت سے پاس ہونے کا یقین ' اور پھر یہ غرور !

بہر حال ہوا یہ کہ ان ناکارہ مدارس کی پیدا وار نے مفتی ہلمے کی سند تو گویا لے لی ' لیکن نہ حقیقت میں اُنہیں صحیح تعلیم ملی نہ وہ ملک و ملت کے مفاد کے لیے عربی زبان کے ذریعہ سے اب تک کچھہ کر سکے - کیا تو اتنا کیا کہ خدمت قرآن کی جگہ خدمت کعبہ کے نام سے چند روز ولایت ہو آئے اور پورا ہندوستان خلافت کے مرکز میں بھی الاسلامیت کے " خواب " دیکھنے لگا - ترکی نے نہ صرف خلافت کو ختم کر کے عربوں کی صحیح گوشمالی کی بلکہ اس نے عربی قبائل کی غداری کا جواب اس طرح دیا کہ عربی زبان کو بھی اپنی قومی لغت سے خارج کردیا - اب مصطفی کمال کی شخصیت تو وہی ہے جو پہلے تھی ' لیکن ترک اسے اتا ترک کہتے ہیں - قومی عصبیت یہی رنگ ایران میں لائی ہے - اور اگرچہ ان دونوں ممالک کے خمیر میں عربی زبان داخل ہے لیکن پور داؤد اور اسی کے مثل دوسرے لوگوں کی مسلسل کوشش ہے کہ ماضی کو ' حالانکہ زندہ ہے ' درگور کردینا چاہیے ' اور "حال" قال کی کیفیت پیدا کرنا چاہیے - گویا کہ یہ قومیں مستقبل میں زندہ ہیں - ماضی دفن حال غائب اور صرف مستقبل کا خواب موجود - عربی

ممالک کو دیکھیے تو ان کی حالت ہی زار ہے - صرف مصر کچھ زندہ ہے - وہاں کے ازہری علما ' جن کے سرگروہ علامہ رشید رضا مرحوم تھے ' عربی زبان کی محبت میں اتنا غلو رکھتے ہیں کہ قرآن کا غیر زبانوں میں ترجمہ کرنا ہی حرام قرار دیتے ہیں اور باوجودیکہ محمد مارماڈیوک پکھتال مرحوم نے مجلس علمائے مصر کے سامنے یہ کہا کہ میں نے انگریزی میں قرآن کے معنی بیان کیے ہیں ترجمہ نہیں کیا (یعنی یہ Rendering ہے Translation نہیں ہے) لیکن ان کا ترجمہ مصر میں ممنوع قرار پایا ' ● حالانکہ نصرانیوں کے ترجمے کھلم کھلا فروخت ہوتے ہیں - اس لیے کہ ان کے فروخت کرنے والے اپنی دلیلوں کو زبان شمشیر سے بیان کر سکتے ہیں —

اب ہندستانی مسلمانوں کو صرف مغرب کی طرف دیکھنا باقی ہے ' اس لیے نہیں کہ ادھر کعبہ ہے یا مسلمان مغرب کو آسانی سے پہنچانتا ہے - نہ اس لیے کہ مغرب زدہ انگریزی داں طبقہ اُدھر اپنا کعبہ نہیں پاتا - بلکہ اس لیے کہ ہندوستان کے مسلمانوں سے کہیں زیادہ مسلمان ادھر بستے ہیں - اگر قبلۂ اولیٰ کے باشندوں کے لیے فلسطین کانفرنس وجود میں آئی ہے تو قبلۂ ثانی کے ماننے والے بھی تو کسی تحریک "شرق الہند" کے محتاج ہیں - چین کا ایک پورا صوبہ مسلمان ہے - کروروں مسلمان ملایا اور جزائر شرق الہند میں آباد ہیں - نہ عربی جانتے ہیں نہ فارسی حتیٰ کہ سنہ ۱۹۲۵ ع سے انہوں نے ملائی وجاوی زبان کو عربی رسم خط میں لکھنا بھی چھوڑ دیا ہے اور لیٹن حروف اختیار کر لیے ہیں - پردے کا نام نہیں - اسلام بہرحال وہاں ہے - اور اس کا اثر بھی ہے - لاکھوں حاجی بھی ہیں - لیکن باوجود

● رسالہ رشید رضا پکتھال مرحوم

هندوستان کے اجارہ داران اسلام کی عدم توجہی اور ڈچ حکومت کی "عنایات" کے اُنہوں نے اپنی قومی تعلیم کا ایک زبردست جال ملک بھر میں پھیلا دیا ہے - اور تعلیم کا ذریعہ ہے ان کی اپنی زبان اور لاطینی (Latin) رسم خط —

شاید آپ کو حیرت ہوکہ پورے هندستان کے مسلمانوں کی نصف آبادی مشرقی بنگال میں ہے - اور باوجودیکہ سرکار کمپنی بہادر سے حقوق دیوانی کی تفویض کے سلسلے میں دربار دھلی سے یہ شرط قرار پائی تھی کہ زبان عدالت فارسی اور رسم خط بھی فارسی هی رهے گا، لیکن خود بنگال میں نواب سلیم اللہ خان مرحوم اور ان کے رفقاء کار پر وہ لے دے هوئی کہ فارسی تو درکنار یہاں کے مسلمان اردو سے بھی ناآشنا هوگئے - اور کثیر تعداد ایسے مسلمانوں کی ہے جو بجا طور پر بنگالی کے مداح هیں اور اسی زبان اور اسی رسم خط کو اپنا سمجھ کر استعمال کرتے هیں - حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسلمانوں هی کا کرم ہے کہ بنگالی زبان اس درجے پر پہنچی ' ورنہ یہاں کے برهمن تو اس کا گلا کب کا گھونٹ چکے هوتے - بہرحال اب وقت آگیا ہے کہ ترقی اردو کے لیے بنگال سے جزائر شرق الہند تک ایک ایسی تحریک شروع کی جائے جو مستقل اور ٹھوس بنیادوں پر قائم هو —

بنگال میں اور اسی کے ساتھہ ساتھہ مشرق ادنی میں اردو کی ترقی کے عظیم الشان امکانات پر غور کرنے سے پہلے همیں یہاں کی ادبی و سیاسی تاریخ کے اوراق کو گردش میں لانا چاهیے - بدھ مذهب کا حال تو ظاهر هی ہے ' یہ هندوؤں کی فرقہ پروری اور تنگ نظری کے خلاف ایک جہاد بھی تھا اور بغاوت بھی - شاید جہاد کا مفہوم بغاوت هی

کے لفظ سے زیادہ ادا ہوسکتا ہے - مسلمان فقیہہ اعلاء کلمۃ الحق کے لیے اسے استعمال کرتے ہیں لیکن گوتم بدھ نے سماج کی چھوت چھات ' جاتی کے بندھنوں ' اور داسیوں کی زندگی کا رخ بدلنے کا نام جہاد رکھا تھا - اور بنگال میں اس کا خاصا اثر بھی ہوگیا تھا - ہندوؤں کا سب سے پہلا قانون ساز منو تھا ' جو زمانہ قبل تاریخ میں پیدا ہوا تھا - اُس کے قوانین کا مجموعہ منو کا دھرم شاستر کہلاتا ہے - لیکن وہ اپنی اصلی صورت میں موجود نہیں - سنی سنائی باتیں اور رسم و رواج کے مجموعہ کو بھرگو سنگھتا میں جمع کر دیا گیا ہے - یہی منو کے نام پر رائج ہے - شاید یہی وجہ ہے کہ گوتم بدھ جو بہت بعد میں پیدا ہوے اور اُن کے ماننے والے کافی تعداد میں بنگال میں تھے ' اس قانون کے مطابق اچھوت قرار پائے - یہ بھی ممکن ہے کہ آریوں نے بدھ سے پہلے ہی اس ملک کے جنگلات اور جنگلی اقوام کا لحاظ رکھتے ہوے اسے مردود قرار دے دیا ہو - ڈی - سی - سین نے "تاریخ ادبیات بنگال" کے صفحہ ۴ پر لکھا ہے " قوانین منو کے مطابق ہر ایک ہندو پر واجب ہے کہ وہ اس ملک (بنگال) سے کوئی تعلق نہ رکھے - اس میں نجس و ناپاک (بدھ دھرم) ہوجانے کا خطرہ ہے - آنند تیرتھ کے سے مشہور شارح کا قول ہے کہ بنگال راکھشسوں اور پشاچوں کا مسکن ہے " اس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج تک شمال مغربی ہندستان کے ہندوؤں کے نزدیک بنگالی قوم کا درجہ ہندو سماج میں بہت ہی ادنیٰ ہے —

سب سے پہلے بدھ مذہب والوں نے سنسکرت کو چھوڑا ' اور ملکی زبانوں میں مذہبی لٹریچر کو رائج کیا - بنگالی زبان کے پہلے محسن وہی ہیں - یہ دسویں صدی مسیحی کی بات ہے - لیکن جب برہمنوں نے

قتل عام اور جلا وطنی کے ذریعہ سے بودھوں کو برما اور چین کی طرف بھگا کر ملک کو صاف کردیا، تو کرشنا پنڈت نے بارھویں صدی مسیحی میں بنگالی زبان کا نام پیشا چی پراکرت (بھوتوں کی زبان) قرار دے کر ایک گرامر (قواعد زبان) لکھی، سنسکرت کے حامیوں نے اسے قبول نہیں کیا، اور بنگالی بولی تحریری زبان ہوتے ہوتے رہ گئی - مذہب، عبادت و قربانی کے اجارہ داروں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ بودھوں کی زبان، مذہب اور رسوم کو مٹاتے بلکہ کمال یہ کیا کہ خود اپنے لٹریچر کے کسی حصے میں اس واقعہ کا تذکرہ بھی نہیں آنے دیا - لیکن بودھ گیا کا وہ عظیم الشان بدھ مندر زبان حال سے اس کی شہادت دے رہا ہے کہ مذہب کے نام پر اہنسا کے ماننے والے جب ہنسا پر اُتر آتے ہیں تو سیکڑوں بتوں کے نہ صرف ناک کان کاٹ لیتے ہیں، بلکہ زندہ آدمیوں کے ساتھہ ایسے مندروں کو بھی دفن کردیتے ہیں جن کی شکست و ریخت اُن کی اُستواری کی وجہ سے ناممکن ہوتی ہے - سیکڑوں سال کے بعد آج گیا کا مندر، جو چار مینار سے دونا بلند ہے، زمین کی گہرائیوں سے اس طرح برآمد ہوا ہے کہ گویا ہندوستان کے فرنگی حکمران حضرت مسیح کے سچے جانشین ہیں کہ مردوں میں جان ڈال رہے ہیں - بہر حال ہندوؤں نے اس غم و غصہ کا بنگال میں جس طرح اظہار کیا وہ بزدلانہ انتقام کی مکروہ تصویر ہے - ایک نمونہ راجہ سودھنوا اس طرح پیش کرتا ہے کہ جب وہ بودھوں اور جینوں کے ہم خیال راجاؤں کو گرفتار کرتا تھا تو حکم دیتا تھا کہ "اُن کے سر کلہاڑیوں سے کاٹے جائیں اور اوکھلیوں میں ڈال کر موسلوں کی مار سے ان کا بھرتا بنایا جائے" - (تاریخ ادبیات بنگال صفحہ ۲) —

عام حالات بنگال

عام حالات سے میرا منشا بنگال کا مختصر جغرافیہ اور تاریخ بیان کرنا ہے - جغرافیہ اس لیے، کہ طبعی اور جغرافی کیفیتوں کا ہر ایک زبان پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے' اس کے بغیر زبان کا صحیح ارتقا سمجھنا نا ممکن ہے - حقیقت یہ ہے زبان نہ صرف اظہار خیال کا ذریعہ ہے بلکہ ایک ایک لفظ اپنے اندر ایک پوری تاریخ پوشیدہ رکھتا ہے جو اس کے طبعی ماحول' تمدن اور فلسفہ کا آئینہ ہوتا ہے۔ تاریخ اس لیے' کہ سیاسی حالات کا انسان کے تمدن و معاشرت سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ اگر اس کا علم نہ ہو تو کوئی یہ نہیں بتاسکتا کہ شمالی افریقہ کی زبان عربی کیوں ہے' امریکہ میں انگریزی کیوں رائج ہے - حالانکہ نہ سندھ میں عربی بولتے ہیں نہ افغانستان میں فارسی - ایک طرف قدیم تمدن و زبان مٹ گئی' دوسری طرف ملکی بولیوں کو زبان بننے کا فخر حاصل ہوا ہے

جغرافیہ

موجودہ بنگال کا رقبہ چوراسی ہزار مربع میل سے کچھ زیادہ یعنی برطانیہ سے کسی قدر کم ہے - لیکن اس کی آبادی پورے جزائر برطانیہ و آئرستان سے زیادہ ہے - یہاں ہمیشہ ہرے بھرے سدا بہار درخت دکھائی دیتے ہیں اس لیے کہ زمین زرخیز ہے اور پانی کی کثرت ہے - اتنی کثرت کہ سیلابوں کی وجہ لاکھوں آدمی خانماں برباد ہوجاتے ہیں' مویشی مرجاتے ہیں اور بونے کا غلہ اور آلات کشاورزی تک تباہ ہوجاتے ہیں - نتیجہ قحط ہوتا ہے - لیکن بسا اوقات یہی سیلاب مفید بھی ثابت ہوتے ہیں جن سے ہر سال نئی قسم کی کھاد کی ایک تہ زمین پر چڑھ جاتی ہے جس میں دھان' کولا اور اسی قسم کی چیزیں اچھی پیدا ہوتی ہیں - سیلابوں کی وجہ علاوہ بارش کے یہ بھی ہے کہ

اس ملک میں پورے شمالی مغربی ہندوستان کا کیچڑ اور مٹی دریاؤں کے ذریعہ جمع ہوتا رہتا ہے اور دریا اکثر اپنا رخ بدل دیتے ہیں یا مختلف ندیوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں - یہ حالت پٹنہ سے شروع ہو جاتی ہے - قدیم شہر پٹنالی پتر دریائے گنگا کے کیچڑ میں بیس فٹ نیچے دفن ہے - اب نیا شہر اُسی پر آباد ہے - لیکن جہاں جہاں دریاؤں نے اپنا راستہ بدل دیا ہے اُس کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ وہ بستیاں جو اُن کے کنارے آباد تھیں، تباہ ہوگئیں - یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم تمدن ہند دریاؤں کا مرہون منت ہے - اور اب بھی دریاؤں سے سیکڑوں صنعتوں اور حرفتوں کو نہ صرف مدد ملتی ہے بلکہ ان کے ذریعہ سے بہت کم خرچ میں زیادہ مال ایک جگہ سے دوسری جگہ آجا سکتا ہے —

پانی کی کثرت کا لازمی نتیجہ تالابوں کی کثرت ہے - کنویں بھی ہیں لیکن اُن کی ضرورت ہی نہیں - اس لیے کہ یہاں کوئی ایسی چیز مثل گیہوں یا جو کے کاشت نہیں کی جاتی کہ اُس کے لیے آب پاشی کی ضرورت ہے - عموماً سب کاشتکاري بارانی ہے چاہی کا وجود نہیں - آبادی کا تین چوتھائی حصہ زراعت پر گزران کرتا ہے - مشرقی بنگال میں صرف چاول اور جوٹ کی کاشت کی جاتی ہے - اور مؤخرالذکر دنیا میں سوائے بنگال کے کہیں پیدا نہیں ہوتا - تلہن، نیشکر اور تمباکو کی بھی کاشت کی جاتی ہے، اور کہیں کہیں روئی بھی پیدا ہوتی ہے - اور زیادہ تر چاول، مچھلی، تیل پر پوری آبادی کی زندگی کا انحصار ہے —

فرنگیوں کی آمد کے ساتھ ساتھ دیہی مصنوعات کی مانگ گھٹ گئی ہے اور کارخانوں کا تیار کیا ہوا مال، خصوصاً کپڑا، فروخت ہونے لگا

ہے - چاء ' کان کنی ' جوٹ مل ' لوہے کی صنعت اور ریلوے کے کارخانوں میں ہندوستانیوں کو مزدوری مل رہی ہے ' جن کے سرمایہ دار اور ناظم زیادہ تر یوروپین ہیں - بعض چھوٹی صنعتوں میں ہندوستانی کمپنیاں بھی کام کر رہی ہیں - مثلاً صابون ' دیا سلائی ' چھتری ' ٹین کے صندوق ' پنسل اور سگرٹ سازی کا کام شروع ہوگیا ہے - مرشدآباد میں خالص ریشم اور مالدہ میں تسر (روئی اور ریشم کو ملا کر) کپڑا تیار کرتے ہیں - چونکہ بنگالی تمدن کا انحصار یہاں کی معتدل آب و ہوا کی وجہ سے بہت سادہ ہے یعنی صرف ایک دھوتی اور ایک چادر کے سوا مرد و زن کو کسی لباس کی ضرورت نہیں ہوتی ' اور کثرت باران کی وجہ سے ننگے پاؤں رہنے کا عام دستور ہے - کپڑوں کا سینا اور دیگر لوازم تمدن کی ابتدا مسلمانوں کی آمد کے بعد سے ترقی پذیر ہوئی - اس لیے جتنی عمدہ صنعتیں یہاں ترقی کرسکیں وہ سب مسلمان امرا کے درباروں کی فن نوازی کا ثبوت دیتی ہیں - ریشمی کپڑوں کے نام ظاہر کرتے ہیں کہ تمدن اسلامی کا اثر کس طرح مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا تھا - یہاں چلدری کا نام " بلبل چشم " ہے - جس کپڑے میں چاند تارا بناتے ہیں اُسے " چاند تارا " کہتے ہیں - " آب رواں " باریک کپڑا ہوتا ہے - مرشدآباد میں ہاتھی کا دانت کا بے مثل کام ہوتا ہے - کٹک ' ڈھاکہ اور مرشدآباد میں سونار اور سادہ کار اس کثرت سے پائے کے ہیں کہ بہت کم ممالک ان کا مقابلہ کرسکتے ہیں - ڈھاکہ کی کشیدہ کاری اور سوزن کاری کا مال اب تک ترکی جاتا ہے - اور جامدانی اور چکن دور دور مشہور ہے - پورنیہ اور مرشدآباد میں تھوڑا سا بدری کام بھی ہوتا ہے —

ضروری التماس اس سلسلے میں ضروری عرض یہ ہے کہ ماہرین علم الالسنہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انسان اپنے فطری ماحول سے اثر پذیر ہوکر الفاظ بناتا ہے - جو نیا لفظ بنتا ہے وہ یا تو مقامی احوال کا مظہر ہوتا ہے یا کسی دوسری قوم کے تمدن کے اثر سے مستعار لیا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ مقامی زبان کا جز بن جاتا ہے - اس قسم کی ہزاروں مثالیں اُن اقوام میں پائی جاتی ہیں جن کا دوسری قوموں سے سیاسی ' تجارتی یا مذہبی تعلق ہوتا ہے - جن قوموں کا تمدن پست ہوتا ہے وہ مجبور ہوتی ہیں کہ خصوصیت سے اسما (Names) اور صفات (Adjectives) کی کمی کو دوسری زبانوں سے لے کر پورا کریں - اس نظریہ کی روشنی میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے تو معلوم ہوگا کہ کھانے پینے' پہننے اوڑھنے حتی کہ رشتے ناتے اور موسم و وقت کے متعلق بھی سیکڑوں الفاظ اردو زبان کے بنگال میں رائج ہیں - اس طرح اردو نے ہندوستان کی مختلف قوموں میں جو اتحاد و اتفاق پھیلانے کی مضبوط بنیاد ڈالی وہ نہ تو کسی مذہب سے ہوسکی اور نہ کسی حکومت کے دباؤ سے - اس بنیادی اتحاد میں رخنہ ڈالنا یقیناً ہندوستان کی متحدہ قومیت کو تباہ کرنا ہے —

تاریخ بنگال کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں یہاں کے اصلی باشندے دراوڑ تھے جو اب تک چھوٹا ناگپور ' اوڑیسہ اور سنتھال پرگنوں میں پائے جاتے ہیں - ان کا تعلق زبان اور شکل و صورت کے اعتبار سے ملکا ' پیگو ' انڈو چائنا اور جزائر شرق الہند سے لے کر آسٹریلیا کے باشندوں تک قائم کیا جاسکتا ہے - کہا جاتا ہے کہ پہلے ان کا عظیم الشان تمدن تھا - آریوں نے اسے مٹادیا - اور اب نہ ان کے پاس زمینیں ہیں

نہ مستقل جائے قیام - زیادہ تر مزدوری پر بسر اوقات ہوتی ہے - سنتھالیوں کی ایک خصوصیت یہ باقی ہے کہ ان میں چوری، بھیک اور بدکاری کا قطعی وجود نہیں - یہ لوگ عام بنگالیوں سے بہت زیادہ محنتی اور جفاکش ہیں اور سنتھالی بولی بولتے ہیں جس کی ڈکشنری بھی مشنریوں کی بدولت بن گئی ہے اور باوجودیکہ ان میں سے اکثر عیسائی بنالیے جاتے ہیں لیکن وہ اپنے قدیم تمدن و طرز زندگی کو نہیں چھوڑتے - آسام کی طرف 'کھاسی' بولی رائج ہے - یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ یہاں کے اصلی باشندے مغربی چین سے آسام اور وہاں سے بنگال آئے ہوں گے —

آریوں نے گنگا کی وادی میں فتوحات شروع کیں - اور جنوبی بہار تک چلے آئے - مسیح سے چھہ سو سال پہلے مگدھ (جنوبی بہار) کا راج قائم ہوگیا تھا - یہ ملک موریہ سلطنت کا مرکز تھا - اس کا مرکز پٹنہ کے قریب شہر راجگیر میں تھا - اسی کے قریب سیسلنگا راجاؤں کا راج تھا، جس کا دارالسلطنت 'ویسالی' تھا - یہ مقام ضلع مظفر پور (بہار) کا موجودہ گاؤں بیساڑ ہے - اسی راج کے زمانے میں جین مذہب کے بانی مہابیر پیدا ہوے تھے، جنھوں نے پٹنہ کے قریب وفات پائی - یہ ویسالی کے راجاؤں کے خاندان سے تھے - گوتم بدھ، بھی اگرچہ مگدھ میں پیدا ہوئے تھے لیکن بہار ہی میں بودھ گیا کے ایک پیپل کے درخت کے نیچے اُنہیں فراغت کاملہ (نروان) کا روشن خواب دکھائی دیا تھا - اشوک (۲۷۲ سے ۲۳۱ قبل مسیح) کے زمانے میں بدھ مذہب کافی عروج پر تھا - اس لیے سلطنت مذہب کے ساتھہ تھی اور خود اشوک نے ڈیڑھ لاکھہ باشندگان کالنگا و اوڑیسہ کو غلام بنانے اور ایک لاکھہ سے زیادہ کو قتل

کرنے کے بعد خون ریزی سے توبہ کرلی تھی اور بدھ مذھب کا پیرو بن گیا تھا۔ اب باورچی خانے کے صرف کے لیے هزاروں جانوروں اور چڑیوں کے بجائے صرف چند جانور کاتے جاتے تھے —

ٹھیک اُس وقت جب کہ عرب سے آفتاب حریت و مساوات طلوع هو رها تھا' بنگال بہار اور اوڑیسہ میں بنگال کے شاشنک راجاؤں نے مذھب کے نام پر قتل عام جاری کررکھا تھا۔ پٹنالی پتر (پٹنہ) نذر آتش هوچکا تھا۔ مقدس پیپل برباد' اور بدھ مندر (وهار) زیر زمین کیے جارهے تھے۔ لیکن راجہ هرش نے ان مظالم کو روک دیا اور بہت جلد خانقاہ 'نالندہ' (متصل پٹنہ) میں دس هزار سے زیادہ بھکو اور طالبان علم جمع هوگئے۔ یہ هندوستان کی عظیم الشان یونیورسٹی صرف بدھ مذھب والوں کی مرهون منت هے۔ 'هرش' کے بعد طوائف الملوکی رهی۔ نویں صدی مسیحی میں شمالی بنگال اور بہار پر 'پال' خاندان کے راجاؤں نے راج شروع کیا۔ بارهویں صدی میں 'سین' راجاؤں نے پورے بنگال پر قبضہ جمالیا اور پال خاندان کو نکال باهر کیا۔ یہ خاندان متعصب قسم کے هندوؤں کا خاندان تھا جنھوں نے زبان سنسکرت کی کافی سرپرستی اور اشاعت کی —

جہاں تک بنگالی زبان کا تعلق هے اس زمانے میں کوئی کام نہیں هوا۔ سنسکرت کے مقابلہ میں اسے علمی زبان بننے کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ یہ فخر مسلمانوں کو هے کہ اُنھوں نے بنگالی بولی کو زبان بنایا۔ اور اب تو وہ هندوستان کی بہترین زبانوں میں شمار کی جاتی هے۔ مسلمانوں کے ابتدائی دور کی ایک کتاب "شنیسہ پران" هے۔ اس میں پران کے خداؤں یعنی شیو' وشنو اور برهما وغیرہ کا حال نئے انداز میں بیان

کہا ہے جس میں ایسے الفاظ بھی آجاتے ہیں جن سے بدھ کے نروان کی جھلک آتی ہے - اس میں خلق عالم سے لے کر دھرم پوجا کے طریقوں تک کا حال ہے - اس میں نثر بھی ہے - اور آخری باب ' جو بہت بعد کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے ' " نرنجن کے غضب " کے عنوان سے شروع ہوتا ہے - اس کے ایک جزو کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے :-

" جاج پور اور مالدہ میں سولہ سو مضبوط برھمنوں کا اجتماع ہوا - یہ ویدک دھرم کے ماننے والے تھے - ان کا دس دس بارہ بارہ آدمیوں کا جتھا اُن ست دھرمیوں (بدھ مذھب والوں) کو قتل کرنے لگا جو اپنے مذھب پر لعنت اور گالیاں دینے سے انکار کرتے تھے - جب وہ ویدوں کے منتر پڑھتے تھے تو اُن کے منہ سے شعلے نکلتے تھے - ست دھرمی اُنہیں دیکھہ دیکھہ کر لرزتے تھے اور ' دھرم ' سے دعائیں کرتے تھے کہ وہ انھیں بچائے - دھرم کے سوا اُنھیں کون بچانے والا تھا ؟ (اس لیے کہ بدھ مذھب میں خدا کے متعلق خاموشی ہے - وہ صرف تین لفظ جانتے ہیں - بدھ ' دھرم ' سنگھہ) اس طرح برھمنوں نے اس زمین پر ظلم کیا اور مخلوقات کو تباہ کیا - دھرم ' جو بیکنٹھہ (بہشت) میں تھا ' یہ دیکھہ کر رنجیدہ ہوگیا وہ دنیا میں مسلمان بن کر چلا آیا - اس کے سر پر سیاہ ٹوپی تھی اور ہاتھہ میں ایک کمان وہ گھوڑے پر سوار تھا - اس کا نام خدا تھا - نرنجن نے بہشت میں اپنا یہ اوتار لیا - سب دیوتاؤں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ وہ پاجامے پہنیں گے - برھما نے محمد کا اوتار لیا - وشنو پیکامبر (پیغامبر یعنی جبریل ؟) بنا اور شیو آدمفا (آدم) - گنیش غازی کے روپ میں نمودار ہوا - کارتک قاضی بنا - نارد نے شیخ اور اِندر نے مولانا بننا پسند کیا - بہشت کے رشی فقیر بن گئے - سورج ' چاند اور دوسرے دیوتا سپاہی بن گئے

اور ڈھول بجانے لگے - دیوی چنڈی نے حیا بی بی اور پدماوتی نے بی بی نور کی صورت میں ظہور کیا - اب یہ سب دیوتا متفقہ طور پر جاج پور کی طرف روانہ ہوئے - اس میں داخل ہوکر انہوں نے مندروں اور مٹھوں کو توڑ ڈالا - ہر طرف شور تھا: "پکڑو! پکڑو! "

"راماٸی پنڈت" اپنا سر 'دھرم' کے قدموں پر رکھہ کر عرض کرتا ہے کہ آپ نے کتنا اچھا ھنگامہ بپا کیا ہے!"

(دیکھیے: History of Bengali Language & Literature
By D. N. Sen B. A., Calcutta University 1911. pp. 36 and 37.)

معلوم نہیں یہ کس لڑائی کی طرف اشارہ ہے - لیکن اتنا ضرور ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کو دیوتا مانا جاتا تھا اور اب بھی مقابلتاً زیادہ جری اور جفاکش ہیں - یہ بھی نہیں معلوم کہ شاعر نے اِندر کو مولانا کیوں بنایا - حالانکہ اِندر کے متعلق حضرت جانعالم واجد علی شاہ مرحوم نے ایک حد تک صحیح نظریہ قایم کیا تھا کہ وہ ناظم بہشت و نغمہ و سرور ہے - ممکن ہے کہ مولاناؤں کی مجالس میں حال و قال، چنگ و رباب کی موجودگی سے شاعر کو یہ سوجھی ہو کہ یہ مسلمانوں کے اِندر ہیں - بیچارے غازیوں کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ صرف قول و قوال تک محدود رہیں اور عمل جہاد اور نغمۂ شمشیر کو چھوڑ سکیں —

غرضکہ مسلمانوں کی بنگال میں اس طرح آمد آمد ہوتی ہے کہ "اندر سبھا" (امانت) میں گویا اِندر تشریف لا رہے ہیں - اس سے پہلے کا زمانہ ہماری نظروں سے اس تیزی سے گزر جاتا ہے کہ سوائے مہابیر، بدھ، فاھیان، اشوک، ھیون سانگ کے قصوں کے اور کچھہ نظر نہیں آتا -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خواب تھا جس کی تعبیر کہیں کسی لاٹھ سے ہوتی ہے کہیں کتبہ سے' کہیں کوئی مدفون مندر نکل آتا ہے یا کسی شاعر کا بھوج پتر پر لکھا ہوا کلام —

بنگال کا تاریخی زمانہ جنرل بختیار خلجی کے نام سے شروع ہوتا ہے جس کے سامنے بلا مبالغہ موجودہ زمانے میں کوئی سپہ سالار نظر نہیں آتا - اس نے ڈیڑھ درجن سواروں کے ساتھ' اپنی پوری فوج کو بہت پیچھے چھوڑ کر لکھنوتی پر (جو بعد میں گور کہلایا) حملہ کر دیا - اور سین راجہ کو جس کی راجدھانی بنارس سے سمندر تک تھی' شہر سے فرار ہونے پر مجبور کیا - بختیار خلجی نے اُس کی جائے پناہ بکرم پور بھی لے لی اور غریب راجہ نے مع اپنے خاندان کے چتا پر جل مرنا پسند کیا - آخر کار فاتح نے ڈھاکہ کے قریب سنار گاؤں میں دم لیا' جسے اپنا دارالسلطنت بنا کے اس نے غلام بادشاہ قطب الدین ایبک سے آزاد ہوکر بنگال میں پہلی مسلمانوں کی سلطنت قائم کی - یہ واقعہ رائے پتھورا کی شکست اور شہاب الدین غوری کے دھلی فتح کرنے کے چھہ سال بعد یعنی سنہ ۱۱۹۸ ع کا ہے - اب مسلمانوں کی آپس کی لڑائیاں شروع ہوگئیں اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان حمایت دین کے لیے ہمیشہ جنگ کیا کرتے ہیں اب اُن کی حالت ملاحظہ فرمائیں -

باوجودیکہ بنگال کی آب و ہوا ایسی نہ تھی کہ کوئی یہاں رہنا پسند کرتا' لیکن دولت و جاہ کی طمع نے سنہ ۱۲۲۵ ع میں التمش کو مجبور کیا کہ خود بدولت بنگال کے صوبہ دار کی گوشمالی کریں - لیکن اس کے مرنے کے بعد پھر بنگال میں خود سری کا دور دورہ شروع ہوگیا - جب بلبن فرمانروا ہوا تو اس نے طغرل خاں والیٔ بنگالہ کو خود جاکر

شکست دی۔ اور نہ صرف طغرل کو قتل کیا بلکہ گور کے باغیوں کے لیے دو میل تک پھانسیوں کی قطاریں کھڑی کرکے وہ سبق پڑھایا جس کا آموختہ دُھرانے کی نوبت اس عالم فانی میں پھر نہیں آئی۔ سنہ ۱۳۳۳ ع میں بہادر شاہ نے خود مختاری کا اعلان کیا اور شاہان تغلق کو اس کی سرکوبی کرنی پڑی۔ لیکن پھر پانچ سال بعد فخرالدین مبارک شاہ نے بنگال کو مرکزی حکومت سے آزاد کرھی لیا —

اس دور حریت و آزادی میں چار خاندانوں کے ۲۴ بادشاھوں نے بنگال پر دو سو سال تک حکومت کی۔ آخری خاندان حسین شاھی کا بانی ایک شخص علاءالدین عربی نسل سے تھا جسے شیر شاہ نے ختم کردیا اور وہ خود سنہ ۱۵۴۰ ع میں دھلی کا بادشاہ بن بیٹھا —

پٹھانوں کو زمانے نے زیادہ مہلت نہ دی۔ اور اگرچہ انھوں نے اوڑیسہ کو بھی سنہ ۱۵۹۸ ع میں اپنے زیر نگیں کرلیا تھا لیکن آخر کار سنہ ۱۵۷۲ ع میں اکبر کی فوجوں نے داؤد خاں تاجدار بنگال کو راج محال میں شکست دے کر بنگال کو فتح کرلیا۔ اب اُس زمانہ کی چند شکستہ عمارتیں اور شہسرام میں شیر شاہ (المتوفی سنہ ۱۵۴۵ ع) کا مقبرہ باقی رہ گیا ھے —

مغلوں کے ابتدائی سو سال کے زمانے میں بنگال میں بائیس صوبہ داروں نے حکومت کی۔ سولھویں صدی کے آخیر میں ٹانڈہ سے راجمحال میں دارالحکومت تبدیل ھوا۔ شائستہ خاں نے سنہ ۱۶۶۶ ع میں اُن پرتگیزوں کا صفایا کردیا جو لوٹ مار کرنے اور غلاموں کی تجارت کے سلسلے میں بحری ڈاکو بن گئے تھے اور ساحل ھی نہیں بلکہ ڈھاکہ تک تباھی پھیلا چکے تھے۔ چاٹگاؤں ان کا بحری مستقر سا ھو گیا

تھا - اس زمانے میں راستوں میں کافی امن و امان ہوگیا تھا - صنعت و حرفت و تجارت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی - حتیٰ کہ برنیر کہتا ہے کہ :—

" بنگال نہ صرف ہندوستان یا مغلیہ سلطنت کا خزانۂ مال و دولت ہے، بلکہ ملحقہ ممالک اور یورپ کے لیے بھی یہیں سے مال مہیا ہوتا ہے - مجھے حیرت ہے کہ صرف ولندیزی تاجر اتنا سوتی سامان جاوا اور یورپ کو روانہ کرتے ہیں کہ اندازہ کرنا مشکل ہے - انگریز، پرتگیز اور ہندوستانی سوداگروں کا تو کہنا ہی کیا ہے - یہی حال ریشمی کپڑوں کا ہے - پٹنہ کی طرف سے شورہ کشتیوں میں آتا تھا، جسے بارود بنانے کے لیے ولندیز اور انگریز یورپ لے جاتے تھے - چاول مدراس، لنکا، اور جزائر مالدیپ (دیپ = دویپ=دوآب = جزیرہ) کی طرف جاتا تھا - غرضکہ بنگال ایسا ملک تھا جو سب کا داتا تھا " -

سنہ ۱۷۰۴ ع میں جب مرشد قلی خاں نے مرشد آباد میں دارالحکومت منتقل کیا تو ڈیڑھ کروڑ روپیہ سالانہ دہلی بھیجنا شروع کیا - تجارت کی ترقی نے ملو کے اس قانون کو توڑ دیا جس کی وجہ سے بنگال کو چنڈالوں اور بھوتوں کا ملک کہا جاتا تھا - شہر شاہی سڑکوں پر سرائیں، مسجدیں، کنویں اور ہندو مسلمانوں کے لیے علحدہ علحدہ خدمت گزاروں کی اتنی کثرت ہوگئی تھی کہ لوگ سونا اچھالتے چلے جاتے تھے - دریاؤں سے بھی آمد و رفت شروع ہوگئی تھی - اور آخر کار مصنف ریاض السلاطین کو لکھنا پڑا کہ اس دور حکومت سے پہلے " نہ صرف مغل امرا بنگال کی آب و ہوا کو مہلک سمجھتے تھے بلکہ واقعی اسے بھوتوں کا مسکن تصور کرتے تھے - لیکن اب یہ ایسا باغ ہے جس میں

کانٹا نہیں - اب ان کی دلی خواہش ہے کہ وہاں کوئی عہدہ ملے "۔
عالمگیر (رح) کے بعد یہاں کے نواب وزیر موروثی ہوگئے - سنہ ۱۷۴۰ ع میں علی وردی خاں کا زمانہ تھا - یہی زمانہ ہے جب کہ مرہٹوں نے سر اُٹھایا تھا - اور ہر طرف لوٹ مار شروع کردی تھی - حتیٰ کہ اُنھیں اُوڑیسہ دے کر پیچھا چھڑایا گیا - یوروپین سلطنتوں کی تجارتی کوٹھیاں سبھی قلعوں اور میگزینوں میں تبدیل ہونے لگی تھیں - حتیٰ کہ جب نواب سراج الدولہ تخت وزارت پر متمکن ہوئے تو اُنھوں نے انگریزوں کو مار بھگایا اور کلکتہ پر قبضہ کرلیا - لیکن مرشد آباد میں اُن کے خلاف ایک سازش ہوئی جس میں کلایو بھی شریک تھا اور سنہ ۱۷۵۷ ع میں سراج الدولہ کو شکست دے کر انگریز سوداگروں نے میر جعفر کو نواب بنادیا - یہ انگریزوں کے ہاتھ میں بالکل کٹھ پتلی تھا - اور جب فوجوں کے لیے روپیہ نہ فراہم کرسکا تو نالائق کر کے نکال دیا گیا - اور میر قاسم نواب بنائے گئے - انھوں نے مونگھیر کو دارالحکومت بنایا - اور جب انھوں نے حسب معاہدۂ وینسٹارٹ (Vansittart) منعقدہ جنوری سنہ ۱۷۶۳ ع اپنے وصولیٔ محاصل چنگی کے جائز حقوق استعمال کرنا شروع کیے تو کونسل کے دیگر امراد نے گورنر کے معاہدہ کو منسوخ کر کے ایلس (Ellis) کو نواب پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا - غرضکہ پھر میر جعفر ۲۳ جولائی سنہ ۱۷۶۳ کو مرشد آباد لایا گیا - اور میر قاسم شکست خوردہ الہ آباد کی طرف چلے گئے - فروری سنہ ۱۷۶۵ میر جعفر مرگیا - لیکن اسی زمانے میں شاہ عالم نے انگریزی کمپنی کو بنگال کے حقوق دیوانی عطا کردیے اور میر جعفر کے بیٹے کی نوابی بھی انگریزوں نے ختم کردی - غرضکہ جو فتح پلاسی میں (سنہ ۱۷۵۷ ع) میں ہوئی تھی

اس پر بکسر کی لڑائی (سنہ ۱۷۶۴ ع) نے مہر تصدیق ثبت کردی، اور شاہ عالم سے معاہدہ ہوکر بنگال کی قسمت کا کچھہ دنوں کے لیے فیصلہ ہوگیا - دارالحکومت مرشدآباد سے کلکتہ میں سنہ ۱۷۷۲ ع میں بدل دیا گیا - اور سنہ ۱۷۹۰ ع میں حقوق دیوانی کے علاوہ فوجداری کو بھی لارڈ کارنوالس نے مغلیہ حکومت سے آزاد کرلیا - یعنی ایک طرح کی نام نہاد حکومت جو نواب کے ہاتھوں میں تھی وہ بھی ختم کردی گئی —

مذاہب | بنگال میں ہندو مسلمان اس طرح آباد ہیں کہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اور مغربی بنگال میں ہندوؤں کی کثرت ہے - اور مجموعی طور پر مسلمان ہندووں سے چند فیصدی زیادہ ہیں - صرف مسلمان یہاں اتنے ہیں کہ جنگ بلقان سے پہلے کی ترکی، ایران اور افغانستان کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہیں - لیکن ان کی عام تعلیمی حالت اور تمدنی زندگی زوال سلطنت کے بعد بہت پست ہوگئی ہے - انگریزوں نے جب یہاں نیا نیا انتظام کیا تو یہاں کے مسلمان زمینداروں کے جو ہندو "کارندے" اور "سرکار" تھے وہ سب زمیندار بن بیٹھے - یعنی مالگزاری کی ادائگی ان کے ذمہ قرار پائی - اس طرح یہاں تقریباً سب زمیندار ہندو ہیں اور مسلمان کاشتکار یا مزدوری پیشہ ہیں - جوٹ کی پیداوار جن علاقوں میں ہوتی ہے وہ تقریباً مسلمان کاشتکاروں کی محنات کا نتیجہ ہے، جوٹ (جس سے بورے وغیرہ بنتے ہیں) کا کاروبار سب انگریز اور اسکاچ سرمایہ داروں کے ہاتھہ میں ہے - یہ چیز بنگال کے علاوہ دنیا میں کہیں پیدا نہیں ہوتی اس لیے اگر معقول قیمت پر فروخت ہو تو کسانوں کو بہت نفع ہو سکتا ہے - لیکن سرمایہ دار کمپنیاں بھی اب ایک طرف تو کسانوں اور مزدوروں کے اتحاد سے پریشان ہو رہی ہیں -

اور دوسری طرف امریکہ اور دوسرے ممالک کی نئی ترکیبوں سے ان کی تجارت پر اثر پڑ رہا ہے - کہتے ہیں کہ وہاں کاغذ کے مضبوط بورے تیار ہونے لگے ہیں - روئی اب یہاں بہت کم پیدا ہوتی ہے' البتہ ریشم کی پیداوار بڑھ رہی ہے —

مذہب ہندو رسم و رواج کے مجموعوں کا نام ہے' ان میں سیکڑوں فرقے ہیں جو اپنے کو ہندو کہتے ہیں - عجائب پرستی اور فطرت پرستی عام ہے - اسی کے ساتھ ساتھ ویدانتی اور فلسفی بھی ہیں جو ہمہ اوست وہمہ از وست کی بحثیں کرتے ہیں - عام طور پر مندر ایسے بنائے جاتے ہیں کہ ہر ایک شخص ایک وقت پوجا کرسکے - جماعتی پرستش صرف مسلمانوں کی امتیازی چیز ہے - شیو کی پرستش کرنے والے بھی ہیں اور وشنو کی پوجا کرنے والے بھی - پہلا گوشت خور ہے دوسرا نہیں - شکتی یا شیو کی بیویوں کی قوت تانیث کی بھی پرستش ہوتی ہے - یہ درگا' کالی اور پاربتی ہیں - انہیں خوش کرنے کے لیے بکروں کے تازہ خون کی بھینٹ چڑھانا ضروری ہے - پہلے آدمیوں کی بھی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی - اس کی ایک شاخ اس حد سے گزر کر تانترک دھرم کے مطابق برہنہ عورت کی پرستش بھی کرتی ہے - گرو (مرشد) کی پوجا بھی ہوتی ہے جسے خدا سے بلند رتبہ دیا جاتا ہے —

راجہ رام موہن رائے سنہ ۱۷۷۴ع – سنہ ۱۸۳۳ع) نے اسلام سے اثر پذیر ہو کر نہ صرف لباس و خوراک میں مغلوں کے اثر کو قبول کر لیا تھا' بلکہ مغلیہ تاجدار کی طرف سے ولایت سے واپسی کے بعد بھی انگریزی مذہب سے مرعوب نہیں ہوے - انہوں نے توحید باری تعالیٰ کی تعلیم کے لیے ایک معقول مذہب (برھمو سماج) رائج کیا تھا - بیواؤں کی شادی کے حامی

تھے - اور چھوت اور کو دور کرنا چاہتے تھے - کیشب چندر سین (سنہ ۱۸۳۸ ع - ۱۸۸۴ ع) نے اور دوسرے پڑھے لکھے ہندوؤں نے اس کی ترویج کی - لیکن اب ان کی مجموعی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں ہے - ان میں دو مسلمان بھی داخل ہیں - اور سب بت پرستی کے خلاف ہیں ---

ہندو تصوف یعنی ویدانت کو رام کرشن پرم ہنس (سنہ ۱۸۰۴ ع - ۱۸۸۶ ع) کے مشن نے ترقی دی - یہ کلکتہ سے چند میل کے فاصلہ پر تھے - ان کے شاگرد رشید سوامی وویکانند اور سسٹر نویدیتا (Sister Nivedita) نے یورپ اور امریکہ میں اس کو کافی شہرت دی - یہ مشن اب دو جماعتوں میں تقسیم ہوگیا ہے - ایک روحانیت کی طرف زیادہ مائل ہے اور گوشت نہیں کھاتا - اور دوسرا خدمت خلق و خدمت مریضاں کی طرف رجوع ہے اور گوشت کھانے پر معترض نہیں - مؤخرالذکر جماعت کو نومبر سنہ ۳۷ ع میں ایک امریکی عورت نے سات لاکھ روپے مندر بنانے کے لیے دیے ہیں جس میں رام کرشن پرم ہنس کا مجسمہ بھی ہوگا - "پرستش کے لیے نہیں" بلکہ یادگار کے طور پر - جس طرح لینن کی قبر روس میں ہے اور باوجود لادینیت کے جوشیلے روسی اس کو دیوتا سمجھنے لگے ہیں - لیکن اسے ان کی عقل کا قصور کہا جاتا ہے - آریہ سماج کا اثر بنگال میں نہیں ہے - اور دیانند سرسوتی (سنہ ۱۸۲۷ ع - سنہ ۱۸۸۳ ع) کی تعلیم کا زور بہار تک آتے آتے ختم ہوگیا ہے ---

باوجود ان فرقوں کے بھکتی کی تعلیم کے ماننے والے بہت زیادہ ہیں - یہ لوگ کالی یا شکتی کی پوجا نہیں کرتے اور ایک قسم کے موحد ہیں - جس طرح کبیر اور نانک نے شمال مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کے اثر سے جات پات کو توڑ کر توحید باری تعالی پر زور

دیا تھا - اسی طرح بھگتی کے حامی خدائے واحد کی محبت کو ذریعۂ نجات تصور کرتے ہیں - 'چیتن' دیو نے' جو کرشن کے اوتار مانے جاتے ہیں' جب بھگتی کی تعلیم دینی شروع کی تو وہ بنگال سے بندرابن گئے اور وہاں جاکر انھوں نے قدیم بزرگوں کے استھانوں (مقامات) کو کشف کے ذریعہ سے معلوم کیا - نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند اور خصوصاً بندرابن اور متھرا کی طرف کثرت سے بنگالیوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی - اور بنگالی زبان پر اردو کے نقش و نگار بننا شروع ہوگئے —

گذشتہ صدی میں جن مسلمانوں کے نام احیائے ملت اسلامیہ کے سلسلہ میں لیے جاتے ہیں ان میں حضرت سید احمد بریلوی اور مولوی کرامت علی جونپوری کا شمار صف اول کے لوگوں میں ہے - بنگال میں جو اثر ہے وہ انہی بزرگوں کا ہے - اور تقلید کی جکڑ بند سے نکلنے میں ان حضرات کی کوششوں نے بہت کچھہ کار فرمائی کی ہے - یہی وجہ ہے بنگال کے عام مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ روشن خیال ہیں - یعنی نہ تو وہ اتنے عجائب پرست ہیں' نہ ہندوؤں کی سی رسموں میں بندھے ہوے ہیں - ایسے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے جو مشرکانہ رسوم کے ترک کرنے کی وجہ سے وہابی کہلاتے ہیں - ان کی کئی قسمیں ہیں - بعض اہل حدیث کہلاتے ہیں اور بعض فرائضی - لیکن قدامت پرستی اور ہندوستانی بدعتوں کے ماننے والے پیر پرست' قبر پرست' اور سماع و مولود کے قائل بھی موجود ہیں - موجودہ زمانے میں تقلید و تجدید کے پیرووں میں مختلف جماعتیں پیدا ہوگئی ہیں - مثلاً مولانا سید ابوبکر صاحب موضع فرفرا' تا کھانہ دکھشن دیہی ضلع ہگلی کے باشندے ہیں' حنفی ہیں یعنی اہل حدیث کے

مخالف سمجھے جاتے ہیں۔ تصویر کے خلاف ہیں۔ مولوی کرامت علی جونپوری کے پوتے ابوالفرح زندہ ہیں، کلکتہ میں بھی رہتے ہیں اور رنگپور میں بھی۔ یہ محمدی کہلاتے ہیں، امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا جائز سمجھتے ہیں اور پیری مریدی کرتے ہیں۔ ابا خالد رشیدالدین عرف بادشاہ میاں، فرید پور (مشرقی بنگال) کے با اثر شیخ ہیں۔ سورہ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے تیس لاکھ مرید ہیں۔ اور خلافت کے سلسلے میں جیل بھی جا چکے ہیں، یہ فرائضی ہیں۔ فرائضی جماعت کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ وہ زمین کو خدا کی ملکیت سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حکومت کو یہ حق نہیں کہ اُس پر کسی قسم کا لگان یا ٹیکس عاید ہو سکے۔ اس لیے وہ لگان و مالگزاری وغیرہ ادا کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوا ہے کہ اب یہ "حیلۂ شرعی" اختیار کیا گیا ہے کہ مالک زمین خود مالگزاری ادا نہیں کرتا بلکہ اس کا کوئی رشتہ دار دے آتا ہے۔ یہ لوگ کاشتکاری کے ذریعہ معاش حاصل کرنا بہتر تصور کرتے ہیں اور نوکری کرنے کو حرام سمجھتے ہیں۔ خواہ کسی کی بھی ہو۔ پیر پرستوں کی ایک جماعت وہ بھی ہے جو سجدۂ مرشد کو جائز سمجھتی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کا نمونہ 'باؤل' فقرا کی جماعت میں نظر آتا ہے۔ یہ زیادہ تر ضلع 'ندیا' میں رہتے ہیں اور دوسرے اضلاع میں بھی موجود ہیں۔ ان میں سے بعض نماز بھی پڑھتے ہیں اور بعض بالکل آزاد ہندو فقیر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا سلسلہ پنجاب کے کسی شیخ کے خاندان سے ہے ــ

جس طرح ہندوستان (سرہند تا پٹنہ) میں ہندی اردو کا اختلاف پیدا ہو رہا ہے، اسی طرح بنگال میں بھی ہندو بنگالی اور مسلمانی بنگالی

موجود ہیں - یعنی ایک میں سنسکرت کی زیادتی اور دوسری میں تمدن اسلامی کی جھلک پائی جاتی ہے - رابندرا ناتھ ٹیگور نے تیس سال کی محنت کے بعد بنگالی زبان کو سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ و محاورات سے آزاد کیا ہے اور عوام کی بول چال سے زیادہ قریب کردیا ہے - اسی طرح قاضی نذرالاسلام نے حافظ و سعدی کی زبان کو فارسی بحروں میں بنگالی زبان کے لیے رائج کرنا شروع کیا ہے - اور زبان کی وسعت میں اضافہ کیا ہے —

بنگالی زبان پر مسلمانوں کا احسان

جس طرح بودھوں کی فراخ دلی اور عدم عصبیت نے عوام کی بولیوں کو زبانوں کی صف میں لانے کی کوشش کی تھی اور ہندوؤں کی تنگ نظری یا قدامت پرستی نے اُنھیں مجبور کیا کہ اس تحریک کو کچل دیں، اُسی طرح، بلکہ اُس سے زیادہ انہماک اور فراخ دلی سے مسلمانوں نے مقامی بولیوں کو ترقی دی - جہاں وہ گئے ملکی بولی کو سلطنت کے طول و عرض میں رائج کرنے لگے - اب تک گجراتی، اودھی، بہاری اور بنگالی کو ہندوؤں نے اس قابل بھی نہیں سمجھا تھا کہ وہ اس میں ویدوں کو نہ سہی تو کم از کم رامائن اور مہابھارت ہی کو ترجمہ کرکے عوام کے قریب لے آتے - حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہر ملک میں چند مذہبی اجارہ دار علم کو اپنی میراث سمجھتے ہیں اسی طرح ہندوستان کی بھی حالت تھی - یورپ کی حالت تو صرف تھوڑے دن پہلے یہ تھی کہ تعلیم کلیسا کی ماتحتی میں تھی اور سائنس کی روشنی

کو ' حتیٰ کہ ریاضی و نجوم کو بھی ' عوام تک پہنچانے والوں کو نہ صرف قید کردیا جاتا تھا بلکہ اکثر و بیشتر ملک عدم کو پہنچا کر دم لیا جاتا تھا - یہ تھی مذہب کے نام پر " ملحدوں " کی خونریزی - اس سفاکی کی مثالیں اتنی طویل ہیں کہ ایک مکمل کتاب نہیں بلکہ پوری تاریخ انسانی اسی مذہبی ہٹ دھرمی اور اجارہ داری کی خون آشامیوں کے واقعات سے تیار کی جاسکتی ہے - بہر حال ہندوستان میں یہی ہوا - اور اب مسلمانوں کی سلطنت کے جانے کے بعد پھر ان مذہبی مجنونوں کو سر اُٹھانے کا موقعہ ملا ہے - مگر ہیں یہ سب رنگے سیار ' مصنوعی مجنون - ان کا مقصد صرف دوسری ترکیب سے اپنی اقتصادی قیادت کو قائم رکھنا ہے - اس سلسلے میں مذہب بھی استعمال ہوسکتا ہے اور سیاست بھی - منشا دونوں کا ایک ہے یعنی ایک مخصوص علمی جماعت کے لیے روٹی دال —

دنیش چندر سین نے مجبوراً دبی زبان سے مسلمانوں کی اس روا داری کو اس طرح بیان کیا ہے - " بنگالی کو ادبی معیار تک پہنچنے کے لیے بہت سی چیزوں سے مدد ملی - اس میں بلا شبہہ اسلامی فتح کو سب سے بلند درجہ حاصل ہے - اگر ہندو راجا آزاد رہتے تو بنگالی کو راجاؤں کے درباروں تک پہنچنا بہت مشکل تھا - پٹھانوں نے تیرھویں صدی کی ابتدا میں بنگال پر قبضہ کرلیا تھا - وہ بہت دور سے یعنی بلخ ' آکسس اور اُس بھی آگے کے ملکوں سے آئے تھے ' لیکن اُنہوں نے بنگال کے میدانوں کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور اپنے پہاڑی وطنوں کو واپس جانے کا ارادہ ترک کردیا - پٹھان شہنشاہوں نے بنگالی سیکھی ' اور ہندوؤں کی اس کثیر آبادی کے ساتھ رہنے لگے جن پر وہ حکومت کرتے

تھے - ان کی مسجدوں کے مینار و گنبد آسمان سے باتیں کرتے تھے ' اور ہندوؤں کے مندروں کے دوش بدوش قائم تھے - جب نووارد اپنی شام کی نماز کے لیے جمع ہوتے تھے تو مندروں سے سنکھ اور گھنٹے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں - ہندوؤں کے شاندار جلوس اور مذہبی رسمیں — درگا پوجا - راسا اور دول اُتسو — اتنا ہی جوش و خروش کا اظہار کرتی تھیں جو مسلمانوں کے محرم ' عید ' شب برات اور دوسرے تہواروں سے ظاہر ہوتا تھا - ان شہنشاہوں نے سنسکرت کی رزمیہ کتابوں کی شہرت سنی - اور وہ فطرتاً مہابھارت اور راماین کو جاننے کے خواہش مند اس لیے ہوے کہ ان کا ہندوؤں کی خانگی اور مذہبی زندگی پر گہرا اثر ہے - پٹھان شہنشاہوں اور سرداروں کو ہندو راجاؤں کا سا صبر نہیں تھا کہ مذہبی جوش کی وجہ سے برہمن عالموں کی سنسکرت کو سنتے' اُن کی علمی تفسیریں سمجھتے اور برسوں میں راماین اور مہابھارت کا دورہ ختم کرتے - پٹھانوں نے ایسے عالموں کو مقرر کیا جو سنسکرت سے ان کتابوں کا ترجمہ اس بنگالی میں کریں جسے وہ بولتے تھے اور سمجھتے تھے - مہابھارت کا پہلا بنگالی ترجمہ نصیرا شاہا (نصیر شاہ) شہنشاہ گور کے حکم سے سنہ ۱۳۲۵ ع میں ہوا - دوسرا ترجمہ پراگل خاں صوبہ دار چاٹگاؤں کے حکم سے 'کوندر پر میشور' نے کیا - نصیر شاہ بنگالی زبان کا اتنا حامی تھا کہ شاعر ودیا پتی نے اپنا ایک قصیدہ اُس کے نام سے معنون کیا ہے - اور سلطان غیاث الدین کا بھی نہایت احترام سے نام لیتا ہے " (Bengali Language and Literature pp 10 - 11) —

یہ سلسلہ اتنا طویل ہے کہ ایک علحدہ کتاب کی ضرورت ہے - مختصر یہ کہ حسین شاہ نے مالا دھر باسو اور اپنے ایک مصاحب کے

ذریعہ سے سنہ ۱۴۸۰ع میں بھاگوت کا بنگالی میں ترجمہ کرایا اور اسے گن راج خاں کا خطاب عطا کیا - اب تک انہی خطابات کے مطابق بہت سے بنگالی معظم دار سرکار' ملک وغیرہ کہلاتے ہیں - پراگل خاں اسی بادشاہ حسین شاہ کا جنرل تھا - چھوٹے خاں ولد پراگل خاں نے بھی سنت پدری پر عمل جاری رکھا اور جب وہ چاٹگام کا صوبہ مقرر ہوا - تو 'نندی' سے بھارت کے ایک باب کا ترجمہ کرایا جسے عرصہ ہوا ساہتیہ پریشد کلکتہ شائع کر چکی ہے - سترھویں صدی میں شاعر علاؤل (علاء الدین) نے ملک محمد جائسی کی پدماوت کا نہایت ہی سنسکرت آمیز بنگالی میں ترجمہ کیا - یہ ترجمہ مانگن ٹھاکر کے حکم سے ہوا جو مسلمان تھا اور اراکان کے رئیس کا وزیر تھا - علاؤل نے امیر سلیمان کے حکم سے ایک فارسی کتاب بھی بنگالی میں ترجمہ کی تھی - حکام کی قدردانی ہمیشہ برہمنوں اور پنڈتوں کو اپنے خیالات بدلنے پر مائل کرتی رہی ہے - آخر کار یہی ہوا کہ وہ بھی بنگالی میں لکھنے لگے اور راجاؤں نے بھی مسلمانوں کی دیکھا دیکھی اس زبان کی سرپرستی شروع کر دی - کمپنی کی حکومت کے زمانے میں ان - پی - ہال ہڈ (Nathaniel Prassy Halhead) نے سب سے پہلے بنگالی گرامر اٹھارھویں صدی میں لکھی اور یوروپین مشنریوں نے بنگالی نثر کو کافی ترقی دی —

یہ ہے مختصر سی تاریخ اس علمی کوشش کی جو مسلمان بادشاہوں اور نوابوں نے شروع کی اور بنگالی بولی کو زبان بنادیا - بعض موجودہ زمانے کے فرقہ پرور اپنی اپنی تنگ نظری کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہندو دھرم اور سنسکرت زبان کو زندہ کرنے کے لیے ہندو مسلم سوال پیدا کرنا اور مذہبی طبیعت کو ترقی دینا مفید ہوگا - لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ہمیشہ یہ آلہ

کارگر نہیں ہوسکتا - اگر کوئی یہ کہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے ' مسلمان بادشاہوں نے اُسے ترقی دی ' اگر مسلمان چاہیں تو اُسے زندہ رکھیں ' عام ہندوستانیوں کو اس زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے تو وہ سخت غلطی کرتا ہے - جس طرح اردو عام ہندوستانیوں کی زبان ہے اور یقیناً مسلمان امرا و سلاطین و شعرا و ادبا نے ایک عام ملکی زبان بنانے میں ضرورت سے زیادہ حصہ لیا ہے ' بالکل اسی طرح اُنھوں نے بنگالی بولی کو زبان بنایا اور برہمنوں کے اقتدار سے علوم و فنون کے خزانوں کو چھین کر عامتہ الناس کو مستفیض ہونے کا موقعہ دیا - یہ کام اُنھوں نے اُس وقت کیا تھا جب عام طور پر برہمنوں نے اُنھیں بھی ملیچھ اور اچھوت سمجھ رکھا تھا —

شاید دنیا میں اس عدیم المثال رواداری اور عدم تعصب کا ثبوت ملنا مشکل ہے جو نووارد ' پر جوش اور تازہ ولایت مسلمانوں نے ہندوستان کے مذہبوں ' زبانوں اور رسوم و رواج کے ساتھ کیا - آج جو کچھ ادبی جواہر ریزے ہیں ' خواہ وہ ہندی میں ہوں یا گجراتی میں' بنگالی میں ہوں یا پنجابی میں ' سب مسلمانوں کی بے نظیر کوششوں کی داد دے رہے ہیں - سمجھ دار ہندوستانی ' خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں ' ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ ہندوستانی زبانوں میں غیر ملکی الفاظ و محاورات کا جو سرمایہ آگیا ہے اسے صرف تعصب کے بدلے میں فروخت کرڈالیں - یہ صدیوں کی کوششوں کا نتیجہ ' اور لاکھوں محبت بھرے دلوں کی یادگاریں ہیں جو مختلف ہندوستانی زبانوں میں نظر آرہی ہیں اور زبان حال سے کہہ رہی ہیں —

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

بنگالی زبان میں اردو الفاظ

ذیل کے صفحات میں بنگالی زبان کی صرف و نحو سے بحث نہیں کی گئی اس لیے افعال و حروف کی فہرست نہیں دی گئی - گویا کہ یہ فہرست صرف اسما تک محدود ہے - لیکن با وجود اس حد بندی کے جو الفاظ درج کیے گئے ہیں ان سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ روز مرہ کی زندگی میں کس کثرت سے اردو اسما کا بنگالی زبان میں استعمال ہوتا ہے - اگر کوئی غیر بنگالی تھوڑی سی نحوی ترکیبوں سے واقف ہوجائے اور الفاظ کی بنگالی طرز ادا یا لہجے کو سمجھ لے تو اسے اردو اور بنگالی میں بہت کم فرق نظر آئے گا - میرا اندازہ ہے کہ بنگالی زبان میں پچاس فی صدی سے زیادہ ایسے اردو الفاظ ہیں جو لہجے کی تبدیلی کی وجہ سے بنگالی معلوم ہوتے ہیں ' لیکن حقیقتاً وہ خالص اردو الفاظ ہیں - اس کے علاوہ بیس فی صدی ایسے فارسی الفاظ ہیں جو بنگال میں رہتے رہتے بنگالی ہوگئے ہیں - باقی تیس فی صدی الفاظ میں زیادہ حصے میں سنسکرت اور کم حصے میں دراوڑ' سنتا ' تبتی ' آسامی ' برمی اور دوسری مقامی بولیوں کے الفاظ مل جل گئے ہیں —

مختلف عنوانوں کے ماتحت جو مختصر فہرست درج ذیل ہے وہ پوری بنگالی لغات پر حاوی نہ ہونے کے باوجود ہمارے اس دعوے کو کو پورے طور پر ثابت کرتی ہے کہ بنگالی زبان اردو زبان سے بہت ہی قریب کا رشتہ رکھتی ہے : —

دنیا اور فطرت

بنگالی	اردو
اکاش	آکاش - آسمان
امابوشے	اماوس - شب هلال
اوگنی	اگنی - آگ
اندهر	اندهیرا
اتر	اتر
برشتی	بارش
پرتهبی	پرتهوی - زمین
پربو	پورب
پهینا - فینا	پهین - کف
پالا - برپهه	پالا - برف
بجلی	بجلی - برق
پورنما	پورنماشی - شب بدر
پوش چم	پچهم
تاپ	تپ - گرمی
تارا	تارا
ٹهنڈا	ٹهنڈک
جل - پانی	جل - پانی
جوگت	جگت - دنیا
چاند	چاند

بنگالی	اردو
درکھن	دکھن - جنوب
رام دھونک	رام دھنک - قوس و قزح
شرجو - شر جو	سورج
میگھہ	میگھہ - بادل
ھوا	ھوا

خشکی (جل) اور تری (ستھل)

اترائی	اترائی (پہاڑ سے)
اِندارا	اندارا (بڑا کنوان)
بلی	بالو - ریت
بھانتا	بھاٹا (جذر)
بہار	پہاڑ
پاتھور	پتھر (چٹان)
پرونالی	پرنالی
پوربوت	پربت
تیر - کنارا	تیر - کنارہ
جھورنا	جھرنا - آبشار
چھوٹو ندی	ندی
چوڑھائی	چڑھائی (پہاڑ پر)
دیپ	دیپ - جزیرہ
گھی	ڈ گی - تالاب

بنگالی	اردو
شومدرو - شاگر	سمندر - ساگر
کوا	کنوان
طفردی	دریا (ندی)

معدنیات = دھاتو

اسپات	اسپات - فولاد
برونز دھاتو	برنج
پی تول	پیتل
پارا	پارا
تانبا - تاما	تانبا
ٹین	ٹین
چون	چونا
دھاتو	دھات
دوستہ	جستہ
روپا	روپا چاندی
سیمنٹ	سیمنٹ
شیشہ	سیسا
شونو	سونا
کاٹھہ	کاٹھہ
کوئلہ	کوئلہ
کانکور	کنکر
کھوڑی	کھریا مٹی

بنگالی	اردو
کانچ	کانچ
مور مور	مر مر (سنگ مر مر)
موتی	موتی
متی	متی
نیلا	نیلم
هیرا	هیرا

چرند و پرند وغیرہ

بنگالی	اردو
اود بڑال	عود بلاؤ
اؤٹ	اونٹ
باچھر	بچھڑا
بڑال - بھڑال	بلار - بلی
باج پکھی	باز
بھڑار باچا	بھڑ کا بچہ - میمنا
باندور	بندر
بلبل	بلبل
بوتیھر	بتیھر
باگھہ	باگھہ
باگھنی	باگھنی
پشو جنتور	پشو - جانور
پاکھی	پنکھی - چڑیا

بنگالی	اردو
پانٹھا	بکرا
پیرو	پیرو (ترکی مرغی)
بھبا بھبا کورا	بھن بھن کرنا
تی تر	تیتر
ٹٹو	ٹٹو
جنور	جانور
چھٹا	چھیتا
چورئی	چڑیا
دول	دل (گلہ)
راج ہنس	راج ہنس
رواں - پشم	بروان (بال)
شاپ	سانپ
شانڑ	سانڈ
شاروش	سارس
شیال	سیار - شغال
شنکھہ	سنکھہ (شہر)
ککر	کوکر - کتا
کھوچر	خچر
کٹھ ٹھوکرا	ھد ھد
کٹھہ بڑالی	کٹھہ بلی (گلہری)
کھور	کھر

بنگالی	اردو
گورو گائے	گائے
گورور با چھر	بچھڑا
گادھا	گدھا
گھگھو	فاختہ
گھوڑا	گھوڑا
موش - مہیش	بھینس
مرگ	مرغ
مورگی	مرغی
مو مھو کورا	مئوں مئوں کرنا
مئویور	مور
مکوڑ شا	مکڑی
هورن	هرن
هورنی	هرنی
هانس	هنس (بطخ)
هاتی	هاتهی

نباتات

آم - آنب	
ابلس	آبنوس
ادا	ادرک

بنگالی	اردو
انگور	=
اکھروت	اخروت
بدام	بادام
بیل	=
بالش	بانس
بے گُن	بیلگن
باندھا کوپی	بند گوبھی
پان	=
پھول	=
پھولیر توڑا	ہار
پھول گوبی	پھول گوبھی
پھل	=
پاتا	پتہ
پھتی	پھوت
پد یلہ	پود یلہ
پیانج	پیاز
تماکو	تمباکو
تورمُج	تربوز
تماٹو	ٹماٹر
جوب	جو
جھاؤ	... = ...

بنگالی	اردو
جوئین	جوھی (چھلی)
چھال	
چھنا بدام	مونگ پھلی
دارو چھنی	دارچینی
ڈال - شاکھا	ڈالی - شاخ
روشن	لہسن
سھو پھل	سیب
سپاری	
شیم	سیم
شونٹھ	سونٹھ
شون	سن
شے گُن	ساگون
شال گوم	شلغم
شاکھہ	شاخ
شوب جی	سبزی
کپاش	کپاس
کھے جر	کھجور
کان تھل	کٹھل
گاجور	گاجر
گھاش	گھاس
گوم	گندم

بنگالی	اردو
لبو - نبو	لیمون - نیبو
سالا	مالا - ھار
نرکل	ناریل

رنگ

بنگالی	اردو
اشمانی نیل	آسمانی
بدامی	بادامی
بیگنی	بیلنجنی
پھیکے - ھلکا	ھلکا رنگ
پھیکے لال - گلاپی	گلابی
دھانی	= ...
شوبج	سبز
فیروجہ	فیروزئی
کالو	کالا
لال	= ...
نیل	نیلا
نارنگی رنگ	نارنجی
گاڑھو - گھلو	گہرا - گاڑھا رنگ
گاڑھو نیل	بنفشی
شادہ	سفید
ھلدے	زرد

بنگالی	اردو

وقت اور موسم

بنگالی	اردو
آج	
آج کل	
بوز ودن	بوا دن
بھورے بیلا	علی الصباح
بار	وار - دن
شوم بار	سوموار
سونگل بار	منگل
بدھ بار	=
برھپتی بار	جمعرات
شکر بار	جمعہ
بورشا	موسم برشگال
بوشونتو	بسنت - بہار
بیلا	وقت
بوچھر	برس
پرشون	پرسوں
تاریکھہ	تاریخ
دن	= ' -
دوپہر	دوپہر
دج	روز

بنگالی	اردو
رتو	رت - موسم
رات - راتری	رات
شانجھہ	سانجھہ - شام
شرو	شروع
کال	کل
گھونٹا	گھنٹہ
ماش	ماہ - مہینہ
بوئے شاکھہ	بیساکھہ
اشارہ	اسارہ
سرابون	ساون
بھادر	بھادوں
کارتک	کاتک
اُگھرن	اگھن
پش	پوس
ماگھہ	ماگھہ
ھوپتہ	ھفتہ

شہر اور دیہات

اڈا	اڈا (گاڑیوں کا)
آنگن	آنگن
بےرا	بارا (مویشوں کا)

بنگالی	اردو
باجر - ھاٹ	بازار ھاٹ
پل	=
تھانہ	=
جونگل	جنگل
جہل کھانہ	جہل خانہ
دیھں - پرگنہ	دیہات
دوکن	دوکان
ڈاک گھور	ڈاک گھر
ڈاک بنگلہ	=
ڈاکٹر کھانہ	دوا خانہ
رستہ۔ شورک	رستہ - سڑک
شوھور - نوگور	شہر - نگر
کھیت	=
کھیت بازی - گولا بازی	کھیت
کٹھر	کٹی - چھونپڑی
کول	کل - کار خانہ
کار کھانہ	
گرجا	=
گور استھان	گورستان
گور - کوبور	گور - قبر
گرام	گاؤں

بنگالی	اردو
گھاٹ	=
گولی	گلی
موڑ	چوراھا
موشجد	مسجد
موکتب - مودرشہ	مکتب مدرسہ
موندر	مندر

رشتے ناتے

استری	عورت
بابا - پتا	باپ
بالک	بچہ
بور	بر - دولھا
بیاھو	بیاہ
بون	بہن
۱ بوڑو بھائی	بڑا بھائی
۲ موجو "	ملجھلا "
۳ شہجو "	سنجھلا "
۴ نوتن "	(نہا) "
۵ پھول "	(پھول) "
۶ چھوٹو "	سب سے چھوٹا "
دادا (بھائی)	بھائی (جو کوئی اپنے سے بزرگ ھو)

بنگالی	اردو
پترو	بیٹا - بچہ
جیٹھا	جیٹھہ
چھوکرا	لڑکا
دیور - دیبور	دیور
دوھتا	دختر
دی دی	بڑی بہن
شالا	سالہ
شامی	سوامی - شوہر
شالیج	سرھج
شالی	سالی
سوشر	سسر
ششری	ساس
کاکی	چچی
کماری	کنواری
ماشی	موسی - خالہ
مامی	ممانی
ملش	آدمی
ماماتا	ماں - ماتا
ماما	ماموں
نون دئی	نندوئی

بنگالی	اردو
ناتی	ناتی - نواسہ
نونود	نند

اعضائے جسم انسانی

آنگل	اپوز
انگشٹھو	انگوٹھا
باھو ۔ ھات	بانھہ - ھاتھہ
بوگول	بغل
بھرو	ابرو
پیلا	تلی
پیٹ	...
پیٹھہ	...
پا	پاوں - ٹانگ
ٹھن ٹی	ٹھڈی
ٹھونٹ	ھونٹ
جبھ	جیبھہ - زبان
چھاتی	... ...
چوربی	چربی
چمڑا	کھال - جلد
دیھو	دیھہ - بدن
دانت	... ...

بنگالی	اردو
روان	بال (علاوہ سر کے)
کان	
کلے جا	(کلیجہ) بمعنی دل
کاندہ	کاندھا - کندھا
کوبجی	قبضہ - کلائی
گال	
گورو	گورا (رنگ)
گلا	گلا
ماتھا	سر
موگوج	مغز سر
مکھہ	منہ
ناک	... ...
نوکھہ	ناخن
ھاڑ	ھڈی
ھات	ھاتھہ

امراض ادویہ وغیرہ

آون دھو	اندھا
آرام کورا	صحت دنیا
آنتو ھوتے	اتماھتیا (خودکشی)
بپود	بپت - مصیبت

بنگالی	اردو
بود ہجم	بد ہضمی
لش	بس - زہر
بوشونکو	(لبسلت) چھچک
پھولا	آماس - سوجن
پھوٹکری	پھٹکری
پوٹی	پٹی
پوش دی	(تصدیع) تکان
ٹھلڈا - شوردی	ٹھنڈک - سردی
جولونی	جلن
جوکھان	(زکام) - دق
دائی	... ...
داگ	داغ
روگ - روگی	
شرو پیرا	سر کا درد
شوردی گورمی	(سردی گرمی) لون لگنا
کاشی	کھانسی
کوش رت	کسرت - ورزش
کوبی راج	کویراج - (وید)
کملا	کنول - یرقان
کرمی	کرم - کھوا
کانا	... ...

بنگالی	اردو
کوپ پر	کافور
مہاماری	(وبا)
مولوم	مرہم
مچکانو	موچ
ھلہلی	دمہ - ضیق النفس

اشیائے خورد نوش

اچار	
آتا	
برفی	
بوروف	برف
بھاجا	بھنا ھوا
پونر	پنیر
پھلیر مربا	مربہ
تھل	
تورکاری	ترکاری
چپاتی	
چلی	چینی
دودھ	
دوئی	دھی

بنگالی	اردو
رٹی	روٹی
شوجی	سوجی - روا
شورلوت	شربت
شرکا	سرکہ
کورمہ - کلیا	قورمہ - قلیا
کھابر	کھانا - غذا
کھچڑی	
کاباب	کباب
کھیر	پکا ہوا دودھ
گڑ	
لچی	لچوئی - پوری
ماکھون	مکھن
ماچھہ	مچھلی
مورچ	مرچ
موہن بھوگ	(حلوہ)
موشلا	مسالہ
مٹھائی	
مود	مدھ - شراب
نون - لون	نون - نمک
ہاجری	حاضری - ناشتہ

مکان اور اسباب خانہ داری

بنگالی	اردو
آرام کرسی	
الماری	
آئینا - آرشی	آئینہ - آرسی
برانڈا	بر آمدہ
بابرچی کھانا	باورچی خانہ
بلش	بالش - تکیہ
باشن	Basin باسن - برتن
بھنڈار	نعمت خانہ
بکشو	بکس
بتی	بتی - لمپ
بتی دان	شمعدان
بالش - گودی -	(بالش) گدی
پائے کھانا	پیخانہ
پھالہ	
پوردہ	پردہ
پکھا	پنکھا
تالا - کلپ	تالا - قفل
تھالا	تھالی
توا	

بنگالی	اردو
ٹکری	نوکری
جنلا	جنگلہ (کھڑکی)
جھلملی	
چادان	چاء دان
چابی	
چمٹا	
چھاتا - چھاتی	چھاتا - چھتری
چابک	
چھت	
چھوبی	شبیہ (تصویر)
چھری	
چلی	چولھا
دیا شولائی	دیا سلائی
دالان	دالان (Hall)
دیال	دیوار
دوات	
دراج	دراز
ڈولا	ھنڈولا
ڈوری	
ڈھکنی	
رکابی	رکابی
شنان	اشنان - غسل

بنگالی	اردو
شورائی	صراحی
شیڑی	سیڑھی
کمرہ	
کوٹلہ	
کافی دان	
کانٹا	Fork
کالی	روشنائی - سیاہی
کیتلی	
کاگوج	کاغذ
کولوم	قلم
گلیچا	قالیچہ
گھوڑی	گھڑی
گھور -	کمرہ (گھر)
گوشول کھانا	غسل خانہ
لون تھون	لال ٹین
لفافا	لفافہ
میج	میز
موشوک	مشک (بہشتی کی)

لباس و زیور وغیرہ

اوس تور	استر

بنگالی	اردو
آنگٹی	انگوٹھی
اورنا	نقاب
بوٹ جوتا	بوٹ
بوگ لس	بکلس - بکسوا
بونت	بانات
برش	برش
بوتام	
بورشاتی جاما	برساتی - باران کوٹ
بچھانا	بچھونا
پاجامہ	
پھیٹہ	فیٹہ
پوشوم	پشم - اون
پوشاک	لباس
جاما یا پنجابی	کرتہ
جوتا	
جیب	
جھالور	جھالر
چادر	چادر
چپل - چپلی	=
چوری - بالا	چوری
چھوری	چھڑی

بنگالی	اردو
دوستانا	دستانہ
رے شوم	ریشم
شال	شال
شابن	صابون
شتی	سوتی
کاچ - گھور	(برتن کا) کاچ
کرتا	=
کوٹ	=
کالر	=
کوم بل	کمبل
کنگن	کنگن
کلکھاب	کمخواب
کانچلی	تھلنچلی
کمیج	قمیص
کھوڑ وم	کھڑاؤں
کاپڑ	کپڑا
گھاگرا - شایا	سایا (انگریزی)
گوھونا	گہنا
گولا بوندھو	گلوبند
لاٹھی	=
ماجن	ملنجن

بنگالی	اردو
موجہ	موزہ
موکھہ مل	مخمل
مول مول	ململ
نمدہ	=
هار	=

پیشے

بنگالی	اردو
اُکیل	وکیل
اُمیدار	امیدوار
بهاٹ	بهاٹ - گویا
بابرچی	باورچی
باجی گور	بازی گر
پہرا والا	پولیس مین
پهول والا	پھل والا
پهول والا	پھول والا
پادری	=
جوتشی	=
جوهری	=
جریب کرتا - امین	پیمائش کرنے والا امین
چاکور	چاکر - نوکر
چهاپا کهانا والا	طابع

بنگالی	اردو
چترو کار	مصور
دورجی	درزی
دھربا - دھوبی	=
چوکیدار	=
دوروان	دربان
دوکن دار	دکاندار
دائی	=
دو بهاشی	ترجمان
دلال	دلال
ڈاک پیادہ	هرکارہ
ڈھولی	ڈھولچی
روپوکار	مصور
رونگ ریج	رنگریز
سپائی	سپاهی
شوهش	سائیس
کاری گور	کاریگر
کل وت	کلاونت - گویا
کوبی	کوی - شاعر
کمار	کمهار
کرشان - چاشی	کسان - کاشتکار
از چاشت بمعنی = کاشت	

بنگالی	اردو
کوشیء	قصائی
کھلاشی جوھاجی	خلاصی - جہازی قلی
گرنتھوکار	مصنف
گوالہ	=
نال بوند	نعل بند
نائب	ایجنٹ
نوٹ	نٹ - اکٹر - اداکار
نٹی	نٹنی - اکٹرس
موجور	مزدور
میش پالک	گڈریہ
موچی	=
موھاجون	مہاجن
مُدی	مودی بنیا
ھلوئی کار	حلوائی

متفرق الفاظ

ذیل میں متفرق بنگالی الفاظ کی فہرست درج ہے - اور جہاں جہاں ضرورت سمجھی گئی ہے ان کا صحیح اردو تلفظ یا ترجمہ قوسین کے اندر دے دیا گیا ہے - تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو - بنگالی الفاظ کے

تلفظ میں صحت کی بہت زیادہ پابندی نہیں ہو سکی اس لیے کہ اعراب کے استعمال کرنے میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی جو ان الفاظ کے سننے میں ہو سکتی ہے —

الف

اُپ واس (فاقہ روزہ)
آبکاری
آپ نی (آپ)
آتما (روح)
آئین (قانون)
آئین انوسار (حسب قانون)
آشا (امید)
آسامی (ملزم)
اختیار
اقرار
ادم شماری
آمدنی (آنے والا مال Import)
آمدنی (معمولی معنی)
آنند
اندہ - ایشور
آواز کرنا (گولی چلانا)
اوتار
ایک جن (ایک شخص)
ایک‌ٹا (ایک‌ٹھو - ایک‌تا - بمعنی ذرا یا کچھ
احمق
اناڑی
انصاف
اجلاس
اظہار (بیان عدالت)
اندھار (اندھیرا)
اونچا
الگ

ب

باقی - ہاتھہ جمع (میزان)
بازار
بیرا
باجنا (گانا)
بچار (خیال)

بے قصور خلاص (ملزم کا صاف بری ہونا)
بحث
برخواست
بدھی (عقل ضمیر - وجدان)
بکری (فروخت)
بدیشی
بے جوڑ (فرد واحد) جوڑا (دو)
بیگ
بھاڑا
بھاڑا کاری
بندوبست
بندر (بندرگاہ)
بشواش (یقین)
بیمہ
بندوق
بھاؤ (جذبہ)
بھول (غلطی)
بھوکا
بھاری
بھلا
بھیانک
بھیجا (بھیجا)
بے آئین (غیر قانونی)
بلام
بوھو (بہت)
بوڑھا
بیشی (زیادہ)
بہانہ (بیعانہ)

پ

پاپ
پرانا
پورا
پال (بادبان)
پوتر
پریک (پریگ - کیل - میخ)
پریم
پرارتھنا (عرض - گزارش - دعا)
پھانسی
پھکاری (تھوک Wholesale)
پکا
پوش کار

ت

تاریخ

تار
تازہ
تپتا (گرم)
تمادی (قانون)

ٹ

ٹھیکہ گاری
ٹھکانا (پتہ)
ٹھنڈا

ج

جائداد (سرمایہ)
جال
جہاز
جرح (قانونی)
جمع بندی تشخیص لگان
جبر دستی ادائی (استحصال بالجبر)
جریمانہ (جرمانہ)
جمع
جنس (شے - قسم)
جوتی (روشنی)
جوگی
جواری
جواب
جے کہو (جو کوی)
جے (جو)
جھوٹ
جیون (زندگی)
جعلیت (جعلساز)

چ

چارا (شکار ماھی کے لیے)
چاقو
چورا
چوت پتے (جھٹ پٹ)
چورس (پوربی میں ہموار زمین - بنگالی میں مربع زمین)
چکر لگنا (چکر آنا)
چنگی
چنتا (فکر - خیال)
چھوترہ (چھرہ کارتوس کا)
چالانی (جانے والا مال)
چھری
چھڑی

ح = (ہ)

حساب

حساب چکانا

حفاظت

حاجت (حوالات)

حاکم (جج)

حق - دابی

حلف

حصہ

خ (= کھ)

خدا

خبر

خرچ

خرچہ بعد (خرچہ چھوڑنے کے بعد)

خرید

خریدار

خالی

خاص (خانگی - Private)

خانساماں

خدمتگار

خون (قتل)

خلاص (مقدمی سے بری ہونا - ختم ہونا - آزاد ہونا)

خسارت (خسارہ

خزانہ (مالگزاری - ٹکس)

خوشی

د

دام

دان (خیرات

دابی (دعوی - حق)

دائرہ سپرد (عدالت سشن سپرد کرنا)

دھار (اُدھار)

دستوری

دیوانی عدالت

دیوتا (فرشتہ)

دیا (کرم - عنایت)

دور

دیندار (قرضدار)

دیوالہ

دلیل (دستاویز)

دستخط کرنا - صحیح کرنا (دستخط کرنا

دو نالہ (دو نالی بندوق)

دنگا

دھرم
دشت (پاجی - شریر)
درکار (ضرورت)
درکاری (ضروری)
در در (دلدر - غریب - مفلس)
دھرمی (دین دار)
دفتر
دکھ
درخواست

ڈ

ڈانٹر (چپو)
ڈورا - ڈوری (موٹی رسی)

ر

راس (لگام)
رپٹانی (باہر جانے والا مال - رفتنی)
Export.
رشی
رسید
رس (جذبہ)
رد کرنا
رقم (طرح - مانند - قسم)
رجوع کرنا - پیش کرنا (عدالت میں مقدمہ داخل کرنا)
روگی (بیمار)

ز

زخم (زخمی)

س

سامنے
سب
سب کچھو (سب کچھ)
سستا
سپیٹا
ست (حق)
سادھو - سلمت
سبالک (بالغ)
سرسراھکار (ایجلنٹ)
سوجا (سیدھا)
سہج (آسان)
سود
سیوا
سہائتا (مدد)
سورگ

سندر
سخت
سیندہ چوری

ش

شکار
شکاری
شکی! (سچ ؟ !)
شکتی
شیطان
شریک
شرط (اقرار)
شناخت

ک

کپتان - سارنگ
کچہری
کبتا (شاعری)
کاربار
کارخانہ - کل
کارتوج (کارتوس)
کتھن
کرپا
کوا
کرکس (سرکش)
کرتا (مہلوجر)
کہچرا (خوردہ فروشی)
کوچوان
کوڑی (۲۰ عدد)
کونڈو (کوئی)
کیو نہ کہو (کوئی نہ کوئی)
کچہو (کچھہ)
کی (کیا - پنجابی بھی یہی ہے)
کے (کون)

گ

گھات
گھائل
گھوڑا
گھن
گودام
گولی
گول
گوئندہ (جاسوس)
گرم

گرفتاری پروانہ (وارنٹ)
گیان
گنت ودیا (حساب)
گرفتار
گیٹی (گھٹ)
گھدا (موٹا)

ل

لمبا
لابھہ (نفع)
لشکر
لگام
لین دین

م

مال (پونجی - سرمایہ)
مانچی
مان (عزت)
مار پیٹ
مرن (موت)
مورتی (بت)
موٹا
میلا
میٹھا

ن

ناستک (مُلحد)
ناٹک
نیا (نوا = نیا)
نیالک (نابالغ)

ہ

ہلپھہ (حلف)
ہلکا -

بنگالی پر اردو کے اثرات کے اسباب

بنگالی زبان پر اردو ، ہندی اور دیگر شمالی مغربی زبانوں
کے اثرات کے کئی اسباب ہیں -

(۱) تیرتھہ یاترا

شاید یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ بنگال کے لاکھوں جاتریوں نے اُن مقدس زیارت گاہوں اور تیرتھہ استھانوں سے

بہت کچھہ "ہندوستانی" تمدن اور زبان حاصل کیا جو شمالی و شمال
مغربی ہندوستان میں واقع ہیں - کاشی و پریاگ (بنارس و الہ آباد
میں اب بھی ہر سال کئی کئی دفعہ لاکھوں ہندوؤں کا مجمع ہوتا ہے او
مقدس گنگ وجمن کی ہم آہنگی سے جو وحدت وجود کا سبق الہ آباد
سنگم سے ملتا ہے وہ اپنے ساتھہ زبان ' تمدن اور رسم و رواج کی ہند
مسلم یکتائیت کو مشرق سے مغرب تک استوار بنا دیتا ہے - سیکڑوں
الفاظ اور محاورے یہاں سے جاتریوں کے ساتھہ ساتھہ ملکوں ملکوں پھیل
جاتے ہیں - اور خود بخود ایک مشترک زبان جسے ریختہ یا اردو کہ
سکتے ہیں تیار ہوتی رہتی ہے - بنارس اور الہ آباد میں تو اب بنگالیوں
کی مستقل آبادیاں قائم ہوگئی ہیں اور روز بروز بڑھتی جاتی ہیں ·
یہی حال برندرابن کا ہے ' جہاں کے آٹھہ ٹھاکروں میں سے سات ٹھاک
بنگالی ہیں اور سب اردو بولتے ہیں - اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی
ہے کہ چیتن دیو پندرھویں صدی میں برندرابن گئے تھے اور چونکہ و
صاحب کشف وکرامات تھے لہذا اُنھوں نے مٹے ہوئے آثار اور مقدس
استھانوں کو اپنی بصیرت سے معلوم کیا اورعوام کو بتایا - نتیجہ یہ ہو
کہ اب وہاں بارہ ہزار بنگالی آباد ہیں اور لاکھوں ہر سال آتے جا
رہتے ہیں - چیتن دیو کرشن کے اوتار مانے جاتے ہیں - اس طرح وشنو
پرستاروں نے جتنی کتابیں لکھیں وہ سب " برج بولی " میں لکھیں او
اب تک یہی " برج بولی " بنگال میں گھر گھر پڑھی اور سمجھی جاتی
ہے - یہ بولی در حقیقت برج بھاشا ہے جو بنگالی مصنفوں کی زبان سے
ادا ہوکر کسی قدر بنگالی آمیز ہوگئی ہے - اور بنگال میں اسے " برج بولی "
کہتے ہیں - اسی طرح بندرابن کے بنگالی اور پھر بنگالی شاعروں نے ج

گانے برج بولی میں تصنیف کیے وہ بھی بنگال میں رائج ہیں - اور " برج بولی " کے ذریعہ سے اردو کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں —

اسی سلسلے میں ودیاپتی شاعر کا ذکر ضروری ہے - یہ چودھویں صدی مسیحی کا شاعر تھا - اُس کی تصنیفات میتھلی یعنی بہاری بولی میں موجود ہیں - بنگال میں اس کا کلام بہت مقبول ہوا حتیٰ کہ وہ بنگال کا شاعر مانا جاتا ہے - اور عام طور سے اس کی شاعری ہر شخص سمجھہ لیتا ہے اور داد دیتا ہے - آج کل " ودیاپتی " نامی ایک فلمی کہانی بھی بن گئی ہے اور سینماؤں میں چل رہی ہے —

ملک محمد جائسی کی پدماوت اتنی مقبول عام ہوئی کہ رائے بریلی (اودھ) کے ایک قصبے کے شاعر کا کلام سو سال کے اندر اندر سولھویں صدی مسیحی میں بنگالی زبان میں ترجمہ ہوگیا - اس کا باعث بھی ایک مسلمان راجہ مانگن ٹھاکر والئی اراکان و آسام ہوا - اور ترجمہ کرنے والا بھی بنگال کا مشہور مسلمان شاعر علاؤل شیخ تھا - اگرچہ یہ ترجمہ سنسکرت آمیز بنگالی میں ہے لیکن بہت سی فارسی کی اصطلاحات تصوف بھی اس کے ذریعہ سے بنگالی میں داخل ہوگئی ہیں —

بنگال میں نابھا داس ہندی شاعر کی تصنیف موسومۂ " بھگت مال " بھی ترجمہ کی گئی اور ہندی زبان سے بنگالی کا رشتہ قائم کرنے میں مفید ثابت ہوئی - یہ شاعر تلسی داس کا ہمعصر تھا - یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ تلسی داس اور میرا بائی کے ہندی گانے اب تک بنگال میں مقبول ہیں اور عام طور سے گائے جاتے ہیں —

سترھویں صدی مسیحی میں شاعر برند کی " ست سئی " ہندی زبان میں ڈھاکہ میں لکھی گئی اور بنگال میں رائج ہوئی - بہار اور ممالک

متحدہ کے مشرقی اضلاع میں اس کتاب کے دوہے بچے بچے کی زبان پر ہیں - اس کے دوہے ایسی ہندی میں ہیں جو بنگالی اور اردو سمجھنے والے دونوں سمجھہ لیتے ہیں - مثلاً :—

سبھے سہائے سبل کو کوؤ نہ نبل سہائے
پون جگاوت آگ کو ' دیپک دیت بجھائے

(۲) دارالسلطنت دھلی سے تعلقات بنگالی زبان پر اردو کے اثر کی دوسری وجہ یہ تھی کہ جب تک ہندوستان کی سلطنت کا مرکز دھلی رہا ' اُس وقت تک مسلسل سرکاری اور غیر سرکاری افراد و افواج و تجار کی آمد و رفت برابر قائم رہی - عام قاعدہ ہے کہ رعایا اپنے حکام کے طرز بود و ماند اور تمدن و زبان کو اختیار کرنے یا کم از کم نقل کرنے کی کوشش کرتی ہے - بنگال اس سے مستثنیٰ نہیں تھا - یہاں مرشد آباد ' ڈھاکہ ' عظیم گنج اور دوسرے مرکزوں میں امرا و رؤسا نے نہ صرف دھلی دربار کی نقل اُتاری تھی بلکہ اُس میں کافی کامیابی بھی حاصل کی تھی - دھلی کے اثر سے یہاں کی سرکاری زبان فارسی ہوگئی تھی - اور جو لوگ صوبہ کے دربار یا انتظامات ملکی میں رسوخ حاصل کرنا چاہتے تھے وہ فارسی سیکھنا فخر سمجھتے تھے - اسی طرح شیر شاہ کے زمانے سے جو فوجی آبادیاں قائم کی گئی تھیں وہاں سب اچھی خاصی اردو بولتے تھے حتیٰ کہ آج تک وہ لوگ اردو بولتے ہیں ' باوجودیکہ کہ اپنے وطن کو چھوڑے ہوئے اُنھیں صدیاں گزر گئیں - اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ ان کی عورتیں بھی اردو بولتی ہیں اور شاید ان کے ساتھہ ہی یہاں آئی تھیں - شانتی نکیتن سے ۳ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کاشی پور ہے - یہ پٹھانوں کی بستی ہے ' جن کا پیشہ کاشت کاری ہے - میں نے خود جاکر

وهاں دیکھا که وہ بنگالی مسلمانوں سے بنگالی زبان میں بات چیت کرتے هیں - لیکن آپس میں اردو بولتے هیں اور اُن کی عورتیں اور بچے بھی اردو بولتے هیں - لیکن اُن کے دیہی مدرسه کا مدرس دوسرے گاؤں کا بنگالی مسلمان هے اور اردو نہیں بول سکتا - اسی طرح کی بہت سی بستیاں پورے بنگال میں موجود هیں —

بنگال کے صوبه داروں کے یہاں کثرت سے هندوستانی سپتھ اور شمالی هندوستان کے رهنے والے سپاهی اور منشی ملازم رهتے تھے - مرشدآباد میں اب تک خالص اردو کے بولنے والے کافی تعداد میں موجود هیں - اور محله ضیاءگنج تو پورا اُن مارواڑیوں سے بھرا هوا هے جن کے آباؤ اجداد کلائو کے زمانے سے پہلے یہاں آکر آباد هوگئے تھے - نواب مرشدآباد کے یہاں انشاءالله خاں کے والد ملازم تھے ' اور یہیں یه پیدا هوئے اور ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی —

۳ - تجارت تجارت کے سلسلے میں علاوہ مارواڑیوں کے ' دوسری قومیں بھی برابر آمد و رفت رکھتی تھیں - خود بنگال میں کپڑے اور ریشم کی بے مثل مصنوعات نے اتنی ترقی کی تھی که انگلستان ' فرانس ' هالینڈ وغیرہ تک اُن کی رسائی هوگئی تھی - اور هندوستان کے دوسرے مقامات میں یہاں سے ڈهاکه کی ململ ' سلہٹ کی چوڑیاں ' سیندور اور دوسری چیزیں بنگالی لے جاتے تھے - بنجاروں اور تاجروں کی آمد و رفت سے اردو کو بہت ترقی ملتی تھی - اور صرف اسی زبان کے ذریعه ایک ملک کا باشندہ دوسرے ملک کے رهنے والے سے گفتگو کر سکتا تھا —

۴ - ہندوستانی مزدور | آج کل مغربی بنگال میں کثرت سے بہار اور ممالک متحدہ کے آدمی نظر آتے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی بنگال کے باشندے فطرتاً کمزور ہیں اور جسمانی محنت کے لائق نہیں ہیں - کثرت سے مزدوری کرنے والے دوسرے صوبوں کے ہیں - جو آدھے منافع میں شریک ہوکر یا تو کاشتکاری کرتے ہیں یا دوسرے قسم کی مزدوریاں کرتے ہیں - ملیریا بخار اور چاول اور تیل کے استعمال نے غریب بنگالی کسانوں کو بہت کمزور کردیا ہے - بہرحال باہر سے آنے والے مزدور سب اردو بولتے ہیں اور بنگالی بولنے والوں کو بھی بہت سے الفاظ سکھا جاتے ہیں —

تبدیل معنی

ذیل میں ہم چند فارسی الفاظ درج کرتے ہیں جن کا تلفظ تو بدل ہی گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اکثر الفاظ ان معنوں میں بولے جاتے ہیں جو ہم عموماً اردو میں نہیں بولتے - بالکل یہی حال بہت سے فارسی اور عربی الفاظ کا اردو میں ہوا ہے - یعنی ان کے اصلی معنی ہماری زبان میں کچھ سے کچھ ہوگئے ہیں - اور اگر وہ خالص لغوی معنوں میں استعمال کیے جائیں تو محاورہ کے خلاف معلوم ہوتے ہیں - بنگالی زبان میں اردو کے بعض حروف تہجی نہیں ہیں - اس لیے ان کی جگہ جو حروف مستعمل ہیں وہ یہ ہیں - ث - س - ص کے لیے شین استعمال ہوتا ہے - شاذ و نادر سین بھی سننے میں آجاتا ہے - ہائے ہوز اور حائے حطی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا' حالانکہ

اردو میں بھی یہی حال ہے، لیکن بہر حال لکھنے میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے - جس کی وجہ ہم آواز الفاظ کے معنوں میں آسانی سے تمیز ہوسکتی ہے - خ کے لیے کھ - (ذ، ز، ض، ظ) کے لیے جیم، عین کے لیے الف، غ کے لیے گ، ف کے لیے پھ، قاف کے لیے کاف کا استعمال ہوتا ہے - کبھی کبھی باے عربی کی جگہ باے فارسی (پ) کا استعمال بھی کیا جاتا ہے - مثلاً گلاب کو گلاپ اور جلاب کو جلاپ کہتے ہیں - لیکن اگرچہ سنسکرت کی نقل میں اس زبان کے حروف تہجی میں زاے ہوز داخل نہیں ہے لیکن گفتگو میں اکثر غیر بنگالی الفاظ کی جیم کو ''زے'' سے اور زے کو جیم سے بدل دیتے ہیں - مثلاً پوسٹ مین ہی حازی محمد ازمل نہیں کہتا، بلکہ انگریزی پڑھا لکھا ٹائپ نویس بھی ہمیشہ حاجی کو Hazi اور اجمل کو Azmal ٹائپ کرتا ہے اگرچہ اس کے سامنے دونوں لفظوں میں بجاے J کے Z کبھی نہیں لکھا جاتا - بہر حال وہ چند الفاظ جن کے معنی تبدیل ہوگئے اور جو مجھے بہ مشکل دستیاب ہوئے ہیں - درج ذیل ہیں - الفاظ کے سامنے ان کے اصلی معنی لکھ دیے گئے ہیں -

بنگالی الفاظ	تبدیل شدہ معنی
بہار (باھار)	حسن
بہادر	شاباش
برات	حاجت
بیگانہ (بگانہ)	لا معلوم
زیر بار (جھر بار)	تھک جانا
خالی (کھالی)	صرف
دادن (دادون)	پیشگی دینا

تبدیل شدہ معنی	بنگالی الفاظ
پہنچنا	داخل
علاقہ	دخل (دکھول)
مفید	درکاری
مقابلہ کرنا	رجوع دینا
روشنی	روشنائی
بہادر - دل والا	دلدار
مشق	ربط (ریٹو)
تہ	طبق (تابوک)
حکم	فرمائش (پھرماچ)
غصہ	گوشہ
قسط	کشتی
گرہ	گھرے
نقشہ	مطلب (متلوب)
ملاقات	مقابلہ (مکابلا)
فساد	ہنگام (ہنگامہ)
انکاری (جو کسی کام کے کرنے پر راضی نہ ہو)	ناراض (ناراچ)

فارسی الفاظ

ذیل میں وہ فارسی الفاظ درج کیے جاتے ہیں جو بنگالی زبان میں اب تک رائج ہیں - اور تھوڑے سے اختلاف تلفظ کے بعد ہر وہ شخص جو ہندوستانی ہے انہیں سمجھہ سکتا ہے - بنگالیوں میں ان الفاظ کو

جو لوگ استعمال کرتے ھیں انھیں یہ بھی محسوس نہیں ھوتا کہ یہ کسی غیر ملکی زبان کے الفاظ ھیں - بلکہ بعض الفاظ تو اس قدر تبدیل ھو گئے ھیں کہ اچھی خاصی فارسی جاننے والے بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ ان کا ماخذ فارسی تھا اور اب یہ بنگالی ھو گئے ھیں - مثلاً چھوبی اصل میں شبیہ کی بگڑی ھوئی صورت ھے اور تصویر کے لیے استعمال ھوتا ھے - اس قسم کی مثالیں پہلے لکھی جا چکی ھیں - اب صرف فارسی الفاظ، فارسی رسم خط میں لکھے جاتے ھیں - بنگالی میں ز، ذ، ض، ظ کے لیے صرف ز یا ج کا استعمال کیا جاتا ھے - اسی طرح غ کے لیے گ، ق کے لیے ک، ت، ص، س کے لیے س رائج ھے :

الف

اُستاد - آئینہ - آستین - آسامی - آتشبازی - افیون - آسان - اسباب - آبنوس - اِزار - آرام - اکثر - آب ھوا - آخر - آفت - اگر - اشتہار - ادا - امیر - امرا - اصول - آواز - انجام - البتہ - اردو آسمان - الائچی - امین - اطلاع - آبخورہ - آبادی - ابر - آبلہ - اثر - اجیر - احمق - احوال - اخبار - آفۃ - اختیار - آنکس - اذان - ارضی - استر - آستان - استعفی - استعمال - آشنا - اصیل - اظہار - افسوس - الو بخارا - الوان - الہی - آمادہ - آمدنی - انتظار - انتظام - انتقال - انصات - انعام - اولاد - ایمان - آتشی - اجارہ - اجلاس - افطار - امام - امروز - آبادی - اعتبار - آئندہ - آشوب - آشنائی - اوقات -

ب

باطل - باغ - برداشت - بک بک - بے وقوف - بوتام - بندوق باورچی -

بھشی - بخشی - بالش - بازوبند - باقی - باد - بخشش - بندگی - بغل -
بغچہ - برج - برات - بابت - بارود - بندہ - بھشتی - بلا - بانات - بدام
بارھا - بز - بند و بست - بستہ - بیشتر برخواست - برقنداز - بارگاہ - بازی
باشندہ - باغبان - بافتہ - بالکل - بارگ - بچہ -

پ

پیالہ - پیادہ - پاپوش - پلنگ - پشم - پاجامہ - پرگنہ - پیغمبر - پیچ -
پروانہ - پلاؤ - پیل خانہ - بادشاہ - پرواز - پہار - پنیر - پوش - پوشاک
پوشاب - پری - پا - پیرہن -

ت

تعلق - تمادی - تحصیل - توپچی - تفاوت - تصویر - تعویذ - تدارک
تاریخ - تلوار - توپ - تفنگ - تختہ - تنخواہ - تقاضا - تدبیر - ترکیب
تازہ - تکمہ - تیر - تاج - توشک - تلور - توقع - ترکاری - تخت پوش -
تار - تعجب - تائید - ترازو - تفسیر - تنگ - تعلیم - تا --

ج

جور - جمع - جریب - جرح - جامہ - جوان - جیب - جان -
جلس - جوش - جگر - جدا - جواب - جانکہ - جادوگری - جانور -
جاگیر - جلوس - جعل - جبہ - جلگی --

چ

چشمہ - چغلی - چغہ - چراغ - چربی - چہرہ - چلم -
چرخہ - چاکر - چست - چابک - چالاک -

ح

حاضر - حضور - حرامی - حرامزادہ - حساب - حال - حکیم - حاشیہ - حور - حدیث - حکمت - حاجت - حد - حجام - حق - حاصل - حیا - حلا - حلوہ -

خ

خام خیالی - خوشبو - خوبصورت - خاکی - خاک - خاص - خراب - خریدار - خون - خوب - خالی - خام - خوش نویس - خطاب - خبر - خوشی - خبر - - خیال - خرگوش - خانگی - خیرات - خدا - خاطر - خط - خزانہ - خود - خوانچہ - خوار - خواب گاہ - خواجہ - خیرخواہ - خستہ - خواہ مخواہ - خواہش - خزانچی - خرچ - خنجر - خارج - خدمت - خلیفہ - خانساماں - خضر - خبردار - خیانت - خشکی —

د

دوات - دلخوش - دروازہ - دار - دنیا - دماغ - دلیل - دستاویز - دائر - دیوار - دم - دعوی - دکان - دق - دواخانہ - دستور - دام - دیوان - دیو - دربان - درگاہ - درخواست - دیوانہ - درکار - دیگ - دیگچی - دجال - دفعہ - داغ - دین - دراز - دارو - دوربین - - دغاباز - درد - دولت - دشمن - دور —

ذ

ذات —

ر

رنگ - رجوع - راہ - رکاب - رومال - رسد - ردی - روشنائی - روزگار - رگ - رفو - رعیت —

ز

زین - زبان - زمین - زمیندار - زری - زنجیر - زیرہ - زعفران - زراعت - زنانہ —

س

سبز - سپرد - سپید - سوال - سزا - سود - سرکار - ستار - سادہ - سرہنگ - سخت - سراغ - سیر - سن - سررشتہ دار - سردار - سرمہ - سار - سرخی - سوداگر —

ش

شرم - شال - شہنائی - شرط - شیخ - شناخت - شائستہ - شمعدان - شبیہ —

ص

صبر - صدر - صف - صرف - صراف - صوبہ - صندوق - صیقل - صحیح -

ض

ضبط - ضد - ضامن - ضلع - ضرور - ضروری —

ط

طاق - طاؤس - طبق - طبلہ - طلاق - طاقت —

ظ

ظلم —

ع

عرض - عرضی - عرق - عزت - عدالت - عمارت - عطر - عید - علیحدہ -

غ

غل - غلط - غلام - غازی - غسل - غزل - غصہ - غالیچہ - غیبی —

ف

فاضل - فتیلہ - فرق - فرش - فرد - فریادی - فراری - فرار -
فکر - فوارہ - فیصلہ - فیروزہ - فیتہ - فوجداری عدالت -
فرمائش (پھرماچ) —

ق

قتل - قلم - قبضہ - قبضی - قدم - قلمدان - قلب - قفل -
قلندر - قواعد - قورمہ - قید - قیلچی - قصور - قاعدہ - قانونگو -
قائم (صحیح) - قرق - قسط (کشطی) —

گ

گرہ - گردن - گریبان - گرد - گرفتار - گرم - گرمی - گز -
گزران - گلاب - گم - گناہ - گور - گورستان - گوش مالی - گواہ —

ل

لگام - لاجورد -

م

ملشی - مالک - مکان - مقام - مشق - مغز - ملک - مصالہ - مرد - مزہ - میدان - مشکل - موزہ - مجلس - معلی - مشغول - مسطول - محصول - مختار - موضع - مسودہ - معمولی - مست - ماہ - مطلب - مصاحب - مسجد - موت - معرفت - مفت - مضبوط - مدد - میوہ - موافق - مشعلچی - منصب - محنت - موسم - مسافر - معاف - ملتوی - معاملہ - مقدمہ - منظور - محل - مقابلہ - مرضی - مع -

ن

نقل - نرخ - نائب - ناظر - ناخن - نالہ - نالش - ناخدا - ناشپاتی - نابالغ - نام - نقد - نقشہ - نزدیک - نہر - نشہ - نشہ خور - نواب - نواب زادہ - نظیر - ناقص - نرخ - نقد - نیلام - نقل نویس - ناراض - نشان (جھنڈا) - نقصان - نمونہ - نشانہ - نرم -

و

واپس - وکیل - وکالت - وزن - وقت - وجوہات - ولایت -

ہ

ہمیشہ - ہوبہو - ہوا - ہضم - ہنگام (بمعنی ہنگامہ) —

ی

یار - یخنی —

بنگالی مثلیں اور کہاوتیں

المثل فی الکلام ' کالملح فی الطعام

مثلیں اور کہاوتیں اُس وقت بنتی ھیں جب زبان اپنے عروج کو پہنچ جاتی ھے - اکثر تاریخی استعارے ' بہت سے فطری مشاھدے ' لاتعداد روزمرہ کے تجربے خاص معنوں میں استعمال ھونے لگتے ھیں - اگر ان کہاوتوں کا ایک زبان سے دوسری زبان میں لغوی ترجمہ کیا جائے تو خاک سمجھ میں نہیں آسکتا کہ کہنے والا کیا کہہ رھا ھے - اسی لیے یہ نتیجہ یقیناً صحیح ھے کہ ھر ایک زبان اپنے مخصوص محاورات رکھتی ھے اور ضرب الامثال کی بنا پر ھم ایک زبان کو دوسری سے تمیز کرسکتے ھیں - بنگالی میں جو کہاوتیں استعمال ھوتی ھیں وہ تقریباً سب اردو زبان سے مستعار لی گئی ھیں - بہ الفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ھے کہ موجودہ بنگالی زبان میں لہجے کے اختلاف سے قطع نظر کرنے کے بعد جو چیز بنگالی اور ھندوستانی زبانوں میں مشترک ھے وہ اردو کہلائے جانے کی مستحق ھے - ذیل میں چند بنگالی کہاوتیں درج کی جاتی ھیں جن سے اندازہ ھو سکے گا کہ بنگالی زبان اردو سے کس قدر قریب ھے - یہ مثلیں مسٹر اس - سی - مترا کی بنگالی لغت موسومۂ " شرول * بانگلا ابھیدان " کے چھٹے باب سے لی گئی ھیں - یہ باب تمامتر " شلوک بولی " یا کہاوتوں پر مشتمل ھے - اور اس میں پندرہ بیس ھزار کہاوتیں ھیں —

۱ - تمی پھرو ڈالے ڈالے آمی پھری پاتے پاتے - یعنی تم ڈال ڈال

---

* See, Subal Chandra Mitra's : The Studets Bengali Dictionary, New Bengal Press, 66 - 67 College Street Calcutta, 6th. Chapter page 1419.

ہم پات پات —

۲ - اجگرے داتا رام - یعنی اجگر کا داتا رام

۳ - آدھک سنیاسی تے گاجن نشٹ - ترجمہ : بہت سے فقیروں سے خانقاہ برباد ہو جاتی ہے - اردو میں کہا جا سکتا ہے کہ دو ملاؤں میں مرغی حرام —

۴ - سات کھون ماپھہ - یعنی سات خون معاف ہیں —

۵ - کاکے لئے گیلو کان ، کا کیر پیچھونے پھچھونے چھوٹو -
(ترجمہ) کوا لے گیا کان ، کوے کے پیچھے پیچھے دوڑو -

۶ - کاچے کوم ، کھیتے جوم - (ترجمہ) کام کم کرنا ، لیکن کھانا جم کے کھانا - اردو میں اس کہاوت کی ہم معنی ایک اور کہاوت ہے یعنی : کھانے میں شیر ، کمانے میں بھیڑ - ہندی میں اسی طرح کی کہاوت ہے :
رام بھجن میں آلسی ، بھوجن میں ہشیار -

۷ - کا رشد ھو کیوا مارے ، کھودا جار راجی - یعنی جس سے خدا راضی ہو اس کو کوئی نہیں مار سکتا - کبیر کہتا ہے :-
جا کو راکھے سائیاں مار سکے نا کوئے - بال نہ بانکا کرسکے جو جگ بیری ہوئے -

۸ - اے بھی جائیگا - یعنی موجودہ حالت بھی باقی نہ رہے گی اور مصیبت راحت سے بدل جائیگی - چنیں نماند و چناں نیز ہم نخواہد ماند -

۹ - سب لال ہوجاے گا - یہ ضرب المثل قصہ طلب ہے - راجہ رنجیت سنگھ کا ایک بنگالی کلرک تھا - اس کے پاس ایک ہندوستان کا نقشہ تھا جس میں انگریز کمپنی کی حاصل کردہ اراضی کو سرخ رنگ سے ظاہر کیا گیا تھا - رنجیت سنگھ نے پوچھا یہ سرخ رنگ کیسا ہے تو منشی نے کہا یہ کمپنی کی ملکیت کو ظاہر کرتا ہے - اس پر

راجہ نے کہا کہ باقی جگہ جو باقی ہے وہ بھی کچھہ دنوں میں لال ہوجائے گی یعنی کمپنی کا اس پر قبضہ ہوجائے گا -

۱۰ - کمیر یر شُنگ باد کُرے' جَل باش کورا

(ترجمہ) مگر کے سنگ بیر کرے' پانی میں رہے

یہ کہاوت "برند" کی ست سئی سے لی گئی ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے - اردو کی کہاوت ہے "پانی میں رہنا اور مگر سے بیر"-

۱۱ - کھاے نا' دے نا پاپی' سانچوے کُرے - تار دھن کھاے چورے اور پورے

یعنی کنجوس آدمی نہ خود کھاتا ہے' نہ کسی کو دیتا ہے بلکہ جمع کرتا ہے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی دولت کو چور اور پرایا آدمی کھاتا ہے - فارسی مثل ہے :- نہ خود خورد نہ بہ کس دہد' گندہ کند بہ سگ دہد -

۱۲ - گرج بوز بلاے - غرض بڑی بلاے ہے -

۱۳ - آکاش دھون چھوڑے' آپن چوکھے پڑے - یعنی آسمان پر دھول ڈالنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اپنی ہی آنکھہ میں پڑتی ہے - اسی طرح کی کہاوت اردو کی ہے چاند پر خاک ڈالے سے خاک تھوڑے پڑتی ہے —

بنگالی زبان کا نمونہ

اب تک ہمارا مطالعہ صرف ان اسماء و صفات تک محدود رہا ہے جو اردو اور فارسی سے بنگالی نے مستعار لیے ہیں - افعال سے ہم نے اس لیے بحث نہیں کی' کہ اس کے لیے ایک علیحدہ باب کی ضرورت ہے - اور مضمون شاید زیادہ طویل ہوگیا ہے - لیکن دلچسپی سے خالی نہ ہوگا -

اگر ہم رابندر ناتھ ٹیگور کے مشہور ڈرامے "ڈاک گھر" کے پہلے منظر کے چند جملے اصل زبان میں پڑھیں - ترجمہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ بنگالی کتابیں اگر اردو رسم الخط میں لکھی جائیں تو کس آسانی سے ہم ان کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں -

ڈاک خانہ	ڈاک گھر
پہلا ایکٹ	۱
(مادھودت کا گھر)	(مادھودت ایر گھر)
مادھودت :-	مادھب دت :
(کتنی) مشکل پڑ گئی ہے !	مشکلے پوڑے گے چھی !
جب تک وہ نہیں تھا، تب تک تھا ہی	جا کھن او چھیلا نا ' تا کھن چھیلائی
نہیں — کوئی فکر ہی نہیں تھی-	نا — کونو بھاؤ ناں چھیلا نا -
اب وہ کہاں سے آ گیا -	ایکھوں او کوتھا تھیکے ایشے -
ہمارے گھر (پر) قبضہ کیے بیٹھا (ہے)،	آمار گھر جوڑے بوشلو -
اس کے چلے جانے (کے بعد) ہمارا یہ گھر	او چلے گیلے آمار اے گھر -
گویا پھر گھر ہی نہ رہے گا -	جانو آر گھری تھاکبے نا -
کبھراج صاحب آپ کیا من (میں)	کبھراج موشائے آپنی کی منے
کر رہے ہیں ؟ اس کو	کرین ؟ او کے ... ...
کبھراج :- اُس کے بھاگوں میں اگر	کبھراج :- اور بھاگے جدی
زندگی ہے ' تو دیر تک	آیو تھاکے ' تا حال دیر گھا
زندہ رہے گا ؛ لیکن ایورویدِ	بانچتھو پارے ؛ کنتو آیور بیدے
جس رقم (طرح) لکھتی (ہے) اُس سے تو...	چے رکم لکھہ چے تاتے تو......
مادھودت :- کیا کہا ؟ !	مادھب دت :- بولن کی ؟ !

کبھراج :- شاستر ے بولچن ... ...
مادھب دت :- تھاک ' تھاک !
آپنی آراونی اشلوک گولو آورا
بئن نا — اوتے آرو آمار
بھائے بھڑے جاے -
ایکھن کی کرتے ھوبے ' شئی
تے بولے دین —
کبھراج :- (نس لوئیا) کھوب
شبدھانے رکھتے ھوبے -
مادھب دت :- شے نو ٹھیک کتھا -
کنتو کی لبشے شبدھان ھوتے ھوبے
شے ای تے سپشٹھر کرے جان -
کبھراج :- آمی تو پوبئی بولے چھی -
اوکے باڑرے ایکے بارے
جیتے دیتے پار بن نا -
مادھب دت :- چھیلے مانش !
اوکے دن رات گھریر مدھے
دھرے ریکھا ' جے بھاری سکتو-

کبھراج :- کتابیں کہتی ھیں...
مادھوت :- ٹھہرو - ٹھہرو
آپ اور وہ اشلوک وغیرہ مفید
نہ ھوں گے - اُس سے اور ھمارا
خوف بڑھ جاے (ھے) -
اب کیا کرنا ھوگا - یہی
چیز بول دیجیے -
کبیراج :- (نسوار لیکر) خوب
حفاظت رکھنا ھوگا -
مادھودت :- یہ تو ٹھیک بات (ھے) -
لیکن کس طرح حفاظت ھوگی
یہی بات صاف کر جائیے -
کبیراج :- میں تو صاف بول چکا
اس کو باھر ایک بار (یعنی بالکل)
جانے دینا نہیں (چاھیے) -
مادھودت :- بچہ ھے !
اس کو دن رات گھر کے اندر
دھرے رکھنا ' یہ بھاری سختی (ھے)

بنگال میں ترقی اردو کے راستے

صراط مستقیم یا سیدھا راستہ تو یہ تھا کہ موجودہ حکومت بھی

اُس عہد کی پاسداری کرتی جو ایسٹ انڈیا کمپنی سے دیوانی عدالت کی زبان کے متعلق سلطنت مغلیہ سے ہوا تھا - لیکن زمانہ بدل گیا - انگریزی زبان کی گرفت مضبوط ہو گئی - اور فارسی نہ صرف عدالتوں سے مٹ گئی بلکہ مدارس سے بھی نام نہاد طریقہ پر اردو اور عربی پر زور دیا جاتا ہے - فارسی کا کوئی نام بھی نہیں لیتا - جہل کی حد یہاں تک پہنچ گئی ہے کی اچھے خاصے پڑھے لکھے ہندوؤں کو میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ عربی فارسی دونوں ایک ہی زبانیں ہیں اور جاہلوں کا ذکر ہی کیا ' وہ تو عربی فارسی تو کیا اردو کو بھی " نوبی کا جوبن " (نبی کی زبان) یعنی مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں - معلوم نہیں کس نبی نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا تھا —

بنگال میں نہ صرف فرقہ پروری کی وبا عام ہے بلکہ تعلیم یافتہ بنگالیوں کو یہ مغالطہ بھی ہے کہ وہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں سے زیادہ بہتر دماغ رکھتے ہیں - یعنی سوچتے زیادہ ہیں لیکن آب و ہوا کی کمزوری کی بنا پر اپنے نظریات کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے - یہی وجہ ہے کہ یہاں کی تحریکوں میں جوش و خروش تو بہت ہوتا ہے لیکن عملی اقدام ہونے تک سرد ہو جاتا ہے —

آج کل کانگرس کی تجویز کے نام پر شہر شہر قصبہ قصبہ " راشٹریہ بھاشا پرچارنی سبھا " کے دفتر قائم ہو رہے ہیں - یہ ہندوستانی زبان پھیلانے والی انجمنیں اس چیز کو بھول گئی ہیں کہ ہندوستانی زبان خود اپنے زاد بوم میں اتنی قدامت پرست اور تنگ نظر نہیں ہے ' چنانچہ بنگالی خادمان ملک نے اسے سنسکرت سے قریب تر لانے میں اپنا نام نہاد فرض ادا کرنا شروع کیا ہے - یہاں " ہندی پرچارنی " سبھائیں بھی

ہیں اور اس جماعت کے لوگ بھی اگرچہ ثقیل ہندی کی تعلیم دے رہے ہیں لیکن اول الذکر جماعت کے مقابلہ میں زیادہ جبری اور سچے معلوم ہوتے ہیں کہ جو کرنا چاہتے ہیں اُس پر محض دکھاوے کے لیے " راشٹری " یا وطنی رنگ نہیں دیتے اور صاف اور سیدھے طریقے سے جس زبان کو وہ ہندی سمجھتے ہیں اُس کی تعلیم دیتے ہیں - اور جو لوگ اس امتحان میں کامیاب ہوجاتے ہیں اُنہیں سندیں اور انعامات بھی دیتے ہیں - ہندی زبان کا رسم خط دیوناگری ہوتا ہے اور اس تحریک کی اعانت بنگال کے غیر بنگالی تاجروں یعنی مارواڑیوں اور گجراتیوں کی طرف سے ہوئی ہے —

اس سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ بنگالی زبان ہندی کے ذریعہ سے اردو کے قریب تر آرہی ہے - اور ہمیں امید ہے کہ جلد ایک عام ملکی زبان جو " راشٹریہ " نہیں ' بلکہ ہندوستانی ہوگی ' بنگال میں رائج ہوجائے گی - بنگالی زبان میں مذکر و مونث میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا - اسی طرح واحد اور جمع کے لیے واحد ہی صیغہ مستعمل ہے - یہی حال جاوی اور ملائی زبانوں کا ہے - اب ہندی کے رواج سے بنگالیوں میں اردو کی یہ دو خصوصیتیں پیدا ہوجائیں گی —

بنگالی اور دیوناگری رسم خط بہت کچھ ملتے جلتے ہیں - لیکن یہاں کے باشندوں میں بنگالیت اتنی غالب ہے کہ وہ اس پر تیار نہیں کہ بنگالی کے بجائے دیوناگری استعمال کرنے لگیں - اِن کا خیال صحیح ہے کہ ہندی لٹریچر سے کہیں زیادہ بنگالی ادب وسیع و عمیق ہے - لیکن میکس ملر (Max Muller) نے برھمی کی بجائے اتفاقیہ طور پر دیوناگری کو ویدوں کی کتابت کے لیے تجویز کرلیا - اس حسن یا سوء اتفاق کا یہ نتیجہ

ہے کہ ناگری رسم خط کو ہندو مقدس ماننے لگے ہیں اور پورے ہندوستان پر اسے عاید کرنا چاہتے ہیں —

حامیان اردو کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ ملکی یکجہتی اور اردو کی ترقی کے خیال سے ہندی تحریک کی مخالفت نہ کریں - البتہ اس کے ساتھہ ساتھہ یہ بھی خیال رکھیں کہ اردو کی ترقی اردو رسم خط کے ذریعہ سے زیادہ تیزی سے ہوسکتی ہے - دنیا کا کوئی معقول انسان اس رسم خط کی زود نویسی اور اختصار سے انکار نہیں کرسکتا - اور جب کہ کراچی کانگرس نے اقلیتوں تک کے رسم خط کو بطور بنیادی حق کے تسلیم کرلیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اردو رسم خط جو ہندوستان کے ہر صوبہ میں رائج ہے اور دنیا کے ہر حصہ میں پڑھا جاسکتا ہے وہ بنگال میں رائج نہ ہو - اس رسم خط کو زیادہ وسعت دینے کے لیے مندرجہ ذیل طریقے مناسب ہوسکتے ہیں —

۱ - محکمۂ تعلیمات بنگال کا فرض ہونا چاہیے کہ ممالک متحدہ کی طرح ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے لیے ایک ہی (Common) زبان کا کورس مقرر کرے - اور ہر طالب علم کے لیے ہندی اور اردو دونوں رسوم خط سیکھنا لازمی قرار دیے جائیں —

۲ - ہندی اور اردو جاننے والوں کے لیے عدالت میں یہ سہولت ہونی چاہیے کہ جس رسم خط میں چاہیں درخواست دے سکیں اور نقل لے سکیں —

۳ - عام طور پر سرکاری محکمہ میں نہ صرف اردو اور ہندی میں مراسلت کرنے کی اجازت ہو بلکہ اس کی بھی اجازت ہو کہ جو شخص جو اردو یا ہندی نہیں جانتا بلکہ صرف بنگالی جانتا ہے وہ بھی

اردو یا ہندی رسم خط میں اپنی بنگالی زبان کو لکھوا کر مراسلت کرسکے -

اس آخری تجویز کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوگی جب وہ لوگ جو بنگالی رسم خط نہیں جانتے اور اردو یا ہندی رسم خط جانتے ہیں ان میں سے کسی رسم خط میں بنگالی زبان لکھنے لگیں گے - نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ بنگالی زبان اردو اور ہندی سے بہت قریب ہو جائے گی اور خصوصیت سے وہ پابند مذہب مسلمان جو اپنے بچوں کو قرآن کریم پڑھانا ضروری سمجھتے ہیں نہایت آسانی سے اردو رسم خط میں اپنی بنگالی زبان کو لکھنے لگیں گے - یعنی جو مشکل اُن بچوں کو بنگالی رسم خط سیکھنے میں ہوتی ہے وہ رفع ہو جائے گی —

اس کے علاوہ ان کو ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ قرآن کریم کے وہ بنگالی ترجمے جو اب تک بنگالی رسم خط میں لکھے جاتے ہیں اردو خط میں لکھے جائیں گے - اور عربی متن کے نیچے بنگالی ترجمہ اردو خط میں ہوگا جو زیادہ آسانی سے سمجھہ میں بھی آئے گا اور اردو سے اجنبیت کو بھی دور کردیگا - مجھے یقین ہے کہ اگر صرف ترکیب نماز و حج و زکواۃ اور چند ضروری سورتیں معہ بنگالی ترجمہ کے اس طرح اردو رسم خط میں شائع کردی جائیں تو نہ صرف شائع کنندہ کو مالی فائدہ ہوگا بلکہ مشرقی بنگال میں دس سال کے اندر اندر اردو رائج ہو جائے گی - اس کام کے لیے اگر اُن بنگالی طالب علموں کو جو یو - پی ، بہار اور مختلف ریاستوں میں عربی کی تعلیم حاصل کرنے چلے جاتے ہیں ، منظم کیا جائے تو غالباً ترقی اردو کا کام زیادہ سرعت سے ہو سکے گا —

فارسی غزل

از

جناب فضل احمد کریم صاحب، فضلی بی - لٹ (آکسفورڈ) ' آی ۔ سی ایس

حصہ دوم

باب اول

فارسی غزل کے ارتقا کی تاریخ حسب ذیل چھ دوروں میں تقسیم کی جاسکتی ہے:-

(۱) ابتدا سے اُس شاعر تک جس نے سب سے پہلے ایک مکمل دیوان غزل چھوڑا یعنی حضرت احمد جام —

(۲) احمد جام سے سعدی تک جب غزل سب سے زیادہ ہر دلعزیز صنف سخن بن گئی —

(۳) سعدی سے حافظ تک جب غزل اپنے معراج کمال کو پہنچی —

(۴) حافظ سے فغانی تک جب غزل میں ایک نئی طرز ظہور پذیر ہوئی۔

(۵) فغانی سے مرزا عبدالقادر بیدل تک —

(۶) نیا دور —

ان ادوار سے بالترتیب بحث کی جائے گی —

پہلا دور

خصوصیات

یہ وہ دور ہے جس میں موجودہ فارسی ادب نے جنم لیا۔ اس

دور میں ایرانیوں نے از سر نو اپنی آزادی و خود مختاری حاصل کی؛ دلوں میں ولولے تھے ' سر افتخار بلند ہو رہا تھا - لہذا انہیں اپنی جداگانہ قومی تہذیب و تمدن اور روایات کو زندہ رکھنے اور اپنی مادری زبان یعنی فارسی کو ترقی دینے کی قدرتاً خواہش پیدا ہوی - بادشاہوں اور رئیسوں نے کچھہ سیاسی مصلحت اور کچھہ رجحان طبیعت کی بنا پر اس جذبے کی تربیت اور نشونما کا بار اُٹھایا - اس لیے اس دور میں دو اصناف سخن نے سب سے زیادہ ترقی کی یعنی ایک تو مثنوی جس میں قومی تاریخ و روایات نظم کی گئیں؛ دوسری قصیدہ ' جس میں ممدوح کی شان میں رطب اللسانی کی گئی - غزل پس پشت پڑی رہی مگر اس کا اصل موضوع یعنی عاشقی و مے نوشی متذکرہ بالا ہر دو اصناف سخن اور رباعیات میں ترقی پاتا رہا —

اس دور کے ابتدائی زمانوں ہی میں غزل نہ حیثیت ایک جداگانہ صنف سخن کے موجود پائی جاتی ہے - اگرچہ لفظ غزل کا اطلاق عموماً ایسی نظموں پر بھی کیا جاتا ہے جو کسی تک سے غزل نہیں کہی جاسکتیں تاہم اس زمانے کے قریب قریب ہر شاعر کے کلام میں چند خالص غزلیں پائی جاتی ہیں - اس دور کے متوسط زمانے میں (اگر اس سے قبل نہیں تو) مطلع لوزامات غزل میں داخل ہوجاتا ہے - مقطع کا استعمال بھی زیادہ کثرت سے ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ دوسرے دور کے ابتدائی زمانوں میں وہ بھی جز و غزل بن جاتا ہے —

غزل کے لیے مناسب زبان ابھی تک نہیں پیدا ہوئی - کرخت و ثقیل الفاظ عموماً اشعار میں پائے جاتے ہیں - اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ فارسی زبان اس زمانے میں اسی قسم کی تھی ' دوسری یہ

کہ شعر و سخن کا مرکز فارسی زبان کے اصل وطن یعنی فارس سے بہت دور تھا - مصرعوں کی ترکیب بھی چست نہیں ہوتی - غیر ضروری الفاظ اکثر پائے جاتے ہیں - عروض کی پابندی کا بھی چنداں خیال نہیں کیا جاتا —

اس دور کی غزل میں عموماً ذاتی واردات و جذبات بیان کیے جاتے ہیں - شعرا آپ بیتی سناتے ہیں اور اپنے اشعار میں اس مادی دنیا کا نقشہ کھینچتے ہیں جسے وہ اپنی گوشت پوست کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں - بعد کے زمانوں کی خیالی دنیا اور اس دنیا کی شاعری ابھی وجود میں نہیں آئی —

معشوق کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا جاتا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صنف ذکور کا فرد ہے - اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شعرا اصلی واقعات بیان کرتے ہیں - دوسری یہ ہوسکتی ہے کہ یہ زمانہ زمانہ قدیم سے قریب ترین ہے جب بقول ابن رشیق اور مولانا حالی کے شعرا اپنے آپ کو عورت اور محبوب کو مرد فرض کرتے تھے اس لیے اس زمانے میں اس پرانی رسم کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے —

چونکہ غزلوں میں ذاتی واقعات بیان کیے جاتے ہیں اس لیے ان میں عموماً تسلسل اور ہم آہنگی ہوتی ہے - یہ امر خاص طور سے قابل لحاظ ہے کیونکہ مولانا شبلی شعرالعجم میں فرماتے ہیں " قدما بلکہ متاخرین میں بھی اس کا (یعنی مسلسل غزلوں کا) بہت کم رواج ہوا " (شعرالعجم جلد دوم صفحہ ۱۸۲) - ان صفحات سے ظاہر ہوگا کہ صورت معاملات برعکس ہے - غیر مسلسل غزلیں بھی پائی جاتی ہیں مگر مقابلتاً کم —

خیالات میں عموماً سادگی ہوتی ہے اور ان کا انداز بیان بھی سادہ

ہوتا ہے - تکلف و تصنع کو بہت کم دخل ہوتا ہے - یوں ہی کہیں کہیں لطافت خیال و حسن بیان بھولے بھٹکے نظر آجاتا ہے - تشبیہات و تمثیلات بھی عموماً سطحی ہوتی ہیں ' ان میں بعد کے زمانوں کی لطافت و نفاست نہیں پائی جاتی - اکثر جنگ و شکار کے مصطلحات استعمال کیے جاتے ہیں ' کچھہ تو اس وجہ سے کہ اس زمانے میں اِن چیزوں کا دور دورہ تھا اور کچھہ اس وجہ سے کہ محبوب خود فوجی سپاہی ہوتے تھے —

اخلاقی مضامین بھی کبھی کبھی غزل میں بیان کیے جاتے ہیں - یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنے کی ہے کیونکہ مولانا شبلی فرماتے ہیں " خواجہ صاحب سے پہلے غزل عشقیہ مضامین کے لیے مخصوص تھی اس کے سوا اور کوئی خیال غزل میں ادا نہیں کیا جاسکتا تھا " (شعرالعجم جلد پنجم صفحہ ۳۹) - ہم دیکھیں گے کہ دامان غزل خواجہ حافظ کی ولادت سے پہلے بھی اسی قدر وسیع تھا جس قدر کہ ان کی وفات کے بعد - اس وسعت کی ابتدا اسی زمانے سے ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ بڑھتی جاتی ہے —

اس دور کے اواخر میں تصوف کو لوگوں کی زندگی میں کافی دخل ہونے لگتا ہے - بہت سے صوفی شعرا پیدا ہوتے ہیں اور ان اسباب کی بنا پر جن کا ذکر اس مقالے کے حصہ اول میں کیا جاچکا ہے ' ان کے اقدام سے غزل کی اہمیت بڑھنے لگتی ہے - مدت دراز تک صوفی شعرا ہی بہترین غزل گو نظر آتے ہیں اور جس شاعر نے سب سے پہلے ایک مکمل دیوان غزل چھوڑا وہ ایک عظیم المرتبت صوفی بزرگ تھا ' یعنی حضرت احمد جام جن سے ہمارے دور دوم کی ابتدا ہوتی ہے - غزل نے جو اہمیت اس دور کے آخر زمانوں میں حاصل کرلی تھی اس کا ثبوت

اس امر سے ملتا ہے کہ خالص قصیدہ کو شاعر بھی اسے ممدوح کی تعریف کے لیے استعمال کرتے نظر آتے ہیں ۔ اس بات نے اس کی اہمیت اور بڑھادی ہوگی (مثال بعد میں مناسب موقع پر بیان کی جائے گی) —

باب دوم

عام خیال ہے کہ غزل کی ایجاد کا سہرا سعدی کے سر ہے - سرگور اوزلی Ouseley اُس مقدمے میں جو انھوں نے اپنے ہاتھ سے نسخۂ دیوان حافظ مکتوبۂ مہر علی کے شروع میں تحریر فرمایا ہے لکھتے ہیں (یہ مقدمہ ان کی کتاب Notices of Poets میں شامل ہے) —

The origin of lyric poetry may certainly be ascribed to Shaykh Sadi

ان کی یہ رائے متعدد فارسی مصنفین کی تحریرات پر مبنی ہے اور مشرق و مغرب کے اہل علم بالعموم اسے تسلیم کرتے ہیں - مولانا جامی بہارستان میں فرماتے ہیں "ہیچ کس پیش وے طریق غزل نورزیدہ" صاحب ریاض الشعرا یوں رقمطراز ہے * "مخترع فن غزل حضرت شیخ است چہ قبل از شیخ احدے از استادان طریقہ غزل نہ پیمودہ اگرچہ در دیوان بعضے از قدما غزلے یافت میشود ' لیکن غزلیات آنہا بطریق قصیدہ است ' اختصار دادہ نامش را غزل کردہ اند حالانکہ غزل گوی را طریق علحدہ است کہ مطلق مشابہت بہ طریق قصیدہ ندارد - از جملہ واضع و مخترع این فن خود شیخ اند" مخزن کے الفاظ یہ ہیں † " اشعار غزل را شیخ رونق دادہ و بانیء غزل اوست و پیش ازوے غزل بطور قصیدہ بود " اسی قسم کے الفاظ دوسرے فارسی مصنفین کی کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں - انھی نے مولانا شبلی کو دھوکے میں ڈال دیا - وہ

* ص ۱۳۸ - † ص ۱۵۳ -

متعدد مقامات پر اس کا ذکر کرتے ہیں اور اس وثوق کے ساتھہ کہ بے اختیار ان کی ذہانت کی داد دینے کو جی چاہتا ہے - ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں " غزل بھی اس وقت تک گویا قصیدہ ہی کی ایک دوسری صورت تھی - محبت عشق کے جذبات اس میں ادا نہیں کیے جاتے تھے بلکہ جس طرح مدحیہ قصائد میں ممدوح کی شجاعت ...... کی مدح کرتے تھے غزل میں معشوق کے حسن اور اعضا کے اوصاف بیان کرتے تھے " (شعرالعجم جلد دوم صفحہ ۹۱) - ایک اور جگہ رقمطراز ہیں "غزل اس وقت تک محض معشوق کی مداحی تھی' شیخ نے اس میں عشق کے اصلی جذبات ادا کیے " (شعر جلد دوم صفحہ ۹۹) - مولانا کو بحیثیت زمانہ حال کے مورخ و مبصر کے اس کی وجہ بھی دینی ضروری تھی - انگریزی مثل ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے - ادھر ضرورت محسوس ہوی ادھر ان کے ذہن کی جدت طراز قوت خلاقی نے فوراً ایک وجہ گڑھ دی - چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "شیخ کے زمانے سے پہلے جو شعرا گزرے وہ عشق کے زخم خوردہ نہ تھے " (شعر جلد دوم صفحہ ۹۲) - اس آخری جملہ کے متعلق کچھہ لکھنا تحصیل ہے - ایک تبسم زیر لب کافی ہے —

اس مقالے کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ مندرجہ بالا بیانات یا تو سرے سے بے بنیاد ہیں یا جہاں ان میں کسی قدر حقیقت کی جھلک ہے وہاں بے انتہا مبالغہ سے کام لیا گیا ہے - واقعہ یہ ہے کہ سعدی نے غزل پر اتنا احسان کیا اور ان کی شخصیت ایسی زبردست تھی کہ اس نے ان کے پیشرووں اور ہم عصروں کو پس پشت ڈال دیا اور لوگوں نے حسب عادت غلو سے کام لے کے انہیں بمنزلہ بانی کے سمجھا اور اپنی راے کی تائید میں متعدد وجوہ پیش کرنے شروع کیے جنہیں حقیقت سے کوئی

سروکار نہ تھا - جب ایک بات ایک دفعہ تسلیم کرلی گئی تو بعد کی نسلوں نے اسے بغیر کسی جرح قدح کے مان لیا - اس میں شک نہیں کہ سعدی غزل کے عظیم ترین محسنین میں ھیں - لیکن محسن ہونا ایک چیز ہے اور بانی ھونا دوسری - یہ کہنا بھی کہ سعدی نے غزل میں بجاے معشوق کے اعضا کی تعریف کے جذبات دل کو بیان کرنے کی ابتدا کی' اصلیت سے دور ھے - جیسا ہم دیکھیں گے سعدی سے پہلے بھی غزل عمیق ترین جذبات انسانی سے مملوتھی - جہاں تک اس کی ساخت کا تعلق ھے وہ شیخ کی وفات کے بعد بھی بجنسہ ویسی ھی رھی جیسی کہ ان کی ولادت سے پہلے تھی - مرأت الخیال کا یہ بیان کہ " از عہد مصلح الدین سعدی شیرازی علیہ الرحمہ ذکر تخلص نیزلازم غزل شدہ '' حقیقت پر مبنی نہیں - ہم دیکھیں گے کہ دور اول ھی میں شعرا نے تخلص کا استعمال شروع کردیا تھا - اگرچہ شروع میں یہ رسم بہت عام نہ تھی مگر رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور سعدی سے بہت پہلے استوار ھوگئی تھی - اسی طرح یہ بھی غلط ھے کہ سعدی نے مطلع کو لازمۂ غزل گوی قرار دیا - صاحب مخزن الغرائب لکھتا ھے (صفحہ ۱۵۳) '' پیش ازوے مطلع و مقطع لازم نبودہ "- یہ بات' ممکن ھے کہ غزل کے بہت ابتدائی زمانوں' صحیح رھی ھو (مناسب موقع پر اس کا ذکر کیا جائیگا) مگر مطلع و مقطع دونوں سعدی سے بہت پہلے جزو غزل بن چکے تھے اس طرح سعدی نے غزل کی ساخت و ماھیت تک میں کوئی تبدیلی نہ کی اس کے بانی ھونے کا کیا ذکر —

باب سوم

(غزل کی ابتدا)

غزل کی ابتدا پر عہد قدیم کی خاموش تاریکیوں کا پردہ پڑا ھوا

ہے - جہاں تک اس کے اصل موضوع یعنی داستان حسن و عشق کا تعلق ہے ہم اسے قدیم ترین فارسی اشعار میں موجود پاتے ہیں - ایسا ہونا قدرتی امر ہے - علاوہ اس امر کے کہ ہر شاعری کا اصل موضوع عشق ہی ہوتا ہے اہل ایران کی زود مشتعل فطرت بھی اسی بات کی مقتضی تھی کہ ان کی شاعری میں یہ شعلہ بداماں جذبہ سب سے پہلے کارفرما نظر آئے —

فارسی کے قدیم ترین اشعار میں حکیم ابو حفص سُغدی سمرقندی کا یہ شعر ہے (مجمع الفصحا جلد ۱ ، صفحہ ۶۵) -

آہوے کوہی در دشت چہ گونہ دودا | او نہ دارد یار بے یار چگونہ رودا

چونکہ صرف یہی ایک شعر ہم تک پہنچا ہے اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تن تنہا وجود میں آیا یا اس کے ساتھ اور بھی اشعار تھے - ظاہر ہے کہ یہ بہ آسانی کسی پرانی غزل کا مطلع ہو سکتا ہے -

بلحاظ قدامت حنظلہ باد غیسی کے حسب ذیل دو شعر اس کے بعد آتے ہیں (لباب صفحہ ۲)

یارم سپند گرچہ بر آتش ہمی فگند | از بہر چشم تا نہ رسد مرو را گزند

او را سپند و آتش نایدہمی بکار | باروے ہمچو آتش و با خال چون سپند

اس کے بعد ابو سالک گورگانی کے یہ اشعار ہیں (لباب صفحہ ۳)

بہ مژہ دل ز من بدزدیدی | اے بلب قاضی و بہ مژگان دزد

مزد خواہی کہ دل ز من بہ بری | این شگفتی کہ دید دزد بہ مزد

یہ مثالیں اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ فارسی کے قدیم ترین اشعار بھی غزل کے اصل موضوع ہی کے متعلق تھے - جب بعد میں آل سامان اور آل سبکتگین کے زر افشاں دربار شعرا کے ملجاو ماوا بنلے اور

انہوں نے زور شور کے ساتھہ قصیدہ خوانی شروع کی تو اس وقت بھی انہیں مجبوراً قصیدہ کے ابتدائی اشعار میں داستان حسن و عشق ہی چھیڑنی پڑتی تھی تاکہ ممدوح ان کے اشعار کو برغبت سنے - زبدۃ الاشعار کے الفاظ میں (صفحہ ۹۰) "نسیب غزلے باشد کہ شاعر علی‌الرسم ان را مقدمۂ مقصود خویش سازد تا بہ سبب میلے کہ بیشتر نفوس را بہ استماع احوال محب و محبوب و اوصاف مغازلت عاشق و معشوق باشد طبع ممدوح بشنود - آن رغبت نماید و حواس را از دیگر شواغل باز ستاند وبدین واسطہ آنچہ مقصود قصیدہ است بخاطر مجتمع و نفس مطمئن ادراک کند" - اس میں شک نہیں کہ نسیب یا تشبیب کی ابتدا عربی شعرا کی تقلید کی وجہ سے ہوئی مگر یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ فارسی شعرا نے جس قدر تشبیب میں تغزل پیدا کیا وہ ان کے استادوں کے بس کی بات نہ تھی - تشبیب کے علاوہ عشق و مے پرستی کے مضامین رباعیوں' قطعوں اور مثنویوں کو بھی رونق بخشتے تھے - اس طرح جہاں تک غزل کے اصل موضوع کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اس صنف سخن کے باضابطہ ظہور پذیر ہونے کے بہت پہلے سے وہ رفتہ رفتہ دوسرے اصناف سخن میں تربیت و ترقی پا رہا تھا - اسی کا نتیجہ تھا کہ غزل بہ حیثیت ایک جداگانہ اور اہم صنف سخن کے نمودار ہوئی اور جلد شاہ راہ ترقی پر گامزن ہونے لگی —

غزل کی موجودہ ساخت کی ابتدا اور ارتقا

ہمیں اس بات کا صحیح علم نہیں کہ غزل کی ابتدا کیونکر ہوئی- صاحب مجمع الفصحا رقمطراز ہے (صفحہ ۴۴)

"پس ازوے (عباس مروزی) چون دولت بہ آل طاہر و آل لیث

رسید ' شعرائے عجم بنائے غزل و قطعہ و ترانہ گوی نہادند '' -
ہم تک اس ابتدائی زمانے کے شعرا کا کلام اتنی مقدار میں نہیں پہنچا کہ ہم اس بیان کی صحت یا عدم صحت کے متعلق کوئی رائے قائم کرسکیں - یہ امر کہ حنظلہ بادغیسی نے ایک دیوان چھوڑا تھا چہار مقالہ کے ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے ''احمد بن عبداللہ الخجستانی گفت بہ بادغیس در خجستان روزے دیوان حنظلہ بادغیسی همی خواندم'' - ہمارے پاس اس امر کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ اس دیوان میں کیا تھا - اگر مجمع الفصحا کا مندرجہ بالا بیان صحیح ہے تو اس میں شائد کچھ ٹوٹی پھوٹی غزلیں بھی رہی ہوں - اس کے علاوہ بھی ہمارے پاس چند شہادتیں ایسی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غزل کسی نہ کسی صورت میں رودکی سے پہلے بھی پائی جاتی تھی ـــ

خود رودکی کا ایک شعر لغات فرس میں حسب ذیل ہے (صفحہ ۳۴) ـــ

دریغ مدحت چون زرو آبدار غزل که چابکیش نیاید همی به لفظ پدید

ابوسالک گورگانی کے بھی یہ اشعار غالباً کسی غزل کے ہیں (لباب صفحہ ۳) ـــ

خون خود را گر بریزی بر زمین به که آب روے ریزی در کنار
بت پرستیدن به از مردم پرست پند گیر و کاربند و گوش دار

ان اشعار کا ایک دوسرے سے غیر متعلق ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ غالباً کسی غزل کے جزو ہیں اور اگر صرف یہی دو اشعار مصنف نے نظم کیے تھے (جس کا امکان کم ہے) تو انہیں وہ تخم خیال کرنا چاہیے جس سے غزل کا تناور درخت پیدا ہوا ـــ

فرالاوی کا بھی جس کی رود کی نے تعریف کی ھے ایک شعر ھے جو یا تو کسی غزل کا معلوم ھوتا ھے یا کسی بہت غزل نما تشبیب کا —

ز چشم مست تو عالم خراب است به بند زلف تو دلہا گرفتار *

اس کے بعد شہید بلخی † کا ایک شعر لغات فرس اسدی طوسی میں ملتا ھے (صفحہ ۱۱) —

دھان دارد چویک پسته لبان دارد به مے شسته
جہان بر من چویک پسته بدان پسته دھان دارد

اس شعر کی بحر، اس کا لہجہ اور اس کا مضمون اس بات کو ظاھر کرتے ھیں کہ وہ غالباً کسی غزل کا ھے۔ شہید کے تین اور اشعار بھی غزل کے معلوم ھوتے ھیں (لباب صفحہ ۴) —

دانشا چوں دریغ ای از انک بے بہای و لیکن از تو بہاست
بے تو از خواسته مبادم گنج ھم چنیں زار و ار با تو رواست
با ادب را ادب سپاہ بس است بے ادب با ھزار کس تنہا ست

ان اشعار کا بذات خود مکمل اور ایک دوسرے سے غیر متعلق ھونا ان کے جزو غزل ھونے پر دلالت کرتا ھے۔ یہی وجہ ھے کہ خلاصۃالافکار نے

---

* یہ شعر مجمع‌الفصحا کے صفحہ ٦٥ پر مندرج ھے، دوسرے تذکروں میں بھی پایا جاتا ھے۔ ظاھرا اس پر براؤن کی نظر نہیں پڑی ورنہ وہ فرالاوی کا ایک قطعہ مندرج کرنے کے بعد یہ نہ لکھتے کہ The following fragment alone survives of his poems (vol. I. p. 455)

† شہید بھی رود کی سے پہلے گذرا ھے۔ اخرالذکر اس کا بہت بڑا مداح تھا جیسا کہ ان اشعار سے ظاھر ھوتا ھے —

کاروان شہید رفت از پیش واں ما رفتہ گیر و می اندیش
از شمار دو چشم یک تن کم وز شمار خرد ھزاران بیش

آخری شعر کے پہلے غزل * لکھا ہے - اگر صرف اتنے ہی اشعار مصنف نے کہے تھے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخزن الغرائب کے اس قول کے مطابق جسے ہم اوپر لکھہ آے ہیں شروع شروع میں مطلع و مقطع غزل کے لازمی اجزا شمار نہیں کیے جاتے تھے - چند مثالیں ہمیں اور بھی ایسی ملی ہیں (ان کا ذکر بعد میں کیا جاے گا) جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس ابتدای زمانے میں شاید ایسا ہی رہا ہو —

ہمارے پاس اس امر کے ثابت کرنے کے لیے کہ رودکی سے پہلے بھی غزل کسی نہ کسی صورت میں موجود تھی صرف مندرجۂ بالا اشعار ہیں - اصل سوال یہ ہے کہ وہ وجود میں کیسے آئی - آیا مثل رباعی کے وہ ایک جداگانہ صنف سخن بن کے حیز وجود میں آئی یا مولانا شبلی کے خیال کے مطابق قصیدہ کی تشبیب نے بتدریج ترقی کر کے غزل کی صورت اختیار کی -

پہلے آخرالذکر امر سے بحث کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے - اس میں شک نہیں کہ قصیدے کی تشبیب کو ابتدائی زمانے میں اکثر غزل بھی کہتے تھے - عوفی ادیب صابر کے متعلق لکھتا ہے (لباب صفحہ۱۱۹)

" ہم او راست در مدح مجدالدین رئیس خراسان - در ہر بیتے

---

* عوفی ان اشعار کا کوئی نام نہیں دیتا ' صرف ولہ' کہہ کے ٹال دیتا ہے ' عوفی نظموں کا نام عموماً بے تک لکھتا ہے ' کبھی تو ان نظموں کو جو صاف غزلیں ہیں صرف نظم و شعر کہتا ہے اور کبھی ان نظموں کو جو کسی غزل کے نام سے موسوم نہیں کی جاسکتیں غزل کہتا ہے مثلاً فرخی کے حسب ذیل اشعار کو غزل قرار دیتا ہے (صفحہ ۴۹) -

شہ زاولستان محمود غازی   سر گردن کشان ہفت کشور
بہ نیزہ کر گدن را بر کند شاخ   بہ زوبین بشکند سیمرغ را پر

لباب ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جن کے نمونے ان صفحات میں بہت جگہہ نظر آئیں گے -

از غزل سرو و یاقوت لازم دارد و در هر بیتے از مدح آفتاب و آسمان" -
یہاں ظاہر ہے کہ لفظ غزل بمعنی تشبیب استعمال کیا گیا ہے - عوفی نے
سلجوقی شاعر خالد طولانی کی ایک اٹھارہ شعر کی نظم مندرج کی ہے
اور اسے غزل کے نام سے موسوم کیا ہے - مگر اس کے حسب ذیل دو شعر
یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ در حقیقت کسی قصیدے کی تشبیب ہے
(لباب صف ۱۴۴)

من چو در مدح شہ در افشانم　　بر من از عارضم زر افشانی
شہ حسن انکہ از جلالت یافت　　تاج شاہی و تخت سلطانی

عنصری اپنے ایک قصیدے کی تشبیب کے آخر میں کہتا ہے * —

ترا کہ ماہ زمینی پس ارمن انکہ کنم
تخلص از غزل تو بہ مدح شاہ زمن

ایسی مثالیں بکثرت پیش کی جاسکتی ہیں - ان سے یہ بات تو
پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ تشبیب کو اکثر غزل بھی کہتے تھے؛ مگر
سوال یہ ہے کہ آیا یہی تشبیب بعد میں علحدہ ہو کے غزل کہلانے لگی
یا غزل جداگانہ طور پر ظہور پذیر ہوئی اور تشبیب کو اس وجہ سے
غزل کہتے تھے کہ دونوں کا موضوع ایک تھا - ہمارے پاس جو مواد ہے
وہ اس مسئلہ کے قطعی فیصلہ کے لیے ناکافی ہے لیکن اخرالذکر امر
حسب ذیل وجوہ سے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے —

مولانا شبلی کی رائے کو تسلیم کرنے کے لیے اس امر کی ضرورت
ہے کہ قصیدہ غزل سے اتنے عرصے پہلے وجود میں آئے کہ تشبیب کو
ارتقائی منازل طے کرکے غزل کی صورت اختیار کرنے کا وقت ملے؛ لیکن

* دیوان عنصری ایلیٹ ۱۱۴ -

صورت حال ایسی نہیں - قدیم ترین فارسی شاعر جس کا معتدبہ کلام ہم تک پہنچا ہے رودکی ہے اور وہی فارسی شاعر کا بابا آدم مانا جاتا ہے - جیسا ہم بعد میں دیکھیں گے رودکی کے وقت تک غزل نے بہ حیثیت صنف سخن کے ایک جداگانہ حیثیت حاصل کرلی تھی - خود مولانا شبلی اسے ان الفاظ میں تسلیم کرتے ہیں (شعرالعجم جلد ۵ صفحہ ۴۳) —

"اس کے (رودکی کے) زمانے میں غزل کی صنف مستقلاً وجود میں آچکی تھی" رودکی سے پہلے کے اشعار اس قدر کم * تعداد میں پائے جاتے ہیں کہ ان سے اس مسئلہ کے حل میں کوئی مدد نہیں ملتی - ان سے قصیدہ کا وجود † بھی اسی قدر ثابت ہوتا ہے جس قدر کہ غزل کا - الغرض ہمارے پاس کوی شہادت اس امر کی نہیں کہ فارسی زبان میں قصیدہ غزل سے پہلے ظہور پذیر ہوا - برخلاف اس کے قدیم ترین زمانے سے ہم دونوں اصناف سخن کو موجود پاتے ہیں - ہاں غزل کی اہمیت بمقابلہ قصیدے کے کچھہ عرصے تک کم ضرور نظر آتی ہے —

یہ سچ ہے کہ قصیدہ و تشبیب دونوں نے عربی میں موجودہ فارسی شاعری کی ابتدا سے بہت پہلے متعدد منازل ترقی و ارتقا طے کر لیے تھے - لیکن اس بات سے ہمیں اس وقت تک کوئی خاص مدد نہیں مل سکتی جب تک کہ ہم یہ نہ تسلیم کریں کہ فارسی شعرا نے جیسے ہی قصیدہ کو عربی سے لیا ویسے ہی انہوں نے یہ بھی طے کرلیا کہ وہ اپنی زبان میں

---

* ہم اس قصیدے کو جو عباس مروزی کی طرف منسوب ہے' قابل قبول نہیں خیال کرتے- پروفیسر براؤن نے اس کی اصلیت پر بجا طور سے شبہ کیا ہے -

† عوفی لباب صفحہ ۲ پر شہید بلخی کے متعلق لکھتا ہے " در قصیدہ میگوید " —

تشبیب کو ایک جداگانہ صنف سخن قرار دیں گے - اس میں کوئی شک نہیں کہ مدت دراز تک قصیدوں کی تشبیبیں اصل غزلوں سے زیادہ عمدہ غزلیں ہوتی تھیں' جس کی وجہ یہ تھی کہ شعرا اپنا سارا زور قلم قصیدوں پر صرف کرتے تھے- مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان ہی تشبیبوں سے غزل پیدا ہوی —

اس سوال کا جواب بھی' کہ آیا غزل بہ حیثیت ایک جداگانہ صنف سخن کے اپنی موجودہ صورت میں شروع ہی سے پیدا ہوئی یا اس نے یہ صورت بتدریج اختیار کی' آسان نہیں - ہمارے پاس مواد اس قدر کم ہے کہ کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرسکتے - مگر آخرالذکر امر زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے - ممکن ہے شروع شروع میں مفرد خیالات مفرد اشعار میں نظم کیے گئے ہوں - اگر یہ خیالات تھوڑے عرصہ کے اندر پیدا ہوے تو انہیں قافیہ کی فراوانی اور اس کے موسیقی اثر کی وجہ سے ہم قافیہ الفاظ اور ایک ہی بحر میں نظم کیا گیا ہو - اس کا نتیجہ ایک ایسی نظم ہوئی ہوگی جس میں چند اشعار بحر و قافیہ کی یکسانی کے رشتہ میں پروئے ہوے ہوں گے اور اس کی صورت مخزن الغرائب کی تحریر کے مطابق غزل کی اس پرانی شکل کی رہی ہوگی کہ جس میں مطلع و مقطع نہ ہوتا تھا - بعد میں قصیدہ کے اثر سے مطلع کا اضافہ کر دیا گیا ہو اور اس کے کچھہ عرصے کے بعد مقطع کا - شعراے آل سامان کی غزلوں میں مطلع و مقطع دونوں نظر آتے ہیں اگرچہ اس عہد میں وہ غالبا غزل کے لازمی اجزا نہیں خیال کیے جاتے تھے —

باب چہارم
(شعرائے آل سامان)
رودکی

جس شاعر کے کلام میں سب سے پہلی مکمل غزل پائی جاتی ہے اور جس سے موجودہ فارسی شاعری کی ابتدا ہوتی ہے، رودکی ہے۔ وہ متفقہ طور پر فارسی زبان کا پہلا بڑا شاعر ہے۔ اس نے سنہ ۹۴۰ ع میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے دس لاکھ سے زیادہ شعر کہے بقول رشیدی (لباب صفحہ ۷) —

شعر او را من شمردم سیزدہ صد سی ہزار
ہم فزون آید اگر چونانکہ باید بشمری

زمانے کے دست تطاول نے ان میں سے صرف چند سو اشعار باقی چھوڑے ہیں، کچھ قصیدوں کے منتخبات، کچھ قطعات رباعیات اور غزلیں۔ بہ حیثیت غزل گو کے اس کی عظمت کا اعتراف عنصری نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ (لباب صفحہ ۶) —

غزل رودکی وار نیکو بود   غزل ہائے من رودکی وار نیست

خوش قسمتی سے رودکی کے کلام میں چند خالص غزلیں پائی جاتی ہیں ورنہ اس عہد میں لفظ غزل جن وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا اس کی بنا پر ہمیں شبہ ہوتا کہ آیا عنصری کا مقصد غزل سے وہی ہے جو اب ہم سمجھتے ہیں یا صرف قصیدے کی تشبیب —

کتب خانہ بادلین میں ایک قلمی نسخہ ہے (اوزلی ایک ۱۲۷) جس میں رودکی کا قریب قریب جملہ موجودہ کلام یک جا کر دیا گیا ہے اور مشکل اشعار کے معنی بھی سہل فارسی میں بیان کئے گئے ہیں۔

نسخے پر کوئی تاریخ ترتیب مندرج نہیں، مگر مقدمے میں حسب ذیل جملہ پایا جاتا ہے " در زمانۂ ما کلیات مرزا صائب مرحوم کہ یک صد هزار وکسرے بالابہت میشود، کس نہ نویسد "- اس سے ظاهر هوتا هے کہ یہ نسخہ صائب کے سال وفات یعنی ۱۰۸۷ کے بعد کا لکھا هوا هے - اس کے علاوہ رودکی کے بہت سے اشعار اُس بےبہا نسخہ یعنی بتخانہ میں پائے جاتے هیں - Ethe نے انہیں دو ذرائع سے رودکی کے موجودہ کلام کا بیشتر حصہ جمع کر کے اپنے مضمون Rudagi der Samanidendichter مطبوعہ Gottinger Nachrich 1873 میں شائع کیا هے - ان صفحات میں همیں اس مضمون کا اکثر حوالہ دینا پڑے گا - مندرجہ بالا منبعوں کے علاوہ هم نے اسدی طوسی کی لغات فرس سے بھی مدد لی هے جو Ethe کے زیر مطالعہ نہ تھی - اس تحقیق و تلاش کا نتیجہ آیندہ صفحات میں پیش کیا جاتا هے —

رودکی کی صرف ایک مکمل غزل هم تک پہنچی هے - اسے هم درج ذیل کرتے هیں* -

زهے فزودہ جمال تو زیب و آرا را — شکستہ سنبل زلف تو مشک سارا را
قسم بران دل آهن خورم کہ از سختی — هزار طرح نہاد است سنگ خارا را
کہ از تو هیچ مروت طمع نمیدارم — کہ کس ندیدہ ز سنگین دلاں مدارا را
تو رودکی بہ غلامی قبول اگر نہ کنی — بہ بندگی نہ پسندد هزار دارا را

---

* اوزلی ایڈ ۲۷. فولیو ۱۲(بی) - مولانا شبلی نے اس غزل کی اصلیت پر، اس کی زبان اور اس میں مقطع کی موجودگی کی وجہ سے شبہ ظاهر کیا هے - جہاں تک زبان کا تعلق هے هم دیکھتے هیں کہ رودکی کے بقیہ کلام کی زبان بھی اسی قسم کی هے - یہی دوسرے سامانی شعرا کے کلام کا حال هے - مقطع بھی اس زمانے کے شعرا کے کلام میں کمیاب نہیں -

اشعار ۲ اور ۳ قطعہ بند ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے اشعار کا استعمال اسی زمانے سے شروع ہوگیا تھا - جملہ خیالات سادہ و سطحی ہیں اور بغیر کسی تصنع کے بیان کر دیے گئے ہیں —

رودکی کی ایک اور غزل حسب ذیل ہے (بتخانہ ' فولیو ۴۹۹ بی) -

اے جان من از آرزوے تو رنجاں بنماے یکے روے و بہ بخشاے برین جان

دشوار نمائی رخ و دشوار دہی بوس آسان بربائی دل و آسان بہ بری جان

نزدیک من آسانی تو باشد دشوار نزدیک تو دشواریء من باشد آسان

خیالات اور طرز ادا کی سادگی کے علاوہ ان اشعار میں کئی اور باتیں قابل توجہ ہیں - ایک تو مطلع کے قوافی کا نقص' دوسرے آخری شعر کی بحر کی نا ہمواری - جملہ اشعار میں تسلسل ہے - چونکہ صرف یہی تین شعر پاے جاتے ہیں اس لیے ہم نہیں کہ سکتے کہ آیا وہ کسی بڑی نظم کا حصہ ہیں یا رودکی نے تین ہی کہے تھے - اگر آخرالذکر صورت ہو تو مقطع کی عدم موجودگی قابل لحاظ ہے —

تیسری غزل یہ (اوزلی ایچ ۱۹۸ فولیو ۱۷۵) —

صرصر ہجر تو اے سرو بلند ریشۂ عمر من از بیخ بکند

پس چرا بستۂ اویم ہمہ عمر گر نہ آں زلف دوتائیست کمند

بہ یکے جان نہ تواں کرد سوال کز لب لعل تو یک بوس بہ چند

بفگند آتش اندر دل حسن انچہ ہجران بود از سینہ فگند

دوسرے شعر کی تشبیہہ قابل لحاظ ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعرا نے جنگی تشبیہات کا استعمال شروع کر دیا تھا - تیسرے شعر میں لطافت خیال پیدا کرنے کی کوشش کا ثبوت ملتا ہے - چوتھے شعر میں تعلق حسن و عشق پر شاعر نے فلسفیانہ نظر ڈالی ہے جو اس ابتدائی دور کے لیے خاص چیز ہے - ان اشعار کے آخر میں بھی مقطع نہیں —

اس کے بعد ان نو اشعار کی باری آتی ہے جو حسب ذیل بحر و قافیہ میں ہیں اور جن کی ترتیب مختلف نسخوں میں مختلف طور پر پائی جاتی ہے —

فغان من همه زان زلف تابدار سیاه   که گاه پردهٔ لاله و گاه معجر ماه

Ethe نے انہیں دو الگ الگ ٹکڑوں میں ترتیب دیا ہے اور دونوں کو غزل کے نام سے موسوم کیا ہے - پہلا ٹکڑا مذکورہ مطلع سے شروع ہوتا ہے اور اس میں چھ شعر ہیں - یہ چھ شعر نسخہ اوزلی ایڈ ۱۲۷ اور دوسرے نسخوں میں بھی پائے جاتے ہیں - یہ اشعار دیوان قطران برٹش میوزیم کے نسخہ (OR 3317) میں ملے اس لیے ہم ان سے قطع نظر کرتے ہیں - ایسا کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے ' یعنی اگر بالفرض انہیں رودکی ہی کا کلام تسلیم کیا جائے پھر بھی بھی وہ صاف طور سے کسی قصیدے کے اشعار ہیں جن کا یہاں ذکر غیر متعلق ہے - اس بحر کے بقیہ اشعار کسی اور شاعر کے کلام میں نظر نہیں آئے اور وہ "صورت و سیرت" میں بدیہی طور پر کسی غزل کے معلوم ہوتے ہیں - انہیں ہم درج ذیل کرتے ہیں - (اوزلی ایڈ فولیوہ ۱۵ اے) -

سماع و بادهٔ رنگین و ساقیان چون ماه   اگر فرشته ببیند همی رود از راه

نظر چگونه بدوزم که بهر دیدن دوست   ز خاک من همه نرگس دمد بجای گیاه

کسے که آگهی از ذوق عشق جانان یافت   ز خویش حیف، بود گر دمے بود آگاه

یہ اشعار بلحاظ خیال و بیان گزشتہ اشعار سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہیں اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس عہد کے معلوم ہی نہیں ہوتے —

آخری شعر صوفیانہ انداز میں ہے اور اگر وہ واقعی رودکی ہی کا کہا ہوا ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تصوف اس ابتدائی زمانے میں بھی غزل میں داخل ہونا شروع ہوگیا تھا —

ان کے بعد وہ پانچ اشعار ہیں جن کا پہلا شعر

شاہ زی باسپاہ چشمان شاد کہ جہاں نیست جز فسانہ و باد

ہے اور آخری

باد و ابر است این جہاں افسوس بادہ پیش آر ہر چہ باد اباد

Ethe نے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ کو "شادزی باسیاہ چشمان شاد" لکھا ہے اور ان جملہ اشعار کو غزل کے نام سے موسوم کیا ہے، مگر عوفی نے شاد کی جگہ شاہ لکھا ہے اور "در قصیدہ میگوید" لکھ کر یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ قصیدے کے اشعار ہیں - عوفی کو قدامت کا فخر حاصل ہے اس لیے ہمیں مجبوراً اس کے قول کو Ethe کی رائے پر ترجیح دے کر ان اشعار سے قطع نظر کرنا پڑتا ہے - بہرحال ان میں ایک بات قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ فارسی شاعری میں 'ابو نواس' کا فلسفہ اسی عہد سے داخل ہونا شروع ہوتا ہے جس سے بعد میں خواجہ حافظ نے گنبد افلاک میں غلغلہ پیدا کردیا - رودکی کے نام سے ایک اور غزل منسوب کی جاتی ہے جس کا مطلع یہ ہے —

یک بار بود عید بہر سال بہ یک بار ہموارہ مرا عید ز دیدار تو ہموار

یہ غزل کلام رودکی کے مذکورہ بالا نسخے میں مندرج ہے اور Ethe حسب معمول اسے بغیر چوں و چرا رودکی کا کلام سمجھتا ہے - لیکن یہ غزل لفظ بلفظ دیوان امامی کے نسخہ برٹش میوزیم (OR 3713. fol. 79 b) میں موجود ہے اس لیے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں —

مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ رودکی کے چند ایسے متفرق اشعار بھی پائے جاتے ہیں جو صاف کسی غزل کے معلوم ہوتے ہیں - انہیں ہم درج ذیل کرتے ہیں —

۱ - کار بوسہ چو آب خوردن شور
چوں خوری بیش تشنہ تر گردی *

تشبیہہ کی سادگی اور آخری ادوار کے معیار نفاست کے مطابق اس کی ناخوش گواری قابل لحاظ ہے —

۲ - ملم خوکردہ بربوسش چناں چوں بازبر بستہ
چناں بانگ آرم از بوسش چناں چوں بشکنی پستہ †

اس شعر میں خیال اور تشبیہ کی "دھقانیت" اور زیادہ پائی جاتی ہے - زبان بھی ثقیل ہے اور غزل کے لیے قطعاً ناموزوں —

۳ - ناز اگر خوب را سزا ست بہ شرط
نہ سزد جز ترا کرشمہ و ناز ‡

رودکی کی غزل گوئی کے متعلق جو کچھہ سرمایہ اس وقت تک ہمارے پاس ہے وہ پیش کیا جاچکا - فارسی شاعری کے اس ابوالآبا کا ذکر چھوڑنے سے پہلے ہم اس کی تغزل سے لبریز تشبیبوں کی ایک مثال پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتے (بت خانہ فولیو ۳۳۰) —

بخندد لالہ بر صحرا بسان چہرۂ لیلی
بگرید ابر بر گردوں بسان دیدۂ مجنوں
ز آب جوے ہر ساعت ہمی بوے گلاب آید
درو شست است پنداری نگار من رخ گلگوں

---

* اوزلی ایڈ ۱۲۷ میں بجاے "چوں خوری بیش" کے "بخوری بیش" تحریر ہے - اول الذکر ریاض الشعرا کے مطابق ہے اور چونکہ اس سے زیادہ اچھے معنی نکلتے تھے اس لیے ہم نے اسے ترجیح دی -

† لغات فرس صفحہ ۳۸ -

‡ لغات فرس صفحہ ۹۲ -

اگر یک زلف بفشاند ازاو صد دل رہا گردد

اگر یک چشم بگمارد دو صد دل را کند پر خون

ظاہر ہے کہ ان غزل نما تشبیبوں سے، خصوصاً جب وہ رودکی جیسے مسلم الثبوت استاد کی کہی ہوی ہوں، غزل کی نشو و نما میں کس قدر مدد ملی ہوگی —

ابوشعیب

رودکی کے بعد جس شاعر کی غزل ہم تک پہنچی ہے وہ ابوشعیب بن محمد ہروی ہے - عوفی نے تو اسے رودکی سے بھی پہلے کا شاعر قرار دیا ہے مگر مجمع الفصحا کے مطابق وہ رودکی کے آخری زمانے کے شاعروں میں ہے * اور ہم اسی کو زیادہ قرین قیاس سمجھتے ہیں - عوفی نے ابوشعیب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے (صفحہ ۵)

"شعر ابو شعیب لطیف و بے بدل و ذات او نادرہ غیب" - اس کے بعد لکھتا ہے "در حق ترسا بچۂ میگوید - غزل" اور حسب ذیل پانچ شعر درج کیے ہیں —

دوزخی کیشی بہشتی روے وقد	آہو چشمی حلقہ زلفی لالہ خد
لب چنان کز خامۂ نقاش چین	بر چکد از سیم بر شنگرف مد
گر بہ بخشد حسن خود بر زنگیان	ترک را بہشک ز زنگ آید حسد
بہلیہ آں تارک † ابریشمین	بستہ بر تارے ز ابریشم عقد
از فرو سو گلبج و از بر سو بہشت	سوزنے سیمین میان ہر دو حد

* آخر زمان رودکی را دریافتہ - صفحہ ٦٦ -

† براون نے " نازک " لکھا ہے - " تارک " مجمع الفصحا کے مطابق ہے اور چونکہ اس سے مقابلتاً بہتر معنی نکلتے تھے اس لیے ہم نے اسے اختیار کیا -

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے بیان میں جدت اور مبالغہ سے کلام لینے کی کوشش کی ہے مگر پھر بھی خیالات سادہ وسطحی رہ جاتے ہیں اور متاخرین کے معیار کے مطابق طفلانہ —

جوئبار ی

یہ بھی عہد آل سامان کا شاعر ہے - عوفی اس کے متعلق لکھتا ہے (صفحہ ۱۱) "شاعرے کامل واین غزل کہ از کعب غزل شیرین تر است از گفتہ ہاے او شنیدہ آمدہ" اس کے بعد حسب ذیل غزل درج کرتا ہے -

به ابر پنهاں کرد آفتاب تاباں را　　بر سبزه بنهفت ان برگ لاله * خنداں را

به سوے هر دو مهش بر دو †شاخ ریحاں بود　　بشاخ مورو لے پوست شاخ ریحاں را

بتے که خسته دلاں را بدرد درمانست　　دریغ دارد ازیں درد دیده درماں را

به ابر نیساں مانم کنوں من از غم او　　سزد که صفعت خوبست ابر نیساں را

به یک گذر که سحر گاه در گلستاں کرد　　بهشت کرد سراسر همه گلستاں را

اس غزل میں بھی حسب معمول خیالات صاف و سادہ ہیں - پہلے دو شعروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب صنف قوی کا فرد ہے - پہلے اور چوتھے میں بحر کی ناہمواری بھی قابل توجہ ہے —

ابوالمؤید بلخی کے دو شعر محبوب کی انگلیوں کی تعریف میں ہیں جنھیں عوفی نے غزل کے نام سے موسوم کیا ہے - وہ اشعار اور عوفی کی عبارت درج ذیل ہے (لباب صفحہ ۲۶) —

"در صفت انگشت معشوقہ می گوید - غزل

---

* براون نے لالہ برگ لکھا ہے مگر میرے خیال میں برگ لالہ ہونا چاہیے -

† براون نے "برد و شاخ" لکھا ہے مگر چونکہ اس سے معنی صاف نہ نکلتے تھے اس لیے میں نے اسے "بردو شاخ" پڑھا -

انگشت را بہ خون دل من کند خضاب کفے کز و بلائے تن و جان هر کس است
عناب و سیم اگو نبود هاں روا بود عنایت بر سبهکۂ سیمین او بس است

اسی طرح یہ دو شعر ابوشکور بلخی * کے بھی ھیں جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بہ آسانی کسی غزل کے هوسکتے هیں (لباب صفحہ ۲۱) —

از دور بدیدار تو اندر نگریستم مجروح شد آن چهرهٔ پر حسن و ملاحت
وز غمزهٔ تو خسته شد آزردہ دل من وین حکم قضادیست جراحت بہ جراحت

ان اشعار سے مضمون میں جدت و لطافت پیدا کرنے کی کوشش صاف ٹپکتی ہے —

خسروانی

خسروانی بھی آل سامان کے بڑے شاعروں میں گذرا ہے - صاحب مجمع الفصحا اس کے متعلق یوں رقمطراز ہے (صفحہ ۱۹۹) "از استادان ایام سلف است واز شعرائے آل سامان - فردوسی شعرے ازاو تضمین کردہ" اس کے بعد سات شعر دیتا ہے جن میں مقطع تو ہے مگر مطلع نہیں ' جو ایک غیر معمولی بات ہے - هر شعر اپنی جگہ پر مکمل ہے اور صاف غزل کا معلوم هوتا ہے - ممکن ہے مطلع کسی وجہ سے نقل نہ کیا گیا هو - لیکن اگر یہ بات نہیں اور خسروانی نے اس غزل میں صرف یہی سات شعر کہے تھے تو ان سے بھی اس امر کا مزید ثبوت ملتا ہے کہ اس زمانے میں مطلع و مقطع غزل کے لازمی اجزا خیال نہیں کیے جاتے تھے - وہ اشعار حسب ذیل هیں † —

---

* مجمع الفصحا نے ابوشکور کو رودکی کے آگے کا شاعر قرار دیا ھے مگر عوفی کی رائے اس کے خلاف ھے اور زیادہ وقیع -

† خلاصة الافکار نے صرف شروع کے تین شعر لکھ کے انہیں قصیدے سے منتخب بتایا ھے مگر اشعار کی نوعیت اور مقطع کی موجودگی اس امر کی تائید نہیں کرتی -

فغاں زاں درنگت بہ ہنگام صلح فغاں زاں شتابت بہ ہنگام جنگ
در نگم بہ راحت ہمہ زاں شتاب شتابم بمردن ہمہ زاں درنگ
نہنگے ست ہجران و دریاست عشق بہ دریا بود جاودانہ نہنگ
رخت دید نتوانم از آب چشم سخن گفت نتوانم از بس غرنگ
رخ تست خورشید و خورشید خاک لب تست یاقوت و یاقوت سنگ
نہ چون خسروانی نہ چون تو بتا بت و برہمن ویک و مشکوے و گنگ

پہلے دو شعر قطعہ بند ہیں - تیسرے سے جدت تشبیہ پیدا کرنے کی کوشش ظاہر ہے - آخری شعر فخریہ انداز میں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خسروانی اپنے عہد کے بڑے شاعروں میں ضرور رہا ہوگا —

دقیقی

قدامت کے لحاظ سے رودکی کے بعد فارسی کا دوسرا بڑا شاعر دقیقی ہے - اس کی اہمیت بالخصوص اس وجہ سے ہے کہ اسی نے شاہنامہ کی بنیاد ڈالی اور اس کی شاعرانہ عظمت کے سب قائل ہیں - اس بات کا ثبوت، کہ دقیقی نے ایک دیوان چھوڑا تھا، اس امر سے ملتا ہے کہ قطران ناصر خسرو سے اس کا سبق لیتا تھا * - اس کی چند غزلوں سے جو اب تک پائی جاتی ہیں اور نیز اس امر سے کہ وہ عشق و عاشقی کا دلدادہ کیا جاندادہ تھا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دیوان میں بہت سی اور غزلیں بھی رہی ہونگی - بد قسمتی سے اس کتاب کا اب پتہ نہیں چلتا - اگر کبھی مل گئی تو اس عہد کی غزل گوئی پر غالباً اس سے قابل قدر روشنی پڑے گی - دقیقی کی چند غزلیں جو مختلف تذکروں میں پائی جاتی ہیں درج ذیل کی جاتی ہیں —

* ملاحظہ ہو سفر نامہ ناصر خسرو (پیرس ایڈیشن) صفحہ ۸ -

پہلی غزل (آتشکدہ - صفحہ ۱۹۴ بی)

در افگند اے صنم ابر بہشتی جہاں را خلعت اردی بہشتی
بدان ماند کہ گوئی از مے و مشک مثال دوست بر صحرا نوشتی
ز گل بوے گلاب آید بدینساں کہ پنداری گل اندر گل سرشتی
دقیقی چار خصلت برگزیدست جہاں را از ہمہ خوبی و زشتی
لب یاقوت رنگ و نالہ چنگ مے خوں رنگ و دین زر دہشتی

دوسرے شعر کی لطافت تشبیہہ قابل داد ہے - ایک بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ تخلص بجاے آخری شعر کے اس سے پہلے کے شعر میں پایا جاتا ہے —

دوسری غزل (لباب - صفحہ ۱۲)

کاشکے اندر جہاں شب نیستے یا* مرا ہجران آن لب نیستے
زخم عقرب نیستے بر جان من گر ورا زلف معقرب نیستے
ور نبودے کوکبش در زیر لب مونسم تا روز کوکب نیستے
ور مرکب نیستے از نیکوئی جانم از عشقش مرکب نیستے
ور مرا بے یار باید زیستن زندگانی کاش یارب نیستے

اس غزل میں ہم آہنگی و تسلسل مضامین قابل توجہ ہے - دقیقی کی زندگی کے حالات اور اس غزل کے انداز بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ غالباً وہ اپنے ذاتی جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے - اس امر کا ثبوت اس کی مندرجہ ذیل غزل سے جو آخری غزل ہے زیادہ پر زور طریقے سے ملتا ہے (لباب صفحہ ۱۲ - ۳) -

* لباب میں بجاے "یا" کے "تا" ہے - مگر چونکہ اول الذکر سے زیادہ اچھے معنی نکلتے تھے اس لیے ہم نے اسے اختیار کیا —

اے ابر بہملی نہ بچشم من اندری | دم زن زمانکے و بر آمدے کم گری
این روز و شب گریستن زار بہر چیست | نے چون ملی غریب و غم عشق برسری
دردا جدا بماندم و در غم ز عشق یار | من زین تونگرم که مباد این تونگری
یارے گزیدم از ہمہ خلقاں پری نژاد | زاں شد ز پیش چشم من امروز چون پری
لشکر برفت و آں بت لشکر شکن برفت | ہرگز مبادکس کہ دہد دل بہ لشکری

آخری شعر سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ معشوق صنف قوی کا رکن ہے اور سپاہی بچہ —

دقیقی کی غزلیں اس کے پہلے کے شعرا کی غزلوں سے کہیں زیادہ بلند مرتبہ ہیں - ان میں مقابلتاً اظہار جذبات زیادہ ہے ' خیالات میں زیادہ لطافت ہے اور انداز بیان میں زیادہ نفاست —

عمارہ

عہد آل سامان کا آخری شاعر جس نے غالباً غزلیں کہی تھیں اور جو اس عہد کو عہد غزنویہ سے ملاتا ہے ' عمارہ ہے - ہمیں اس کی کوئی غزل نہیں ملی مگر بہارستان میں مولانا جامی کے یہ الفاظ اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ضرور غزل کہتا تھا - "در مقالات شیخ ابو سعید ابوالخیر مذکور است کہ روزے قوال در پیش ایشان این بیت بخواند —

اندر غزل خویش نہاں خواہم گشتن

تا بر لب تو بوسہ زنم چونش بخوانی

شیخ را وقت خوش آمد - پرسید کہ این شعر کیست - گفتند عمارہ"

اس شعر میں خود ندرت و لطافت ہے - اس کی خوبی اور نیز یہ امر کہ قوال اسے شیخ ابوسعید کے سامنے گا رہا تھا اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ عمارہ اپنے زمانے کا مقبول عام شاعر تھا اور غزلیں محفل سماع

میں گائی جانے لگی تھیں - عوفی نے اس کی شاعرانہ عظمت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے (لباب - صفحہ ۲۴) "شعراے عصر آخر او را مقتداے خود دانستند" - اب ہم عہد آل سبکتگین میں قدم رکھتے ہیں جہاں ہم اپنے کو پہلے کی طرح نادر ہوا نہیں پاتے اور جہاں ہمیں اپنے موضوع کے متعلق مقابلتاً بہت کافی ذخیرہ ملتا ہے —

باب پنجم

(شعراے آل سبکتگین *)

فردوسی سنہ ۱۰۲۵ ع

فردوسی نہ محض فارسی کے عظیم ترین شاعروں میں ہے بلکہ دنیا کے عظیم ترین شاعروں کی صف اول میں اس کی جگہ ہے - اسے حسن و عشق کے موضوع سے جو قدرتی لگاؤ تھا اس کا ثبوت شاہنامے کے ان حصوں سے ملتا ہے جن میں اس نے یہ دلچسپ داستان چھیڑی ہے، مثلاً زال و رودابہ اور بیژن و منیژہ کے قصے - اِس کے علاوہ اس نے اس موضوع پر ایک مستقل مثنوی 'یوسف و زلیخا' بھی تصنیف کی، اس سے اور نیز اس امر سے کہ اس کی ایک آدھ غزلیں اب بھی پائی جاتی ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے غالباً کافی تعداد میں غزلیں کہی ہوں گی، اس کی ایک غزل نمونتاً درج ذیل کی جاتی ہے † —

---

* ان ابواب میں شعرا کا ذکر تاریخ وفات کی قدامت کے لحاظ سے کیا جاے گا -

† تاریخ گزیدہ اور مخزن‌الغرائب میں مندرج ہے، براؤن نے اسے J. R. A. S. بابت جنوری سنہ ۱۹۰۱ ع کے صفحہ ۸ پر شائع کیا، مخزن‌الغرائب میں فردوسی کی ایک اور غزل کے چند اشعار اس بحر میں پاے جاتے ہیں -

اگر بدکنی کیفرش خود بری   نہ چشم زمانہ بخواب اندرست

شبے در برت گر بہ آسودمے　　سر از فخر بر آسماں سودمے
قلم در کف تیر بشکستمے　　کلاہ از سر مہر بر بودمے
بقدر از نہم چرخ بگذشتمے　　بہ پے فرق کیواں بفرسودمے
جمال تو گر زانکہ من دارمے　　بجائے تو گر زانکہ من بودمے *
بہ بیچارگان رحمت آوردمے　　بہ درماندگان بر بہ بخشودمے

اس غزل میں دو باتیں قابل لحاظ ھیں ' ایک تو اس کا تسلسل' دوسرے آخری شعر کے آخری مصرعے کی زبان - زائد ' بر ' کا استعمال مثنوی میں تو جائز ھے مگر غزل کے لیے نازیبا ھے - اس کی موجودگی فردوسی کی مثنوی نویسی کی عادت کے علاوہ اس وجہ سے بھی ھے کہ اس ابتدائی عہد میں غزل کی مناسب زبان پیدا نہیں ھوئی تھی لہذا اس قسم کی خامیاں ان ابتدائی عہدوں میں کمیاب نہیں -

فرخی

فرخی کے دیوان کے دو قلمی نسخے برٹش میوزیم میں موجود ھیں † دونوں طبع ھوچکے ھیں - اول الذکر کو محمد مہدی بن مصطفی مخلص طہرانی نے شائع کیا اور آخرالذکر کو رضا قلی خاں ھدایت نے - رضا قلی خاں کتاب کے مقدمے میں لکھتا ھے :

" دو دیوان اشعار اورا بدست آوردہ یکے سہ ھزار بیت
و یکے نُہ ھزار بیت - لیکن درست تمام او خواندہ نمی شد ' لہذا
قریب دو ھزار و پانصد بیت از آنہا انتخاب کردہ نوشتہ شد "

رضا قلی خاں کا نسخہ مخلص کے نسخے سے زیادہ مفصل ھے - اس

---

* یہ مصرع تاریخ گزیدہ کے نسخہ بادلین (Ch : 8) میں نہیں پایا جاتا -

† نمبر ۲۰۳ و ۲۰۴ -

میں چھ غزلیں هیں اور مخلص کے نسخے میں تین - اس بات کا ثبوت که فرخی نے چھ سے زیادہ غزلیں کہی تھیں رضا قلی خاں کے مندرجه بالا بیان کے علاوہ حسب ذیل امور سے بھی ملتا هے - اگرچه مخلص کے نسخے میں صرف تین هی غزلیں هیں مگر پھر بھی ان میں سے دو رضا قلی خاں کے نسخے میں نهیں پائی جاتیں - ایک غزل لباب میں موجود هے جو مذکورہ بالا نسخوں میں نهیں - یهی حال ان متفرق اشعار کا هے جو مختلف تذکروں میں پائے جاتے هیں اور جو بظاهر غزل کے معلوم هوتے هیں -

فرخی کی شاعرانه عظمت سب تسلیم کرتے هیں ۔ وہ عظیم ترین قصیدہ گویوں میں هے اور اس کے قصیدوں میں اپنے جمله هم عصروں سے زیادہ تغزل پایا جاتا هے - صاحب مجمع الفصحا رقمطراز هے (صفحه ۴۳۹)

"الحاصل حکیم فرخی را در شاعری طرزے مرغوب است و تغزلات شیریں عاشقانه مسرت انگیز دارد - سخن وے سهل ممتنع است" —

اس امر کا سب سے بڑا ثبوت که فرخی کے تغزل کے اس کے همعصر بھی قائل تھے عنصری کے اس شعر سے ملتا هے* —

خارج شود ز نعت خطت طبع عنصری

عاجز شود ز وصف لبت و هم فرخی

عنصری نه محض فرخی کے عظیم ترین همعصروں میں تھا بلکه دربار محمودی کا ملک الشعرا بھی تھا - فرخی بھی اسی دربار کا شاعر تھا اس لیے جذبۂ رقابت و خوف مسابقت قدرتی امر تھا - ایسی حالت

* دیوان عنصری ایلیٹ ۱۱۴ - دیوان کے دوسرے نسخے (۱۳۷۹۷ - سی - ۸) میں یه شعر یوں هے

خارج شود ز نعت لبت طبع عنصری   عاجز شود ز وصف خطت و هم فرخی

میں عنصری کا اپنے قصیدے میں فرخی کے کمال تغزل کا اعتراف کرنا اس کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت ہے -

فرخی پر رنگ تغزل اس قدر غالب ہے کہ اس کے قصائد در حقیقت طویل غزلیں ہوتی ہیں - اس کی تشبیبیں اتنی لطیف ہیں کہ ان میں سے ایک کا یہاں مثالاً نقل کرنا بے موقع نہ ہوگا -

خوشا عاشقی خاصہ وقت جوانی　　خوشا با پری چہرگان کامرانی
خوشا با رفیقان یکدل نشستن　　بہم نوش کردن مے ارغوانی
بوقت جوانی بکن عیش زیرا　　کہ ہنگام پیری بود ناتوانی
جوانی و از عشق پرہیز کردن　　چہ باشد نہ دانی بجز جانگرانی
جوانے کہ پیوستہ عاشق نہ باشد　　دریغ است از روزگار جوانی
در شادمانی بود عشق خوباں　　بباید کشادن در شادمانی
در شادمانی کشا دست بر تو　　کہ خدمت گر شہریار جہانی

ان اشعار اور گریز کی تعریف محتاج بیان نہیں —

فرخی کے کلام میں ہمیں خوش قسمتی سے ایک ایسی مثال ملی جو اس کے میلان تغزل اور اس اہمیت کو جو غزل نے اس زمانے میں حاصل کرلی تھی، نہایت خوبی سے ظاہر کرتی ہے - اپنے ایک قصیدے میں کہتا ہے —

خوش بگوش آید شعر یکہ در ان شعر بود　　مدحت خسروے با نعت رخے ہم چو قمر
مطربا آن غزل نغز و دلاویز بیار　　ورنہ دانی بشلو تا غزلے گویم زر
اے در یغا دل من کاں صنم سیمیں بر　　دل من برد و مرا از دل او نیست خبر
او دلے داشت گرامی ولے دیگر یافت　　کاش کے من دلکے یافتمے نیز دگر
دل فروشان خراساں را بازار کجاست　　تا دلے یابم از یشاں چو دل خویش مگر

اندریں شہر کسے را دل افزونی نیست ور بود ونیز همانا نه فروشند به زر
هرکه او نزد بتاں گشت چو من بیدل شد حال ازینگونه است اینجا حذر اے قوم حذر

ان اشعا کے بعد اصل قصیدہ پھر شروع ہوتا ہے - اوپر کی مثال میں حسب ذیل امور قابل توجہ ہیں —

(الف) قصیدہ کی ابتدا اس غزل سے نہیں ہوتی اس لیے اس پر تشبیب کا گماں نہیں کیا جاسکتا —

(ب) اسے خود شاعر نے غزل کے نام سے موسوم کیا ہے اور اس کی ابتدا مطلع سے ہوتی ہے - چونکہ یہ وسط قصیدہ میں واقع ہے اس لیے مطلع کا اس جگہ ہونا اس غزل کو قصیدے سے الگ کر دیتا ہے اور اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ اس زمانے میں غزل نے جداگانہ صنف سخن کی صورت اختیار کرلی تھی اور مطلع جزو غزل سمجھا جانے لگا تھا —

(ج) غزل مسلسل ہے —

فرخی کی مطبوعہ غزلوں کی تعداد نو ہے - اس مقالے کے حدود اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم ان سب سے بحث کریں ' اس لیے ہم ایک مکمل غزل اور ایک کا انتخاب پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں —

غزل

اے دوستی نمودہ وپیوستہ دشمنی در شرط من نبود که با من تو ایں کنی
دل پیش من نهادہ بتردوئی مرا آگه نبودہ ام که همی دانه افگنی
پنداشتم همی که دل از دوستی دهی بر تو گماں که برد که تو دشمن منی
دادن دل توازپئے آں بود تا مرا اندر فریبی و دل از جاے بر کنی
کشتی مرا بدوستی و کس نه کشته بود زیں زار تر کسے را هرگز به دشمنی

بستی بہ مہربا دل من چند بار عہد　ازچون توے سزد کہ کنوں عہد بشکنی

یہ غزل بھی مثل فرخی کی اور غزلوں کے مسلسل ھے - اس میں جس قسم کے جذبات کا اظہار ھے ان کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں مگر وہ متاخرین کے معیار عشق و محبت کے منافی ھیں اور اس لیے ان کے کلام میں مفقود - یہ بات فرخی کی اور غزلوں میں بھی ھے - حسب ذیل اشعار سے جو اس کی ایک دوسری غزل سے منتخب کیے گئے ھیں ' اس امر کا مزید ثبوت ملتا ھے —

کوے تو جایگاہ فتنہ شدہ است　　بر . ر کوے تو قدم نہ نہم

دوستاں از فراق تو خوں دل　　من ھمی از وصال تو خرم

فرخی حیلۂ بباید کرد　　تا از اں شوخ سنگ دل بر ھم

ان اشعار میں جو خیالات ادا کیے گئے ھیں وہ متاخرین کے مذھب عشق میں کفر ھیں - ان کے نزدیک عاشق صادق ھمیشہ ناکام نامراد رھتا ھے - شاد کامی و خوش بختی ھمیشہ رقیب روسیاہ کا حصہ سمجھی جاتی ھے - باوجود معشوق کی انتہائی جفا کاریوں کے عاشق ناکام راہ وفا سے منہ نہیں موڑتا بلکہ " سرور تپ غم " بیان کرنے کے لیے " ھر موے بدن زبان سپاس " بن جاتا ھے - اس کی زبان سے معاذاللہ نکل سکتا ھے " فرخی حیلۂ بباید کرد " - ان اشعار میں جن جذبات کا ذکر کیا گیا ھے وہ متاخرین کے معیار سے گرے ھوے سہی مگر وہ اس بات کو ثابت کرتے ھیں کہ شعرا اس عہد میں جو خود محسوس کرتے تھے اسے اپنے اشعار میں بیان کرتے تھے اور متاخرین ایک خیالی و رسمی دنیا میں رھتے تھے جسے اصلیت سے بہت کم کم سروکار تھا - ان اشعار میں دو باتیں اور قابل توجہ ھیں (الف) ان

اشعار میں تسلسل نہیں بلکہ یک گونہ تضاد پایا جاتا ہے - اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ مسلسل غزلیں اس زمانے میں زیادہ رائج تھیں تاہم غیر مسلسل غزلیں بھی کہی جاتی تھیں —

(ب) آخر شعر میں تخلص پایا جاتا ہے - یہ بات فرخی کی اور غزلوں میں بھی پائی جاتی ہے - یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ مقطع کا استعمال عام ہونا شروع ہوگیا تھا —

فرخی کی رباعیاں بھی تغزل سے لبریز ہوتی ہیں - ہم ان میں سے دو نمونتاً درج ذیل کرتے ہیں * —

گویند کہ معشوق تو زشت ست و سیاہ
گر زشت و سیاہ ست مرانیست گناہ
من عاشقم و دل بر او گشتہ تباہ
عاشق نشود ز عیب معشوق آگاہ

تا در طلب دوست ہمی بشتابم عمرم بکراں رسید و من در خوابم
گیرم کہ وصال دوست درخواہم یافت این عمر گذشتہ را کجا دریابم

کسائی

کسائی بھی اس عہد کے بڑے شاعروں میں گذرا ہے - اس نے بھی کچھہ غزلیں ضرور کہی تھیں - عوفی نے کسائی کو بڑی اہمیت دی ہے اور اپنی کتاب کے پانچ صفحوں میں اس کا ذکر کیا ہے - صاحب چہار مقالہ بھی اس کا شمار ان شاعروں میں کرتا ہے جن کی وجہ سے ان کے ممدوح کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا - ناصر خسرو جیسا عظیم المرتبت شخص بھی اپنے کلام

---

* ریاض صفحہ ۲۵۴ -

میں اس کا بار بار حوالہ دیتا ہے * —

بد قسمتی سے کسائی کا کلام زیادہ نہیں پایا جاتا - حسب ذیل غزل اس تغزل کا عمدہ نمونہ ہے † —

اے زعکس رخ تو آئینہ ماہ	شاہ حسلی و عاشقانت سپاہ
ہر کجا بنگری دمد نرگس	ہر کجا بگذری بر آید ماہ
روے و موے تو نامۂ خوبیست	چہ بود نامہ جز سفید و سیاہ
بلب و چشم راحتی و بلا	بہ رخ و زلف توبہ و گناہ
دست ظالم ز سیم کوتہ بہ	اے بہ رخ سیم زلف کن کوتاہ

مطلع کے دوسرے مصرعے میں کی تشبیہ جنگی زندگی کے اثر کو ظاہر کرتی ہے - اس کی مثالیں بعد میں بکثرت ملیں گی - تشبیہ و طرز ادا

---

* Ethe کے نزدیک یہ حوالہ جات کسائی کی تضحیک کی غرض سے ہیں اور وہ انہیں جذبہ رشک اور اختلاف عقائد کا نتیجہ خیال کرتا ہے - براؤن کی راے بجا طور پر اس کے خلاف ہے کیونکہ یہ حوالہ جات در حقیقت توصیفی ہیں - مگر عجیب بات یہ ہے کہ براؤن انہیں توصیفی خیال کرنے کے باوجود کسائی کے ساتھہ ناصر خسرو کے اختلاف کے وجوہ بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ دکھانا چاہتا ہے کہ وہ Ethe کے بتائے ہوے وجوہ سے مختلف تھے - ہمارے نزدیک ناصر خسرو نے کسائی کا بار بار حوالہ اس وجہ سے نہیں دیا کہ اسے اس کے ساتھہ کوئی عناد تھا بلکہ اس وجہ سے کہ دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں - عوفی کسائی کے متعلق لکھتا ہے " اکثر اشعار او در زهد و عظاست " اور یہی خصوصیت ناصر خسرو کے کلام کی بھی ہے - ذیل کے اشعار متذکرہ بالا حوالہ جات کی عمدہ مثال ہیں (از ہت خانہ) -

سوے شعر حجت در آ اے پسر	(حجت ناصر خسرو کا تخلص تھا)
اگر هیچ در خاطر تو رضا ست
کہ دیباے رومی ست اشعار من
اگر شعر فاضل کسائی کسا ست

† لباب صفحہ ۳۷ - عوفی حسب دستور اسے شعر کہتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ خالص غزل ہے -

میں لطافت پیدا کرنے کی کوشش ان اشعار سے ظاہر ہے اگرچہ خیالات ابھی تک سطحی ہیں —

بو علی سینا سنه ۱۰۳۷

حکیم اعظم بوعلی سینا کی بھی دو غزلیں ہمیں ملیں - ظاہر ہے کہ حکیم موصوف نے صرف یہی دو غزلیں نہ کہی ہوں گی - بو علی سینا جیسی عظیم المرتبت ہستی کی غزل سرائی کی وجہ سے اس صنف سخن کو جو اہمیت حاصل ہوئی ہوگی وہ محتاج بیان نہیں - Ethe نے انہیں Gottinger Nachrichten (1875) میں شائع کیا ہے - پہلی غزل کے بجائے گیارہ شعروں کے Ethe نے صرف سات شعر دیے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے زیر مطالعہ صرف نسخہ ایلیٹ ۲۹۴ تھا - نسخہ اوزلی ایق ۶۹ میں تین شعر اور مندرج ہیں - آتشکدہ میں ایک اور شعر ہے - مکمل غزل حسب ذیل ہے —

فدای روح بود بادۂ رحیق الحق * — کہ رنگ او کند از دور رنگ گل را فق†
بہ طعم تلخ چو پند پدر ولیک مفید — بہ نزد مبطل باطل بہ نزد دانا حق
سہیل ‡ بالش و خورشید فرو مہ طلعت — بہ بوز عنبر و مشک و گلاب بردہ سبق
حلال بر عقلا و حرام بر جہال — کہ مے محک بود و خیر و شر ازو مشتق
حلال گشتہ بہ احکام عقل بر دانا — حرام گشتہ بہ فتوای شرع بر احمق
شراب را چہ گنہ زانکہ ابلہے بخورد — بہ سوی تیرہ برد دست یا سوی حق
§ چو در چکد زدہان ظروف در کاسہ — زلحن بالبدی خوشترا ست آن لق لق

* الحق - ایلیٹ ۲۹۴ صفحہ ۹۸ - نے اس کی تقلید کی ہے -
† کہ بکند دور رنگ گل راشق - ایضاً
‡ صرف اوزلی ایق ۶۹ صفحہ ۲۹۵ میں -
§ ایضاً

*غلام آں مے تابم کہ از رخ خوباں — بہ یک دوکاسہ بگیرد ہزار گونہ عرق
مے از جہالت جہال شد بہ شرع حرام — چو ماہ کز سبب ملکران دیں شد شق
†بدار خدائے کہ جزوےدگرخدائے نیست — کہ مے چوں مے خورم اجزاے من بگیرد حق
چو بو علی مئے صاف‡ارخوری حکیمانہ — بحق حق کہ وجودت شود بہ حق ملحق$

اس غزل میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں ایک تو مطلع و مقطع دونوں کی موجودگی، دوسرے تسلسل - شعر نمبر ۸ کی لطافت قابل داد ہے -

دوسری غزل چھے شعر کی ہے - یہ بھی مسلسل ہے - اس میں مطلع ہے مگر مقطع نہیں - غزل بحیثیت مجموعی خشک ہے اور اخلاقی مضامین سے مملو - ہم اسے درج ذیل کرتے ہیں (ایلیٹ ۲۹۲ - فولیو ۱۶۳ بی) —

حرامست دہ چیز بر رادمرد — کزاں شش بود مرد آزادہ فرد
حسد بردن و سفلگی و دروغ — نمودن نیاز و ضعیفی و درد
چو نعمت بود دست بر دوستاں — بباید کشودن بداد و بخورد
چو شدت بود راز پیدا مکن — بہل تا شود رویت از درد زرد
سوالے نیرزد سراسر جہاں — چہ فرجام باشد یکے آہ سرد
اجل نرد باز ست و ما مہرہ ایم — فلک کعبتین و جہاں تخت نرد

غضائری سنہ ۱۰۳۵

غضائری بھی اس عہد کے بڑے شاعروں میں ہے - وہ عنصری کا زبردست مد مقابل تھا یہاں تک کہ آخرالذکر نے ایک دن انتہائی برہمی کی حالت میں اس کے دیوان کو اس کی موجودگی میں دھودھا برابر

---

* صرف اوزلی ایڈ ۶۹ صفحہ ۴۹۵ میں -
† آتشکدہ صفحہ ۱۷۵
‡ ناب - ایضاً -
$ حق مطلق ایضاً

کہا * - اس لیے غضائری کے اشعار بہت کم ملتے ہیں - لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے عہد کے عمدہ غزل گویوں میں تھا - اس نے ایک بار محمود کی فرمائش پر ایاز کی تعریف میں ایک غزل لکھی اور انعام سلطانی سے مالا مال ہوا - اس کے شعر میں اس امر کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے —

هزار بردہ و هزار دگر ملک افزود بہ یک غزل کہ زمن خواست پر لطایف غزال

بد قسمتی سے ہمیں اس کی کوئی غزل نہیں ملی † اس لیے ہم اس کے ذکر کو یہیں چھوڑتے ہیں اور اس کے حریف عنصری کا ذکر کرتے ہیں —

عنصری سنہ ۱۰۴۰

عنصری دربار کا ملک الشعرا تھا اس لیے اس کی اہمیت محتاج بیان نہیں - اس زمانے کے دستور اور اپنے پیشہ کے مطابق عنصری کا زیادہ وقت قصیدہ خوانی میں گزرا - کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک عشقیہ مثنوی موسوم بہ وامق وعذرا بھی تصنیف کی تھی —

بتخانے میں اس کی چار غزلیں مندرج ہیں - باڈلین میں اس کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ (ایلیٹ ۱۴ ا) ہے جس میں تیرہ غزلیں ہیں - ان تیرہ غزلوں میں بتخانے کی جملہ غزلیں شامل ہیں - اس کے دیوان

---

* مجمع الفصحا (صفحہ ۳۶۸) کے الفاظ حسب ذیل ہیں " بالآخر کار بجائے رسید کہ بعد از ملاقات و مباحثات دیوان اورا گرفتہ در حضور وے فروشست و بر درید لہذ شعرش باقی نماند " -

† عوفی اس کے حسب ذیل دو اشعار کو غزل کہتا ہے (صفحہ ۵۹) -

مہارپے خوبروے و بربط ار چو یکے کوز پشت عاشق پیر
نالہ شیر خوار دارد لیک بکنار اندروں نہ خواہد شیر

مگر ظاہر ہے کہ یہ غزل کے اشعار نہیں -

کے ایک مطبوعہ نسخے میں (۱۴۷۹۷ - سی - ۸ - ہم اسے آئندہ صرف سی - ۸ کہیں گے) صرف پانچ غزلیں ہیں اور ایک دوسرے مطبوعہ نسخے میں (۱۴۷۹۷ - سی - ۱۲ ہم اسے آئندہ صرف سی - ۱۲ کہیں گے) صرف تین - مگر یہ جملہ غزلیں متذکرہ بالا قلمی نسخے میں پائی جاتی ہیں - اس طرح عنصری کی موجودہ غزلوں کی تعداد صرف تیرہ رہتی ہے - ہم ان میں سے چند کا ذکر یہاں کریں گے —

اس کی ایک غزل ہے (بت خانہ اور ایلیٹ ۱۱۴) —

سر زلف مشکین جانان من　　مرا کشت و پیچید بر جان من
بیا ترک سیمین تن و سنگدل　　هویدا به تو راز پنهان من
به فرمان من باش تا برخوری　　ترا بد نه آید ز فرمان من
نه گردم ز پیمان تو من به دل　　مگرداں تو دل راز پیمان من

آخرالذکر دو شعر اپنے مضمون کی وجہ سے قابل توجہ ہیں - جیسا ہم اوپر بیان کرچکے ہیں حضرت عاشق کی یہ معشوق نوازی اور معشوق کو تابع فرمان سمجھ کے اس سے تعمیل ارشاد کی امید رکھنی ' جو اس عہد کی شاعری میں اکثر پائی جاتی ہے ' اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ یہ شاعری بہ مقابلہ زمانہ ما بعد کی شاعری کے حقیقت سے قریب تر تھی -

عنصری کا ایک اور غزل کا مطلع ہے (بت خانہ اور ایلیٹ ۱۱۴)

به مجلس اندر کان بت مرا شراب دهد　　به من شراب و بد خواه من عذاب دهد

بھلا یہ خوش قسمتی بعد کے اس عاشق کو جو بد قسمتی سے شاعر بھی ہو ' کہاں نصیب -

شاعر کی شرط اس لیے لگائی گئی کہ یوں تو عاشق ہر زمانے ہی میں خوش قسمت و بد قسمت ہوتے آئے ہیں اور رہیں گے ' مگر شاعر کے لیے عاشق

ناکام بننا لازمی ہے، چاہے وہ بذاتہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو۔

عنصری کی ایک غزل صنعت ذو قافیتین میں بھی ہے۔ یہ صنعت ان ابتدائی دورں میں قصیدہ گو شعرا کو بہت پسند تھی۔ اسی کا اثر ہے کہ عنصری نے، جو در حقیقت ایک قصیدہ گو تھا، اسے غزل میں بھی استعمال کیا۔ ہم اس غزل کے صرف تین شعر نمونتاً درج ذیل کرتے ہیں۔ (بت خانہ و اہلبیت ۱۱۴)۔

فغاں زاں پری چہرہ مہار یار   کہ با منش دائم بہ پیکار کار
دہانے چو یک نار دانہ دو نیم   مرا ہست در دل ازاں نار نار
دو زلف سیاہش بماند بداں   کہ دوزاغ دارد بہ منقار قار

آخری شعر کی تشبیہہ قابل توجہ ہے۔ اس کی ثقالت متاخرین کے مذاق لطافت پر بار ہوگی۔ اتنے ابتدائی عہد میں اس مشکل صنعت میں غزل کا پایا جانا اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ قصیدہ کا تصنع اسی زمانے سے غزل میں داخل ہونا شروع ہوگیا تھا —

حسب ذیل اشعار اس کی ایک اور غزل سے منتخب ہیں (دیوان - سی - ۸) —

بہ گرد ماہ براز غالیہ حصار کہ کرد   بہ روے روز براز تیرہ شب نگار کہ کرد
بہ ماہ مانی آنکہ کہ تو سوار شوی   چگونہ اے عجبی ماہ را سوار کہ کرد

یہ اشعار صاف طور سے ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا معشوق "ڈاڑھی باز" ہے اور اس لیے صنف قوی کا فرد۔ مطلع کے دونوں مصرعوں میں "بر" کا زائد استعمال قابل لحاظ ہے —

عنصری کی ایک غزل کا شعر ہے * —

* سی - ۱۲ - یہ شعرسی - ۸ میں نا مکمل درج ہے - پہلے مصرعے میں " است لیکن " اور دوسرے مصرعے میں " ۔وزن " چھوٹ گیا ہے -

دو لب چون دانہ نارست لیکن بہ نوک سوزن اندیشہ سفتہ

یہ تشبیہ اس کے ایک اور شعر میں پائی جاتی ہے جو اوپر درج کیا جاچکا ہے - لیکن اس شعر میں شاعر نے پہلے سے بہت زیادہ بلند پروازی کی کوشش کی ہے - یہی بلند پروازی اور مبالغہ ہے جس نے رفتہ رفتہ ترقی کرکے دور پنجم میں شاعری کو حقیقت سے کوسوں دور پھینک دیا اور اسے چیستان و معمہ بنا دیا —

عنصری کی غزلیں عموماً مسلسل ہوتی ہیں - ہر غزل میں مطلع ہے ' اگرچہ مقطع نہیں - ان میں کوئی خاص خوبی نہیں اور وہ اس عہد کے دوسرے بلند پایہ شعرا کی غزلوں سے یقیناً کم رتبہ ہیں —

رابعہ بنت کعب

اب ہم ایران کی پہلی شاعرہ * یعنی رابعہ بنت کعب کا ذکر کرتے ہیں - اس کا قریب قریب جملہ کلام غزلوں پر مشتمل ہے اور سب نہایت بلند پایہ ہیں - تاریخ غزل گوئی میں اس کی شخصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے ' اس لیے ہم اس کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کرتے ہیں —

اس کے عہد شاعری کے متعلق کافی اختلاف رائے ہے - صاحب مجمع الفصحا رضا قلی خاں نے اس کی زندگی کے متعلق ایک طویل نظم لکھی ہے اور اس وجہ سے اس کی رائے اس موضوع پر قابل استناد سمجھی جاتی ہے - اس کے نزدیک رابعہ رودکی کی ہمعصر تھی † - برخلاف اس کے عوفی

---

* بڑا تعجب ہے کہ اگرچہ براؤن رابعہ کا ذکر اپنی کتاب میں دو جگہ کرتا ہے (صفحہ ۱۱۶ اور ۱۵۷) مگر پھر بھی جب مہستی کا ذکر کرتا ہے جو عہد سنجر کی شاعرہ تھی تو لکھتا ہے
It would be unchivalrous to pass over in silence the first persian poetess that we have yet come across (P. 334 vol. II.) -

† " معاصرآل سامان و رودکی بودہ " صفحہ ۲۲۱ -

اسکا شمار عہد غزنویہ کے آخری دور کے شعرا میں کرتا ہے * - علاوہ اس وزن کے جو عوفی کی راے کو بوجہ قدامت کے حاصل ہے خود رابعہ کا کلام ایسا ہے کہ ہم رضاقلی خاں کی راے کو بغیرشبہ کی نظر سے دیکھے نہیں رہ سکتے - لیکن ہمیں عوفی سے بھی اتفاق راے نہیں - مولانا جامی نے نفحات الانس † میں شیخ ابو سعید ابوالخیر کو، جن کی وفات سنہ ۱۰۴۹ ع میں ہوئی، رابعہ کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتے دکھایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کچھہ عرصہ پہلے قید ہستی کو ترک کر چکی تھی - ان باتوں کو دیکھتے ہوئے اگر ہم اسے اس عہد کی شاعرہ تسلیم کریں تو زیادہ غلط نہ ہوگا —

عوفی اس کے متعلق لکھتا ہے (لباب صفحہ ۶۱) —

" اگرچہ زن بود اما بفضل بہ مردمان جہاں بخندیدے - فارس ہردو میدان و والی ہر دو بیان - بر نظم تازی قادر و در شعر پارسی بغایت ماہر و باغایت ذکائے خاطر و حدت طبع پیوسطہ عشق باختے و شاہد بازی کردے " —

صاحب مجمع الفصحا رقمطراز ہے (صفحہ ۲۲۲) -

" اورا میلے بہ یکتاش نامی غلامے از غلامان برادر خود بہمر سیدہ و انجامش بہ عشق حقیقی کشیدہ " -

یہی وجہ ہے کہ مولانا جامی نے رابعہ کو اپنے تذکرۃ الاولیا یعنی نفحات میں جگہ دی ہے اور اس کے متعلق حضرت شیخ ابوالخیر کا یہ

---

* لباب صفحہ ۶۱ -

† صفحہ ۷۳۲

قول نقل کیا ہے * —

" سخنے کہ او گفتہ است نہ چنانست کہ کسے را در مخلوق افتادہ باشد "

چونکہ عشق نے اسے آتش بجان کر دیا تھا اس لیے اس کے کلام میں بھی اس دھکتی ہوئی آگ کی گرمی پائی جاتی ہے - اس کی غزلیں صداقت جذبات و سوز و گداز سے لبریز ہیں - افسوس کہ ہمیں اس کی صرف چار غزلیں مل سکیں اور ایک اور غزل کے دو شعر - اس کی پہلی غزل حسب ذیل ہے (مجمع الفصحا صفحہ ۲۲۲) -

عشق او † باز اندر آوردم بہ بند　　کوشش بسیار نامد سود مند

توسنے ‡ کر دم ندانستم ہمی　　کز کشیدن سخت $ تر گردد کمند

عشق دریائے کرانہ ناپدید　　کے تواں کردن شنا اے ہوشمند §

عاشقی خواہی کہ تا پایاں بری　　پس بباید ساخت با ہر نا پسند ¶

زشت باید دید و انگارید خوب　　زہر باید خورد و پنداريد قند

مطلع میں بعد کے غزل گو شعرا خصوصاً سعدی و حافظ کا محبوب مضمون ' یعنی حضرت انسان بے بس ہیں ' خاص کر معاملات عشق ' میں بڑی سادگی اور پراثر طریقے سے نظم کیا گیا ہے -

ان اشعار کے کوزوں میں غم و حزن کا بحر نا پیدا کنار جس طرح بند کیا گیا ہے وہ اہل دل سے مخفی نہیں -

---

* صفحہ ۷۳۲ - ممکن ہے شیخ کی مراد رابعہ بصری سے رہی ہو اور مولانا کو ہمنامی کی وجہ سے دھوکا ہؤا ہو - مگر فی الحال ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں - اگر کبھی اس کا ثبوت مل گیا تو عوفی کی راے کے مطابق رابعہ کو اواخر عہد غزنویہ کا شاعر تسلیم کرنا پڑیگا -

† را - نفحات صفحہ ۷۳۲ -　　‡ نفحات میں یہ غزل کا آخری شعر ہے -

$ تنگ - نفحات -　　§ مستمند - نفحات -

¶ نفحات میں یہ شعر یوں ہے - عشق را خواہی کہ تاپایاں بری　　بس کہ بہ پسندید باید نا پسند -

رابعہ کی دوسری غزل حسب ذیل ہے * -

مرا بہ عشق ہمی متہم † کنی بہ حیل چہ حجت آری تو پیش خدائے عز و جل

بہ عشقت اندر عاصی ہمی نیارم شد بدینم اندر طاعت ہمی شود بہ مثل

نعیم با تو نہ خواہم جحیم با تو رواست کہ بے تو شکر زہر است و با تو زہر عسل

بروے نیکو تکیہ مکن کہ تا یک چند بہ سنبل اندر پنہان کنند نجم زحل

ہر آئینہ نہ دروغ ست آنچہ گفت حکیم فمن یکبر یوماً فبعد عز ذل

مطلع سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرہ اپنے ذاتی جذبات کی ترجمانی کر رہی ہے۔ اس نے غزل میں خاص تاثر پیدا کر دیا ہے —

تیسری غزل ‡ —

زبس گل کہ در باغ ماوی گرفت چمن رنگ از نلگ مانی گرفت

مگر چشم مجنون بہ ابر اندر است کہ گل رنگ رخسار لیلی گرفت

بہ مے ماند اندر عقیقین قدح سر شکے کہ در لالہ ماوی گرفت

سر نرگس تازہ از زر و سیم نشان سر تاج کسری گرفت

چو رہباں شد اندر لباس کبود بنفشہ مگر دین ترسا گرفت

اس غزل کی زبان اتنی اچھی ہے کہ اسے بجا طور پر بہت بعد کے زمانے کی سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسرا شعر اتنا لطیف ہے کہ اگر ہم اسے فارسی کے بہترین اشعار میں شمار کریں تو بیجا نہ ہوگا —

رابعہ کی چوتھی اور آخری غزل گیارہ شعر کی ہے، اس میں

* سمجھ میں نہیں آتا کہ صاحب مجمع الفصحا اس غزل کو قصیدہ کیوں کہتا ہے، عوفی اسے نہایت پر زور طریقے سے غزل قرار دیتا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں (لباب صفحہ ۶۲)

" این غزل کہ از کعب غزال در حلاوت زیادہ است واز وصال یار صاحب جمال در طراوت بیش است، میگوید - غزل " — † متہم - مجمع الفصحا صفحہ ۲۲۴ -

‡ مجمع الفصحا صفحہ ۲۲۲ یہ غزل لکھتے وقت مصنف لکھتا ہے " بعضے برودکی نسبت دادہ اند "

مطلع و مقطع دونوں ھیں' چونکہ ھم اس کے کلام کا کافی نمونہ دے چکے ھیں اس لیے ھم اس غزل کے صرف چار شعر درج ذیل کرنے پر اکتفا کرتے ھیں - (دقائق الاشعار - فولیو ۲۰۴ اے) —

الا اے باد شبگیرے پیام من بہ دلبر بر
بگو آن ماہ خوباں را کہ دل با جان برابر بر
نگارا چوں تو بیلشیلی میان نیکواں وانگہ
بداں ماند کہ بنشیند خطیب مہ بہ منبر بر
ھر آنچہ آیدز عشق تو بر ایں خستہ دل مسکیں
نیامد از غم یوسف بہ یعقوب پیمبر بر
مدارا اے بنت کعب اندہ کہ یار از تو جدا ماند
رسن گرچہ دراز آمد گزر دارد بہ خیبر بر

اس غزل کا قافیہ و ردیف بمقابلہ اور غزلوں کے زیادہ مشکل ھے اس سے ظاھر ھوتا ھے کہ رابعہ مشاق شاعرہ تھی - افسوس کہ اس کا کلام زیادہ مقدار میں نہیں پایا جاتا - اس کی زبردست قوت شعری اور تیغ عشق کا زخم خوردہ ھونا اس امر پر دلالت کرتا ھے کہ اس نے بہت کافی کلام چھوڑا ھوگا - آخرالذکر امر نے اسے غزل گوئی کی جانب مائل کیا ھوگا' اس کے قریب قریب جملہ موجودہ کلام کا غزل کی صورت میں ھونا یہ ظاھر کرتا ھے کہ غالباً اس نے زیادہ غزلیں ھی کہی ھوں گی - علاوہ ان کی بذات خود بلند پایگی کہ رابعہ کی زبردست شخصیت' اس کے علم و فضل اور تقدس نے ان غزلوں کو اور وقیع بنا دیا ھوگا' اس سے صنف غزل کی اھمیت بہت بڑھ گئی ھوگی - اس عہد کے اور شاعروں کا کلام' جس سے ھم آئندہ صفحات میں بحث کریں گے' اس امر کو بخوبی

واضح کرتا ہے —

رابعہ کا ذکر چھوڑنے سے پہلے اس کے بقیہ دو شعروں کا، جو کسی غزل کے معلوم ہوتے ہیں، یہاں درج کرنا نامناسب نہ ہوگا- (لباب صفحہ ۹۲)

دعوت من بر تو آں شد کایزدت عاشق کناد
بر یکے سنگیں دلے نامہرباں چوں خویشتن
تا بدانی درد عشق و داغ مہر و غم خوری
تا بہ ہجر اندر بہ پیچی و بدانی قدر من

ان اشعار میں بھی وہی صداقت جذبات و سوز و گداز ہے جو رابعہ کے کلام کی خصوصیت ہے —

(باقی آئندہ)

میر انیس کے غیر مطبوعہ اشعار

از

(قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا ، پٹنہ)

میر انیس نے غزلیں کہیں یا نہیں؟ میر صاحب کے حالات زندگی کتابی صورت میں جن اصحاب نے لکھے ہیں، نہ معلوم انہوں نے اس سوال کا کیا جواب دیا ہے - اس وقت وہ کتابیں پیش نظر نہیں - 'نساخ' نے سخن شعرا میں میر انیس کے تین شعر درج کئے ہیں جو کسی طرح مرثیے یا سلام کے نہیں ہوسکتے - یہ اشعار میر انیس کے شایان شان نہیں - نہ معلوم نساخ کو کہاں سے ملے - حال میں ایک قلمی تذکرے میں مجھے میر انیس کی ایک مکمل غزل اور ایک مطلع ملا ہے - یہ تذکرہ میر انیس کے ایک معاصر نے لکھا ہے، اور کلام بھی میر انیس ہی کا معلوم ہوتا ہے -

خموش اے بلبل شوریدہ اس میں کیا ہے بس میرا
یہ اپنی اپنی قسمت ہے چمن تیرا قفس میرا

شہید عشق ہوئے قیس نامور کی طرح — جہاں میں عیب بھی ہم نے کئے ہنر کی طرح
کچھ آج شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح — ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح
سیاہ بختوں کو یوں باغ سے نکال اے چرخ — کہ چار پھول تو دامن میں ہوں سپر کی طرح
تمام خلق ہے خواہان آبرو یارب — چھپا مجھے صدف قبر میں گہر کی طرح
تجھی کو دیکھوں گا جب تک ہیں برقرار آنکھیں — مری نظر نہ پھرے گی تری نظر کی طرح
"انیس" یوں ہوا حال جوانی و پیری — بڑھے تھے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح

لکھنؤ کا ایک لطیفہ

از

(جناب پنڈت کشن پرشاد کول صاحب)

'اکبر' اور بیربل کے لطیفے تو زبان زد خاص و عام ھیں - ویسے بھی آپ نے اچھے سے اچھے لطیفے سنے ھوں گے تاھم کچھہ مضائقہ نہیں جو لکھنؤ کا بھی ایک لطیفہ سنیں - لکھنؤ بھی خدا اس کو سلامت رکھے عجیب و غریب شہر ھے - بگڑ بگڑ کر سنورتا ھے - اس کی رعنائیاں و دلربائیاں نت نئے شیدائی پیدا کرتی ھیں - پر جہاں ایسے قدر دانوں کی کمی نہیں وھیں رقیبوں سے مفر نہیں - بہت دن نہیں ھوئے کہ ایک زمانہ تھا کہ لکھنؤ اور دلی میں رقابت تھی - آئے دن دلی والے لکھنؤ والوں پر چوٹیں کیا کرتے تھے - ادیبوں اور شاعروں کی بزم ادب میں بس یہی ایک چرچا رھتا تھا - خوب گرما گرمی ھوتی تھی - ذراسی بات پر صفحے کے صفحے سیاہ کیے جاتے تھے - لیکن اب تو نہ 'داغ' ھیں نہ 'امیر'، نہ اُن کے ھواخواہ و قدر دان - نہ مشاعروں کی وہ گرما گرمی - خدا مغفرت کرے سجاد حسین مرحوم کی، اُن کے ساتھہ اودھ پنچ کا شباب بھی بہت گیا - ایک دولہا صاحب کا دم غنیمت تھا کل کی بات ھے کہ لوگ سال سال بھر تک اس دن کا انتظار کرتے تھے اور دور دور سے چلے آتے تھے کہ 'انیس' کے اس نام لیوا کو مجلس کے منبر پر

بیٹھا دیکھہ لیں اور اس کا مرثیہ سن لیں - لیکن -

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اس کے یہ معنی نہیں کہ شاعری کا چرچا کم ہوگیا یا لکھنؤ سے مرثیہ خوانی اٹھہ گئی - چشم بد دور اب بھی اچھے اچھے کہنے والے موجود ہیں لیکن بقول جناب 'ظریف' کے اب تو خوش الحانی کی داد چاہی جاتی ہے ' شاعری کہاں! مشاعروں کی بھی کمی نہیں - آئے دن ہر قصبے اور ہر ہوسٹل میں ہوتے رہتے ہیں لیکن جاکر دیکھیے تو وہ طوفان بد تمیزی کہ معلوم ہوتا ہے کہ مشاعرہ نہیں کوئی سوراجیوں کا مظاہرۂ عام ہے - غرض کہنے کی یہ ہے کہ نہ وہ لوگ رہے نہ وہ زمانہ رہا - ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند !

پھر بھی نہ لکھنؤ کی رونق میں کمی ہے نہ اس کے رقیب ناپید ہیں - پہلے لکھنؤ اور دلی کا چرچا رہتا تھا اب لکھنؤ اور الہ آباد کا جھگڑا ہے - پہلے بزم ادب میں معرکے ہوتے تھے اب بساط سیاست پہ چالیں چلی جاتی ہیں اور الہ آباد کے پہلوان خم ٹھوک ٹھوک کر اکھاڑے میں اترتے ہیں - لکھنؤ فریب اب بھی آنکھوں میں کھٹکتا ہے - کوئی پوچھے کہ صاحب آخر یہ الہی بغض کیوں؟ جواب ملتا ہے کہ راجدھانی تو الہ آباد ہے مگر سرکار کی نگاہ تلطف جب دیکھو تب لکھنؤ پر رہتی ہے - ہر فرمایش پوری کی جاتی ہے - ساری دولت و خزانہ اس کی آرائش و زیبائش پر لٹایا جاتا ہے - بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ اپنوں سے بھر غیروں سے ناتا - ہم سے جھکے جی یہ رنڈاپا نہیں سہا جاتا - مانا کہ الہ آباد راجدھانی کہلاتا ہے پر نوشتۂ تقدیر تو نہیں کہ مٹایا بھی نہ جا سکے - ارے صاحب یہ تو بڑی پرانی مثل

ہے کہ جو پیا من بھائے سو ہی سہاگن کہلائے۔ کوئی بات تو لکھنؤ میں ہوگی جو پیا من بھاتا ہے۔ لاکھ صورت اچھی سہی پر صورت بھی تو کوئی چیز ہے۔ چہرہ پر نمکینی ہو جسے چھب کہتے ہیں۔ اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے کا سلیقہ ہو۔ گفتگو میں انداز دلربائی ہو تو لاکھ آپ متقی و پرهیزگار ہوں نظر ایک دفعہ اُٹھ ہی جاتی ہے۔ پھر دنیا میں سب متقی و پرهیزگار ہی تو نہیں ہوتے۔ طبیعتیں شوقین مزاج و طرحدار بھی ہوتی ہیں۔ البتہ لگتی کہنے کا، شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ کتنے ہیں کہ جو چاہے کالی ہو، بھدی ہو، بھونڈی ہو، لیکن محض بیوی ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور کبھی کسی اچھی صورت پر نظر اُٹھا کر نہیں ڈالتے۔ راجا ہو یا پرجا، خاصۂ انسانیت سے تو کوئی خارج نہیں۔ کار پردازان حکومت بھی تو آخر انسان ہی ہیں کوئی فرشتہ تو نہیں۔ پھر اگر لکھنؤ کی رعنائیاں و دلربائیاں ان کو اپنا شیدائی بناتی ہیں اور اس کا جذب انہیں اپنی طرف کھینچتا ہے تو یہ کون سا الزام ہے۔ لوگ کہتے ہیں، میں نہیں کہتا، کہ الہ آباد میں سوائے امرود، کھیریل اور پراگ والوں کے دھرا کیا ہے؟ ایک حضرت 'اکبر' تھے سو خدا بخشے وہ بھی اب نہ رہے۔ پھر الہ آباد کو 'اکبر' پر ناز بیجا ہے وہ تو اودھ پنچ کے نو رتنوں میں سے ایک انمول رتن تھے اُن کو الہ آباد سے کیا واسطہ۔ یہ صحیح ہے کہ الہ آباد اقلیم سیاست و صحافت کا بادشاہ ہے اور بالعموم اخباروں اور رسالوں کو لکھنؤ کی آب و ہوا موافق نہیں آتی، اسی لیے حضرت 'جوش' ملیح آبادی نے "کلیم" کے لیے پنجاب کی قربت میں دہلی کا آشیانہ ڈھونڈ نکالا۔ لیکن جب ایسا ہے تو پھر آخر آپ نے اس غریب 'پایونیر' کو بڑھاپے میں ٹھوکریں کھانے اور دم توڑنے کے لیے لکھنؤ کیوں بھیج دیا؟ لاکھوں روپیہ

مریض کی تیمارداری پر صرف کیا جا رہا ہے پر بوسیدہ ہڈیوں میں کوئی جوانی کی روح کیسے پھونک دے ؟

مذاق کی تو بات ہی دوسری ہے - پر سچ تو یہ ہے کہ لکھنؤ لکھنؤ ہی ہے - لاکھہ اُجڑ گیا بگڑ گیا پھر بھی شہر ہے - مٹتی مٹاتی عظمت و تہذیب کی انمول نشانی ہے - شایستگی و شرافت کا گھر ہے - اودھ کی سرزمین اور لکھنؤ بھی وہ مردم خیز خطہ ہے کہ علم و ادب کی مجلس میں وہ وہ نامور پیدا کیے کہ جنھوں نے اپنا سکہ زمانہ پر بٹھا کر چھوڑا - انشا و سودا - آتش و ناسخ - انیس و دبیر - نسیم و میر حسن نواب مرزا شوق اور رجب علی بیگ سرور کا نام کون نہیں جانتا - خیر - یہ تو پرانی داستانیں ہیں - لیکن سرشار کو گذرے ہوئے تو بہت دن نہیں ہوئے اُردو میں فن فسانہ نگاری کا موجد تھا - مٹتے مٹاتے لکھنؤ کی جیتی جاگتی اور بولتی چالتی وہ وہ تصویریں اپنے قلم سے کھینچ گیا ہے کہ دیکھنے والے عش عش کرتے ہیں - جب تک ہندوستان میں اُردو کے قدر دان اور پڑھنے والے موجود ہیں فسانۂ آزاد کے ' خوجی ' کو بھول نہیں سکتے - وہ دم بدم ان سے ٹھٹول کرے گا اور ان کو ہنساتا رہے گا - ہندو ہوں یا مسلمان - اردو والے ہوں یا ہندی والے - اس میں عورت و مرد کی بھی تخصیص نہیں - گلزار نسیم کس نے نہیں پڑھی - گل بکاولی کا تماشہ کس نے نہیں دیکھا - بیسوں شعر ضرب المثل ہوگئے اور سیکڑوں زبان زد خاص و عام ہیں - نواب مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق کا نام کس نے نہیں سنا - آج بھی پڑھنے والے کلیجہ تھام کے رہ جاتے ہیں - لندن پنچ کی تتبع میں نہ معلوم ہندوستان میں بھی پنچانہ رنگ کے کتنے ہی اخبار نکلے ہندی پنچ ' بمبئی پنچ وغیرہ وغیرہ ' لیکن اودھ پنچ کا سا شباب کسی

کو نصیب نہ ہوا - اس گلشن ظرافت کے پھول نہ مرجھاتے ہیں نہ باسی ہوتے ہیں - ویسے کے ویسے ہی بکھرے پڑے ہیں - جب جی چاہے چن کر اور بین کر گلدستے بنا لیجیے - اس چمن کی تختہ بندی اور آبیاری اُن نکتہ رس اور بذلہ سنج زندہ دل طبیعتوں نے کی تھی جن کی ظرافت' زندہ دلی' طنز و تمسخر اور بذلہ سنجی کی دھاک اور سکہ ہر کہ و مہ پر بٹھایا ہوا تھا - جو بر رو آیا اُسی نے منہ کی کھائی - مرزا سجاد حسین مچھو بیگ ستم ظریف - تربھون ناتھ ہجر - اکبر حسین اکبر - جوالا پرشاد برق - نواب سید محمد آزاد - محمد علی کسمنڈوی وغیرہ اودھ پنچ کے وہ نو رتن تھے کہ جن کا نام دنیائے صحافت میں خدائے سخن کا مرتبہ رکھتا ہے - دولھا صاحب دیکھنے میں دبلے پتلے' کمزور اور بوڑھے آدمی تھے - گردن ہمیشہ مراقبہ میں رہتی تھی مگر طبیعت میں دریائے سخن موجزن رہتا تھا - مضامین تھے کہ اُمنڈتے چلے آتے تھے - مرثیہ گوئی کا جوہر انیس سے ورثہ میں ملا تھا - مرثیہ خوانی کا کمال خدا داد تھا - جس وقت منبر پر بیٹھتے اور گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں بند پڑھتے تو رن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھچ جاتا تھا - معلوم ہوتا تھا کہ دراصل کوئی شہسوار شمشیر بے نیام کر رہا ہے - خدا جانے اس وقت ان بوسیدہ ہڈیوں میں کس بلا کی طاقت اور کہاں سے آجاتی تھی - بات یہ تھی کہ صاحب کمال تھے - اگر یورپ میں پیدا ہوئے ہوتے تو چار دانگ عالم میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا - شاہی درباروں میں قدر و منزلت ہوتی - ہر اخبار و رسالے میں تصویریں چھپتیں اور نہ معلوم کتنی یادگاریں اب تک قائم ہو گئی ہوتیں - لیکن اس بد نصیب ملک کے ماہران فن و صاحبان کمال کے یادگاروں کی کس مپرسی کی حالت تو اسی شعر کے مصداق ہے کہ

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

علم ادب و صحافت، شاعری، موسیقی، دستکاریوں کی صنعتیں، خورد و نوش کے تکلفات ہر تہذیب و تمدن کی جان ہوا کرتے ہیں - قوموں کی شایستگی و شرافت کا پتہ انھیں باتوں سے چلتا ہے - میں کہہ چکا ہوں کہ اس مٹی مٹائی حالت میں بھی لکھنؤ شرافت و شایستگی کا گھر ہے - ہندوستانی تہذیب کا مرکز ہے - علم ادب و صحافت سے قطع نظر نغمہ و سرود تو لکھنؤ کے رگ و ریشہ میں پیوست ہے - گو زمانہ کے انقلاب نے اب یہاں کی رقص و سرود کی محفلوں کا رنگ ماند کردیا ہے - 'سنیما' اور 'ڈانس' کی اچھل کود کے آگے انھیں کون پوچھتا ہے - مگر بہت دن نہیں گذرے کہ لوگ کالکا کا ناچ اور بندہ دین کی ٹھمریاں اور ہولیاں دور دور سے سننے آتے تھے - فی زمانہ کھادی اور چرخے کی دھوم ہے - دستکاریوں کی نمائشیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں - نئے نئے قسم کے چرخوں اور کرگھوں کی ایجاد کے لیے سینکڑوں روپے کے انعام دیے جاتے ہیں- ہاتھ کا بنا ہوا معمولی دیسی کپڑا عجائبات میں سے سمجھا جاتا ہے - اگر آنکھیں ہوں اور قدر کرنا جانتے ہو تو لکھنؤ کی چکن اور ٹانکے کی جامدانی ملاکر دیکھو کہ دستکاری کی صنعت و معجزہ کسے کہتے ہیں - اس جامدانی کو ہاتھ میں لیتے ہی بخدا طبیعت بے ساختہ چاہتی ہے کہ بنانے والے کے ہاتھ چوم لے - مٹی کے کھلونے ہر قصبہ و شہر میں بنتے ہیں مگر یہ بات صرف لکھنؤ کے ہی کھلونوں میں ہے کہ صرف جان ڈالنے کی کسر معلوم ہوتی ہے - لکھنؤ کے مطعون کرنے والے تو بہت ہیں لیکن فصل پر ملیح آباد کے سپیدے اور لکھنؤ کے دسہری کے پارسل کا بیچینی سے انتظار کیا جاتا ہے زردہ اور قوام کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے لیے پھر لکھنؤ ہی لکھنا

پڑتا ہے - لکھنؤ پہنچتے ہی بیگماتی گلوریوں کی فرمائش ہوتی ہے - ککڑی کی کیا حقیقت ہے - ایسی کوئی کھانے کی چیز ہی نہیں، لیکن جہاں " لیلیٰ کی انگلیاں ہیں اور مجنوں کی پسلیاں ہیں " کی صدا کانوں میں آئی بے اختیار طبیعت للچاتی ہے اور خدمت گار کو حکم ہوتا ہے کہ دو پیسے کی لے آنا - ایک کیا سیکڑوں باتیں ہیں جن کا ذکر کیا جا سکتا ہے - شبہ نہیں کہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن شرافت و شایستگی کے تکلفات کی انہی چھوٹی باتوں سے ہر قوم کے تہذیب و تمدن کا اندازہ ہوتا ہے - یہی وہ باتیں ہیں جنھیں آپ فی زماننا مروجہ زبان میں Culture کہتے ہیں مگر اسے کیا کیجیے کہ ہمارے میدان سیاست کے سورما اور سور بھر اس بات کو مانتے ہی نہیں کہ ہندوستانی تہذیب و تمدن بھی شایستگی کے نام کا اہل ہے - انھوں نے اس سے زیادہ پڑھا اور سمجھا ہی نہیں کہ ہندو تہذیب کا ماحصل " چوتیا و دھوتیا " ہے اور اسلامی تہذیب کا لب لباب - " گُھٹنا اور بدھنا " - ان کے آگے اس دکھڑے کا بیان اسی ہندی مثل کا مصداق ہے کہ " اندھے کے آگے روئیے اور اپنے نین کھوئیے " —

آپ کہیں گے کہ دعوت دی تھی لطیفہ سننے کی اور لگا یہ دکھڑا رونے - سو یہ بکواس بھی بالکل بے محل نہ تھی - اس تمہید کی ضرورت اس لیے پڑی کہ آپ لطیفے کا پورا لطف اٹھا سکیں - اچھا تو سنیے - مگر ہاں ایک بات کہنی بھول گیا اور وہ بہت ضروری ہے - یعنی یہ کہ جو کچھ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں وہ الہ آباد والوں کو برا نہ لگے - یہ فقیر تو اکبر آبادی مرحوم کے اُجڑے دیار کا رمتا جوگی ہے - اسے نہ لکھنؤ کی پچ نہ الہ آباد سے کد نہ دلی سے واسطہ - صرف اتنا جانتا ہے کہ مست کا بول بالا رہے -

اچھا، لطیفہ سنیے - سنی ہوئی بات ہے، انکھوں کی دیکھی نہیں -

اس لیے عذاب دروغ بر گردن راوی - کوئی چار پانچ برس کی بات ہے کہ ہنگامۂ انقلاب برپا تھا - ملک میں چاروں طرف سے سوائے 'مہاتما کی جے' کے کوئی آواز کان پڑی سنائی نہ دیتی تھی - لکھنؤ میں بھی جوش کافی تھا - مرد تو مرد عورتیں بھی اور اچھے اچھے گھرانوں کی عورتیں بے نقاب ہوکر میدان کارزار میں نکل آئی تھیں - عورتوں کی ہمت اور بہادری کا ہر طرف چرچا تھا - لوگ ان کی ہستی اور حقوق کے قائل ہوگئے تھے - اسی زمانہ میں میونسپلٹی کا الکشن ہونے والا تھا - سوراجیوں نے تو اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا لیکن اور ممبری کے امیدواروں کی کمی نہ تھی - چنانچہ چوک وارڈ سے ایک ڈاکٹر صاحب ممبری کے لیے کھڑے ہوے تھے - ان کا خاندان لکھنؤ کے پرانے خاندانوں میں تھا - پھر اپنے کام میں ہشیار تھے لوگوں کو ان کی ذات پر بھروسہ تھا - ان کے حامیوں اور مددگاروں کی کمی نہ تھی - یقین تھا کہ ممبر ہو جائیں گے - پر کوئی شخص کیسا ہی ہردل عزیز کیوں نہ ہو خار کھانے والے اور مخالف ہر شخص کے ہوتے ہیں - کسی صاحب کو ان سے کد تھی - ہرانا اور جتانا تو ان کے بس کی بات تھی نہیں پر ڈاکٹر صاحب کو تنگ کرنے کی انھوں نے ٹھانی تھی - آدمی سوجھ بوجھ کے اور بڑے دل لگی باز تھے - اور وثیقہ سلامت رہے دل لگی بازوں اور بے فکروں کی اب بھی لکھنؤ میں کمی نہیں - انھوں نے ایک بی صاحبہ کو ابھارا کہ ممبری کے لیے کھڑی ہو جائیں اور ڈاکٹر صاحب کا مقابلہ کریں - بی صاحبہ لکھنؤ کی مشہور گانے والیوں میں تھیں - ان کے بھی ہواخواہوں اور قدر دانوں کی کمی نہ تھی - میراثی اور سازندے دوڑ دھوپ کے لیے حاضر تھے - نئے بگڑے ہوے تماشبین اور سیٹھ ساہوکار روپیہ خرچنے کو تیار تھے - چوک

کی عام طوائفیں بے فکرے وثیقہ دار اور دل لگی باز ووٹ دینے کو موجود تھے - بی صاحبہ کو بھی اچھی دل لگی ھاتھہ آئی - دل لگی کی دل لگی اور مشغلہ کا مشغلہ - کھڑی ھو گئیں - نئی نئی بات تھی - گھر گھر یہی چرچا تھا اور شہر بھر میں اس کا غلغلہ - ڈاکٹر صاحب بھی گھبرائے کہ عجب انمویت کا سامنا ھے ' اگر ایک طوائف کے مقابلے میں جیتے تو کون سی سرخروئی اور ھارے تو ذلت ھی ذلت - پھر یاران طریقت کی فقرے بازی مزید براں - بہت کچھہ سوچ سمجھہ کر بی صاحبہ کو پیغام بھیجا کہ پانچسو روپے لے لیں اور بیٹھہ جائیں - کسی طرح پلک تو چھوٹے - بی صاحبہ بڑی ستم ظریف تھیں ' انہوں نے جواب میں کہلا بھجوایا کہ "ڈاکٹر صاحب تو بڑے آدمی ھیں اور یہ لونڈی کس قابل ھے پر ایک هزار میں ھی دیتی ھوں ڈاکٹر صاحب ھی بیٹھہ جائیں" - ڈاکٹر صاحب نے رقم تگنی کرکے دوبارہ پیغام بھیجا - اُس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ "میں روپیہ کی بھوکی نہیں - میں تو صرف عورتوں کے حقوق کی پیروی کی غرض سے ممبری کے لیے کھڑی ھوئی ھوں ' ڈاکٹر صاحب کسی شریف گھرانے کی تعلیم یافتہ اور بیدار مغز خاتون کو اپنی جگہ کھڑا کرادیں ' میں وعدہ کرتی ھوں کہ بیٹھہ جاوں گی اور مخالفت نہ کروں گی" - اب تو ڈاکٹر صاحب کا قافیہ بڑا تنگ ھوا ' لیکن بڑے گرگ باراں دیدہ تھے اس میدان کے پرانے کھلاڑی تھے انہوں نے وہ چال چلی کہ بی صاحبہ کی فقرے بازی کچھہ کام نہ آئی - الکشن میں شیعہ سنی کا سوال چھیڑ دیا - لکھنؤ ' میں شیعہ سنی کا سوال چھیڑنا گویا بھس میں چنگاری لگانا ھے - جب زیادہ جوش بڑھتا ھے تو نقض امن تک کی نوبت آتی ھے - محرم کے زمانہ میں حکومت کو پولیس کا خاص انتظام کرنا پڑتا ھے آج - کل بھی 'مدح صحابہ' کا قضیہ اس سلسلے

میں چھڑا ہوا ہے اور نقض امن کا اندیشہ ہے - شیعہ سنی کا سوال چھڑتے ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو گیا - طوائفوں اور سازندوں؛ اُن کے حامیوں اور ہواخواہوں کے دو گروہ بن گئے - ایک شیعہ اور ایک سنی - الکشن ہوا اور بڑی دھوم دھام سے ہوا - لیکن پالا ڈاکٹر صاحب کے ہی ہاتھ رہا - بی صاحبہ ہار گئیں مگر Sportsman تھیں اپنا ووٹ ڈاکٹر صاحب کو ہی دیا اور نتیجہ معلوم ہونے کے بعد بہ نفس نفیس ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد دینے پہنچیں - ڈاکٹر صاحب اپنے خیمہ کے باہر خوش خوش کھڑے تھے - ان کی ٹکڑی کے لوگ ان کے ارد گرد جمع' تھے الکشن کے جوڑ توڑ کا ذکر ابھی جاری تھا کہ بی صاحبہ بھی آپہونچیں - آگے بڑھیں اور ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کر کے بولیں —

بی صاحبہ - ڈاکٹر صاحب الکشن کی جیت مبارک -

ڈاکٹر صاحب - اجی ہار جیت تو ہوا ہی کرتی ہے' اس میں مبارک کی کیا بات ہے —

بی صاحبہ - نہیں 'مبارک' دینا تو میرا فرض ہے' پر مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ہمارے شہر کی بدنامی ہوگی -

ڈاکٹر صاحب - وہ کیسے ؟

بی صاحبہ - اجی الہ آباد والے ویسے ہی روز ہم لوگوں پر لعن طعن کرتے رہتے ہیں - انہیں ایک موقع اور مل گیا - کہیں گے' اور صحیح کہیں گے' کہ لکھنو والوں کی نگاہ میں عورت کی ہستی و حیثیت کی کچھہ قدر و منزلت ہی نہیں - عورتوں کے حقوق کا کچھہ پاس و لحاظ ہی نہیں -

ڈاکٹر صاحب - مجھے الہ آباد والوں کے کہنے سننے کا تو کچھہ غم نہیں

پر آپ سے شکایت ہے کہ آپ بھی ایسا کہتی ہیں -

بی صاحبہ - جو بات کھری ہوتی ہے کہنے میں آتی ہے - اچھا آپ ہی بتائیے ڈاکٹر صاحب ' دیکھیے قران پاک کی قسم ہے سینہ پر ہاتھہ رکھہ کر سچ سچ کہیے گا ' کہ آخر اس الکشن کے نتیجہ سے ظاہر کیا ہوتا ہے ؟ یہی نا کہ لکھنؤ میں مرد کم ہیں اور مریض زیادہ ! —

اس فقرے پر فرمائشی قہقہہ پڑا اور ڈاکٹر صاحب کچھہ ایسا سٹ پٹائے کہ جواب دیتے نہ بنی —

ادبی معلومات

(از "ناخدا")

صفحہ

(۱) ایک ہسپانوی شاعر کی شہادت — از پابلو نرودا — ۴۲۷

(۲) ادب عالم اور ادب جدید — از کارل ریڈاک — ۴۳۱

(۳) چینی ادب اور قومی جنگ — از پاؤسن ننگ — ۴۳۸

(۴) ہندی شاعری کی ایک صنف (نائکہ بھید) — ۴۴۳

ادبی معلومات

(از ناخدا)

(۱) ایک ہسپانوی شاعری کی شہادت

(از :— ' پابلو نرودا ' (Pablo Neruda)

[اسپین میں فاشسٹوں کا ظلم بےگناہ عورتوں اور معصوم بچوں کے قتل عام سے تجاوز کر کے ہر حقیقت بیں کی جان کا لاگو ہو گیا ہے - اوؤدو یونیورسٹی کے ریکٹر پروفیسر ایلاس اور مشہور شاعر لورکا (Lorca) کی موت میں ایک جہان عبرت پوشیدہ ہے —

یہ مختصر مضمون جو دراصل ' لورکا ' کا نوحہ ہے ' جنوبی امریکہ کے نامور شاعر ' پابلو نرودا ' کا لکھا ہوا ہے - موصوف اب پیرس میں رہتے ہیں -]

ہمیں جو جو گھاؤ لگے ہیں ' کیا میں ان میں سے ایک کو بھی بھول سکتا ہوں ؟ اندلس کے کسان ' عسطوریہ کے کوہکن ' دیہاتوں کے کاریگر اور شہروں کے مزدور جو ہمارے دشمنوں کی گولیوں کے شکار ہوگئے ؛ ہزاروں عورتیں اور بچے جو ان کے برچھوں سے چھدے پڑے ہیں —— یہ سب ہمارے دیس کے لخت جگر تھے اور ان سب کی روحیں تمہارے آگے فریاد کرنے آئی ہیں - اگر تم فریب اور ظلم کے مخالف ہو تو یہ فریاد یقیناً تمہارے دل میں جگہ حاصل کرے گی - جس طرح جھرلے بہتے بہتے کبھی زمین کے نیچے

چھپ جاتے ھیں تاکہ نئے جوش و خروش کے ساتھہ باھر اُبل آئیں ' اسی طرح دم بھر کے لیے ان کے نام زمین لیئم میں دفن ھوگئے ھیں - لیکن شہید کی یاد ھوا اور آگ کی طرح غیر فانی ھوتی ھے —

یہ کیسے ھوسکتا ھے کہ میں ان میں سے صرف ایک ھی کا ذکر کروں اور دوسروں کی بات نہ پوچھوں ؟ - مگر سچ پوچھو تو اس نام میں ایسی تاثیر ھے کہ وہ تمام مظلوموں کی نمایندگی کرسکتا ھے - وہ سب اسی اصول کے لیے جیے اور مرے ' جس کے گیت گاتے ھوئے وہ سولی پر چڑھ گیا - وہ آخری سانس تک اپنے نغموں سے وطن کی حفاظت کرتا رھا —

فیڈرکو گارشیالورکا ! رباب کے تاروں کی طرح خنداں و شادماں اور اپنے ھم وطنوں کی طرح معصوم اور حساس تھا - زندگی بھر وہ عوام کا دم بھرتا رھا اور وہ بھی اس پر دم دیتے رھے - غداروں نے اس کی جان یہ سوچ کر لی کہ اس طرح ملک کی روح مجروح ھوجائے گی - وہ اسپین کی تازگی ' شگفتگی اور روشنی کو بجھانا چاھتے تھے —

یہ دو اسپینوں' دو خون کے پیاسے بھیڑیوں کا مقابلہ تھا - ان میں سے ایک خونیں کفن میں لپٹا ھوا ' ریا اور ظلم کی اولاد ھے ' جو اپنے زھرآلود سانس سے ھر حیات آفریں عنصر کو مٹانے کے درپے ھے - دوسرا اسپین کا جواں مرد اور نیک دل ھے - اس نے اپنی محبت بھری آنکھوں سے دنیا کو ابھی ابھی دیکھا ھے - وہ ' لورکا ' کا اسپین ھے —

لورکا مرچکا ھے - وہ انسان جو انسانیت کی خدمت کے لیے زندہ تھا ' مرچکا ھے - اور اس مٹی کے نیچے دبا پڑا ھے جسے اس کے قاتلوں نے اس کی لاش پر ڈال دیا تھا - لیکن اسپین والوں کی دلیری کو آنچ نہیں لگی اور وہ اپنی آزادی کے لیے لڑ رھے ھیں - لورکا کے گیت اُن کے

حربے ہیں - یہ گیت انسانیت کی یادداشت پر خون کی روشنائی سے لکھہ دیے گئے ہیں اور ہمیشہ لکھے رہیں گے —

ہسپانوی ادب نے دو تخلیقی دور دیکھے ہیں - ایک تو لوپ دواگا (Lopedvaga) کا زمانہ - عہد متوسط کے وہ دن جب لوگ اس جادو بیان ادیب کے دامن کو بوسہ دیا کرتے تھے - یا پھر اس کے بعد آج کا دن ہے کہ مضمون اور طرز کی ایسی بوقلمونی کبھی دیکھنے میں نہ آئی اور نہ عوام میں شاعری کا ایسا چرچا ہوا —

لورکا خالی خولی جمال پرست نہ تھا - اس کی نظمیں اور تمثیلیں جذبات انسانی میں ڈوبی ہوئی ہیں اور اس کی شاعری انسانیت کے غم سے لبریز ہے - عوام کو اس کا منشا سمجھتے دیر نہ لگی اور انہوں نے دل کھول کر اس کے گیت گائے اور انہیں ساری دنیا نے سنا —

اس کی تحریروں کی حقیقت پسندی کو جنوبی امریکہ نے بہت سراہا - جنوبی امریکہ اور اس کے جنم دیس یعنی اسپین کے مابین زمان و مکان نے صوبوں کی دوری اور سمندروں کا فاصلہ پیدا کر دیا ہے، پھر بھی وہ اس نوجوان شاعر کا شیدائی تھا کیونکہ وہ اپنے وطن کے غم کا آئینہ دار تھا - تین سال پہلے میں نے جنوبی امریکہ میں اس کے ناٹکوں کو اسٹیج پر دیکھا اور اس کی مقبولیت کا اندازہ کیا - اس نے قدیمی ہسپانوی ڈرامے کو نئی جلا دی تھی - اس کی تحریر میں محبت اور موت بغلگیر ہوکر رقص کر رہی تھیں - میں نے دیکھا کہ سب تماشائیوں کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں —

اس کی تصویر کھینچنے کی قدرت مجھے نصیب نہیں - اس کے اخلاص، انتھک محنت، نیکی اور خوش مزاجی کا اندازہ الفاظ سے کیسے لگایا

جا سکتا ہے؟ - وہ اپنے ساتھہ خوشی کی لہریں لیے چلتا تھا —

اندلس کے دو شاعر لورکا اور البرتی زندگی کے شیدائی تھے - ان کے گیت میں رس ہے' وہ ہمارے بھائی بند معلوم ہوتے ہیں' وہ چھوٹے بڑے سب کے شاعر ہیں - ان کی شاعری کا سوتا ایک ہی جگہ سے پھوٹتا ہے' یعنی اندلس اور کیسٹائل کے پرانے دیہاتی گیتوں سے - ابتدا میں یہ رجحان ایک تجسس اور تلاش کی حیثیت رکھتا تھا؛ جیسے کوئی نکھرے سنورے چمنوں کی سیر سے تنگ آکر سیدھے سادے رمنوں میں جا نکلا ہو - ان کی تلاش کا پھل بہت میٹھا تھا کیونکہ ان کی شاعری میں جو جدت پیدا ہوئی وہ بہت مفید اور دور رس تھی - یہ دونوں جگری دوست تھے -

لورکا کی ناٹک منڈلی نے پورے ملک کا دورہ کر کے لوپ دوگا اور سرونٹیس (Cerventes) کے قدیم اسٹیج کو از سر نو زندہ کیا - یہ لورکا ہی کی ذات ہے جس کی وجہ سے اسپین کے ہر حصے میں ادب قدیم کی عظمت زندہ ہوئی - پہاڑیوں کے رہنے والے بھوکے ننگے جو موٹر اور گراموفون سے بھی نا آشنا تھے' اپنے پرداداؤں کی زبان کو سن کر اور پرانی رسموں کو اسٹیج پر دیکھہ کر چونکے - ان میں زندگی کا شوق پیدا ہونے لگا -

لورکا کو ہر لمحہ اس ستم سے دو چار ہونا پڑتا تھا' جو امیر غریبوں پر توڑتے ہیں - اس نے اپنے سامنے ایک ایسی دنیا دیکھی جس میں صرف ایک راگ سنائی دیتا تھا اور یہ بھوک کا راگ تھا - یہ سب دیکھتے دیکھتے اس کا دل بھر آیا —

جب لورکا اپنے دیہات میں رہتا تھا تو اس نے ایک عجیب واقعہ دیکھا - سورج نکل رہا تھا اور گھر میں قدرت کی رنگینی چھپ گئی تھی - ایک مینڈا کسی بہت بڑے بت کے سائے میں گھاس چر رہا تھا - اتنے میں

سات سیاہ سؤر اس پر یک بیک جھپٹے اور چشم زدن میں اسے پھاڑ ڈالا -

جب لورکا نے میڈرڈ میں ایک بڑے مجمع کو یہ واقعہ سنایا تو اس کی آواز کانپ رہی تھی —

جب اسے انسان نما درندوں نے پھاڑ ڈالا تو مجھے یہ قصہ یاد آیا اور مجھے محسوس ہوا کہ لورکا اس وجہ سے کانپ رہا تھا کہ اس کی روح اس کے انجام کو دیکھ رہی تھی —

تم سمجھتے ہوگے کہ میں میدان جنگ کے شور شغب کو بھلا کر کوئی مافوق الحیات نغمہ سناؤں گا - یہ نہیں ہو سکتا - میری رگوں میں اسپین کا خون بہتا ہے اور میں نے وہاں جاکر اپنے بھائیوں کے مصائب کو اِنہیں آنکھوں سے دیکھا ہے - میرے کانوں میں اُنہیں کا نوحہ سمایا ہوا ہے - میں سیاست داں نہیں ہوں اور سیاسی کشا کش سے دور رہتا ہوں تو' بھی میری آواز میں غصہ ہے - شاید تم مجھہ سے اس کی توقع نہ کرتے تھے - لیکن مجھے سمجھو! ذرا سوچو کہ انھوں نے ایک ایسے آدمی کو مار ڈالا جو ہم سب کا سر تاج تھا - ہم لورکا کے قتل کو نہ بھول سکتے ہیں نہ معاف کر سکتے ہیں - کبھی نہیں ' کبھی نہیں !! —

(۲) ادب عالم اور ادب جدید

از

کارل ریڈک

[سوویت روس کے مشہور اہل قلم کی ایک تقریر کا یہ خلاصہ ہے -]

سرمایہ داری کا انحطاط کوئی مسلسل دھارا نہیں ہے - کیونکہ ہر

دور کے انحطاط میں بھی یہاں وہاں ترقی کی ایک آدھ کرن پھوٹ پڑتی ھے - یہی حال سرمایہ داری کے دور کے ادب کا ھے - کبھی کبھار وہ ایسے شہپارے پیدا کر دیتا ھے کہ ہم حیران رہ جاتے ھیں - ھمارا فرض ھے کہ اس زمانے کے مختلف رجحانات کو دیکھیں اور پرکھیں -

ادب جدید سے وہ ادب مراد ھے جو جنگ عظیم کے ساتھ شروع ہوا - اس واقعہ کو اب لگ بھگ ۲۵ سال ہوے - اس مدت کو ہم تین حصوں میں بانٹ سکتے ھیں تا کہ ان پیمانوں سے ادب عالم کی گونا گوں خصوصیتوں کو جانچیں - یعنی : جنگ ، انقلاب روس اور فاشیزم کا نزول

جنگ عظیم اور ادب

جب یہ ہولناک لڑائی شروع ہوئی تو ہم نے کیا دیکھا کہ ' ادب برائے ادب ' کے تمام جگادری نمائندے سامرا جیوں کے ساتھ ہوگئے اور کروڑوں معصوم انسانوں کے خون ناحق کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا -

اناطول فرانس (Anatole France) جیسا دانا ، جو فرشتوں کی بغاوت کے لیے بھی مادی اسباب ڈھونڈا کرتا تھا * سامراجی پر چار کے چکر میں آگیا - ' صرف روماں رولاں ' نے جنگ کے دیوتا کے آگے سر نہ جھکایا - لیکن اسکا احتجاج عدم تعاون کی حد سے آگے نہ بڑھا اور وہ امن پسندی کے گوشۂ عافیت میں جا چھپا -

مشہور ادیبوں میں سے صرف دو نے کھلم کھلا اس جنگ کی مخالفت کی - گورکی اور مارٹن انڈرسن نیکس (M. Anderson Nexoe) - سنہ ۱۹۱۶ ع میں فرانس کے نامی انشاپرداز ھینری بارجوس نے اپنا ناول ' Under Fire ' شائع کیا - اس زمانہ میں ہم لوگ لینن کے ساتھ سویٹزرلینڈ

* Revolt of Angels اناطول فرانس کا مشہور طنزیہ رومان ھے -

میں تھے اور ہم سب کی متفقہ رائے تھی کہ عوام کی بےچینی کا یہ پہلا اظہار ہے - لیکن درحقیقت جب جنگ ختم ہو گئی تو ادب میں امن پسندی کا رجحان بڑے زور شور سے شروع ہوا - ان کتابوں میں سب سے پہلے Remarque کے ناولوں کا نام آتا ہے - مگر اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ جنگ کے بنیادی اسباب کے خلاف کچھ نہیں کہتا - چنانچہ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ اس کے دوسرے ناول "واپسی" The Way Back کا ہیرو جیسے ہی گھر پہنچتا ہے اس کے ملک پر فاشیزم کا نرغہ ہوتا ہے اور خود مصنف کو گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑتا ہے - یہیں معلوم ہوتا ہے کہ 'خلاف جنگ' ادب کتنا بے بساط ہے کیونکہ نئے سامراجی جنگ کے ناگزیر ہونے کو وہ رو بسور کر تسلیم کر لیتا ہے - مثلاً ایچ - جی - ویلس کے ناول Mr. Britling sees it through کو لیجئے - اس میں مصنف نے جنگ کے مظالم سے اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے - لیکن اب وہ کہہ رہا ہے کہ اگلے پچاس سال مسلسل لڑائیوں میں گزرینگے -

اس قسم کا خالی خولی احتجاجی ادب دیوالیہ ہوتا جاتا ہے 'اور اس کے بر عکس ایک نیا رجحان پیدا ہو رہا ہے جو عوام میں جنگ کی برکتوں کا پرچار کر رہا ہے - جاپان میں ان آتش پاروں کی تعداد وبائی جراثیم کی طرح بڑھ رہی ہے - جرمنی بھی اس ادبی تیاری میں پیچھے نہیں - وہاں کے نازی ادیب Johst اور Beumelberg آیندہ جنگ کے لیے میدان صاف کر رہے ہیں -

یہ ماننے کی بات ہے کہ سرمایہ دارانہ ادب نے اس زمانہ میں اپنی خدمت ایمانداری سے انجام دی - وطن پرستی کا نشہ پلا کر یا یہ کہہ کر کہ دنیا کہ مصائب ختم ہوگئے اور ایک زریں عہد کا آغاز

ہونے والا ہے -

اُس زمانے میں اشتراکی ادب گھٹنوں چلنا سیکھ رہا تھا - یاد رکھنے کی بات ہے کہ وہ ایک نا معلوم منزل کا نشان بردار تھا - اسے بنجر زمینوں کو توڑنا تھا - اس سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ اپنے بچپن ہی میں بڑے بڑے شاہکار پیدا کر دے گا - تاہم ایسی متعدد کتابیں چھپیں اور مقبول ہوئیں جن میں جنگ کے خلاف عوام کی بغاوت کی تصویر تھی -

اس سلسلے میں ہمیں جاپانی ادیبوں کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا ہے - ان کے سب سورما قید خانوں میں بند ہیں لیکن ان کی آواز آزاد ہے اور جاپانی مظلوموں کو دعوت عمل دے رہی ہے —

انقلاب روس اور ادب

برنرڈشا اور روماں رولاں جیسے دو چار انصاف پسند ادیبوں کو چھوڑ کر تمام سرمایہ دار مصنفوں نے تاریخ کے اس شاندار کارنامہ کی مخالفت کی - انہیں یہ نہیں سوجھا کہ انسان ایک نئی دنیا بسانے چلا ہے - اس انقلاب کے متعلق ان کی تحریریں کذب و افترا کے دفاتر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں - البتہ جو ادیب خانہ جنگی کے دوران میں ہمارے دیس میں آئے ' ان میں سے کئی نے ہمیں سمجھنے کی کوشش کی - ان لوگوں میں ہم ' فاب پرائیس ' اور ' آرتھر رینسوم ' کا نام لے سکتے ہیں —

سرمایہ داری کا آشوب

یہ دن بھی گذر گئے اور پھر سرمایہ داری کے آشوب (Crisis) کا زمانہ آیا - ایک طرف تو سرمایہ دارانہ نظام تیزی سے زوال پذیر ہونے لگا اور دوسری طرف روس کا اشتراکی نظام فروغ حاصل کرنے لگا -

مفکروں اور ادیبوں کو اس پہیلی کا حل بوجھنے کے لیے مجبور ہونا پڑا اور ان میں سے کئی ہماری طرف رجوع ہونے لگے —

مثلاً (Theodore Dreiser) دیکھیے - ایک مرتبہ اس نے لکھا تھا پوری زندگی کے غور و فکر کے بعد بھی سماج کے مسائل کا حل اس کی سمجھ میں نہیں آتا - لیکن اب وہ امریکہ کو مشورہ دیتا ہے کہ روس کی تقلید کرے - یا روماں رولاں کو لو - اس ادیب کو ہر قسم کی کشمکش سے نفرت تھی' لیکن آج وہ روس کا ہم نوا اور ہمدم ہے —

ڈریزر اور رولاں کی یہ تبدیلی سمجھ میں آتی ہے کیونکہ اِن میں سے پہلا حقیقت پسند اور دوسرا انسانیت پسند تھا - لیکن آندرے ژید (Andre Gide) کو کیا کہیے جسے روز مرہ کی زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا اور وہ سرتا سر رنگینی اور رومان میں سرشار تھا —

بس ہم دیکھتے ہیں کہ سرمایہ داری کے قلعہ میں پھوٹ پڑ گئی ہے - اور جن کے دل میں انسانیت کا درد ہے وہ ہماری تائید پر کمر بستہ ہو رہے ہیں - یہ کام بڑی جرأت کا ہے' کیونکہ اپنے ماضی کی تردید کے لیے کوئی شخص واحد جلد تیار نہیں ہوتا —

مگر ان ادیبوں کو ابھی حال ہی میں تاریخ نے ایک عبرت ناک سبق دیا ہے - پانچ سال پہلے جرمنی کے نازیوں نے دنیا کے تقریباً سب مصنفوں کی کتابوں کو چوراہوں پر یہ کہہ کر جلا دیا کہ جو ہمارے ساتھ نہیں ہے' وہ ہمارا مخالف ہے' - انہوں نے زمانۂ حال کے ادب سے یہ دو ٹوک بات کہہ دی کہ تاریخ کے منظر پر آج 'جو جنگ شروع ہوئی ہے' اس میں کوئی راہ فرار نہیں ہے - دو میں سے کسی ایک کا ساتھ بر ملا دینا ہی ہے —

اس چنوتی کے باوجود کئی مصنف عجب حیص بیص میں مبتلا ہیں -
اس ضمن میں ہم برنرڈ شا کے ڈرامہ (Too good to be true) کا ذکر
کر سکتے ہیں - وہ ہمیشہ سرمایہ داری کی گود میں پھلا پھولا ' یہاں تک
کہ اس کی دنیا اسی پس منظر میں سکڑ گئی - اور جب اس نے دیکھا
کہ اس نظام کی بنیاد کتنی کھوکھلی تھی تو وہ جھجکا کہ میں بھی
اسی گھروندے میں رہتا تھا اور اگر یہ بالو کی دیوار گری تو میں بھی
دب جاؤں گا —

فاشیزم اور ادب

موجودہ جرمنی کے بہترین ادیب کا نام Hans Fallada ہے - اپنی
مشہور تصنیف Little Man what now میں اس نے بڑی خوبی سے
یہ دکھایا ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج میں عوام کی حالت کیسی خستہ
و خراب ہوتی ہے اور جمہوریت کے نام لیوا اُنہیں کیسے کیسے فریب دیتے
ہیں - مگر فیشیزم کے متعلق مصنف کی رائے مبہم رہی اور بہت سے لوگ سمجھ
نہ سکے کہ وہ اس کا موافق ہے یا مخالف - جب ہٹلر گدی پر براجا
تو بہت باتیں بدلنے کے باوجود بیچارے فیلیڈا پر اس کا ستم ٹوٹا اور
نازیوں نے اس کی کتابوں کو مردود قرار دیا —

پولینڈ کے لکھنے والوں میں Kaden Bandrovski کا بڑا نام ہے -
خاص طور پر اس کے رومان Black Wings کا شہرہ ہے - مگر اس میں
پولش فاسسٹوں کا کوئی ذکر نہیں ہے -

اطالوی ادب کے بارے میں وہاں کا سب سے بڑا اخبار Giornale d' Itaila
لکھتا ہے : " ہمارے ادب میں ایک ایسے شباب کی تصویر ملتی ہے جو
بہیمانہ امراض کا شکار ہے اور جس کی زندگی مطلق بے فیض اور بے مقصد

ہے ۔ یہ کوئی ادبی کارنامہ نہیں ہے ۔ یہ مجسم بے راہ روی ہے ۔ جتنی جلدی یہ بیہودہ کوئی بند ہوجائے اتنا ہی اچھا ہے "۔ ایک دوسرا اخبار (Tevere) لکھتا ہے کہ ' ہمارے ملک نے ایک بھی ادیب پیدا نہ کیا جو یہاں کے کسانوں کی حالت کا صحیح نقشہ کھینچتا ' —

معلوم یہ ہوا کہ فاشزم قدیم ادب کو مٹا تو سکتا ہے لیکن اس کی خانہ پری نہیں کرسکتا ۔ اس کے برعکس سوویت روس کا ادب یہ کہہ سکتا ہے کہ اگرچہ اس نے اب تک جاوداں ادب پارے پیدا نہیں کیے' تاہم حقیقت کا سچا سچا روپ پیش کرنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے ۔

اشتراکی ادب

ایک نئے انقلابی دور کے ساتھہ دنیا میں ایک نیا اشتراکی ادب پیدا ہو رہا ہے ۔ امریکہ میں ڈریزر اور سینکلر اسپین میں ریمن سینڈر اور فرانس میں روماں رولاں اس نئے رجحان کے پیشوا ہیں ۔ روماں رولاں کی نئی عظیم الشان تصنیف Enchanted Souls ہمارے ادبی نظریہ کی سب سے بڑی فتح ہے —

دوسری طرف جاپان میں انقلابی ادب کا دھارا اتنا تیز ہے کہ روس کے علاوہ دنیا کا کوئی ملک اس کا جواب پیش نہیں کرسکتا —

نئے ادیبوں کی کمزوریاں

مجھے اپنے نئے ادیبوں میں کئی کمزوریاں نظر آتی ہیں اور جب تک وہ دور نہ ہوں' وہ اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتے ۔ ایک تو یہ کہ ان میں رکھہ رکھاو اور آداب کی کمی ہے ۔ یہ یوں ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو تمدن کی جمع پونجی سمجھے بیٹھے ہیں ۔ لیکن اُنہیں کارخانوں اور کھیتوں کے سوا اور کیا دیکھنے

کا موقع ملا ہے - کارخانہ اور اپنا علاقہ — لے دے کر یہی ان کی دنیا ہے اور اس دنیا میں صرف دو جاندار رہتے ہیں — سرمایہ دار اور مزدور - مگر مارکس کی تعلیم یہ نہیں ہے - اس کا قول ہے کہ دنیا کو ہر زاویہ سے دیکھو کیونکہ اس کا ایک ایک ذرہ اپنے میں عجیب وغریب امکانات رکھتا ہے —

دوسری کمی یہ ہے کہ ان کا طرز بیان بڑا پھیکا ہوتا ہے - وجہ یہ ہے کہ قدیم ادب نے اس کے لیے مناسب اسالیب پیدا نہیں کیے - اس کے لیے بڑی جاں فشانی کی ضرورت ہے - اس کے لیے وقت اور صبر کی ضرورت ہے - ہمارے ادیبوں کو چاہیے کہ وہ قدیم اور جدید ادب کے تمام بڑے نمایندوں کا مطالعہ کریں اور ان میں جو سیکھنے کی باتیں ہیں انہیں سیکھیں - لیکن انہیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہمارا اصل فرض عوام کو بیدار کرنا ہے اور ادب اس روش کا ایک وسیلہ ہے —

(۳) چینی ادب اور قومی جنگ -

از

یاؤ سن ننگ - (Yao - Hsin - Nung)

اس صدی کے آغاز تک چینی ادب کی حالت بڑی ابتر تھی - سماجی نظام میں اجداد پرستی اور سامنتی سرداروں کی پوجا کا غلغلہ تھا اور ادھر عوام کے دماغ پر اوہام کی سیاہ چادر پڑی ہوئی تھی - چینی عبارت کی ہزار دقتوں پر مستزاد یہ کہ قدیم طرز انشا

جسے 'وین یان' کہتے تھے، عام طور پر مقبول تھی - یہ بلیغ اور لچھے دار طرز ہر سنجیدہ اور علمی موضوع کے لیے ناموزوں تھا —

مگر جب نئی روشنی پھیلی تو زندگی کے دوسرے شعبوں سے پہلے ادب میں اس کا اُجالا پہنچا - یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ نئے ادیبوں کا راستہ اور مسلک ایک ہی تھا - کچھ نے تو پرانے اداروں اور دقیانوسی اوہام کا مذاق اڑانا شروع کیا کیونکہ یہ ان کی انفرادیت کا تقاضا تھا - بعض نے بدیسی سامراج کی نفرت کی وجہ سے یہ راہ اختیار کی - لوسن Lu hsun کی طرح کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے اُن قوتوں کا صحیح اندازہ لگایا جو ایک نئی دنیا کی تعمیر کر رہی تھیں —

مگر اُن مختلف رجحانات کی تہہ میں ایک چیز مشترک تھی - وہ یہ کہ دنیا کو حقیقت کی نظر سے دیکھیں اور چین میں ایسی فضا پیدا کریں کہ وہ واقعات کا صحیح تجزیہ کرسکے اور انھیں عقل کے معیار پر پرکھ سکے —

پہلے تو یہ ادبی تحریک سرمایہ دارانہ مغرب کی پیروی کرتی رہی - لیکن چین کے حالات ایسے نہ تھے کہ انیسویں صدی کے لبرازم کو پلپنے کا موقع دیتے - بہت جلد اس نے ایک مادی اور انقلابی شکل اختیار کرلی - ساتھ ہی ساتھ 'وین یان' طرز انشا کی مخالفت ہونے لگی - کیونکہ شہنشاہیت پرست ذہنیت سے اس کا چولی دامن کا ساتھ تھا - اِس کے مزید بول چال کی زبان کو جسے پیءوا' (pai hwa) کہتے ہیں' حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے —

جمہوریت کے برسر اقتدار ہوتے ہی بول چال کی زبان نے 'وین یان' کی پرانی جھول کو اتار پھینکا اور سنہ ۱۹۲۰ میں حکومت نے اسے سرکاری

زبان تسلیم کرلیا —

ہمارے ادب کا یہ زرین عہد تھا - یورپ کی عمدہ عمدہ کتابوں کے تراجم تیزی سے ہو رہے تھے - انھیں دنوں ہمارے قائد اور استاد لوسن نے 'ایک پاگل کی ڈایری' اور 'آہ کیو کی کہانی' لکھ کر تخلیقی ادب کی داغ بیل ڈالی —

یہ سن یات سین کا زمانہ تھا ' جب چینی انقلاب جمہوریت کی منزلوں طے کرکے روس کی طرف قدم بڑھا رہا تھا - اب تک ہمارا نصب العین 'ادبی انقلاب' تھا - لیکن لوسن نے ایک قدم بڑھ کر 'انقلابی ادب' کا نعرہ لگایا اور اس کی گونج ملک کے کونے کونے میں جا پہنچی - انقلابی افسانوں اور ڈراموں کا انبار لگ گیا اور سنہ ۲۶-۲۵ تک یہی کیفیت رہی - یہ وہ دن تھے جب جنگ کائی شیک اور کمیونسٹ دوش بدوش شمال کی مہم پر نکلے تھے اور سامنتیوں کے آخری گڑھ کا قلع قمع کر رہے تھے - لیکن اس کے بعد جنگ کائی شیک نے یک بیک چولا بدلا اور کمیونسٹوں کا قتل عام شروع ہوگیا - اس کے بعد عرصہ تک انقلابی خیالات نرغہ میں رہے اور ترقی پسند ادب میں افراتفری پھیلی رہی —

اس افراتفری کی وجہ سے کئی رجحان پیدا ہوئے - ان میں سے ایک تو رومانی تھا جس کا لیڈر کومی جو تھا جو چین کا مشہور شاعر ہے - دوسرا رجحان حقیقت پسندی کا تھا جس کا قائد 'ماؤتن' چین کا سب سے بڑا ناول نگار ہے - اس کے پیرو 'لوسن' کے اس اصول کے ماننے والے تھے کہ ادب کی بنیاد حقیقی مشاہدہ پر ہو ' طرز تحریر عام فہم ہو اور مقصد ہر کسی انسانی مسئلہ کی تحقیق اور کسی سماجی

ہیجان کی تصویر —

چینی ادیبوں کو اپنے ملک کی خاطر بڑی سختیاں جھیلنا پڑیں - ان میں سے میں کئی فوج میں بھرتی ہو کر سامنتی غداروں کے خلاف لڑے اور سیکڑوں چنگ کائی شیک کے ہاتھوں قتل ہوئے —

اشتراکی تحریک دب کر زیادہ مضبوط ہوتی گئی - سنہ ۱۹۳۰ میں لوسن کی صدارت میں اشتراکیت پسند ادیبوں کی ایک انجمن قایم ہوئی جس میں مختلف گروہوں کے نمائندے یک جا ہوگئے - انتہائی سیاسی مظالم کے باوجود یہ انجمن اپنا کام کرتی گئی - اس کے ارکان میں سے ماؤتن نے ' شفق ' اور ایک ادیبہ ڈنگ لنگ نے ' ماں ' نامی رومان لکھا - یہ دونوں کتابیں از حد مقبول ہوئیں -

چنگ کائی شیک کی رجعت پرور حکومت نے ادبی انقلاب کو روکنے کے لیے پھر سے قدیم طرز انشا کو زندہ کرنے کی کوشش کی تاکہ عوام میں نئے ادب کا چرچا رک جائے - اس کے جواب میں ترقی پسند ادیبوں نے رومن رسم الخط اور عام تعلیم کا پرچار شروع کردیا - اور حکومت کو منہ کی کھانی پڑی -

ادھر جاپانی حملے کا آغاز ہوچکا تھا - اور حکومت اس سے چشم پوشی کرکے چین کے انتہا پسندوں کو چن چن کر مار رہی تھی - سنہ ۱۹۳۵ میں یہ ظلم انتہا کو پہنچ گیا اور ادبی انجمن کو اپنا دفتر بند کر دینا پڑا - لیکن جاپان کی مخالف چینی پارٹیوں کی جماعت بندی کے پرچار میں اس نے بڑا کام کیا -

اس دور نے چین کے سب سے بڑے تخلیقی ادیب کا منہ دیکھا -

'تین چن' جو منچوریا کے ایک کسان کا بیٹا تھا، بھاگ کر شنگھائی گیا اور وہاں اس نے "اگست میں ایک گانوں" نامی ناول شایع کیا - موجودہ چینی ادب کے بابا آدم لوسن نے اسے پڑھ کر کہا کہ اب تک چین میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی - اس کی بیوی کا شمار چین کی سب سے اچھی لکھنے والیوں میں ہوتا ہے - ساتھ ساتھ ساؤیو کا ڈرامہ 'طوفان' شائع ہوا جو ملک کا بہترین ڈرامہ سمجھا جاتا ہے - کتنی عجیب بات ہے کہ چین کی تاریخ میں جو دور سب سے کٹھن ہے، وہ اس کے ادب کے لیے ابر رحمت ثابت ہوا —

سنہ ۳۷ میں 'متحدہ محاذ' کی تحریک نے حکومت کی مغرور گردن کو خم کردیا اور اب چین کا ہر فرد جاپان کے خلاف لڑ رہا ہے - اشتراکیت پسند گروہ بھی متحد ہوگئے اور اپنے استاد لوسن کی موت کے بعد انہوں نے اس کی مقدس میراث کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی - اس کی میراث تھی آزادی کی حفاظت - چین کا ہر ادیب آج اس کا نگہبان ہے —

اب چین کی تمام تمدنی، فنی اور ادبی جماعتیں ایک واحد انجمن میں منظم ہوگئی ہیں اور چینی تمدن کی بقا اور فروغ کے لیے لڑ رہی ہیں - ان کا ایمان ہے کہ یہ صرف چین کی ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام انصاف پسندوں کی جنگ ہے - تمدن کسی ایک ملک کی جائداد نہیں - وہ زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے - جو لوگ تمدن اور ادب کے دعویدار ہیں وہ اپنے چینی بھائیوں کے لیے آج کیا پیغام لائے ہیں؟

(۴) هندی شاعری کی ایک صنف - نائیکہ بھید

[دنیائے شاعری میں صرف هندی کو یہ امتیاز حاصل هے کہ اس نے محبوبہ کی تقسیم کوک شاستر کے اصولوں پر کی اور 'عورت' کے تخیل کو اتنا نجس اور ناپاک بنا دیا جس کی مثال کہیں نہیں ملتی - اس صنف کے متعلق هندی ادب کے سب سے بڑے نقاد پنڈت مہاویر پرشاد دویدی کے خیالات یہاں درج کیے جاتے هیں -]

دربار میں جگہ ملتے هی شاعر کو یہ فکر هوتا تھا کہ راجہ صاحب انواع و اقسام کی عورتوں سے کس طرح لطف اندوز هوسکیں - دس سال کی معصوم لڑکی سے لے کر پچاس سال کی ادھیڑ بیوی تک کے باریک سے باریک فرق اور ان کے نک سک اور تاؤ بھاؤ کے تذکرے پر هی شاعر اکتفا نہ کرتا تھا - عورتوں کو پھسلانے کے لیے کٹنیوں کو کیا کرنا چاهیے - مالن، دھوبن وغیرہ میں کون اِس کام کے لیے موزوں هوسکتی هے اور کیوں کر، اس کا فیصلہ بھی شاعر هی کرتا تھا - بھڑووں کے ذکر سے بھی یہ حضرت چوکتے نہ تھے - حتیٰ کہ قرمساقی پر بھی ان کی دوربیں نظر پڑ هی جاتی تھی - ایسی تصنیفوں اور نظموں کا سلسلہ هنوز جاری هے -

ایسی کتابوں میں کیا لکھا هوتا هے؟ طوائفوں کی بدکاریاں اور دوشیزاؤں کی عصمت فروشی اور بس! یہ ننگ ادب تصنیفیں مشاطاؤں اور قحباؤں کی روسیاهیوں کی داستانیں هیں - کٹنیوں اور کٹنیوں کے هتکنڈے یعنی وہ کس ترکیب سے مردوں اور عورتوں کو ملاتے هیں! بازار میں بیٹھ کر بیسوائیں کس طرح لوگوں کے دل لبھاتی هیں -

بیویوں اور دوشیزاؤں کے ' بروگ ' کا کیا حال ہوتا ہے : کہیں کوئی ' نایکہ ' اندھیرے میں جمنا کے کنارے دوڑی جا رہی ہے ' کہیں کوئی چاندنی میں روپہلی ساڑی پہنے گھر سے نکلی ہے اور ایک سنسان کُنج میں بیٹھ کر اپنے یار کا انتظار کر رہی ہے - شام کو آئے ہوئے پردیسی سے کوئی کہہ رہی ہے کہ میرا شوہر گھر پر نہیں ہے اور ساس اندھی ہے اس لیے رات تم یہیں بسر کرو - کہیں کوئی اپنے عاشق کے ساتھ اپنی سکھی کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے - یہی باتیں بڑی مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی کے ساتھ ان نظموں میں بیان کی گئی ہیں - اخلاق اور ادب کے لیے اس سے زیادہ قاتل زہر اور کیا ہوسکتا ہے !

افکار و واقعات

(از ' اڈیٹر)

صفحہ

(۱) بمبئی اور پونا کا سفر -	۴۴۵
(۲) ہندوستانی اکیڈیمی کا سالانہ جلسہ -	۴۵۱
(۳) ہندستانی کمیٹی صوبۂ بہار -	۴۵۴
(۴) شاخ انجمن ترقیٔ اُردو الہ آباد -	۴۵۸
(۵) ودیا مندر اسکیم -	۴۵۹
(۶) مدراس کے وزیر اعظم اور ہندی اور ہندستانی -	۴۶۷
(۷) مسٹر کھیر وزیر اعظم بمبئی اور ہندی -	۴۷۰
(۸) راشٹر بھاشا کانفرنس اور مسٹر کھیر اور مسٹر سوباش چندر بوس وغیرہ کے ارشادات -	۴۷۲
(۹) صدر کانفرنس اور ہندستان کی مشترک زبان -	۴۷۳
(۱۰) اُڑیسہ میں ہندی کا پرچار -	۴۷۴
(۱۱) پراونشل اینٹی ہندی کانفرنس (صوبۂ مدراس) -	۴۷۵
(۱۲) اردو کے متعلق سرتیج بہادر سپرو کا ارشاد -	۴۷۵
(۱۳) انجمن کے اردو مدرسے -	۴۷۸

افکار و واقعات

(از ' اڈیٹر)

۱ - بمبئی اور پونا کا سفر

اس سے پہلے کئی بار خیال کیا اور کچھ کوشش بھی کی کہ بمبئی میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم ہو جائے ' لیکن کوئی صورت نہ بنی - پچھلے دنوں ہمارے مہربان مولوی خلیل الرحمن جنھوں نے الہ آباد میں انجمن کی شاخ قائم کرنے اور اس کے مقاصد کو عمل میں لانے کے لیے سعیء بلیغ کی تھی ' بمبئی میں کچھ عرصے کے لیے مقیم تھے - ان کے اور مولوی نجیب اشرف ندوی پروفیسر گورنمنٹ اسمعیل کالج اندھیری اور بعض دیگر اصحاب کے صلاح و مشورہ سے یہ قرار پایا کہ مجھے بمبئی آنے کی دعوت دی جائے اور اُس وقت صوبۂ بمبئی کے لیے بمبئی شہر میں انجمن کی شاخ قائم کرنے کی تدبیر کی جائے - مولوی خلیل الرحمن صاحب نے مجھے لکھا کہ یہ صورت ہے ' کیا رائے ہے - میں نے جواب دیا کہ کوئی تاریخ مقرر کرکے اطلاع دیجیے ' میں بلاتامل حاضر ہو جاؤں گا - چنانچہ جلسۂ مشاورت کی تاریخ ۹ مارچ قرار پائی - میں عین وقت پر پہنچ گیا - مولوی نجیب اشرف صاحب ندوی کے بنگلے پر تمام اصحاب جمع ہوگئے - اس مجلس میں اردو کے ہمدرد اور ہر طبقے کے نمایندے اچھی خاصی تعداد میں جمع تھے - دیر تک اردو کی اشاعت و ترقی اور انجمن ترقیء اردو کی شاخ قائم کرنے کے متعلق گفتگو رہی - اسی ضمن

میں وزیر فنانس صوبۂ بمبئی کے بجٹ اور اُن کی تقریر کا بھی ذکر آیا - بالاخر سب کی متفقہ رائے سے یہ طے پایا کہ بمبئی شہر میں انجمن ترقی اردو ہند کی ایک شاخ انجمن ترقیء اردو صوبۂ بمبئی کے نام سے قائم کی جائے اور صوبے کے تمام اضلاع اور مشہور مقامات میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں - اُسی وقت ایک فہرست ارکان کی مرتب کی گئی اور اس عارضی جماعت کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ ۲۰ ارکان کی تعداد میں اضافہ کر سکتی ہے - پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب اس کے داعی (کنوینر) قرار پائے -

اس کے بعد ہی ڈاکٹر محمد بذل الرحمن صاحب پرنسپل گورمنٹ اسمعیل کالج کے ہاں ایک علمی مجلس تھی اور اس میں خاص خاص اہل علم مدعو تھے - میں بھی اس میں شریک ہوا اور حاضرین کے اصرار پر اردو زبان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا اور تمام اہل بزم سے اردو کی اشاعت و امداد کی درخواست کی - اتفاق سے آنریبل مسٹر نوری' وزیر تعمیرات بھی وہاں موجود تھے - اُن سے طویل گفتگو کے بعد یہ طے ہوا کہ وزیر اعظم سے مل کر زبان کے متعلق بعض غلط فہمیوں کو دور کرلیا جائے —

(آنریبل مسٹر کھیر وزیر اعظم حکومت بمبئی سے ملاقات)

مسٹر بریلوی اڈیٹر بمبئی کرانیکل نے اپنی عنایت سے وزیر اعظم سے ملاقات کا وقت مقرر کرلیا تھا - چنانچہ میں دوسرے روز (۷ مارچ کو) ایک بجے ان سے ملنے گیا - وہ بہت خندہ پیشانی اور اخلاق سے پیش آئے - میں نے اُن سے عرض کیا کہ آپ اب گورمنٹ ہیں' حریف یا مخالف پارٹی نہیں رہے' اس لیے آپ کو ہر فریق سے یکساں برتاؤ کرنا چاہیے

اور خصوصاً اقلیتوں کے حق میں انصاف کرنا چاہیے - مسٹر کھیر نے فرمایا کہ انصاف ہی نہیں بلکہ جو اقلیتیں پس ماندہ ہیں اُن کے ساتھ خاص رعایتیں کرنا بھی ہمارا فرض ہے - میں نے کہا کہ آپ کی زبان سے یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور امید ہے کہ آپ کے زمانے میں ایسا ہی ہوگا - اس کے بعد میں نے کہا کہ ایسی حالت میں یہ کیا ضرور ہے کہ آپ کی حکومت کی طرف سے بلا وجہ ایسے لفظ استعمال کیے جائیں یا ایسی تجویزیں پیش کی جائیں جو دوسری جماعتوں یا قوموں کی دل آزاری کا باعث ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کی طرف سے لوگوں میں بدگمانی اور غلط فہمی پیدا ہوگی - انھوں نے پوچھا کہ ایسی کون سی بات ہوئی ہے - میں نے کہا کہ ابھی حال میں آپ کے وزیر فنانس نے جو بجٹ پیش کیا اس میں یہ صاف طور سے تحریر ہے کہ اس قدر رقم اس صوبے میں ہندی کی اشاعت و ترقی کے لیے مخصوص کر دی گئی - اور اپنی تقریر میں بھی انھوں نے اس کا اعادہ کیا - کسی کانگریس حکومت کو یہ حق نہیں کہ وہ ملک کے خزانے کا روپیہ کسی ایسے صوبے میں جہاں کی زبان ہندی نہیں، ہندی کی اشاعت میں صرف کرے - انھوں نے اعتراف کیا کہ یہ غلطی ہوئی - ہماری مراد اس سے ہندستانی تھی - میں نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ یہ غلطی اکثر کانگریس حکومتوں اور ان کے وزرا سے ہوتی ہے حالانکہ کانگریس کا صاف اور صریح رزولیوشن موجود ہے کہ ملک کی زبان ہندستانی ہوگی، اور افسوس ہے کہ مجھے کانگریس کی حکومتوں اور کانگریس کے وزرا کو یہ بتانا پڑتا ہے - انھوں نے وعدہ کیا کہ اس کی اصلاح کر دی جائے گی اور جو آپ کا منشا ہے وہ مجھے لکھا دیجیے تاکہ اس پر عمل در آمد کیا جائے -

چنانچہ میں نے انہیں لکھوا دیا کہ "هندستانی" کا لفظ استعمال کرنا چاهیے اور هندستانی زبان کی تعریف یہ هے - یہ وهی تعریف تھی جو میرے اور بابو راجندرا پرشاد کے مشترکہ بیان میں درج هے - میں نے اُن سے یہ بھی عرض کیا کہ آیندہ زبان کے معاملے میں جب کبھی ایسی صورت پیش آئے تو انجمن ترقیء اردو سے مشورہ کر سکتے هیں - اور اب چونکہ یہاں اُس کی ایک شاخ قائم هوگئی هے آپ کو اس میں زیادہ آسانی هوگی - اس کے سکرتری پروفیسر نجیب اشرف میرے ساتھ آئے هیں ' آپ فرمائیں تو انہیں بلالوں ' آپ اُن سے مل لیجیے - چنانچہ پروفیسر صاحب سے وہ بہت خوشی سے ملے اور اُن سے فرمایا کہ جب کبھی ضرورت هو آپ مجھ سے مل سکتے هیں اور مشورہ دے سکتے هیں - پروفیسر صاحب نے کہا کہ میں سرکاری ملازم هوں ایسے معاملات میں کھونکر مشورہ دے سکتا هوں - فرمایا کہ سرکاری ملازم کا تو سب سے زیادہ یہ فرض هے ' وہ تنخواہ هی اس بات کی پاتے هیں - غرض میں اس ملاقات سے بہت خوش هوا اور مسٹر کھیر نے جتنی باتیں کہیں وہ نہایت معقول تھیں - لیکن سب سے زیادہ خوشی مجھے اس بات سے هوئی کہ وہ اردو یعنی هندستانی بہت اچھی اور بلا تکلف بولتے هیں - میں نے ان سے انگریزی میں بات چیت شروع کی تھی لیکن جواب ایسی صاف اور اچھی اردو میں دیا کہ میں حیران رہ گیا —

(اردو زبان پر تقریر)

اسی روز شام کے سات بجے انجمن اسلام هال میں میری تقریر تھی - یہ میرے آنے سے پہلے هی طے هوچکا تھا اور اس کی اطلاع اخباروں میں چھپ چکی تھی - جناب سید عبد اللہ بریلوی اڈیٹر بمبئی کرانیکل

نے صدارت فرمائی - جناب صدر نے اپنی افتتاحی تقریر کے اثنا میں یہ بھی فرمایا کہ کانگریس کو ایک قومی ادارہ ہونے کا دعوی ہے اور بحیثیت ایک حقیقی قومی ادارے کے وہ اہل ہند کے لیے ایک مشترک زبان کی ضرورت تسلیم کرتی ہے اور اس لیے اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہندستانی ملک کی قومی زبان ہونی چاہیے - چنانچہ کانگریس کے دستور کے فقرہ ۱۷ میں صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ کانگریس کی تمام کارروائی عام طور پر ہندستانی زبان میں ہونی چاہیے - کانگریس کے خیال کے مطابق ہندستانی وہ زبان ہے جسے عام لوگ سمجھ سکیں اور وہ دونوں رسم خط میں لکھی جانی چاہیے - اس کے بعد مسٹر بریلوی نے حکومت بہار کی ہندستانی کمیٹی کا ذکر کیا اور آخر میں اس افسوس ناک غلط فہمی کا ذکر کیا جو بمبئی کیبینٹ کی بجٹ کی تقریر سے پیدا ہوئی - فنانس منسٹر نے اپنی تقریر میں یہ کہا کہ ہماری حکومت نے قومی زبان ہندی کے لیے ایک معتدبہ رقم صرف کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے - یہ لفظ "ہندی" فنانس منسٹر نے غلطی سے بلا ارادہ استعمال کیا تھا - مسٹر بریلوی نے فرمایا کہ میں سب کو اور خصوصاً مسلمانوں کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس سے کانگریس کا حقیقی منشا ہندستانی تھا اور اس پر وہ عمل بھی کرنا چاہتی ہے -

مسٹر بریلوی نے اپنی آخری تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ وہ مقرر سے (یعنی مجھ سے) اس امر میں پورا اتفاق کرتے ہیں کہ جب کہ کانگریس نے باضابطہ طور پر ہندستانی کو قومی زبان تسلیم کر لیا ہے تو اب ہر کانگریس والے کا یہ فرض ہے کہ وہ اس زبان کی ترقی کے لیے کوشش کرے - اور یہ افسوس کی بات ہے کہ بعض کانگریس والے جب کبھی وہ قومی زبان کا ذکر کرتے ہیں تو اسے ہندی کہتے ہیں —

مجمع قابل اور صاحب ذوق لوگوں کا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ جلسے میں جو کچھہ ہوا اس سے وہ بہت مطمئن اور خوش تھے —

(پونا)

پونا کے بعض ہمدردان اردو کی خواہش تھی کہ کم سے کم ایک دن کے لیے وہاں ضرور ہو آؤں۔ منگل کے روز (۸ مارچ کو) ان کا تار بھی پہنچا۔ اس لیے مولوی نجیب اشرف صاحب کی ہمراہی میں پونا پہنچا۔ دوپہر کو سید ابوطاہر صاحب (اردو ترینِنگ اسکول) کے اصرار پر وہاں کے طلبہ کے سامنے اردو کی اہمیت اور اس بارے میں مدرسین کے فرائض پر تقریر کی۔ شب کے وقت مخصوص اصحاب کا ایک جلسہ مشورہ منعقد ہوا۔ اور اسی میں ایک عارضی کمیٹی بنائی گئی۔ جناب خان بہادر پروفیسر شیخ عبدالقادر صاحب' خان صاحب ہدایت اللہ صاحب ہیڈ ماسٹر اینگلو اردو اسکول' خان صاحب مولوی عبدالقدیر صاحب' مسٹر ابوطاہر صاحب' سید سبط نبی نقوی صاحب' خان صاحب باقر علی صاحب' زبیدہ خاتون صاحبہ (اردو ترینِنگ اسکول نسواں) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان صاحبوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ پونا میں انجمن ترقیء اردو کی شاخ قائم کر کے اس کے مقاصد کو عمل میں لانے کی کوشش کریں گے —

میں اس خوش خبری کا منتظر ہوں

پونا میں سر رفیع الدین صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ اگرچہ اب ان کی بصارت جاتی رہی ہے لیکن عام صحت اور دماغی قوت اب تک ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ انہوں نے اپنے زمانے میں اردو کے لیے بہت کچھہ کیا تھا —

۲ - ہندوستانی اکیڈیمی کا سالانہ جلسہ

اسی سال ہندوستانی اکیڈیمی کا اجلاس بہت ہی ناگوار حالات میں ہوا۔ ہندو مسلم فساد کی وجہ سے الہ آباد درندآباد ہوگیا تھا۔ پہلا اجلاس ۱۹ مارچ کی سہ پہر کو ہوا۔ سر سلطان احمد اس سال صدر منتخب ہوئے تھے لیکن وہ کسی وجہ سے نہ آسکے' اس لیے صدارت کا فرض بھی رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو نے ادا کیا۔ آپ نے موقع کے مناسب بہت اچھی اور پر لطف تقریر کی۔ شروع میں بڑی معقولیت سے ان اعتراضات کا جواب دیا جو بعض لوگ ہندوستانی اکیڈیمی پر کرتے ہیں اور اس ضمن میں فرنچ اکیڈیمی کا بھی ذکر کیا جس کے سہ صدی جشن میں انہیں شریک ہونے کا اتفاق ہوا تھا۔ آپ نے جدید ہندی کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ آج کل جو تقریریں اس زبان میں کی جاتی ہیں اور جو ہندی ہندی رسالوں میں لکھی جاتی ہے وہ ہندی دانوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے چند ہندی رسالے لیے اور ان کے مضامین بغور دیکھے' میں خود بھی ہندی جانتا ہوں اور اپنے ایک دوست کو جو ہندی زبان سے بخوبی واقف ہیں' انہیں بھی دکھائے۔ ان مضامین کے پڑھنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ تقریباً ۷۲ فی صدی ایسے الفاظ تھے جو ہم نہ سمجھ سکے۔ ایسی زبان لکھنے سے کیا فائدہ جسے عام طور پر لوگ نہ سمجھ سکیں۔ یہی اعتراض ان کا پنجاب کے بعض اردو رسالوں کے متعلق تھا۔ آپ نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ میرے سامنے بیٹھے ہیں ورنہ میں بہت کچھ کہتا' لیکن اتنا ضرور کہتا ہوں کہ اردو جسے کہتے ہیں وہ ان کی اور ان کے

رسالے کی زبان ہے - ایک خیال انھوں نے یہ بھی ظاہر کیا کہ صورت کچھ ایسی آپڑی ہے کہ ہندی اور اردو اب دو الگ الگ زبانیں ہوگئی ہیں - کچھ زمانہ پہلے ممکن تھا کہ وہ ایک ہوجاتیں لیکن اب ان کا ایک ہونا ممکن نہیں معلوم ہوتا - لہذا انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اپنی اپنی راہ پر الگ الگ ترقی کرنے دیا جائے - اس خیال سے ان اصحاب کو ضرور افسوس اور صدمہ ہوگا جو ہندستان میں ایک مشترک زبان دیکھنے کے آرزو مند ہیں —

سرتیج بہادر نے اردو کے متعلق لکھنؤ میں بھی بعض خیالات کا اظہار فرمایا تھا جو ہماری توجہ اور غور کے قابل ہیں - وہ ہم نے ایک اخبار سے دوسری جگہ نقل کیے ہیں —

جناب صدر کی تقریر کے بعد ہندی اور اردو شعبوں کے صدروں کی تقریریں ہوئیں - ہندی شعبے کے صدر صاحب نے نہایت مختصر تقریر فرمائی یعنی صرف چند ہی جملے ارشاد فرمائے - اردو شعبے کے صدر جناب سجاد حیدر صاحب نے اپنا خطبہ پڑھا جس میں اردو زبان کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی تھی - رسم خط کے معاملے میں ان کی رائے رومن حروف کے حق میں ہے - رسم خط کا مسئلہ آج کل ہر جگہ بحث میں آرہا ہے - صرف ادیب اور ادبی مجلسیں ہی اس پر غور نہیں کر رہی ہیں، بلکہ سیاسی جماعتوں میں بھی اس کا چرچا ہے - چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر نے بھی اپنے خطبے میں رومن حروف کے اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے —

آخر میں اکیڈیمی کے فاضل سکرٹری ڈاکٹر تارا چند نے ایک تحریر پڑھ کر سنائی - ابتدا میں بہت ہی مختصر طور پر اکیڈیمی کا ذکر تھا

لیکن اصل بحث ہندستانی زبان سے تھی - ان کی یہ راے ہے کہ اصل زبان ہندستانی ہے اور اردو اور ہندی اس کی دو شاخیں ہیں - ہندستانی سے مراد وہ زبان ہے جو ہندو مسلم اتحاد سے بنی اور جس میں نہ دقیق اور مشکل فارسی عربی الفاظ ہیں اور نہ سنسکرت کے - گویا یہ ایسی زبان ہے جسے ہندو مسلمان اور ہندستان کے دوسرے باشندے عام طور پر سمجھتے ہیں —

ہر سال پہلے اجلاس کے ختم پر سر تیج بہادر سپرو کی طرف سے ایٹ ہوم دیا جاتا تھا - اس سال بھی حسب معمول آپ نے دعوتی رقعے تقسیم کیے تھے - لیکن شہر میں ایسی ہڑبونگ مچی ہوئی تھی کہ اس کا انتظام نہ ہوسکا - جلسے میں بھی وہ رونق نہ تھی جیسی ہر سال ہوتی ہے - خود شہر کے بہت سے لوگ شریک نہ ہوسکے —

دوسرے دن کی نشست ۸ سے ۱۲ بجے تک رہی - ایک کمرے میں ہندی والے اور دوسرے میں اردو والے جمع ہوئے - اس میں خاص خاص مضامین پڑھے گئے - یوں تو مضامین بہت سے تھے لیکن مجبوری کی وجہ سے مضمون پڑھنے والے جلسے میں نہ آسکے - صرف چار مضمون پڑھے گئے - سید آل احمد سرور صاحب لکچرار مسلم یونیورسٹی نے "اقبال اور ابلیس" پر ایک مقالہ پڑھا - خوب لکھا تھا - مضمون اور زبان دونوں اعتبار سے قابل تعریف تھا - مولانا سید سلیمان ندوی نے بعض الفاظ کی اصل و تحقیق پر بہت دلچسپ مضمون پڑھا - اس کا عنوان غالباً یہ تھا "چند پرانے لفظ نئے لباس میں" - ایک مضمون میں نے "اردو کے قدیم کتبے" پڑھا - یہ اس رسالے میں موجود ہے - یہ چیز سامعین کے لیے بالکل نئی تھی - آخر میں ایک صاحب نے ایک مضمون

پڑھا جس میں یہ بحث تھی کہ اردو شاعری اور غزل پر فارسی سے زیادہ ہندی کا اثر ہے - مضمون تلاش سے لکھا تھا - بس اسی پر جلسہ ختم ہو گیا —

۳ - ہندستانی کمیٹی صوبۂ بہار

پچھلے نمبر میں اس کے متعلق ذکر آچکا ہے - اس وقت تک اس کی تاریخ مقرر نہیں ہوئی تھی - بعد میں اطلاع آئی کہ اس کی تاریخ ۲۲ و ۲۳ مارچ مقرر کی گئی ہے - اس کا پہلا اجلاس ۲۲ کی سہ پہر کو پٹنہ یونیورسٹی کے سنڈیکٹ کے کمرے میں ہوا - مفصلۂ ذیل ارکان شریک جلسہ تھے :-

۱ - ڈاکٹر راجندر پرشاد (صدر)

۲ - ڈاکٹر ایس - سنہا ' وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی -

۳ - ڈاکٹر ذاکر حسین ' جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی -

۴ - ڈاکٹر تارا چند ' الہ آباد یونیورسٹی -

۵ - ڈاکٹر بی - آر سکسینہ ' الہ آباد -

۶ - مولوی عبدالحق' حیدرآباد دکن -

۷ - مولانا سید سلیمان ندوی صاحب' دارالمصنفین اعظم گڈھ -

۸ - خواجہ غلام السیدین صاحب' مسلم یونیورسٹی علی گڈھ -

۹ - پروفیسر نرائن دیو' بنارس -

۱۰ - پروفیسر بدری ناتھہ ورما' پٹنہ -

۱۱ - راجہ رادھکا رامن پرشاد سنہا سورج پور -

افسوس کہ مولانا ابوالکلام آزاد تشریف نہ لاے - اُن سے زبان کے معاملے میں بہت سی باتیں کرنی تھیں - ڈاکٹر سید عابد حسین بھی بوجہ علالت شریک جلسہ نہو سکے -

ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم نے کمیٹی کا افتتاح فرمایا اور اپنی تقریر میں ارکان مجلس کی شرکت پر خوشی کا اظہار کیا اور هندستان کے لیے ایک قومی زبان کی ضرورت اور اهمیت پر زور دیا - اس امر پر افسوس ظاهر کیا کہ هم اپنے ملک کی مشترک زبان کی طرف سے بہت غفلت کر رهے هیں اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے هیں اور کمیٹی سے التجا کی کہ وہ قابل عمل اور قابل قبول تجاویز پیش کر کے اپنی قومی زبان کی ترقی میں مدد دے تا کہ هندستانی زبان هماری تعلیم کا ذریعہ بن سکے -

اس کے بعد کمیٹی کا کام شروع هوا - اس اجلاس میں جو دو گھنٹے تک رها ، اس مسئلے کے عام اصولوں پر بحث هوتی رهی -

دوسرے دن کمیٹی کا اجلاس ڈاکٹر ایس - سنہا وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی کے مکان پر آٹھہ بجے صبح سے هوا اور مسلسل تین گھنٹے کے غور و فکر اور بحث مباحثے کے بعد یہ رزولیوشن بالاتفاق منظور هوے :—

۱ - هندستانی وہ زبان هے جو شمالی هند میں معمولی بول چال میں اور آپس کے میل ملاپ کے وقت استعمال کی جاتی هے اور جو هندی اور اردو کی مشترک بنیاد هے -

ثانوی تعلیم کے درجے تک مختلف مضامین کی کتابوں کی ترتیب و تالیف میں هندستانی زبان استعمال کی جاے اور ان کتابوں میں

اصطلاحی الفاظ مشترک ہونے چاہئیں - اِن اصطلاحوں کی بنیاد ہندستانی الفاظ پر قائم کی جائے اور جہاں اس طرح اصطلاحیں نہ بن سکیں تو دوسری زبانوں سے الفاظ لیے جاسکتے ہیں - یہ اصطلاحیں ہندستانی زبان کی صرف و نحو کے مطابق بنائی جائیں -

قرار پایا کہ سکرٹری (مسٹر نجم الہدیٰ) اُن انگریزی ' ہندی اور اردو اصطلاحوں کی ایک فہرست مرتب کریں جو ہائی اسکول کی جماعتوں تک کی نصاب کی کتابوں میں استعمال ہوتی ہیں - یہ فہرستیں کمیٹی کے ارکان کی خدمت میں بھیجی جائیں تاکہ وہ اُس اصول کے مطابق جس کا اوپر ذکر ہوا ہے ، ہندستانی اصطلاحیں بنائیں -

یہ تمام اصطلاحیں جو اس طرح بنائی جائیں گی کمیٹی کی منظوری کے بعد بہار کے مدارس کی کتابوں میں استعمال کی جائیں گی -

سکرٹری یہ فہرستیں ۳۰ اپریل سنہ ۱۹۳۸ تک ممبروں کے پاس بھیج دیں - اس کے بعد کمیٹی کا اجلاس آخری فیصلے کے لیے مقرر کیا جائے گا -

۴ - ادبی ریڈروں میں جس قسم کے انتخاب شریک کیے جائیں گے ان کی نوعیت یہ ہونی چاہیے :-

(الف) ہندی اور اردو کے مشہور مصنفین کے کلام کے انتخاب -

(ب) سادہ ہندی اور اردو کے انتخاب دونوں کے لیے مشترک ہونگے -

(ج) ہندی ریڈروں کے لیے اردو عبارتوں کا انتخاب ایسا ہونا چاہیے جو اسی درجے کی ہندی ریڈر کے معیار سے کسی قدر کم ہو - اور یہی صورت اردو ریڈروں کے لیے ہندی عبارتوں کے انتخاب کی ہوگی —

۳ - پرائمری جماعتوں کی ریڈریں ہندستانی زبان میں ہونگی - اِن ریڈروں میں نثر کا حصہ یکساں یعنے مشترک ہوگا، البتہ نظم کے حصے میں سادہ ہندی اور اردو کی نظمیں مختلف ہوسکتی ہیں —

۴ - ریڈروں کے لکھوانے کے لیے سکرتری صاحب بذریعہ اشتہار درخواست طلب کرکے یا کسی دوسرے طریقے سے مصنفوں اور مولفوں کے ناموں کی ایک فہرست تیار کریں - اس کے بعد کمیٹی ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کی ریڈروں کے لکھوانے کے لیے اس فہرست میں سے مناسب صاحبوں کا انتخاب کرے گی —

۵ - مولوی عبدالحق مجاز کیے جاتے ہیں کہ ہندستانی زبان کا لغت تیار کریں، جس میں وہ تمام عربی فارسی لفظ آجانے چاہییں جو مستند ہندی مصنفوں نے استعمال کیے ہیں، اسی طرح وہ تمام ہندی اور سنسکرت الفاظ بھی شریک کیے جائیں جو مستند اردو مصنفوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں —

اس لغت کے جو حصے تیار ہوتے جائیں وہ مولوی عبدالحق ڈاکٹر تارا چند کو بھیجتے جائیں جو اُن کی نظر ثانی پنڈت رام نراین تری پٹھی سے کرائیں گے - اس نظر ثانی میں ڈاکٹر بی - آر سکسینہ اور دوسرے اہل علم بھی شریک رہیں گے —

۶ - مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر تارا چند سے درخواست کی جاتی ہے کہ ہندستانی زبان کی گریمر تیار کردیں - اس میں وہ دوسرے اہل علم سے بھی مشورہ لے سکتے ہیں —

۴ - شاخ انجمن ترقی اردو ، الہ آباد

جن ایام میں میں ہندستانی اکیڈیمی کی شرکت کے لیے الہ آباد جانے والا تھا، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ انجمن کی شاخ "انیس اردو" کا بھی ایک جلسہ کرلیا جائے گا - لیکن اُن دنوں میں کسی جلسے کا ہونا ممکن نہ تھا، اس لیے پٹنے سے واپسی پر ۲۷ مارچ کو ڈاکٹر صاحب کے مکان پر جلسہ کیا گیا - اس میں متعدد تجاویز پیش اور منظور ہوئیں - ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے جو خبریں یا مضامین نشر کیے جاتے ہیں وہ زیادہ تر ہندستانی میں ہوتے ہیں - ہندی کے علم برداروں نے اس کے خلاف آواز بلند کی ہے - گویا ہندستانی ملکی زبان نہیں - اس بارے میں اس جلسے نے انجمن ترقیء اردو ہند کو خاص طور پر توجہ دلائی —

کام کی سہولت کے لحاظ سے مختلف شعبوں کی الگ الگ کمیٹیاں بنادی گئیں - ان کی تفصیل یہ ہے —

۱ - مجلس تحقیق حالات دسٹرکٹ بورڈ - اس کمیٹی کے سات ارکان تجویز ہوے اور مفتی فخرالاسلام اس کے داعی قرار پاے —

۲ - مجلس نگران اخبارات و رسائل - اس کے پانچ ارکان تجویز ہوے اور صدر ڈاکٹر زبید احمد صاحب —

۳ - مجلس تعلیمی - اس کے پانچ رکن تجویز ہوے اور داعی پروفیسر ڈاکٹر حفیظ سید - اس کا ضمنی شعبہ نصاب تعلیم ابتدائی کا ہے جس کے ارکان ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب، مفتی فخرالاسلام اور مولوی ظفر احمد صاحب تجویز ہوے —

۴ - سائنس بورڈ کی کمیٹی - اس کے پانچ ارکان ہیں - اور صدر جناب سید افضال احمد —

۵ - مجلس تاجران و تجارت - اس کے تین ارکان تجویز کیے گئے -

تجویزیں بہت معقول ہیں - اور اس سے قبل جو جلسہ گزشتہ ستمبر میں ہوا تھا اس میں انجمن کے جو مقاصد طے ہوئے تھے وہ بہت جامع اور ضروری ہیں - یہ سب کچھ ہے لیکن سب سے زیادہ ضرورت عمل کی ہے - اور امید ہے کہ یہ مجلسیں اپنے اپنے فرائض کو توجہ اور تن دھی سے انجام دیں گے - انجمن کے معتمد مولوی خلیل الرحمن صاحب اور شریک معتمد سید اختر حسین صاحب دونوں بہت مستعد ہیں اور اردو کا درد رکھتے ہیں - ان دونوں صاحبوں سے یہ توقع ہے کہ وہ ان مجلسوں کو عمل کی طرف متوجہ کرتے رہیں گے —

۵ - ودیا مندر اسکیم

ودیا مندر اسکیم کا معاملہ ابھی تک طے نہیں پایا - مسٹر شکلا وزیر تعلیم نے مجھے ودیا مندر اسکیم کی ایک نقل بھیجی تھی اور خواہش کی تھی کہ میں اپنی رائے اس کے متعلق ظاہر کروں - اس کے جواب میں میں نے جو خط انہیں لکھا تھا اس کا ترجمہ یہ ہے —

ڈیر مسٹر شکلا -

میں آپ کے عنایت نامے مورخہ ۲ مارچ سنہ ۱۹۳۸ ع اور ودیا مندر اسکیم کی مرسلہ نقل کا بہت شکر گزار ہوں —

میں نے اس اسکیم کو بغور پڑھا ' خصوصاً اس نظر سے کہ آپ کے صوبے

کے اردو بولنے والے طبقے پر اس کا کیا اثر پڑے گا —

اس اسکیم میں دو امور آپ کے غور کے قابل ھیں —

(۱) مجوزہ مدارس کا نام یعنے " ودیا مندر" لفظی اعتبار سے کیسا ھی اچھا ھو، لیکن اس ملک میں ایک قومی ادارے کے لیے ھرگز موزوں نہیں ھوسکتا، اس سے مذھبی اندیشے پیدا ھونگے - خود آپ کی اسکیم کے یہ الفاظ کہ " اس نام میں کئی کششیں ھیں" ان اندیشوں کو سمجھا رھے ھیں - یہ الفاظ پڑھ کر یہ پوچھنے کو جی چاھتا ھے کہ علاوہ خالص تعلیمی کشش کے دوسری کششیں کونسی ھیں - صرف یہی نہیں بلکہ (جیسا کہ اسکیم میں درج ھے) آپ کی اسکیم ۹۹ فی صدی اشخاص میں مقبول ھونے کی توقع رکھتی ھے - اس کہ یہ معنے ھوے کہ یہ اسکیم آپ کے صوبے کی اکثریت کے لیے ایک فرقہ واری کشش رکھتی ھے - اس بنا پر میں آپ کو مشورہ دیتا ھوں کہ اس نام کو بدل کر کوئی مناسب نام تجویز کیجیے - نیز ایک طبقے کے مدارس کے لیے ودیا مندر اور دوسرے طبقے کے مدارس کے لیے بیت العلوم کے نام تجویز کرنے سے بھی یہ مشکل حل نہیں ھوتی - اس سے خواہ مخواہ مذھبی تفریق کا خیال پیدا ھوگا —

سب سے آسان بات تو یہ تھی کہ ھندستانی زبان میں جو الفاظ مروج ھیں انھیں میں سے کوئی اختیار کر لیا جاتا، مثلاً مکتب، مدرسہ، سکول - لیکن اگر آپ کو کسی نئے لفظ ھی کے ایجاد کا شوق ھے تو اس کے لیے قدیم لفظوں اور ترکیبوں کی تلاش یا ایسے الفاظ کے استعمال کی کیا ضرورت ھے جن کی تہ میں مذھبی خیال ھو اور جو کسی خاص فرقے کے لیے کشش رکھتا ھو، میں آپ کی خدمت میں " پڑھائی گھر " کا

نام پیش کرتا ہوں جو اپنی ساخت اور ترکیب کے لحاظ سے بالکل ہندستانی ہے —

۴ - اس اسکیم کی رو سے جہاں کہیں ۴۰ لڑکے لڑکیاں پڑھنے کی قابل عمر کی ہونگی وہاں ایک مدرسہ قائم کردیا جاے گا - اس شرط کے ہوتے ہوے ایسے مقام پر کیا انتظام ہوگا جہاں دس اردو کے طالب علم ہیں اور تیس مرہٹی کے - اسکیم میں یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ تعلیم مادری زبان کے ذریعے سے ہوگی - ایسی حالت میں اِن دس اردو بولنے والے طالب علموں کا کیا حشر ہوگا - اگر آپ انہیں مرہٹی کے ذریعے سے تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کریں گے تو یہ آپ کی اسکیم کے مقصد کے خلاف ہوگا - اس مشکل کے رفع کرنے کے لیے کیا آپ اِن دس اردو کے طالب علموں کے لیے الگ مدرسہ قائم کریں گے ؟ آپ یہ نہیں کرسکتے تو لازمی اور جبری تعلیم کی صورت میں جو والدین کو سزا دی جاے گی اُسے اٹھا دینا پڑے گا - اور اگر آپ یہ کرتے ہیں تو اس سے آپ کی اسکیم کی غایت فوت ہوجاتی ہے -

ان تمام حالات پر غور کرنے کے بعد میں محسوس کرنے پر مجبور ہوں کہ آپ کی اسکیم زیادہ تر، بلکہ تمام تر، آپ کے صوبے کے ایک ہی فرقے کے لیے کار آمد ہوسکتی ہے اور دوسرے فرقے کے لیے کسی طرح مفید نہیں ہو سکتی - میری راے میں یہ مناسب ہوگا کہ آپ اس کے بجاے وردھا اسکیم کو، وہ جیسی کچھہ بھی ہے، اختیار کرلیں اور اپنے صوبے میں اس کا تجربہ کر کے دیکھیں -

آخر میں میں آپ کی نئی اسکیم متعلق ضلع بیتول کا ذکر کرنا چاہتا

ہوں - آپ اس ضلع میں ۱۲۶ مدرسے کھولنا چاہتے ہیں جنہیں گورنمنٹ سے امداد دی جاے گی - مجھے امید ہے کہ یہ مدرسے بھی وردھا اسکیم کے تحت کام کریں گے " -

میں ۱۷ مارچ کو ایک دن کے لیے ناگپور گیا اور بعض اصحاب سے اس اسکیم کے متعلق مشورہ کیا - اسی شب کو ایک عام جلسہ عبدالسلام فاروقی صاحب ایڈوکیٹ ہای کورٹ ناگپور کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں میں نے ہندستان کی مشترکہ زبان اردو یعنی ہندستانی پر تقریر کی - تقریروں کے بعد یہ قرارداد بالاتفاق منظور ہوی کہ ایک وفد اُس مجلس نصاب تعلیم کی خدمت میں حاضر ہو جو گورنمنٹ نے ودیا مندر اِسکیم کے ضمن میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں قائم کی ہے اور مجلس کے سامنے اِس صوبے کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اور اردو مدرسوں کے قیام کے مناسب انتظام کے متعلق اپنی تجاویز پیش کرے - انجمن ترقی اردو ناگپور نے بھی اپنے جلسے میں اس اسکیم کے خلاف قرارداد منظور کی اور اس کی نقلیں گورنمنٹ سی پی کو، مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو بھیجی گئیں -

اس معاملے میں علاوہ انجمن ترقیء اردو ناگپور کے خان بہادر مرزا رحمن بیگ صاحب اور خان صاحب عبدالرحمن خان صاحب ایم-ایل-اے نے خاص طور پر کوشش کی، اسمبلی میں بھی اور اسمبلی کے باہر بھی - ہم جناب خان صاحب کے بہت ممنون ہیں کہ انھوں نے اردو کی حمایت میں عین وقت پر کام کیا - انھوں نے گاندھی جی کو اس بارے میں ایک مفصل خط لکھا ہے - اگر اس پر توجہ کی جاتی تو یہ مسئلہ

بہت آسانی سے حل ہو جاتا - مرزا صاحب نے اِس خط میں بڑی تفصیل سے اس اسکیم پر بحث کی ہے اور اس کے نقائص اور نتائج پر پوری روشنی ڈالی ہے - آخر میں انہوں نے مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کو مد نظر رکھہ کر چند تجویزیں پیش کی ہیں اور گاندھی جی سے درخواست کی ہے کہ وہ ان پر غور فرمائیں اور صوبے کی گورنمنٹ کو مشورہ دیں کہ اس معاملے میں مناسب کارروائی کرے -

وہ تجاویز یہ ہیں :—

(۱) ودیا مندر کے نام کا فیصلہ بہار کمیٹی کے سپرد کردیا جاے جس میں بابو راجندرا پرشاد' مولوی عبدالحق اور دیگر اصحاب شریک ہیں تاکہ وہ اس کے بدلے کوئی ایسا نام تجویز کریں جو تمام فرقوں کے لیے قابل قبول ہو -

(۲) مسلمانوں کی لازمی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ وردھا اسکیم کے تحت حل کیا جاسکتا ہے —

(۳) موجودہ اردو پرائمری اور مڈل اسکول علیٰ حالہ قائم رہنے چاہییں - نہ تو وہ بند کیے جائیں اور نہ کبھی وہ ہندی یا مرہٹی اسکولوں میں ضم کیے جائیں —

(۴) جہاں کافی تعداد پڑھنے والوں کی مل سکے وہاں گورنمنٹ کے خرچ سے اردو مدرسہ قائم کردیا جاے —

(۵) جہاں کہیں تعداد کافی نہ ہو اور علحدہ اردو کا مدرسہ نہ کھولا جاسکے' وہاں ان لڑکوں کو ان کی مادری زبان یعنی اردو میں تعلیم دینے کا انتظام کیا جاے —

(۶) چونکہ تعلیم کا تعلق ہر قوم کی زبان اور تہذیب سے ہے لہذا ہر

کمیٹی میں جو اس غرض سے قائم کی جائے' مسلمانوں کی مناسب
نیابت کا خیال رکھا جائے - مسلمانوں کو اپنی زبان کے مستقبل کے
متعلق بہت بڑا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے - ان کو نصاب کی کمیٹی'
ہائی ایجوکیشن بورڈ' ٹکسٹ بک کمیٹی' نیز یونیورسٹی کی
کمیٹیوں میں شریک ہونے کا پورا موقع دیا جائے —

(۷) اردو اسکولوں کے نام کا مسئلہ نیز یہ مسئلہ کہ علحدہ اردو مدرسے کھولنے کے لیے کس قدر طالب علموں کی شرط لگائی جائے' مسلم تعلیمی اداروں اور مسلم ماہران تعلیم کے مشورے سے طے کیا جائے (یہاں انھوں نے ان اداروں وغیرہ کے نام بھی لکھ دیے ہیں)' اور زبان کے معاملے میں انجمن ترقیٔ اردو ہند کا فیصلہ ناطق سمجھا جائے —

ان میں اکثر تجویزیں بہت معقول اور ضروری ہیں لیکن ان پر کوئی توجہ نہیں کی گئی اور نہ آئندہ اس کی توقع ہے —

نتیجہ یہ ہے کہ سی - پی کی حکومت نے اس سال دو لاکھ روپیہ ودیا مندر اسکیم کے لیے منظور کیا ہے - اردو کی قسمت میں اس میں سے ایک حبہ بھی نہیں - بیتول کے ضلع میں ہندی لازمی کی جارہی ہے - صرف ایک اردو اسکول تھا وہ بھی بند کردیا گیا - چنانچہ ناگپور کا روزانہ انگریزی اخبار "ہتوادا" ۲۵ فروری سنہ ۱۹۳۸ ع کی اشاعت میں لکھتا ہے —

"ڈسٹرکٹ کونسل بیتول نے اپنے ضلع میں جبری تعلیم جاری کرنے کے لیے ایک اسکیم پیش کی ہے جس کی رو سے ۳۹ دیہاتی مرکز قائم کیے گئے ہیں جن میں ۹۶ گانو ایسے ہیں جن میں کوئی مدرسہ نہیں -

تجویز یہ ہے کہ جبر بتدریج عمل میں لایا جائے - یعنی پہلے سال ۶ سے ۸ سال تک کی عمر والوں کے لیے ؛ دوسرے سال ۶ سے ۹ اور تیسرے سال ۶ سے ۱۰ اور ۶ سے ۱۱ تک کی عمر کے بچوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے - اس اسکیم سے صرف یورپین اور اینگلو انڈین مستثنیٰ کیے گئے ہیں باقی سب پر اس کا نفاذ ہوگا - ذریعۂ تعلیم ہندی زبان ہوگی اور دس سال کی عمر تک لڑکے لڑکیاں مل کر پڑھیں گے - اسی قسم کی بیتول ضلع کے لیے دو اور اسکیمیں پیش کی گئی ہیں اور رقمیں بھی منظور ہو گئی ہیں —

اس سے صاف ظاہر ہے کہ بیتول ضلع میں اردو کے پڑھانے کا کوئی انتظام نہ ہوگا - ڈسٹرکٹ کونسل اور حکومت نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ضلع بھر میں کسی کی زبان اردو نہیں اور نہ اس کی تعلیم کی کوئی ضرورت ہے —

اسی خیال سے میں نے تین مستعد نوجوان طالب علموں کو سی - پی اور برار کے دورے پر بھیجا ہے کہ وہ اس صوبے کے اضلاع اور قصبات کا دورہ کر کے تمام ضروری معلومات بہم پہنچائیں اور یہ دیکھیں کہ اردو کی تعلیم و اشاعت کے کیا امکانات ہیں اور اس کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں - اس کے متعلق میں آئندہ تفصیل سے لکھوں گا —

نصاب تعلیم کی کمیٹی کی رپورٹ کا بھی انتظار ہے - یہ دیکھنا ہے کہ اس نے کیا تجاویز پیش کی ہیں - افسوس ہے کہ اِن تمام کمیٹیوں میں صوبے کے کسی مسلمان کو شریک نہیں کیا گیا ، حالانکہ اس کی بہت ضرورت تھی ، اس سے کمیٹی کے کام میں آسانی پیدا ہوتی اور اسے علم ہو جاتا کہ وہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اور مطالبات کیا ہیں —

وردہ میونسپل کمیٹی نے اردو اسکول کا نام بدل کر " اردو ودیا مندر "

رکھہ دیا ھے - مسٹر هدایت علی ایم - ایل - اے نے اس کے متعلق اسمبلی میں سوال کیا تو مسٹر شکلا وزیر تعلیم نے اس کا اعتراف کیا کہ بے شک نام بدل دیا گیا ھے - اور جب انہوں نے یہ پوچھا کہ کیا گورنمنٹ نے اس کے متعلق کوئی احکام جاری کئے تھے ' تو جواب دیا گیا کہ نہیں - اس کے بعد کے سوال و جواب یہ هیں : —

سوال — کیا یہ واقعہ ھے کہ وردہ کے مسلمانوں کو اس نام کی تبدیلی پر سخت اعتراض ھے ؟

جواب - ڈپٹی انسپکٹر اردو مدارس کا بیان ھے کہ مسلمانوں کو عام طور پر میونسپل کمیٹی کے اس عمل کے خلاف اعتراض ھے - لیکن وردہ کے کسی مسلمان کی طرف سے میونسپل کمیٹی میں کوئی شکایت یا اعتراض پیش نہیں ہوا —

سوال - کیا گورنمنٹ کو احتجاجی ریزولیوشن وصول ہوئے هیں ؟ کیا امراؤتی ڈسٹرکٹ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے کوئی احتجاج اس بارے میں کیا گیا ھے ؟

جواب - امراؤتی ڈسٹرکٹ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی سنٹرل سٹینڈنگ کمیٹی کی طرف سے اس کی مخالفت میں ایک رزولیوشن وصول ہوا ھے —

سوال - کیا گورنمنٹ مہربانی کر کے اردو اسکول وردہ کے سابق نام کے بر قرار رکھنے میں کوئی کارروائی کرے گی ؟ —

جواب - ڈپٹی کمشنر نے میونسپل کمیٹی کو اس معاملے کی طرف توجہ دلائی تھی - کمیٹی کا جواب رزولیوشن نمبر ۳ مورخہ ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۳۸ ع میں موجود ھے —

کمیٹی میں ڈپٹی کمشنر کا خط پیش کیا گیا - اس پر جو بحث ہوئی اس میں یہ بیان کیا گیا کہ بے شک نام بدل دیا گیا ہے اور اس سے کسی فرقے یا مذہب کے جذبات کو صدمہ پہنچانا مقصود نہیں ہے - اور محض نام کے بدلنے سے مسلمانوں کی تہذیب پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اور نہ اس سے اکثریت کی تہذیب کا احیا اور تفوق قائم کرنا مقصود ہے -

اس تمام کارروائی سے ظاہر ہے کہ ہوا کا رخ کدھر ہے —

۶ - مدراس کے وزیر اعظم اور ہندی اور ہندستانی

ہندی کو جبری طور پر مدارس میں رائج کرنے کے متعلق مدراس لیجسلیٹو اسمبلی کے مسلمان ممبروں نے بہت سخت اعتراض کیے - جس کے جواب میں وزیر اعظم نے فرمایا کہ اردو یا دیوناگری رسم خط کو ہندو مذہب اور اسلام سے کوئی تعلق نہیں - اور پھر کہا کہ ہندی ہندستان کی زبان ہے جسے کسی مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہے - وہ ہندی کے رائج کرنے سے ہندستان کے لیے کوئی مشترک زبان پیدا نہیں کرنا چاہتے، لیکن ان کے لڑکوں کو ہندی جاننا ضروری ہے اس لیے کہ زیادہ تر یہی زبان ہندستان میں بولی جاتی ہے —

مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق وزیر اعظم نے اپنا سابق وعدہ پھر دھرایا اور کہا کہ جہاں تک فنڈ میں گنجائش ہوگی وہ مسلمانوں کی تعلیم پر فیاضی کے ساتھ رقم صرف کریں گے —

یہ ٹائمز آف انڈیا اور دوسرے اخباروں کی رپوٹ ہے لیکن

بمبئی سینٹینل مورخہ ۲۳ مارچ سنہ ۳۸ ئ کا بیان اس سے کسی قدر مختلف ہے - وہ یہ ہے —

" مسٹر سی راج گوپال چاری وزیر اعظم نے مدراس لیجس لیٹو کونسل میں ہندستانی کے متعلق کانگرس گورمنٹ کا طرز عمل صاف صاف بیان کر دیا —

اسمبلی میں دیوناگری اور عربی رسم خط کے متعلق معمولی نزاع پیدا ہوگیا - اس پر وزیر اعظم نے کہا کہ رسم خط کو کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں - مقصد صرف یہ ہے کہ ہندستانی کا کام چلاؤ علم آجائے " -

اڈیٹر سینٹینل لکھتے ہیں کہ افسوس ہے کہ یہ واقعہ نہیں ہے اور حیرت کی بات ہے کہ مسٹر راج گوپال چاری جیسا شخص اتنا بھی نہیں جانتے کہ جس رسم خط میں قرآن لکھا جاتا ہے مسلمانوں کی نظر میں وہ مذہبی رو سے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے —

اس سے قطع نظر مسٹر راج گوپال چاری نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ہر طرح قابل قبول ہے اور امید ہے کہ ہندستانی کے مخالف اور ہندی زبان کے مجنوں حامی اسے ذہن میں رکھیں گے —

مدراس کے وزیر اعظم نے یہ بھی کہا کہ ان کی یہ خواہش نہیں ہے کہ ہندستان کے لیے کسی مشترک زبان کو رائج کریں لیکن اُن کی راے میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں سے اکثر و بیشتر " ہندی یا ہندستانی " جانیں —

یہ پہلا وقت نہیں ہے کہ ایسا بیان کیا گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ ہندی کے پرچارکوں (مبلغوں) نے اپنی کوششوں سے یہ خیال پیدا کر دیا ہے کہ وہ ہندستانی کے بجاے جو ہندستان کی عام اور مشترک زبان ہے '

ایک دوسری زبان کی اشاعت کے درپے ہیں (جس کا نام ہندی ہے) —
اگر اس تحریک کو کامیاب بنانا ہے تو اس خیال کا رفع کرنا نہایت ضروری ہے" —

لیکن ۲۶ مارچ کا 'لیڈر' کچھ اور ہی لکھتا ہے :—

"آج سہ پہر (۱۹ مارچ) کو ہندی کو مدرسوں میں رائج کرنے کے متعلق ایک سلسلۂ سوالات کے جواب میں ڈاکٹر سُبا راین وزیر تعلیم نے کہا کہ گورمنٹ کی پالیسی یہ ہے کہ ہندستانی فسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ فارم میں پڑھائی جائے - سال رواں میں یہ ۱۲۵ مدرسوں میں جن میں ۲۵ گورمنٹ اسکول بھی ہیں، جاری کی جائے گی - یہ مدرسے صوبے کے تمام اضلاع میں پھیلے ہوے ہیں - وہاں اس زبان کے سکھانے میں کوئی دقت نہ ہوگی کیونکہ بعض مدرسوں میں پہلے سے ہندستانی پڑھائی جاتی ہے - ہندستانی نصاب کی کتابیں دونوں خطوں میں تیار کی جائیں گی اور گورمنٹ کی سرپرستی میں شایع کی جائیں گی تاکہ زبان کا ایک معیار قایم ہو جاے" —

اس بحث میں عجیب خلط مبحث ہوگیا ہے - یا تو یہ لوگ ہندی ہندستانی کا فرق نہیں سمجھتے - یا کسی نہ کسی طرح سے ہندی کو سامنے لانا چاہتے ہیں - اول ہندی کہتے ہیں، جب اعتراض ہوتا ہے تو ہندی یا ہندستانی کہہ کر خاموش کر دیتے ہیں - مسٹر راج گوپال چاری نے جتنے بیان اس وقت تک شایع کیے ہیں یا اسمبلی میں جو کچھ کہا ہے وہ اس قدر مبہم اور ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ صحیح طور سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا منشا کیا ہے —

۷ - مسٹر کھیر وزیر اعظم بمبئی اور ہندی

میں اوپر مسٹر کھیر کی ملاقات کا ذکر کرچکا ہوں جس میں انہوں نے لفظ ہندی کے استعمال کے متعلق غلطی کا اعتراف اور آیندہ اصلاح کا وعدہ کیا، لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۱۱ اپریل سنہ ۱۹۳۸ ع میں ان کی اس تقریر کا خلاصہ پڑھا جو انہوں نے گاندھی میدان' دادر میں ہندی سکشا پرچارک سمتی کے سالانہ تقسیم انعام کے موقع پر فرمائی - اس میں ہندی کے متعلق یہ ارشاد کیا ہے —

"مسٹر بی - جی کھیر وزیر اعظم بمبئی نے فرمایا کہ ملک بھر میں کسی کو اس بارے میں مطلق اختلاف نہیں کہ ہندستان کی ایک مشترک زبان ہونی چاہیے ... ... اور سب نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ وہ مشترک زبان ہندی ہونی چاہیے" --

ایک کانگرس حکومت کے وزیر اعظم کی زبان سے ایسے الفاظ کا نکلنا نہایت حیرت انگیز ہے - یہ سراسر غلط ہے کہ سب نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہندستان کی مشترک زبان ہندی ہونی چاہیے' خصوصاً جب کہ خود کانگرس کا قطعی فیصلہ موجود ہے کہ ملک کی زبان ہندستانی ہے - میں ایک مدت تک اس الجھن میں رہا کہ کیا وجہ ہے کہ جب کہ کانگرس نے اپنے رزولیوشن اور اپنے دستور (کانسٹی ٹیوشن) میں صاف طور سے یہ اعلان کردیا ہے کہ ہندستان کی زبان ہندستانی ہے تو پھر کانگرس حکومتوں کے وزرا اور کانگرس کے ارکان کیوں بار بار بجائے ہندستانی کے ہندی کو ملک کی مشترک زبان قرار دیتے ہیں اور جتانے پر اور اپنی

غلطی ماننے پر بھی کیوں اپنے اس خیال پر قائم ہیں اور جب موقع آتا ہے تو وہ اپنی تحریر اور تقریر میں ہندی ہی کا راگ الاپتے ہیں - بہت دنوں کے غور کے بعد یہ راز کُھلا اور وہ یہ ہے کہ

> کانگرس سے بھی بالا اور اعلیٰ ایک ہستی ہے جس کے ایک اشارے، ایک لفظ کے سامنے کانگرس کے تمام رزولیوشن، اس کا دستور اور اس کے ضوابط اور قواعد سب ہیچ ہیں - گاندھی جی نے چونکہ ملک بھر میں ہندی کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے اس لیے کانگرس کا ہر وزیر اور ہر رکن وہی کہتا ہے جو "مہاتما جی" کہتے ہیں - جو نیت امام کی وہی ان کی —

اور لطف یہ ہے کہ گاندھی جی سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہوگئے ہیں، کانگرس کے چار آنے والے ممبر بھی نہیں، اس لیے ان سے کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ آپ کانگرس کے رزولیوشن کی کیوں پابندی نہیں کرتے - باوجود اس کے کانگرس ان کی انگلیوں پر ناچتی ہے اور کسی وزیر یا کانگرس کے ممبر یا کانگرس کے پریزیڈنٹ کی یہ مجال نہیں کہ ان سے اختلاف کر سکے - یہ ہے اصل حقیقت اس قصے کی —

لیکن اصولاً کانگرس کے کسی رکن کو اور خصوصاً کسی وزیر حکومت کو یہ حق نہیں کہ وہ ہندی کا پرچار کرے - اگر اسے ایسا ہی شوق ہے تو پہلے اسے کانگرس سے مستعفی ہوجانا چاہیے اور پھر اس کام کو کرنا چاہیے، جب تک وہ کانگرس میں ہے اس پر کانگرس کے قواعد کی پابندی لازم ہے -

---

۸ - راشٹر بھاشا کانفرنس اور مسٹر کھیر اور مسٹر سوباش چندر بوس وغیرہ کے ارشادات

۲۰ فروری کو کانگریس کی سبجیکٹ کمیٹی کے پنڈال میں راشٹر بھاشا (قومی زبان) کا اجلاس ہوا جس کے صدر جمنا لال بجاج تھے - اس موقع پر مسٹر سوباش چندر بوس صدر نیشنل کانگریس کا پیغام پڑھا گیا جس میں ہندستان کے لیے ایک مشترک زبان کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا - ان کی رائے میں وہ زبان صرف ہندی یا ہندستانی ہوسکتی ھے - مسٹر بوس نے ان لوگوں سے جنھوں نے اب تک ہندی نہیں سیکھی پرزور درخواست کی کہ وہ اسے جلد سیکھ لیں کیونکہ یہ "ہندستانی قوم کے بنانے میں مدد دے گی" —

سیٹھ جمنا لال بجاج نے اپنے خطبۂ صدارت میں ایک مشترک زبان کی اشاعت کی ضرورت کو پرزور الفاظ میں بیان کیا اور اپنے اہل وطن کو جتایا کہ وہ ہندی زبان کی اشاعت کو سوراج کے حصول کا اصلی جز خیال کریں —

ایک رزولیوشن اس مضمون کا پیش ہوا کہ ایسے تمام ادارے جن کا تعلق ہندستان کے مختلف صوبوں سے ھے، اپنے کاروبار اور مراسلت میں ہندی زبان استعمال کریں - رزولیوشن بالاتفاق منظور ہوا —

اس رزولیوشن کی تائید میں مسٹر کاکا کالیلکر، مسٹر اینے اور مسٹر اننت سیانم آینگار نے بھی تقریریں کیں —

مسٹر کھیر وزیر اعظم بمبئی نے کہا کہ میں نے دکشنا بھارت ہندی سبھا کے مسلسل تین امتحانوں میں کامیابی حاصل کی اور ہر امتحان

میں تمام کامیاب امیدواروں میں اول آیا - میں ہندی کی جماعت میں اپنے دس سالہ بیٹے کے ساتھہ شریک ہوتا تھا - اور باوجود کام کی کثرت کے میں نے ہندی زبان سیکھی - انہوں نے تمام حاضرین سے التجا کی کہ وہ زبان کے مسئلہ کو معمولی نہ سمجھیں بلکہ اس کی طرف پوری توجہ کریں " —

یہ سب کارروائیاں انڈین نیشنل کانگریس کے پنڈال میں ہوتی ہیں- اس کے بعد بھی مدینہ کے فاضل اڈیٹر کو یہ شکایت ہوسکتی ہے کہ کانگریس نگر میں کہیں اردو نظر نہیں آتی —

۹ - صدر کانگرس اور ہندستان کی مشترک زبان

مسٹر سوبھاش چندر بوس نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ " جہاں تک ہندستان کی مشترک زبان سے تعلق ہے اس کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ ہندی اور اردو کا امتیاز مصنوعی ہے - اصل زبان وہ ہے جو ان دونوں کے میل سے بنی ہے اور جو ملک کے اکثر حصوں میں روز مرہ بولی جاتی ہے اور ہندی اور اردو دونوں حروف میں لکھی جا سکتی ہے - میں جانتا ہوں کہ ہندستان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان میں سے ایک رسم خط کے حامی ہیں اور دوسرے کے بالکل روادار نہیں - مگر ہماری پالیسی ناروا داری کی نہیں ہونی چاہیے - ہمیں دونوں کے استعمال کی پوری آزادی دینی چاہیے " —

اس کا مقابلہ آپ کے راشٹر بھاشا کانفرنس کے پیغام سے کیجیے - کتنا بڑا تفاوت ہے —

لیکن سب سے طرفہ بات یہ ہے کہ جناب سوبھاش چندر بوس نے انڈین نیشنل کانگریس میں جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا وہ ایسی مشکل ہندی میں تھا کہ خود بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے اور ایک شخص پیچھے بیٹھا ہوا برابر لقمہ دیتا جا رہا تھا —

شاید اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ کانگرس والوں کے قول اور فعل میں بڑا بل ہے —

۱۰ - اڑیسہ میں ہندی کا پرچار

" آنریبل مسٹر بودھ رام دوبے وزیر تعلیم اڑیسہ نے اڑیسہ کے تمام مدارس میں ہندی پڑھانے کے احکام جاری کر دیے ہیں اور کٹک کے بعض مدارس میں اس پر عمل بھی شروع ہو گیا ہے —

عنقریب راونشا گرلز سکول میں لڑکیوں کو ہندی پڑھانے کے لیے مستقل طور پر ایک معلمہ کا تقرر کیا جائے گا " (یونائٹڈ پریس) —

اڑیسہ میں کانگریسی حکومت ہے جو کانگرس کے احکام کی اس طرح تعمیل کر رہی ہے - اب بھی اس میں کسی کو شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ کانگریسی حکومتیں کانگرس کے احکام کو گاندھی جی کے ارشاد کے سامنے بالکل بے حقیقت سمجھتی ہیں - اور لطف یہ ہے کہ ہندستانی کا رزولیوشن جو کانگرس نے منظور کیا وہ حضرت ہی کا لکھا ہوا ہے - لیکن اس سے کیا ہوتا ہے کانگرس والے تو ان کے منشا اور نیت کو دیکھتے ہیں - کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ انڈین نیشنل کانگرس کا نام بدل کر گاندھی کانگرس رکھہ دیا جائے - کہیں تو قول و فعل میں مطابقت ہو —

یہ سب کچھہ ہوتے ہوئے بھی گاندھی جی مسٹر جناّ سے مصالحت کی بات چیت کرنے کے لیے تیار ہیں - اس پر میر صاحب کا یہ مصرع یاد آتا ہے۔

دریا کا پھیر پائیے تیرا نہ پائیے

۱۱ - پراونشل اینٹی ہندی کانفرنس (صوبۂ مدراس)

صوبۂ مدراس میں ہندی کی مخالفت میں ایک کانفرنس قایم ہو گئی ہے - فروری کے آخری ہفتے میں اس کا بڑا جلسہ منعقد ہوا جس کے صدر سر کے وی ریڈی تھے - انہوں نے فرمایا کہ "ہم دراوڑیوں کے لیے ہندی ایسی ہی غیر زبان ہے جیسی انگریزی - اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ نہ تو کسی قدامت کا دعویٰ کرسکتی ہے اور نہ کسی بڑی ترقی کا" —

اسی جلسے میں سر ایم کرشنن نائر نے کانفرس کا افتتاح کرتے ہوے وزارت مدارس کی اُن کوششوں پر سخت اعتراض کیا جو وہ ہندی کو مدرسوں میں داخل کرنے کے متعلق کررہے ہیں - انہوں نے کہا کہ یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے کہ انگریزی کو تو غیر زبان سمجھہ کر خارج کیا جارہا ہے اور لوگوں کی خواہش کے بر خلاف ہندی کو سارے ملک کی زبان بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جو ایک ناممکن کام ہے" -

۱۲ - اردو کے متعلق سر تیج بہادر سپرو کا ارشاد

ہندستانی اکیڈیمی کے تذکرے کے ضمن میں سر تیج بہادر سپرو کے جس ارشاد کا حوالہ دیا گیا تھا اس کا خلاصہ بعض اردو اخباروں میں

شایع ہوا ہے ' جو ہم یہاں نقل کرتے ہیں -

انجمن بہار ادب کا ایک جلسہ سر تیج بہادر کی صدارت میں آج تیسرے روز ختم ہوا - شعرا کی انجمن میں اردو زبان کی سیاسی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوے سر تیج بہادر نے لکھنؤ والوں کو اردو کی حیات کا ذمہ دار ٹھہرایا - اور سخت تردید اُن لوگوں کی کی جو اردو کو محض مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں - انہوں نے فرمایا کہ اردو زبان پر اس سے زیادہ کوی ظلم نہیں ہو سکتا کہ اس کو مسلمانوں سے منسوب کر کے چھوڑ دیا جاے - اردو در اصل ہندو اور مسلمانوں دونوں کے اسلاف کی بنائی ہوئی زبان ہے - اردو زبان کا بڑا کام یہ رہا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کی تہذیب وتمدن کے سمجھنے اور اختیار کرنے میں سہولت ہو ' تاکہ باہمی یکجہتی اور ہم آہنگی قائم ہو سکے - آج سے پچاس سال قبل اسی مقصد کے لیے پچاس پچاس روپے پر معلم مقرر ہوتے تھے ' حالانکہ اب جامعات کے پروفیسروں کی تنخواہیں پندرہ سو تک ہو گئی ہیں - سر تیج بہادر نے فرمایا کہ اگر یہ دو فریق — یعنی ایک اردو میں زیادہ سے زیادہ فارسی عربی الفاظ شامل کرنے والا اور دوسرا زیادہ سے زیادہ سنسکرت الفاظ ٹھونسنے والا — کچھہ عرصے کے لیے اور قائم رہے تو یہ ہوگا کہ آپس میں گفتگو کے لیے بھی مترجم ساتھہ رکھنے پڑیں گے - سر تیج بہادر نے لکھنؤ والوں سے اپیل کی کہ وہ لکھنؤ کی اردو کے احیا پر کمر بستہ ہو جائیں جو اصلی زبان تھی - آخر میں سر تیج بہادر سپرو نے فرمایا کہ

" ہندو مسلم اتحاد کا انحصار
محض اردو کی بقا پر ہے - "

جلسے کو ایسے مقررین نے بھی مخاطب کیا جن کی مادری زبان اردو نہ تھی مگر ان کو اردو سے بڑی دلچسپی تھی - اُنھوں نے اردو کو ملک کی واحد مشترکہ زبان تسلیم کرلیا - چنانچہ مسٹر والفرڈ (اینگلو انڈین طبقے کی جانب سے رکن قانونیہ) نے کہا کہ قانونیہ (لیجس لیٹو کونسل) کی تقریریں اردو زبان کے زوال کا بیّن ثبوت ہیں اور اُن کی ذاتی طور پر یہ راے ہے کہ کوئی یورپین یا اینگلو انڈین جو اردو سے واقف نہ ہو بہت بڑے ظلم کا مرتکب ہوگا - انھوں نے بہت زور دے کر کہا کہ اِن طبقوں کے بچوں کی تعلیم میں اردو کو لازمی مضمون کی حیثیت سے شریک کیا جانا چاہیے - "

میں نے سر تیج بہادر کا قول یہاں اس لیے نقل کیا ہے تاکہ معلوم ہو کہ ایک حقیقت شناس و صاحب نظر اور ایک مقلد و بے خبر کی راے میں کس قدر فرق ہوتا ہے - کانگریسی حکومتوں کے اکثر وزیر جو ہندی ہندی پکارتے ہیں وہ نہ ہندی کو جانتے ہیں نہ ہندستانی کو - ان میں سے اکثر ہندستانی تہذیب اور ہندستانی زبان سے ناواقف ہیں اور محض ایک بڑے شخص کی تقلید میں اندھوں کی طرح کام کر رہے ہیں - گاندھی جی بلا شبہ بہت بڑے آدمی ہیں لیکن زبان کے معاملے میں اُن کی راے مستند نہیں ہو سکتی - وہ کیا جانیں کہ ہندستانی تہذیب کا ہندستانی زبان سے کیا تعلق ہے - ہندستانی زبان سے غفلت کرنا ہندستانی تہذیب کا برباد کرنا اور ہندو مسلم اتحاد کی جڑ کاٹنی ہے - اس مسئلہ میں اگر کسی کی راے مستند ہو سکتی ہے وہ سر تیج بہادر سپرو ہیں —

۱۳ - انجمن کے اردو مدرسے

انجمن کے اردو مدرسوں کا ذکر اس سے قبل اس رسالے کے کسی گزشتہ نمبر میں ہوچکا ہے - یہاں صرف ان مدرسوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے جو اس کے بعد قائم ہوے ہیں —

(۱) ضلع نیلگری کے نئے مدرسے

۱ - مدرسۂ ارون کاڈو - یہاں گورمنٹ کا بارود کا کارخانہ ہے جس میں بہت سے مسلمان کام کرتے ہیں لیکن ان کے بچوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا - چاند خاں صاحب کی (جو کارخانے کے دفتر میں ملازم ہیں) کوشش سے گزشتہ دسمبر میں یہ مدرسہ قائم ہوا - اس وقت ۲۴ بچے تعلیم پا رہے ہیں - اردو سب کے لیے لازمی ہے - اس مدرسے کا نصف خرچ انجمن دیتی ہے —

۲ - سینٹ جوز فس کالج کولوز - یہاں اردو کی تعلیم کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا - اردو لینے والے طلبہ نجی کے طور پر اپنے پڑھنے کا انتظام کر لیتے تھے - سردار خاں صاحب ایم - اے پریزیڈنٹ نیلگری اردو سوسائٹی ' لوڈیل کی کوشش سے شروع سال سے اس کالج میں اردو کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام ہوگیا ہے - مدرس کی تقریباً نصف تنخواہ انجمن ادا کرتی ہے —

(۲) علاقۂ مالا بار کے مدرسے

۱ - تیلی چری - یہ مالا بار کا مشہور مقام ہے - یہاں خان بہادر موئدو صاحب ایم - ایل - سی کی کوشش سے ایک شبینہ مدرسہ جاری کیا گیا ہے -

۲ - ارکوا - اس مقام پر مسلمانوں کی ایک انجمن ہے جس کا نام ندوۃ الاسلامیہ ہے - اس کی زیر نگرانی گزشتہ ستمبر سے اردو کا ایک مدرسہ کھولا گیا ہے - مدرسہ اچھی حالت میں ہے اور ترقی کر رہا ہے —

۳ - کاکٹ - یہاں بھی مسلمانوں کی ایک انجمن ہے اس کی نگرانی میں گزشتہ نومبر سے اردو کا ایک مدرسہ قائم کیا گیا ہے - طلبہ کی تعداد ۴۰ ہے —

(۳) شمالی آرکاٹ

تروناملے - یہاں بھی انجمن کا ایک مدرسہ ینگ مسلم سوسائٹی کی نگرانی میں چل رہا ہے - ۲۰ مسلمان اور سات ہندو تعلیم پا رہے ہیں -

(۴) جنوبی آرکاٹ

مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن تنڈی ونم کی نگرانی میں دو مدرسے ہیں ایک مردانہ دوسرا زنانہ - دونوں مدرسوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے - حکومت مدراس نے ابھی تک کوئی امداد منظور نہیں کی - انجمن پچیس روپے ماہوار مدد دیتی ہے - یہ مدرسہ نہایت اچھی حالت میں ہے اور خوب ترقی کر رہا ہے - تقریباً تین سو مسلمان اور ہندو طالب علم ہیں - اردو سب کے لیے لازمی —

مالابار اور دیگر مختلف مقامات سے اردو مدارس قائم کرنے کے لیے برابر درخواستیں آرہی ہیں - لیکن افسوس کہ انجمن کے سرمایہ میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ سب درخواستیں منظور کرلے - تاہم جہاں زیادہ ضرورت معلوم ہوتی ہے وہاں مدرسہ قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے - ہمیں اردو کے بہی خواہوں سے امید ہے کہ وہ اس کام میں ہمارا

هاتهه بٹائیں گے - کم سے کم اگر صاحب ثروت اصحاب ایک ایک مدرسه هی کا کل خرچ یا نصف خرچ اپنے ذمے لے لیں تو انجمن بہت سے مدرسے قائم کر کے ملک کے دور دراز مقامات میں اردو کی اشاعت کر سکتی هے - هم مدراس کے نامور بزرگ ساهوکار جمال محمد صاحب اور نواب صدر یار جنگ بہادر کے ممنون هیں که ان دونوں حضرات نے بے طلب اس کام میں انجمن کی مدد فرمائی هے —

تبصرے

ادب

دبدبۂ امیری ۴۸۱

مضامین رشید ۴۸۲

نذر ولی ۴۸۳

قصص الامثال ۴۸۵

صحیفۂ چین ۴۸۷

متفرقات

روسی جلد اول و دوم ۴۹۰

آداب حق موسوم بہ باغ جہاں افروز ۴۹۱

اقوال قانونی ۴۹۱

مسلمانوں کا روشن مستقبل ۴۹۲

اردو کے جدید رسالے

مجلس ۴۹۵

'زمانہ' پریم چند نمبر ۴۹۶

سب رس ۴۹۸

بورڈ ٹیچر ۵۰۰

دوام ۵۰۰

اختر لاہور ۵۰۱

تبصرے

ادب

دبدبۂ امیری -

(مولفہ سید محمد عبد الحکیم صاحب حکمت - قیمت مجلد
دو روپے - منیجر حکمت بک ڈپو عالم گنج ڈاک خانہ گلزار باغ '
پٹنہ سے مل سکتی ھے)

یہ منشی امیر احمد ' امیر مرحوم کی سوانح عمری ھے - لکھنے والے اُن کے خاص شاگرد اور فدائی حضرت حکمت صاحب ھیں - قابل مولف نے منشی صاحب مرحوم کے حالات جمع کرنے میں پوری کوشش کی ھے اور اس سے قبل جو کتابیں یا مضامین ان کی شاعری یا اُن کے سوانح کے متعلق لکھے گئے ھیں اُن سب کو بغور پڑھا ھے - ایک باب ان کے شاگردوں کے حالات و تصانیف کے لیے مخصوص کر دیا ھے - غرض منشی صاحب مرحوم کے حالات ' خیالات ' سیرت ' کردار ' تعلقات اور اُن کے کلام اور تصانیف پر کافی تبصرہ ھے - لیکن مولف نے مدح میں اتنا غلو کیا ھے کہ بعض معمولی

اور ادنیٰ اشعار کو بھی آسمان پر پہنچا دیا ہے - شاید وہ اسے شاگردانہ سعادتمندی خیال کرتے ہیں - لکھنے لکھنے کا فرق ہے ورنہ یوں سمجھیے کہ آزاد نے ذوق کو جو رتبہ دیا ہے وہی رتبہ مولف کی نظر میں امیر کا ہے - مولف امیر مرحوم کے بہت بڑے شیدائیوں میں سے ہیں، لیکن انہیں وہ گُر معلوم نہیں جو اس قسم کی تحریروں کے لیے ضروری ہے —

اس کتاب کو بہ لحاظ تنقید، طرز بیان اور خیالات کے مولوی امیر احمد صاحب علوی کی کتاب طرۂ امیر پر ترجیح نہیں ہوسکتی - تاہم مولف کی محنت قابل قدر ہے اور انہوں نے بعض ایسی معلومات اور حالات بہم پہنچائے ہیں جو اس سے قبل کی تالیفات میں نہیں ملتے —

مضامین رشید -

(پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کے مضامین کا مجموعہ
مکتبۂ جامعہ، دھلی - قیمت مجلد دو روپے)

رشید احمد صدیقی صاحب زمانۂ حال کے چند نامور ظرافت نگاروں میں سے ہیں - وہ صرف ظرافت نگار ھی نہیں بلکہ انہوں نے اس موضوع پر ایک اچھی کتاب بھی لکھی ہے - ان مضامین میں سے اکثر یا سب کے سب پہلے بعض رسالوں میں چھپ چکے ہیں، اب کتاب کی صورت میں شایع کیے گئے ہیں - ان میں سے بیشتر ایسے مضامین ہیں جن کا تعلق مسلم یونیورسٹی یا پروفیسر رشید صاحب کے احباب سے ہے یا اُن کا ذکر کسی نہ کسی طرح ضمنی طور پر آگیا ہے، اس لیے پورے طور پر سمجھنے اور لطف حاصل کرنے کے لیے اُس صحبت سے واقف ہونا ضروری ہے - رشید صاحب

طبعاً ظریف ہیں، اردو خوب لکھتے ہیں اور موقع محل سے ایسے لفظ استعمال کرتے یا بعض اوقات گھڑلیتے ہیں کہ بات میں اور لطف پیدا ہو جاتا ہے - قوت مشاہدہ بھی تیز ہے اور ایک نظر میں اپنے مطلب کی بات ایسی ڈھونڈ نکالتے ہیں کہ ظرافت کا پہلو نکل آتا ہے - استعاروں اور تشبیہوں کا تعلق ظرافت کے پیرائے میں حالات حاضرہ سے برابر قائم رکھتے ہیں جس سے پڑھنے والے بہت محظوظ ہوتے ہیں - یوں تو سب مضمون پڑھنے کے قابل ہیں لیکن کوئی کوئی بہت دلچسپ ہے - مثلاً "کارواں پیداست" - لیکن رشید صاحب کے مضامین میں ایک بات ضرور کھٹکتی ہے کہ کبھی کبھی غیر متعلق باتیں اس طرح داخل کر دیتے ہیں کہ جس سے آورد کا شبہہ ہوتا ہے - ظرافت میں آمد ہی کچھہ مزہ دیتی ہے، جہاں طبیعت پر زور ڈال کر کوئی بات کہی تو مزہ جاتا رہا —

کتاب کے شروع میں رشید صاحب کا فوٹو بھی ہے - صورت سے ذہین معلوم ہوتے ہیں گو ظریف نہیں معلوم ہوتے؛ لیکن ظرافت بغیر ذہانت کے نہیں ہوتی —

نذر ولی

(سلسلہ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو - حیدرآباد،
صفحات ۱۴۶ مجلد)

مضامین کی فہرست :-

۱ — ولی کا تخیل — از، لطیف النسا بیگم بی-اے

۲ — کلام ولی اور تصوف — از، نجم النسا بیگم، بی-اے

۳ - ولی کی معلومات اور شاعری کی خصوصیات از ' نعیم النسا بیگم ' بی - اے

۴ - ولی کا فن شعر از ' جہاں بانو بیگم ' بی - اے

گزشتہ دنوں جگہ جگہ "یوم ولی" منائے جانے کے بعد سے ولی کے متعلق زیادہ دلچسپی پیدا ہوگئی ہے - زیر نظر مجموعۂ مضامین اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ' لکھنے والیاں سب کی سب جامعۂ عثمانیہ کی جماعت ایم - اے کی طالبات ہیں ' مضامین سے پہلے " سلسلۂ ادبیات اردو " کے مدیر عمومی کی مختصر سی تقریب بھی ہے —

پہلا مضمون " ولی کا تخیل " کتاب کے ایک سو بارہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس میں ولی کے متعلق معلومات ' اعتقادات ' پند و موعظۂ اور دوسری خصوصیتوں پر بھی بحث کی گئی ہے ' بادی النظر میں ولی کے سمجھنے کے لیے یہی ایک مضمون کافی ہوتا اور دوسروں کے لکھنے کے لیے کچھہ باقی تو نہ تھا مگر بعد کے مضامین کے پڑھنے سے طالبات کی ذکاوت اور اس کاوش کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اجمال کو تفصیل اور بصیرت سے لکھنے میں کامیاب رہیں —

" کلام ولی اور تصوف " ماہرانہ انداز میں سپرد قلم کیا گیا ہے ' تصوف کے مرکزی مسایل اور مصطلحات کو شرح و بسط کے ساتھہ سمجھایا گیا ہے جس کی وجہ سے اہل نظر اور " تماشائی " دونوں کے لیے دلچسپی کی تقریب نکل آئی ہے ' اس " قال " میں کہیں کہیں " حال " کی بھی جھلکیاں ہیں — واقعیت کے اس دور میں تصوف جیسے مسئلہ پر صاحب دلانہ انداز میں اس تبحر کے ساتھہ لکھا جانا یقیناً مکتب کی کرامت ہے - موضوع کی سنجیدگی اسلوب پراثر انداز ہوے بغیر نہ رہ سکی —

" ولی کی معلومات اور شاعری کی خصوصیات " دراصل ولی پر اس اعتراض کا جواب ہے کہ وہ پڑھا لکھا نہ تھا، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ولی اُمی محض نہ تھا اس کے کلام میں آئی ہوئی بہت سی تلمیحوں کو چن کر ان پر چھوٹے چھوٹے نوٹ دیے گئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ولی کے کلام کی نمایاں خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے — یہ مضمون بلا کسی لن ترانی یا آرایش کے سیدھی سادی زبان میں لکھا گیا ہے —

" ولی کا فن شعر " قابل توجہ اور دلچسپ ہے - ولی کے فن شعر کو اُجاگر کرنے کے لیے خود " فن شعر " پر بحث ناگزیر تھی مگر یہ اچھا ہوا کہ مضمون فن شعر سے زیادہ حسن کی تفسیر اور فلسفہ جمال کی تشریح کے لیے وقف ہوگیا، اسلوب بیان بھی اسی نسبت سے اختیار کیا گیا ہے —

کتاب کی لکھائی چھپائی صاف اور جلد نہایت دیدہ زیب ہے، تمام مضامین محنت اور شوق سے لکھے گئے ہیں، یہ گل بداماں مجموعہ اردو مطبوعات میں ایک حسین اضافہ کہلایا جاسکتا ہے، اگر طالبات اپنے دل و دماغ کی تازگی کو زندگی سے قریب تر موضوعات کے لیے صرف کرنے پر آمادہ ہوسکیں تو ان کا قلم اور زیادہ مفید اور قابل قدر ہوسکے گا —

(د)

قصص الامثال -

(مولفہ ابو عامر خواجہ محمد باقر حسن صاحب -

پبلشر سید محمد اشفاق علی مالک رایل ایجوکیشنل

بک ڈپو، اردو بازار دہلی، چھوٹی تقطیع

حجم ۳۰۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ پانچ آنے)

یہ کتاب ڈھائی سو سے زیادہ کہاوتوں کا مجموعہ ہے، متعلقہ قصے کہانیاں، لطیفے اور حکایتیں بڑی محنت و کاوش سے فراہم کی گئی ہیں، اور کچھہ مولف نے "علم درسینہ" کی مدد سے اضافہ کی ہیں - زبان نہایت سادہ اور سلیس استعمال کی گئی ہے - ہر ضرب المثل کا محل اور موقع استعمال بیان کیا گیا ہے، ایک مضمون کی کہاوتیں اکثر یکجا کردی گئی ہیں اور ساتھہ ہی ساتھہ دوسری زبانوں کی ہم معنی ضرب الامثال بھی جگہ جگہ پیش کردی گئی ہیں اور کہیں مفہوم ظاہر کرنے کی خاطر ان کی تشریح بھی ہے، ایسے محاوروں کو بھی جنھوں نے کثرت استعمال کی بدولت کہاوتوں کا درجہ حاصل کرلیا ہے، اس تالیف میں شامل کرلیا گیا ہے، موضوع کے لحاظ سے اس مختصر سے مجموعے میں اور زیادہ تفصیلات کی گنجائش بھی بمشکل ہی نکل سکتی کیونکہ الفاظ و محاورات کے بہ نسبت کہاوتوں کا وجود کہیں زیادہ مقامی روایات و حالات کا رہین منت ہوا کرتا ہے - غالباً اسی وجہ سے بعض ضرب الامثال عام مروجہ شکل سے ذرا ہٹ کر استعمال کی گئی ہیں اور اسی مناسبت سے ان کی تشریح بھی کی گئی ہے، مثلاً "اندھیر نگری چوپٹ راج" کے بجائے صرف "الٹی نگری اندھا راجہ" لکھہ دینے پر اکتفا کیا گیا ہے - "قصص الامثال" بچوں کے لیے لکھی گئی ہے لیکن توقع ہے کہ بڑوں میں بھی دلچسپی سے پڑھی جائے گی اور مفید ثابت ہوگی —

(ر)

صحیفۂ چین

(از سید اسدعلی صاحب 'انوری' فریدآبادی' بی' ایس' سی' آئی' ایف' ایس' حجم ۲۴۸ صفحات' چھوٹی تقطیع' لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا ہے ٹائٹل پر چین کے قومی پرچم کا نشان ہے قیمت' ایک روپیہ آٹھ آنے - مکتبہ جامعہ ملیہ' دھلی)

شروع کے ۷۴ صفحات تک کنفیوشس کی کتاب " شوکنگ " کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہے اور باقی صفحات چین کی تاریخ' کنفیوشس کے حالات' اس کی تعلیمات اور چین کے بادشاہوں کی ابتدا سے لے کر جنرل چیانگ کائی شیک کی موجودہ قومی حکومت کے قیام تک کی تاریخ وار فہرست بڑے اہتمام سے مرتب کی گئی ہے جس سے چین کی قدیم عظمت کی شان معلوم ہوتی ہے - ضمیمہ (ب) میں چین کی تاریخ کے ساتھ ساتھ جغرافیائی حالات و خصوصیات کا تذکرہ بھی ہے جس کی بدولت وہاں کے قدیم و جدید حالات سے قرار واقعی آگاہ ہونے میں بڑی مدد ملتی ہے - ناموں کے تلفظ اور ہجا میں خاص اہتمام رکھا گیا ہے - چین کے علوم و فنون اور وہاں کے حالات سے نا واقفیت کا بڑا سبب زبان کا اختلاف تھا' اردو میں یہ کتاب اس لحاظ سے اور بھی قابل قدر ہے - " شوکنگ " کا ترجمہ بھی بہت اچھا ہے' اگرچہ اصل کتاب کے سترہ بادشاہوں میں سے صرف گیارہ کے حالات کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے - " شوکنگ " تاریخ کی نہایت ابتدائی کتابوں میں سے ہے - اور اس کا مصنف کنفیوشس چین میں پیغمبری کا رتبہ رکھتا ہے' اصل نام " کنگ فوزے " تھا اور سنہ ولادت (۵۵۱ ق - م) - امور سلطنت میں کار گزار رہنے کے بعد

سیاست اور مذہب میں نئے رجحانات کا موجد بنا ' اس وقت بھی چین میں اس کے ۳۵ کروڑ پیرو موجود ہیں - حیات انسانی کے متعلق اس کا فلسفہ یہ تھا کہ " انسان کی فطرت صحیحتہ اجتماعی ہے اور وہی نیک ہے ' بر خلاف اس کے انفرادیت اور انانیت فطری نہیں بلکہ عادتاً ہیں اس لیے بُری ہیں " - اس کی تعلیم یہ تھی : —

" ایسے رہو کہ دوسروں کے لیے تمہارا وجود رحمت ہو " —

مولف صاحب نے کنفیوشس کے فلسفے اور تعلیم سے اختلاف کرتے ہوئے جس میں حیات انسانی کے اجتماعی تصور کو انفرادیت پر کھلی کھلی ترجیح دی گئی ہے ' انفرادیت یا انانیت کو غیر فطری قیاس کرنے سے انکار کیا ہے - لیکن استدلال میں محض عوام کی سمجھ کے لیے اس نظریہ کا باطل ہونا کہہ دینے پر اکتفا کی گئی ہے - سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے مغربی صاحبان فکر نے بھی اس مابہ الاختلاف مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انفرادیت اور اجتماعیت میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں - البتہ ترجیح و اولیت اب بھی معرض بحث میں ہے - کنفیوشس اور اس کے ہم خیالوں کے نزدیک خاندان کا جو تصور ہے وہی مملکت اور معاشرت کے تصور میں اُن کا رہبر ہے ' لہذا کنفیوشس کے پیش کردہ اصول کو بغیر مدلل بحث کے غلط کہہ دینا کسی قدر جرات کی بات ہے —

کنفوشش کی " شوکنگ " میں زراعت اور آبپاشی پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے اور ان انتظامات کی طرف توجہ کرنے والے بادشاہوں کو رعایا کا سچا بہی خواہ کہہ کر سراہا گیا ہے - زمین کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ دستور سلطنت میں نو وزرا کے نام

ہیں جن میں سے چار وزرا کا تعلق اراضیات سے تھا - چین میں نجوم کو جو اہمیت حاصل رہی وہ غالباً اسی وجہ سے ہے - زراعت ہی چین کی کثریت کا پیشہ رہا ہے لیکن صنعت و حرفت بھی وہاں بڑے پیمانے پر موجود تھی، رسل و رسایل کی آسانی اور فلاحت کی ترقیوں کی خاطر نہروں کا جال بچھا ہوا تھا، دیوانی و فوجداری قوانین موجود تھے اور دستور و ضابطہ پر حکومت کاربند تھی اور یہ سب پچیس صدی پیشتر کہا حالانکہ بعض نام نہاد ترقی یافتہ ممالک میں اب بھی قوانین مالگزاری کی تدوین مکمل نہیں ہو پائی ہے - چین میں افلاس بالکل تو مٹایا نہ جا سکا تھا لیکن رعایا کی آواز معدلت پناہ تک پہنچتی اور اس کا اثر ضرور ہوتا تھا - چنانچہ جب بادشاہ "سن" نے جو ایک خود رائے اور عیش پسند شخص تھا پہلی مرتبہ کھانا کھانے کی قلمیں ہاتھی دانت کی بنوائیں (چینیوں میں بانس یا لکڑی کی تیلیوں سے کھانا کھانے کا رواج بہت قدیم سے ہے) تو حکیم "کی سے" نے اس پر ملامت کی اور کہا "اب تو تم نے ہاتھی دانت کی قلمیں بنوائی ہیں، پھر تم بلور کے پیالے بنواؤ گے، پھر آگے چل کر تم ریچھ کے پنجے اور شیرنی کا رحم کھانا چاہو گے ... ... اسی قماش کی چیزوں کی ضرورت تمہیں زیادہ ہوتی جائے گی اور یقیناً ملک اس طرح کنگال ہو جائے گا" - (صفحہ ۶۹) - گویا بادشاہ کی خواہش پرستی کے خلاف رعایا کے حقوق سے اس کو آگاہ کیا گیا - کتاب نہ صرف چین کی قدیم تہذیب و سیاست کا آئینہ ہے بلکہ زمانۂ حال کے لیے ایک قابل قدر درس ہے —

(ر)

متفرقات

رومی جلد اول و دوم-

(مولفہ و مصنفۂ مہر ولی اللہ صاحب ایڈووکیٹ ایبٹ آباد، سرحد)

مہر صاحب نے مثنوی مولانائے روم (رح) کو جدید نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے - اب تک بعض لوگ اسے محض مجموعۂ اساطیر سمجھتے تھے اور بعض اسے فلسفے کی دقیق کتاب کے نام سے موسوم کرتے تھے، لیکن مہر صاحب نے ثابت کر دکھایا ہے کہ یہ کتاب سراسر سعی و عمل اور جد و جہد کا پیغام ہے -

فاضل مؤلف نے اپنے اس نقطۂ نظر سے مثنوی کے خاص خاص اقتباسات دیے ہیں - ترتیب اس کی یوں ہے کی سب سے پہلے تمہیدی یا ابتدائی تشریحی بیان ہے - پھر مثنوی کا متن جلی قلم سے لکھا گیا ہے - اس کے بعد ان اشعار کا مختصر اور پر مطلب ترجمہ ہے - خوبی اس میں یہ رکھی گئی ہے کہ مبتدی بھی بہ آسانی معنے سمجھہ لیتا ہے - قرآنی آیات اور تلمیحات کو خوب واضح کیا گیا ہے اور بعض بعض مقامات پر مثنوی کے اشعار کی شرح قرآن کریم کے حوالے سے کی گئی ہے -

دوسری جلد کے خاتمے پر سات صفحوں میں مولانا جلال الدین رومی (رح) (صاحب مثنوی) کا مختصر مگر جامع تذکرہ بھی درج ہے -

لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ - قیمت فی حصہ ایک روپیہ آٹھہ آنے

ملنے کا پتہ :- دارالاشاعت بادۂ ناب - ایبٹ آباد (صوبہ سرحد)

(ر - ا)

آداب حق موسوم بہ باغ جہاں افروز

(مولفہ مولانا محمد ایوب 'باغ' صاحب قادری چشتی اکبر آبادی ثم اجمیری صفحات ۲۹۰ - قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ :- آزاد ایجنسی اجمیر)

اس کتاب میں خاص خاص عنوان قائم کر کے صوفیاے کرام و مشائخ عظام کے اقوال جمع کیے گئے ہیں - ہر عنوان کے نیچے مصنف (رح) کے اشعار بصورت قطعہ یا رباعی رکھے گئے ہیں پھر آپ کے اقوال ' بعدہ دیگر صوفیا و اہل اللہ کے اقوال - غرض ' اِس کی ترتیب میں محنت سے کام لیا گیا ہے اور بلاشبہ یہ کتاب عام طور پر مفید ہے -

افسوس ہے کہ املا کی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں مثلاً فائز المرام کو فائض المرام ' غنیۃ الطالبین کو غنیت الطالبین ' صوفیائے کرام کو صوفیاے اکرام ' چکھہ کو چکہہ اور خلائق کو خلالق لکھہ دیا گیا ہے - پھر کاتب صاحب نے نہایت بے دردی سے عربی عبارتوں پر کند چھری چلائی ہے مثلاً رحمۃ للعالمین کو ایک جگہ رحمت الالعلمین لکھہ دیا ہے اور دوسری جگہ رحمۃ الالعلمین - ارحم الرحمین کو الرحم الرحمن اور اهدنا الصراط المستقیم کو اهدنالصراط المستقیم - وغیرہ وغیرہ طباعت معمولی ہے

(ر - ا)

اقوال قانونی

(مرتبہ افضل حسین صاحب فاروقی - ایچ - سی - ایس)

روم کا ملکی قانون ' اُم القوانین ' کہا جاتا ہے اسی لیے آج بھی

دنیا کے چلتے مجموعۂ قوانین ہیں سب اس سے متاثر اور کم و بیش اُن ہی قدیم اصولوں پر مدون کیے گئے ہیں - یہ ایک بحث طلب مسئلہ ضرور ہے کہ روم نے عرب کا اثر قبول کیا یا عرب نے روم سے استفادہ کیا ' بہر حال قانون کی مروجہ کتابیں اور قانون کے پروفیسروں کے لکچر اور مقالے شاید تشنہ معلوم ہوتے اگر رومیوں کے اصولوں کا انہیں کے الفاظ میں جابجا حوالہ نہ دیا جایا کرتا - مولوی افضل حسین صاحب نے ان ہی روز مرہ کے استعمال کے مقولوں کو جو روم کے ملکی قانون کے معروف اصول کہے جاتے ہیں ' یکجا کر کے ہر ایک کے مقابل اردو ترجمہ ابجدی ترتیب کے ساتھہ پیش کیا ہے مقولے زیادہ تر (Broom 's Legal Maxims) سے لیے گئے ہیں اور ترجمے میں رام نرائین کی قانونی محاورات کی لغت سے مدد لی گئی ہے ' دو جگہ انگریزی جملوں کے اردو ترجمے ہیں ' یہ مجموعہ کار آمد ضرور ہوسکتا تھا مگر بعض مقامات پر زبان کو بہت زیادہ قانونی بنانے اور بعض جگہ لفظی ترجمے کی خاطر مبہم عبارت اور نامانوس ترکیبوں کے استعمال سے گریز نہیں کیا جاسکا -

(ر)

مسلمانوں کا روشن مستقبل

اس کتاب کے مصنف جناب طفیل احمد صاحب منگلوری ہیں جو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شریک معتمد نیز رسالہ " سود مند " وغیرہ بعض رسائل و کتب کی اشاعت سے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں کافی شہرت رکھتے ہیں - کتاب کا اصل موضوع یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں

ایسے مستقبل کی طرف سے جو خوف پیدا ہوگیا ہے اور ان میں افسردگی اور مایوسی کی کیفیت پائی جاتی ہے' یہ بے بنیاد و عارضی ہے' اور وہ نہ صرف آزادی ہند کی جد و جہد میں بڑا حصہ لیں گے بلکہ آزاد ہندستان میں بھی ان کی قومی حالت ہر اعتبار سے اچھی اور لائق اطمینان رہے گی —

یہ موضوع نہایت دلکش ہے اور کچھہ شک نہیں کہ لائق مصنف کا مقصد تصنیف بھی بہت نیک، اور حب قومی کی دلیل ہے - لیکن بڑی مشکل یہ آپڑی ہے کہ جس طرح جناب موصوف کو رسالہ "سودیش" کی اشاعت کے موقع پر غالباً تجربہ ہوا ہوگا ' آپ کے بنیادی خیالات مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کے خیالات سے بالکل مختلف ہیں اور ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر جناب مصنف کے پیش کردہ واقعات و دلائل اور استخراج کیے ہوے نتائج کو درست مان لیا جاے تو بھی مسلمانوں کا یہ گروہ ہرگز اس حالت پر مسرور و مطمئن نہ ہوگا جسے جناب طفیل احمد صاحب "روشن مستقبل" کے شوق انگیز نام سے یاد فرماتے ہیں - یہ عرض کیے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ابتدا میں "بنیادی حقوق" گنوانے کے بعد فاضل مصنف نے آخر میں ان کی بحث کو بہت ہی تشنہ اور غیر واضح تحریر فرمایا ہے کہ حالانکہ کتاب کی جان یہی حصہ ہونا چاہیے تھا —

کتاب کے شروع میں ہندستان کی اسلامی حکومت اور پھر انگریزوں کے تسلط پر بھی کئی فصلوں میں بحث کی ہے - لیکن ان تاریخی واقعات کو اصل ماخذوں سے جمع کرنے کی بجاے عموماً بعد کی کتابوں' رسالوں بلکہ معمولی مجلسی تقریروں سے نقل کرنے پر قناعت فرمائی گئی ہے جس سے کتاب کے اس حصے کی قیمت کسی اخباری مقالے سے

یہ مشکل زیادہ کہی جاسکتی ہے —

کتاب کے سب سے کار آمد ابواب وہ ہیں، جن میں جدید تعلیم اور علی گڑھ تحریک کے آغاز و فروغ کے حالات لکھے ہیں - اور اسی ضمن میں بتایا ہے کہ کس طرح مسٹر بیک نے پہلے سر سید پر اور پھر ان کے ذریعے مسلمانوں کی سیاسیات پر قبضہ حاصل کیا اور انہیں کانگرس کا حریف بناکر قومی تحریک کے راستے میں روڑے اٹکائے - ان حالات کو کافی تفصیل و واقفیت کے ساتھہ بیان کیا گیا ہے اور ہر چند مصنف کا نقطۂ نظر کانگرسی ہے اور وہ ہندستان کے سیاسی یا اسلامی مسائل پر کچھہ بہت گہری نظر نہیں ڈال سکے ہیں، تاہم کتاب کا یہ حصہ خاصی تاریخی اہمیت رکھتا ہے —

آخری ابواب میں جدید سیاسی تحریکات، خلافت، ترک موالات، مطالبہ سوراج وغیرہ کے واقعات تحریر ہیں اور بتایا گیا ہے کہ اس قدر پس ماندگی اور زبوں حالی کے باوجود ہندستان کے مسلمانوں نے ان تحریکوں میں کیسے جوش و خروش اور ایثار سے کام کیا اور کر رہے ہیں —

کتاب چھوٹی تقطیع کے چھہ سو سے کچھہ زیادہ صفحات پر مجلد شائع کی گئی ہے اور دو روپے آٹھہ آنے قیمت میں یقیناً ارزاں ہے - نظامی پریس بدایوں یا مشہور کتب فروشوں سے مل سکتی ہے —

(ھ)

اُردو کے جدید رسالے

مجلس

(ڈون اسکول اوریئنٹیل سوسائٹی)

کچھہ دنوں پہلے آغا محمد اشرف صاحب ایم - اے کا تعلق دلی کے ریڈیو سے تھا - اور اپنی خوش بیانی اور شیریں زبانی کی وجہ سے بہت مقبول تھے - اب ان کا تعلق ڈیرہ دون اسکول سے ہوگیا ہے - یہاں بھی وہ اپنی زبان کی خدمت کر رہے ہیں - یہ رسالہ انہیں کی نگرانی میں شایع ہوتا ہے - اس کے دو حصے ہیں - ایک اردو کا' دوسرا ہندی کا - اردو کا حصہ ۷۲ صفحے کا ہے اور ہندی کا ۴۲ صفحے کا —

اردو کے حصے میں ۲۱ مضمون ہیں سافر صاحب کا گیت خارج کردیا جاے تو باقی بیسوں کے بیسوں اسکول کے بچوں کے لکھے ہوے ہیں - تین مضمون تو گیارہ گیارہ برس کے بچوں کے لکھے ہوے ہیں اور چھے مضمون تیرہ برس کی عمر والوں کے ہیں - زبان سب مضمونوں کی بہت سادہ' صحیح اور پیاری ہے - یہ آغا صاحب کا فیض معلوم ہوتا ہے - مضمون بھی بہت دلچسپ ہیں اور بعض بعض میں ظرافت کا بھی چٹخارا پایا جاتا ہے - جتنے مضمون ہیں وہ لکھنے والوں کی طبیعت' عمر اور ماحول کے مناسب ہیں - بچوں کے لیے یہ رسالہ بہت موزوں معلوم ہوتا ہے' اُنہیں دیا گیا تو بہت شوق سے پڑھیں گے —

ایک بات اس "مجلس" میں خاص طور پر دیکھنے اور غور کرنے کی ہے - اس میں بیس مضمون ہیں اور سب بچوں کے لکھے ہوئے ہیں- ان لکھنے والوں میں تین تو ایسے ہیں جنہوں نے اپنے اصل نام نہیں لکھے- اب رہے سترہ' تو ان میں سے بارہ ہندو اور پانچ مسلمان ہیں- اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ زبان کسی ایک فرقے یا قوم کی نہیں بلکہ ہم سب کی ہے اور جس طرح شروع میں اس کے بنانے اور بڑھانے میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے اب بھی دونوں اسی شوق سے پڑھتے اور لکھتے ہیں- جو لوگ یہ بات نہیں مانتے اور اسے کسی ایک قوم کی زبان بتا کر اس کی طرف سے بدگمانی اور نفرت پھیلاتے ہیں وہ اپنے ملک سے دشمنی کرتے ہیں- یہ ہماری محبت اور یک جہتی کی یادگار ہے اور اس لیے ہم سب کو اس کی پرورش کرنی چاہیے - کیا تعجب ہے کہ ڈون اسکول کی مجلس زبان کی صفائی اور ترقی کے لیے وہی کام کرے جو کسی زمانے میں کلکتہ' دلی اور علی گڑھ نے کیا تھا - اگرچہ اس مجلس کے رونق دینے والے بچے ہیں' لیکن بعض وقت بچے بڑوں بڑوں کو سبق دے دیتے ہیں —

یہ رسالہ لطیفی پریس دہلی میں چھپا ہے اور خوب چھپا ہے - جیسے اچھے اور ستھرے اس کے مضمون ہیں ویسی ہی اچھی اور ستھری اس کی لکھائی چھپائی ہے —

زمانہ ' پریم چند نمبر -

رسالہ ' زمانہ ' کانپور نے منشی پریم چند آنجہانی کی یادگار میں

'پریم چند نمبر' شایع کیا ہے - یہ نمبر ادبی لحاظ سے ہر طرح قابل قدر ہے اور اس میں منشی صاحب مرحوم کی سوانح حیات اور ان کے علمی کارناموں کے متعلق کافی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں - اس نمبر کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے - پہلے حصے میں منشی جی کی سوانح حیات بیان کی گئی ہے - ان کی آپ بیتی کے علاوہ ان کے جگری دوست منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر 'زمانہ' نے اپنے طویل و بسیط مضمون میں ان کی زندگی کے حالات و واقعات تفصیل اور خوبی سے لکھے ہیں ' یہ مضمون ہر لحاظ سے قابل قدر اور تمام رسالے کی جان ہے - مسز پریم چند کے مضمون سے منشی صاحب کے خانگی تعلقات' عادات و خصائل پر خاص روشنی پڑتی ہے ' اور ان کی سادگی اور ایثار کا حال معلوم ہوتا ہے - خاص طور پر ان کے آخری وقت کا بیان بہت موثر اور دردانگیز ہے - اسی حصہ سے متعلق کئی اور اصحاب نے بھی مضمون لکھے ہیں - مثلاً مرزا محمد عسکری نے پریم چند مرحوم سے زیادہ خود اپنی تعریف کی ہے - فدا علی 'خنجر' اور 'فراق' کے مضمون بھی اسی قبیل کے ہیں کہ ممدوح کی تعریف کے ضمن میں اپنا ذکر خیر بھی فرمادیا ہے - 'بیتاب' کا مضمون البتہ اچھا ہے اور انہوں نے پریم چند مرحوم کے حالات زندگی کو چار دوروں میں تقسیم کرکے ان کی خوبیوں کو بیان کیا ہے —

دوسرے حصے میں منشی جی کی افسانہ نگاری سے متعلق مضمون لکھے گئے ہیں اور ان کے علمی اور ادبی کارناموں پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے - اس حصے میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کا مضمون اچھا اور دلچسپ ہے - دوسرے مضامین بھی اچھی غور و فکر کا نتیجہ ہیں —

تیسرے حصے میں منشی پریم چند کی وفات پر ملک کے مختلف شعرا نے

جو اظہار غم کیا ہے ' وہ نظمیں ' قطعات اور تاریخیں مندرج ہیں -

غرض ' پریم چند نمبر ' ہر طرح مرحوم کے شایان شان نکالا گیا ہے اور اس کے لیے مدیر زمانہ مستحق مبارک باد ہیں کہ انہیں مرحوم سے جو محبت و ربط تھا اس کی یادگار بھی انہوں نے انتہائی خلوص و عقیدت سے پیش کی —

اس نمبر میں پریم چند مرحوم کی کئی تصویریں بھی شایع کی گئی ہیں- قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے رکھی گئی ہے اور ضخامت تقریباً ۲۵۲ صفحات ہیں - کاغذ معمولی استعمال کیا گیا ہے —

(ت - ر)

سب رس -

" ادارہ ادبیات اردو " کا ماہ نامہ جنوری سنہ ۳۸ ع سے ڈاکٹر سید محی الدین قادری ' زور ' کی نگرانی اور ' میکش ' صاحب کی ادارت میں شایع ہونا شروع ہوا ہے - ' زور ' صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں ' ان کے علمی و ادبی کارناموں سے اردو داں حضرات بخوبی واقف ہیں- حیدرآباد میں اردو کی ترقی اور علم و ادب کی فراوانی کے باوجود اچھے رسائل کا ایک بڑی حد تک فقدان نظر آتا ہے - اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے " سب رس " نکالا گیا ہے - یہ ایک ادبی رسالہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے دلچسپ اور عام فہم مضامین شایع کیے جائیں کہ جنھیں عام و خاص سب سے پڑھ سکیں - اب تک اس کے تین نمبر

شایع ہو چکے ہیں - زیر نظر پرچہ مارچ کا ہے ، جو " محرم نمبر " کے نام سے شایع کیا گیا ہے - شہدائے کربلا کی یادگار میں یہ نذر عقیدت انتہائی خلوص سے پیش کی گئی ہے - شہادت سے متعلق بعض مضامین بہت اچھے اور قابل مطالعہ ہیں - متعدد سلام اور نوحے بھی درج ہیں - اس کے علاوہ اردو مرثیہ نگاری کے متعلق مختلف مضامین کے ذریعہ کافی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں —

" اردو مرثیوں کا ارتقا " کے زیر عنوان ڈاکٹر 'زور' صاحب نے تقریباً ۱۱۵ مرثیہ نگاروں کے نام اور ان میں سے اکثر کا نمونۂ کلام بھی شایع کیا ہے - جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو شاعری میں صنف مرثیہ نگاری کس قدر مقبول رہی ہے ، اور اس میں کس طرح بتدریج ترقی ہوئی ہے —

محرم سے متعلق مضامین کے علاوہ مارچ کے 'سب رس' میں عام مضامین بھی شایع کیے گئے ہیں - جن میں سروری صاحب کا " جھٹکا " عظیم بیگ چغتائی کے یکہ کے نمونہ پر لکھا گیا ہے - مرزا عصمت اللہ بیگ کا مزاحیہ مضمون " بلدر بھبکی " بھی برا نہیں - 'میکش' صاحب کی نظم 'کشمکش' اور جہاں بانو بیگم کا مضمون " شام غربت کی اک جھلک " قابل تعریف ہے —

'سب رس' کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا ایک حصہ بچوں کے لیے وقف ہے ، جس میں ان کی دلچسپی کے مضامین ، طرح طرح کی معلومات ، نظمیں ، کہانیاں ، پہیلیاں ، لطیفے اور چٹکلے ہوتے ہیں -

رسالہ کا سالانہ چندہ حیدرآباد کے لیے چار روپے اور حیدرآباد سے

باهر چار روپے آتهه آنے مقرر کیا گیا هے - کاغذ لکهائی چهپائی بہت اچهی هے تصاویر بهی شایع کی جاتی هیں —

ملنے کا پته : رفعت منزل - خیریت آباد هے —

ت - ر

بورڈ تیچر

بورڈ تیچرز یونین کا اصلاحی و علمی رساله هے جس کا مقصد بورڈ تیچرز کے حقوق و مفاد کی حفاظت و نگرانی کرنا هے - اساتذہ کے تقرر' ترقی' تخفیف علیحدگی وغیرہ جملہ امور کے متعلق مفید مشورے بهم پهنچانا اور مدرسین کو موجودہ ذلت اور پستی سے نکال کر ان کی علمی اور مالی حالت کو سنوارنا هے - اس کے علاوہ علمی و اصلاحی مضامین شایع کرنا' خاص طور پر ایسے مضامین جن میں کمسن طالب علموں کی تعلیم و تربیت اور درستی اخلاق و عادات پر روشنی ڈالی جائے' غرض' اس رسالے کے مقاصد بہت مفید هیں - چندہ سالانہ دو روپے هے - مقام اشاعت بٹاله' گورداسپور هے —

(ت - ر)

دوام

پشاور سے اس نام کا ایک ماهوار رساله ستمبر سنه ۳۷ ع سے جاری هوا هے - صوبه سرحد میں اردو رسائل بہت کم بلکه نه هونے کے برابر هیں - اور وهاں کسی علمی و ادبی رسالے کو چلانا آسان بهی هے اور مشکل

بھی ' آسان اس لیے کہ جہاں کم رسالے نکلتے ہوں وہاں اگر کوشش اور ہمت سے کام لیا جائے تو نئے رسالے کا کامیابی حاصل کرلینا اتنا دشوار نہیں جتنا اس جگہ جہاں پہلے ہی سے بے شمار رسائل جاری ہوں - مشکل اس لیے ہے کہ جب تک رسالے کو دلچسپ اور مفید نہ بنایا جائے کہ وہ " پسند کرلیں خواص ' سمجھہ میں آئے عوام کی بھی کا مصداق ہو جائے ' وہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا —

مدیر رسالہ کے برادر محترم نے ' دوام ' کے لیے جو تجاویز پیش کی ہیں اگر اُن پر عمل در آمد کیا جائے تو یقین ہے یہ رسالہ پروان چڑھ سکے گا —

چندہ سالانہ کچھہ درج نہیں - قیمت فی پرچہ چھہ پیسے ہے -

(ت - ر)

اختر لاهور

' اختر ' لاهور نے اپنا جنوری کا پرچہ نو روز نمبر کے نام سے شایع کیا ہے - نظرات میں مدیر محترم لکھتے ہیں کہ وہ بذات خود سالنامہ نکالنے کے خلاف ہیں - اس لیے موجودہ نمبر میں انہوں نے یہ جدت کی ہے کہ دیگر ادبی جرائد نے جو سالنامے اس سال پیش کیے ہیں ' ان میں سے چند چیدہ مضامین انتخاب کرکے شایع کر دیے ہیں ' تاکہ وہ لوگ جو مختلف سالنامے خرید کر نہیں پڑھ سکتے ' اس طرح ان کے مضامین سے لطف اندوز ہو سکیں - اس سلسلے میں تین افسانے اور ایک ڈراما منتخب کیا گیا ہے —

پہلا افسانہ 'پریم کا جادو' نامکمل ہے' جس کی وجہ سے اس کا سارا مزہ کرکرا ہوگیا ہے - باقی افسانے اور ڈرامے خاصے ہیں - دو نظمیں بھی ہیں جو معمولی ہیں —

آئندہ نمبر "اقبال نمبر" نکالنے کی تجویز ہے جس کے متعلق بہت کچھہ توقعات ظاہر کی گئی ہیں - قیمت ۸ آنے مقرر کی گئی ہے - رسالے کا سالانہ چندہ دو روپیہ پندرہ آنے' فی پرچہ چار آنے ہے -

(ت - ر)

اردو

جلد ۱۸	جولائی سنہ ۱۹۳۸ ع	حصہ ۷۱

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

حسب ذیل کتابیں بھی انجمن کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہوسکتی ہیں

— (نظامی پریس بدایوں) —

خطوط سرسید	تین روپے
لیڈیو گرافی	دو روپے آٹھ آنے
دیوان غالب مع شرح	دو روپے آٹھ آنے
دیوان غالب اردو	ایک روپیہ آٹھ آنے
قاموس المشاہیر	چھ روپے
غزلیات ذوق	ایک روپیہ آٹھ آنے
دیوان جان صاحب مجلد	ایک روپیہ آٹھ آنے
انتخاب زریں مجلد	دو روپے
مراثی میر انیس جلد اول مجلد	دس روپے
مراثی میر انیس جلد دوم قسم دوم	پانچ روپے
مراثی میر انیس حصہ سوم قسم اول آرٹ پیپر	آٹھ روپے
مراثی میر انیس حصہ سوم قسم دوم	چھ روپے
انقلاب دہلی	ایک روپیہ آٹھ آنے
رباعیات شاد	ایک روپیہ
دیوان درد	ایک روپیہ چار آنے
قصائد ذوق	ایک روپیہ آٹھ آنے
سکہ اور شرح تبادلہ	ایک روپیہ

— (تصانیف نور الہی و محمد عمر صاحبان) -

تین ٹوپیاں	آٹھ آنے
قزاق	آٹھ آنے
ناٹک ساگر (یعنی دنیائے ڈراما کی تاریخ) مجلد	تین روپے
غیر مجلد	دو روپیہ آٹھ آنے
ناٹک کتھا	آٹھ آنے

- (مطبوعات ہندستانی اکاڈیمی الہ اباد) -

عرب و ہند کے تعلقات	چار روپے
کبیر صاحب	دو روپے
اردو زبان و ادب	ایک روپیہ
ناتن	دو روپے آٹھ آنے
فریب عمل	دو روپے
قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب	چار روپے
ہندی شاعری	دو روپے
فلسفۂ نفس	ایک روپیہ
عالم حیوانی	چھ روپے آٹھ آنے
معاشیات، مقصد اور منہاج	ایک روپیہ

— (کتابستان الہ آباد) —

مثنوی ناسخ	بارہ آنے
بس کا روکھا	ایک روپیہ
تاریخ اسلامی حصہ اول	آٹھ آنے

انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد دکن

کا

کتب خانہ

انجمن ترقیء اردو (ہند) اورنگ آباد دکن نے اپنا ایک عظیم الشان کتب خانہ حیدرآباد دکن میں عابد شاپ پر قائم کیا ہے ؛ ہندوستان کے مشہور و معروف اردو کے اشاعت خانوں کی جملہ مطبوعات اور انجمن کی تمام کتابیں اس کتب خانے سے دستیاب ہوسکتی ہیں -

المشتہر ————————————

منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد (دکن)

اردو

فہرستِ مضامین

بابت جولائی سنہ ۱۹۳۸ ع

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	مقالات گارساں دتاسی (مترجمہ)	ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۵۰۳
۲	کالیداس کی "مالویکا"	جناب ونشی دھر صاحب لکچرر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۶۳۱
۳	معزز الفاظ کی توہین اردو زبان میں	جناب شیخ محمد اسمعیل صاحب سکرٹری اورنٹیل پبلک لائبریری پانی پت	۶۴۸
۴	ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات	پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب	۶۶۱
۵	افکار و واقعات	اڈیٹر	۶۷۹
۶	تبصرے	اڈیٹر اور دیگر حضرات	۷۰۱
۷	اشتہارات	منیجر انجمن اور دیگر مشتہرین	۷۰۱

مقالات گارساں دتاسی

سنه ۱۸۷۲ ع

مترجمه

(از ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ' جامعۂ عثمانیه حیدرآباد)

هندوستانی زبان اور ادب پر جو میری سالانه تقریظیں شائع هوتی هیں وه نه صرف یورپ میں بلکه هندوستان میں بهی قدر کی نظروں سے دیکهی جاتی هیں - چنانچه دیسی اخبارات میں ان کے بعض حصوں کے ترجمے بهی شائع کیے جاتے هیں- میرے سنه ۱۸۷۱ ع والے مقالے کے ایک حصے کا ترجمه مظفرپور کے " اخبارالاخیار" مورخه ۱۵ جولائی سنه ۱۸۷۱ ع اور " اخبار انجمن پنجاب" مورخه ۹ اگست سنه ۱۸۷۱ ع میں شائع هوا هے - یه ترجمه مسٹر ڈرمنڈ کے انگریزی ترجمے سے کیا گیا هے - ان دونوں مذکوره اخبارات میں میری تصویر بهی شائع کی گئی هے - جو لوگ مجهه سے ذاتی طور پر واقف هیں وه میری اس تصویر کو دیکهکر جو " اخبار انجمن پنجاب" میں نکلی هے پهچان لیں گے لیکن "اخبارالاخیار" میں میری جو تصویر چهپی هے وه عجیب سی معلوم هوتی هے —

اب سنه ۱۸۷۲ ع کا سالانه مقاله تیار کرتے وقت میری همت بلند هے اور میں ایرانی شاعر کا یه شعر پڑهتا هوں :—

آغاز کردۂ بہ رسانش بہ انتہا طرحے فگندۂ بہ عنایت تمام کن

یورپ کی طرح ہندستان میں بھی زمانہ اپنی کروٹیں بدل رہا ہے - ہندوستان کے براعظم میں بتدریج تغیرات ظہور پذیر ہورہے ہیں- ہندو اور مسلمان یہ ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ ایک قوم بن جائیں اور جہاں تک ممکن ہے مغربی تمدن کو اپنی زندگی میں سمولیں' بالکل اسی طرح جیسے مسیحیت کے آغاز کے وقت یہودی اور رومن لوگ گھل مل کر ایک ہوگئے تھے حالانکہ ان دونوں کے درمیان اختلاف کی ایک آہنی دیوار حائل تھی - لیکن باوجود اس خواہش کے جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں پائی جاتی ہے ' اردو اور ہندی کے متعلق لسانی بحث مباحثہ کا سلسلہ بدستور جاری ہے - ہندوستان کے ایک اخبار میں پڑھنے میں آیا کہ صوبہ شمال مغربی کے دو لاکھہ رجعت پسند ہندوؤں کے دستخط سے کلکتہ کی انگریزی حکومت کے روبرو ایک معروضہ پیش کیا گیا ہے جس میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ تمام سرکاری کارروائیاں بجائے عربی رسم خط کے جس میں اردو لکھی جاتی ہے ' دیوناگری رسم خط میں ہونی چاہییں جس میں سنسکرت لکھی جاتی ہے - میرا خیال ہے کہ اس بیان میں کچھہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے - غالباً مذکورہ بالا معروضہ سے وہ یادداشت مراد ہے جو بابو شیو پرشاد نے حکومت کو بھیجی تھی اور جس پر ۵ ہزار اشخاص کے دستخط تھے جن میں مدرسہ کے طلبہ ' بابو شیوپرشاد کے ماتحت اور ان کے احباب شامل تھے - بابو شیو پرشاد مہتمم تعلیمات ہیں اور ہندی کے زبردست حامیوں میں ہیں - ان کی یادداشت کے متعلق مجھے ایک بہاری مسلمان کے مضمون کے ذریعہ اطلاع ملی جو " اخبار انجمن پنجاب " مورخہ ۲۰ ستمبر سنہ ۱۸۷۲ ع میں شائع ہوا ہے - مجھے پوری

توقع ہے کہ سرکار انگریزی اس وقت کے معروضوں کو کبھی تسلیم نہیں کرے گی اس واسطے کہ ہندوؤں کو خوش کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ مسلمانوں کے دلوں کو مجروح کیا جائے جو اپنے رسم خط کو بہت عزیز رکھتے ہیں اس واسطے کہ قرآن کریم کا رسم خط یہی ہے - لیکن کوئی چیز نا ممکن نہیں ہے - بہاری مضمون نگار اس ضمن میں یوں رقمطراز ہے :—

" اس خبر وحشت اثر نے سارے ہندوستان میں کھلبلی ڈال دی ہے - بابو شیو پرشاد نے جو پتھر پھینکا ہے وہ مسلمانوں کے سر پر بہت زور سے لگا ہے - کچھ عرصے سے مسلمانوں کو کچھ امید پیدا ہو چلی تھی ' لیکن اب ان کی امید کا درخت جس کی شاخیں کچھ سر سبز ہو رہی تھیں ' پھر سے خشک ہونے لگا " -

مضمون نگار نے آخر میں یہ سوال کیا ہے کہ " کیا اردو زبان کو سرکاری دفاتر اور عدالتوں سے خارج کردیا جائے گا اور اس کی جگہ دیوناگری کو دی جائے گی جو مسلمانوں کے لیے کبھی بھی قابل قبول نہ ہوگی - مسلمانوں کو انگریزی زبان سیکھنے کی اس واسطے ضرورت ہے کہ یہ حکومت کی زبان ہے - اب کیا ان کے لیے یہ بھی لازمی ہوگا کہ وہ ان کی زبان سیکھیں جو ان کے ایک زمانے میں محکوم تھے ؟ ہندی زبان کا رسم خط بدنما اور بھدا ہے - اس میں سنسکرت کے الفاظ ٹھونسے جاتے ہیں جو ایک مردہ زبان ہے اور جسے مردہ زبان ہوئے ایک ہزار سال سے بھی زائد ہوا - ہندی کو ترقی دے کر اردو کو فنا کیا جارہا ہے جس کی آبیاری عربی اور فارسی جیسی زندہ زبانوں کے سر چشموں سے ہوتی ہے اور جس کا خوش نما

رسم خط آسانی سے سیکھا جاسکتا ہے اور جو سیکڑوں برسوں سے ہندوستان کے ہر گوشے میں قبولیت حاصل کر چکا ہے لیکن ایسا کرنے میں کامیابی حضرت مسیح کے معجزوں سے کم نہ ہوگی - اگر انگریزی حکومت یہ سمجھتی ہے کہ ہندی کو رواج دے کر وہ ہندوؤں کی خواہش کی ترجمانی کر رہی ہے تو اس کو چاہیے کہ اضلاع کے مجسٹریٹوں کے ذریعہ کمیٹیاں قایم کرا کے اس امر کی تحقیقات کرائے کہ آیا واقعی ہندوؤں کی اکثریت دیوناگری رسم خط کو اختیار کرنے کے موافق ہے - لیکن اگر ان چند ہزار اشخاص کے علاوہ جنہوں نے بابو شیو پرشاد کی عرضداشت پر دستخط کیے ہیں، دوسرے ہندو لوگ دیوناگری کی تائید میں نہیں ہیں تو حکومت کو اس کی موافقت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں - بابو صاحب اور ان کے ہم خیال اشخاص پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ ہندوستان کی ۱۴ کروڑ مخلوق میں سے اکثریت یا کم از کم ۶ یا ۷ کروڑ دیوناگری رسم خط کی حمایت میں ہیں اس لیے کہ صرف مدرسوں کے طلبہ کے دستخطوں سے ایسے اہم معاملہ کا فیصلہ نہیں ہونا چاہیے - بہر حال اس میں شبہ کی گنجایش نہیں کہ اگر حکومت نے دیوناگری رسم خط کی حمایت کا تہیہ کرلیا تو مسلمانوں کو اس سے بڑا نقصان پہنچے گا اور وہ جہالت کے دلدل میں پھنس جائیں گے - اردو کے توسط سے وہ عربی اور فارسی کے سر چشموں تک بآسانی پہنچ جاتے ہیں جو ان کے نزدیک نہایت اہم زبانیں ہیں - اور حقیقت تو یہ کہ بہت سے ہندو بھی جو اردو زبان اور اردو رسم خط کے عادی ہیں،

ان درختوں کے مماثل ہوجائیں گے جن کی جڑیں کسی نے
اکھاڑ دی ہوں - "

" یہ دعویٰ بلند آہنگی کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ دیوناگری
رسم خط بہ نسبت اردو رسم خط کے زیادہ واضح ہوتا ہے اور
اس میں جعل سازی بہت دشوار ہے - اس کا جواب یہ ہے
کہ اگر اردو رسم خط میں ہر طرح کی سہولت نہ ہوتی تو
صدیوں سے اس کو استعمال نہیں کیا جاتا - دراصل
دیوناگری رسم خط میں طوالت ہوتی ہے اور اس کی تحریر
میں بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے - جس تحریر کے لیے اردو
میں ایک منٹ درکار ہوتا ہے اس تحریر کے لیے دیوناگری میں
چھ منٹ صرف ہوتے ہیں - اور جو لوگ جعل سازی کرتے ہیں
انہیں نہ اردو تحریر میں ایسا کرنے سے کوئی روک سکتا ہے
اور نہ دیوناگری میں - اگر اردو کی جگہ
دیوناگری رسم خط حکومت نے اختیار کر لیا تو مسلمانوں کے لیے
سرکاری دفاتر میں ملازمتیں باقی نہیں رہیں گی - ویسے
بھی سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور
جو مسلمان سرکاری ملازمت میں ہیں وہ ادنیٰ خدمات پر
فائز ہیں - اگر دیوناگری کی تجویز منظور ہوگئی تو ان کی
تعداد سرکاری دفاتر میں اتنی بھی باقی نہیں رہے گی - "

۱۵ نومبر سنہ ۱۸۷۱ع کو لندن کی انجمن فنون کے روبرو سید امیر علی
خاں نے ایک مضمون پڑھا تھا جس میں ہندوستانی زبان کے مسئلہ پر
بحث کی ہے - وہ کہتے ہیں :- " مجھے جن زبانوں کا علم ہے ان

میں ایک بھی ایسی نہیں جو فصاحت و بلاغت میں ھندوستانی کا مقابلہ کرسکے یا جس کا ذخیرۂ الفاظ اس کی طرح مالا مال ھو - پنجاب سے لے کر (بھاگلپور) بنگال تک وہ بولی جاتی ھے - اور حقیقت یہ ھے کہ اردو زبان نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ اکثر ھندوؤں کی بھی قومی زبان ھے - بنگال میں بھاگلپور سے بنگالی زبان شروع ھوتی ھے - بنگال میں صوبجات شمال مغربی اور بہار سے آکر جو مسلمان آباد ھوگئے ھیں وہ بنگالی بہت کم سمجھتے ھیں - بنگال کے اکثر شمالی اضلاع میں اردو زبان بولی جاتی ھے اگرچہ ظاھر ھے کہ وہ دھلی اور لکھنؤ کی اردو کی طرح فصیح نہیں ھوتی - مشرقی بنگال کے مسلمان بھی اکثر اردو بولتے ھیں - بنگالی ان میں سے بہت بولتے ھیں - اس میں شبہہ نہیں کہ بنگالی زبان مسلمانوں کے عہد حکومت کے مقابلے میں آج کل زیادہ استعمال ھونے لگی ھے -" *

کالجوں اور اسکولوں میں ھندوستانی زبان کے رواج کے متعلق مسٹر ایچ جے کارٹر کی رائے قابل وقعت ھے - موصوف بمبئی کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے سابق معتمد ھیں - انھوں نے مجھے اپنے ایک خط میں مورخہ ۲۵ جنوری سنہ ۱۸۷۲ ع لکھا ھے : - " جہاں تک میرا تعلق ھے میری رائے ھے کہ ھندوستانی زبان سرکاری مدارس میں ذریعۂ تعلیم ھونی چاھیے - انگریزی حکومت کے لیے بھی یہ بات مناسب ھوگی کہ اھل ھند کو بجائے انگریزی میں تعلیم دینے کے ملکی زبان میں تعلیم دی جائے -

سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر صوبجات شمال مغربی بھی مذکورہ بالا رائے سے متفق ھیں - موصوف کو اھل ھند میں بڑی ھردلعزیزی حاصل ھے اور جب موقع ملتا ھے وہ ھندوستانی زبان میں بلا تکلف اپنے خیالات

---

* اخبار الاخیار - مورخہ ۱۵ جنوری سنہ ۱۸۷۲ ع -

ظاہر کرتے ہیں - موصوف کو ہندوستانی زبان پر جو قدرت حاصل ہے اس کا ثبوت ان کی حالیہ تقریر سے ملتا ہے جو انہوں نے مرادآباد کے دربار میں تاریخ یکم نومبر سنہ ۱۸۷۱ ع کی تھی - اس دربار میں نواب رامپور اور روہیلکھنڈ کے امرا نے شرکت کی - سر ولیم میور نے اپنی تقریر کے دوران میں بیان کیا کہ انگریزی حکومت مذہبی معاملات میں انتہائی رواداری برتتی ہے اور مذہبی آزادی کا اصول جس پر سرکار انگریزی عمل پیرا ہے' ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا - تقریر کے دوران میں موصوف نے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار برجستہ پڑھے اور ان کے ساتھ ہندی کا ایک دوہا بھی پڑھا - تقریر میں اس امر پر بھی زور دیا گیا کہ اہل ہند اپنے بچوں کی تعلیم کا خاص طور پر انتظام کریں اور حتی الامکان مذہبی اور نسلی امتیازات کو آپس میں کم کرنے کی کوشش کریں -

ہندستان کے نئے وائسرائے لارڈ نارتھ بروک نے بھی مختلف موقعوں پر اپنی تقاریر میں مقامی زبانوں اور خاص کر ہندستانی زبان میں تعلیم دینے کے متعلق اظہار خیال کیا ہے -

لیکن بایں ہمہ بعض لوگ مستقل طور پر باقاعدہ ہندستانی زبان کی مخالفت پر کمر بستہ معلوم ہوتے ہیں - اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وول وچ کی شاہی اکاڈمی میں ہندستانی زبان کی تعلیم کا انتظام کیوں نہیں کیا گیا - ایک بیرسٹر نے انڈین میل کے اڈیٹر کو لکھا ہے اور اس کی نسبت شکایت کی ہے - بیرسٹر موصوف نے لکھا ہے کہ ہندستانی زبان کی تعلیم کا انتظام کرنا ضروری ہے اس واسطے کہ فوج کے تین چوتھائی افسر جو اس کالج سے نکلیں گے' ہندستان میں چند سال

تک ضرور رہیں گے - اس سے کیا فائدہ کہ ہندستانی کے بجائے ان افسروں کو جرمن، لاطینی اور یونانی سکھائی جاتی ہے جو مطلق ان کے کام نہیں آئیں گی - اس اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ انگریز افسروں کے لیے اس میں زیادہ سہولت ہوگی کہ وہ ہندستانی زبان ہندستان جاکر سیکھیں - لیکن دیکھا گیا ہے کہ گرم آب و ہوا میں اکثر لوگ سست ہوجاتے ہیں - اگر فوجی افسروں کو ہندستانی زبان کے اصول اس وقت سکھادیے جائیں جب کہ وہ انگلستان میں زیر تعلیم ہیں تو وہ مشق سے اور ہندستان میں رہ کر اس زبان کی تحصیل مکمل کر سکتے ہیں —

اس کی بڑی ضرورت ہے کہ سرکاری عہدہ دار مروجہ زبانوں سے واقفیت رکھتے ہوں - لیکن اس وقت ہندستان میں ایسا نہیں ہے - چنانچہ دیسی اخباروں میں ایسے سرکاری عہدہ داروں کے خلاف شکایات شایع ہوتی رہتی ہیں جو عوام کی زبان سے نابلد ہوتے ہیں - ان شکایات کے ساتھ اس خواہش کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ سرکاری عہدہ داروں کا اپنی خدمات پر مامور ہونے سے پیشتر مروجہ زبانوں میں سے ایک میں باقاعدہ امتحان لینا چاہیے —

لاہور کے یونیورسٹی کالج کی تجاویز کی بدولت کلکتہ یونیورسٹی کی سینیٹ نے اپنی یہ غلطی تسلیم کی ہے کہ وسطانیہ کے امتحانات میں مقامی زبان میں جوابات دینے کی طلبہ کو اجازت ہونی چاہیے - در اصل مقامی زبان میں امتحان دینے کی اجازت نہ ہونے کے باعث بہت سے ہندستانی نوجوان شرکت نہیں کر سکتے - یہ ان کے ساتھ بڑی نا انصافی ہے - دنیا کے تمام ممالک میں یہ قاعدہ ہے کہ امتحانات یا تو ملکی زبان یا قدیم زبان کے توسط سے ہوتے ہیں - انگریزی زبان

اہل ہند کے لیے نہ تو ملکی زبان ہے اور نہ اس کی حیثیت ان کی قدیم زبان کی ہے - خوشی کی بات ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی نے بالآخر ہندستان کی مروجہ زبانوں کی حیثیت کو تسلیم کرلیا اور اس باب میں اپنے فرض کو پہچانا - چنانچہ ۱۲ مئی سنہ ۱۸۷۱ ع کو سینیٹ کے جلسے میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ ملکی زبان کے ذریعہ جوابات کی وسطانیہ کے امتحانات میں اجازت ہوگی - ملکی زبانوں میں ہندستانی کے ماسوا بنگالی، اُڑیا اور آسامی شامل ہیں - امیدوار کو اجازت ہوگی کہ ان میں سے کسی زبان میں سوالات کے جواب دے - وسطانیہ کے امتحان کے بعد جو صداقت نامے کامیاب امیدواروں کو دیے جائیں گے وہ بھی امیدوار کی مقامی زبان میں ہوں گے - اس کے متعلق گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے ضروری قواعد و ضوابط نافذ کردیے ہیں اور ان کا سرکاری طور پر باقاعدہ اعلان کردیا گیا ہے * —

کلکتہ یونیورسٹی کے اس فیصلہ سے ملکی زبانوں کو فروغ حاصل کرنے کا پورا موقع ملے گا - بالخصوص ہندستانی زبان کی وسعت میں اس کی وجہ سے بہت مدد ملے گی جو پنجاب، صوبجات شمال مغربی، اودھ، بہار، صوبجات متوسط و دکن اور بنگال کے ایک حصے میں بولی جاتی ہے اور جس کو بجا طور پر "قومی زبان" کہہ سکتے ہیں - اس طرح ہندستانی اور انگریزی میں مقابلہ ہوگا کہ کونسی زبان مقبولیت حاصل کرتی ہے - وسطانیہ کے امتحان میں امیدوار کی جانچ صرف و نحو اور مادری زبان کی انشا کے علاوہ ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ میں کی جائے گی —

* اخبار انجمن پنجاب، مورخہ ۱۵ مارچ سنہ ۱۸۷۲ ع

کلکتہ یونیورسٹی کی سینیٹ نے جو تجویز منظور کی ہے اس سے مسلمان بہت خوش ہیں اس لیے کہ انھیں اب اس کا موقع حاصل ہوگا کہ بغیر انگریزی پڑھے ہوئے وسطانیہ کے امتحان میں شرکت کرسکیں۔ وہ اس امتحان میں انگریزی کی بجاے فارسی یا عربی لے سکتے ہیں جو ان کی قدیم زبانیں ہیں —

بہار کی علمی مجلس (سائنٹفک سوسائٹی) کا صدر مقام مظفر پور ہے۔ اگرچہ یہ انجمن سنہ ۱۸۶۸ع میں قائم ہوئی ہے لیکن اس کے ارکان کی تعداد پانچ سو ہو چکی ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ چند انگریز بھی اس انجمن میں شریک ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی کی سینیٹ نے وسطانیہ مدارس کے امتحانات کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے اس میں اس انجمن کے اثر کو بہت کچھ دخل حاصل ہے۔ اس فیصلے سے بہت سے اہل ہند کے دلوں میں انگریزی حکومت کے ساتھ لگاؤ پیدا ہوگیا ہے جو سرکاری ملازمتوں کے لیے انگریزی کو لازمی نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ اس سے انگریزی حکومت کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوگا۔ اودھ کی پولیس کے انسپکٹر جنرل نے اس صوبے کے ناظم تعلیمات سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر سال ۴۰ مسلمانوں کو اپنے محکمے میں ملازمت دے گا بشرطیکہ وہ ہندستانی لکھ پڑھ سکتے ہوں اور ریاضی سے واقف ہوں۔ مدراس کے لفٹنٹ گورنر لارڈ ہوبرٹ بھی مسلمانان ہند کے ساتھ خاص ہمدردی رکھتے ہیں۔ انھوں نے پچاس مسلمانوں کی ایک فہرست پہلے سے تیار کرلی ہے جنھیں سرکاری خدمات خالی ہونے پر فوراً ملازم رکھ لیا جائے گا۔ موصوف نے حکومت کی ایک تجویز کا بھی اعلان کیا کہ مسلمانوں کے لیے علحدہ مخصوص مدارس کھولے جائیں گے جن میں ہندوستانی زبان میں تعلیم دی جاے گی تاکہ وہ سرکاری خدمات حاصل کرسکیں —

بہار کی سائنٹفک سوسائٹی نے لفٹنٹ گورنر بنگال کی شکر گذاری کے لیے ایک ایڈریس پیش کیا ہے جس میں اس کا اظہار کیا گیا ہے کہ وسطانیہ جماعتوں کا مادری زبانوں میں امتحان لینے سے لوگوں کو کس قدر فائدہ پہنچا ہے *- اس ایڈریس میں اس متذکرہ بالا اصلاح کے یہ فائدے بتائے گئے ہیں :— (۱) دیسی طلبہ کی رسائی سائنس تک ہوسکے گی - (۲) اہل ہند کے دلوں میں ملکۂ معظمہ کی قدر و منزلت بڑھے گی اسواسطے کہ ان محترمہ نے ان کی اس دشواری کو محسوس فرمایا جو انگریزی زبان میں وسطانیہ کا امتحان لازمی رکھنے سے انہیں پیش آتی تھی اور ہندستانی زبان اور ان کی قدیم زبانوں کو ترقی کا موقع عطا فرمایا جن میں ان کے مذہبی علوم ہیں - اس ایڈریس میں سوسائٹی کی جانب سے ان مقاصد کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو اس کے پیش نظر ہیں - یعنی حکومت کی مدد سے دیسی زبانوں کی تعلیم کے لیے مدارس قایم کرنا - اس کے ساتھ ساتھ ایسے مدارس قایم کرنا جن میں انگریزی زبان اور مغربی علوم و فنون کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہو - سوسائٹی کے ایک مجلہ کے ذریعہ عام معلومات کی نشر و اشاعت کرنا - یہ مجلہ ہندستانی زبان میں ہوگا اور اس میں علمی اور ادبی دونوں قسم کے مضامین شائع ہوں گے - سوسائٹی نے توقع ظاہر کی ہے کہ عنقریب وہ پٹنہ میں ایک کالج قایم کرنے والی ہے جہاں ہندستانی کے ذریعہ مغربی علوم پڑھائے جائیں گے —

علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی کے تعاون عمل سے بہار کی سائنٹفک سوسائٹی نے پانچ نئی کتابیں شایع کی ہیں اور بارہ کتابیں زیر ترجمہ

* اخبار سائنٹفک سوسائٹی بہار - مورخہ ۱۵ اپریل سنہ ۱۸۷۲ م -

ہیں - اس کے کتب خانہ میں عربی کی مزید ۷۰ کتب کا اضافہ ہوا ہے جو مصر میں طبع ہوئی ہیں - انگریزی کی ۱۲۰ کتب کا اضافہ ہوا ہے جو مختلف علوم و فنون اور فلسفہ سے تعلق رکھتی ہیں - انجمن کے معتمد نے بعض فاضل انگریزوں کے مشورے سے یہ کتب منگائی ہیں —

مظفر پور کے کالج کے علاوہ جہاں ہر شخص اس امر کی تشفی حاصل کرسکتا ہے کہ مغربی علوم و فنون کس قدر سہولت کے ساتھ ہندستانی زبان کے ذریعہ پڑھائے جاسکتے ہیں، سائنٹفک سوسائٹی بہار نے ترہوت اور دوسرے اضلاع میں متعدد مدارس قایم کیے ہیں - اگر حکومت نے سوسائٹی کی اعانت کی تو توقع ہے کہ بہت جلد وہ اور مدرسے قایم کردے گی - اب تک سوسائٹی کا کل سرمایہ چندوں اور عطیات پر مبنی ہے اور بہت سے امرا اور زمیندار لوگ اس کی مالی امداد کرتے رہے ہیں - اس ایڈریس میں جو لفٹنٹ گورنر بنگال کو پیش کیا گیا معطیوں کے ناموں کی فہرست اور ان کے عطیات کی رقوم درج ہیں -

اگرچہ یہ درست ہے کہ جن طلبا نے مغربی علوم کی تحصیل کی ہے انہیں سرکاری ملازمت کو اپنا مقصد حیات نہیں بنانا چاہیے لیکن اس کے ساتھ حکومت کا یہ فرض باقی رہتا ہے کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق تعلیم یافتہ ہندستانیوں کو خدمات دے، چاہے وہ انگریزی زبان سے واقفیت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں - اگر حکومت نے یہ حکمت عملی اختیار کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت بڑھ جائے گی اور ان میں خود بخود انگریزی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوجائے گا جس کے ترجموں کے ذریعہ وہ علوم (سائنس) حاصل کرتے ہیں —

مظفر پور کے سنٹرل کالج کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد ۷ نومبر سنہ ۱۸۷۱ ع کو بنگال کے لفٹننٹ گورنر مسٹر جی کیمبل نے رکھا - یہ کالج بیچ شہر میں آموں کے جھنڈ میں واقع ہے - اُس روز صبح ہی سے ہزاروں آدمی اس تقریب میں شرکت کے لیے خیموں تلے جمع تھے - اس موقع پر تین تقاریر ہوئیں - مولوی سید امداد علی نے ہندوستانی میں تقریر کی - ڈاکٹر نولن نے انگریزی میں اور مسٹر جی کیمبل لفٹننٹ گورنر بنگال نے بھی انگریزی زبان میں تقریر کی - لفٹننٹ گورنر بنگال نے دوران تقریر میں کہا کہ میں انجمن بہار کے ان خیالات کی تائید کرتا ہوں جو اس نے پٹنہ کالج کے متعلق ظاہر کیے ہیں - اس میں شبہ نہیں کہ عوام کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوے اور تعلیمی ترقی کا لحاظ رکھتے ہوے یہ ضروری ہے کہ ابتدائی اور وسطانی تعلیم ملکی زبان کے ذریعہ دی جائے - اس سے یقیناً مسلمانوں کو فائدہ ہوگا اس لیے کہ وہ اب تک سرکار کے مدرسوں اور کالجوں سے دور رہے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں اپنی مادری زبان اور اپنی قدیم (کلاسکی) زبانوں سے محبت ہے - موصوف نے کہا کہ مجھے یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ انجمن بہار نے جو مدارس قایم کیے ہیں ان میں نصف تعداد طلبہ کی مسلمانوں پر مشتمل ہے - موصوف نے یہ بھی کہا کہ میں ہندوستانی زبان کا دل سے ہوا خواہ ہوں جہاں تک کہ اس کی اشاعت کا پنجاب اور صوبجات شمال مغربی سے تعلق ہے - ان علاقوں میں اس زبان کے ذریعہ سب کارروائیاں ہوتی ہیں اور انگریزی کو اب تک کم رواج حاصل ہوا ہے - لیکن صوبۂ بہار کے حالات دوسرے ہیں - اس کا تعلق صوبۂ بنگال سے ہے جہاں انگریزی زبان نے جڑ پکڑلی ہے - اس لیے یہاں بجائے قدیم مشرقی زبانیں سکھانے کے انگریزی

کی تعلیم پر زور دیا جاے تو بہتر ہوگا - بلاشبہہ سنسکرت زبان میں مٹھاس پائی جاتی ہے اور اس کا ذخیرۂ الفاظ بھی بہت وسیع ہے - اس کا تعلق یورپ کی اکثر السنہ سے ہے اسی طرح عربی زبان بھی ایک جاندار زبان ہے اور اس میں فلسفہ اور تاریخ کے بیش بہا خزانے موجود ہیں - لفٹننٹ گورنر بنگال نے کہا کہ ان زبانوں کے متعلق انکا وہی خیال ہے جو یورپ کی کلاسکی زبانوں کے متعلق ہے - موصوف نے کہا کہ انگلستان میں ان قدیم زبانوں کے سکھانے پر بیکار بہت وقت ضائع کیا جاتا ہے - موصوف نے آخر میں اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ قدیم زبانوں کی تعلیم اختیاری ہونی چاہیے اور انگریزی اور سائنس کی تعلیم کو لازمی رکھنا چاہیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اپنی مذہبی کتابوں کو سمجھنے کے لیے مسلمان لوگ عربی اور فارسی سیکھیں لیکن ان زبانوں کو ذریعہ تعلیم تو نہیں بنایا جاسکتا - اگر ملک کی کسی زندہ زبان میں تعلیم دینے کا انتظام نہیں ہوسکتا تو بہتر ہوگا کہ انگریزی ہی ذریعۂ تعلیم رہے - مغلوں کے عہد حکومت میں فارسی سیکھنی پڑتی تھی - اب جبکہ ہندوستان میں انگریزی حکومت نے امن و امان قایم کیا ہے تو اگر اہل ہند میں انگریزی زبان کی اشاعت کی جائے تو شکایت کا موقع نہ ہونا چاہیے - پھر انگریزی زبان کے پھیلنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ اہل ہند مغربی علوم و فنون سے آگاہ ہوں گے جس سے انہیں بہت سے فوائد حاصل ہوں گے - اگرچہ حکومت نے وسطانیہ مدارس کی تعلیم کے لیے یہ سہولت بہم پہنچا دی کہ مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کیا جائے لیکن اگر طلبہ انگریزی زبان سیکھیں گے تو انہیں آئندہ یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کرنے میں آسانی ہوگی اس لیے کہ یونیورسٹی میں قدیم مشرقی زبانوں سے واقفیت کام نہ آئے گی -

اور انگریزی کے توسط سے مغربی علوم (سائنس) حاصل کرنے میں بے حد سہولت ہوگی ۔

ان چند باتوں کا ذکر کرنے کے بعد لفٹننٹ گورنر بنگال نے مولوی امداد علی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں چونکہ زبان سے ناواقف ہوں اس لیے تقریر کا بہت کم حصہ سمجھ سکا اور مشکل سے یہ فرق کرسکا کہ ان کی تقریر اردو میں تھی یا فارسی زبان میں - تعجب ہے کہ باوجود اس کے کہ لفٹننٹ گورنر بنگال اردو زبان سے ناواقف ہیں لیکن انہوں نے اس قسم کی تنقید کو روا رکھا - اس ضمن میں موصوف نے یہ بھی کہا کہ اردو دیسی زبان نہیں ہے اور تعلیم عامہ میں اس کو رواج نہیں دیا جاسکتا - لیکن ہم یہ عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ لفٹننٹ گورنر بنگال کے نزدیک دیسی زبان سے کیا مراد ہے ؟ کیا دیسی زبان ان کے نزدیک وہ ہے جو فوجی لوگ یا قلی بولتے ہیں ؟ افسوس ہے کہ وہ اس بات سے ناواقف ہیں کہ دیسی زبان کا اطلاق جیسا ہندوستانی اردو پر ہوتا ہے کسی اور زبان پر نہیں ہوتا - یہ زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل سے پیدا ہوئی - اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ بالکل فطری طریقے پر شامل ہوئے - عربی کے لفظوں نے اصل فارسی ہی کی راہ سے اس زبان میں بار پایا - اس زبان میں بھی دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح بول چال کے محاورے علمی اور ادبی زبان سے مختلف ہیں - یہ درست ہے کہ مسلمان اردو میں ایسے بہت سے لفظ استعمال کرتے ہیں جو عام بول چال میں نہیں برتے جاتے - ظاہر ہے کہ لفٹننٹ گورنر بہادر بنگال کو یہ بات ہرگز پسند نہ ہوتی کہ کوئی انہیں ایسی زبان میں خطاب کرے جو رکیک اور بازاری ہو - مولوی امداد علی نے جو طرز

خطاب اس موقع پر اختیار کیا وہ حسب حال اور موزوں تھا - مشرق کی اور دوسری زبانوں میں بھی سوائے عربی کے ہمیں یہ بات ملتی ہے - چنانچہ ترکی اس باب میں ہندستانی سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے - ترکی میں بھی بہت سے ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو ترکی لفظ کے ساتھہ عربی اسم کے ملانے سے بنائے جاتے ہیں - ترکی مصنفین اپنی تحریروں میں عربی اور فارسی کے الفاظ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں - کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی تحریر کو لوگ نہیں سمجھتے ؟ - مشرقی زبانوں کی اس خصوصیت کو ہمیں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے کا کوئی حق نہیں - خود انگریزی زبان میں لاطینی محاورے استعمال ہوتے ہیں - پارلیمنٹ کے جلسوں میں اراکین 'ورجل' اور 'ہوریس' کے اشعار لاطینی زبان میں پڑھتے ہیں اور کوئی شخص اعتراض نہیں کرتا —

مسٹر جی کمبل' لفٹنٹ گورنر بنگال نے ہندوستانی اردو کے خلاف جو تقریر کی اور جس میں مولوی امداد علی کی زبان کو معرض بحث میں لایا گیا وہ دراصل ان کے ایک اور اہم بیان کا پیش خیمہ تھی جسے ہم سرکاری کہہ سکتے ہیں - ہماری مراد ہے اس یاد داشت سے جو دیسی زبانوں میں تعلیم دینے کے متعلق ۴ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ ع کو شائع کی گئی ہے - کوئی شخص اس کا گمان بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اس قسم کی تحریر خود اعتمادی کے ساتھہ حکومت کے سامنے پیش کی جائے گی - ہمیں پوری توقع ہے کہ نئے وائسرائے بہادر اس تحریر کو منسوخ قرار دیں گے - یہ تحریر اس قدر عجیب و غریب اور غیر متوقع ہے کہ ہم یہاں اس کا ایک اقتباس درج کرتے ہیں :—

"فارسی زبان کو جو ہندوستان کے قدیم حکمرانوں کی زبان تھی، کلیتاً ترک کر دیا گیا ہے - سرکاری زبان کی حیثیت سے میرے (لفٹننٹ گورنر بنگال) ہندوستان آنے سے قبل یہ زبان ترک کر دی گئی تھی - میری خدمت کے ابتدائی ایام میں اس بات کی پورے طور پر کوشش کی گئی کہ سرکاری قوانین میں اس دوغلی زبان کے الفاظ مستعمل نہ ہوں جو فارسی انشا پردازوں کو بہت عزیز تھے * - میرا خیال تھا کہ یہ زبان بالکل متروک ہو چکی ہے اور ہمیں ایسا کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے - لیکن پچھلے دنوں جب مجھے بہار جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ دوغلی زبان پھل پھول رہی ہے اور ہمارے قوانین میں اس کے لفظ استعمال ہوتے ہیں اور مدرسوں میں بھی اس کی تعلیم کا انتظام ہے - بہار میں میں نے جو زبان سنی وہ نہایت خراب اور مصنوعی تھی † ایسی مصنوعی زبان میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی - مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس قسم کی زبان کو ہمارے مدارس میں دیسی زبان (ورنیکلر) کہا جاتا ہے - مولوی لوگ جو زبان مروجہ زبان کی بجائے ہمارے مدارس میں سکھاتے ہیں وہ زبان کہلانے کی مستحق

* ان الفاظ سے ہندوستانی کے الفاظ مراد ہیں - لیکن اس کو کیا کیجیے کہ خود انگریزی زبان کے اکثر الفاظ دوغلے ہیں جیسا کہ گلکرسٹ نے بار بار کہا ہے - اس اعتبار سے انگریزی بھی دوغلی زبان ہوئی —

† مصنوعی سے کیا مراد ہے؟ ہر زبان جو صرف و نحو کے قواعد کے مطابق بولی جاتی ہے ایک حد تک مصنوعی کہی جاسکتی ہے —

ہی نہیں - اس زبان کے لیے "اردو" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو نہایت غیر موزوں ہے - میں سمجھتا ہوں یہ لفظ بنگال کے محکمۂ تعلیمات نے رائج کیا ہے - یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی متعین نہیں کیے جاسکتے - کتابوں میں چاہے اس زبان کے متعلق کوئی کچھ لکھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان اہل دربار اور دہلی کی طوائفوں کی زبان ہے - اس کو ملک کی مروجہ زبان نہیں کہہ سکتے - میں نے پورا ارادہ کرلیا ہے کہ جہاں تک میرا بس چلے گا اس زبان کی تعلیم کو جو ہمارے مدرسوں میں دی جاتی ہے' روکنے کی کوشش کروں گا - میں فارسی زبان کے مداحوں میں ہوں - یہ ایک نفیس اور پر تکلف زبان ہے - اگر فارسی زبان کی تعلیم دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ حالات ایسا کرنے کے موافق ہوں - لیکن بگڑی ہوئی عربی اور بگڑی ہوئی فارسی کے میل سے جو زبان تیار کی گئی ہے جس میں ہندوستانی کے کچھ تھوڑے سے افعال و حروف وجاڑیہ (conjunctions) شامل کرلیے گئے ہیں جسے اردو کہتے ہیں' ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کی تعلیم دی جاے - مجھے بنگالی زبان نہیں آتی لیکن مجھے یقین ہے اس زبان میں بھی بہت میل پیدا ہوگیا ہے اور اس میں سنسکرت کے لفظ اور محاورے بے تحاشا شامل کرلیے گئے ہیں * بہار کے مدارس

---

* غالباً اردو سے نا واقفیت کی بنا پر لفٹنٹ گورنر بنگال نے اس کے متعلق اپنی یہ راے ظاہر کی ہے - سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بغیر سنسکرت الفاظ کے بنگالی کی کیا حیثیت رہ جاے گی اس کا جواب ریورنڈ جے لانگ اور مسٹر جان بیمز دے سکیں گے —

میں جو مروجہ زبان میں تعلیم دی جاتی ہے وہ تمام تر اس پر مشتمل ہے کہ ایک مولوی صاحب اردو پڑھادیتے ہیں اور ایک پنڈت جی ہندی میں لکھے ہوئے چند سورماؤں کے تاریخی حالات بتادیتے ہیں۔ اس تاریخ میں ہر دوسرے یا تیسرے صفحے پر سنسکرت کے شلوک ضرور ہوتے ہیں۔ ہندی کے متعلق میری راے ہے کہ اس میں خواہ مخواہ سنسکرت کے لفظوں کی ٹھونس ٹھانس نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہم یہ کرسکتے ہیں کہ ہندی کا نام لیکر ہر گانوں کی علحدہ بولی کو تسلیم کریں۔ ایسا کرنا بالکل اس کے مماثل ہوگا کہ انگلستان میں بچوں کو 'ڈور سیٹ شائر' یا 'یارک شائر' کی بولیاں سکھائی جائیں*۔ ہندوستان کی ایک زبان کل ملک کے لیے ہے جو ہندوستانی کہلاتی ہے بالکل اس طرح جیسے انگلستان میں انگریزی ہے۔ میری دانست میں اہل بنگال کی زبان اسی طرح بنگالی کہی جا سکتی ہے' لیکن چونکہ بنگالی زبان ابھی حال ہی میں وجود میں آئی ہے اس لیے بول چال کی بنگالی اور تحریر کی بنگالی میں فرق کرنا ہوگا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ اردو میں سے فارسی الفاظ چن چن کر علحدہ کردئے جائیں۔ یہ ہندوستانی زبانوں کی خصوصیت خاصہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ کسی اجنبی زبان کے محاورے اور لفظ کسی مطلب کو ادا کرنے کے لیے آسانی سے اپنے میں شامل

* اس کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی بچوں کو نہ ہندی سکھائی جاے اور نہ اردو بلکہ انھیں صرف انگریزی پڑھائی جاے۔

کراپکتی هیں اسواسطے که خود ان میں اس کے ادا کرنے کے لیے لفظ موجود نہیں چنانچہ هندوستانی زبانوں میں بہت سے فارسی الفاظ نے راہ پائی - اسی طرح انگریزی لفظ بھی اپنائے جا رهے هیں اور غالباً آئندہ اور زیادہ اپنائے جائیں گے - یہ دوسری زبانوں کے لفظ جو هندوستانی زبانوں میں اپنائے گئے هیں بچوں کو سکھانے هوں گے* - هم اس بات پر زور دیتے هیں که بچوں کو جو زبانیں سکھائی جائیں وہ ملک کی حقیقی زبانیں هونی چاهئیں جو عام طور پر بولی جاتی هیں - اور جنهیں عوام الناس سمجھ سکیں † - مصنوعی زبانیں سکھانے سے کوئی فائدہ نہیں جنهیں عام لوگ نہیں بولتے اور نه سمجھ سکتے هیں اگر جدید تصورات کو ادا کرنے کے لیے جدید الفاظ کی ضرورت هے تو میں سمجھتا هوں یہ بہتر هوگا که انگریزی الفاظ رائج کیے جائیں بجائے اس کے که کسی اجنبی زبان کے اجنبی الفاظ قبول کیے جائیں - یہ ضرورت اس واسطے پیش آئے گی که هم انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے ذریعہ جدید تصورات کو اهل هند کے سامنے پیش کر رهے هیں - هندی اور هندوستانی کے متعلق میرا خیال هے که ان

---

* یہ خیال بہت اچھا هے - ایسے لفظ جو هندستانی زبانوں میں داخل هوگئے هیں اور جن سے لوگ مانوس هیں عام طور پر عربی اور فارسی کے لفظ هیں - مثلاً سلام، صاحب، شراب، مختار، نذر، رسالہ اور بد معاش - اسی طرح کے سیکڑوں اور دوسرے الفاظ هیں جو هندستانی زبانوں کے علاوہ انگریزی تک میں قبول کرلیے گئے هیں -

† کاش مسٹر کمبل، لفٹنٹ گورنر بنگال کسی ایسی ملکی زبان کے دو ایک صفحے بطور مثال پیش کرسکتے تاکہ معلوم هو کہ ان کی مراد کس قسم زبان سے هے -

دونوں کو اس طرح سکھانا چاہیے گویا وہ دونوں ایک زبان ہوں جو دو مختلف رسم خط میں لکھی جاتی ہیں - میں نے ابھی جو کچھہ کہا ہے اس سے اندازہ کر لیا گیا ہوگا کہ میں قدیم اور دقیانوسی ہندی کی ہمت افزائی کے خلاف ہوں - ہندی کی جو کلاسکی کتابیں صوبجات شمال مغربی (یو - پی) میں چھاپی جارہی ہیں ان میں فارسی کے ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جنھیں لوگ سمجھہ سکیں - اگر انھیں کتابوں کو فارسی رسم خط میں لکھا جائے تو وہ ایسی خالص ہندوستانی زبان بن جائے گی جس کو رائج ہوتے دیکھنے کی میری دلی خواہش ہے ' -

" میں ناظم تعلیمات کی توجہ مندرجہ ذیل امور کی جانب مبذول کراتا ہوں - (۱) اردو زبان ہمارے مدرسوں اور تعلیمی اداروں میں قطعی طور پر متروک ہوچکی ہے - (۲) ناظم تعلیمات اور مہتممان تعلیمات کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس بات کو دیکھیں کہ ہمارے مدرسوں میں کوئی ایسی کتاب تو نہیں پڑھائی جاتی جو ملک کی اصلی اور خالص زبان میں نہیں لکھی گئی ہے جس کے متعلق اوپر ذکر کیا جاچکا ہے * - (۳) اس قسم کی کتابیں جو نصاب میں شامل کی جائیں ان کی فہرست مجھے بھیجی جائے - مجھے اس میں مطلق

---

* دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ایسی ہندی پڑھائی جائے جس میں فارسی لفظ ہوں اور فارسی رسم خط میں وہ لکھی جائے - یہ عجب بات ہے کہ اس پر اتنی تنقید کر چکنے کے بعد اس زبان کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ وہ کام آسکتی ہے -

شبہ نہیں ہے کہ صوبجات شمال مغربی میں ہندی اور ہندوستانی کی جو کتابیں شایع کی جا رہی ہیں وہ نصابی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتیں۔ اگر ہندوستانی میں کلاسکی کتب کی کمی ہے تو اس کمی کو اس طرح پورا کیا جا سکتا ہے کہ ہندی کی کتب کو فارسی رسم خط میں چھاپ دیا جائے جس کے متعلق میں ذکر کر چکا ہوں - لیکن بنگالی میں ایسی کتابیں کثرت سے موجود ہیں جن سے ہماری ضروریات کما حقہ پوری ہوتی ہیں - اگر ان کتب کو علحدہ کر دیا جائے جن میں سنسکرت کا عنصر غالب ہے یا جن کی عبارت مصنوعی ہے تو بھی ایسی کتابیں ہمارے پاس بچ جائیں گی جو مروجہ بنگالی زبان میں لکھی گئی ہیں جن سے ہماری مقصد بر آری ہو سکتی ہے - (۴) اگر تعلیمات کے کسی شعبے میں ایسی کتب موجود نہ ہوں جو مروجہ زبان میں لکھی گئی ہوں تو اس کے متعلق مجھے خاص رپورٹ بھیجنی چاہیے - میں ان کتب کی فراہمی کا انتظام کروں گا" —

" میں نے اوپر جو کچھ ہدایات دی ہیں ان کی تعمیل تمام سرکاری عہدہ داروں پر عاید ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے دفاتر میں سوائے مروجہ زبان کے دوسری زبان کا استعمال نہ ہونے دیں سوائے انگریزی زبان کے - انگریزی زبان جن دفاتر میں استعمال ہوتی ہے وہاں وہ علی حالہ رہے گی مجھے توقع ہے کہ ہائی کورٹ بھی اس بارے میں ہمارا ہاتھ بٹائے گا - مجھے پورا یقین ہے کہ ہائی کورٹ جج میری طرح دیسی زبانوں کے غلط استعمال کے خلاف ہوں گے" —

مسٹر کیمبل لفٹننٹ گورنر بنگال کی دیسی زبانوں کے متعلق یہ یادداشت ہے جو عجیب و غریب نوعیت رکھتی ہے - میں نے اس کو یہاں اس واسطے درج کردیا تاکہ یورپ میں بھی لوگ اس سے واقف ہوجائیں- مجھے یقین ہے کہ یورپ میں ان خیالات کو سن کر وہ لوگ جو ہندوستان کے حالات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں ناک بھوں چڑھائیں گے - معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بھی اس یادداشت سے لوگ خوش نہیں ہیں جیسا کہ بنگال کے ناظم تعلیمات کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے جو اس یادداشت کے جواب میں لکھی گئی ہے - بنگال کے ناظم تعلیمات مسٹر ڈبلو ایس ایٹکنسن کے سوا محکمۂ تعلیمات کے دوسرے اعلی عہدہ دار جیسے مسٹر سٹ کلف ، مسٹر فیلن اور مسٹر ہیلڈ وغیرہ نے بھی اس کے جواب دیے ہیں - اگرچہ ان جوابات کا لب و لہجہ نہایت مودبانہ ہے لیکن ان کا مفہوم واضح ہے - ان سبھوں نے مسٹر کیمبل کے خیالات کو ناقابل عمل بتایا ہے اور ان کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے - ان کا خیال ہے کہ لفٹننٹ گورنر بنگال کے تصورات شرمندۂ عمل نہ ہوسکیں گے —

انڈین ڈیلی نیوز نے مسٹر کیمبل کے عجیب و غریب لسانیاتی نظریوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی - اس اخبار نے اس کا مذاق اڑایا ہے کہ ہندوستانی زبان بنائی نہیں جا سکتی اور اس کو سرکاری طور پر ہندوستانی اردو کی جگہ نہیں رائج کرایا جاسکتا - اسی مسئلے کے متعلق لفٹننٹ گورنر بنگال اور کلکتہ یونیورسٹی کے درمیان سخت اختلاف رائے پیدا ہوگیا ہے - لیکن مسٹر کیمبل کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہندوستانی اردو نے جس طرح ہندوؤں کی رجعتی حکمت عملی کا مقابلہ کیا ہے اس طرح وہ ان کی تنقید و تعریض کا بھی مقابلہ کرلے گی - ممکن ہے مسٹر کیمبل

کے احکام کی بلا چون و چرا پابندی کی جائے اور بہار کے مدارس میں اردو کو ختم کردیا جائے لیکن اور دوسرے مقامات پر اس زبان کے رواج کو کوئی نہیں روک سکتا - ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں میں اس کی تعلیم برابر جاری رہے گی * - ایسے جلسوں میں جن میں انگریز اور ہندوستانی دونوں شریک ہوں گے اسی زبان کے ذریعہ مبادلۂ خیالات کیا جائے گا - حکومت ہند کے اس کی بابت احکام موجود ہیں کہ مقامی مجلسوں اور انجمنوں کو مقامی زبان میں اپنی کارروائیاں کرنی چاہییں - ان احکام کے اجرا پر عام طور سے اظہار اطمینان کیا گیا اور بالخصوص لاہور کی ادبی انجمن نے ان کو بہت پسند کیا † - اسی ضمن میں حکومت نے عدالتوں کو بھی یہ حکم بھیجا تھا کہ وہ بھی اسی زبان کو ترجیح دیں جو ان لوگوں کی عام زبان ہے جو دادرسی کے لیے آتے ہیں - عدالتوں کو چاہیے کہ سرکاری کاغذات میں حتی المقدور ہندوستانی اصطلاحات کو رائج رکھیں - ان کی جگہ انگریزی اصطلاحات سے احتراز کیا جائے ‡ - ان باتوں کے علاوہ انڈیا آفس کا حکم موجود ہے جس کے بموجب سول سروس کے امیدواروں کے لیے ہندوستانی زبان کا سیکھنا لازمی کیا گیا ہے حالانکہ ملک کی کسی دوسری زبان کو اس قدر اہمیت نہیں دی گئی $ —

---

* بیمپور ضلع علیگڑھ کے مدرسے میں ایک ہندو مدرس نے اردو کی جگہ ہندی کی تعلیم شروع کردی تھی لیکن اس تبدیلی کا یہ نتیجہ ہوا کہ بجائے ۱۸ طالبعلموں کے ہندی کی کلاس میں صرف ۵ رہ گئے - (علیگڑھ اخبار - مورخہ ۹ اگست سنہ ۱۸۷۲ ع) -

† اخبار انجمن پنجاب - مورخہ ۱۹ جنوری سنہ ۱۸۷۲ ع -

‡ اخبار سائنٹفک سوسائٹی بہار - مورخہ ۱۵ اپریل سنہ ۱۸۷۲ ع -

$ ۲۳ اگست سنہ ۱۸۷۲ ع کے انڈین میل میں اس خبر کی اشاعت کے ساتھ ہندوستانی زبان پر سخت تنقید و تعریض کی گئی ہے اور وہی دلائل پیش کیے گئے ہیں جو مسٹر کیمپل نے پیش کیے ہیں - ان کی یہاں تردید کرنا مجھے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے -

بہار کے ایک مسلمان مضمون نگار نے جن کی نسبت میں اوپر ذکر کر چکا ہوں اس ضمن میں اظہار خیال کیا ہے - پہلے تو موصوف نے مسلمانوں کی تعریف کی ہے اور پھر یہ بتایا ہے کہ انگریزی حکومت کی نظر عنایت پہلے پہل مسلمانوں پر رہی لیکن اس کے بعد حکومت کی نگاہیں بدل گئیں - اس عذر کی بنا پر کہ چونکہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا رواج نہیں ہے انہیں سرکاری خدمات سے محروم کیا گیا - مسلمانوں نے جب اس کے خلاف احتجاج کیا تو حکومت نے وعدہ کیا کہ ان کے لیے ان کی قومی زبان (اردو) میں وسطانیہ کے امتحان لینے کا انتظام کیا جائے گا اور بغیر انگریزی زبان کی واقفیت کے انہیں سرکاری ملازمتیں دی جائیں گی - آگے چل کر مضمون نگار کہتا ہے کہ "وسطانیہ کے امتحان کی یہ رعایت جنوری ۱۸۷۲ ع سے منظور کی گئی - اسی وقت سے آنریبل جارج کمبل لفٹنٹ گورنر بنگال نے تہیہ کر لیا ہے کہ اردو زبان کو بالکل مٹا کے چھوڑیں گے اور اس کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی کوشش کریں گے - وہ اپنے اس ارادے میں کامیاب ہوں گے یا نہیں اس کا علم خدا کو ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایسی زبان کو مٹانا جو چھ سو برس سے سوسائٹی کے ہر طبقے میں اٹک سے لے کر چین کی سرحد تک بولی جاتی ہے، ناممکن ہے - یہی زبان صوبجات شمال مغربی (یو-پی) اور بہار کے لوگوں کی مادری زبان ہے - مسٹر کمبل نے اس زبان کے متعلق جو رائے قائم کی ہے کیا وہ صرف ایک شخص کی تقریر سننے کا نتیجہ ہے جس میں عربی اور فارسی الفاظ استعمال کیے گئے تھے؟* دراصل بول چال کی زبان علمی زبان سے مختلف ہوتی ہے -

* مولوی امداد علی کی تقریر -

یہ عجیب بات ہے کہ مسٹر کمبل نے صرف ایک تقریر سن کر یہ حکم دے دیا کہ لوگوں کی زبان بدل دی جائے - لیکن ہمیں توقع ہے کہ یہ شرمندۂ عمل نہ ہوسکے گا - اگر حکومت کی جانب سے ہر پانچویں سال اسی قسم کے احکام جاری ہوتے رہے تو یہ رعایا کے لیے سخت زحمت کا باعث ہوگا - اگر مسٹر کمبل کے جانشین نے بھی کہا کہ

دنیا بہت پرانی ہو چکی ؛ اب ایک نئی کائنات درکار ہے تو اس کا نتیجہ معلوم - لیکن چاہے کچھ ہی کیوں نہ کیا جائے انگریزی زبان ہندوستان کی عام زبان کبھی نہیں بن سکتی " -

مضمون نگار نے ، جس کے مضمون کا اقتباس میں نے اوپر درج کیا ہے ، اس اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے جو اس ضمن میں مسٹر کمبل اور کلکتہ یونیورسٹی کے درمیان پیدا ہوگیا ہے - مسٹر کمبل نے جس ہندوستانی زبان کا ذکر کیا ہے اور جسے وہ ملکی اور دیسی زبان کہتے ہیں ؛ اس کی شرائط اس قدر دشوار ہیں کہ ان کے مطمح نظر پر کسی زبان کا پورا اترنا ناممکن معلوم ہوتا ہے - مسٹر کمبل نے ادنیٰ ادنیٰ سرکاری خدمات کے لیے جو شرائط لازمی قرار دی ہیں وہ مضمون نگار کے نقطۂ نظر سے ناقابل عمل ہیں -

مسٹر کمبل نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ تعلیم عامہ کی زبان میں تبدیلی کرنا چاہتے ہیں - موصوف نظام تعلیم میں بھی انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں - ایک سرکاری قرار داد کے ذریعہ ، جو اتنی ہی عجیب و غریب ہے جیسے کہ زبان والی قرار داد جس کی نسبت اوپر ذکر کیا جا چکا ہے ، موصوف نے فیصلہ کیا ہے کہ بنگال و بہار کے مدارس کے معائنہ کا کام تعلیمات کے مہتمموں کے ہاتھ سے نکال کر مُدرسوں اور مجسٹریٹوں

کے هاتهه میں دیدیا جائے - اب ناظم تعلیمات کی حیثیت محض محرر کی رہ جائیگی - حکومت کی اس قرار داد پر سخت نکتہ چینی هورهی هے - مجھے پورا یقین هے کہ اس تجویز کو بہت جلد پس پشت ڈال دیا جائیگا * -

میں نے گزشتہ سال کے مقالے میں ذکر کیا تها کہ مشرقی الفاظ جب لاطینی رسم خط میں لکھے جاتے هیں تو بعض اوقات باوجود اختلاف کے وہ یکساں معلوم هوتے هیں - انگریزی حکومت چاهتی هے کہ سرکاری طور پر مقامات کے نام ایک خاص طریقے پر لکھے جایا کریں - یہ مسئلہ بہت نازک هے - چنانچہ سر ولیم میور نے اس کے متعلق وائسرائے بہ اجلاس کونسل کو اپنے خیالات سے مطلع کیا هے † - موصوف نے لکھا هے کہ ایک دم سے مقامات کے نام کے هجے بدل دینا مناسب نہیں هے - یہ بالکل ویساهی هوگا کہ لڑکوں کے نام اور شہروں کے مکانوں کے نمبر ایک جنبش قلم سے تبدیل کردیے جائیں - اس نئے اصول کے مطابق آئندہ سے مندرجہ ذیل نام اس طور پر لکھے جائینگے -

Amritsar	بجائے	کے	Umritsar
Karachi	"	"	Kurrachee
Nilgiri	"	"	Neilgherry
Aligarh	"	"	Allygurh
Amballa	"	"	Umballa
Zamindar	"	"	Zameendar

* Allen's Indian Mail مورخہ ۱۸ نومبر سنہ ۱۸۷۲ ع —

† انڈین میل - مورخہ مئی سنہ ۱۸۷۲ ع - مسٹرڈبلو هنٹر نے اپنے گزیٹیر میں اس نئے اصول کے مطابق عمل کیا هے —

ناموں کے ہجے بدلنے سے یورپین لوگوں کو شروع شروع میں سخت دقت پیش آئے گی - مجھے خود اسماء کے ہجے بدلنے میں سخت دشواری پیش آرہی ہے - بہت سے ہندوستانی لوگوں نے نئے نئے اصول کے مطابق اپنے ناموں کے ہجے بدل ڈالے ہیں - چنانچہ ڈبلن کے کرائسٹ کالج کے فاضل پروفیسر اپنے نام کو بجائے Meer Owlad Alee کے اب Mir Aulad Ali لکھنے لگے ہیں - اسی طرح Moollah Azeez Oodde'n کا نام اب Mulla Azizuddin ہوگیا - لیکن میرے دوست سید عبداللہ نے اپنے نام کی ہجے نہیں بدلے - میں انہیں ان کی اس وضعداری پر قابل مبارک باد سمجھتا ہوں —

میرے خیال میں گلکرسٹ نے مشرقی الفاظ کو لکھنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ اس قدر فاضلانہ نہیں ہے جیسا کہ جونس کا طریقہ جسے حکومت ہند اختیار کر رہی ہے - ہمارے خیال میں یہ طریق تحریر مشرقی الفاظ کے لیے اتنا موزوں نہیں ہے جتنا کہ انگریزی الفاظ کے لیے موزوں ہے - گلکرسٹ کے طریقے کو اہل ہند اختیار کر رہے ہیں اور اسے اچھی خاصی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے - مسٹر اسٹوڈس ٹی پریچرڈ نے اگرچہ موجودہ لکھنے کے طریق پر اعتراض کیا ہے لیکن ان کی یہ رائے ہے ہندوستانی الفاظ لاطینی رسم خط میں لکھنے میں بہت سے فائدے ہیں - ہندوستانی الفاظ جب لاطینی رسم خط میں لکھے جائیں تو ہجے کے بہ نسبت تلفظ کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے - موصوف نے اس بات کی بھی سخت مخالفت کی ہے کہ دوسری زبانوں کی علامات انگریزی یا یورپ کی کسی دوسری زبان میں استعمال کی جائیں - وہ چاہتے ہیں کہ خفیف a کی آواز کے لیے u کو باقی رکھنا چاہیے اور اسی طرح i کے لیے ee اور طویل u کے لیے oo رہنے چاہییں-

جن حروف صحیحہ کی آواز مشابہ ہے انہیں ایک دوسرے میں ضم کرنا بہتر ہوگا * —

میں اس سے پہلے بھی متعدد مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کرچکا ہوں کہ ہندستانی ادب میں ادائے مطالب کے نئے نئے انداز پیدا ہو رہے ہیں - ہندی زبان کو ہندو لوگ سنوارنے کی کوشش کر رہے ہیں - لیکن میں ان لوگوں کو رجعت پسند خیال کرتا ہوں - خالص ہندستانی جسے اردو کہتے ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی زبان ہے - دونوں جماعتوں کے ترقی پسند افراد نے اس زبان میں کتابیں لکھی ہیں - اس کے علاوہ ہندستان میں اس وقت دیسی مسیحی ادبیات بھی خاص حیثیت رکھتی ہے - ہم اس ادبیات کو انڈو یورپین کہہ سکتے ہیں اس واسطے کہ یہ انگریزی اثر کی مرہون منت ہے - اس ادبیات کے متعلق مرشدآباد کے محمد ارشاد نے "اخبار سرشتۂ تعلیم اودھ" میں مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا ہے † —

"درحقیقت اس وقت دو طرح کی اردو زبان رائج ہے - ایک دیسی اردو ہے اور دوسری وہ اردو ہے جو انگریزی اثر سے پیدا ہوئی ہے - دیسی اردو کو ہندستان کے شہروں کے باشندے اور شرفا و امرا بولتے ہیں - یہ دیسی اردو نہایت صاف ستھری' سادہ اور ایسی فطری ہے کہ مطلب ادا کرنے کے لیے بہت سے لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی - لیکن انگریزی اثر سے جو اردو نکلی ہے وہ زمانۂ حال کی پیداوار ہے - اس کی تاریخ دلچسپی سے خالی نہ ہوگی - یہ زبان سرکاری قواعد و

---

* Allen's Indian Mail مورخہ ۱۷ جون سنہ ۱۸۷۲ ع —

† ملاحظہ ہو "اخبار انجمن پنجاب" - مورخہ ۱۲ جولائی سنہ ۱۸۷۲ ع —

ضوابط اور احکام کا ترجمہ کرنے اور اخبارات کے ذریعہ وجود میں آئی ہے - اس نئی زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے جملے بہت طویل ہوتے ہیں اور پڑھنے والوں کو بعض اوقات پریشانی میں مبتلا کر دیتے ہیں - اس زبان میں آپ کو خالص ہندستانی زبان کے فقروں کی ساخت کہیں نظر نہیں آئے گی - اس میں آپ دیکھیں گے کہ اسما و صفات ' فعل ' فاعل ' مفعول اور ضمائر دور دور اور آپس میں بے تعلق سے ہوتے ہیں لفظوں کی ترکیبیں عجیب و غریب ہوتی ہیں - الفاظ اور جملوں کا تعلق بعض اوقات اس قدر مصنوعی ہوتا ہے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لکھنے والا کہنا کیا چاہتا ہے - حکومت کے احکام کے ترجمے اور اخباروں کی خبریں اس طرز تحریر کے ذریعہ پیش کی جاتی ہیں جو ذوق سلیم کو سخت ناگوار ہوتا ہے - پٹنہ کے ایک بزرگ نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ہندستانی زبان میں جتنے عربی اور فارسی کے الفاظ مستعمل ہیں انہیں اس زبان سے خارج کرکے چھوڑیں گے اور ان کی جگہ انگریزی الفاظ کو رواج دینے کی کوشش کریں گے - چنانچہ اس طرز میں انہوں نے بعض علمی کتب تالیف کی ہیں - لیکن اہل ہند کے لیے ان انگریزی الفاظ کے معنی متعین کرنے میں سخت دشواری پیش آئے گی اور ان میں ہزارہا لوگ ایسے ہوں گے جو ان کتابوں سے استفادہ نہیں کر سکیں گے - یہ صاحب جن کا میں نے ذکر کیا اور انہیں کی طرح کے دوسرے ہندستانی مصنفین سمجھتے ہیں کہ اہل یورپ کے محاورں کا ہو بہو ترجمہ کرنا اور مکھی پر مکھی مارنا گویا کمال کی بات ہے - ان کا یہ خیال غلط ہے کہ یورپین خیالات کو اس طرح وہ اپنی زبان میں منتقل کرلیں گے - اہل ہند نے ہر باب میں یورپین لوگوں کی نقالی پر کمر باندھی ہے تو انہیں چاہیے

کہ پورے طور پر اہل یورپ کی زبان، لباس اور رسم و رواج اختیار کرلیں - ان جدت پسندوں کا یہ خیال غلط ہے، اگر وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ حاکم جماعت کو خوش کر سکیں گے - یہ بات اب واضح ہو جانی چاہیے کہ حکومت چاہتی ہے کہ ہندستانی اور دوسری ملکی زبانوں کو فروغ حاصل ہو تاکہ جدید مغربی علوم کی بہترین کتب کا ان زبانوں میں ترجمہ ہوسکے اور اہل مشرق ان علوم سے استفادہ کرسکیں - حکومت کی ہرگز یہ خواہش نہیں ہے کہ ہم اپنی زبان میں انگریزی الفاظ اور غیر ملکی محاوروں کو داخل کرکے اس کے خد و خال کو مسخ کر ڈالیں - لارڈ میو کے عہد حکومت میں جو قرار داد حکومت نے منظور کی ہے اس سے صاف طور پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حکومت دیسی زبان کی ترقی کی خواہاں ہے - چنانچہ اس قرار داد کی روسے نہایت دشوار تجریدی مضمونوں میں بھی ہندستانی زبان میں امتحان لینے کی اجازت دی گئی ہے اب ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ انگریزی کی اعانت کے بغیر ہم اپنی زبان کو مالا مال کردیں - دراصل انگریزی اور ہندستانی زبان میں دور کی بھی کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی - بھلا یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ انگریزی کی اعانت سے ہندستانی کو فروغ دیا جائے - ہندستانی زبان کو ترقی دینے کے لیے فارسی، عربی اور سنسکرت کے سرچشموں سے فائدہ اٹھانا سمجھ میں آسکتا ہے * اگر انگریزی الفاظ بلا امتیاز ہندستانی میں داخل ہوتے چلے گئے تو اندیشہ ہے کہ کہیں ہندستانی زبان بالکل خراب نہ ہوجائے - لیکن اگر فارسی، عربی اور سنسکرت سے ہندستانی زبان فائدہ اٹھائے گی

---

* بالکل اسی طرح جیسے فرانسیسی زبان لاطینی اور یونانی سے اعانت حاصل کرتی ہے جو اس کی ساخت میں شامل سمجھنی چاہییں -

تو اصطلاحات بنانے میں سہولت ہوگی اور زبان کو حقیقی معنوں میں فروغ حاصل ہوگا جس کی خواہش حکومت کو ہے - میں نے اوپر جن دشواریوں کا ذکر کیا ہے ان کی مثالیں ہمیں ضابطۂ فوجداری و دیوانی کی تدوین میں مل سکتی ہیں - ان قانونی کتب کو سمجھنے کے لیے ہر فقرے کو دس مرتبہ پڑھنا چاہیے تب جاکر اس کا مطلب معلوم ہوتا ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کتب کی تدوین میں انگریزی فقروں کا ہوبہو چربہ اتارنے کی کوشش کی گئی ہے - ان کی زبان کو ہم خالص ہندستانی نہیں کہہ سکتے" —

"اخبار سررشتۂ تعلیم اودھ" کے نامہ نگار نے جن دشواریوں کا اوپر ذکر کیا ہے ہم ان سے انکار نہیں کرتے - لیکن "علیگڑھ اخبار" (علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ) میں ایک مضمون نگار نے (جن کے متعلق مجھے پوری طرح یقین ہے کہ وہ سید احمد خاں ہیں) اس بات کی حمایت کی ہے کہ ہندستانی میں انگریزی الفاظ کو رواج دینا چاہیے - چنانچہ موصوف نے اس زبان کی تائید کی ہے جو آج کل ہندستانی اخبارات میں عام طور پر استعمال کی جاتی ہے - ہم ذیل میں اس مضمون کا خلاصہ درج کرتے ہیں جو اخبار کے سات کالموں میں چھپا ہے —

مضمون نگار نے پہلے بتایا ہے کہ اس کو "الموڑہ اخبار" میں ایک مضمون پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ ہندستانی زبان کے اخباروں کے طرز بیان کے متعلق کچھ لکھا جائے - اس مضمون میں یہ ضرورت بتائی گئی ہے کہ اخباروں کی زبان ایسی صاف اور سادہ ہونی چاہیے کہ ہر بڑا چھوٹا آسانی سے اسے سمجھ سکے اور جو مطالب بیان کیے گئے ہوں وہ ایسے متعین ہونے چاہییں کہ پڑھنے والے کے ذہن میں ان کے متعلق شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے - لیکن عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ

اخبار نویس حضرات نہ تو اپنے طرز تحریر کی زیادہ پروا کرتے ہیں اور نہ انہیں اس کی فکر ہوتی ہے کہ اخبار بین طبقے کی سہولت کیا ہے۔ "المورہ اخبار" کے دوسرے مضمون کا بھی حوالہ دیا گیا ہے جس میں دیسی اردو اور اس اردو کے درمیان فرق واضح کیا گیا ہے جو انگریزی کے اثر سے بن رہی ہے۔ ان مضامین کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ہند اپنی قومی زبان کو اس کی اصلی حالت میں برقرار رکھنے کے خواہاں ہیں - لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ زبان اصلی حالت میں برقرار کیوں کر رہے بلکہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ یہ زبان مالا مال ہو اور اس میں مطالب ادا کرنے کی صلاحیت بڑھے - ہمارے زمانے سے کچھ قبل اردو کی خاص حیثیت تھی - نظم و نثر میں اس زبان میں ایسی تصانیف موجود ہیں جو نہایت دلچسپ ہیں اور جن کی شہرت آج تک ہے - لیکن ان پرانی کتابوں کا طرز بیان اس سے مختلف ہے جو آج کل پایا جاتا ہے - موجودہ طرز بیان قابل ترجیح ہے اس واسطے کہ اس میں ایک طرح کا لطف اور صفائی پائی جاتی ہے جو اس زبان کے شایان شان ہے جو ایک بڑے ملک کی قومی زبان ہے - کچھ عرصہ قبل عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ اردو میں یہ صلاحیت موجود نہیں ہے کہ وہ ملکی ضروریات کی کفیل ہوسکے لیکن آہستہ آہستہ اس میں ایسی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے اور اس کا ذخیرۂ الفاظ اس قدر مالا مال ہو گیا ہے کہ اب ہم اس کو ہندستان کی قومی زبان کہہ سکتے ہیں - اس کے ذریعہ ہر قسم کے خیالات ادا کیے جا سکتے ہیں اور اس سے تمام ضروریات پوری ہو سکتی ہیں - اب وہ زمانہ گیا جب کہ ہم اپنے خطوط اور ابتدائی کتابیں بھی فارسی زبان میں لکھا کرتے تھے اور اس طرح ایک غیر زبان کے ذریعہ ہمیں

علم و ادب تک رسائی حاصل ہوا کرتی تھی - اس وقت اردو زبان میں اتنی پختگی نہیں آئی تھی کہ وہ ہر قسم کے مطالب ادا کر سکتی، لیکن اب اس زبان کے ذریعہ سے ہر قسم کے مطالب ادا کیے جا سکتے ہیں - اس زبان میں نظم اور شاعرانہ نثر کے علاوہ تاریخ و قصص کے بیان کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے - اس کے سوا قدیم و جدید علوم، فنی مضامین اور حکومت کے احکام سب نہایت جچی تلی زبان میں صحت و صفائی کے ساتھ ادا کیے جا سکتے ہیں - اس زبان میں جو اخبارات نکلتے ہیں ان کی کافی اشاعت ہے - غرضکہ زبان سے جو ضروریات پوری ہوتی ہیں وہ سب بدرجہ اتم اس زبان سے پوری ہوتی ہیں —

مضمون نگار محمد ارشاد کا خیال ہے کہ اخباروں اور حکومت کے قوانین کے ترجمے میں جو ہندستانی زبان استعمال کی جاتی ہے وہ ایک طرح کی انگریزی ہندستانی ہے - مضمون نگار کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس زبان میں انگریزی کے الفاظ اور محاوروں کی بھرمار ہوتی ہے - اخباروں میں جو زبان لکھی جاتی ہے اس میں عربی اور فارسی کے لفظ بھی بکثرت استعمال ہوتے ہیں لیکن ان اخباروں کے مضمون نگاروں کو عربی اور فارسی کی واقفیت بہت محدود ہوتی ہے - ہندستانی زبان میں انگریزی لفظوں کے استعمال کی حمایت "علی گڑھ اخبار" میں کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انگریزی لفظوں کا استعمال ہندستانی کی ترقی کے لیے ضروری ہے - لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ انگریزی محاوروں کو ہندستانی میں رائج کیا جائے جس کی وجہ سے ہندستانی زبان کے مسخ ہو جانے کا اندیشہ ہے —

"علی گڑھ اخبار" کے مضمون نگار کا خیال ہے کہ اردو ایک مرکب زبان

ہے - اس میں مختلف عناصر شامل ہیں - اگر اس میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کردیا جائے تو کچھہ مضائقہ کی بات نہیں - مضمون نگار نے لکھا ہے کہ " جس زمانے میں ہندستانی زبان نئی نئی وجود میں آئی اس وقت اگر انگریزی فارسی کی جگہ سرکاری زبان ہوتی تو نئی زبان میں یقیناً بجائے فارسی الفاظ کے انگریزی کے لفظوں کی بھرمار ہوتی - اب ہمیں چاہیے کہ جب کبھی کسی مفید انگریزی لفظ سے ہماری ضرورت پوری ہوتی ہو تو اس کو بلا تکلف اپنی زبان میں داخل کرلیں - ایسا کرنے سے ہماری زبان میں سقم پیدا ہونے کے بجائے دلکشی پیدا ہوگی - اگر بجائے پانچ زبانوں کا مرکب ہونے کے ہماری زبان چھ کا مرکب ہوجائے گی تو کوئی بڑا فرق نہیں پیدا ہوگا - ہم یہ نہیں چاہتے کہ غیر ضروری طور پر انگریزی الفاظ رائج کریں - ہم صرف انہیں الفاظ کو لینا چاہتے ہیں جو ضروری ہیں اس قسم کے الفاظ میں ہم "پارلیمنٹ ، " کمیٹی " اور " سوسائٹی " کو خیال کرسکتے ہیں - اس طرح کے بہت سے دوسرے لفظ ہیں جن کا ہماری زبان میں داخل کرنا ضروری ہے - شاعری ' مذہب اور خانگی بول چال میں اس قسم کے الفاظ داخل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے - ہم اپنی بیٹی کو " مائی ڈاٹر " یا " مائی ڈیر " نہیں کہیں گے —

اب میں ذیل میں ان کتابوں کا ذکر کروں گا جو حال میں شائع ہوئی ہیں -

مجموعۂ سخن — یہ اردو کے شاعروں کا تذکرہ ہے جسے پنڈت شیو نرائن نے مرتب کیا ہے اور لکھنؤ سے شائع کیا ہے - پنڈت جی اپنی متعدد تصانیف کی بدولت شہرت رکھتے ہیں —

مجمع الاشعار — یہ بھی اردو شاعروں کا تذکرہ ہے اور دہلی سے شائع ہوا ہے —

یہ دونوں تذکرے اس بات پر دلالت کرتے ھیں کہ باوجود بعض ھندوؤں کی رجعت پسندی کے اردو شاعری کا ذوق ھندستان میں اب تک نشو و نما پا رھا ہے - اس کا اظہار ان دیوانوں کے دیکھنے سے بھی ھوتا ہے جو فقیر محمد گویا لکھنوی اور زمان علی نے شائع کیے ھیں* "زیبا فسانہ" میں جو ابھی حال میں شائع ھوا ہے ایک قصہ نظم میں بیان کیا گیا ہے —

سنہ ۱۸۶۷ ع میں 'مرتھا' (اودھ) میں قرآن شریف کا ایک ایڈیشن شائع ھوا ہے - اس کے ھر صفحہ پر دس سطریں ھیں - ھر سطر کے نیچے فارسی اور اردو میں ترجمہ ہے اور حاشیوں پر جلالین کی تفسیر ہے یہ ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے - جلالین سے مراد محلی اور سیوطی کی تفسیر ہے - انہیں جلالین اس لیے کہتے ھیں کہ ان دونوں کے نام شروع میں 'جلال' آتا ہے - فارسی ترجمے کا عنوان "فتح الرحمن" ہے یہ ترجمہ ولی اللہ عبدالرحیم نے کیا ہے - اس سے قبل بھی قران شریف کا ایک ایڈیشن شائع ھوچکا ہے جس میں اردو ترجمہ موجود ہے اور جلالین کی تفسیر بھی ہے - اس ایڈیشن کا پہلا حصہ میرے پاس موجود ہے - یہ چھوٹی تقطیع پر ۹۳۹ صفحات میں ہے —

حال میں اردو کی جو کتب شائع ھوئی ھیں ان میں سے میں صرف ان کے متعلق یہاں ذکر کروں گا جن سے میرے مقالے پڑھنے والوں کو کچھ دلچسپی ھوسکتی ہے —

تحفۂ تیموریہ - یہ کتاب فقہ میں ہے (اخبار عالم' مورخہ ۲۰ جون سنہ ۱۷۷۲ ع

---

* یہ غالباً وھی شاعر ھیں جن کے متعلق میں نے اپنی کتاب " ھندی اور ھندستانی ادب کی تاریخ جلد ۳ - ص ۳۶۱ پر زمان شاہ حافظ رامپوری کے نام سے ذکر کیا ہے -

تاریخ گجرات - یہ مرزا اعظم بیگ کی لکھی ہوئی تاریخ ہے جس میں گجرات کا مفصل حال ملتا ہے * —

سراج الہدایت - مصنفۂ وزیر علی خاں † - اس کتاب میں عورتوں کی تعلیم اور ان کے حقوق کے متعلق مفصل بحث کی گئی ہے -

سیرستان انگلینڈ - یہ کرشن داس کا سفر نامہ انگلستان ہے - انہوں نے اس کتاب میں ان خیالات کو ظاہر کیا ہے جو ان کے انگلستان میں قیام کی وجہ سے پیدا ہوئے ‡ - اس ضمن میں مسٹر ٹی ڈی - فورسیتھ (Forsyth) کے سفر نامہ ترکستان کا ذکر کردوں - یہ سفر نامہ اہل ہند نے بہت پسند کیا اور اس کا اردو میں لاہور سے ترجمہ شائع ہوچکا ہے —

راحت سالکین - یہ غلام محمد کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو سیالکوٹ سے شائع ہوا ہے - غزلیں تصوفانہ رنگ میں ہیں —

نامۂ منتظر - یہ شیو ناتھ کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو لاہور سے شائع ہوا ہے - غزلیں عاشقانہ رنگ میں ہیں —

منشی نظام الدین نے فارسی کی مشہور کتاب "اخلاق ناصری" کا، جس میں اصول اخلاق سے بحث کی گئی ہے، اردو میں ترجمہ کیا ہے - یہ ترجمہ لاہور سے شائع ہوا ہے اور ۲۹۶ صفحات پر مشتمل ہے - اسی قسم کی دو اور کتابیں منشی غلام سرور نے لاہور سے شائع کی ہیں - ایک کا نام "اخلاق سرور" ہے اور دوسری کا "مخزن حکمت" —

---

* صفحات ۶۰۶ - مطبوعۂ لکھنؤ سنۂ ۱۸۷۰ ع -

† میں نے اپنی کتاب " ہندی اور ہندستانی ادب کی تاریخ " میں وزیر علی کا ذکر کیا ہے - غالباً یہ وہی وزیر علی ہیں - (جلد ۳ - ۲۹۳) —

‡ صفحات ۱۸۸ مطبوعۂ دہلی ۱۸۷۱ ع -

ہندستانی میں کارآمد کتابیں تالیف کرانے کی ہر طرف ہمت افزائی کی جارہی ہے - مسلمانوں کی ترقیء تعلیم کے لیے جو انجمن قائم ہے اس نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندستانی زبان میں لکھنے والے مصنفین کو پانچ سو، تین سو اور سو روپے کی رقمیں ان کی کتابوں کے معیار کے لحاظ سے بطور معاوضہ دی جائیں —

گورنر جنرل لارڈ میئو نے، جن کی ناگہانی موت سے سارے ہندوستان میں ہلچل مچ گئی ہے، اہل ہند کی بھلائی کے لیے فیصلہ کیا تھا کہ ایک ہزار روپے کی رقم بطور انعام کے اس شخص کو دی جائے جو مختلف امراض کے علاج کے متعلق بہترین کتاب تالیف کرے - جو اشخاص اس مقابلے میں شریک ہونا چاہیں وہ اپنے مسودات ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۷۲ ع سے پہلے محکمۂ طبابت کلکتہ کو بھیجدیں —

ان مشرقی مصنفین کی پوری کتابیں رکھنے کے بجائے جن کی تصانیف کے بعض حصے مدارس اور کالجوں کے نصاب میں داخل ہیں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان کی کتب کے اقتباسات نصاب میں شامل کیے جائیں - مسٹر جان مردوش کی بھی یہی رائے ہے - اس کا بھی اہتمام کیا جائیگا کہ ایسے اقتباسات نہ رکھے جائیں جن سے مسیحی خیالات کی نشر واشاعت مقصود ہو - ہمارے خیال میں یہ غیر ضروری تھا —

حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ جو لوگ ہندوستانی زبان میں (اردو میں یا ہندی میں) فلسفہ، تاریخ، سیاحت یا سائنس پر کوئی کتاب تالیف کریں گے انہیں ان کی محنت کا معاوضہ دیا جائیگا بشرطیکہ کتاب کا طرز بیان دلکش اور عام فہم ہو - اس کی بھی اجازت ہوگی کہ کتاب نظم میں لکھی جائے یا نثر میں - اگر کوئی چاہے تو ایسے موضوع پر قلم

اٹھائے جو بالکل خیالی ہو بشرطیکہ اس میں کوئی بات ایسی نہ آنے پائے جو اخلاقی نقطۂ نظر سے گری ہوئی ہو - سنہ ۱۸۷۱ ع اور سنہ ۱۸۷۲ ع میں ہندی اور اردو کی ۲۲ کتابیں کمیشن نے پسند کیں جو خاص اس غرض کے لیے مقرر کیا گیا تھا - ان کتابوں کے مصنفین کو ۸ مئی سنہ ۱۸۷۲ ع الہ آباد میں لفٹنٹ گورنر نے انعامات تقسیم کیے - بعض نے رقمی معاوضہ قبول کیا اور بعض نے اپنی کتاب حکومت کے خرچ پر طبع کرانے کی خواہش ظاہر کی - بعض کتابوں کے نسخوں کی ایک خاص تعداد حکومت کے مدارس کے لیے خریدنے کی منظوری دی گئی - ان کتابوں اور ان کے لکھنے والوں کی فہرست دینا غیر ضروری ہوگا - میں یہاں صرف ان میں سے چند کی نسبت ذکر کروں گا - " تاریخ آگرہ " کے مصنف کریم الدین ہیں - " جغرافیہ راجپوتانہ " پنڈت کرشنا نند کی تصنیف ہے جو بریلی کے رہنے والے ہیں - پنڈت منولال نے ضلع مراد آباد کا جغرافیہ لکھا ہے - مرزا پور کے پنڈت گدادھر نے ایک سنسکرت کے ناٹک کا ترجمہ کیا ہے - اس ضمن میں منشی ذکاءاللہ کے " سلسلۃ العلوم " کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا - منشی ذکاءاللہ دہلی کے نارمل اسکول میں مدرس ہیں - مسٹر کمپسن ' ناظم تعلیمات صوبجات شمال مغربی نے " سلسلۃ العلوم " کی بہت تعریف کی ہے * —

ہندوستانی زبان کی ۱۴ ہزار جلدیں سنہ ۱۸۷۱ ع میں حکومت بمبئی کی طرف سے مدارس وغیرہ کو تقسیم کی گئیں - ان میں بعض کو حکومت

* اتالیق پنجاب - اگست سنہ ۱۸۷۲ ع ؛ علیگڑھ اخبار ' مورخہ ۲۲ اگست سنہ ۱۸۷۲ ع - یہ منشی ذکاءاللہ وہی ہیں جنھوں نے شورش عظیم سے کچھ پہلے سنہ ۱۸۵۶ ع میں میرے مضمون " اردو تذکروں پر تقریظ " کا اردو میں ترجمہ کیا تھا - ان کا ذکر میری کتاب " ہندی اور ہندستانی ادب کی تاریخ " میں ہے - جلد ۳ - ص ۳۵۲ —

نے اپنے خرچ سے طبع کرایا تھا اور بعض کو مصنفوں سے خریدا تھا * - میرا خیال ہے کہ غالباً سنہ ۱۷۷۲ ع میں بھی حکومت بمبئی نے تقریباً اتنی ہی جلدیں خریدیں - صوبۂ بمبئی کے ناظم تعلیمات مسٹر پیل نے اعلان کیا ہے کہ اردو اور سندھی میں جو عمدہ کتابیں تصنیف کی جائیں گی ان کے لکھنے والوں کو حکومت کی طرف سے انعام دیے جائیں گے † —

اس سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ ہندستانی زبان کی متعدد کتابیں ایسی شائع ہوچکی ہیں جن سے اہل ہند کی تعلیم میں بہت مدد ملے گی - ان میں سے بعض انعام کی مستحق قرار پائیں - علیگڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی نے تین سال کے عرصے میں بیس کتابیں شائع کی ہیں - اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ کتب واقعی مفید ہیں اور جس مقصد کے تحت لکھی گئی ہیں وہ ان سے پورا ہوتا ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ پر مسٹر لازرس (Lazarus) نے میرٹھ کی مجلس مباحثہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور میرٹھ کے "لارنس گزٹ" مورخہ ۱۴ جون میں ان کی یہ تقریر شائع ہوئی ہے - موصوف کا خیال ہے کہ ان میں سے اکثر کتب نہایت مفید ہیں اور جن کتابوں کا حکومت کی طرف سے معاوضہ دیا گیا ہے وہ درحقیقت اسی لایق تھیں —

"علیگڑھ اخبار" مورخہ ۲۸ جون میں اس تقریر کا جواب شایع ہوا ہے - اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندستانی کی اکثر کتب جو شائع ہوئی ہیں کچھ مفید نہیں ہیں اور ان کتابوں میں بھی جن کا معاوضہ دیا گیا ہے کوئی نئی بات نہیں ملتی - ان

* رپورٹ سررشتۂ تعلیم صوبۂ بمبئی بابتہ سنہ ۱۸۷۰ ع و سنہ ۱۸۷۱ ع - ص ۳۱ -

† اخبار الاخیار - مورخہ یکم جولائی سنہ ۱۸۷۲ ع -

کتابوں میں زیادہ تر اخلاقیات کے مسائل ہیں اور لفظوں کو ادل بدل کر وہی مطالب بیان کیے گئے ہیں جو دوسری کتابوں میں ملتے ہیں - مضمون نگار نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر ہر کتاب میں علم یا فن کے کسی ایک موضوع پر بحث کی جاے اور اس کے متعلق تحقیق ہو تو زیادہ مفید ہوگا - اب حال یہ ہے کہ سب کتابیں موضوع کے اعتبار سے آپس میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور ان کے پڑھنے سے علم میں مطلق اضافہ نہیں ہوتا - اس پر کسی کو اعتراض نہیں کہ مصنفین کو ان کی محنت کا معاوضہ دیا جاے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی تصانیف کی جانچ سختی کے ساتھ ہونی چاہیے اور صرف وہی قابل ترجیح قرار پائیں جن کی زبان صاف اور پاکیزہ ہو جیسی کہ دھلی کے مصنفوں کی ہوتی ہے - مضمون نگار نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے ذرائع پر بھی بحث کی ہے - مضمون نگار کو اس بات کا یقین ہے کہ ھندستانی زبان میں نصاب کی جو کتب لکھی جا رہی ہیں ان میں آہستہ آہستہ ترقی ہوگی اور کچھ عرصے بعد بہتر کتابیں لکھی جائیں گی - ظاہر ہے کہ یہ کام بتدریج ہی ہو سکتا ہے - جوں جوں ھندستانی لکھنے والوں کو نصابی ضروریات کے مد نظر لکھنے کی مشق ہوتی جاے گی اسی قدر جلد عمدہ قسم کی کتابیں فراہم ہو سکیں گی —

۲ اگست کے "لارنس گزٹ" میں مسٹر لازرس نے "علیگڑھ اخبار" کے متذکرہ بالا مضمون کا جواب دینے کی کوشش کی ہے - پھر اس جواب پھر اس جواب کا جواب "علیگڑھ اخبار" کے مدیر نے ۱۶ اگست کی اشاعت میں دیا ہے اور اپنے دلائل کو بوضاحت بیان کیا ہے - اس کا خیال ہے کہ جو تصانیف معاوضے کے لیے مقابلے میں پیش کی

جائیں گی ان کا جانچنا بہت دشوار کام ھے - ان تصانیف کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ھے کہ مرکزی کمیٹی جو الہ آباد میں ان کے جانچنے کے لیے منعقد ہوتی ھے وہ ان سب تصانیف کو نہیں پڑھ سکتی- کمیٹی زیادہ تر انفرادی آرا پر بھروسہ کرتی ھے - لیکن کوئی شخص ایسا نہیں ہوتا جس نے سب تصانیف پڑھی ہوں - اس لیے زیادہ تر قیاس اور اٹکل سے سے فیصلہ کیا جاتا ھے - " علیگڑھ اخبار " نے اس امر پر بھی زور دیا ھے کہ ان مصنفین کی مطلق ہمت افزائی نہیں کرنی چاہیے جو ادھر ادھر سے سرقہ کرکے محض معاوضے کی خاطر کتاب تیار کرلیتے ہیں - وہ دوسری کتابوں کی زبان میں تھوڑی بہت تبدیلی کرکے وھی مطالب اپنی کتاب میں شامل کرلیتے ھیں - " تحفۃ العروس " کو بطور مثال پیش کیا گیا ھے جو تمام تر " مرأت العروس ' پر مبنی ھے * - سوائے زبان کے دونوں کتابوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا —

یہ خوشی کی بات ھے کہ مسٹر جان بیمز (Beames) نے ' چند ' کے متعلق اپنی تحقیقات جاری رکھی ھے - موصوف نے اس کے متعلق اس سال کے " جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال " میں ایک مضمون شائع کیا ھے جس کے ساتھہ اصل متن کا بھی کچھہ حصہ ھے - " انڈین انٹی کویری " میں مسٹر بیمز نے اپنے ایک مضمون میں بتایا ھے کہ ھندی کی بولیوں کو لسانیاتی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت حاصل ھے † - جس طرح مسٹر ایچ ایچ ولسن نے ادب کی اہمیت واضح کی ھے اسی طرح مسٹر ' بیمز ' نے

---

* ملاحظہ ھو میری کتاب " ھندی اور ھندوستانی ادب کی تاریخ " جلد۲- ص ۴۶۰ - (دوسرا ایڈیشن) -

† مسٹر بیمز نے اس موضوع پر ایک اور مضمون لکھا ھے جو " ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی کارروائیوں " میں شائع ہوا ھے - مضمون کا عنوان " گمبھیر رائے کی رزمیہ نظم " ھے - (اگست سنہ ۱۸۷۲ ع) -

بولیوں کے متعلق یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی لسانیاتی اہمیت بہت زیادہ ہے - موصوف سے قبل ریورنڈ ایس ایچ کیلوگ (Kellogg) نے یہی خیال پیش کیا تھا اور یہ بات واضح کی تھی کہ اگرچہ ان بولیوں کا سنسکرت سے تعلق ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ سنسکرت سے ماخوذ ہیں - میں بھی یہی خیال مدت ہوئی ظاہر کر چکا ہوں - ریورنڈ ڈاکٹر اے ایف آر ہورنل جو بنارس کے جگ نارائن کالج میں ہیں ' 'چند' کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں - چونکہ اب مسٹر گروس نے جو 'چند' کے متعلق کام کر رہے تھے' اس کام کو تقریباً ترک کر دیا ہے اس لئے ریورنڈ اے ایف آر 'ہورنل' نے مسٹر 'بیمز' کے ساتھہ کام کرنا شروع کر دیا ہے —

والمیکی کی رامائن کی جو نقلیں کی گئی ہیں یا ہندوستان کی جدید زبانوں میں اسی قسم کی جو نظمیں لکھی گئی ہیں ان کے متعلق ایک عقیدتمند ہندو نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ان میں صرف تلسی داس کی رامائن ایک ایسی ہے جس میں انسانی نکوکاری کو اجاگر کرکے دکھایا گیا ہے - یہی وجہ ہے کہ عقیدتمند ہندو اس کو بڑے اعتقاد سے پڑھتے ہیں - شمال مغربی ہند میں ہر ہندو چاہے وہ پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ ہو تلسی داس کی رامائن کے چند اشعار اسے ضرور یاد ہوتے ہیں جنہیں وہ مناسب موقع محل پر پڑھ دیتا ہے * —

یجروید کی برج بھاشا کی تفسیر جسے گوری پرشاد سنگھہ راجہ 'بوسا' نے کچھہ عرصہ ہوا لکھنا شروع کیا تھا' اب پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے - اس کے تین حصے شائع ہو چکے ہیں جو دیوناگری رسم خط میں

* علیگڑھ اخبار مورخہ ۲۲ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ م -

۴۰۰ صفحات پر آئے ہیں —

سنسکرت کی کتاب راماسوا میدھ کا ہندی ترجمہ دوہے اور چوپائی میں کیا گیا ہے - اس کے متعلق "کبی بچن سدھا" مورخہ ۲۳ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ء میں ذکر کیا گیا ہے - اس میں ہندوؤں کی زبان کی رجعت پسندی کا اظہار ہوتا ہے - دہلی میں "مجنوں لیلیٰ" کے عربی قصے کو ہندی میں شائع کیا گیا ہے —

آگرہ میں مہابھارت کا اردو ترجمہ ماہوار برابر شائع ہو رہا ہے اور پنجاب کی "انجمن ادب" نے بھی اس کا نسخہ خریدا ہے * —

یہ بات تعجب سے سنی جائے گی کہ دہلی کی "مجلس ادب" کی جانب سے رگ وید کا اردو ترجمہ کرایا گیا ہے اور اس وقت زیر طباعت ہے - لیکن یہ ترجمہ بجائے اصل سنسکرت کے انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہے - ترجمہ کرنے والے لکشمن داس ہیں اور پنڈت بشن ناتھ نے بھی ان کے ساتھ اس کام میں شرکت کی ہے —

بمبئی کے ناظم تعلیمات مسٹر پیل (Mr. Peile) نے از راہ نوازش جدید کتابوں کی فہرست بھیجی ہے جس سے ہندوستانی، سندھی، مرہٹی اور گجراتی کی کتابوں کا حال معلوم ہوتا ہے - ان کتابوں میں "کاسروپ" اور "برہ بارہ ماسا" قابل ذکر ہیں - ان کے علاوہ فلسفۂ ویدانت پر ہندی زبان میں ایک تفسیر ہے جن میں سنسکرت اشعار بھی درج کیے گئے ہیں - اس کتاب کا نام "ودیان نوکا ساتک" ہے - اس کے مصنف کا نام شام داس ہے - ہندی سے انگریزی میں جو ترجمے ہوئے ہیں ان

---

* اخبار انجمن پنجاب، مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۱ء -

میں " راج نیتی " کا ترجمہ قابل ذکر ہے - یہ ترجمہ سی ڈبلو بوڈلر (C. W. Bowdler) نے کیا ہے —

ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ نے جو کچھ عرصے سے آدی گرنتھ کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں، ابھی حال میں ایک حصہ بطور نمونہ " جرنل اف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی " (جلد ۵ - حصہ ۲ - ص ۱۹۷) میں شائع کیا ہے - موصوف نے نہایت تحقیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ آدی گرنتھ کی زبان " دسویں پادشاہ کے گرنتھ " کی طرح ہندی نہیں ہے بلکہ اس سے مختلف ہے - یہ زبان بڑی حد تک سندھی سے مشابہ کہی جا سکتی ہے جسے ہم قدیم گُرمکھی کہہ سکتے ہیں - ڈاکٹر ٹرمپ نے اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے مثالیں پیش کی ہیں اور ان پر تنقید کی ہے - اس فاضلانہ بحث سے جو نہایت دلچسپ ہے، بعض غیر یقینی باتیں پایۂ تصدیق کو پہنچ جاتی ہیں - اس ضمن میں موصوف نے مجھے ذاتی طور پر گزشتہ ۲ اکتوبر کو ایک خط لکھا ہے جو میں یہاں نقل کرتا ہوں :—

" میں گزشتہ اپریل میں ہندوستان سے واپس آچکا ہوں - وہاں کے دوران قیام میں میں نے سخت محنت کی - سکھ مذہب کے عالموں کی مدد سے میں نے لاہور میں پورے گرنتھ کا مطالعہ کیا اس سلسلے میں مجھے معلوم ہوا کہ خود ان لوگوں کو اپنی مقدس کتاب کے متعلق بہت کم واقفیت ہے - ان کی تاویلیں اکثر بالکل قیاسی ہوتی ہیں - لیکن یہ دیکھ کر مجھے اس لیے تعجب نہیں ہوا کہ یہ لوگ سنسکرت نہیں جانتے اور پراکرت سے بالکل ناواقف ہیں جو قدیم ہندی کو

سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہے - جوں جوں میں نے آدی گرنتھ کے مطالعہ میں ترقی کی اتنا ہی میں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ مجھے اس زبان کی ایک لغت اور ایک کتاب صرف و نحو کے متعلق تیار کرنی چاہیے - لدھیانہ کے امریکی مبلغین مسیحیت نے جو پنجابی کی لغت تیار کرائی ہے اس سے آدی گرنتھ کے سمجھنے میں مطلق مدد نہیں ملتی - تھامسن کی ہندی لغت بھی اس مطلب کے لیے بیکار ثابت ہوئی - غرضکہ میں نے یہ دونوں کام اپنے ذمہ لیے اور میں اپنے تئیں مبارکباد دیتا ہوں کہ انہیں پایۂ تکمیل کو پہنچایا - اب مجھے جب کبھی فرصت ملی تو پنجابی گرامر کو شائع کروں گا جو مجھے یقین ہے آپ کے لیے دلچسپی کا موجب ہوگی اس واسطے کہ گرنتھ میں ازمنۂ وسطیٰ کی ہندی بولیوں کا انتخاب ملتا ہے جن سے ہندستان کی موجودہ زبانیں نکلی ہیں - ان قدیم بولیوں کے ذریعے بہت سے لسانی مسائل ہماری سمجھ میں آجاتے ہیں - اگرچہ یہ بولیاں آج مردہ ہیں لیکن ان کی اہمیت باقی ہے - آپ اپنی تصنیف " ہندی اور ہندوستانی ادبیات کی تاریخ " میں گرنتھ کے مصنفین کو بھی شامل کر سکتے ہیں - کبیر داس کے کلام کا بیشتر حصہ گرنتھ میں شامل ہے - اس طرح ہندی کے قدیم لکھنے والوں میں نامدیو، رائے داس، تریلوچن، پیپا اور سینا وغیرہ اور دوسرے بھگتوں کا کلام آپ کو اس میں ملے گا - ان مختلف بھگت شاعروں کی زبان میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے اور ان کی زبان کا سمجھنا

بعض اوقات بہت دشوار ہوتا ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک زبان کی شکل میں صحت و تعین نہیں پیدا ہوا تھا - هندوستان میں مجھے کبیر کے کلام کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا ہے جس کی میں نہایت احتیاط کے ساتھ نقل کروا رہا ہوں - قدیم هندی کے شاعروں میں دادو، بکھونا، هری چند اور سندر داس کے کلام کے نسخے بھی میں نے حاصل کر لیے ہیں" —

اس عرصے میں ان تھک ڈاکٹر ٹرمپ کی "سندھی صرف و نحو" شائع ہو چکی ہے * - یہ ایک نہایت اہم کتاب ہے - ہمارے لیے اس میں اس لیے اور زیادہ دلچسپی موجود ہے کہ سندھی زبان کا هندوستانی اور دوسری دیسی زبانوں سے مقابلہ کیا گیا ہے - اس کتاب کی بدولت ایک بڑی کمی پوری ہوگئی ہے - اس کی اشاعت انگریزی حکومت کی طرف سے کی گئی ہے - اس کا انتساب سر بارٹل فریر (Sir Bartle Frere) کے نام کیا گیا ہے جو بمبئی کے لفٹننٹ گورنر تھے - ڈاکٹر ٹرمپ نے پشتو زبان کی صرف و نحو بھی تیار کی ہے جو زیر طباعت ہے - موصوف نے عام خیال کے خلاف یہ بات ثابت کی ہے کہ پشتو هندوستانی زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے —

هندوستانی اردو کی ابتدائی کتابوں کو جو کامیابی اور مقبولیت حاصل ہو رہی ہے وہ دراصل ایک طرح کا رد عمل ہے ان حملوں کے خلاف جو مسٹر کمبل نے اس زبان پر کیے تھے - اس ضمن میں مسٹر جان ڈوسن

* Grammar of the Sindhi Language campared with the Sanscrit-Pracrit and the cognate Indian Vernaculars. (Leipzig, 1872).

(John Dowson) کی اردو صرف ونحو قابل ذکر ہے * - موصوف سٹنڈ ہرسٹ کے اسکول میں اردو زبان کے پروفیسر ہیں - درحقیقت اردو زبان کی صرف ونحو پر نئی کتاب کی کوئی خاص ضرورت تو نہ تھی اسواسطے کہ اس موضوع پر پہلے سے متعدد کتب موجود تھیں لیکن مسٹر جان ڈوسن نے اپنے پیشرووں کے مقابلہ میں زیادہ تحقیق سے کام لیا ہے - اردو صرف ونحو پر اب تک جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں مسٹر ڈوسن کی کتاب سب سے زیادہ مکمل ہے - اس میں "باغ و بہار" سے مثالیں پیش کی گئی ہیں - خط شکستہ اور تقویم کے متعلق نئی معلومات درج کی گئی ہیں - مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ مسٹر ڈوسن نے بھی شکسپیئر کی طرح اردو کے ایرانی - ہندی حروف تہجی مکمل نہیں درج کیے بلکہ صرف ان کی علحدہ علحدہ اصلی شکلیں لکھی ہیں وہ شکلیں جو دوسرے حروف سے مل کر پیدا ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے بعض اوقات اصلی حرف پہچان نہیں پڑتا ' چھوڑ دی گئی ہیں - اگرچہ ان کے متعلق علحدہ ذکر کردیا گیا ہے —

دیبی پرشاد راے نے ایک لغت کلکتہ سے شائع کی ہے جس میں ہندی اور ہندوستانی کے علاوہ انگریزی ' فارسی اور بنگالی کے الفاظ ہیں اس کے علاوہ ہندوستانی زبان کی اور متعدد کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں جن کا ذکر غیر ضروری ہے - الہ آباد کے ریورنڈ جے ڈی بیٹ کی ہندی لغت آج کل زیر طباعت ہے اس لغت میں ۳۷ ہزار الفاظ ہیں - شیکسپیئر فوربس اور تھامسن کی لغتوں کے مقابلے میں اس میں بارہ ہزار الفا زیادہ ہیں - یہ لغت تقریباً ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگی - اس وقت

* A Grammar of the Urdu or Hindustani Language, (London, 1872).

اس کا نمونہ میرے پیش نظر ہے - ڈاکٹر ایس ڈبلو فیلن کی ہندوستانی انگریزی لغت کا نمونہ بھی میرے سامنے ہے - یہ لغت اور دوسری لغتوں کے بہ نسبت جو اب تک شائع ہوئی ہیں زیادہ مکمل ہے - اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ عورتوں کی زبان کے خاص الفاظ اس میں شامل کیے گئے ہیں جو اور دوسری لغتوں میں نہیں ملتے —

ڈاکٹر جی ڈبلو لیٹنر کی علمی کاوشیں ابھی جاری ہیں - موصوف نے ہندوستانی میں عربی زبان کی گرامر لکھی ہے جس کا نام " مقدمۃ الصرف' ہے - یہ کتاب ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے اور لاہور میں طبع ہوئی ہے -

میجر ہنری کورٹ نے جنھوں نے کچھہ عرصہ قبل ' سودا ' کا کُلیات شائع کیا تھا ' " نثر بے نظیر " کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو سنہ ۱۸۷۱ ع اور سنہ ۱۸۷۲ ع میں الہ آباد میں شائع ہوا ہے - میں ذاتی طور پر خود میر حسن کی نظم کو ترجمہ پر ترجیح دیتا ہوں - ' افسوس ' کی " آرائش محفل " کا بھی انگریزی میں موصوف نے ترجمہ کیا ہے —

پنجاب کے لفٹننٹ گورنر کی رپورٹ بابت حالات سرحد شمال مغربی کا اردو ترجمہ کپتان ہوارڈ نے کیا ہے جو اصل رپورٹ کے شائع ہونے کے ساتھہ لکھنؤ سے شائع ہوا ہے یہ ترجمہ دو جلدوں میں ہے اور اس کے ساتھہ ایک نقشہ بھی ہے —

اردو زبان میں جو مسیحی ادب شائع ہو رہا ہے اس میں اس سال نئی کتابوں کا اضافہ ہوا ہے - لاہور کے ریورنڈ رابرٹ کلارک کی نوازش سے مجھے ان میں سے چند کتابیں حاصل ہوگئیں اور بعض کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں - ان کتابوں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں -

تاریخ محمد - یہ کتاب اردو میں امرتسر کے عمادالدین نے لکھی ہے -

موصوف مشہور عالم ہیں اور مسلمان سے عیسائی ہوگئے ہیں - میں نے اپنے سنہ ۱۸۷۱ ع کے مقالے میں غلطی سے لکھہ دیا تھا کہ عمادالدین "اعجاز قران" کے مصنف ہیں حالانکہ اس کتاب کے مصنف رام چندر ہیں جو دھلی کے باشندہ ہیں اور آج کل پٹیالہ میں ناظم تعلیمات ہیں - میں سمجھتا ہوں یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ایسے شخص نے جو کبھی زمرۂ اسلام میں داخل تھا لیکن اب اس سے باہر ہے' اپنی زبان میں لکھی ہے - سیرت نگار نے ان متضاد بیانوں کا ذکر کیا ہے جو قران اور حدیث میں ملتے ہیں - قران میں معجزوں کو بیکار بتایا ہے اس لیے کہ ان سے حقیقت ثابت نہیں ہوسکتی - حالانکہ حدیث میں جو بذریعہ روایات محفوظ ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی جانب ایسے معجزے منسوب کیے گئے ہیں جو مضحکہ خیز ہیں —

عمادالدین ایک اور دوسری کتاب "تعلیم محمد" کے نام سے لکھہ رہے ہیں - اس کتاب کے لکھنے میں بہترین دیسی ماخذ استعمال کیے گئے ہیں - یہ کتاب ہندوستان کے مسیحی ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہے - تبلیغ و اشاعت کے کام میں ان دونوں کتابوں سے بہت مدد ملے گی -

نغمۂ زنبوری - اس میں عمادالدین اور لکھنؤ کے ایک مولوی کا مباحثہ بیان کیا گیا ہے —

تحقیق الایمان - اس کتاب میں عمادالدین نے مختلف مذاہب کے متعلق تحقیق کی ہے —

ضرورت ہند - یہ سردار دھیان سنگھہ کا خطبہ ہے جو انھوں نے سکھہ سرداروں کے روبرو پڑھا تھا تاکہ وہ غلط راستے کو چھوڑ کر سیدھا راستہ اختیار

کریں اور وحشت و بربریت کو ترک کر کے تہذیب و تمدن کے سایہ میں پناہ لیں - یہ خطبہ امرتسر میں جو سکھوں کا مذہبی مرکز اور تجارت کی بڑی منڈی ہے، طبع ہوا --

ایک ہندوستانی شخص نے جو عیسائی ہوگیا ہے ایک سو صفحوں کا رسالہ لکھا ہے جو الہ آباد میں طبع ہوا ہے * - اس رسالہ کا نام "مرأت الواعظین" ہے - اس میں ان لوگوں کو نصیحت کی گئی ہے جو دیسی لوگوں میں مسیحی مذہب کی نشر و اشاعت کا کام کر رہے ہیں - مضمون نگار نے اس بات پر تعجب ظاہر کیا ہے کہ مسیحی مذہب نے ابتدائی تین صدیوں میں نہ صرف رومۃ الکبریٰ بلکہ ایران اور عربی ممالک میں جو ترقی کی اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی- یہ ترقی ان حالات میں ہوئی جب کہ مسیحی مبلغوں کو قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ان کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی جاتی تھیں - ہندوستان میں مسیحی مبلغوں کو ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہیں اور ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے تب بھی مسیحیت کی ترقی کو اس ملک میں زور حاصل نہیں ہوا - مضمون نگار کا خیال ہے کہ اس کی ذمہ داری دراصل ان دیسی عیسائیوں پر عاید ہوتی ہے جو تبلیغ کا کام کر رہے ہیں- اول تو یہ لوگ جیسے تعلیم یافتہ ہونے چاہییں ویسے نہیں ہیں - پھر غلطی سے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کوتاہی کو اپنے جوش و خروش سے پورا کرسکیں گے - لیکن حقیقت میں ان کا یہ جوش جھوٹا جوش ہے - اس کی تہ میں سچا مذہبی احساس نہیں ہے اور نہ اس کے پیش نظر الوہی مقاصد ہیں - یہ لوگ غلطی

* اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

سے سمجھتے ہیں کہ یورپین طرز کا لباس پہن کر اور یورپین معاشرت کی تقلید کرکے وہ اپنے کام کے لیے کوئی خاص اثر پیدا کرتے ہیں - دراصل ان باتوں کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے - ان باتوں سے اہل ہند کے دلوں میں ناراضی پیدا ہوتی ہے - وہ انہیں حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ لوگ روپے پیسے کے لیے تبلیغ کا کام کر رہے ہیں - مضمون نگار نے اپنی صاف اور کھری باتوں کی معذرت کی ہے اور اپنے مضمون کو سینٹ پال کے اس مقولے پر ختم کیا ہے کہ "کیا میں اس لیے تمہارا دشمن ہوگیا کہ میں نے تم سے سچی اور کھری کھری باتیں کہہ دیں" —

میں ان سب کتابوں کا ذکر غیر ضروری سمجھتا ہوں جو مذہبی مسائل کے متعلق یورپین لوگوں نے ہندوستانی زبان میں لکھی ہیں اور جو گزشتہ سال شائع ہوئی ہیں —

ادبی کتابوں کے بعد اخباروں کو خاص اہمیت حاصل ہے جنہیں دن بدن ہندوستان میں ترقی حاصل ہو رہی ہے - وہ سیاسی، علمی اور ادبی اخبار جن کی نسبت میں پہلے ذکر کرچکا ہوں بدستور جاری ہیں - ان میں سے بعض مجھے وصول ہوتے ہیں جن کے بھیجنے والوں کا میں شکر گذار ہوں - مجھے پہلی مرتبہ "پنجابی اخبار" کے نسخے وصول ہوئے ہیں جو کئی سال سے کامیابی کے ساتھ جاری ہے —

اس وقت ہندوستانی زبان کے ۶۰ مختلف اخبارات ہندوستان کے چار صوبوں یعنی پنجاب، صوبجات شمال مغربی، اودھ اور صوبجات متوسط سے شائع ہو رہے ہیں * - صوبجات شمال مغربی (یو - پی) کے

---

* علیگڑھ اخبار - مورخہ ۸ نومبر سنہ ۱۸۷۲ ء -

ہندوستانی اخبارات کی تعداد سنہ ۱۸۶۹ ع میں ۲۶ تھی ' سنہ ۱۸۷۰ ع میں ۳۳ تھی اور اب اس سے بھی زیادہ ہوگئی ہے - ان ۳۳ اخباروں میں سے ۲۰ اخبار ہندوستانی اردو میں تھے ' ۶ ہندی میں اور ۵ ہندی اور اردو دونوں میں تھے - ایک اخبار بنگالی کا تھا - ان اخباروں کے اکثر مضامین انگریزی اخباروں سے ماخوذ ہوتے ہیں لیکن بعض مضامین اصلی ہوتے ہیں اور خاص قدر و قیمت رکھتے ہیں - ان میں تعلیمی اور معاشرتی مسائل کے متعلق مفید معلومات ہوتی ہیں - ان میں وہ شکایتیں صاف صاف بیان کردی جاتی ہیں جو اہل ملک کو انگریزی حکومت سے ہوتی ہیں - ان تمام اخباروں میں " علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ " اپنے مضامین کے معیار کے لحاظ سے خاص امتیاز رکھتا ہے - اس اخبار میں مولوی سید احمد خاں اور ان کے تنقید نگاروں میں یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ آیا یورپین اداروں کو ہندوستانی اداروں پر فوقیت حاصل ہے یا نہیں - سنہ ۱۸۷۰ ع میں صوبہ شمال مغربی میں ۸ رسالے شایع ہورہے تھے جن میں سے ۶ ہندوستانی میں ' ایک سنسکرت میں اور ایک انگریزی میں ہے —

اس کے سوا ہندوستان کی مختلف ادبی انجمنیں اپنے اپنے رسالے شائع کرتی ہیں جن میں ان کی کارروائیاں درج ہوتی ہیں اور ان کے جلسوں میں جو مباحثے ہوتے ہیں ان کا حال درج ہوتا ہے تاکہ رسالے کے پڑھنے والوں کو پوری کیفیت ملتی رہے * —

دہلی کی ادبی انجمن کا اب تک کوئی رسالہ شائع نہیں ہوتا تھا لیکن اب انجمن نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ بھی اپنا رسالہ شائع کرے گی -

* Report on the administration of the North - West Provinces for 1870 – 71.

چنانچہ اس کی پہلی اشاعت کے متعلق " اتالیق پنجاب" میں ذکر ہے اور اس کی بہت کچھ تعریف توصیف کی گئی ہے —

اور دوسرے رسالے جن کی نسبت میں نے پہلے ذکر نہیں کیا مندرجہ ذیل ہیں :—

بودھا سماچار - اس ہندی اخبار کا " اخبار انجمن پنجاب" مورخہ ۱۹ فروری سنہ ۱۸۷۲ ع میں ذکر موجود ہے —

چشمۂ علم - یہ اخبار پٹنہ کے نارمل اسکول کی طرف سے نکلتا ہے —

کوہ طور - یہ مہینے میں دو دفعہ لاہور سے شائع ہوتا ہے - اس کی پہلی اشاعت ۱۹ اپریل سنہ ۱۸۷۲ ع کو شائع ہوئی - یہ ۸ صفحوں پر مشتمل ہوتا ہے اور اس میں علمی اور ادبی مضمون ہوتے ہیں —

منشور محمدی - یہ اگست سنہ ۱۸۷۲ ع سے ہر دسویں روز بنگلور سے شائع ہوتا ہے اور آٹھ صفحوں پر مشتمل ہوتا ہے - اس کے مدیر منشی محمد قاسم ہیں جو " قاسم الاخبار " کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں - اس اخبار کے ضمیمے میں ان مضامین کی تردید شائع کی جاتی ہے جو لکھنؤ کے مسیحی مبلغوں کے اخبار " شمس الاخبار " میں نکلتے ہیں * —

مطلع انوار - یہ اخبار اردو اور ناگری رسم خط دونوں میں ہوتا ہے - لاہور سے شائع ہوتا ہے اور اس کے مضامین زیادہ تر ہندوؤں سے متعلق ہوتے ہیں - اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوؤں کے رسم و رواج اور ان کے عقاید کی حمایت کرے - " اخبار انجمن پنجاب " مورخہ ۲۹ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ ع میں اس کے متعلق ذکر ہے —

---

* دیکھو میری کتاب " ہندی اور ہندوستانی ادبیات کی تاریخ " - جلد ۳ - ص ۲۸۶ -

ہندو میموریل گزٹ - اگرچہ اس کا نام انگریزی وضع کا ہے لیکن یہ اخبار
اردو کا ہے اور انجمن دہلی کی طرف سے شائع ہوتا ہے * —
پٹیالہ اخبار - اس کے متعلق " اخبار الاخبار " مورخہ ۵ اپریل
سنہ ۱۸۷۲ ع میں ذکر ہے —
رسالۂ انجمن بٹالہ - یہ رسالہ بٹالہ کی انجمن شائع کرتی ہے اور اس
کی طباعت لاہور میں ہوتی ہے —
شمشیر بہادر - یہ اخبار ہندوستانی زبان میں نکلتا ہے - اس کے متعلق
النس انڈین میل (Allens Indian mail) مورخہ ۱۱ مارچ سنہ ۱۸۷۲ ع
میں ذکر موجود ہے —
عمدۃ الاخبار - یہ اخبار بھوپال سے شائع ہوتا ہے - اسی نام کے دو اخبار
ایک مدراس سے اور ایک بریلی سے شائع ہوتے ہیں —
اردو گائڈ - یہ ہندوستانی زبان کا اخبار کلکتہ سے ٹائپ میں شائع ہوتا
ہے اور مطبع مظہرالعجائب میں چھپتا ہے - " مظہرالعجائب "
مطبع کا بھی نام ہے اور ایک اخبار کا بھی نام ہے جو اسی مطبع
میں چھپتا ہے - اس کے مدیر کا نام تریلا کھوناتھ دت ہے —
دیسی لوگوں کے انگریزی اخبار جو ہندوستان میں شائع ہوتے ہیں ان
میں علیگڑھ کا " محمڈن سوشل ریفارمر " (تہذیب الاخلاق) خاص
طور پر قابل ذکر ہے —

الہ آباد کے رسالے " مخزن مسیحی " کی نسبت میں اپنے سنہ ۱۸۶۸ ع
والے خطبہ میں ذکر کرچکا ہوں ۔ یہ رسالہ بدستور جاری ہے - اس کے

* Allen's Indian Mail مورخہ ۱۳ مئی ۱۸۷۲ ع -

مدیر ریورنڈ جے والش (Rev. Walsh) ہیں جو آج کل یورپ آئے ہوئے ہیں - موصوف نے مجھے دسمبر سنہ ۱۸۷۱ع تک کی سب اشاعتیں ازراہ شفقت بھیج دی ہیں - اس اخبار کے مضامین دلچسپ ہوتے ہیں اور ان کا علمی معیار بھی بلند ہوتا ہے - اس میں اردو کی بعض نظمیں شائع ہوئی ہیں جو انگریزی وزن کے مطابق لکھی گئی ہیں - لکڑی پر بنائی ہوئی تصویروں کے عکس بھی ان میں شائع ہوئے ہیں - ضمیموں میں بعض مذہبی کتابوں کے ترجمے برابر نکلاتے رہتے ہیں - چنانچہ " The Pilgrim's Progress " ، " The Blood of Christ " ، " The Closer Walk " " The Fountain of life " اور " The Missionary Flavel " کے ترجمے شائع ہوچکے ہیں ان ترجموں کے سوا " عیسائیت کی تاریخ " ، " سینٹ جیک کی تفسیر " اور " القاب المسیح " بھی شائع ہوچکی ہیں —

لاہور سے " Punjab Tract and Book Society " کے زیر اہتمام اردو میں ایک رسالہ جاری ہوا ہے جس کا نام " حقیقی عرفان " ہے —

" کوی بچن سدھا " میں ، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ، ہندی کتابوں کے اقتباسات شائع ہوتے ہیں - اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے یہ اخبار اردو اور ہندی کے دوسرے اخباروں سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے - اس کے مدیر بابو ہری چندر نے اس اخبار کی ۹ مارچ سنہ ۱۸۷۲ع کی اشاعت میں ہندوستان کی رائے عامہ کے متعلق بحث کی ہے - اسی موضوع پر سید محمود نے ایک دلپذیر تقریر کی تھی جس کے متعلق میں سنہ ۱۸۷۱ع کے مقالہ میں ذکر کرچکا ہوں - بابو ہری چندر نے بھی بالکل وہی استدلال پیش کیا ہے جو سید احمد خاں کے قابل فرزند نے پیش کیا تھا - دونوں کی فکر کا انداز بالکل ایک سا معلوم ہوتا ہے - ہندوستان میں

مذہبی اختلاف کی وجہ سے فکر و نظر کی ایسی مشابہت قابل تعجب معلوم ہوتی ہے - بابو ہری چندر نے اپنے مضمون کے اختتام پر اسی قسم کی خواہشات کا اظہار کیا ہے جو عام طور پر تعلیم یافتہ ہندو ظاہر کیا کرتے ہیں - وہ کہتے ہیں :- "جب تک عام طور پر یہ خواہش لوگوں میں نہیں پیدا ہوگی کہ وہ توہمات کے بوجھل جوئے کو اتار پھینکیں اس وقت تک ہندوستان کی نجات کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی - ضرورت اس کی ہے کہ فرقہ واری تنگ نظری کے کالے بادل مغربی تہذیب و تمدن کی شعاعوں سے دور ہوں اور پھر ہم اس قابل ہوسکیں کہ عام نقطۂ نظر سے اپنے رسم و رواج پر تنقید کرسکیں - اس وقت یہ ممکن ہوگا کہ ہم اپنی قومی ترقی کی عمارت کو اتحاد کی بنیادوں پر کھڑا کرسکیں گے- اور دنیا کی قوموں کی اولین صف میں جگہ پاسکیں گے " —

متذکرہ بالا اخبار کی گزشتہ ۲ اکتوبر کی اشاعت میں ہندی زبان کے متعلق ایک نہایت دلچسپ اور فاضلانہ مضمون شائع ہوا ہے - میرے قابل شاگرد مسٹر گستاؤ گارز نے ، جو پیرس کی ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک نہایت ممتاز رکن ہیں ، اس مضمون کا مندرجہ ذیل الفاظ میں خلاصہ بیان کیا ہے :—

"زبان کی تین قسمیں ہیں - (۱) روز مرہ - (۲) شاعری کی زبان - اور (۳) نثر کی زبان - اس بات کا تعین کرنا ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ صوبجات شمال مغربی کی روز مرہ کیا ہے - دہلی اور دوسرے بڑے شہروں میں کھتری ، اگروال اور دوسری مغربی ذاتوں کے لوگ ہندی نہیں بولتے - ہر کوس پر بولی بدلتی جاتی ہے - بنارس کے قدیم باشندے

مختلف بولیاں بولتے ھیں - تانبے کے برتن بنانے والوں کی ایک بولی ھے اور کلکتے کے بابے ایک اور بولی بولتے ھیں - عوام الناس کی بولی کے علحدہ محاورے ھیں - بعض لوگوں کا خیال ھے کہ بنارس کی قدیم ترین زبان وہ ھے جو وھاں کے قوم بولتے ھیں - اس بات کا اچھی طرح یقین ھے کہ پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پچھم کی طرف کی ھے - بنارس سے تھوڑے فاصلے پر گنگا پار جائیے تو رام نگر میں بالکل دوسری ھی بولی آپ کو سنائی پڑتی ھے - یہ بولی مرزا پور کی بولی سے بہت کچھہ ملتی جلتی ھے - غرضکہ مختصر طور پر یہ کہنا درست ھے کہ صوبجات شمال مغربی میں مختلف بولیاں بولی جاتی ھیں - اگرچہ چند شہر ایسے ضرور ملتے ھیں جہاں کھڑی بولی بولی جاتی ھے لیکن یہ کہنا درست نہ ھوگا کہ کھڑی بولی صوبجات شمال مغربی کے سب لوگوں کی مادری زبان ھے -

" صوبجات شمال مغربی کی شاعری کی زبان برج بھاشا ھے اور اس میں کچھہ شبہ نہیں کہ برج بھاشا کا استعمال قدیم زمانے سے یہاں چلا آرھا ھے اگرچہ تاریخی طور پر اس کا ذکر اکبر کے زمانے سے ملتا ھے ملک محمد جائسی ' چند اور تلسی داس کے طرز نگارش میں بے قاعدگی پائی جاتی ھے - میں نے ذاتی طور پر کھڑی بولی میں شعر کہنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہ ھوسکا - اس سے مجھے یہ بات معلوم ھوئی کہ شاعری کے لیے در اصل برج بھاشا ھی موزوں ھے - بعض شاعروں نے بندھیل کھنڈی میں بھی اظہار کیا ھے اور بعض نے پنجابی

اور مارواڑی میں شعر کہے ہیں —

متذکرہ بالا مضمون نگار نے مختلف بولیوں کے مختصر نمونے دیے ہیں - کھڑی بولی کا ایک دوہا بطور مثال پیش کیا ہے اور اس کے ساتھہ مندرجہ ذیل راے ظاہر کی ہے : - "یہ شاعری کس قدر بوجھل معلوم ہوتی ہے ! میں نے اس پر اکثر غور کیا کہ کھڑی بولی میں شعر کیوں نہیں کہے گئے اور مجھہ پر یہ راز کھلا کہ چونکہ اس زبان کے افعال اور دوسرے اجزاے کلام لمبے لمبے ارکان تہجی پر مشتمل ہوتے ہیں اس لیے وہ شعر کے لیے موزوں نہیں ہوتے - اس مثال سے سب پر یہ بات روشن ہو جانی چاہیے کہ شاعری کے لیے برج بھاشا خاص طور پر موزوں ہے اور اس کو دوسری زبانوں پر فوقیت حاصل ہے " —

"زبان کی تیسری قسم کا اظہار نثر میں ہوتا ہے - اس کے متعلق بہت کچھہ اختلاف راے پایا جاتا ہے - بعض کہتے ہیں کہ نثر لکھنے میں اردو کے لفظ کثرت سے استعمال کرنے چاہییں اور دوسرے کہتے ہیں کہ نہیں سنسکرت کے لفظوں کو ترجیح دینی چاہیے - چونکہ اپنے اپنے رجحان کے مطابق لوگ ہندی نثر لکھتے ہیں اس واسطے اس کی کوئی متعین شکل نہیں پیدا ہوسکی " —

ہندی نثر لکھنے میں جو رجحان پاے جاتے ہیں ان کی مثالیں مضمون نگار نے پیش کی ہیں اور انہیں مندرجۂ ذیل قسموں میں تقسیم کر دیا ہے —

(۱) ایسی ہندی نثر جس میں سنسکرت کے لفظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہوں —

(۲) ایسی ہندی جس میں سنسکرت لفظ کم ہوں —

(۳) صحیح ہندی —

(۴) ایسی ہندی جس میں دوسری زبانوں کے لفظوں کی آمیزش ہو —

(۵) ہندی جس میں فارسی کے لفظ استعمال کیے گئے ہوں —

(۶) وہ ہندی جس میں ایسے انگریزی کے لفظ استعمال ہوے ہوں جو اہل ہند بلا تکلف بولتے ہیں —

(۷) ایسی ہندی جس میں پوربی یا بنارس کے قریب کی بولیوں کی آمیزش ہو -

(۸) ایسی ہندی جس میں بنارس کے آس پاس کے ان پڑھ لوگوں کے محاورے استعمال کیے گئے ہوں —

(۹) وسط ہند کی ہندی —

(۱۰) بنگالیوں کی ہندی —

(۱۱) انگریزوں کی ہندی —

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ " میں اس موقع پر یہ بحث چھیڑنا نہیں چاہتا کہ کونسی ہندی قابل ترجیح ہے - لیکن اگر میری رائے دریافت کی جائے تو میں کہوں گا کہ نمبر ۲ اور نمبر ۳ کی زبان میں جو طرز نگارش ملتا ہے وہ یقیناً قابل قبول اور قابل تقلید ہے - اب اگر اس کے متعلق تحقیق کی جائے کہ ہندی کا آغاز کیونکر ہوا تو اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ زبان پچھم سے آئی - پنجابی ' برج بھاشا اور دوسری پچھم کی بولیوں کی آمیزش سے یہ بنی اور آخر میں اس کا سلسلۂ نسب ناگ بھاشا سے مل جاتا ہے * —

* ناگ بھاشا کے معنی ہیں سانپوں کی زبان - برہمن لوگ اپنی مقدس زبان یعنی سنسکرت کے مقابلے میں عوام کی بولیوں کو اس نام سے پکارتے تھے اس لیے کہ بدھ مت اور بعض دوسرے مذہبی فرقوں نے ان عوام کی بولیوں کو ادبی مرتبہ تک پہنچانے کی کوشش کی تھی (ژورنال ایسیا تک اگست ستمبر - سنہ ۱۸۷۲ ص ۲۱۷) -

علی گڑھ اخبار مورخہ ۲۹ جنوری سنہ ۱۸۷۲ ع میں پندرہ اشعار کی ایک مثنوی شائع ہوئی ہے جو نواب رامپور کی فرمائش پر ایک میلے کے متعلق لکھی گئی ہے - یہ میلہ ۲۷ مارچ سے شروع ہوتا ہے اور ۳ اپریل تک رہتا ہے - رامپور کے قریب " باغ بے نظیر " میں یہ میلہ لگتا ہے - جوق جوق لوگ وہاں آتے ہیں - رامپور کو مسلمان لوگ، مصطفےآباد بھی کہتے ہیں - میلے کا مقام شکار گاہ سے بالکل ملا ہوا ہے اور " درگاہ قدم رسول " بھی وہیں قریب ہے - اس مثنوی میں نواب کی تعریف اور میلے کا حال بیان کیا گیا ہے - ہر سال لوگ میلے کے منتظر رہتے ہیں - بہت سے لوگ درگاہ پر حاضری کے لیے آتے ہیں اور تاجر پیشہ ہندستان کے ہر حصے سے اس موقع پر اپنا مال فروخت کرنے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے خوب رونق رہتی ہے —

" اخبار انجمن پنجاب " خوب کامیابی کے ساتھ برابر نکل رہا ہے- چونکہ میں اس انجمن کا اعزازی رکن ہوں اس لیے مجھے اس کے سب نمبر پہنچتے رہتے ہیں - اس اخبار کے جاری ہونے کے بعد انجمن کے ماہوار رسالے کی ضرورت باقی نہیں رہی جس میں انجمن کے قواعد اور کارروائیاں شائع ہوا کرتی تھیں - چنانچہ اس رسالہ کو بند کردیا گیا - اس اخبار کے سر عنوان ہما کی تصویر ہوتی ہے جس کے پھیلے ہوے دونوں پروں کے نیچے تاج رکھے ہوے ہیں - عام طور پر لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس چڑیا کا سایہ بھی اگر کسی شخص پر پڑ جاے تو وہ تخت و تاج کا مالک بن جاتا ہے - چنانچہ ٹیپو سلطان کے تخت کی آرائش میں ہما بنایا گیا تھا- اس اخبار کی ۲۹ اپریل والی اشاعت میں " بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے متعلق ایک دلچسپ مضمون ہے - مسلمان اپنے کام " بسم اللہ " سے شروع

کیا کرتے ہیں - چنانچہ مضمون نگار نے بتایا ہے کہ کتابوں کے شروع میں بھی اس کا لکھنا اچھا ہے - اس بات کی شکایت کی گئی ہے کہ سرکاری طور پر جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان کے شروع میں اس کا لکھنا بند کردیا گیا - اس اخبار کی ۱۹ جولائی کی اشاعت میں اُن تحقیقات کے متعلق ایک مضمون ہے جو انجیل مقدس کے تخلیق آدم کے نظریہ کے متعلق کی گئی ہیں - عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ خداوند نے جو چھ دن میں دنیا پیدا کی اس سے مراد تخلیق کے چھ مختلف دور ہیں - سب سے آخری دور میں آدم کی تخلیق ہوئی - طبقات الارض کے بعض ماہروں کو انسان کی ہڈیاں ان عجیب و غریب جانوروں کی ہڈیوں کے ساتھ ملی ہیں جو قدیم زمانے میں پائے جاتے تھے - یہ ہڈیاں ایسے پتھروں اور ریت کے ڈھیروں میں دستیاب ہوئی ہیں جو تاریخی زمانے سے دس ہزار سال قبل کے ہیں - مضمون نگار نے تمام واقعات پیش کیے ہیں اور آخر میں ایران کے فلسفی شاعر حافظ کی طرح وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ :-

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را

اس اخبار کی دوسری اشاعتوں میں پہیلیاں حل کی غرض سے پیش کی گئی ہیں تاکہ پڑھنے والوں کی ذہانت کی جانچ ہوسکے —

"علیگڑھ اخبار" مورخہ ۸ مارچ سنہ ۱۸۷۲ع میں پنڈت کاشی ناتھ کا ایک خط شائع ہوا ہے جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ سرکاری مدارس میں طلبا کو قومی شاعری کا ذوق پیدا کرنا چاہیے - میں اس بات میں پنڈت جی کا ہم خیال ہوں - میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے

اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-
"ادبیات کی اصناف میں شاعری میں سب سے زیادہ دلپذیری اور اور خوبی پائی جاتی ہے۔ ہر قوم میں ایسے شاعر ہوتے ہیں جن کے کلام کو قبول عام حاصل ہوتا ہے۔ ہر ملک اور ہر زمانے میں شاعری تعلیم کا جزو رہی ہے اور ان شاعروں کے کلام سے طلبا کو واقفیت حاصل کرائی جاتی ہے جنھوں نے زبان کو پاکیزہ بنانے میں حصہ لیا ہے۔ کیا شمالی ہند میں ہمیں ایسے شاعر نہیں ملیں گے جن کا کلام قومی سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہو۔ تلسی داس، سورداس، کیشوداس، بہاری لال اور کبیر داس کی حیثیت ہمارے دیس کے لیے رہی ہے جو انگلستان کے لیے ملٹن، شیکسپیئر، ڈرائڈن اور پوپ کی ہے۔ ہندی کے جدید شاعر قدما سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ تشبیہہ و استعارہ اور نازک خیالی میں وہ دوسری قوموں کے شاعروں کا آسانی سے مقابلہ کرسکتے ہیں۔ ہمارے ہندی شاعر قدیم یونانی شاعروں کی طرح دیوتاؤں اور سورماؤں کے عشق و محبت اور ان کی مہم جوئیوں کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ اپنے موضوع کے لحاظ سے ان شاعروں کا کلام اس قابل نہیں کہ مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے۔ لیکن ہماری رائے میں اگر ان شاعروں کے کلام کی ضخیم جلدوں میں سے انتخاب کیا جاے تو ایسے حصے ضرور دستیاب ہوسکیں گے جو دلچسپ بھی ہوں گے اور مفید بھی اور ان کا اخلاقی اثر طلبا پر اچھا پڑے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے انگریزی شاعری کے جو حصے ہمارے مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں ان کا اثر اچھا ہوتا ہے تلسی داس اور بہاری لال کے ہاں آپ کو فطرت نگاری، عشق و محبت، خوف، رنج و غم اور خوشی

کے ملنظر ملیں گے جو اگر کسی انگریزی زبان کے شاعر کے ہاں ہوتے تو قدر کی نظر سے دیکھے جاتے - ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ سرکاری مدارس کے نصاب تعلیم میں ہماری شاعری کے ایسے نمونے کیوں شامل نہیں کیے جاتے جن کے متعلق واقفیت حاصل کرنا ہندوستانی طلبا کا حق ہے - یہ سچ ہے کہ جن مدارس کے نصاب میں ہم یہ تبدیلی کرنا چاہتے ہیں ان میں ریاضی وغیرہ پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ کسی نئے مضمون کی مشکل ہی سے گنجائش نکالی جاسکتی ہے - ہماری یہ خواہش ہے کہ اقلیدس اور جبر و مقابلہ کے بجائے فطرت کی نیرنگیاں ' زمین کے طبعی تغیرات اور دنیا کی مختلف اقوام کے رسم و رواج اور ان کے حالات بچوں کو پڑھائے جائیں - شاعری میں صرف ہندی شعرا کے کلام کے نمونے نصاب میں نہ رکھے جائیں بلکہ ساتھ ساتھ اردو شعرا کے کلام کا انتخاب بھی ہونا چاہیے - اردو شاعروں میں بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے غیر اخلاقی موضوعوں پر لکھا ہے لیکن ایسے بھی بہت سے شاعر ملیں گے جن کے کلام میں یہ عیب نہیں نظر آتا - ان کے کلام میں نازک خیالی اور شاعرانہ ذوق جمال کے بہترین نمونے ملیں گے - ذراسی محنت سے ان شاعروں کے کلام کا انتخاب کیا جاسکتا ہے جو اخلاقی اور ادبی اعتبار سے نصاب میں داخل کرنے کے قابل ہو" —

ہندوستانی شاعری کی حمایت میں صرف کاشی ناتھ نے ہی آواز نہیں بلند کی ہے - علی گڑھ اخبار کی ۲۹ مارچ کی اشاعت میں ایک نامہ نگار کا خط چھپا ہے جس میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ صوبجات شمال مغربی کے مدارس میں مشرقی شاعری کے حصے نصاب میں داخل نہیں کیے گئے ہیں - نامہ نگار کے خط کے سلسلے میں اخبار کے مدیر نے لکھا ہے کہ " شاعری ایک

صنعت ہے جس کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کا ذوق پیدا کرنا چاہیے - لیکن دشواری یہ آن پڑتی ہے کہ ہندوستانی زبان کی شاعری میں سوائے دوراز کار باتوں یا ایسی تشبیہوں اور استعاروں کے کچھ نہیں ہوتا جو اخلاقی سطح سے گرے ہوئے ہوتے ہیں - اس وجہ سے محکمۂ تعلیمات نے ہندوستانی شاعری کے نمونے اپنی نصاب کی کتابوں میں نہیں داخل کیے - لیکن کاشی ناتھ کی طرح نامہ نگار کا یہ خیال بھی قابل لحاظ ہے کہ ہندوستانی شاعری میں ایسے نمونے مل سکتے ہیں جن میں بیہودہ یا ناپاک خیالات ظاہر نہیں کیے گئے ہیں بلکہ وہ اخلاق کو بہتر کرنے والے ثابت ہوں گے - اگر کسی یوروپین زبان میں ان کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ کیا جائے تو یقین ہے کہ اہل یورپ ہندوستانی شاعری کی قدر افزائی کریں گے * - جب مشرقی شاعری میں ایسے نمونے موجود ہیں جن میں اعلی درجہ کے نفیس خیالات ادا کیے گئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ انہیں نصاب میں نہ داخل کیا جائے اور ہندوستانی طلبہ کو ان سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع نہ دیا جائے - ہمارا خیال بھی یہی ہے کہ جس طرح نگینہ جڑا جاتا ہے اسی طرح شعر انسانی روح میں نقش ہو جاتا ہے - لوگ اشعار یاد رکھ سکتے ہیں لیکن نثر نہیں یاد رکھ سکتے - شعر اپنے وزن اور دلکشی کے باعث حافظے میں محفوظ رہ جاتا ہے اور جب یاد آتا ہے تو اس سے دل کو حظ حاصل ہوتا ہے - ان حالات کے مد نظر ہم نامہ نگار کے خیال سے متفق ہیں کہ اگر تعلیم سے شعر

* میرے دوست گران جیرے دے لا گرانج نے سنہ ۱۸۲۲ ء میں " ژورنال ایسیاتک " (Journal Asiatique) میں ایک دلچسپ مضمون لکھا تھا جس میں اسی قسم کے خیالات ظاہر کیے گئے تھے - مضمون کا عنوان تھا " مشرقی شاعری کی حمایت میں " -

کو بالکل خارج کر دیا گیا تو اس کا برا اثر بچوں کی ترقی پذیر ذہنی صلاحیتوں پر پڑے گا - چونکہ شعر کے مفید ہونے میں کلام نہیں اس لیے اس کا نصاب میں داخل کرنا ضروری ہے - پھر اس میں بھی شبہ نہیں کہ مشرقی شعراء کے یہاں ہمیں اعلیٰ پایہ کے اور حسین خیالات ملتے ہیں - مشرقی شاعری میں روحانی اور دنیاوی دونوں قسم کے خیالات موجود ہیں - واقعہ یہ ہے کہ مشرقی انشا پردازوں کی نثر میں زبان کا وہ لطف اور فصاحت ہمیں نہیں ملتی جو شعرا کے یہاں ملتی ہے - نثر سے زیادہ نظم میں تصوف کے خیالات ظاہر کیے گئے ہیں اور نظم ہی کے ذریعہ ہمیں رسم و رواج کے متعلق بھی زیادہ واقفیت حاصل ہوسکتی ہے - چنانچہ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مشرقی شاعری میں کوئی بات ایسی نہیں جس کا جاننا ضروری ہو - مشرقی شاعری کے نمونے نصاب میں رکھنے سے طلباء کے تخیل میں بلندی پیدا ہوگی اور وہ اپنے شعرا کے کلام کی باریکیاں سمجھ سکیں گے - ہم نامہ نگار سے متفق ہیں کہ ہندوستانی بچوں کو اپنے شاعروں کے کلام سے محروم رکھنا قابل افسوس امر ہے " —

میں اوپر " منشور محمدی " کے متعلق ذکر کر چکا ہوں - اپنی شاعری کی وقعت بڑھانے کے لیے اس اخبار کے سر عنوان پر دو اشعار درج ہیں جن سے اس کی حکمت عملی واضح ہوتی ہے * —

" اخبار انجمن پنجاب " کی ۲۲ مئی سنہ ۱۸۷۱ ع کی اشاعت میں ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا ہے جس میں انگریزوں پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ وہ اہل ہند کو " نیم متمدن " کہتے ہیں - یقیناً اُس قسم کے غیر ذمہ دارانہ الفاظ قابل ملامت ہیں - اہل ہند کی اپنی تہذیب ہے جو ہماری

* یہاں ان دونوں شعروں کا فرانسیسی ترجمہ ہے -

تہذیب سے مختلف ہے لیکن وہ زیادہ قدیم ہے - اسی طرح مسلمانوں کی بھی اپنی تہذیب ہے - درحقیقت خود ہماری تہذیب کے بعض اجزا مسلمانوں کی تہذیب کے رہون منت ہیں - مسلمانوں کی تہذیب کا اثر ہماری تہذیب پر صلیبی جنگوں کے زمانہ میں پڑنا شروع ہوا - مسلمانوں کی بدولت ہمیں متعدد یونانی تصانیف کا حال معلوم ہوا جن کے متعلق ہم بالکل ناواقف تھے —

لیکن مضمون نگار نے ان باتوں کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا - وہ لفظ "تہذیب" کا وہی مفہوم لیتا ہے جو یورپین لوگوں کا نقطۂ نظر ہے - چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اہل ہند ممکن ہے انیسویں صدی کے شروع میں "نیم متمدن" کہلانے کے مستحق ہوں لیکن اب جب یورپ کے علوم و فنون کا اس ملک میں رواج ہو رہا ہے یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ بہت جلد ان کی تہذیب یورپ کی تہذیب کی سطح پر پہنچ جائے گی - وہ کہتا ہے کہ "بلاشبہ ایشیا میں بعض ملک ہیں جنہیں نیم متمدن کہا جاسکتا ہے - مثلاً ایران ، افغانستان ، ترکستان اور چین وغیرہ - لیکن ہندوستان کو اس زمرہ میں داخل کرنا درست نہیں ہے - بعض قومیں ہیں جن میں بربریت موجود ہے ، جیسے تاتاری ، حبشی اور امریکہ کے بعض ملکوں کے قدیم باشندے - لیکن ہندوستان کے لوگوں کو ان کی طرح سمجھنا انصاف سے بعید ہے" —

"دیسی ریاستوں کے امرا بھی مغربی تعلیم و تہذیب اپنے اپنے علاقوں میں پھیلانے میں کوشاں ہیں - پٹیالہ ، جے پور ، بھرت پور ، کپور تھلہ ، بلرام پور اور وزیا نگرم کی ریاستوں میں نہایت عمدہ طریق حکومت رائج ہے - حیدرآباد (دکن) میں سر سالار جنگ

کی شخصیت اور قابلیت کو خود انگریزی حکومت نے تسلیم کرلیا ہے - کشمیر میں جو الاسہائے کی انتظامی قابلیت تعریف و تحسین کی مستحق ہے - نواب مردان علی کی خوبیوں کا حاکم ماننا دشوار ہے ! مہاراجہ پٹیالہ اور نواب علاءالدین احمد خاں کی خوش انتظامی کی دور دور شہرت ہے - دیسی ریاستوں میں جو ترقی ہو رہی ہے اس کو ظاہر کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے - اس وقت ہندوستان میں زندگی کے ہر شعبے میں ممتاز شخصیتیں موجود ہیں - اہل ہند میں آپ کو قابل انشا پرداز ' لایق فوجی افسر اور نظم و نسق کے ماہر ملیں گے - ہندوستانی کاریگروں اور صناعوں کی بنی ہوئی اشیاء خود اہل یورپ کو اچنبھے میں ڈالدیتی ہیں - پیرس اور لندن کی نمائشوں میں ان کاریگروں کی صنعت گری کی داد دی گئی ہے اور بڑے بڑے اخباروں نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی نقل ناممکن ہے - کیا کوئی یورپ کا ایسا فن ہے جس میں ہندی صناع امتیاز نہ حاصل کرسکے - جب اہل ہند میں یہ سب صلاحیتیں موجود ہیں تو انہیں " نیم متمدن " کہنا کہاں تک حق بجانب ہوگا - لیکن ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ابھی اہل ہند میں کوتاہیاں باقی ہیں - اہل ہند میں اپنے وطن کی ویسی محبت اب تک نہیں پیدا ہوئی جو یورپ کی قوموں کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کی بدولت انہوں نے اس قدر ترقی حاصل کی ہے " —

" ہمیں صرف اپنے ملک کی کاریگری اور صنعت کاری تک

اپنی نظر کو محدود نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ دوسرے ملکوں کی صنعتوں کو سیکھیں اور ان میں کمال پیدا کریں۔ ہمیں اہل یورپ کی طرح اپنی تجارت کو دنیا کے ہر گوشے میں پھیلانا ہے۔ باہر کے ملکوں سے ہمارا تجارتی تعلق بہت کمزور ہے جب یہ بات جاتی رہے گی اس وقت ہندوستان انگلستان کی طرح متمول اور دولت مند ملک ہوسکے گا۔ ہمیں اپنی زراعت کو ترقی دینا ہے اس لیے کہ اس پر مملکت کی خوشحالی کا تمام تر دار و مدار ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں سیکڑوں میل زمین بے کاشت اور بنجر پڑی ہوئی ہے اگر یہ سب زمین زیر کاشت آجائے تو اس سے بے اندازہ نفع حاصل ہوگا۔ ہمارے ملک کی ایک بڑی کوتاہی یہ ہے کہ ہم لوگ، نظام و نسق اور امن و امان قایم کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتے۔ لیکن خود اہل ہند کا اس میں کوئی قصور نہیں اس واسطے کہ انگریزی حکومت نظم و نسق کے تمام فرائض انجام دیتی ہے۔ ہندوستانیوں کو معمولی عہدوں پر مامور کیا جاتا ہے یا انہیں اعزازی ججی کی خدمت دی جاتی ہے۔ ان عہدوں پر ہندوستانی لوگوں نے اپنے فرائض اس خوبی سے ادا کیے ہیں کہ اس سے صاف ثابت ہوگیا ہے کہ وہ اس کے مستحق ہیں کہ انہیں ملک کی حکومت میں براہ راست شریک کیا جائے۔ ان حالات میں جب کہ یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ اہل ہند نے زندگی کے مختلف شعبوں میں کافی ترقی کی ہے اور آئندہ ان کی ترقی کی رفتار اور تیز ہوتی

جائیگی تو انہیں "نیم متمدن" کہنا کہاں تک درست ہے ؟ -
اس سے ان کی سخت دل آزاری ہوتی ہے "* —

میرٹھہ کے "اخبار عالم" مورخہ ۲۵ اپریل سنہ ۱۸۷۲ع میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں ہندوستان کی ادبی انجمنوں کا یورپ اور خاص کر انگلستان کی ادبی انجمنوں کے ساتھہ مقابلہ کیا گیا ہے - مضمون نگار نے اس امر کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے کہ بجائے اس کے کہ انگریزی حکومت کے زیر اهتمام ہندوستان کے مختلف شہروں میں انجمنیں قایم ہوں جن کے مقاصد غیر متعین ہوں ' یہ بہتر ہوگا کہ ان انجمنوں کے سامنے مخصوص موضوعوں کی تحقیق ہونی چاہیے جیسا کہ انگلستان میں ہے - اس طرح یہ ہوگا کہ علوم انسانی کے مختلف شعبوں میں ہماری واقفیت بڑھے گی اور ہم متعین نتائج حاصل کرسکیں گے - مثلاً ضرورت ہے کہ جغرافیہ ' آثار قدیمہ اور لسانیات پر تحقیق کرنے کے لیے علحدہ علحدہ انجمنیں قایم ہوں - لیکن ہماری رائے میں مضمون نگار ذرا جلد بازی سے کام لینا چاہتا ہے - ہندوستان کی نشأۃ ثانیہ کی ابھی ابتدا ہوئی ہے - جس قسم کی انجمنوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا قایم کرنا یقیناً ضروری ہے لیکن وہ اسی وقت قایم ہوں گی جب ان کی ضرورت کا پورے طور پر احساس ہوجا ئیگا - اب بھی ہندوستان میں متعدد انجمنیں ایسی ہیں جو مخصوص موضوعوں پر تحقیقات کر رہی ہیں - ابھی حال میں بمبئی میں ایک "زرعی انجمن" قایم کی گئی ہے —

"اخبار سر رشتۂ تعلیم اودھ" اور دوسرے اخباروں کے مقابلے

---

* اس مسئلہ کے متعلق اسی اخبار کی ۵ جولائی کی اشاعت میں پھر بحث کی گئی ہے -

میں کسی طرح کم دلچسپ نہیں ہے - اس کی یکم نومبر سنہ ۱۸۷۲ ع کی اشاعت میں دیوان حافظ کی ساتویں غزل کا نظم میں ترجمہ شائع ہوا ہے - جو بات اس ضمن میں قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ یہ ترجمہ ایک ہندو کا کیا ہوا ہے جس کا نام تارا چند اور تخلص اختر ہے —

اہل ہند کو انگریزی مدارس میں انگریزی زبان اور ادب کی تعلیم بطور لازمی مضمون کے دی جاتی ہے - اس تعلیم کی بدولت نیا ہندستانی ادب پیدا ہو رہا ہے جسے ہم ہندی یورپین ادب کہہ سکتے ہیں - ہندستانی زبان کے اخبار اسی ادب کا نمونہ ہیں - ایسے مدارس جو کلیتاً اہل ہند کے ہاتھ میں ہیں بالعموم اسلامی مدارس ہیں - ہندو لوگ قدیم اسلامی حکومت کے مقابلے میں انگریزی راج کو ترجیح دیتے ہیں - اور پارسیوں کا بھی یہی حال ہے - جب سے سرکاری درسگاہوں کی تنظیم عمل میں آئی ہے اس وقت سے انہوں نے اپنا علحدہ تعلیمی انتظام کرنے کی طرف مطلق کوئی توجہ نہیں کی - مسلمانوں کی طرح یورپین مدارس میں تعلیم پانے کو وہ برا نہیں سمجھتے - لیکن مسلمانوں کا اس معاملے میں نقطۂ نظر دوسرا ہے - میں پہلے بھی ان کی علحدہ درسگاہوں کی نسبت ذکر کرچکا ہوں - ان میں سے ایک دہلی کا مدرسہ محمدی ہے - یہ مدرسہ ۱۸۵۷ ع کی شورش کے زمانے میں بند ہوگیا تھا - بارہ برس تک بند رہنے کے بعد پھر وہ کھل گیا ہے اور اس میں کام جاری ہے - اس مدرسے میں بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کا انتظام ہے - یہ مدرسہ گلی قاسم خاں میں لال کنوئیں کے قریب واقع ہے - جو فاضل لوگ یہاں تعلیم دیتے ہیں ان میں ضیاءالدین خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں - موصوف متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور عربی علوم کا درس

دیتے ہیں * —

شاہ آباد (بہار) میں "مدرسۂ اسلام" میں بھی اسلامی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے - ہندستانی ادب کی قدیم کتابوں کی بھی یہاں تعلیم دی جاتی ہے —

ہندو لوگ مسلمانوں کے ان علحدہ مدرسوں کے مخالف نہیں ہیں بلکہ حق بات تو یہ ہے کہ وہ انہیں پسند کرتے ہیں اور ان کی مالی امداد بھی کرتے ہیں - چنانچہ راولپنڈی کے ضلع میں جو متعدد اسلامی مدارس قایم کیے گئے ہیں ان کی ہندوؤں نے مالی امداد کی ہے - یہ مدرسے خوشحال ہیں - ان میں عربی اور سنسکرت کے علاوہ اردو اور انگریزی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے † - ہندستان کے ہر گوشے میں مسلمانوں میں بیداری کے آثار نمایاں ہیں اور ان میں مذہبی جوش دن بہ دن بڑھتا جاتا ہے - ہندستان کے ہر حصے میں سندھ تک ہر جگہ آپ کو یہی حال نظر آئے گا - بمبئی کے ناظم تعلیمات نے چار سو روپے کا ایک انعام مقرر کیا ہے جو اس شخص کو دیا جائے گا جو ہندستان کے مسلمانوں کے متعلق بہترین مضمون لکھے گا - اس مضمون میں ان کی تعداد، ان کی تاریخ اور ان کی عام عمرانی زندگی پر تحقیق کے ساتھ تبصرہ ہونا چاہیے - یہ مضمون چاہے ہندستانی میں ہو چاہے سندھی زبان میں ‡ -

وادیِ کشمیر کی آبادی کا $\frac{9}{10}$ حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے - ان میں زیادہ تر تو اہل سنت والجماعت ہیں اور تھوڑے سے شیعہ بھی ہیں - شیعوں

* اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۱۶ فروری سنہ ۱۸۷۲ ع -
† علی گڑھ اخبار مورخہ یکم جولائی سنہ ۱۸۷۲ ع -
‡ Allen's Indian Mail مورخہ ۲۱ جولائی سنہ ۱۸۷۱ ع -

نے سنہ ۱۸۷۲ ع میں سری نگر میں ایک زمین کا ٹکڑا خریدا ہے تاکہ وہاں اپنی مسجد تعمیر کریں - اس جگہ کے قریب سنیوں کی مسجد ہے چنانچہ انہوں نے شیعوں کی مسجد کی تعمیر میں رکاوٹیں ڈالنا شروع کیں - بالآخر جھگڑے تک نوبت آئی اور کئی شیعوں کی جانیں ضائع ہوئیں اور ان کے مکانات جلا دئے گئے * - یہ طریقہ جو سنیوں نے اختیار کیا قابل ملامت ہے - اس طرح وہ اپنے مخالفوں کو اپنا ہم خیال کبھی نہیں بنا سکتے —

ترکی میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام رو بہ زوال ہے - لیکن چند سال سے اس میں نئی زندگی کے آثار نظر آ رہے ہیں - الھانیہ کے مسلمانوں میں بھی بیداری پیدا ہو رہی ہے - یہ سب کچھ وزیر اعظم محمود پاشا کی توجہ کا طفیل ہے - اُدھر خدیو مصر نے حبشہ میں یورش کی ہے - اس کی وجہ سے بھی اسلام کی توسیع عمل میں آے گی - اسلام پہلے سے افریقہ کے مختلف ممالک میں حاوی ہوتا جاتا ہے - یہ سن کر تعجب ہوگا کہ سیرلیون (Sierre Leone) میں ایک اسلامی یونیورسٹی ہے جس میں ایک ہزار طلبا تعلیم پاتے ہیں اور ان تعلیم پانے والوں میں عورتیں بھی شامل ہیں † —

ہندوستان کے مسلمانوں میں جو عام بیداری پیدا ہوئی ہے اس کی ذمہ داری ایک حد تک وہابی تحریک پر عاید ہوتی ہے - اگرچہ وہابی تحریک سیاسی اعتبار سے ختم ہو چکی ہے لیکن تمام مسلمانوں

---

* علی گڑھ اخبار مورخہ ۳ نومبر سنہ ۱۸۷۲ ع -

† علی گڑھ اخبار مورخہ ۱۵ نومبر ۱۸۷۲ ع - (یہ برطانوی نو آبادی افریقہ کے مغربی ساحل پر لائبیریا کے قریب واقع ہے - مترجم) -

میں اس نے مذہبی جوش پیدا کردیا ہے - وہابیوں کے متعلق ہم سب جانتے ہیں کہ وہ اپنے عقاید میں متشدد ہوتے ہیں - انہوں نے جب مکہ فتح کیا تو سنگ اسود کو توڑ ڈالا اس لیے کہ اس میں بت پرستی کا شائبہ تھا - مدینہ میں انہوں نے مسلمان اولیا کے مقبروں کو منہدم کردیا اسواسطے کہ توہم پرست مسلمان اُن کا احترام کرتے تھے - تمام مسلمان اور خاص طور پر وہابی لوگ مورتوں کو حرام سمجھتے ہیں اور انہیں مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں —

مسلمانوں کی عام بیداری جس کے پیدا کرنے میں ایشیا کی تمام اقوام مدد دے رہی ہیں، تاریخ کا نہایت اہم واقعہ ہے - میرے فاضل دوست اے اسپرنگر کا خیال ہے کہ "نصف صدی کے اندر اہل ایشیا مغربی تہذیب و تمدن پر اپنا اثر ڈالنے لگیں گے اور ذہن انسانی کی ترقی کو اعلیٰ بلندیوں تک پہنچادیں گے - وہ ایسی کتب تصنیف کریں گے جن سے نہ صرف انہیں بلکہ اہل یورپ کو بھی فائدہ پہنچے گا - اہل مشرق ذہانت میں یورپین لوگوں سے کسی طرح کم نہیں بلکہ بعض لحاظ سے ان سے زیادہ تیز فہم ہیں - وہ مستقبل قریب میں انسانیت کی ترقی کے ضامن بن جائیں گے - دوسری صدی عیسوی میں اور اس کے بعد بھی علوم و فنون کے بڑے بڑے محقق شام اور شمالی افریقہ کے لوگ تھے - کیا یہ بات ناممکن ہے کہ ان علاقوں میں پھر بڑے بڑے فاضل پیدا ہوں اور دنیا کو اپنے علم سے مستفید کریں" —

میں نے اپنی کتاب "ہندوستانی زبان اور ادب کی تاریخ" (ص ۱۰) پر یہ ذکر کیا تھا کہ شمالی چین میں نئی اسلامی سلطنتیں قایم ہورہی ہیں - اس کے متعلق اس وقت میں کچھ قطعی معلومات آپ کے سامنے

پیش کرسکوں گا - یونان کے صوبے میں جو چین کے جنوب مغرب میں واقع ہے، مسلمانوں نے ایک نئی مملکت قایم کرلی ہے - اس علاقے میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے - یہ لوگ پانتھے کہلاتے ہیں - ان کے سرگروہ نے ابھی حال میں اپنی سفارت لندن بھیجی ہے - یونان کے علاقے میں مسلمانوں کی اتنی زبردست تعداد کے متعدد وجوہ ہیں - ایک افسانوی روایت یہ مشہور ہے کہ حضرت نبی کریم کے چچا حضرت امیر حمزہ نے اس علاقے پر حملہ کیا تھا اور یہاں عربوں کی ایک نوآبادی بسائی تھی - اس قسم کے دوسرے مہم جوئی کے افسانے حضرت امیر حمزہ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں - لیکن غالباً اس علاقے میں بہت قدیم سے مسلمانوں کی چھوٹی سی آبادی موجود رہی ہے - پھر آہستہ آہستہ تبلیغ و اشاعت دین کے ذریعہ اور لاوارث بچوں کو مسلمان بنا کر تعداد میں اضافہ ہوتا رہا - بہرحال ہمیں یہ پورے طور پر معلوم ہے کہ چینی حکومت نے اس علاقے کے مسلمانوں کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی - لیکن کچھ عرصے سے چینی حکومت نے مسلمانوں کی مخالفت شروع کردی تھی اور ان کے مٹانے کے درپے ہوگئی تھی - بات یہ ہوئی کہ مسلمان مزدوروں نے چینی حکومت کی حکم عدولی کرنے کا فیصلہ کرلیا جس پر شہنشاہ چین کل مسلمانوں کے درپے ہوگیا - چنانچہ اس علاقے کے تمام مسلمانوں نے چینی حکومت کے خلاف اپنا متحدہ محاذ قایم کرلیا اور چینی حکام کو قتل کرڈالا جو ان پر طرح طرح کے ظلم کرنے لگے تھے - بتدریج مسلمانوں میں تنظیم پیدا ہوگئی - انھوں نے اپنے امرا میں سے ایک کو جس کا نام سلیمان ہے اپنا سلطان منتخب کرلیا - سلیمان اس وقت مسلمانوں کی سربراہی کررہا ہے - تھوڑے ہی عرصے میں اس

نے یونان کے صوبے کے بیشتر حصے پر قبضہ کرلیا - اب سولہ سال سے یونان میں اسلامی شریعت کے مطابق خود مختار حکومت قایم ہے - اس نئی مملکت کا نام تے لی فو (Talifu) ہے - یہ مملکت رقبے میں برطانیہ عظمیٰ کے برابر ہے - اس مملکت کے آس پاس کے صوبوں میں بھی چینی حکومت کے خلاف بغاوتیں ہو رہی ہیں اور وہاں کے مسلمان آپس میں اتحاد پیدا کر رہے ہیں —

شہزادہ حسن سلطان سلیمان کے فرزند ہیں - وہ اس سفارت کے صدر ہیں جو انگلستان بھیجی گئی ہے اور جس کی نسبت میں نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے - شہزادہ حسن نے انگلستان روانہ ہونے سے قبل اپنے والد کی حکومت کو مستحکم کرنے کی تمام ممکن تدابیر اختیار کیں اور شمالی اور مغربی چین کے مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی پوری کوشش کی - انہوں نے شمال اور مغربی چین کے مختلف علاقوں میں سفر کیا اور اپنے مقاصد کی نشر و اشاعت کی - وہ پوشیدہ طور پر شہر پیکنگ میں کچھہ عرصے تک مقیم رہے تاکہ وہاں ایک جماعت قایم کریں جو ان کے مقاصد سے ہمدردی رکھتی ہو - اس شہر میں مسلمانوں کی آبادی بیس ہزار سے زائد ہے اور وہاں متعدد مساجد بھی ہیں - ممکن ہے شہزادہ حسن کے پیش نظر انگلستان آنے سے یہ مقصد ہو کہ وہ انگریزی حکومت کو اس بات پر رضامند کریں کہ اگر چین کے مسلمان موجودہ حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کریں تو ان کی مدد کی جائے - چین میں مسلمانوں کی مذہبی تبلیغ و اشاعت اس کامیابی کے ساتھہ ہو رہی ہے کہ ممکن ہے کہ وہاں وہ قوت حاصل کرلیں —

چنگ ھان فو' چین سی کے صوبے کا صدر مقام ہے - یہاں مسلمانوں

کی آبادی پچاس ہزار کے لگ بھگ ہے - کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں ان سب کو چینی حکومت نے قید کر رکھا تھا اور ان کو شہر کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی - اگر کوئی شخص ان میں سے شہر کی چار دیواری کے باہر قدم رکھتا تو وہ قتل کر دیا جاتا - چین کے اور دوسرے بڑے شہروں میں بھی مسلمانوں کی کافی تعداد موجود ہے - حکومت وقت کو ان سے بڑا خطرہ ہے اس واسطے کہ ان میں پھر اسی قسم کا مذہبی جوش پیدا ہو رہا ہے جس نے انہیں دنیا کے بڑے حصے کو فتح کرنے پر اکسایا تھا - ان لوگوں میں عام طور پر ایک پیشین گوئی کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں یہ حکم لگایا گیا ہے کہ چین کی موجودہ سلطنت کا تختہ الٹنے والا ہے اور اس کی جگہ مسلمانوں کی حکومت قایم ہوگی * —

گلجا ' اس نام کے صوبے کا صدر مقام ہے - گزشتہ سال روسی سپاہ نے اس شہر پر قبضہ کر لیا تھا - اس شہر کی سات ہزار سات سو آبادی ہے جس میں چار ہزار نو سو مسلمان ہیں - چینیوں کے یہاں صرف دو مندر ہیں اور مسلمانوں کی ۳۶ مسجدیں ہیں - چھ مدرسے ہیں ' پانچ مسلمانوں کے اور ایک چینیوں کا - اس علاقے کے دوسرے شہروں کے اگر اعداد و شمار جمع کیے جائیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی آبادی چینیوں کے مقابلے میں بعض مقامات پر زیادہ ہے —

چینی مسلمانوں کے زیر اہتمام مطابع چل رہے ہیں جن میں عربی کتابیں چھاپی جاتی ہیں - متن کے ساتھ چینی ترجمہ بھی درج کیا جاتا ہے - ہمارے مدرسۂ السنۂ مشرقی میں ان مطابع کی بعض چھپی

---

* پال مال گزٹ - مورخہ ۲۹ جون سنہ ۱۸۷۲ ع -

ہوئی کتابیں موجود ہیں ـــ

سید احمد خاں کے فرزند ارجمند سید محمود نے لندن اور کیمبرج میں اپنی تعلیم کی تکمیل کرلی ہے اور وہ بیرسٹری کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس گئے ہیں - جب وہ واپسی پر پیرس میں ٹھہرے تھے تو اس وقت مجھے ان سے ملنے کے متعدد مرتبہ موقعے ملے اور ان سے بہت دلچسپ گفتگوئیں رہیں - اس نوجوان فاضل شخص کی دلی تمنا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک ایسی درسگاہ قایم کی جائے جو کیمبرج کے نمونے کی ہو - موصوف کی اس خواہش کا چرچا اس وقت ہندوستان میں ہو رہا ہے - چنانچہ "علیگڑھ اخبار" مورخہ ۲۱ مئی سنہ ۱۸۷۲ ء میں ایک نامہ نگار نے اس کے متعلق لکھا ہے * :ـــ

"ہمارا مستقبل یقیناً تاریک ہے اگر ہم ترقی کے راستے میں پیچھے رہ گئے یا اگر ہم نے صرف اس پر اکتفا کیا کہ اپنے شاندار ماضی کی مدح سرائی کرتے رہیں - اس وقت جو تجویز زیر غور ہے اس سے ہماری معاشری حیثیت سدھر جائے گی اور ہمارے نوجوانوں کو اعلی عہدے حاصل کرنے کے مواقع حاصل ہو جائیں گے - ہمیں چاہیے کہ اس تجویز کے مطابق حکومت سے آزاد ایک اپنی درسگاہ قایم کریں - چونکہ اودھ کے متمول مسلمانوں کے زیر غور بھی اسی قسم کی تجویز ہے اس لیے ضروری ہے کہ ان دونوں تجویزوں کو ملا دیا جائے - اس درسگاہ میں علوم دین ' اسلامی فقہ قدیم فلسفہ اور مشرقی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا

* یہ ترجمہ فرانسیسی عبارت سے کیا گیا ہے (مترجم) -

اور اس کے پہلو بہ پہلو مغربی علوم و فنون کی تعلیم دی جائے گی۔ اس وقت یہ ضروری نہیں کہ پروفیسروں کی بڑی تعداد موجود ہو۔ ہم چھوٹے پیمانے پر اپنا کام شروع کر سکتے ہیں۔ گنگا اور جمنا کے منبع کو دیکھو تو چھوٹے چھوٹے چشمے نظر آئیں گے۔ خود آکسفورڈ اور کیمبرج کی جامعات ابتدا میں چھوٹے چھوٹے مدرسے تھے۔ اس قسم کی درسگاہ کے لیے لکھنؤ کا شہر نہایت موزوں ہے اس لیے کہ یہاں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہے اور اس کے نواح میں متمول مسلمان آباد ہیں۔ اودھ کا صدر مقام علم و فن کے لحاظ سے دہلی کا مقابلہ کر سکتا ہے'' * —

"علیگڑھ اخبار'' کے نامہ نگار کی تجویز پر نہایت سلجھدگی سے عمل شروع ہو گیا ہے اور علیگڑھ میں ایک مجلس اس غرض سے قایم کی گئی ہے تاکہ درسگاہ قایم کرنے کے لیے چندہ فراہم کرے۔ اس درسگاہ کا نام ''مدرسۃ العلوم مسلمانان'' تجویز کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے قدیم علمی مرکز دہلی، آگرہ اور لکھنؤ تھے۔ لیکن ان سبھوں کے مقابلے میں علیگڑھ کو ترجیح دی گئی ہے † - اس مدرسے کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کی جائے گی۔ اس درسگاہ میں مسلمانوں کے لیے دینی اور دنیاوی علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ مجلس تعلیمی جو مقرر ہوئی ہے اس نے اپنا تعلیمی پروگرام شائع کیا ہے۔ مولوی سید احمد خاں بہادر اس مجلس

---

* یہ بات قابل لحاظ ہے کہ دہلی کے بعد لکھنؤ وہ شہر ہے جس نے ہندوستانی زبان کے سب سے زیادہ تعداد میں شاعر پیدا کیے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب " ہندوستانی زبان اور ادب کی تاریخ " میں ساڑھے تین ہزار شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ۲ سو کا تعلق دہلی سے ہے اور ۴۲۰ لکھنؤ کے ہیں —

† علی گڑھ اخبار مورخہ ۵ و ۱۹ اپریل سنہ ۱۸۷۲ ع —

کے معتقد ہیں - ممدوح نے اس سارے منصوبے کو علمی جامہ پہنانے کا تہیہ کیا ہے - میرا خیال ہے کہ ذریعہ تعلیم ہندوستانی رکھا جائے گا * - سید احمد خاں نے اپنے پروگرام کی تفصیلات شائع کی ہیں - وہ رقم کی فراہمی کے لیے نہایت موثر ثابت ہوں گی - جب ضروری رقم فراہم ہو جائے گی تو فوراً تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے گا اور کالج کا افتتاح کر دیا جائے گا - سرکاری طور پر گورنر جنرل اور گورنر صوبجات شمال مغربی نے یقین دلایا ہے کہ وہ اس منصوبے کی تکمیل میں ہر طرح تعاون عمل کریں گے اور ہاتھ بٹائیں گے - نئے وائسرائے لارڈ نارتھ بروک نے چھ ہزار کا وعدہ کیا ہے - دوسرے لوگ بھی چندے دے رہے ہیں - گزشتہ اگست کے مہینے میں ۳۰ ہزار ایک سو چھتیس روپے جمع ہو چکے تھے —

بنارس کی " انجمن ترقی تعلیم مسلمانان " کی اپیل پر کہ اس امر کی تحقیق کی جائے کہ مسلمان طلبا سرکاری مدارس میں تعلیم کے لیے کیوں نہیں جاتے، ملک کے مختلف گوشوں سے ۲۵ مضامین بھیجے گئے ہیں - † ان میں صرف تین مضمون ایسے ہیں جو اشاعت اور معاوضہ کے قابل تصور کیے گئے - باقی مضمون بھی اچھے خاصے ہیں - چنانچہ انجمن کے رکن مولوی احمد شفیع نے، جو وزیرآباد کے رہنے والے ہیں یہ تجویز پیش کی ہے کہ ان مضامین سے استفادہ کرنے کے لیے اُنہیں محفوظ رکھا جائے اور آئندہ یا تو حکومت سے درخواست کی جائے کہ ان کی اشاعت کا انتظام کرے یا انہیں طبع کرانے کے لیے سرمایہ چندہ سے جمع کیا جائے - " علی گڑھ اخبار " کے مدیر کی یہ رائے ہے کہ ان مختلف رسالوں کا

---

* مجھے دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ اس ضمن میں لاطینی زبان کا بھی ذکر کیا جا رہا ہے -

† علی گڑھ اخبار - مورخہ ۱۹ جولائی سنہ ۱۸۷۲ ء -

خلاصہ تیار کیا تاکہ جو اہم باتیں ان میں بیان کی گئی ہیں وہ سب اس میں آجائیں - اس طرح اس خلاصے کی ایک چھوٹی سی جلد تیار ہو جاےگی- اہل ہند اس قسم کے خلاصوں کو بہت پسند کرتے ہیں - چنانچہ ان کے یہاں مثل مشہور ہے کہ ''دریا کوزہ میں'' - ہم بھی ''علی گڑھ اخبار'' کے مدیر سے اس باب میں ہم خیال ہیں - اس طرح اہل ہند کو اور ان یورپین لوگوں کو جو ہندوستان کے ساتھہ دلچسپی رکھتے ہیں ان سب دلائل کا علم ہوسکے گا جو ان رسالوں میں بیان کیے گئے ہیں * -

یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ حکومت ہند حتی الامکان ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کی پوری کوشش اور ہمت افزائی کر رہی ہے - یہ واقعہ ہے کہ سواے پنجاب اور صوبجات شمال مغربی کے اور دوسرے حصوں کے مسلمان نہ صرف مغربی علوم میں پیچھے ہیں بلکہ عربی فارسی علوم کی طرف بھی زیادہ راغب نظر نہیں آتے —

ہم نے یہ رائے ان اعداد و شمار کی بنا پر قایم کی ہے جو حکومت کہ شعبۂ نظارت تعلیمات نے مختلف مدارس کا معائنہ اور اس مسئلے کے متعلق تحقیق کرکے قایم کی ہے - اس حالت کے وجوہ معلوم کرنا مفید ہے تاکہ اس میں تبدیلی کی تدابیر اختیار کی جاسکیں - ہم نے ابھی جن مضامین کا ذکر کیا ہے ان میں اس مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہوگی -

''اخبار انجمن پنجاب'' کے مدیر کی راے میں اس جگہ مختصر طور پر بیان کرتا ہوں :- ''ہندوستان کے مسلمانوں اور دوسرے ملکوں کے مسلمانوں میں بنیادی فرق ہے جس کو تسلیم کرنا ضروری ہے اور جسے سرسری نظر میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے - ہندوستان کے باہر دوسرے

---

* انڈین میل - مورخہ ۲۸ اگست سنہ ۱۸۷۳ م -

ملکوں میں مسلمانوں کا اپنے مذہب سے حقیقی تعلق ہے - ہندوستانی مسلمان بھی مذہب کو عزیز رکھتے ہیں لیکن مذہبی احکام سے زیادہ ان پر رسم و رواج کا اثر ہے - یہی فرق ہے جو انہیں باہر کے مسلمانوں سے علحدہ کرتا ہے - اس بات کو ثابت کرنے کے لیے ہم یہاں چند مثالیں پیش کرتے ہیں - اس کی کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کو برا سمجھتے ہیں حالانکہ انگریزوں کا اہل کتاب میں شمار ہوتا ہے - کہا جاتا ہے کہ یہ رسم و رواج کا معاملہ ہے - جو ان کے بزرگوں کے وقت سے غلط خیالات چلے آرہے ہیں انہیں پر وہ کار بند ہیں - لیکن تعزیہ داری کی رسم کو کیا کہا جائے گا جو صرف ہندوستان کے مسلمانوں میں پائی جاتی ہے - باہر کے مسلمان اس سے ناواقف ہیں - قبر پرستی کی مثال بھی اسی قسم کی ہے - یہ تمام رسوم شریعت اسلامی کے منافی ہیں - ہندوستانی مسلمان اپنی ان رسوم کو بہت اہمیت دیتے ہیں - ان کے بہت سے رواج ان میں ہندوؤں کے ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے پیدا ہوئے - انہوں نے ہندوؤں کی بہت سی رسوم اختیار کرلی ہیں - وہ بھی ان کی خاطر شادی بیاہ کے موقع پر بے اندازہ خرچ کرتے ہیں - ہم یہ نہیں کہتے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس وقت جو رسوم پائی جاتی ہیں وہ سب دین اسلام کے خلاف ہیں لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ یہ رسوم شریعت کے مطابق نہیں ہیں اگرچہ ان پر صدیوں سے عمل ہو رہا ہے - ان پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی ختنہ کرائیں اور اپنی شریعت کی تعلیم سے اپنے بچوں کو آگاہ کریں - یہی وجہ ہے کہ اپنے بچوں کو انگریزی یا اور کوئی زبان شروع کرانے سے پہلے وہ قرآن اور فارسی کی بعض کتابیں پڑھاتے ہیں جن کا پڑھنا مذہبی

تعلیم کا جزو تصور کیا جاتا ہے - بچوں کی عمر کا ابتدائی حصہ اس طرح گزرتا ہے - اب جب کہ سرکاری مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں تو بہ نسبت ہندو طلباء کے جنہیں مذہبی تعلیم میں وقت نہیں صرف کرنا پڑتا ان کی عمر زیادہ ہوجاتی ہے - اس وجہ سے مسلمان بچے دوسرے مذاہب کے بچوں کے مقابلے میں پیچھے رہ جاتے ہیں - مسلمان بادشاہوں کے زمانے سے عربی اور فارسی علوم کو جو اہمیت حاصل تھی وہ بعد میں باقی نہیں رہی - اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمان علوم کو حاصل کرنے کی جانب بہ نسبت اس زمانے کے زیادہ مائل تھے - بہت سے فاضل لوگ ایسے موجود تھے جو اپنے علم کی بدولت فضیلت حاصل کرتے تھے - اس زمانے کے مسلمان اپنی تعلیم سے روحانی اور دنیاوی عقل کی تربیت حاصل کرتے تھے - اگرچہ تعلیم سے دنیاوی فوائد کم حاصل ہوتے تھے لیکن پھر بھی مسلمانوں کو اس کا اندازہ تھا کہ دنیاوی مفاد کی خاطر کس قدر تعلیم درکار ہے - اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمان کس طرح تعلیم میں امتیاز حاصل کرسکتے ہیں - بعض مذہبی رسوم کی وجہ سے جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر بیان کیا، مسلمان بچے جب سرکاری مدرسہ میں پہنچتے ہیں تو ان کی عمر بہ نسبت دوسری قوموں کے زیادہ ہوجاتی ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انگریزی تعلیم میں دوسروں کے مقابلے میں پیچھے رہ جاتے ہیں - یہ سچ ہے کہ ہندو بچوں کو اس قسم کی کوئی خاص دشواری نہیں پیش آتی - وہ بالکل کم عمری میں مدرسے میں داخل ہوجاتے ہیں - مسلمان بچے عمر بڑھنے پر مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں اور جب تعلیم ختم کرنے کی نوبت آتی ہے تو ان کی عمر بہت زیادہ ہوچکتی ہے - وہ اپنے ہم جماعت ہندو

طلبا کے مقابلے میں شاذ و نادر ہی امتیاز حاصل کرسکتے ہیں۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان اپنے مدارس علیحدہ قایم کریں۔ ان مدارس کے اخراجات نصف حکومت برداشت کرے اور نصف وہ خود برداشت کریں۔ ان مدارس میں قرآن اور مذہبی کتابوں کی تعلیم کا عام تعلیم کے ساتھ انتظام کیا جاسکتا ہے —

ہماری رائے ہے کہ سرکاری مدارس میں بھی قرآن، تفسیر حدیث اور فقہ کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے — اس پر یہ اعتراض کیا جائے گا کہ ایسا کرنا حکومت کی حکمت عملی کے خلاف ہے جو ان مدارس کو چلاتی ہے۔ لیکن یہ کیا جاسکتا ہے کہ نصاب میں وہ کتابیں رکھی جائیں جن میں دوسرے مذاہب کی برائی نہ ہو — اگر اس قسم کا سرکاری مدارس میں انتظام کیا گیا تو صرف ہندوستان کے طلبا ہی جوق جوق نہیں آئیں گے بلکہ بخارا اور دوسرے قریب کے اسلامی مرکزوں سے طالب علم ہندوستانی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا کریں گے - اگر ایسا انتظام کیا گیا تو مسلمان انگریزی حکومت کے بہت شکر گزار ہوں گے کہ اس نے ان کے بچوں کی تعلیم کے لیے سہولتیں فراہم کیں - اگر حکومت چاہتی ہے کہ مسلمان بادشاہوں کی طرح مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کرے تو ضروری ہے کہ عربی اور فارسی علوم کی تعلیم ان لوگوں کے ذریعہ دی جائے جو اپنی قابلیت اور ذاتی وجاہت میں مُسلّم ہیں ۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو لوگ اس تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہ کریں گے - کوئی شخص یہ پسند نہیں کرے گا کہ وہ کسی مسجد کا مُلّا ہوجائے یا پیر زادہ کہلانے لگے یا تعویذ گنڈے لکھا کرے - عربی اور فارسی علوم کی تحصیل کے بعد بھی لوگ روٹیوں کو محتاج رہتے ہیں - زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ کسی

مسجد کے مدرسے میں پڑھانے لگتے ہیں - ان تمام باتوں کو دیکھ کر نوجوان مسلمان عربی فارسی کے علوم کو بے سود تصور کرنے لگے ہیں * " -

بھوپال کے " عمدۃ الاخبار " کے مدیر نے اس مسئلے کے متعلق یوں اظہار خیال کیا ہے -: " یورپ کے تمام موجودہ ذہنی علوم ہندوستان کے مسلمانوں میں بہت جلد مقبول ہوسکتے اور پھیل سکتے ہیں اس واسطے کہ یہ علوم دوسری شکل میں ان کے پاس پہلے سے موجود ہیں - انہوں نے ان علوم کو یونان سے براہ راست لیا تھا جب ان میں ان کے حاصل کرنے کا شوق تھا - ابو جعفر منصور نے ' جو بنوعباس کا دوسرا خلیفہ ہوا ہے ' اقلیدس کا یونانی سے عربی میں ترجمہ کرایا تھا - اس سے عربوں میں یونانی علوم حاصل کرنے کا شوق اور زیادہ پیدا ہوا - چنانچہ خلیفہ مامون نے ابونصرفارابی ' بوعلی سینا ' قاضی ابو ولید بن رشید اور ابوبکر بن صالح کو اس کام پر مقرر کیا کہ وہ یونانی علوم کو عربی میں منتقل کریں - عباسیوں اور برامکہ کے عہد حکومت میں یونانی علوم وفنون کی بڑی قدردانی ہوئی - دمشق میں ۲۱۴ ہجری میں مامون کے زمانے میں یحیٰی بن منصور نے رصد گاہ بنوائی - ناصرالدین طوسی اور علی بن شاطر نے بھی رصد گاہیں بنوائیں - ہندوستان میں بھی مسلمان حکمرانوں کے عہد حکومت میں یہ علوم پھیلے اور مصر میں بھی ان کی اشاعت ہوئی - لیکن ان ممالک میں ان علوم کو زیادہ مقبولیت نہیں حاصل ہوئی - اس وقت اگر چہ ہندوستان میں علمی زوال چھا یا ہوا ہے لیکن مصر میں فرانسیسی اور انگریزی زبان سے ترجمے ہورہے ہیں اور علوم کو خوب ترقی حاصل ہورہی ہے اور مدارس میں تعلیم کا انتظام

* یہ فرانسیسی عبارت کا ترجمہ ہے - (مترجم) -

ہے - علم نباتات ، علم حیوانات ، زراعت ، فلکیات اور طب پر مصر میں جو کتابیں چھپ رہی ہیں وہ میری نظر سے گزریں - انہیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں ان علوم کو نئے طرز پر پڑھایا جارہا ہے اور پرانے طریقوں کو نظر انداز کیا جارہا ہے - مختلف علوم کی بہت کم کتابیں ایسی ہیں جو ترجمے کے ذریعہ مصر میں روشناس نہ ہوچکی ہوں - مصر میں ذریعۂ تعلیم عربی زبان ہے جو ملکی زبان ہے - لیکن چونکہ یہ ایک مذہبی زبان ہے اس لیے ہندوستان کے مسلمان بھی اسے سیکھتے ہیں - اگر حکومت چاہے تو ان علمی کتابوں کے خلاصے جو مصر میں شائع ہوئی ہیں ، ہندوستان میں بھی رائج کردے —

" ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی حکومت کے ساتھ اس باب میں متفق ہیں کہ ہندوستان کی سرزمین سے جہالت کی تاریکی کو دور کیا جائے - اہل ہند کو مغربی علوم و فنون کی برتری کا احساس پیدا ہوگیا ہے - شروع شروع میں جب اہل ہند سے کہا جاتا تھا کہ وہ سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کریں تو وہ اس کی مخالفت کرتے تھے لیکن اب کچھ عرصے سے وہ اپنی خوشی سے مغربی تعلیم حاصل کر رہے ہیں - بعض ہندوستانی امرا بھی تعلیم کی اشاعت میں ہر طرح مدد دے رہے ہیں اور حکومت ان کی مدد سے پورا فائدہ اٹھا رہی ہے - باوجود اس کے اکثر انگریزی حکام کا خیال ہے کہ ہندوستانی امرا جو مغربی علوم کی اشاعت میں دلچسپی ظاہر کر رہے ہیں وہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ فی الواقع ان علوم کے قدردان ہیں بلکہ وہ صرف حکومت کی اس طرح خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں - میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی - اس طرح انگریزی حکام مغربی علوم کی برتری اور جدید تعلیم کی برکتوں

کو ظاہر کرتے ھیں لیکن یہ بات قرین انصاف نہیں معلوم ہوتی کہ ھندوستانی امرا کے ذوق علمی کو اس طرح خوشامد پر محمول کیا جائے - میرے خیال میں ھندوستانی امرا جو اس قدر جوش و خروش مغربی تعلیم کی اشاعت کے لیے ظاہر کر رہے ھیں اس کی وجہ یہ ھے کہ وہ انہیں مفید سمجھتے اور ان کی اھمیت کو محسوس کرتے ھیں - ضلع 'راجشاھی' کے ایک زمیندار نے ۵ ھزار روپے سالانہ کی آمدنی کی زمین سرکاری اسکول کے نام وقف کر دی ھے بشرطیکہ آئندہ اس مدرسے میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا جائے - اس سے ظاہر ہوتا ھے کہ اس شخص کو اپنے ملک میں اعلیٰ تعلیم پھیلانے کا کس قدر شوق ھے * - میں سمجھتا ہوں مغربی علوم کی اشاعت کا یہ شوق ھندوستان میں دن بدن ترقی کرتا جائے گا - مجھے اس کی بھی پوری توقع ھے کہ ھندوستان کے امرا اس وقت مغربی تعلیم کی اشاعت کے لیے جو شوق ظاہر کر رہے ھیں وہ آئندہ بھی باقی رہے گا —

" پنجاب کے باشندوں نے اپنے امرا کی سر کردگی میں قومی علوم کو ترقی دینے کے لیے ایک جامعہ قایم کرلی ھے - یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس درسگاہ کے قایم ہونے سے نہایت مفید نتائج بر آمد ہوے ھیں - یہ اس وقت تک قایم نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ لوگوں میں واقعی اس کی دلی خواهش موجود نہ ہوتی کہ وہ اپنے علوم محفوظ کرنے کا انتظار کریں - یہ ایک ننھا سا پودا تھا جو انہوں نے لگایا تھا - اب آبیاری اور توجہ سے یہ پودا بڑا درخت ہوگیا ھے اور اس میں پھل پھول آرہے ھیں جن سے ہر شخص بلا امتیاز اس کے کہ وہ امیر ھے یا غریب

---

* علیگڑھ اخبار کے مدیر نے اس قسم کی اور بھی مثالیں پیش کی ھیں جن کا ذکر کرنا یہاں غیر ضروری ھے -

مستفیض ہو رہا ہے - اس درخت کی تازگی اور سایہ میں دلوں کی پژمردگی دور ہوتی ہے - اگر خدا کو منظور ہے تو اس کا فیضان پنجاب کی حدود سے نکل کر ہندوستان کے ہر گوشے تک پہنچے گا "* —

لاہور کے حلقے میں ۱۳۹۷۲ مسلمان طلبا سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں لیکن غیر سرکاری مدارس میں جہاں بغیر حکومت کی امداد سے مذہبی تعلیم کا انتظام ہے اس کی دوگنی تعداد تعلیم پا رہی ہے † —

۳۰ نومبر ۱۸۷۱ ع کو پنجاب کے لفٹنٹ گورنر کی صدارت میں یونیورسٹی کالج کے طلبا کو انعامات تقسیم کرنے کے لیے لاہور میں ایک بڑا دربار منعقد ہوا - کہا جاتا ہے کہ اتنا بڑا دربار پنجاب میں پہلے کبھی نہیں منعقد ہوا تھا - جلسے کی تاریخوں سے پہلے ہی لفٹنٹ گورنر کی دعوت پر پنجاب کے امرا و رؤسا جمع ہوگئے تھے - عورتوں کے لیے نشستیں خاص طور پر محفوظ رکھی گئی تھیں - ایک طرف انگریزوں کی نشستیں تھیں اور دوسری طرف ہندستانیوں کی - لفٹنٹ گورنر کی نشست سب سے علحدہ تھی اور اس کے دونوں طرف حکومت کے معتمدین' ڈاکٹر لٹز اور پنجاب یونیورسٹی کے چانسلر تھے ‡ - ان کے سامنے میزوں پر کتابیں اور دوسری انعامی اشیا بھی رکھی ہوئی تھیں اور جن طلبا کو یہ انعام ملنے والے تھے وہ بھی وہیں نزدیک بیٹھے ہوئے تھے - ٹھیک دس بجے لفٹنٹ گورنر دربار میں داخل ہوا اور اجلاس شروع ہوگیا - سب سے پہلے ڈاکٹر لٹز

* اخبار سائنٹفک سوسائٹی بہار' مورخہ یکم دسمبر سنہ ۱۸۷۱ ع -

† یہ معلومات ڈاکٹر لٹز کے اس خط سے لی گئی ہیں جو انھوں نے مجھے بھیجا تھا -

‡ مسٹر پیرسن پہلے راولپنڈی کے ناظر مدارس تھے - اب وہ لاہور کالج کے پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کے چانسلر ہیں - (اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۲۲ مارچ سنہ ۱۸۷۲ ع)-

نے گزشتہ سال کی رپورٹ انگریزی زبان میں پڑھی - اس کے بعد چندہ ہوا اور تقریباً تین لاکھ روپے کے قریب وعدے ہوے - ہمیں توقع ہے کہ آئندہ سال رقم اس سے زیادہ جمع ہوسکے گی - طلبا کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے - پنجاب کے ہر ضلع سے ہر عمر کے طالب علم تعلیم سے مستفید ہونے کے لیے آتے ہیں —

جب ڈاکٹر لئنر اپنی رپورٹ پڑھ چکے تو انہوں نے اس کا انگریزی سے ہندستانی میں نہایت فصاحت سے ترجمہ ان لوگوں کے لیے کر دیا جو انگریزی زبان سے ناواقف تھے - اس کے بعد لفٹنٹ گورنر نے تقریر کی اور پھر انعامات تقسیم کیے گئے - بعض طالب علموں کو اتنی کتابیں ملیں کہ وہ انہیں اٹھا نہیں سکتے تھے - جب انعامات تقسیم ہو چکے تو حاضرین میں سے ایک ممتاز شخص نے جن کا نام راجہ بہادر ملہدی (؟) تھا، ایک باموقع تقریر کی جس میں اہل پنجاب کو اس امر کی مبارک باد دی کہ انہوں نے عام تعلیم کے لیے ایک نہایت مفید ادارہ قایم کرلیا ہے - اس کے بعد مسٹر لیپل گریفن (Lepel Griffin) نے جو معتمد حکومت ہیں اور جنہوں نے پنجاب کے راجاؤں کے متعلق ایک اہم کتاب ابھی حال میں شائع کی ہے، تقریر کی اور امید ظاہر کی کہ بہت جلد یونیورسٹی کامیاب طلبا کو انتہائی اور اعلیٰ ترین امتحانات کی ڈگریاں دینے لگے گی - جس روز دربار منعقد ہوا اسی روز لفٹنٹ گورنر کے حکم سے ایسے ۱۶ امراے پنجاب کی ایک مجلس بنا دی گئی ہے جو سینیٹ کے ارکان ہیں تاکہ اعلیٰ تعلیم کی تنظیم کے متعلق غور کیا جائے - پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے یونیورسٹی کی ترقی کے لیے جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے اس سے امید بندھتی ہے کہ کامیابی یقینی ہے -

سنہ ۱۸۶۳ ع سے بنارس میں حکومت کی سرپرستی میں ایک کالج قایم ہے جہاں امیروں کی لڑکیاں چاہے وہ یتیم ہوں اور ان کی جائدادوں کا انتظام کورٹ آف وارڈز کرتا ہو اور چاہے ان کے والدین زندہ ہوں، تعلیم حاصل کرتی ہیں - یہاں صوبۂ شمال مغربی اور بنگال کے امرا کی زیادہ تر لڑکیاں آتی ہیں - ان میں ۹ سے لیکر ۱۶ برس کی عمر تک کی لڑکیاں ہوتی ہیں - انہیں اجازت ہے کہ دو خدمتگار اوپر کے کام کے لیے، ایک باورچی اور ایک سائیس اپنے ساتھ لائیں - ہر ایک کو رہنے کے لیے علحدہ کمرہ دیا جاتا ہے اور کھانے پکانے کا کمرہ بھی علحدہ ملتا ہے - جہاں سب لڑکیاں پڑھتی ہیں وہ کمرہ مشترک ہوتا ہے - طالبات میں رتبہ اور دولت کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا - انہیں ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کی مطلق اجازت نہیں ہوتی - بالخصوص کھانے کے بارے میں ہر ایک کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ جس طرح کا چاہے کھانا پکوائے اور کھائے * --

مسٹر کالن براؤننگ (Colin Browning) نے اودھ کی ترقی تعلیم پر جو رپورٹ شائع کی ہے اسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی - اس قابل اور روشن خیال ناظم تعلیمات کا کرنل نسولیز (Nassou Lees) کی طرح یہ خیال ہے کہ مروجہ زبانوں کے ذریعہ اہل ہند کو تعلیم دینا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ انہیں ادھوری انگریزی کے توسط سے پڑھایا جائے - بعض اور دوسرے اعلیٰ انگریزی حکام کا بھی یہی خیال ہے - مجھے

---

* ہندوستان میں ذاتوں کے لحاظ سے کھانے پینے کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے - اس کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے کہ کھانا پکانے والا شخص کون ہے اور برتن کس قسم کے استعمال کیے جاتے ہیں -

یہ دیکھہ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو انگریزوں کو قدیم رومیوں کے مثل تصور کرتے ہیں- رومیوں کا دستور تھا کہ جب اپنے سے کم تہذیب یافتہ قوموں کو زیر کرتے تھے تو انھیں اپنی زبان سیکھنے پر مجبور کرتے تھے- لیکن ان صاحبوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اہل ہند کی زبانیں انگریزی کے مقابلے میں زیادہ مکمل ہیں اور ان کی ادبیات نہایت قدیم ہیں جس کی قدر دانی ہندوستان سے زیادہ اس وقت یورپ میں ہورہی ہے- رومن لوگوں نے اگر اپنی زبان اور تہذیب مفتوح اقوام پر مسلط کی تو یہ ان کی غلطی تھی- رومن جنھیں وحشی خیال کرتے تھے انھوں نے کچھہ عرصے بعد جب انھیں موقع ملا رومن اقتدار کو ملیا میٹ کردیا—

اودھ میں اردو شہروں کی اور ہندی دیہاتوں کی زبان ہے- عام طور پر اردو کے ذریعہ سے یہاں تعلیم دی جاتی ہے- لوگ اس تعلیم سے بالکل مطمئن ہیں- اودھ میں اردو اور فارسی کی بہ نسبت ہندی اور سنسکرت کی زیادہ ہمت افزائی کی جاتی ہے- یہاں اردو کو جو ترجیح حاصل ہے اس کا اس سے اظہار ہوتا ہے کہ سرکاری مدارس کے کل طلبا میں سے ۱۷ ہزار ۹۹ طلبا اردو پڑھتے ہیں اور صرف ۴ ہزار ۹ سو ۲۴ طلبا ہندی پڑھتے ہیں—

کلکتہ یونیورسٹی نے عام احتجاج سے متاثر ہوکر رعایتاً مڈل کلاس کے امتحان رکھے ہیں جو مروجہ زبان میں ہوتے ہیں- یہ امتحان صوبجات شمال مغربی، اودھ اور پنجاب میں ہر سال ماہ اکتوبر میں ہوتے ہیں- ان کے نتائج اب تک قابل اطمینان رہے ہیں- ان کی وجہ سے "اینگلو ورناکلر نارمل اسکول" قایم کیے گئے ہیں جن میں انگریزی زبان کی

تعلیم اختیاری ہے اور خاص توجہ مروجہ زبانوں کی طرف کی جاتی ہے تاکہ عوام الناس تعلیم سے فیض پائیں - "مڈل کلاس" کے امتحان میں ایک مشرقی زبان کے ساتھ انگریزی کا بھی امتحان لیا جاتا ہے - انگریزی کی حیثیت کلاسکی زبانوں کے برابر رکھی گئی ہے - میں سر ولیم میور کی راے سے بالکل متفق ہوں کہ ان مدارس میں ہندستان کی جدید ادبیات کے فروغ کے لیے کوشش کرنی چاہیے تاکہ مغربی اثر سے اس میں جدید خیالات سموے جائیں اور وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے ادب کے دوش بدوش کھڑی ہو سکے —

صوبجات شمال مغربی کی حکومت کی جانب سے ایک مفصل رپورٹ شائع ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۷۰ ع اور سنہ ۱۸۷۱ ع میں طلبا کی تعداد جو زیر تعلیم تھے دو لاکھ چار ہزار ایک سو تین رہی* - مدارس کی تعداد ۸۱۱۸ اور کالجوں کی تعداد ۳ تھی - طلبا میں گیارہ ہزار دو سو تینتالیس لڑکیاں اور باقی لڑکے تھے - گزشتہ سال کے مقابلے میں لڑکوں کی تعداد میں ۵۱۴ کا اضافہ ہوا ہے اور ہمیں پوری توقع ہے کہ ان کی تعداد میں دن بہ دن ترقی ہوتی جائے گی - سرکاری مدارس میں ۲۶۸ طلبا نے فوقانیہ کے نصاب کی تکمیل کی اور اب وہ یونیورسٹی میں داخل ہو سکتے ہیں - آٹھ ہزار چھیالیس طلبا نے سرکاری اور غیر سرکاری مدارس میں اردو اور انگریزی کی کامیابی کے ساتھ تعلیم حاصل کی - صوبجات شمال مغربی کے محکمۂ تعلیمات نے سال مذکور میں ۱۹ لاکھ ۲۹ ہزار چار سو ۹۹ روپے خرچ کیے —

علیگڑھ میں بعض علم دوست حضرات نے عوام کے فائدے کے لیے

* اخبار الاخیار - مورخہ یکم دسمبر سنہ ۱۸۷۱ م -

ایک مدرسہ قایم کیا ہے * - جس مجلس کے زیر نگرانی اس مدرسے کا قیام عمل میں آیا ہے اس کے معتمد منشی درگاہ پرشاد ہیں - موصوف ہندستانی کے عمدہ شاعر ہیں اور شاد تخلص کرتے ہیں —

ضلع کالپی کے ہائی اسکول کی رسم افتتاح ۱۰ فروری سنہ ۱۸۷۲ع کو لفٹننٹ گورنر سر ولیم میور کی صدارت میں منائی گئی - موصوف نے ۳۰ سال قبل اس ضلع کے نظم و نسق کو درست کیا تھا جلسے میں مجلس بلدیہ کے ارکان، ایک نواب اور شہر کے امرا موجود تھے - اس جلسے میں فیض علی نے مجلس بلدیہ کی طرف سے ہندستانی زبان میں سر ولیم کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا - لفٹننٹ گورنر نے اسی زبان میں ایڈریس کا جواب دیا - سر ولیم ہندستانی زبان نہایت صفائی اور فصاحت سے بولتے ہیں - اس اسکول میں انگریزی کے علاوہ عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے گا اور اگر بچوں کے والدین چاہیں تو اپنے بچوں کو ان مضامین کی تعلیم کے لیے داخل کرا سکتے ہیں - ایک علحدہ عمارت میں طلبا کی رہائش کا بھی انتظام کیا جائے گا جو ہندستان میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے † —

یکم اپریل سنہ ۱۸۷۲ ع کو الہ آباد کالج کے کھلنے پر جس کے بانی خود سر ولیم میور ہیں اور یہ کالج انہیں کے نام پر " میور سنٹرل کالج " کہلاتا ہے، سر ولیم نے ہندوستانی زبان میں تقریر کی جس میں طلبا کو نصیحت کی کہ وہ اپنی تعلیم میں جوش اور انہماک سے کام لیں - موصوف نے تعلیم نسواں کی ضرورت کی طرف بھی اشارہ کیا اور بتایا کہ ہندستان

* مدرسۂ مفید خلائق - (علیگڑھ اخبار - مورخۂ ۹ فروری سنۂ ۱۸۷۲ ع) -

† علیگڑھ اخبار مورخۂ ۲۳ فروری سنۂ ۱۸۷۲ ع -

کی معاشری ترقی بغیر اس کے ممکن نہیں - الہ آباد میں جو بنگالی لوگ آباد ہوگئے ہیں ان کی تعریف کی کہ وہ اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلاتے ہیں - موصوف نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ صوبجات شمال مغربی میں مجموعی طور پر تعلیم نسواں نے ترقی نہیں کی * - سر ولیم میور کی تقریر دلپذیر میں مشرقی تشبیہیں اور استعارے بلا تکلف استعمال کیے گئے تھے جن کا دیسی لوگوں پر جنھوں نے یہ تقریر سنی، ضرور اثر ہوا ہوگا -

صوبہ بمبئی کا محکمہ تعلیمات قابل اطمینان طور پر کام کرھا ہے - اس صوبے کے ناظم تعلیمات مسٹر پیل (Peile) نے جو سالانہ رپورٹ پیش کی ہے اس سے اس صوبے کی تعلیمی ترقی کی تفصیلات کا پتہ چلتا ہے - یہ رپورٹ ٥٠٠ صفات پر مشتمل ہے - اس کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ صوبۂ بمبئی میں ہندوستانی کے دس مدرسے ہیں اور مرہٹی مدارس میں چار مقامات پر ہندوستانی زبان کی جماعتوں کا انتظام کیا گیا ہے - جن میں تقریباً ٧٠٠ طلباء ہندوستانی پڑھتے ہیں - پونا کے نارمل اسکول میں بھی ہندوستانی زبان کی علیحدہ جماعت کھول دی گئی ہے جس میں گیارہ طالب علم شریک ہیں - خاندیس میں ہندوستانی کی تعلیم کے لیے ١٨ جماعتیں اور احمدآباد کے ضلع میں ٤ جماعتیں علیحدہ قایم کی گئی ہیں † —

سنہ ١٨٧١ ع کے آخیر میں بمبئی یونیورسٹی کے شعبۂ فنون میں میٹرک کے امتحان میں ٥٨ طلباء شریک ہوے جن میں سے ١٤ کامیاب ہوے -

---

* Allen's Indian Mail مورخہ ٨ جون سنہ ١٨٧٢ ع -

† رپورٹ محکمۂ تعلیمات صوبۂ بمبئی بابتہ سنہ ١٨٧١ ع -

ان کامیاب طلبا میں دس ہندو ، دو عیسائی ، ایک مسلمان اور ایک پارسی تھے - ملکی زبان کے امتحان میں ۱۳۴ امیدوار شریک ہوے جن میں سے ۴۲ کامیاب ہوے - سول انجینرنگ کے امتحان میں ۱۲ کامیاب ہوے جن میں ۹ ہندو اور ۳ پارسی تھے * -

لاہور کے ماہوار رسالے "اتالیق پنجاب" میں صوبجات متوسط کے صدر مہتمم تعلیمات مسٹر ولموت کی رپورٹ بابتہ سنہ ۱۸۷۱ ع شائع ہوئی ہے - یہ پہلی رپورٹ ہے جو مسٹر ولموت نے حکومت کے سامنے پیش کی ہے - موصوف نے رپورٹ میں شکایت کی ہے کہ بعض ناظر مدارس جب دورے پر جاتے ہیں تو اپنے فرائض کو کما حقہ پورا نہیں کرتے - یہ دورے گویا ان کے لیے سیر تفریح کے مواقع بہم پہنچاتے ہیں - ایسی مثالیں ہمیں یورپ میں بھی ملیں گی - موصوف نے بعض مدرسین کے طریقۂ تعلیم کی بھی شکایت کی ہے اور خواہش ظاہر کی ہے کہ نارمل اسکولوں میں صرف ان نوجوانوں کو شریک کرنا چاہیے جو تعلیم و تعلم سے خاص لگاؤ رکھتے ہوں اور صحیح معنوں میں تحصیل علم کے جویا ہوں نہ کہ طوطے کی طرح عبارتوں کو یاد کرنے کے خوگر ہوں - اس رپورٹ کو پڑھنے سے آدمی محسوس کرتا ہے مسٹر ولموت اپنے فرض منصبی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھی اور ماتحت افسر بھی انھیں کی طرح فرض شناسی سے کام کریں -

اہل ہند اور یورپینوں کے باہم ملنے جلنے سے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں علمی اور ادبی انجمنیں قائم ہوگئی ہیں اور ان

---

* Allen's Indian Mail مورخہ ۹ جنوری سنہ ۱۸۷۲ ع -

میں سے بعض نے خاص اہمیت حاصل کرلی ہے * - میں لاہور ' علیگڑھ لکھنؤ ' مرزاپور اور کلکتہ کی انجمنوں کے متعلق پہلے ذکر کر چکا ہوں - لاہور کی انجمن کے متعلق پنڈت شیوناتھ نارائن معتمد انجمن تہذیب ' لکھنؤ نے جو اس کے خاص جلسے میں شریک ہوئے تھے مندرجہ ذیل رائے ظاہر کی ہے :- " اس انجمن کی مساعی سے بعض نہایت اہم نتائج برآمد ہوئے ہیں اور اس کے ذریعہ سے ترقی کی بہت سی راہیں کھل گئی ہیں - یہ انجمن دوسری انجمنوں کے لئے بطور نمونہ ہے - اگر چہ اس انجمن کے پیش نظر خالص علمی مقاصد ہیں لیکن وہ اقتصادی اور معاشرتی مسائل سے بھی دلچسپی رکھتی ہے اور ان کے متعلق اپنی رائے سے کھلم کھلا حکومت ہند اور حکومت پنجاب کو مطلع کرتی رہتی ہے - یہ انجمن خاص طور پر محکمۂ تعلیمات کو تعلیم عامہ کے متعلق اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہتی ہے - "

انجمن لاہور ہر قسم کے مسائل کے متعلق معلوم ہوتا ہے اپنی رائے کا اظہار کرتی ہے - مثلاً جالندھر کے مددگار سپرنٹنڈنٹ سید ہادی حسین نے انجمن سے دریافت کیا ہے کہ وہ اپنے خطابات کو جو انہیں حکومت نے عطا کیے ہیں ' نام کے ساتھ کس طرح لکھا کریں - چنانچہ انجمن نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر نام کے شروع میں پہلے سے خان موجود نہ ہو تو " خان " کے خطاب کو نام کے بعد میں رکھا جائے اور " بہادر " اس کے بعد آئے -

---

* ان انجمنوں میں راج کوٹ کی انجمن قابل ذکر ہے جو کاٹھیاواڑ کے امرا نے قایم کی ہے - حاجی پور میں مراد علی نے ایک انجمن قایم کی ہے جس کا نام " انجمن تہذیب اخلاق " ہے - مراد علی بڑے جوشیلے مسلمان ہیں اور اصلاحی کاموں میں بہت حصہ لیتے ہیں - ایک انجمن چندر گڑھ میں قایم ہوئی ہے - اس انجمن کے زیر انتظام پنڈت گوپی ناتھ نے سائنس کے فوائد پر ابھی حال میں تقریر کی تھی —

اور اگر خان پہلے سے نام کے شروع میں موجود ہو تو نام کے آخر میں " بہادر " لکھنا کافی ہوگا - " رائے " کا خطاب ہمیشہ نام کے شروع میں آنا چاہیے —

انجمن لاہور کے صدر ڈاکٹر لیٹنر نے گزشتہ جلسے میں اعلان کیا کہ چونکہ وہ راولپنڈی اور گجرات کے حلقے کے مہتمم تعلیمات مقرر ہوئے ہیں اور ان کی جگہ مسٹر پیرسن مقرر کیے گئے ہیں اس لیے مناسب ہوگا اگر ثانی الذکر کو انجمن کا صدر مقرر کیا جائے - اگرچہ ارکان انجمن اور معتمدین کو ڈاکٹر لیٹنر کی جدائی کا افسوس تھا لیکن انھوں نے اس تجویز کو منظور کر لیا - ڈاکٹر لیٹنر نے جو انجمن کی خدمت کی ہے وہ ناقابل فراموش ہے - انجمن صاحب موصوف کو ہمیشہ اپنا ہمدرد اور بہی خواہ سمجھے گی - ڈاکٹر لیٹنر اپنے علم و فضل کے ساتھ اہل ہند کی ہمدردی کے لیے بجا طور پر شہرت رکھتے ہیں - ممدوح نے راولپنڈی میں جیسا کہ بعد کی اطلاعوں سے معلوم ہوتا ہے ' اپنا کام جوش و خروش کے ساتھ شروع کر دیا ہے اور لوگ ان کے کام سے بہت مطمئن ہیں * —

علیگڑھ سوسائٹی نے اپنے گزشتہ اجلاس مورخہ ۴ مارچ سنہ ۱۸۷۲ ع کو اُن تصانیف کے متعلق فیصلہ کیا جو ناظم تعلیمات کی طرف سے انعامات کے تعین کے لیے اس کے سامنے پیش کی گئی تھیں - یہ انجمن لاہور کی انجمن کی طرح برابر کام کیے جا رہی ہے اور اس کا دلچسپ اخبار بدستور نکل رہا ہے - تمام تصانیف پر غور کرنے کے بعد مولوی رحیم بخش کی تصنیف " حدیقۂ وصال " کو اول انعام کے لائق سمجھا گیا - اس کے

* اخبار انجمن پنجاب - مورخہ ۲ جولائی سنہ ۱۸۷۲ ع ؛ علیگڑھ اخبار مورخہ ۲ فروری سنہ ۱۸۷۲ ع -

علاوہ چھ اور دوسری تصانیف بھی انعام کے قابل سمجھی گئیں —

" علیگڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن " کی شاخ کا ایک جلسہ ۱۰ فروری سنہ ۱۸۷۲ ع کو " سائنٹفک سوسائٹی " کے ہال میں منعقد ہوا - اس جلسے میں ایسوسی ایشن مذکور کے ارکان کے علاوہ " سائنٹفک سوسائٹی " اور " ریفارم لیگ " کے ارکان نے اور شہر کے امرا نے شرکت کی - مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ برھمو سماج کے قائدین اور بعض انجمنوں کے اصرار پر حکومت نے سول شادی (میرج) کی موافقت میں جو مسودہ قانون پیش کیا ہے وہ کس حد تک قابل قبول ہے - حکومت کے مسودہ قانون کو عام طور پر ہندوستانیوں نے بنظر استحسان نہیں دیکھا اور بعض برھمو سماج کے حامیوں کو بھی وہ پسند نہیں ہے - " علیگڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن " کے ایک جلسے منعقدہ ۲۲ فروری سنہ ۱۸۷۲ ع میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ وائسرائے گورنر جنرل سے ایک معروضہ کے ذریعہ استدعا کی جائے کہ وہ اس مسودہ قانون کی ان دفعات کو منسوخ کردے جو ایسوسی ایشن کے ارکان کے نزدیک سیاسی ، اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے قابل اعتراض ہیں - یہ واضح رہے کہ ایسوسی ایشن کے ارکان میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہیں - یہ جلسہ بدری پرشاد کی صدارت میں منعقد ہوا تھا - راجہ جے کشن داس معتمد اور بعض دوسرے ارکان نے اس موقع پر تقاریر کی تھیں اور اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ان خطرات کو واضح کیا تھا جو اس مسودہ قانون کے منظور ہونے سے پیدا ہوں گے - اس ضمن میں جو بحث ہوئی وہ حد درجہ دلچسپ ہے - اس کی تفصیل " علیگڑھ اخبار " مورخہ ۸ مارچ میں ۱۵ کالموں میں درج ہے - بالآخر جلسے میں جو قرار داد منظور

کی گئی اس کی نقل وائسرائے کو بھیج دی گئی * - لیکن مجلس وضع قوانین میں مسودہ قانون منظور کر لیا گیا - اب تک یہ قانون نافذ نہیں ہوا ہے اس لیے کہ انڈیا آفس کی منظوری کا انتظار ہے - میرا خیال ہے کہ ڈیوک آف آرگل جو آج کل وزیر ہند ہیں ابھی تھوڑے دن گزرنے دیں گے تاکہ اس قانون کے خلاف جو احتجاج ہو رہا ہے وہ کم ہو اور پھر اس کے بعد اسے نافذ کیا جائے —

مدراس میں دو سو ہندوؤں کا ایک جلسہ ۲۳ اپریل کو منعقد ہوا جس میں مذکورہ بالا قانون کے متعلق اظہار ناخوشی کیا گیا - جلسے نے اس قانون کے نافذ ہونے کے خلاف جو قرار داد منظور کی اس کا خلاصہ وزیر ہند کو بذریعہ تار روانہ کر دیا گیا اور اس سے درخواست کی گئی ہے کہ پوری قرار داد کے پہنچنے تک وہ کوئی قطعی تصفیہ نہ کرے † —

بٹالہ (پنجاب) میں ایک ادبی انجمن لاہور اور علیگڑھ کی انجمن کے طرز پر قایم کی گئی ہے - اس انجمن کا ایک اخبار بھی نکلتا ہے جس کے مدیر لکشمی سہائے ہیں جو انجمن کے معتمد بھی ہیں - اس قسم کی ایک انجمن جس کے پیش نظر ادبی اور معاشری ترقی ہے گونڈہ (اودھ) میں قایم ہوئی ہے - اس کے لیے ۴ ہزار ۸۹ روپے بطور چندہ جمع ہوگئے ہیں —

علیگڑھ کی "انجمن تہذیب" سائنٹفک سوسائٹی سے مختلف ہے - اس کا علحدہ اخبار بدستور جاری ہے - ان دونوں انجمنوں کے بانی سید احمد خاں ہیں -

بہار کی سائنٹفک سوسائٹی کا ایک عام جلسہ گزشتہ فروری میں مظفرپور میں منعقد ہوا تھا - اس جلسے میں تقریباً دو ہزار اشخاص

---

* اس قرار داد کی نقل "علیگڑھ اخبار مورخہ ۲۲ مارچ سنہ ۱۸۷۲ ء میں شائع ہوئی ہے —

† Allen's Indian Mail - مورخہ ۲۰ مارچ سنہ ۱۸۷۲ ء —

نے شرکت کی اس انجمن کی جانب سے جو مدرسہ قایم ہے اس کے طلبا کو پہلے انعامات تقسیم کیے گئے - اس کے بعد انجمن کے معتمد مولوی امداد علی خاں نے اپنے ایک مختصر اور برجستہ خطبے میں ان تمام کارروائیوں کا ذکر کیا جو انجمن کے زیر انصرام سر انجام پائیں اور جو انجمن کے مقاصد میں شامل تھیں - یہ خطبہ نہایت سلیس زبان میں تھا - مولوی امداد علی خاں کا مظفرپور میں یہ آخری خطبہ تھا اس لیے کہ بعد میں ان کا تبادلہ گیا ہو گیا ممدوح نے 'صاحب گنج' میں مظفرپور والی انجمن کی ایک شاخ قائم کی جس کے دستور کی تفصیل "اخبار الاخیار" میں شائع ہو چکی ہے —

مولوی امداد علی خاں نے مظفرپور کی سائنٹفک سوسائٹی کے سامنے جو خطبہ پڑھا اس میں پابند مذہب مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ اہل یورپ کے سائنٹفک علوم کو ہندوستانی یا کسی اور دیسی زبان میں منتقل کرنے میں کوئی بات مذہب کے خلاف نہیں تصور کرنی چاہیے - مسلمانوں کو انگریزی زبان سیکھنی چاہیے اس واسطے کہ اس زبان کے ذریعہ سے ان کے ہاتھ میں علوم کے خزانے کی کنجی آجائے گی - اس کے بعد موصوف نے ان کتابوں کی تفصیل بیان کی جن کے ترجمے ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں - پھر ان مدرسوں کا ذکر کیا جو انجمن کے زیر انصرام قایم کیے گئے ہیں اور ان طلبا کا حال بیان کیا جنھوں نے کامیابی حاصل اور کلکتہ یونیورسٹی میں شریک ہوئے اور انگریزی کے امتحانات میں ممتاز رہے - آخر میں انجمن کی آمدنی اور اخراجات کے گوشوارے پیش کیے گئے * —

* اخبار انجمن پنجاب ' مورخہ یکم مارچ سنہ ۱۸۷۲ م -

نینی تال کا انسٹیٹیوٹ اپنا کام خوب اچھی طرح کر رہا ہے - اس کے پیش نظر خاص کر زراعت کی ترقی کے لیے وسائل اختیار کرنا ہے - ہندوستان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ زراعت ہے - انسٹیٹیوٹ کی طرف سے ایسے مدارس قایم کیے جا رہے ہیں جہاں زراعت کے اصول سکھائے جائیں تاکہ ملک کی زرعی پیداوار میں اضافہ ہو * —

" پنجاب ریفارم ایسوسی ایشن " کا مرکز بھی لاہور ہے - یہ انجمن بھی اچھی طرح سے چل رہی ہے † —

" اسلامک سوسائٹی " کا سالانہ جلسہ گزشتہ جنوری میں منعقد ہوا - اس میں شاہ سیام ، وانسرائے ہند اور متعدد امرا اور انگریز حکام نے شرکت کی - مولوی عبداللطیف خاں معتمد اسلامک سوسائٹی نے جو انتظامات کیے ان کی وجہ سے اس جلسے کی بہت شہرت ہوئی ‡ —

کلکتہ کے اسلامیہ کالج کی انجمن مباحثہ کا چھٹا سالانہ جلسہ گزشتہ اگست کی ۳ تاریخ کو منعقد ہوا - جلسے کی صدارت پروفیسر بلوخ مان (Blochmann) نے کی - سالانہ رپورٹ پڑھے جانے کے بعد ریورنڈ ڈاکٹر مرے مچل نے رسول اکرم کے بعد سے اس وقت تک کی اسلامی تاریخ پر تبصرہ کیا اور خاص طور پر مسلمانان ہند کی موجودہ حالت کو اجاگر کر کے بتایا - اس کے بعد اصول اسلام کے متعلق بحث شروع ہوئی - ایک نوجوان مقرر نے اپنی تقریر کے دوران میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن میں جنت کا ذکر بطور تمثیل ہے - جس طرح عیسائیوں کو مرنے

---

* علیگڑھ اخبار مورخہ ۲۶ جنوری سنہ ۱۸۷۲ م —

† اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۱۶ اگست سنہ ۱۸۷۲ م —

‡ علیگڑھ اخبار مورخہ ۴ اکتوبر سنہ ۱۸۷۲ م —

کے بعد روحانی خوشیوں کا وعدہ کیا گیا ہے اس طرح جنت کی لذتیں روحانی ہوں گی نہ کہ مادی * —

نیشنل ایسوسی ایشن کی ایک نئی شاخ لیڈز (Leeds) میں قائم ہوئی ہے - اس کا مقصد یہ ہے کہ اہل ہند کی معاشری ترقی کی تدابیر اختیار کرے - اس کی بانی مس کارپنٹر ہیں جن سے مجھے اس وقت شرف ملاقات حاصل ہوا جب کہ موصوفہ بمبئی جاتے ہوئے پیرس سے گزری تھیں - اس ایسوسی ایشن کی شاخیں پہلے سے لندن ، برسٹل برمنگھم ، مانچسٹر ، اڈنبرا ، گلاسگو اور شفیلڈ میں موجود ہیں - ہمیں امید ہے کہ انگلستان کے اور دوسرے شہروں میں بھی اس کی شاخیں قایم ہو جائیں گی - لیڈز کی شاخ ریورنڈ جے ای کارپنٹر کی سربراہی میں نہایت مفید کام کر رہی ہے - اس کا تعلق علیگڑھ کے سائنٹفک انسٹیٹوٹ کے ساتھ قائم ہوگیا ہے —

ہندستان کے موجودہ حالات میں علمی ادبی انجمنوں کو اتنی اہمیت نہیں حاصل ہے جتنی کہ اصلاح معاشرہ کی انجمنوں کو ہے جو ایک طرح سے مذہب سے بھی تعلق رکھتی ہیں - اس لیے برھمو سماج کو ہمیں خاص اہمیت دینی چاہیے - اس سال ١٤ فروری چہار شنبہ کے روز بابو کیشب چندر سین نے کلکتے میں اپنا سالانہ خطبہ پڑھا - جس جلسے میں یہ خطبہ پڑھا گیا اس میں ہزاروں اشخاص شریک تھے جن میں انگریز بھی کافی تعداد میں تھے - "اخبار انجمن پنجاب" کے مدیر نے اپنے اخبار کی ١٦ فروری کی اشاعت میں اس ضمن میں لکھا

---

* The Friend of India - مورخہ ٨ اگست سنہ ١٨٧٢ ء -

ہے کہ "ان کے (کیشب چندر سین کے) خطبے اس قدر دلپذیر ہوتے ہیں اور وہ اپنے دلائل سے اس قدر اچھا اثر پیدا کرتے ہیں کہ ان کی تقریر سننے والا ان کے عقاید کی برتری کا قائل ہوجاتا ہے اور ان کی شخصیت کی عظمت کا سکہ اس کے دل پر بیٹھ جاتا ہے - ان کی ذات سارے ہندستان اور خاص طور پر بنگال کے لیے مایۂ صد افتخار ہے - ان کے عقاید میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ وہ ذات پات کو بالکل مٹانے کے موید نہیں ہیں - ان کا خیال ہے کہ اگر ایسا کیا گیا تو ہندو جاتی درہم برہم ہوجائے گی - کیشب چندر سین کا خیال ہے کہ ذات پات کی بدولت عوام کے اخلاق اور ہندو امارت کا قیام ممکن ہوا - ہم نے یہ کہتے سنا ہے کہ برہمو سماجی اپنے طور پر خدا کی وحدانیت میں یقین رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سارے ہندوستان میں خدا کی وحدانیت کو تسلیم کیا جائے - لیکن وہ ہندو سماج کو مٹانا نہیں چاہتے بلکہ نئی بنیادوں پر اس کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں - کنٹر بری کے اسقف اعظم اور ریورنڈ ڈاکٹر ٹیٹ (Tait) نے ٹھیک کہا کہ برہمو سماج ہندو دھرم سے بھی زیادہ بت پرستی کی طرف لے جانے والی تحریک ہے *—

" برٹش انڈین ایسوسی ایشن " کو برہمو سماج کے ساتھ خلط ملط نہ کرنا چاہیے - یہ انجمن بت پرستی کی بالکل مخالف تو نہیں ہے - ہاں' اس کے ارکان یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ہندوؤں کے مندروں میں جس بے حیائی اور عریانی کا مظاہرہ ہوتا ہے اس کو روکا جاے - اس انجمن کے ایک اجلاس میں جو کلکتہ میں منعقد ہوا تھا بابو راجندر لال متر

---

* یہ ترجمہ فرانسیسی عبارت سے کیا گیا ہے - (مترجم) - اس سلسلے میں ملاحظہ ہو لندن ٹائمز کا خط جو ۲ ستمبر سنہ ۱۸۲۲ ء کو شائع ہوا -

نے جو مشہور عالم اور ماہر آثار قدیمہ ہیں، اس قسم کی تجاویز کی مخالفت کی اس لیے کہ اگر ہندو دھرم کی خارجی نشانیوں کو مٹادیا گیا تو خود ہندو دھرم مٹ جائے گا اور عوام کے مذہب کو سخت ٹھیس لگے گی۔ ہمیں انگریزی حکومت کی اس باب میں تقلید کرنی چاہیے جس نے مذہب کی پوری آزادی دے رکھی ہے۔ اگر عوام کے معاملات میں دخل اندازی کا یہی حال رہا تو کل یہ کہا جائے گا کہ فقیر سنیاسی ننگے نہ پھریں اور بچے بھی گھر سے باہر نکلیں تو اسی طرح کپڑے پہنے ہوے ہوں جس طرح یورپ میں ہوتے ہیں۔ انگریزی حکومت نے اس معاملے میں اہل ہند کو پوری آزادی دے رکھی ہے۔ وہ اس وقت تک دخل اندازی نہیں کرتی جب تک کہ کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جو فطری قانون کے بالکل ہی خلاف ہو۔ اس ضمن میں میں "نسیم جونپور" کا ایک اقتباس اس جگہ نقل کرتا ہوں:- "ابھی حال ہی میں بنارس میں ایک فقیر ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا کہ وہ نہ ہلتا ہے، نہ حرکت کرتا ہے۔ لوگوں کو اس سے عقیدت پیدا ہوئی اور ایک رسی کے ذریعہ سے جو درخت پر باندھ دی گئی تھی اسے کھانے پینے کی چیزیں اوپر چڑھانے لگے" *۔ انگریزی حکومت اس قسم کے فقیروں کو جو ان کا جی چاہے کرنے دیتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے یورپ میں بھی بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جنھیں دانش مند لوگ معیوب سمجھتے ہیں لیکن حکومتیں انھیں منع نہیں کرتیں —

برہمو سماج کی سب سے قدیم شاخ "ادی سماج" ہے۔ یہ اپنے مخصوص

* یہ ترجمہ فرانسیسی عبارت سے کیا گیا ہے (مترجم)۔

انداز میں هندو دھرم کی تاویل پیش کرتی ھے - کلکتہ کی نیشنل سوسائٹی کے ایک جلسے میں اس شاخ کے ایک سرگرم رکن بابو راج نارائن بوس نے ''ادی سماج'' کے اصول پر تقریر کی - موصوف نے بارہ دلائل پیش کیے جن کی بنا پر هندو دھرم کی دنیا کے دوسرے مذاهب کے مقابلے میں فضیلت ثابت هوتی ھے - ان دلائل میں سے بعض ایسے هیں جنهیں سن کر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ھے کہ بابو صاحب کو دوسرے مذاهب کا علم بہت کم ھے - بابو صاحب کے دلائل یہ هیں - (۱) هندو دھرم کسی ایک شخص کے نام کے ساتھ وابستہ نہیں ھے جیسا کہ دوسرے مذاهب میں ھے - اس لیے یہ بہ نسبت دوسرے مذاهب کے زیادہ عالمگیر مذهب هونے کی صلاحیت رکھتا ھے - (۲) هندو دھرم میں پرستش کرنے والے اور جس شئے کی پرستش کی جاے کوئی واسطہ نہیں هوتا - هندو براہ راست شیو وشنو یا درگا کی پوجا کرتے هیں اور انهیں اپنا معبود حقیقی سمجھتے هیں- (۳) هندو دھرم میں خدا اصل روح ھے جو انسان کی ذات سے بالکل قریب ھے اور انسان اس کے نزدیک محبوب ھے - اپنشدوں کے زمانے سے لے کر آج تک هندو دھرم میں یہ تخیلات ملیں گے - (۴) انسان باوجود اپنی دنیاوی زندگی کے خدا کی ذات میں ضم هوسکتا ھے - (۵) دوسرے مذاهب میں نیکی کی تعلیم کے عوض ابدی مسرت کے وعدے کیے گئے هیں حالانکہ هندو دھرم میں نیکی نیکی کی خاطر اور خدا کی پرستش خدا کی خاطر کی جاتی ھے - (۶) دوسرے مذاهب میں صرف انسانوں پر رحم کرنے کا حکم ھے حالانکہ هندو دھرم میں تمام زندہ مخلوق کے ساتھ رحم کرنے کا حکم ھے - (۷) هندو دھرم میں آخرت کا جو تصور پیش کیا گیا ھے وہ اس سے اعلیٰ ھے جو دوسرے مذاهب میں پیش کیا گیا

ہے - ہندو دھرم میں تناسخ کے ذریعہ گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے حالانکہ مسیحیت اور اسلام میں جو جہنم میں جائے گا وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا - آخرت کی زندگی کا جو تصور ہندو دھرم میں ہے وہ انسان کی اس ترقی کا ضامن ہے جو وہ دنیا میں کر سکتا ہے - (۸) ہندو دھرم دوسرے مذہبوں کے ساتھ روا داری کا سلوک کرتا اور ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب کی پیروی کر کے نجات حاصل کر سکتا ہے - (۹) ہندو دھرم میں ایسے عقاید بھی قابل قبول ہیں جو ان لوگوں کے لیے ہوتے ہیں جن کی ذہنی تربیت کافی طور پر نہیں ہوئی ہے - پیشتر اس کے کہ وہ اعلیٰ عقاید تک پہنچیں انہیں ادنیٰ درجے کے عقاید کی منزل سے گزرنا ضرور ہے، یہاں تک کہ آخر میں ہر شخص ذات الوہیت کا جزو بن سکتا ہے - (۱۰) ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ مذہب زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے - چنانچہ یہ کہنا درست ہوگا کہ "ہندو کا کھانا، پینا رہنا سہنا اور سونا مذہب کے مطابق ہوا کرتا ہے" - (۱۱) ہندو دھرم کے مطابق سائنس، سول دستور اور معیشت کے ہر مسئلہ کی توجیہہ ممکن ہے اس لیے کہ وہ مذہب کے اثر کو زندگی کے ہر گوشے پر مسلط کر دیتا ہے - (۱۲) ہندو دھرم انسان کا قدیم ترین مذہب ہے - وہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مذہب فطرت انسانی کی مستقل بنیادوں پر قائم ہے *-"

کوکا لوگوں نے جو علم بغاوت بلند کر دیا ہے اس کی وجہ سے پبلک اس فرقے کے معاملات میں دلچسپی لے رہی ہے - اس فرقے کے بعض افراد پر

* Allen's Indian Mail مورخہ ۲۸ اکتوبر سنہ ۱۸۸۲ م -

جو مظالم کیے گئے ہیں اور ان کو طرح طرح سے جو اذیتیں دی گئی ہیں۔ اس کے خلاف حکومت کارروائی کر رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس فرقے کے متعلق یہاں کچھ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ بابو کاشی ناتھ نے "علیگڑھ اخبار" مورخہ ۳ مئی سنہ ۱۸۷۲ ع میں اس فرقے کے متعلق جو کچھ لکھا اُس کی معلومات کا ماخذ ایک جوگی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"یہ فرقہ صرف چھ سات سال ہوے وجود میں آیا ہے۔ اس کے بانی کا نام گرو رام سنگھ ہے جو آج کل الہ آباد میں قید ہے۔ گرو رام سنگھ کے پیرو 'کوکا' اس لیے کہلاتے ہیں کہ یہ اپنی عبادت میں 'کوک' کا لفظ بہت استعمال کرتے ہیں۔ اس فرقے میں زیادہ تر بڑھئی' لوہار اور معمار لوگ شامل ہیں جو پنجاب کے جنوب مغرب میں آباد ہیں۔ اس پر تعجب ہوتا ہے کہ ایک ادنیٰ شخص نے اتنی تھوڑے عرصے میں اس قدر اثر پیدا کر لیا ہے اور اچھی خاصی تعداد کو اپنے فرقے میں داخل کرلیا ہے۔ حالانکہ مسیحی مبلغین کو باوجود انتہائی مشقت کے نسبتاً بہت کم کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان نیکی کے مقابلے میں بدی کی جانب جلد راغب ہوجاتا ہے۔ 'کوکا' لوگ دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔ وہ سکھوں کے بھی دوست نہیں ہیں اگرچہ گرو گوبند سنگھ کو وہ مانتے ہیں اور گرنتھ کو مقدس کتاب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ امرتسر کے بڑے مندر کے نیگہبان 'کوکا' لوگوں کو اندر نہیں جانے دیتے۔ اس لیے کہ 'کوکا' لوگوں نے نہ صرف مساجد کو بلکہ بعض جگہ دھرم شالوں اور پگوڈوں کو بھی مسمار کر ڈالا ہے۔ انہیں پورا یقین ہے کہ ان کا فرقہ کچھ عرصے بعد سارے ہندستان میں حاوی ہوجاے گا اور دوسرے مذاہب پر اسے فوقیت حاصل

هو جائے گی - 'کوکا' لوگوں میں ذات پات کی تقسیم نہیں ہوتی - نہ وہ برہمنوں کی عزت کرتے ہیں - ہندوؤں کی مقدس جاتراؤں' دریاؤں سنگموں اور گئو ماتا کا ان کے نزدیک احترام ضروری نہیں ہے - گرونانک نے اپنی تعلیم میں ہندو دھرم کے جو تھوڑے بہت عناصر باقی رکھے تھے انہیں بھی کوکا فرقے نے نکال پھینکا - چنانچہ اس بنا پر یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ سکھوں سے علحدہ ہیں - لیکن ان میں اور سکھوں میں سلام کا طریقہ ایک ہی ہے یعنی دونوں " اکال پرش " کے الفاظ استعمال کرتے ہیں -

" کوکا لوگ عام طور پر مہمان نواز ہوتے ہیں اور آپس میں مل جل کر محبت سے رہتے سہتے ہیں - ان میں بغاوت کی آگ مشتعل کرنے والے چند ڈاکو ہیں جو بدامنی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں - اس فرقے کے اکثر لوگ امن پسند پیشہ ور ہیں جو بغاوت کو پسند نہیں کرتے - ۴۹ باغیوں کو بغیر عدالتی کارروائی کے جو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اس سے نہ صرف اس فرقہ کے افراد میں بلکہ سارے ہندوستان میں سنسنی پھیل گئی ہے - کوکا لوگوں کی عادات سادہ ہوتی ہیں - ہندوؤں کی طرح بچوں کے پیدا ہونے اور شادی اور موت کے موقع پر بھی یہ رسوم کی پابندی نہیں کرتے - ان رسوم کے لیے کوئی خاندانی پروہت نہیں طلب کیا جاتا جو شاستروں کے مطابق رسوم بجالائے - کوکا لوگ اپنے مُردوں کے متعلق بھی کوئی مقرر قاعدے نہیں رکھتے - ان میں سے بعض اپنے مردوں کو مسلمانوں کی طرح دفن کرتے ہیں ' بعض ہندوؤں کی طرح جلاتے اور بعض پارسیوں کی طرح ہوا اور دھوپ میں چھوڑ

دیکھے ھیں * — "

سب سے پہلے علمائے دینیات نے یورپ میں مشرقی سامی زبانوں کی تحقیق کی طرف توجہ کی ۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح انجیل مقدس کے خاص خاص محاوروں اور ان رسوم و روایات کا پتہ لگایا جائے جن کی نسبت اس میں ذکر ملتا ہے ۔ چونکہ یہ رسوم یورپ کے رواجوں سے بالکل مختلف ھیں اس لیے سامی زبانوں کا کھوج لگایا گیا تاکہ ان کی اھمیت واضح ھوسکے - بہ نسبت کیتھولکوں کے پروٹسٹنٹوں نے مشرقی زبانوں کی تحقیق میں زیادہ کام کیا اس لیے ان کے عقاید تمام تر انجیل مقدس ھی پر مبنی تھے - چنانچہ مشرقی زبانوں کے متعلق انگلستان ' ھالینڈ ' جرمنی ' ناروے اور سویڈن میں بہ نسبت فرانس کے زیادہ کام کیا گیا - مشرقی زبانوں کی تحقیق سے انجیل مقدس کے سمجھنے میں جو مدد ملی ہے اُسے ریورنڈ جیمز لانگ (James Long) نے تسلیم کیا ہے ۔ ! موصوف نے اپنی تصنیف میں ان استعاروں کا ذکر کیا ھے جو انجیل میں ملتے ھیں اور پھر ان کا مقابلہ ھندوستانی (اردو) ' عربی ' فارسی ' بنگالی اور اسی کے محاوروں اور استعاروں سے کیا ھے - یہ کتاب اس قدر دلچسپ ھے کہ میں اس کے اکثر حصوں کو یہاں نقل کرسکتا ھوں لیکن چونکہ ایسا کرنا طوالت کا باعث ھوگا اس واسطے میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گا - مصنف نے اس کتاب کے تیار کرنے میں بہت جاں فشانی کی ھے اور تبحر علمی کا ثبوت دیا ھے - اور یہ سب کچھ صرف اس لیے کہ مسیحیت کی خدمت ھو سکے —

---

* میئر نے اپنے سنہ ۱۸۷۱ ع کے مقالے میں بھی اُن کے متعلق ضمنی طور پر ذکر کیا تھا۔

† ملاحظہ ھو ممدوح کی تصنیف " Scriptural Truth in Oriental dress " کلکتہ ' سنہ ۱۸۷۱ ع —

اس کتاب میں بعض ایسی رسوم کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جن کے متعلق انجیل میں بھی ذکر ملتا ہے - مثلاً انجیل میں "کھاری سمندر" کا ذکر ملتا ہے (یم ھملح) اسی طرح جیسے عربی میں بحر اور فارسی میں دریا کہتے ہیں - اور اگر کھلے سمندر سے مقصد ہوتا ہے تو عربی میں مالح اور فارسی میں شور کا لفظ بڑھا دیا جاتا ہے - حضرت موسیٰ نے جب مقدس سر زمین پر قدم رکھا تو اپنے جوتے اتار دیے - مشرق میں اب بھی یہ دستور موجود ہے کہ مسجد میں لوگ جوتے اتار کر جاتے ہیں - عربوں میں "نمک" وفاداری کے خیال کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور انجیل میں بھی یہی خیال اسی محاورہ سے ادا کیا گیا ہے - انجیل میں اس خیال کو ظاہر کرنے کے لیے کہ "تم مجھے جانتے ہو" یہ محاورہ استعمال کیا گیا ہے - "تم میرا بیٹھنا اور اٹھنا جانتے ہو" - فارسی میں بالکل یہی محاورہ استعمال کرتے ہیں - انجیل میں مطلع صاف ہونے کے لیے یہ محاورہ استعمال ہوا ہے - "آسمان کھل گئے" - بالکل یہی محاورہ ھندوستانی زبان میں بھی مستعمل ہے - انجیل میں ہے کہ "زندگی کا دروازہ چھوٹا ہے اور جو راستہ اُس کو جاتا ہے وہ تنگ ہے" - یہی خیال یجروید میں بھی پیش کیا گیا ہے اور مسلمانوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ ہے کہ جنت کا راستہ پل صراط پر سے ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے - انجیل میں دو عورتوں کا ذکر ہے جو چکی میں گیہوں پیس رہی ہیں - مشرقی ممالک میں یہ رواج ہمیشہ سے موجود رہا ہے اور اب بھی موجود ہے - مشرق میں چکی میں گیہوں اسی طرح سے پیستے ہیں جیسے ہمارے یہاں قہوہ یا کالی مرچ پیسی جاتی ہے - انجیل میں مختلف مقامات

پر مذکور ہے کہ حضرت مسیح اور ان کے حواری خانۂ خدا میں جا کر تلقین کرتے تھے - لیکن وہ آخر کس طرح تلقین کرسکتے تھے جب کہ انہیں ستانے والے موجود تھے - مسلمانوں میں اب بھی یہ طریقہ رائج ہے کہ مسجد ہر ایک کے لیے کھلی ہوتی ہے - بغیر رکاوٹ کے اس میں ہر مسلمان داخل ہو سکتا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے - حضرت مسیح اور حواریوں نے بھی یہی کیا ہوگا کہ چونکہ خانۂ خدا میں ہر شخص جاکر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے انہوں نے بھی بلا روک ٹوک اپنی تعلیم کی اس طرح تلقین کی ہوگی - انجیل میں ہے کہ خدا کے نیک بندوں کی پیشانی پر خدا کا نام لکھا ہوتا ہے - یہ وہی بات ہے جس طرح ہندوؤں میں ماتھے پر تلک لگاتے ہیں اور اس کے ذریعہ مختلف ذاتوں کو ظاہر کرتے ہیں - انجیل کے بہت سے محاورے ایسے ہیں جو آج بھی ہندوستانی زبان میں بولے جاتے ہیں - ہم ان میں سے چند ذیل میں لکھتے ہیں : —

(۱) خدا جسے بچائے اس کا بال بیکا کرنے والا کون ؟ —

(۲) اپنا منہ آئینہ میں دیکھو —

(۳) کپڑوں کا حسن الماری میں ہوتا ہے اور آدمی کا ذاتی حسن اس کی شخصیت سے وابستہ رہتا ہے —

(۴) دولت ڈھلنے والی چیز ہے جیسے دوپہر کا سورج —

(۵) نیم کڑوا ہی رہے گا چاہے آبیاری بجائے پانی کے دودھ ہی سے کیوں نہ ڈالا کرو —

(۶) درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے —

(۷) اگر کانٹے بوؤگے تو گلاب نہیں کاٹو گے —

(۸) سوئی کے ناکے میں سے ہاتھی کا گزرنا (انجیل کے محاورے میں بجائے ہاتھی کے اونٹ ہے) —

مسیحیت کے مبلغین جو انجیل کے تمام حصوں پر پوری طرح حاوی ہوتے ہیں ہندوستان کے مختلف مراسم سے بعض ایسے حصوں کی تشریح کرسکتے ہیں جو اب تک مبہم رہے ہیں اور جنہیں خود سمجھنے کے بعد دوسروں کو بھی وہ سمجھا سکیں گے —

کولونیل چرچ کرانیکل (Colonial Church Chronicle) کی مئی کی اشاعت میں لکھا ہے کہ " غیر مسیحی ممالک میں جو لوگ حضرت مسیح کا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں ان کی نظر سب سے پہلے ہندوستان پر پڑتی ہے جو ان کی دلچسپی کا مرکز ہے - اس زبردست سلطنت کے آٹھ صوبوں میں صرف شمال مغربی صوبہ اتنا وسیع ہے جتنا کہ برطانیہ عظمیٰ - اس صوبے کی آبادی ۳ کروڑ سے زائد ہے - پنجاب کا رقبہ اٹلی کے برابر ہے - صوبجات متوسط بھی رقبے میں برطانیہ عظمیٰ اور آئرلینڈ کے مساوی ہیں - باوجود اس قدر وسعت کے اس پورے ملک میں انگلستان کی طرف سے صرف تین اسقف مقرر کیے گئے ہیں حالانکہ روم کے کلیسا کے ۱۶ اسقف ہیں - اس میں شبہ نہیں کہ یہ تینوں اسقف نہایت جوشیلے ہیں اور وہ اپنے کاموں سے اپنے اپنے علاقے میں زندگی پیدا کر رہے ہیں* —

کیتھولک مشن ہندوستان میں خوب کامیابی حاصل کر رہے ہیں - ان کے وسائل نہایت وسیع ہیں - مسیحیت کی اشاعت کے لیے صرف فرانس میں ۴۷۴۸۹۰۲ فرانک کی رقم فراہم کی گئی لیکن یہ رقم دنیا

---

* تین اسقف یہ ہیں :- ڈاکٹر ملمن (Milman) اسقف کلکتہ ؛ اسقف ڈگلس (Daglas) اسقف بمبئی ؛ اور اسقف گل (Gell) اسقف مدراس -

کے مختلف حصوں میں تقسیم کی جائے گی جیسا کہ اسقف ہیبر (Heber) نے ایک جگہ لکھا ہے :—

" گرین لینڈ کے برفیلے پہاڑوں سے لیکر ہندوستان کے ساحلوں اور افریقہ کے دریاؤں تک جو اپنی سنہری ریت آفتاب کی روشنی میں بہا کر لاتے ہیں وہ (مسیحی مبلغین) غلط روی کی زنجیر سے ملکوں کو رہا کرتے ہیں - ان کی آواز قدیم دریاؤں کے ساحلوں اور کھجور کے درختوں سے بھرے ہوے میدانوں میں سنائی دیتی ہے " —

سنہ ۱۸۱۴ ع میں جو اعداد و شمار جمع کیے گئے تھے ان کے مطابق ہندوستان میں کیتھولکوں کی تعداد ۸۷۸ ۶۹۱ تھی لیکن اسقف ملمین (Milman) کا خیال ہے کہ ان کی تعداد میں کچھہ تخفیف ہوگئی ہے - وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں * : " یسوعیوں کے مدارس نہایت عمدہ خدمات انجام دے رہے ہیں - کیتھولک مشن کے سرگروہ ہندوستان میں اسقف اعظم استینس (Steins) ہیں جو نہایت فاضل شخص ہیں اور ساتھہ ہی ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو کلیسا کے ایک اعلیٰ عہدہ دار میں ہونی چاہئیں - وہ نہایت خلیق اور صاحب وجاہت ہیں اور ان کی شخصیت سے ہر شخص متاثر ہوتا ہے - کیتھولک کلیساؤں میں یوریین اور ہندوستانی لوگ بلا کسی نسلی امتیاز کے شرکت کرتے ہیں- کیتھولک لوگوں میں مذہبی اقتدار کو بلا چون و چرا تسلیم کیا جاتا ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کے خلاف زبان ہلا سکے " —

مذکورہ بالا رائے ایک اینگلی کن (Anglican) اخبار کی ہے جس نے بلا رو رعایت کیتھولک مشن کی خدمات کا اعتراف کیا ہے - لیکن

* Colonial Church Chronicle بابت جون سنہ ۱۸۷۲ ع —

کیتھولک مشن کو پروٹسٹنٹ مشن سے یہ شکایت ہے کہ خواہ مخواہ اس نے رقابت پیدا کرلی ہے دراصل دونوں مشنوں میں مقابلہ کبھی بھی نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا - اس کا اظہار "سال نامۂ اشاعت دین" میں کیا گیا ہے —

کلکتہ کے اسقف اعظم ملمین نے، جن کے تحت ہندوستان اور لنکا کے تمام مسیحی حلقے ہیں، مارچ سنہ ۱۸۷۱ع میں اپنے احکام کی دوسری قسط شائع کی ہے - پہلی قسط کے متعلق میں اپنے سنہ ۱۸۶۸ع کے خطبے میں ذکر کر چکا ہوں - ہندوستان کے اسقف اعظم نے مذہبی جلسے اپنے سفر کے دوران میں ملک کے ہر حصے میں منعقد کیے - موصوف نے اس ضمن میں تذکرہ لکھا ہے کہ جنوبی ہند میں بہ نسبت شمالی ہند کے مسیحیت کے حلقے میں زیادہ تعداد میں لوگ شامل ہوے - جنوبی ہند میں بعض اضلاع میں خاص طور پر مسیحیت کو خوب فروغ حاصل ہوا ہے - اینگلی کن کلیسا کے پیرو اس وقت تمام ہندوستان میں ۱۸۰۰۰۰ ہیں - اب دن بدن ایسے لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے جو اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور مسیحیت کے زمرہ میں شریک ہوگئے ہیں - "اودھ اخبار" میں حال میں شہزادۂ سلیمان کے متعلق ذکر تھا جو مغل شہنشاہ کے پوتے ہیں اور اپنے والد کی طرح مسیحیت کے حلقے میں شامل ہوگئے ہیں - اسقف اعظم نے مسیحی مبلغین کے جوش دینی کو بہت کچھ سراہا ہے کہ ان کی بے لوث خدمت کی بدولت نہایت عمدہ نتائج برآمد ہو رہے ہیں - ان کے مدارس میں نوجوان ہندوستانی روحانی زندگی کے ابتدائی سبق لیتے ہیں اور ان کے دلوں میں تعلیم کے ذریعہ اخلاقی حس پیدا ہوجاتی ہے اور وہ مقدس حقائق

کو قبول کرنے کی اپنے میں صلاحیت پیدا کرلیتے ہیں —

اسقف ہند نے پچھلے تین سال میں ایک ہزار دو سو ستر دیسی اور ایک ہزار یورپینوں کو بپتسما دیا، ۱۹ کلیساؤں کا افتتاح کیا اور ۲۹ قبرستان بنانے کا انتظام کیا۔ موصوف نے دیسی زبانوں کے مطالعہ کے شوق کو مبلغین مذہب میں بڑھانے کی کوشش کی۔ وہ خود اردو، ہندی اور بنگالی میں بلا تکلف وعظ کر سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ موصوف ایک منکسر المزاج شخص ہیں اس لیے وہ خود اپنے کارناموں کے متعلق کوئی ذکر نہیں کرتے * —

اڈنبرا کے اسقف کے تحت اسکاٹلینڈ کے کلیسا نے ایک خاص شعبہ قایم کیا ہے جس کا مقصد غیر مسیحی ممالک اور خاص طور پر ہندوستان میں تبلیغ کرنا ہے۔ چنانچہ اس کا انتظام ہو گیا ہے کہ 'چاندہ' کو مرکز بنا کر گوالیار کے آس پاس کے علاقے میں تبلیغ کی جائے۔ کلکتہ کے اسقف اعظم نے اس کام کی ہمت افزائی کی ہے اور اس میں کچھ ہرج تصور نہ کیا کہ مسیحیت کی اشاعت ایک دوسرے کلیسا کے ذریعہ انجام پائے اور اپنے اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے اس کے ساتھ تعاون عمل کیا جائے۔ وسط ہند کا تمام علاقہ اسکاٹلینڈ کے کلیسا کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ 'اندور' کے قریب 'مئو' ایک مرکز بنایا گیا ہے اور وہاں کا کام ایک ہندوستانی شخص کے سپرد کیا گیا ہے جو پہلے پنڈت تھا اور اب عیسائی ہے۔ بھوپال اور بندیلکھنڈ کے علاوہ سندھیا اور ہلکر کی ریاستیں اسی مشن کے سپرد کی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاقے میں مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے بہ نسبت دوسری دیسی

---

* Colonial Church Chronicle بابت مارچ سنہ ۱۸۷۲ ء —

زبانوں کے بجائے ہندی زیادہ مفید ثابت ہوگی - اسی وسیع علاقے میں ہندوستانی 'اردو' بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے * —

اسقف ہند نے جب جنوبی ہند کا دورہ کیا تو وہاں بمقام کٹاگم (Cattagam) سینٹ جان "سیرین کرسچین" لوگوں کے اسقف سے ملاقات ہوئی - ان کی تعداد تین لاکھ کے لگ بھگ ہے - اس نے ان کی عبادت میں بھی شرکت کی - تمام حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ کلیسا بھی بڑی خدمت انجام دے رہا ہے اور دیسی لوگوں کے دلوں سے اپنی تعلیم و تلقین کے ذریعہ توہمات کے دور کرنے میں ساعی ہے - اس کلیسا نے یہ اصول بھی تسلیم کر لیا ہے کہ اپنی عبادات میں دیسی لوگ اپنی مادری زبان حتی الامکان استعمال کریں —

گزشتہ ستمبر میں اسقف ہند کلکتہ سے روانہ ہو کر پنجاب پہنچے جہاں وہ مختلف علاقوں کا چار ماہ تک برابر دورہ کریں گے † —

چھوٹا 'ناگپور' کے علاقے کے متعلق جو رپورٹ شائع ہوئی ہے وہ ہر طرح قابل اطمینان ہے - سنہ ۱۸۷۱ ع میں اس علاقے میں سات سو انیس اشخاص کا بپتسما ہوا جن میں پانچ سو سترہ ہندو تھے جو پہلے بت پرستی کیا کرتے تھے - ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع میں رانچی میں ایک کلیسا کا سنگ بنیاد رکھا گیا - وہاں عرصے سے ایک کلیسا کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی - عبادت بجائے اردو کے ہندی میں ہوتی ہے اور گریگری کا گیت بھی دعاؤں میں شامل کر لیا گیا ہے - عیسائی مزارعین

* یہ تفصیلات مجھے اسقف ملمین کے اس خط سے حاصل ہوئیں جو موصوف نے اسکاٹلینڈ کو لکھا تھا - ملاحظہ ہو Colonial Church Chronicle - جون سنہ ۱۸۷۲ ع —

† Colonial Church Chronicle - اگست سنہ ۱۸۷۲ ع —

کی درخواست پر فصل تیار ہونے کے موقع کے لیے علاحدہ دعائیں تیار کی گئی ہیں جن میں خدا سے التجا کی جاتی ہے کہ ان کی محنت اکارت نہ جائے - 'رانچی' میں مسیحی دینی علوم کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قایم کیا گیا ہے لیکن ابھی اس میں طلبہ کی تعداد صرف پانچ ہے - گزشتہ فروری میں اسقف ہند نے رانچی میں ۲۶۲ دیسی لوگوں کو بپتسما دیا ' ایک مذہبی پیشوا اور مقرر کیا اور ۸۰ اشخاص کو عشاے ربانی سے سرفراز کیا * —

کشمیر میں دیسی عیسائیوں پر طرح طرح کے مظالم روا رکھے جاتے ہیں - اس ریاست میں مسیحی مذہب کے ساتھہ رواداری کا برتاؤ نہیں کیا جاتا - گرمی کے موسم میں سرینگر کا موسم بہت خوشگوار ہوتا ہے اور بہت سے یورپین تبدیل آب و ہوا کے لیے وہاں اس زمانے میں چلے جایا کرتے ہیں - گرمی کے موسم میں مسیحی مبلغین کو اجازت ہے کہ وہ سرینگر کی سڑکوں پر تلقین و وعظ کے لیے جلسے منعقد کریں - یہاں وعظ و تلقین اردو میں کی جاتی ہے —

میں نے اب تک پرتگیزی کلیسا کی نسبت کچھہ ذکر نہیں کیا - اس کے تعلقات کیتھولک کلیسا کے ساتھہ کشیدہ رہتے ہیں —

مدراس کے ریورنڈ راجگوپال نے یہ بات واضح کردی ہے کہ ہندوؤں کی موجودہ نسلیں اپنے بزرگوں سے بہت مختلف ہیں - اپنے بزرگوں کے عقاید کے خلاف ان میں خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرنے کا رجحان عام طور پر پایا جاتا ہے جو اس دنیا کا خالق اور اس کو محفوظ رکھنے والا ہے - دن بدن یہ حقیقت بھی ہندو لوگ تسلیم کرتے جاتے ہیں کہ مسیحی

* Colonial Church Chronicle - ستمبر سنہ ۱۸۷۲ ع -

مذہب آسمانی ہے۔ اس کے متبعین کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے - نوجوان ہندوستانی ذات پات کی جکڑ بند سے اُکتا گئے ہیں اور اس جوے کو اپنے کاندھوں سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں - انہیں اپنے رسوم پر جو توہمات پر مبنی ہوتی ہیں ' مطلق بھروسہ نہیں رہا - ہم اب یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ اب وہ زمانہ بہت دور نہیں رہا جبکہ سارا ہندوستان مسیحیت کے زمرہ میں شامل ہوجائیگا اور ہندو چلا اٹھے گا :—

" میں اپنے روحانی دیس سے دور گم کردہ راہ ادھر اُدھر بھٹکتا پھرتا تہا - مجھے اس راستہ کا علم نہ تھا جو حقیقی مسرت کی منزل کی طرف جاتا ہے - لیکن خدا نے میری جلاوطنی پر ترس کھایا - اب وہی میرا راستہ ہے اور وہی میری منزل - اس سیدھے راستہ پر چل کر میں پھر کبھی نہیں بھٹکوں گا " * —

میں گزشتہ سال کے مقالے میں ریورنڈ چارلس فورسٹر کے انتقال پر ملال کے متعلق ذکر نہ کرسکا اس لیے کہ مجھے اس کی اطلاع بہت بعد میں موصول ہوئی - مرحوم Stisted کے پادری اور کینٹربری کے کلیسا کے واعظ تھے - ان کا انتقال ۲۰ اگست سنہ ۱۸۷۱ ع کو ہوا - ان کی عمر انتقال کے وقت ۸۲ سال تھی - ان کی بیٹی اور ان کے عزیز دوست رچارڈ جب (Richard Jebb) ان کےپاس موجود تھے جب ان کی روح نے قفس عنصری سے پرواز کی تو بقول شاعر : -

" مرتے وقت پختہ عقیدہ اس کی گھڑیوں کو مسرور کررہا تھا - اس کے بل پر انسان موت کی خوفناک قوت پر فتحمند ہوسکتا ہے " -

چارلس فورسٹر کے سات بیٹے تھے ' حضرت یعقوب کی طرح ' اور تین

* پیرس کی دعا (Parision Liturgy)

لڑکیاں تھیں - چار بیٹے ان کی آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے فوت ہوگئے اور بیوی کا بھی انتقال ہوگیا - تین لڑکیوں میں باپ کے انتقال کے وقت صرف ایک زندہ تھی - مرحوم کا ایک فرزند جب فورسٹر، اپنے باپ کی طرح اینگلی کن کلیسا میں پادری کی خدمت انجام دے رہا تھا - اس کا سنہ ۱۸۶۸ع میں انتقال ہوا - اس کے انتقال پر اس کی یاد میں جو کلیسا کے ایک اعلیٰ عہدہ دار نے خط لکھا ہے اس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس معاشرہ میں ان خوبیوں کے اشخاص ہوں وہ کتنا بلند معیار رکھتا ہے - یہ خط مجھے لکھا گیا تھا - ذیل میں میں ناموں کو نکال کر اصل خط نقل کیے دیتا ہوں : —

۲۱ جون سنہ ۱۸۶۱ع

پیرس

مکرمی -

آپ نے جو ڈاکٹر فورسٹر کا خط مجھے بھیجا وہ اس قدر دل پر اثر ڈالنے والا اور مسیحی جذبات سے معمور ہے کہ اس کو پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا - آپ کی اس توجہ فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں - میں نے اور 'پ' نے اس کو ساتھہ ساتھہ پڑھا - ہم دونوں کے دلوں پر جو اثر مترتب ہوا وہ اس قسم کا تھا جو فطرت سے بالاتر کسی قوت کے ساتھہ تعلق سے پیدا ہوتا ہے - آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ایسے لوگوں کا کلیسا کے زمرہ میں ہونا در اصل ہم سبھوں کے لیے باعث صد فخر ہے - اگر چہ مرحوم کا ویسے خارجی طور پر کلیسا سے تعلق تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو " روح کلیسا " کہا جائے تو درست ہوگا - سینٹ آگستائن کا قول ہے کہ خارجی طور پر کلیسا سے متعلق ہونا انسان کی

زندگی کو پاکیزہ بناتا ہے لیکن توفیق الٰہی ایسے کلیسا کے بطن سے بھی روحانی اثرات پیدا کرسکتی ہے جو بالکل صحیح راستہ پر نہیں کہا جاسکتا - اس میں کسے شبہ ہوسکتا ہے کہ انگلی کن کلیسا کے ارکان کو وہ عقیدہ حاصل نہیں ہوتا جو نجات دلانے کا ضامن ہو لیکن بعض نہایت قابل احترام اشخاص کا بیان ہے جو ہمارے عقاید کو ماننے والے ہیں کہ ایںگلی کن کلیسا کے بعض ارکان کے عقاید کے متعلق انہیں مطلق شبہ نہیں ہوا کہ وہ راستہ سے بھٹکے ہوئے ہیں - حضرت مسیح کے نام کی خاطر ہمیں اس بات میں مطلق تامل نہیں ہے کہ ہم ڈاکٹر فورسٹر اور ان کے لائق فرزند جیسے اشخاص کے ساتھ پوری ہمدردی ظاہر کریں - میں نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں میں باپ زیادہ قابل تحسین ہیں یا فرزند - آپ کا خط پڑھنے کے بعد میرے اور 'پ' کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مرحوم کی یاد میں مقدس قربانی کی رسم پوری کریں گے - ہم نے اپنے اس عہد کو پورا کیا تا کہ مرنے والے کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ باقی رہے - میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے اپنی زندگی میں ایسے عالی مرتبہ احباب پیدا کیے جو مسیحی مقاصد کے لیے اپنی زندگی کو وقف کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے " —

چارلس فورسٹر نے متعدد ادبی یادگاریں بھی چھوڑی ہیں - ممدوح نے دینیات کے موضوع پر بہت کچھ لکھا - سینٹ جان کے متن کے متعلق بعض نہایت اعلیٰ درجہ کی تحقیقات شائع کیں - ان کی کتاب " قدیم زبان " (Primeval language) معرکۃ الآرا تصنیف خیال کی جاتی ہے - اسی طرح کوہ سینا کی تحریروں کے متعلق بھی بہت عرق ریزی سے کام کیا — ان کی دوسری مشہور کتابیں " عرب کا تاریخی جغرافیہ " Historical Geography

of Arabia) اور " اسلام بے نقاب " (Mahometism Unveiled) ھیں جنھیں مقبولیت حاصل ہوئی —

مرنے سے کئی ماہ قبل مرحوم کی صحت بالکل جواب دے چکی تھی - آخری زمانے میں انھیں سب سے زیادہ صدمہ اس کا تھا کہ آئرستان میں اینگلی کن کلیسا کو موقوف کیا جارہا ھے اور کہیں اس کا نتیجہ یہ نہ ہو کہ اور دوسرے مقامات میں بھی کیتھولکوں کی مرضی کے مطابق اینگلی کن کلیسا کی بنیادیں کمزور ہو جائیں - ایسی صورت میں رومن کیتھولک کلیسا دنیا میں حاوی ہو جائے گا - وہ لوگ جو کسی مذہب کی صداقت میں یقین نہیں رکھتے وہ یہ دیکھ کر خوش ہوں گے کہ حکومت جس کلیسا کی پشت پناہی پر تھی وہ کمزور ہو گیا - لیکن مرنے والے کے عقاید آخر دم تک غیر متزلزل رہے - اور وہ مشہور دعا کے الفاظ دھرا تا رہا :—

" اپنی امید کی سرگرمی قایم رکھتے ہوئے اپنے مسلک پر
جما رہ - اس مسلک پر تیری نظر سے زیادہ تیرا عقیدہ تجھے
ٹھیک راستہ پر رکھے گا - پھر تو دیکھے گا کہ جو وعدہ تھا وہ
پورا ہوا - شام کے وقت تجھے روشنی نظر آئے گی " —

اس سال (سنہ ۱۸۷۲ ع میں) ہندوستان میں ایک نہایت افسوس ناک قتل کا حادثہ پیش آیا جو اسی نوعیت کا واقعہ ھے جو گزشتہ سال جج نارمن کے قتل کی صورت میں ظاہر ہوا تھا اور جس نے سارے ہندوستان میں ھلچل مچا دی تھی - میری مراد ھے گورنر جنرل وائسرائے ہند لارڈ میو کے قتل سے - وہ جزائر انڈمان گئے ہوئے تھے تاکہ بہ نفس نفیس وہاں جو مجرم بھیجے جاتے ہیں ان کا حال معلوم کریں - درۂ خیبر کے ایک

باشندے نے جس کا نام شیر علی تھا جسے سنہ ۱۸۶۷ ع میں موت کی سزا کا حکم دیا گیا تھا لیکن بعد میں جلا وطنی بہ عبور دریائے شور کی سزا کا اس کے حق میں فیصلہ ہوا ، اس شخص نے خاندانی جھگڑے کے سلسلے میں ایک آدمی کو قتل کر ڈالا تھا - اس کو ۱۲ مارچ وائپر آئیلنڈ (Viper Island) میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا - جج نارمن کے قاتل عبداللہ کی طرح شیر علی نے بھی اقبال جرم کیا اور کہا کہ کوئی اس کا شریک جرم نہ تھا - میں یہاں لارڈ میو کے سیاسی کارناموں پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتا - صرف یہاں اتنا ذکر کروں گا کہ ہندوستانی لوگوں میں اسے بڑی مقبولیت حاصل تھی بالکل اسی طرح جیسے لارڈ ولیم بنٹنگ اور لارڈ لارنس کو حاصل تھی - وہ ہندوستان میں عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرنا چاہتا تھا - اس نے ہندوستان کی قدیم زبانوں کے احیا میں بڑی ہمت افزائی کا رویہ اختیار کیا - عربی ، فارسی اور سنسکرت کے فروغ کے لیے اس نے ہر ممکن کوشش کی - میں نے اپنے پچھلے مقالے میں مسلمانان ہند کی جن شکایات کا ذکر کیا تھا انہیں رفع کرنے کی طرف بھی لارڈ میو نے توجہ کی تھی —

لارڈ میو ڈبلن میں سنہ ۱۸۲۱ ء میں پیدا ہوئے اور ٹرنٹی کالج میں تعلیم پائی - یہ وہی کالج ہے جہاں آج کل میر اولاد علی جیسا عالم فاضل شخص عربی ، فارسی اور ہندوستانی کی تعلیم کے لیے مقرر ہے - لارڈ میو سنہ ۱۸۴۷ ء میں پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے اور سنہ ۱۸۶۸ ع تک رکن رہے جب کہ وہ ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل نامزد کیے گئے - ان کا تعلق ایک قدیم شریف خاندان سے تھا - ان کے پر دادا توام (Tuam) کے اسقف تھے اور دادا واٹرفورڈ اور لسمور کے اسقف

تھے - لارڈ میو کی تجہیز و تکفین بڑے تزک و احتشام سے ہوئی - لیڈی میو اس موقع پر موجود تھیں - اینگلی کن دعاؤں کے ساتھ کیتھولک کلیسا کے اعلیٰ عہدہ داروں کی دعائیں بھی سنائی دیتی تھیں - افسوس ہے کہ اس موقع پر اسقف ملمین دورے پر گئے ہوئے تھے اور کلکتہ میں موجود نہ ہونے کے باعث شرکت نہ کر سکے —

لارڈ میو کی جگہ لارڈ نارتھ بروک وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر ہوئے - سنہ ۱۸۵۹ ء میں موصوف نائب وزیر ہند کے عہدہ پر سرفراز تھے - ان کے بعد اس اہم خدمت پر سر استرافرڈ نارتھ کوٹ اور پھر مسٹر گرانٹ ڈف مامور ہوئے - یہ دونوں میرے عزیز دوستوں میں ہیں —

میں مرنے والوں میں الگزنڈر گویلے من (Guillemin) کا ذکر کرنا بھی ضروری خیال کرتا ہوں - وہ میرے پرانے دوست تھے - وہ مشہور وکیل ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے شاعر تھے اور انہوں نے متعدد تصانیف بھی چھوڑی ہیں - ایک تصنیف کا نام "آسمان" ہے جس کا اردو میں ترجمہ لے پوئر ون (Le Poer Wynn) نے کرنے کا ارادہ کیا تھا - الگزنڈر گویلے من کا انتقال پیرس میں ۳ مارچ سنہ ۱۸۷۲ ء کو ہوا - مرحوم نے ۸۳ سال کی عمر پائی —

تھیوڈر گولڈ ستکر (Goldstucker) اپنے زمانے کے سنسکرت کے زبردست فاضلوں میں سمجھے جاتے تھے ۶ مارچ کو لندن میں یکایک ان کا انتقال ہو گیا - وہ سنہ ۱۸۲۱ ع میں کونگز برگ میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں انہوں نے مشرقی زبانوں کی تحصیل کی - پھر وہ سنہ ۱۸۴۵ ع میں پیرس چلے آئے - مجھے فخر حاصل ہے کہ میرے ہندوستانی زبان کے درسوں میں جو حضرات آتے تھے ان میں وہ بھی تھے اور ان کے علاوہ

سویڈن کے مشہور عالم کل گرن بھی تشریف لایا کرتے تھے جن کا سنہ ۱۸۲۹ ع میں انتقال ہوا * - سویڈن کی پارلیمنٹ کے مشہور رکن چارلس دے برگ سٹڈ (Charlede Bergstedt) بھی میرے درسوں میں آیا کرتے تھے - اس وقت سے برابر گولڈ سٹکر سے میرے تعلقات قایم تھے اور انہوں نے بارہا میرے ساتھہ اپنی عنایت اور خلوص کا ثبوت دیا - وہ سنہ ۱۸۵۰ ع میں لندن چلے گئے جہاں ایچ ایچ ولسن سے انہیں بڑی مدد ملی - شہزادہ البرٹ سے بھی جو ان کے ہم جماعت رہ چکے تھے' انہیں بڑی امداد ملی - بالآخر یونیورسٹی کالج میں وہ سنسکرت کے پروفیسر مقرر ہوگئے - اس کے بعد انجمن لسانیات کے صدر اور رائل ایشیا ٹک سوسائٹی کے رکن مقرر ہوے - اگرچہ انہوں نے ہندوستانی زبان پر زیادہ وقت نہیں صرف کیا لیکن وہ ان السنۂ ہند کے ماہروں میں سے نہیں تھے جو ہندوستانی زبان کو لچر پوچ تصور کرتے ہیں - انہوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ سنسکرت زبان پر صرف کیا اور اس زبان کے متعلق جو تحقیقاتیں انہوں نے کیں ان کے باعث انہیں بڑی شہرت نصیب ہوئی - سنسکرت کی ضخیم لغت کا کام انہوں نے نامکمل چھوڑا جس میں وہ کئی سال سے منہمک تھے - ان کی تصنیف "سنسکرت کی صرف و نحو" بھی ابھی طبع نہیں ہوئی بلکہ قلمی شکل میں موجود ہے - ہمیں پوری توقع ہے کہ بہت جلد یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہوگی اسواسطے کہ اس میں ہمیں یقیناً نئی معلومات ملیں گی - یہ فاضل شخص جوان مرا - لاطینی کے شاعر

---

* اس نو جوان محقق نے پروفیسر فلشر کے ساتھہ مل کر ابن ملک کی صرف و نحو کا ترجمہ کیا تھا - اس کا ارادہ تھا کہ سویڈش ترجمہ کے ساتھہ جرمن زبان میں بھی اس کو شائع کرے لیکن موت نے اس کی مہلت نہ دی -

نے علماء کے متعلق جو لکھا ہے وہ اس پر اچھی طرح چسپاں ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے :—

"جو لوگ ذہنی کام میں انتہائی محنت کرتے ہیں ان کی عمر کم ہوتی ہے اور بڑھاپے تک شاذ و نادر ہی پہنچتے ہیں" —

کرنل فریڈرک لیارڈ کا اپریل کی ۲۷ تاریخ کو ۴۸ سال کی عمر میں بمقام ویلس انتقال ہوگیا۔ ان کے بھائی آج کل اسپین میں حکومت انگلستان کی طرف سے سفارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور میرے دوست مارکوئس آف بوٹے بھی آج کل اسپین میں ہیں۔ کرنل فریڈرک لیارڈ سنہ ۱۸۶۹ ع میں نواب بنگال کے ساتھ یورپ آئے تھے اور مجھے ان سے پیرس میں شرف ملاقات حاصل ہوا تھا۔ مرحوم کا تعلق ایک قدیم فرانسیسی خاندان سے ہے جس نے انگلستان میں سکونت اختیار کرلی ہے۔ یہ خاندان نانت کے احکام کے منسوخ ہوجانے کے بعد ترک وطن کرکے فرانس میں آباد ہوگیا تھا* - کرنل فریڈرک لیارڈ بنگال کی فوج کے ایک صاحب حیثیت افسر تھے۔ ان کی قبل از وقت موت سے ان کا خاندان اور ان کے احباب سب متاثر ہوے۔ انگریزی حکومت کو اس قابل افسر کے انتقال سے سخت نقصان ہوا —

کرنل ڈبلو ایچ سائکس کا ۱۶ جون سنہ ۱۸۷۲ ع ۸۳ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ سنہ ۱۷۹۰ ع میں پیدا ہوے اور سنہ ۱۸۰۴ ع سے سنہ ۱۸۳۱ ع تک

---

* یہ احکام ہنری چہارم والیء فرانس نے سنہ ۱۵۹۸ ع میں جاری کیے جن کی رو سے پروٹسٹنٹ لوگوں کے شہری حقوق تسلیم کیے گئے۔ لوی چہاردہم نے سنہ ۱۶۸۵ ع میں پروٹسٹنٹ لوگوں کو ان حقوق سے محروم کردیا جس کی وجہ سے ان کے بہت سے خاندان دوسرے ملکوں میں جاکر آباد ہو گئے (مترجم) -

بمبئی کے صوبے میں فوجی ملازم کی حیثیت سے کار گزار رہے - سنہ ۱۸۵۰ع میں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلس نظما کے رکن بن گئے اور سنہ ۵۸ ع - ۱۸۵۷ ع میں مجلس نظما کے صدر مقرر ہوے - وہ ابرڈین یونیورسٹی کے امیر جامعہ تھے اور ۱۵ سال سے برابر اس شہر کی طرف سے پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے منتخب ہو رہے تھے - رائل سوسائٹی کے علاوہ اور دوسری علمی انجمنوں کے بھی رکن تھے - رائل ایشیا ٹک سوسائٹی ' مجلس اعداد و شمار اور لندن کی مجلس فنون لطیفہ کے اجلاسوں کی صدارت بھی کر چکے تھے - ان کی تعلیم گہری اور متنوع ہوئی تھی - انھیں ہندوستانی زبان سے خاص لگاؤ تھا اور مجھ پر ان کی خاص نظر عنایت تھی —

مدراس کے ہندوستانی زبان کے شاعر خواجہ محمد پادشاہ کا جن کا تخلص ' عبرت ' تھا ۱۵ ربیع الاول مطابق ۲۲ مئی سنہ ۱۸۷۲ ع انتقال ہوگیا - وہ ' مظہر الاخبار '' کے مالک اور مدیر تھے - ان کی موت کا ذکر کرتے ہوئے '' اخبار عالم '' کے مدیر نے ٹھیک کہا ہے کہ '' انسان کی زندگی پانی کے بلبلے کی طرح ہے جو سمندر کی سطح پر تھوڑی دیر کے لیے ظہور پذیر ہوتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے '' —

ٹیپو سلطان کے فرزند ارجمند غلام محمد نے ۱۲ اگست سنہ ۱۸۷۲ ع ۷۰ سال کی عمر میں کلکتہ میں وفات پائی - شاہی خاندان کے اس فرد کے متعلق میں پہلے ذکر کر چکا ہوں اور اس کے اوصاف بیان کر چکا ہوں جن کا اعادہ غیر ضروری ہے - ان کی موت کا ہر شخص کو سخت افسوس ہوا اور بالخصوص وہ لوگ جو ان سے واقف تھے یا ان کی فیاضی سے مستفیض ہوئے تھے اس واقعہ سے سخت ملول تھے - لارڈ میو کے قتل کا مرحوم کو

بہت صدمہ ہوا تھا اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس واقعہ کی وجہ سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے —

۲۹ اگست سنہ ۱۸۷۲ع کو میرے قدیم دوست ہیمر اسمتھ کا لندن میں انتقال ہوگیا - وہ عرصہ تک بیت المقدس میں سفارت (قونصل) کے فرائض انجام دے چکے تھے - وہیں ان کے ایک فرانسیسی موسیو دے باریر کے ساتھ نہایت گہرے تعلقات پیدا ہوگئے - انہیں یہودیوں کے مسائل سے خاص شغف تھا اور اس کے متعلق انہوں نے متعدد کتب تصنیف کی ہیں - ان کتابوں میں یہودیوں کے حالات' یورپ اور مشرقی ممالک میں ان کا پھیلنا اور چین تک پہنچنا' غرضکہ سب تفصیل یہودیوں کے متعلق دستیاب ہو سکتی ہے - اس تحقیق میں انہیں عبرانی زبان کی واقفیت سے بہت کچھ مدد ملی —

پنجاب کے پرانے لفٹننٹ گورنر سر ڈانلڈ میکلوڈ کا ۲۸ نومبر سنہ ۱۸۷۲ع بمقام لندن ریل پر سے گر کر انتقال ہوگیا - وہ نہایت قابل ماہر نظم و نسق تھے اور ہیلی بری کے کالج کے قدیم طالب علم تھے - اسی کالج میں انہوں نے ہندوستانی زبان سیکھی تھی - وہ اس زبان پر اتنی قدرت رکھتے تھے کہ بلا تکلف گفتگو کر سکتے تھے —

ایڈون نارس (Edwin Narris) جو عرصے سے لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے معتمد تھے' اس جہان کو خیر باد کہہ گئے - ان کے انتقال سے نہ صرف مستشرقین کا ایک بڑا شخص کم ہو گیا بلکہ ایک محقق ہم میں سے جاتا رہا - اپنے علم و فضل کے ساتھ موصوف کے مخلصانہ اخلاق کبھی فراموش نہیں کیے جا سکتے - میرے تعلقات ان کے ساتھ ۴۰ سال سے تھے - وہ لسانیات کے متبحر عالم تھے اور ہندوستانی زبان میں بھی

درک رکھتے تھے - مرتے دم تک وہ برابر "سریانی زبان کی لغت" کی تیاری میں مصروف و منہمک رہے - یہ ایک نہایت مہتم بالشان کام ہے جس کی وجہ سے ایڈون نارس کا اُس صدی کے بڑے فاضلوں اور محققوں میں شمار کیا جائے گا - انہوں نے سر ھنری رالنسن کے ساتھہ اس کام کی ابتدا کی تھی اور سریانی زبان کی تحقیق کا کام ان کے ساتھہ شروع کیا تھا - دونوں نے مل کر لغت کا کام شروع کرنے سے قبل، پیکانی خطوط کی بعض تحریروں کے متعلق نہایت عمدہ تحقیقات شائع کی تھیں - یڈون نارس کی واقفیت دنیا کی مختلف زبانوں سے انسان کو تعجب میں ڈال دیتی تھی - انہوں نے ایشیا اور افریقہ کی بعض بولیوں کی صرف و نحو پر کتابیں لکھیں - ان بولیوں کے متعلق اس وقت تک اھل یورپ بالکل نا واقف تھے - انہوں نے انجیل مقدس کا تبتی زبان میں ترجمہ کیا اور کورنویل (Cornouailles) کی بولی میں ایک قدیم ناٹک کا ترجمہ کیا - انہوں نے ۷۷ سال کی عمر پائی - کچھہ عرصے سے ان کی صحت خراب ھوچلی تھی اور انہیں معلوم تھا کہ :-

" دن ، مہینے اور سال ختم ھونے والے ھیں - صرف ابدیت ھی کبھی ختم نہ ھوگی - وہ ھمیشہ ھمیشہ یوں ھی چلی جائے گی جس طرح ازل سے اس کی ابتدا ھوئی " —

کالیداس کی "مالویکا"

از

(پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار لکچرار جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

کالیداس عام ہیئت کے ایک باکمال پنڈت اور سنسکرت زبان کے شاعر اعظم ہی نہیں تھے بلکہ علم رقص وسرود میں بھی بلند پایہ استاد تھے اور رقص کو اپنی فن کارانہ ذہانت کی مہارت کے ذریعہ بڑی نزاکت، شیرینی اور موسیقانہ جذبات کے ساتھہ اسٹیج پر نمایاں کرسکتے تھے - اس کا پتہ ان کے " مالویکا گنی متر " ناٹک کے مطالعہ سے چلتا ھے - کالیداس کی مالویکا انسانی باغ کی بہار کی وہ پرشباب، نازک ترین، اور دل ربا پھول ھے جو اوپر سے نیچے تک نوشگفتہ، خوشبودار، رنگین، حسین اور دلکش پھولوں کے کھلے پھلے محبت کی پرکیف ہواؤں کے لطیف جھونکوں سے دلوں کی محفل میں گوناگوں معنوں سے لبریز نغمہ ریز اور اشاروں بھرا ناچ ماھرانہ انداز میں کر رھی ھے - وہ ایسے حالات میں پیش کی گئی ھے جہاں صرف اپنی سریلی صداؤں سے اپنے دل کے اندرونی خفیہ جذبات پورے طور پر نمایاں نہیں کرسکتی - اس لیے وہ آنکھہ، ھاتھہ، پھر جسم کے ہر حصے کی جذبات انگیز اداؤں سے دل کی ساری کائنات کو ماھرانہ رقص کے اشاروں میں مجسم کردیتی ھے - کلام کا

خاتمہ دل کے اندرونی جذبات کو ظہور میں لانے اور بیدار کرنے ولے نغمہ پر ہوتا ہے - اور جب انہیں جذبات آفریں کلموں کی بے انتہا سریلی لہریں اپنے آپ کو آنکھہ ، ہاتھہ ، پیر اور تمام جسم وغیرہ کی انداز بھری خاموش حرکات میں نمایاں کرنے لگتی ہیں تو رقص کا آغاز ہوتا ہے - اسی رقص کی حسین مجسم شکل کالیداس کی " مالویکا " ہے -

" ساہتیہ درپن "* کے مصنف نے پر لطف کلام کو شاعری کے نام سے تعبیر کیا ہے - لیکن شاعری ہی کیا ہر ایک روحانی فن کا پر کیف ہونا بے حد ضروری ہے - کلام الفاظ کے مجموعے کا نام ہے جب اس مجموعے میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو یہ شعر بن جاتا ہے - تصویر لکیروں اور رنگوں سے بنی ہوئی ہوتی ہے لیکن جب اس میں دل کے اندرونی جذبات جھلک اُٹھتے ہیں تو وہ جاندار ہوجاتی ہے - سنگیت (موسیقی) میں آواز کا میٹھا اور خوشگوار ارتعاش ہوتا ہے اور جب اس میں دل کے جذبات مل جاتے ہیں تو اس کے اندر انسان کا دل ویسے ہی چمکنے لگتا ہے جیسے بادل کے پانی کی بوندوں پر سورج کی کرنیں پڑنے سے قوس قزح نمودار ہوجاتی ہے - رقص بھی آنکھہ ، ہاتھہ ، پیر اور تمام جسم کی جنبش کی اداؤں سے ظہور پذیر ہوتا ہے اور جب اس میں اندرونی جذبات جھلکیاں دکھانے لگتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسان کا دل خود باہر آکر اپنی فطرتی خاموش زبان میں اپنے آپ کو نمایاں کر رہا ہے- شاعری میں جب تک جذبات کا رس نہو تو وہ صرف لفظوں کا کھیل ہی معلوم ہوتا ہے - اگر تصویر میں جذبات انگیز انسانی دل کا جلوہ نہ

---

* سنسکرت ادب میں اس کتاب کو اعلیٰ مرتبہ حاصل ہے -

ھو تو وہ صرف رنگ اور لکیروں کی بے جان شکل معلوم ھوتی ھے - اگر سنگیت میں انسان کے دل کے رس کا میل نہ ھو تو مٹھاس کے باوجود اس کا اثر دل کش نہیں ھوتا - اور اگر ناچ میں دلی جذبات کے رس کی جھلک نہ ھو تو وہ صرف جسم کی لرزش اور ایک قسم کی ورزش معلوم ھونے لگتی ھے - ''ساھتیہ درپن'' کے مصنف نے جس چیز کو رس کے نام سے یاد کیا ھے وہ اصل میں انسانی دل کے اندرونی جذبات کے سوا اور کوئی چیز نہیں ھے - جب یہی دل کے جذبات اپنے نام سے اصلی شکل میں لفظوں کے روپ میں نمایاں کرتے ھیں تو شاعری میں ایک ایسی چیز پیدا ھو جاتی ھے جو الفاظ سے بھی بالا تر ھوتی ھے - جیسے الفاظ اپنی بندشوں میں مقید کرتے ھوے بھی قید نہیں کرسکتے - تصویر کی لکیروں سے بنی ھوئی شکلوں میں جب یہ جذبات اپنے رنگ کو منعکس کرتے ھیں تو وہ لکیریں اپنے اندر اپنی حدود سے تجاوز کر جاتی ھیں - سنگیت کے نغموں میں جب دلی جذبات کی لطیف لہریں اُٹھنے لگتی ھیں تو ان لہروں میں سمندر کی موجوں جیسی لاانتہائی کانپنے لگ جاتی ھے اور جب رقص میں آنکھیں ، ھاتھ پیر ، لباس اور تمام جسم کی حیرت انگیز ادائیں دل کے اندرونی جذبات کو متحرک کردیتی ھیں تو اس ھر ایک متحرک انداز اور اشاروں میں بے انتہا جذبات کی جھلک دکھائی دینے لگتی ھے - دل کے جذبات پرور رس کے بغیر کوئی بھی حسن کارانہ چیز تھوڑی دیر کے لیے دل بہلائی کی چیز ھوسکتی ھے لیکن وہ کسی طرح ھماری زندگی کا ایک جیتا جاگتا عنصر نہیں ھوسکتی —

انگریزی زبان کے مشہور مصنف کارلائل نے اپنے ایک مقالے میں لکھا

ہے "موسیقی * دیوتاوں کی زبان ہے "- یہ الفاظ اُسے اس لیے لکھنے پڑے کہ گانے والوں کو اکثر اعلیٰ سوسائٹی میں خاص عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا اور اس وجہ سے معزز لوگوں کی نظروں میں موسیقی کی اہمیت بھی بہت کم رہ جاتی ہے - سنگیت کو تو پھر بھی بہت کچھہ وقعت حاصل ہے لیکن ناچ کا ساتھہ ایسے ماحول سے ہوگیا ہے کہ اس کا نام سنتے ہی اعلیٰ طبقے کے لوگ، ایک دم ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں - رقص کو عزت کی نگاہوں سے دیکھنا تو درکنار اس کا نام سنتے ہی لوگوں کے دلوں میں ایسا تنفر آمیز تذبذب پیدا ہو جاتا ہے جو بیان نہیں کیا جاسکتا - گویا یہ اس قابل نہیں کہ مہذب حضرات کے خیال میں بھی لایا جاسکے - شاعر اعظم کالی داس کو شاید اسی لیے ناچ کے استاد "گن داس † " کی زبان سے یہ کہنا پڑا کہ " رشی فرماتے ہیں کہ رقص دیوتاؤں کی آنکھوں کی سرور آگیں عید ہے " (یعنے دیوتاؤں کے لیے جشن شادمانی کا درجہ رکھتا ہے) - اگر سنگیت دیوتاؤں کی زبان ہے تو ناچ دیوتاؤں کی آنکھوں کے لیے حسین اور عیش سامان عید ہے - اس سے زیادہ کالیداس جو کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے " بھگوان مہادیو خود رقص کیا کرتے ہیں " - اس طرح وہ رقص کی بڑی تعریف کرتے ہیں —

ہندوستان میں جتنے "اُپ وید ‡" تھے ان میں ایک رقص کا بھی وید تھا - رقص کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ اس کو وید کے مقدس نام سے موسوم کیا گیا - پھر اس وید کی تخلیق کیسے ہوئی ؟

---

* Music is the Language of gods.

† ناٹک کا ایک کردار - مالویکا کا استاد رقص -

‡ ایسی الہامی کتابیں جو چاروں ویدوں سے ملحق تھیں -

اس کے بارے میں سنسکرت کی کتابوں میں یہ لکھا ہے —

सर्वशास्त्रार्थसम्पंन्न, सर्वशास्त्रविचक्षणम्
नाट्यसंज्ञमिमं वेदं, सेतिहासं करोम्यहम् ।
एवं सकल्प्य भगवान्, सर्ववेदाननुस्मान्,
नाट्यवेदं ततश्चक्रे, चतुर्वेदाङ्गसंभवम् ॥

یعنی "میں تمام شاستروں کے معنی سے لبریز تمام فنون کو نمایاں کرنے والے علم رقص کی پورے تسلسل کے ساتھ تخلیق کرتا ہوں - اس طرح خدا نے بالارادہ تمام ویدوں سے رقص کا وید پیدا کیا - پھر علم رقص کا پھل کیسا شاندار ہے ....

جو ناچ دکھلاتا ہے اور جو بڑے انہماک سے دیکھتا ہے ان دونوں کو وہی رتبہ حاصل ہوتا ہے جو چاروں ویدوں کو جاننے والوں' ہون کرنے والوں اور بڑے متبحر آدمیوں کو حاصل ہوتا ہے - مندرجہ بالا سطور سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ پرانے زمانے میں رقص کو کتنی بڑی اہمیت حاصل تھی لیکن اس وقت علم رقص نہ صرف بہت کچھ مفقود ہوگیا ہے بلکہ اس کی اہمیت ہمارے ملک میں صفر کے برابر رہ گئی ہے —

کسی چیز کی لرزاں حرکت کی تصویر کوئی بڑا باکمال اور ماہر مصور ہی کھینچ سکتا ہے - اسی طرح ناچ اور اس کے اشاروں کو الفاظ کے جامے میں محسوس طریقہ سے پیش کرنا کسی باکمال شاعر ہی کا کام ہوسکتا ہے - مہا کوی کالیداس نے " مالویکا " کے ناچ کا اپنی زبان میں ایسا ٹھیک اور سندر نقشہ کھینچا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا مالویکا زبان کے روپ میں خود اسٹیج پر ناچ رہی ہے' بعض مغربی عالموں نے " مالویکا " ناٹک کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ یہ ناٹک اس

کالیداس کا نہیں ہوسکتا جس نے "رگھونش" "میگھدود" اور شکنتلا جیسی کتابیں لکھی ہیں - جو علماء "مالویکا" کو کالیداس کی تصنیف مانتے بھی ہیں وہ خود اسے ایک معمولی درجے کا ناٹک سمجھتے ہیں - ہندوستان کے بہت سے سنسکرت کے پنڈتوں نے بھی ان کی اس ہاں میں ہاں ملادی ہے - اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ کالیداس کا پہلا ناٹک تھا اس لیے اگر اس میں ان کے قلم کی معجز نگار خاصیت نہیں پائی جاتی جو ان کی بعد کی لکھی ہوئی ناٹکوں اور شاعرانہ تصانیف میں پائی جاتی ہے تو کونسی تعجب کی بات ہے ؟ پروفیسر رائڈر (Prof. Ryder) اس ناٹک کو کالیداس کا لکھا ہوا مانتے ہیں لیکن وہ اسے کچھہ خاص اہمیت نہیں دیتے - وہ لکھتے ہیں کہ "اس * ناٹک کے پلاٹ میں کوئی اپج نہیں ہے اور نہ اس میں جذبات کی گہرائی پائی جاتی ہے" - ہمیں بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ان عالموں نے کس طرح مذکورہ بالا باتیں لکھہ ڈالیں ؟ اس ناٹک میں وہ سب خصوصیات موجود ہیں جو کالیداس کی دوسری تصانیف میں پائی جاتی ہیں - بھلا کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ سورج کی کرن ہو اور وہ پہچانی نہ جائے کہ وہ سورج کی ہے ؟ اور پھر اس میں وہ روشنی نہ ہو کہ اس کے سامنے دنیا کی ساری تجلیاں پھیکی نہ پڑجائیں ؟ - اس ناٹک میں کالیداس کا وہی اسلوب بیان وہی ' استعاروں بھری میٹھی میٹھی چٹکیاں ' وہی اندرونی جذبات کی لطافتیں اور موسیقی بھرے سادہ الفاظ کی تصویریں اور وہی حسن کارانہ سرور پایا جاتا ہے جو صرف انہی کے کلام میں حاصل ہوتا ہے - اس ناٹک کے کئی مصرعے زباں زد خلائق ہو کر

---

* The Prley

آسر ہوگئے ہیں —

آج ہمیں جو چیز بالکل معمولی سی معلوم ہوتی ہے صرف اس لیے کہ وہ بہت عام ہوگئی ہے اور اس میں کوئی دلکشی باقی نہیں رہتی وہی چیز پہلے پہل جب انسانی دلوں کے سامنے آتی ہے تو اس میں کتنا نیاپن اور وہ کس قدر حیرت خیز ہوتی ہے! آج مغربی علما اس ناٹک کے جس انداز بیان میں کسی قسم کی جدت محسوس نہیں کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ وہ تو صرف رسمی ہے وہی جب پہلے پہل اہل بصیرت کے آگے آئی ہوئی تو اس میں نہ صرف غیر معمولی جدت بلکہ قوت تخیل کی نزاکت کا حیرت انگیز سراغ ملا ہوگا - یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ اس طرح کی پلاٹ کو شاعر نے کسی دوسرے ناٹک سے یا کسی دوسرے ماخذ سے تو حاصل نہیں کیا - اگر اس نے پلاٹ کو کہیں لیا ہے تو تب اسے رسمی کہا جاسکتا ہے لیکن اگر یہ تمام اس کے ذہن کی پیداوار ہے تو اس کا رسمی ہونا اس پلاٹ کی خوبی کو ثابت کرتا ہے - ادبی تنقید کرنے والے بہت کھوج کرنے کے بعد بھی اس کا پتہ چلا سکے کہ اس کہانی کا ڈھانچا شاعر نے کہاں سے لیا ہے - بعض نے اس میں تاریخی واقعات کا پتا لگایا ہے لیکن یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ اس کا پلاٹ شاعر نے کہاں سے لیا ہے - کالیداس نے اپنے دوسرے ناٹکوں کی کہانیوں کے خاکے پرانوں اور مہابھارت سے لیے ہیں - اگر اس ناٹک کی بنیاد تاریخی واقعات کو مان لیا جائے تو اس میں یہ بھی ایک نئی بات ثابت ہوگی - اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ اس ناٹک کے خاکے کا تخیل شاعر کا اپنا ہے اور اس کا رسمی ہوجانا ثابت کرتا ہے کہ یہ غیر معمولی ہے - پھر اگر تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ

شاعر نے اس پلاٹ کو اپنے پیشروؤں سے حاصل کیا ہے تو بھی ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ کیا اس نے اپنی ذہانت سے اس کے اندر کوئی اپج پیدا کر کے اسے اپنا تو نہیں بنالیا ہے! لکھنے کے موضوع عام طور پر وہی ہوتے ہیں' وہی چیزیں ہوتی ہیں' وہی پلاٹ ہوتے ہیں لیکن یہ مصنف کا ذاتی اسلوب نگارش ہوتا ہے جو اس کے احساسات کو نمایاں کرتا ہے اور اس کا دل' اس کی حسن کارانہ گہری ذہانت ہوتی ہے جو اس میں دلکش جدت پیدا کردیتی ہے اور موضوعات کو اشیا کو اور پلاٹ کو ہر طرح سے شاعر ہی بنادیتی ہے —

اس ناٹک میں دو بڑے پاتروں کا ایک دوسرے سے علم میں اپنے کو بڑا ثابت کر کے دکھانے کا نظارہ' بسانت کے دنوں میں "اشوک" درخت کو کنواری لڑکیوں کے ٹھوکر مارنے کا اور اس درخت کی ٹہنیوں پر فوراً پھولوں کے نکل آنے کا اور خود ٹھوکر لگانے والے نازک پیروں کا سنگار کرنے کا سماں' اراوتی کے حسد بھرے دل کا نقشہ' راجہ اگنی مترکی چال بازانہ جھینپ' مسخرے کی ظرافت آفریں ذکاوت اور باریکی اور آخر میں رانی کا خود ہی "مالویکا" کو شادی کے لیے پیش کرنا' یہ تمام مناظر بڑی فن کاری سے کھینچے گئے ہیں - آخر میں رانی کا خود ہی "مالویکا" کو بیاہ دینا شاعر بہاری لال کے اس دوہے کی یاد دلا دیتا ہے —

"ماں* نہ ہو منہ دکھ راونی دل ہنسنی کری انو راگ"
ساس سدن من للن بھنوں سوتن اے سہاگ"

* گویا رونمائی کی رسم میں دلھن کی ساس نے گھر تحفتاً دیا' شوہر نے اپنا دل اور سوت نے اپنا سہاگ پیش کیا!

یہاں (منہ دکھ راونی) رونمائی میں نہیں لیکن اپنے شوہر کو خوش کرنے کے لیے رانی اپنے سہاگ کو مالویکا کی نذر کردیا ہے —

لیکن سارے ناٹک میں ہمیں سب سے سندر سین دوسرے ایکٹ کا معلوم ہوتا ہے - اس سین میں شاعر نے "مالویکا" کے ناچ کا مظاہرہ کرایا ہے - یہ سین اس قدر دلکش ' اتنا حیات آفریں اور پھر اس میں اتنی حیرت میں ڈالنے والی جدت طرازی ہے کہ اسے جتنی دفعہ پڑھا جائے اتنا ہی زیادہ لطف آتا ہے - ناچ مطالعہ کرنے کی چیز نہیں اگرچہ کالیداس نے اِسے اپنی گہری فن کاری سے الفاظ میں پیش کیا ہے - جب وہ ناچ آنکھوں کے سامنے اسی متحرک انداز میں آجائے تو یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ کالیداس نے اس ناٹک کے اندر دیوتاؤں کے دیکھنے کے قابل کیسی حیرت انگیز چیز پیدا کر دی ہے - ہمیں تو کئی دفعہ یہ محسوس ہوا کہ شاعر نے اسی منظر کو خاص طور پر پیش کرنے کے لیے اس ناٹک کو تیار کیا ہے - شاید دوسرے ایکٹ میں مالویکا کے رقص کو دیکھنے کے بعد شاعر خود مسخرے کی زبان سے کہہ رہا ہے * —

" न केवलं रूपे शिल्पेऽप्यद्वितीया मालविका "

راجہ اگنی مترا "مالویکا" کے ناچ کو دیکھ کر کہتا ہے —

" अव्याजसुन्दरीं तां विज्ञानेन ललितेन योजयता
परिकल्पितो विधात्रा वाणः कामस्य विषदिग्धः "

" اس سادہ حسین دوشیزہ کے ساتھ فن لطیف (موسیقی اور ناچ) کو ملا کر خدا نے گویا ' کام دیو ' کے پھولوں سے بنے ہوئے تیر کو

* " مالویکا " صرف حسن ہی میں نہیں بلکہ ناچ گانے میں بھی بے مثال ہے! -

زھر * میں بجھا ھوا بتادیا ھے پھولوں کا تیر اور وہ بھی زھر میں بجھا ھوا !
" مالویکا " کا اس سے سلندر بیان نہیں ھو سکتا - آج کل ھم اکثر پڑھتے ھیں کہ کسی ناٹک کی ایکٹرس یا رقاصہ سے کسی بڑے اور مالدار آدمی نے اس کے بے مثال حسن اور کمال فن پر فریفتہ ھو کر شادی کر لی ھے ' اگنی متر جیسے مہاراجہ کے ایک رقاصہ سے اس کے بے نظیر حسن اور رقص پر فریفتہ ھوکر شادی کرنے کے لیے بے چین ھو جانے کی تصویر جو کالیداس نے اپنے اس ناٹک میں پیش کی ھے گویا راجہ کی عظمت سے شاعر نے رقص کی عظمت پر مہر لگادی ھے - اگرچہ بعد کو پانچویں ایکٹ میں یہ معلوم ھوگیا ھے کہ " مالویکا " راج گھرانے کی ھے تو بھی راجہ نے اس کا علم ھونے سے پہلے ہی اپنے دل اور دماغ کو اس کی نذر کر دیا تھا —

معلوم ھوتا ھے کہ ھندوستان میں برار کا علاقہ حسن خیزی اور فن آفرینی میں کسی زمانے میں ضرور مشہور رھا ھوگا - راجہ " نل " کی بیوی " دمینتی " نے اسی ملک میں جنم لیا تھا - مہاراج سری کرشن کی بیوی " رکمنی " بھی اسی علاقے میں پیدا ھوئی تھیں - راجہ رام چندر کے دادا " اج " کی بیوی " اندومتی " بھی اسی دیس کی تھی - کالیداس کی مجسمہ یعنی یہ " زھر بجھا پھولوں کا تیر " بھی اسی ملک کی رھنے والی تھی - کئی شخص مالویکا نام سے یہ مطلب نکالتے ھیں کہ وہ شاید " مالوہ " کی رھنے والی تھی لیکن یہ ٹھیک نہیں - پانچویں ایکٹ میں صاف طور پر یہ پتہ چل جاتا ھے کہ مالویکا برار کے راجہ کے چچا کی بیٹی تھی - پھر اسی آخری

* " زھر میں بجھا ھوا پھولوں کا تیر " یہ الفاظ کتنے لطیف جذبات سے بھرے ھوے ھیں جو کالیداس ھی ادا کرسکتے تھے - شاعر بہاری لال کی شاعری کو " ناوک کے تیر " کہا جاتا ھے - کالیداس کے اشعار کو زھر بجھے پھولوں کے تیروں سے تشبیہہ دینا بالکل مناسب ھو گا -

ایکٹ میں " مالویکا کا سنگار بھی برار دیس کے رسم و رواج کے مطابق کیا گیا ہے - اس بیان کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کے سنگار میں کچھہ خاص رونق تھی - پانچویں ایکٹ میں مسخرہ راجہ سے کہہ رہا ہے کہ رانی نے پنڈتا کوشکی سے کہا -

'' भगवति ! यत्वं प्रसाधनगर्वं वहासि तद्दर्शय

मालविकाया शरीरे वैदर्यं विवाहतेपथ्यम् ।

तया च सविशेषालङ्कृता मालविका ''

" شریمتی جی آپ کو اگر سجانے اور سنگھار کرنے کا بڑا گھمنڈ ہے تو '' مالویکا '' کو برار دیس کی ریتی سے شادی کے کپڑے پہنا کر سجا کر دکھلاؤ '' - چنانچہ اس نے بڑی تزئین کے ساتھہ '' مالویکا '' کا سنگار کیا - اس کی توضیح کرتے ہوے راجہ '' کاٹ یویم '' لکھتا ہے کہ برار کے علاقے کے رہنے والوں کا سنگار سجانے کا طریقہ مشہور ہے - اس کے سوا سنسکرت زبان میں لکھنے کے ایک اسلوب کو " براری اسلوب " کہتے ہیں - اس اسلوب کی تعریف ساھتیہ درپن کے مصنف نے یوں کی ہے -

माधुर्यव्यञ्जकैर्वर्णैः रचना ललितात्मिका

अवृत्तिरल्पवृत्तिर्वा वैदर्भी रीतिरिष्यते ।

شیریں اور سادہ الفاظ نیز چھوٹے چھوٹے جملوں والی عبارت کو '' براری اسلوب " کی تحریر کہتے ہیں - شاید سنسکرت کے اس اسلوب نگارش کا وجود بھی برار سے متعلق ہے -

برار کے علاقے کی اس حور تمثال دوشیزہ کے رقص کا منظر دوسرے ایکٹ میں بڑی خوبی سے دکھلایا گیا ہے - پنڈال (ناٹک گھر) میں ایک جانب راجہ، مسخرہ، رانی اور اس کا خاندان بیٹھا ہوا

ہے اور دوسری طرف باجا بج رہا ہے اور رقص کے دونوں استاد جنہیں شاعر "جذبات مجسم" کہتا ہے، موجود ہیں - رقص کا امتحان لینے کے لیے تارک دنیا سنیاسن پنڈتا "کوشکی *" کو حکم بلایا گیا ہے - سنیاسن کو ناچنے کا حکم چن کر گویا شاعر نے ناچ کی معصومیت کو ثابت کر دیا ہے - دونوں رقص کے استاد اپنے شاگرد کے ذریعہ یہ دکھاتے ہیں کہ وہ رقص کے کتنے بڑے ماہر ہیں - اس رقص کے لیے جسم کے اعضا کے سڈول ہونے، اُن میں خوش گوار تناسب، لوچ اور خوشنمائی کی ضرورت بتلائی گئی ہے - علم رقص میں سے "چلت" نام کے رقص کی نمائش کی جاتی ہے کیونکہ "چلت" ناچ ہی سب سے زیادہ مشکل سمجھا جاتا ہے -

---

* سنیاسن پنڈتا کوشکی کو بہت سے محققوں نے بدھ بھکشن (Budhist nun) لکھا ہے - بہت کھوج کرنے کے بعد بھی ہمیں یہ پتا نہیں چلا کہ یہ خیال کس طرح پھیل گیا - اس سارے ناٹک میں پنڈتا کوشکی کے کردار سے یہ کہیں مترشح نہیں ہوتا کہ وہ بھکشن تھی - اس نے ایک بار بھی کہیں بدھ بھکشنیوں کی طرح بدھ کا نام نہیں لیا - لیکن دوسرے سنسکرت کے ناٹکوں میں جب بدھ بھکشو آتا ہے تو وہ بدھ کو سلام کرتا ہوا اور اس کی مدح کرتا ہوا نمودار ہوتا ہے - بدھ بھکشو پراکرت میں بولتے ہیں لیکن یہ سنیاسن ہمیشہ سنسکرت زبان میں بولتی ہے - کالیداس نے کوشکی کو "آریہ کوشکی" "پنڈتا کوشکی" اور "مجسم روحانی علم" جیسے باعزت ناموں سے یاد کیا ہے - اس ناٹک کے شارح راجہ "کاٹے دیوم" نے بھی اپنی شرح میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ وہ بدھ بھکشن تھی -

پانچویں ایکٹ میں پنڈتا کوشکی نے جب اپنا پورا تعارف کرایا ہے تو اس نے صرف اتنا ہی کہا کہ مجھے اپنے بڑے بھائی "آریہ سومتی" کی موت سے بڑا صدمہ پہنچا اور میرے دل میں اپنے بیوہ ہونے کا دکھ پھر جاگ اٹھا - اس لیے میں نے دنیا کو ترک کر کے بھگوے کپڑے اختیار کرلیے ہیں - کوشکی نے کبھی یہ نہ کہا کہ وہ بدھ ہوگئی ہے - صرف گیروے کپڑے پہننے سے یہ قیاس قایم کرنا کہ وہ بدھ ہو گئی تھی، کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ ہمارے ہاں سنیاسی اسی رنگ کے کپڑے پہنتے تھے اور سنسکرت کی کتابوں میں بیوہ عورت کو "گیروے کپڑے پہننے والی" کہا گیا ہے - ہمیں کوشکی کے تمام کردار کا مطالعہ کرنے سے کہیں بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ بدھ بھکشن تھی - ہماری رائے میں یہ تنقید نگاروں کی خیال آرائی ہے -

اس ناچ میں ناچنے والا اپنے جسم، زبان، کپڑے اور یہاں تک کہ پسینے وغیرہ کی کیفیت سے اور اشاروں سے دوسروں کے دلی جذبات کو نمایاں کرتا ہوا اپنے اندرونی جذبات کو پیش کر دیتا ہے - اس کو سنکرت زبان میں "چھلک" بھی کہتے ہیں - مالویکا نے اسی " چلت " ناچ کو ناچ کر دکھایا ہے -

ناچ سے پہلے وہ ایک چھوتا سا تعارفی گانا گاتی ہے - اس کے بعد اصلی ناچ والا گانا شروع کرتی ہے —

" दुर्लभः प्रियतास्मिन् हृदय भव निराशम्,
अहो अपाङ्गको मे स्फुरति किमपि वाम ।
एष स चिराद् दृष्टः कथमुपनेतव्यो,
नाथ मां पराधीनां त्वयि गणय सतृष्णाम् ॥ "

مالویکا نے سنسکرت کا بلکہ پراکرت زبان کا گیت گایا ہے - ہم یہاں اس کا ترجمہ جو شاعر نے خود سنسکرت زبان میں کیا ہے، پیش کرتے ہیں - اس کا ترجمہ یہ ہے "پیارے کا ملنا کٹھن ہے: اس لیے اے دل تو نراس ہو جا - ہیں! یہ میری * بائیں آنکھ کیوں پھڑک رہی ہے؟ میں نے اپنے پیارے کو بہت دنوں پہلے دیکھا تھا - اس کے پاس کیسے جاؤں - اے ناتھ میں پرادھین ہوں (پرادھین کے معنی اپنے آپ پر قدرت کا نہ ہونا ہے) میں تمہارے پاس نہیں آسکتی لیکن تم تو مجھے اپنی چاہنے والی ہی سمجھنا! " —

---

* سنسکرت میں ایک علم " ہے جس کا نام " شگون کا علم " ہے - اس میں لکھا ہے کہ عورت کی بائیں آنکھ اور مرد کی دھنی آنکھ کا پھڑکنا بہت مبارک ہوتا ہے اسی طرح عورت کا بائیں ہاتھ اور مرد کے داھنے ہاتھ کا پھڑکنا بھی مبارک ہے -

اس کے بعد وہ اپنے ناچ میں اس گیت کے تاثرات کو دکھاتی ہے - ہم نہ تو سنگیت کو جانتے ہیں اور نہ ناچ کو' لیکن اس نظم کی ترکیب کچھہ ایسے الفاظ میں ہوتی ہے کہ ہمیں اس میں ناچ جھلکتا ہوا معلوم ہوتا ہے جو مالویکا نے ناچ کے دکھایا ہے - اس گیت کی پہلی سطر میں نراشا ہو رہی ہے' دوسری سطر میں ایک دم آشا پھوٹ رہی ہے اور تیسری سطر میں ملنے کا سوال پیدا ہوتا ہے اور لاچاری سامنے آتی ہے' اس پر بھی وہ اپنی چاہ کے درشن کرادیتی ہے! ان متغیر جذبات میں معلوم ہوتا ہے کہ مالویکا نے اپنے ناچ سے ہم آہنگی پیدا کرلی ہوگی۔ اس ناچ کی دنقید پنڈتا کوشکی کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ناچ کی تشریح او اس کے حقیقی اصول کی توضیح کرتے ہوے شاعر نے "مالویکا" کے اس سندر ناچ کی تصویر کو لفظوں میں اُتار دیا ہے - نیدا سن پنڈتا کوشکی کہتی ہے —

"अङ्गैरन्तर्निहितवचनैः सूचितः सम्यगर्थः,

पादन्यासो लयमुपगतस्तन्मयत्वं रसेषु ।

शाखायोनिर्मृदुरभिनयस्तद्विकल्पानुवृत्तौ,

भावो भावं नुदति विषयाद्रागबन्धः स एव ॥"

"آنکھہ ہاتھہ پیر وغیرہ جسم کے اجزاء نے جن کے اندر زبان سمائی ہوئی تھی (جو اشاروں کی زبان سے بول رہے تھے) دل کے جذبات کو اچھی طرح نمایاں کردیا - پیروں کی ضربیں لے کی بالکل ہم آہنگ تھیں - اور جیسے جذبات تھے ویسی ہی اس کی اداکاری تھی - یعنی وہ جن جذبات کو ناچ کر دکھاتی تھی انہی کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی - ہاتھوں کا تھرکنا نہایت نازک تھا اور جیسے جیسے ایک جذبہ کے بعد دوسرے

جذبے کا ناچ ہوتا تھا تو وہ دوسرا جذبہ پہلے کی جگہ بالکل قدرتی طور پر مجسم ہوجاتا تھا۔ ہر ایک جذبہ دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ناچ کے اشاروں میں جلوہ دکھاتا تھا۔ لیکن دل کی لذت اور خوشی کا وہی عالم تھا، یعنی جدا جدا اداؤں میں فرق تو پڑجاتا تھا لیکن دل یکساں طور پر محظوظ ہوتا جاتا تھا۔ پہلے جذبے کے ناچ میں دل جس قدر لذت اور حظ محسوس کرتا تھا ویسے ہی دوسرے جذبات سے لذت اندوز ہو رہا تھا۔ "مالویکا" نے اپنے جسم کے اعضا کی حرکت سے دل کے جذبات کا کیسا اچھوتا ناچ ناچا ہے!" —

مذکورہ بالا اشلوک کے پورے اور ٹھیک ٹھیک معنی تو علم رقص کا کوئی استاد ہی سمجھ سکتا اور سمجھا سکتا ہے لیکن اتنا تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ جس ناچ کا پنڈتا کوشکی نے ایسا بے مثل بیان دیا ہے وہ خود عملی شکل میں کتنی گہرائی سے اپنے آپ کو نمایاں کرنے والا ہوگا۔ اس اشلوک میں کالیداس نے خود رقص کی جیتی جاگتی ناچ کرتی ہوئی تصویر پیش کردی ہیں۔ ویسے تو ہر ایک ناٹک میں ناچ ہوا ہی کرتے ہیں لیکن ناچ نہ صرف بے معنی اور فضول ہوا کرتے ہیں بلکہ ان سے لوگوں کے مذاق پر برا اثر پڑتا ہے۔ ان ناچوں میں بہت ہی کم ایسے ناچ ہوتے ہیں جنہیں علم رقص کے کسی دور کے معنوں میں بھی ڈھینچ کھانچ کر رقص کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی ناچوں سے تہذیب یافتہ طبقوں میں ناچ وہ درجہ حاصل نہ کرسکا جو دوسرے فنون لطیفہ کو حاصل ہے۔ ان ناچوں میں صرف جسم کا ہی ناچ ہوتا ہے، دل کے جذبات کے ناچ کی اداکاری نہیں ہوتی۔ "مالویکا" کے اس ناچ میں اور اُن ناچوں میں وہی فرق ہے جو خالی تک بندی

اور جذبات سے بھری شوریں اور موسیقی سے لبریز شاعری سے ہوتا ہے۔ یہ وہ ناچ ہے جسے دیکھ کر دیوتاؤں کی آنکھیں بھی ستایش کریں گی۔ صرف ہاتھوں کی حرکت اور پازیب کی چھم چھم اور اس کے ساتھ سریلے سروں میں گا دینا ہی ناچ نہیں، جب تک ہاتھوں کی حرکت، پازیب کی جھنکار میں دل کے اندرونی جذبات متحرک ہو کر چھما چھم نہ کرنے لگیں تب تک اس قسم کے ناچ سے شاید کچھ تھوڑی بہت دل بہلائی ہو جائے تو ہو جائے لیکن اس کا کچھ خاص دیرپا اور گرویدہ کرنے والا اثر نہیں پڑ سکتا۔ جذبات سے خالی ناچ ایک قسم کا دل بہلانے والا جسمانی کھیل ہو سکتا ہے لیکن اس میں دل کے اندرونی جذبات ملے ہوئے نہیں ہوتے اس لیے وہ زندگی پر کوئی لطف اور حیات پرور اثر نہیں ڈالتا۔ ایسا ناچ انسانی زندگی کے دل کا جز نہیں بن سکتا۔ اس ناٹک میں مالویکا کا ناچ کچھ تھوڑے سے لمحوں کے لیے دل کو بہلانے والی چیز نہیں ہے بلکہ وہ انسانی زندگی کے اندرونی جذبات کے اظہار کی ایک، حقیقت ہے جو خود انسانی زندگی کی طرح طلسماتی، عظیم الشان اور ہمیشہ زندہ رہنے والی شے ہے۔ بعض ناٹکوں میں کسی خاص خیال کو یا پر جذبات واقعہ کو آہستہ آہستہ مکمل کیا جاتا ہے اور اس تدریجی تکمیل میں ہمیں اس کی اندرونی خصوصیات کا علم ہوتا ہے۔ لیکن کئی ایک ناٹکوں میں کسی ایک سین کو خاص اچھوتے پن سے دکھا دیا جاتا ہے اور وہی اس ناٹک کی جان ہوتی ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ اس "مالویکا" ناٹک میں شاعر نے ناٹک کے آخر تک اندرونی محبت کہ جذبے کے اظہار کے سوا اور کسی خاص خیال کو اس پریم کے ساتھ شروع سے آخر تک نہیں دکھایا ہے۔ اسی لیے شاید بہت سے

تنقید کرنے والے اس ناٹک میں کسی انسانی جذباتی خصوصیت کو محسوس کرنے میں قاصر معلوم ہوتے ہیں ، لیکن پھر بھی اس ناٹک کے دوسرے ایکٹ میں کالیداس نے "مالویکا" کے اچھوتے ناچ کی جس قابل قدر فن کاری سے نمایش کی ہے وہ بیان کرنے کی نہیں بلکہ دیکھنے کی ہی چیز ہوسکتی ہے - وہ دیوتاؤں کی آنکھوں کا نشاط افروز جشن ہے - اگرچہ اس ناچ کی لفظی تصویر بھی کالیداس نے ناچ کو بیان کرتے ہوے مجسم شکل میں آنکھوں کے سامنے رکھہ دی ہے - تاہم اس سے اس کی خوبیوں کا کافی اندازہ نہیں ہو سکتا - پورے طور پر تو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب اسے عملی طور پر دیکھا جائے - علم رقص میں تو ناچ کو عملی طور پر پیش کرنے ہی کی اہمیت ہے - اس لیے اس ناچ کی قیمت کو کامل طور پر سمجھنے کے لیے ناٹک میں اس سین کو پڑھ لینا کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا - اس کی خصوصیت ، اس کا کامل اچھوتا پن تب ہی معلوم ہو سکتا ہے جب کہ یہ سین آنکھوں کے سامنے شاعر کی بیان کی ہوئی صورت میں رقص کرنے لگے اور تب یہ ایک ہی سین اس ناٹک کی اس لطف آفرین عظمت کو دکھا سکتا ہے جو سنسکرت زبان میں کالیداس کے سوا شاید ہی کوئی اور شاعر دکھا سکے ! اس ایکٹ کو پڑھنے سے ہندوستان میں علم رقص کی عظیم الشان تکمیل کی ایک حسین جھلک آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور وہی جھلک کالیداس کی "مالویکا" معلوم ہوتی ہے —

معزز الفاظ کی توہین

اردو زبان میں

از

(جناب شیخ محمد اسمعیل صاحب سکرٹری اورنٹیل پبلک لائبریری پانی پت)

قوموں کی ترقی و تنزل اور عروج و زوال کے اسباب و محرکات پر غور کرنے والے اور ملکوں کی معاشرتی اور تمدنی تاریخ کے ماہر اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ جب کوئی قوم بام عروج سے پستی کی طرف گرنی شروع ہوتی ہے تو اُس کی ہر حرکت اور اُس کے ہر قول میں عام طور پر دنائت، کمینگی اور سفلہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اُس کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں۔ اس کی مالی حالت بدتر ہو جاتی ہے۔ اس کی جسمانی حالت کمزور ہو جاتی ہے۔ اس کی الوالعزمی اور ہمت جاتی رہتی ہے۔ علم کا شوق اس میں باقی نہیں رہتا۔ زمانہ بھر کی بدکاریاں، بدتمیزیاں اور بیہودگیاں اس میں آہستہ آہستہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور سب سے زیادہ بول چال اور زبان اس قدر خراب ہو جاتی ہے جس کی انتہا نہیں۔ بات بات پر مردوں کا گالیاں بکنا اور عورتوں کا کوسنے دینا اس قوم کا روز مرہ کا معمول ہو جاتا ہے۔ اور پھر گالیاں بھی اتنی فحش اور گندی کہ ایک سنجیدہ آدمی تو ان کو سن کر لرز اٹھے۔ یہ دیوانگی یہاں تک بڑھتی ہے کہ آدمیوں کو چھوڑ کر اس قسم

کے وحشی انسان جانوروں یہاں تک کہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی مغلظ گالیاں دیتے ہیں کہ آدمی سن کر حیران ہو جائے - مبالغہ نہیں واقعہ ہے کہ میں نے بوڑھے بوڑھے مہذب انسانوں کو اپنے لڑکوں اور دوسرے کے بچوں کو نہایت پیار میں "بدمعاش" کہتے سنا ہے - اور جو سچ پوچھو تو یہ بھی بہت ہی معمولی لفظ ہے - سامعین میں سے سینکڑوں اصحاب نے لوگوں کو محض پیار میں اپنے شیر خوار بچوں اور گود میں کھیلنے والے لڑکوں کو بہت بڑی بڑی گالیاں دیتے دیکھا اور سنا ہوگا - اس واقعہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہماری گالیاں کھاتے کھاتے اور سنتے سنتے ہمارا معصوم لخت جگر خود بھی اپنے ہمجولیوں کو گالیاں دینے لگتا ہے - اب چونکہ ہمارا بویا ہوا درخت پھل لانے لگتا ہے لہذا ہماری خوشی کی کوئی حد نہیں رہتی - بہت سی مائیں اس بات کی آرزو کیا کرتی ہیں کہ ہمارا ننھا کب بڑا ہو اور کب وہ باہر سے کسی بچے کو گالیاں دے کر آئے اور ہمارا دل ٹھنڈا ہو - اور درحقیقت وہ دن ماں کے لیے عید کا دن ہوتا ہے - اس سلسلہ میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ والد بزرگوار بڑے شوق سے بچے کو سکھا رہے ہیں کہ " ہاں بیٹا! اپنی ماں کو یہ گالی دو " - اور جب بچہ اپنی توتلی زبان میں باپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے تو سارا گھر سارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بن جاتا ہے - بچے کی خوب پیٹھ ٹھونکی جاتی ہے اور اس سے بار بار وہی گالی ماں کو دلوائی جاتی ہے - انصاف اور غور کیجیے کہ اس سے زیادہ اخلاق کو تباہ کرنے والی اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟

معاملہ صرف اسی حد تک نہیں رہتا بلکہ ہم نے ایک قدم آگے بڑھایا ہے اور زبان کے وہ الفاظ جو نہایت مقدس و متبرک یا بیحد معزز اور

محترم تھے آج کل ہم نے اُن کو ایک نیا لباس پہنایا ہے - جس کے بعد ان لفظوں کی شکل بالکل مسخ اور برعکس ہوگئی ہے - اور ہمارے اخلاق کی خرابی اور مذاق سلیم کی بدذوقی کی وجہ سے جو لفظ جتنا زیادہ مقدس تھا وہ اب اتنا ہی بدترین سمجھا جاتا ہے - اور جو لفظ جس قدر زیادہ معزز تھا آج کل وہ اتنے ہی ذلیل معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے - مثلاً چند الفاظ عرض کرتا ہوں : —

(۱) " حضرت " - اس سلسلے میں سب سے زیادہ جس مقدس لفظ کی توہین اور بے عزتی کی جا رہی ہے وہ لفظ " حضرت " ہے - ظاہر ہے کہ یہ لفظ خدا تعالیٰ کے پاک نبیوں ، اولیاء اور مقدسین مذاہب کے نام کے ساتھ تعظیماً استعمال کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا - مگر اردو زبان کی بدقسمتی اور ہماری کور ذوقی دیکھیے کہ آج کل یہی مقدس ترین لفظ بدترین شریر ، نہایت اوباش اور چھٹے ہوئے بد معاش ، بے حد چالاک ، عیار اور مکار انسان کے لیے بولا جاتا ہے - افسوس صد افسوس —

(۲) " خلیفہ " - یہ لفظ مذہب اسلام کی نہایت مقدس اصطلاح ہے - اللہ تعالیٰ یا انبیائے کرام کے نائبین کو اس معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے - جیسے خلیفۃ اللہ یا خلیفۃ الرسول - خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا " اِنی جاعلٌ فی الارض خلیفہ " آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں کو " خلفائے راشدین " کہتے ہیں - لیکن آہ کس قدر افسوس ہے کہ اس قدر متبرک لفظ ہماری زبان میں آکر اپنی تمام عزت و وقعت کھو بیٹھا - اور آج کل نائی اور حجام یا پہلوان کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے —

(۳) " صلواۃ " - اس لفظ کو دیکھیے اور ہماری اخلاقی حالت پر روئیے -

کون نہیں جانتا کہ اس کے حقیقی اور واقعی معنی " نماز ' دعا ' درود ' بخشش اور خدا کی رحمت و سلامتی " کے ہیں - مگر درحقیقت رونا آتا ہے جب ہم کسی سے یہ فقرہ سنتے ہیں " خواہ مخواہ اُس نے مجھے ہزارہا صلواتیں سنائیں " - مطلب یہ ہے کہ بہت سی گالیاں دیں - اب بتلائیے - نماز و دعا اور گالی و دشنام میں کتنا فرق ہے ؟ مگر ہم روز مرہ یہ لفظ بولتے ہیں اور کبھی قطعاً ہمیں خیال نہیں آتا کہ کس قدر پاک اور متبرک لفظ کو کتنی بری اور بیہودہ جگہ استعمال کر رہے ہیں —

(۴) " علامہ یا علامۂ دہر " - فاضل یگانہ اور عالم بے مثل اس لفظ کے معنی ہیں - جو ظاہر ہے کہ بہت بڑا لفظ ہے مگر ہماری قدردانی دیکھیے کہ آج کل یہ لفظ بڑی حرّافہ ' نہایت چالاک ' بڑی عیارہ اور نہایت دھوکہ باز عورت کے لیے بولا جاتا ہے —

(۵) " مُلّا " - اس لفظ کا بھی حشر اردو میں آکر علامہ جیسا ہوا - اس کے معنی بھی بہت بڑے عالم اور فاضل ادیب کے ہیں - اس سے زیادہ اس لفظ کی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ ایک زمانہ تھا جب کہ یہ لفظ فیضی ' ابوالفضل اور جامی جیسے فضلائے یگانہ کے ناموں کا جز تھا اور آج کل جاہل ' بیوقوف ' کودن اور احمق کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے - نیز ان فقیر نما انسانوں کے لیے جو مسجدوں کے حجروں میں رہتے اور محلہ کے گھروں کی روٹیوں پر جو بطور خیرات وہ دونوں وقت مانگ کر لے آتے ہیں ' گزر کرتے ہیں —

(۶) " مولوی یا مولانا " - اس لفظ کے معنی ہیں وہ شخص جو خدا کا ہو رہے - یا صاحب علم - مگر اس لفظ کی آج کل وہ مٹی پلید ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ - مسلمانوں میں ہر وہ شخص جو تحریک خلافت ' تحریک

ہجرت اور ترک موالات میں شامل تھا - یا جس نے ذرا سی ڈاڑھی رکھ لی بس وہ مولوی ہے - خواہ کندۂ ناتراش اور جاہل محض ہی ہو - یہ لفظ جہلا کے لیے اب اس قدر کثرت سے استعمال کیا جانے لگا ہے کہ اصلی اور حقیقی عالم اپنے آپ کو مولوی کہلاتے ہوئے شرمانے لگے ہیں -

(۷) "قبلہ" - مسلمانوں کے سب سے زیادہ مقدس مقام کعبہ کو قبلہ کہتے ہیں - یعنی جدھر منہ کرکے سب مسلمان پانچ وقت نماز ادا کرتے ہیں - مگر آج کل اخلاق اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ ہر اچھے لفظ کو قصداً نہایت برے معنوں میں ڈھال لیا گیا ہے - چنانچہ قبلہ آج کل نہایت عیار مکار اور چالاک آدمی کے متعلق بولتے ہیں -

(۸) "اللہ" - اب بھلا بتائیے کہ خدا تعالیٰ سے زیادہ مقدس ہستی ایک مسلمان کے لیے اور کون سی ہو سکتی ہے - مگر افسوس ہے کہ اس قادر و قیوم ذات کو بھی ہم نے خالی نہ چھوڑا - وہ ذات پاک جو آسمانوں اور زمینوں کی مالک اور ان کی خالق ہے، وہ شہنشاہ جو دونوں جہانوں کا مالک اور آقا ہے ہم نے اس کے متعلق جو فقرے اور محاورے ایجاد کر رکھے ہیں وہ انتہائی غریبی اور مفلسی کو ظاہر کرتے ہیں - چنانچہ جب ہم کہیں گے کہ "گھر میں اللہ ہی اللہ ہے" یا "اللہ کا نام ہے" تو ہمیشہ اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ گھر میں نہایت مفلسی، غریبی اور محتاجی ہے اور اس وقت محتاج یا سائل کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں - کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اس مطلب کو ظاہر کرنے کے لیے ہم نے نام بھی چھانٹا تو اس ذات اقدس کا جس کے قبضہ قدرت میں تمام جہان کے خزانے ہیں اور بڑے بڑے باجبروت شہنشاہوں کو دم کے دم میں خاک میں ملا سکتا ہے - کیا ہمیں دنیا

جہاں میں کوئی اور لفظ اللہ کے سوا اس مطلب کو ظاہر کرنے کے لیے نہیں مل سکتا تھا؟

(۹) "انشاءاللہ" - قرآن کریم میں خداتعالیٰ کا تاکیدی حکم ہے کہ جب تم کسی کام کا وعدہ کرو تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ لیا کرو کہ "اگر خدا نے چاہا" - اگلے زمانے میں مسلمانوں کا وعدہ پتھر کی لکیر ہوتا تھا - اور مخاطب "انشاءاللہ" کا لفظ سنتے ہی پورے طور پر اپنے کام کی طرف سے مطمئن ہو جاتا تھا - اور وعدہ کرنے والے شخص پر بھی انشاءاللہ کہنے کے بعد (یعنی خدا کو اپنے وعدے پر گواہ کرلینے کے بعد) اس وعدے کا پورا کرنا بے حد ضروری ہو جاتا تھا - مگر یہ سب کچھ پہلے زمانے کی باتیں ہیں جو قصے کہانیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں - آج کل کے مہذب اور روشن زمانے میں جب انشاءاللہ کا لفظ کسی کے منہ سے نکلتا ہے تو مخاطب کو معاً اس بات کا یقین ہوجاتا ہے کہ یہ سب ٹالنے کی باتیں ہیں اور یہ شخص ہرگز ہرگز میرا کام نہیں کرے گا - میں نے اکثر لوگوں کو انشاءاللہ کے جواب میں یہ کہتے سنا ہے کہ "انشاءاللہ نہیں، پکا وعدہ کرو" - مطلب یہ ہے کہ انشاءاللہ کہنا وعدہ خلافی اور کام نہ کرنے کا آج کل یقینی ثبوت سمجھا جاتا ہے - افسوس —

(۱۰) "اُستاد" - ماں باپ کے بعد تعظیم و تکریم کے لحاظ سے اُستاد کا درجہ اخلاق کی قدیم کتابوں میں تسلیم کیا گیا ہے - مگر ہماری بول چال میں آکر اس لفظ کے معنی نہایت چالاک، فریبی اور دغا باز کے ہوگئے - زمانے کا انقلاب ہے —

(۱۱) "گرو" - اس لفظ کی قسمت بھی بالکل لفظ اُستاد کے ساتھ بندھی ہوئی ہے —

(۱۲) "مرشد" - اس لفظ کے معنی عربی میں ہادی، رہنمائے مذہبی، ہدایت کرنے والا، راہ بتانے والا اور پیر طریقت کے ہیں - ظاہر ہے کہ اپنے حقیقی معنوں کے لحاظ سے یہ لفظ کس قدر مقدس اور محترم ہے - مگر اردو کے سانچے میں ڈھل اور بازاری آدمیوں کی زبان پر چڑھا تو اس کے معنی بڑے چالتے پرزے اور عیار و مکار اور چالاک انسان کے ہوگئے - نہ معلوم تمام اقسام کے بدترین اور بیہودہ مطالب کو ظاہر کرنے کے لیے مقدس ترین الفاظ کی فوج پر کیوں ڈاکہ ڈالا گیا - میں نہایت ممنون ہوں گا اگر کوئی صاحب اس کی معقول اور مدلل وجہ بتائیں گے —

(۱۳) "ولی" - اس لفظ کے معنی ہیں خدا کا خاص مقرب بندہ اور اس کے عشق میں سرشار - مگر ہمارے ہاں آن کر یہ لفظ مرشد سے بھی زیادہ بدترین معنوں میں استعمال ہونے لگا - آپ نے مشہور مصرع سنا ہوگا —

هم تو مرشد تھے تم ولی نکلے

(۱۴) حافظ جی - کیسا سیدھا سادہ اور عام فہم لفظ ہے - اس کے معنی ہیں وہ شخص جس نے قرآن پاک حفظ کرلیا ہو - مگر یار لوگوں نے اس کے معنی اندھے کے بنالیے یا پھر مسجد کے ملا کے - چاہے وہ دونوں الحمد بھی پڑھے ہوئے نہ ہوں —

(۱۵) "جہاد" - یہ ایک مقدس مذہبی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے دین کی اشاعت اور خداوند کریم کی رضا کی خواہش میں اپنی جان لڑا دینا - لیکن وائے بدقسمتی کہ آج کل یہی مقدس لفظ ہر بغاوت، ہر سرکشی اور ہر فتنہ و فساد کی آگ کو بھڑکانے کے وقت بہت فخر یہ طور پر استعمال کیا جاتا ہے - ہندوستان کے موجودہ

دور میں کون ہے جس نے " جہاد آزادی " اور " جہاد حریت " کے لفظ نہیں سنے ؟

(۱۶) " معجزہ " - ہندوستان میں آکر جس قدر اس مقدس لفظ کی بے عزتی ہوئی ہے شاید ہی کسی کی ہوئی ہو - یہ خالص مذہبی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں وہ عظیم الشان غیر معمولی نشان جو سوائے نبی اور رسول کے دنیا میں کوئی اور شخص نہ دکھا سکے - مذہبی اصطلاح میں یہ لفظ صرف نبی کے لیے بولا جاتا ہے - کسی اور کے لیے ہرگز نہیں - یعنی اگر کسی ولی یا قطب یا غوث یا ابدال سے کوئی نشان ظہور میں آئے تو اُسے بھی معجزہ نہیں کہیں گے - مگر یہ مقدس مذہبی اصطلاح آج کل بہت ہی معمولی معمولی کاموں کے لیے استعمال ہونے لگی ہے - امراض خبیثہ اور شرمناک بیماریوں کے اشتہارات پر جو ہر اخبار میں بیسیوں ہوتے ہیں آپ اکثر لفظ " معجزہ " موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا پائیں گے - للہ مجھے کوئی شخص بتائے کہ کیا یہ حرکت اس مقدس لفظ کی صریح توہین نہیں ؟

(۱۷) " مومن " - اس لفظ کے معنی ہیں نہایت سچا اور پکا مسلمان اور نیک مرد - لیکن اس سے زیادہ ستم ظریفی اور کیا ہوگی کہ آج کل اس لفظ سے نہایت احمق اور بیوقوف مراد لی جاتی ہے - اور جلاہے جو بدقسمتی سے بیوقوفی میں ضرب المثل ہو چکے ہیں ' اس نام سے پکارے جاتے ہیں —

(۱۸) " بہشتی " - یہ بھی مومن کے تائب کا لفظ ہے - لفظی معنی ہیں بہشت میں رہنے والا یا جنت میں جانے والا - لیکن ہماری زبان میں سقے اور ماشکی کو کہتے ہیں - اور اس کی ایک نہایت بیوقوفانہ تاویل یہ

بنا رکھی ہے کہ چونکہ سقا پانی بھرتا ہے اور پانی پلانا چونکہ ثواب کا کام ہے اور ثواب کا کام کرنے کا نتیجہ جنت ہے لہذا اس مناسبت سے سقہ کو بہشتی کہا جاتا ہے - چاہے وہ صرف ایک ڈول مشک میں ڈال کر پھونک سے ہی ساری مشک پھلالے مگر کہلائے گا بہشتی ہی - ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

(۱۹) " قلندر "- آج کل کے زمانہ میں کون یقین کرسکتا ہے کہ اس لفظ کے معنی تارک الدنیا اور باخدا انسان کے ہیں جب کہ یہ لفظ موجودہ عہد میں بے غیرت اور بے حیا آدمی کے لیے بولا جاتا ہو اور ریچھ اور بندر نچانے والے قلندر پکارے جاتے ہوں - اگر مشہور بزرگ حضرت بوعلی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ پانی پتی کو پتہ ہوتا کہ میرے بعد اس معزز لفظ کی یہ گت بنے گی تو ہرگز اپنے آپ کو قلندر نہ کہلواتے —

(۲۰) " مجذوب " - یہ لفظ بھی قلندر کا بھائی ہے - اس کے معنی ہیں خدا کی محبت اور اُس کے عشق میں ڈوبا ہوا - لیکن آج کل اردو لغت کی کتابیں کھول کر دیکھیے تو صاف لکھا ہوا پاؤ گے کہ مجذوب ' سڑی ' پاگل ' بیوقوف اور احمق آدمی کو کہتے ہیں —

(۲۱) " مصلی " - عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں نماز پڑھنے والا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا - لیکن نہ معلوم لوگوں پر کیا مصیبت پڑی کہ اُنہوں نے ہر اُس چوڑھے اور خاکروب کو مصلی کہنا شروع کردیا جو اسلام قبول کرلے - کیا دنیا بھر میں نومسلم چوڑھوں کے تعارف کے لیے لوگوں کو کوئی اور لفظ نہیں ملتا تھا ؟ مسجد کے ملاؤں پر بھی یہ لفظ اکثر استعمال کیا جاتا ہے - جیسے " آج میں نے بیس مصلیوں کی دعوت کی " —

(۲۲) "شہید" - یہ بھی ایک مقدس مذہبی اصطلاح ہے اور اُس شخص کو شہید کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اُس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان فدا کر دیتا ہے- نیز یہ اللہ تعالیٰ کا ایک نام بھی ہے- مگر اپنے ہم مشرب اور ہم معنی دوسرے الفاظ کے ساتھ اس مقدس لفظ کی بھی آج کل کے زمانے میں بڑی بے توقیری ہو رہی ہے - پچھلے دنوں قطب جنوبی کی تحقیقات کرتا ہوا سیاحوں کا ایک گروہ برف میں دب کر ہلاک ہوگیا تو ایک بہت بڑے مشہور مولوی صاحب نے اپنے بہت مشہور اخبار میں "شہدائے راہ کشف و سیاحت" کے فصیحانہ عنوان سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا تھا اور مطلق اس امر کا خیال نہیں کیا کہ شہید ایک خالص اسلامی اصطلاح ہے اور اُس کو بے محل استعمال کرنا کسی طرح موزوں نہیں- اس کے علاوہ ویسے بھی اس لفظ کی بڑی مٹی پلید ہوئی ہے - مقدس بانیان مذاہب کو جو ناپاک انسان اپنی ہر تحریر اور تقریر میں عمر بھر گندی سے گندی گالیاں دیتے رہے آج بڑے فخر کے ساتھ "شہید" کے نام سے پکارے جاتے ہیں- وہ شریر انسان جو مذہبی پیشواؤں کی نہایت گندی توہین کے جرم میں باغیرت مگر کم عقل لوگوں کے ہاتھوں دوسرے جہاں میں پہنچا دیے گئے فوراً "شہید" کے اعزاز سے معزز کر دیے گئے- یہی نہیں بلکہ جو مفسدہ پرواز اور باغی انسان حکام پر بم کے گولے پھینک کر پھانسی پر چڑھے فوراً "شہید" بن گئے - اب بتلائیے اس ذہنیت کا کیا علاج ہے؟ —

(۲۳) "غازی" - یہ معصوم اور مظلوم لفظ بھی بہت ہمدردی کا مستحق ہے - اس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں کافروں سے جنگ کرنے والا- جس شخص نے خدا کی راہ میں اپنے سر کی بازی لگا دی ہو یقیناً

نہایت تعظیم کا مستحق ہے - مگر بوالعجبی دیکھیے کہ لغت تک میں اس کے معنی بازیگر اور نٹ کے لکھے ہوئے ہیں - اس کے علاوہ ہر وہ شخص جو ہر قسم کی بد اعمالیاں اور بدکاریاں کرتے رہنے کے باوجود ترک موالات کی تحریک میں والنٹیر رہ چکا ہے یا احرار کا سپاہی ہے " غازی " بنا پھرتا ہے —

(۲۴) "ذات شریف" - اس لفظ کے لفظی معنی ہیں نہایت شریف ' نیک اور اچھا آدمی - لیکن ہم اس پر تلے بیٹھے ہیں کہ ہر اچھے لفظ کا حلیہ ضرور بگاڑنا ہے - چنانچہ حسب معمول اس لفظ کے ساتھ بھی ہم نے یہی سلوک کیا اور آج کل ذات شریف نہایت چالاک ' ہوشیار اور چالباز انسان کو کہتے ہیں ' جس سے شریفوں کو بہت بچ کر رہنا چاہیے —

(۲۵) "دہقان" - اس لفظ کے معنی ہیں ' گاؤں کا مالک ' سردار اور حاکم - دہقان خلد جنت کے داروغہ یعنی رضوان کا نام ہے - مگر آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ آج کل اس بد قسمت لفظ کے معنی جاہل ' گنوار ' وحشی اور اکھڑ آدمی کے ہیں —

(۲۶) "مہتر" - اس سے زیادہ بد سلوکی شاید ہی اُردو زبان میں کسی اور لفظ کے ساتھ کی گئی ہو - کسی زمانہ میں یہ لفظ جس قدر زیادہ معزز ' محترم اور مکرم سمجھا جاتا تھا آج اُسی قدر ذلیل حقیر اور بے عزت خیال کیا جاتا ہے - اس کے معنی ہیں بڑا بزرگ ' قوم کا سردار ' لشکر کا امیر ' نواب ' شہزادہ ' رئیس اعظم - اسی مناسبت سے والیء چترال کو " مہتر چترال " کہتے ہیں - لیکن مہتر چترال کو کسی قدر شرم و غیرت آئے اگر وہ یہ سنیں کہ اردو دنیا میں یہ لفظ بھنگی ' خاکروب اور فضلہ اُٹھانے والے ادنیٰ ترین انسان کے

لیے بولا جاتا ہے - یہ لفظ ان معنوں میں اس قدر کثرت کے
ساتھ استعمال ہوتا ہے کہ اب عوام کے وہم میں بھی یہ بات
نہیں گزر سکتی کہ یہ لفظ کس قدر معزز اور مکرم ہے اور اگر ان کو
یہ بات بتائی جاے تو ان کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہے —

(۲۷) "سسرا" - ہماری زبان کی حالت آج کل واقعی بڑی قابل
رحم ہے جس میں خسر جیسا معزز اور قابل عزت لفظ کھلی ہوئی گالی
کے طور پر استعمال کیا جاتا ہو - افسوس —

(۲۸) "سالا" - یہ لفظ بھی سسرے کی قسم کا ہے - اور نہایت محبت
اور پیار کے رشتہ کو ظاہر کرتا ہے - مگر آج کل کسی شخص کو ذرا
کہہ کر تو دیکھو - جوشیلا ہوگا تو فوراً تھپڑ کھینچ مارے گا - سنجیدہ ہوگا
تو آپ سے بولنا چھوڑ دے گا —

(۲۹) "چچا" . نہایت مکرم و معظم لفظ ہے - سعادتمند لوگ چچا
کی تعظیم و تکریم باپ کے برابر کرتے ہیں ہیں - مگر آج کل جن معنوں
میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اس سے ہر شخص واقف ہے - کون ہے جس
نے یہ محاورہ نہ سنا ہوگا کہ "چچا ہی بنا کے نہ چھوڑا تو کہنا" -
چچا بیچارے کے متعلق یہ شعر بھی اپ نے بارہا پڑھا ہوگا :

چچا کے چچا ہم تو مشہور تھے
بھتیجا ہمارا چچا ہو گیا

دیکھا آپ نے ! یہ صرف چند الفاظ ہیں جو معمولی اور سرسری
طور پر جمع کر دیے گئے ہیں - اگر اس قسم کے الفاظ کی مکمل فہرست
مرتب کی جائے تو غالباً سینکڑوں تک پہنچ جاے گی - مگر کہا ان محترم
اور معزز الفاظ کے اتنے بڑے اور بیہودہ معنی کرنے کسی بھی زبان کے

لٹریچر میں مفید اضافہ کا باعث هو سکتے هیں؟ ظاهر ہے که هرگز نہیں -
گالیاں دینے اور مذاق اُڑانے کے لیے جن پرانے الفاظ کو هم نے نئے
سانچے میں ڈھالا ہے بلاشبہ وہ انسانیت اور اخلاق کا گلا کاٹنے کے لیے
ایک تیز تلوار کی حیثیت رکھتے هیں - اس لیے همارا فرض ہے که
هم اپنے مقدس الفاظ کی قدر کریں اور ان کو همیشه انهی معنوں
میں استعمال کریں جن کے لیے وہ ابتدا میں وضع کیے گئے تھے -
جب زبان هی ٹھیک نه هوگی تو همارے اخلاق و عادات کس طرح
مہذب و شایسته اور متین و سنجیدہ بن سکتے هیں - پس آؤ اور آج
کے دن سے عہد کر لو که عمدہ الفاظ کو برے معنوں میں کبھی استعمال
نہیں کروگے اگر تم ایسا کرنے پر قادر هو سکے تو تم یقیناً محسوس
کروگے که زبان کی درستگی کا اثر تمهاری دوسری عادات و اخلاق پر بھی
بہت گہرا پڑا ہے کیونکه دوسرے اخلاق و عادات عموماً زبان کے ساتھ چکر
لگاتے رهتے هیں - زبان اگر اچھی رهی تو سب چیزیں اچھی رهتی هیں؛
زبان بگڑی تو سب کچھ ملیا میٹ هو جاتا ہے - کاش هماری سمجھ میں یه بات
آجائے اور هم اپنی زبان میں سے اس قسم کے الفاظ قطعاً خارج کردیں —

ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات

(یہ مضمون جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب نے پٹنے کے جلسے میں پڑھا تھا لیکن اخباروں میں بہت غلط سلط چھپ گیا تھا' لہذا حضرت کیفی کی تصحیح کے بعد چھاپا جاتا ہے ...) —

حضرات - متمدن قومیں ایک دوسرے سے میل جول کے بغیر نہیں رہ سکتیں - سب قوموں کے جغرافی حالات ' ان کی زمین کے خواص اور آب و ہوا ایسی چیزیں ہیں جو یکساں نہیں ہوا کرتیں - اسی وجہ سے ان کے ہاں کی پیداوار اور صنعت کاری بھی مختلف ہوا کرتی ہے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومیں اول اول اجناس یعنی ملک کی پیداوار اور صنعت کاری کی چیزوں کی ادلا بدلی کرتی ہیں اور یہ مبادلہ کسی نہ کسی شکل میں قایم رہتا ہے خواہ وہ تمدن کی کسی منزل میں ہو —

یہ میل جول یا مبادلہ جب مادی دنیا سے نکل کر قوموں کی شایستگی اور تہذیب کی رفتار کی نسبت سے ذہنی مبادلہ کی شکل اختیار کرتا ہے تو بین الاقوامی کلچر کے نام سے پکارا جاتا ہے - اسی کلچر اور اس کے بین الاقوامی تاثر سے متعلق آج چند باتیں آپ کے پیش کی جائیں گی —

کلچر کو تہذیب یا سبھیتا وغیرہ خواہ کوئی نام دیں لیکن یہ لفظ

اصلی حیثیت ہی میں اتنا جامع واقع ہوا ہے کہ اسے چھوڑ دینے کو جی نہیں چاہتا - اس لیے آج کی گفتگو میں اسی لفظ سے کام لیا جائے گا —

قدیم تہذیب

قدیم آریہ لوگ جب اس ملک میں آئے تو انہوں نے یہاں ایک اچھی اور ترقی یافتہ تہذیب پائی جس کے آثار اب 'ہڑپہ' اور 'موہن جداڑو' میں ملتے ہیں - یہ لوگ مفتوح تھے اور ہمارے آریہ بزرگ فاتح - لیکن بہتر ہتھیار اور جنگ کے فن کی اعلیٰ قابلیت قومی میل جول اور کلچرل ارتباط کو روک نہ سکی - دیوبانی اب وہ بانی رہی جس کو مقدس وید کی زبان ہونے کا امتیاز حاصل تھا - زبان میں تبدیلیاں دیکھتے ہوئے رشی 'پاننی' نے ضروری سمجھا کہ اس مقدس زبان کی حفاظت اس کی تنظیم سے کی جائے - اس ضرورت نے 'اشٹادھیائی' کی شکل اختیار کی - اس کے ساتھ آرین فاتحوں کو اپنے مفتوحوں کا جاننا اور سمجھنا بھی ضروری تھا - اس کا ثبوت 'وراُرچی' کی پراکرت گریمر ہے - بالکل ایسی ہی ضرورت پچھلی صدی کے اوایل میں انگریزوں کو پیش آئی جسے گلکرسٹ اور ڈنکن فاربس وغیرہ کی ہندوستانی گریمروں نے پورا کیا —

کلچر کے بین الاقوامی عمل کے سلسلے میں آپ کے سامنے انسان کی تاریخ کے پراچین دفتر کھولنے فضول ہیں کیونکہ وہ آپ کے علم میں ہیں - اس لیے میں گفتگو کو وطن مالوف ہی تک محدود رکھوں گا - اختصار سے کام لیتے ہوئے یہ کہنا تواریخی اعتبار سے درست ہوگا کہ ہندوستان میں تین عظیم الشان تصادم یا کہیے اتصال کم و بیش پختہ کلچروں کے ہو چکے ہیں - ان میں سے ایک کی طرف ابھی اشارہ ہوا ہے اور اسی

کو کافی سمجھنا چاہیے - دوسرا تصادم یا اتصال وہ ہے جو مسلمان فاتحوں کے اس ملک کو اپنا وطن بنالینے کے وقت سے پیدا ہوا - تیسرا تصادم یا اتصال وہ ہے جو انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی پروگرام ترک کردینے اور ملک گیری کے پروگرام کو سامنے رکھ لینے کے وقت سے ظہور میں آیا - آج کی صحبت میں اس نمبر ۲ کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے گا اور آج کے موضوع کی علت غائی بھی یہی ہے —

ایک معنی خیز نکتہ

حضرات - آپ جانتے ہیں کلام الفاظ کا دست نگر ہوا کرتا ہے - میں نے اب تک کلچروں کے لیے متبادل لفظ یعنی تصادم اور اتصال استعمال کیے ہیں جب کہ صرف آخر کا لفظ یعنی اتصال ہی کافی تھا - تصادم اسے کہتے ہیں کہ دو چیزیں مخالفانہ شدت کے ساتھ آپس میں ملیں کہ ایک دوسرے کو شدید صدمہ پہنچائے - جب دو ریل گاڑیاں آپس میں ٹکرائیں تو وہ تصادم ہے - اتصال یہ ہے کہ ایک ریل گاڑی ایک طرف سے آکر ٹھہری ہوئی ہے اور دوسری آگ پھانکتی اور انگارے اگلتی دوسری طرف سے آتی ہے اور اس کے برابر ٹھہر جاتی ہے - دونوں کے مسافر اور پارسلوں کی ادلا بدلی ہوتی ہے - مسلمانوں کے یہاں آنے سے ایسا ہی ہوا - اس کی نظیر ہم کو یونان میں اہل روما کی آمد میں بہت کچھ ملتی ہے - یاد رکھیے کہ بہت کچھ کا کلمہ بہت سوچ سمجھ کر استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں بالکل یا قطعاً - نہیں —

یہ واقعہ اب تک تشریح اور استدلال کا محتاج ہے کہ سندھ میں عربوں کی آمد سے قطع نظر جو مسلمان ہندوستان میں فاتحانہ آئے اور

یہیں کے ہو گئے وہ کون تھے ؟ کس تہذیب و تمدن کے علمبردار اور کس کلچر سے بہرہ ور تھے ؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب آپ کو ان نصابوں میں نہیں ملے گا جو اسکول اور کالج میں ہمارے نو جوانوں کے ذہن پر لادے جاتے ہیں۔ بحث اس سے نہیں کہ وہ سلجوقی تھے یا غوری پٹھان، چنگیزی مغل تھے یا کون ؟ بحث اس سے ہے کہ ان کی کلچر کیا تھی ؟ وہ کونسی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے ؟ محض مسلمان کہہ دینا یا قبیلہ کا نام لے دینا اصل مبحث پر روشنی نہیں ڈالتا —

مسلمانوں کی آمد

تاریخ اعظم کے ملاحظہ سے واضح ہوگا کہ جو مسلمان شمال مغربی دروں کے راستے سے ہندوستان میں آئے وہ خواہ کسی ملک یا خطہ کے رہنے والے ہوں ایران کی تہذیب اور کلچر میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کا تخیل اور ان کی زندگی اس کلچر سے متاثر تھی جس کا ابتدائی خاکہ شاہنامہ میں پایا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایرانی کلچر اور لٹریچر کا رنگ ان کے دل و دماغ پر چڑھا ہوا تھا اور چونکہ ایرانی اور اِنڈو آرین یعنی ہندوستان میں آنے والے آرین ایک ہی تنے کے دو ٹہنے تھے جس کی تشریح غیر ضروری ہے اس وجہ سے ان مسلمانوں کی کلچر اور ہندوستانیوں کی کلچر میں بہت ہم آہنگی اور اپنائیت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو ہندو رہ کر اور مسلمان مسلمان رہ کر اس خوش اسلوبی سے شیر و شکر ہو گئے کہ رواداری اور سمجھوتا کا اوتار بن گئے۔ یہ جملے جھگڑے اور فتنے اٹھانے کے ہیں کہ مفتوح اپنے فاتحوں پر غالب آگئے یا یہ کہ فاتح اپنی فاتحانہ خود اعتمادی اور انفرادیت سے محروم ہو گئے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ دونوں کلچروں کے مزاج کچھ ایسے واقع ہوئے

تھے کہ ان کا روبرو ہونا ہی ارتباط کا قایم ہو جانا تھا - یہ ارتباط نگاہ اولیں کی اشتیاق انگیزی سے کم نہ تھا - کلچروں کے اس ارتباط کے کارنامے ایک نہیں دو نہیں بہت سے اور گونا گوں ہیں - قوموں کے تعلقات کے ارتقا میں یہ ہوا کرتا ہے کہ پہلے ایک کیفیت اپنے آپ پیدا ہوجاتی ہے اور پھر اہل غرض اس کو سیاسی رنگ دیتے ہیں اور اس سے فایدہ اٹھاتے ہیں اسی طرح یہ کلچروں کا اتحاد پہلے ناگزیر صورتوں میں اپنے آپ پیدا ہوا ' بعد میں اس سے سیاسی استفادہ کیا گیا - آپ ادبی زاویہ نگاہ سے اس مسئلہ پر نظر ڈالیں اور فرمائیں کہ نئی زبانیں اور لٹریچر جو اس کلچرل ارتباط سے پیدا ہوئے کیا اس کے متعلق کسی کا معہود ذہنی سیاسی مصلحت پر مبنی کہا جاسکتا ہے ؟ مہابھارت یا گیتا وغیرہ کے ترجموں کی نسبت جو شہنشاہ اکبر کے حکم سے ہوئے ایسا گمان ہوسکتا ہے - لیکن خانخاناں رحیم اور رس خاں کا اتنا اچھا ہندی کا شعر کہنا اور ملک محمد جائسی کا ہندی میں پدماوت تصنیف کرنا کونسی سیاسی مصلحت اندیشی پر مبنی بتایا جائیگا - ایک طرف یہ ہوا تو دوسری طرف وارستہ اور ٹیک چند بہار نے وہ جید کتابیں فارسی میں لکھیں جو ایران میں سند مانی گئیں - اگر یہ ہندو یا مسلمان اپنی انفرادیت گنوا بیٹھتے تو " دو کلچروں کا ارتباط " یہ فقرہ ہی بے معنی تھا - مگر یہاں ایسا ہوا ہی نہیں - لوگوں کا حافظہ کمزور ہوا کرتا ہے - خاصکر قومی اور اجتماعی معاملوں سے متعلق ان کی یادداشت بہت سست ہوا کرتی ہے - اس صورت میں کچھ بحث کی آڑلی جاتی ہے ' خوف دلایا جاتا ہے کہ اگر ان میں اور ہم میں ارتباط ہوگیا تو ہماری ملی انفرادیت اور دھارمک سوتنترتا پھر کہاں ! ہم کیوں اپنی قدیم روایات گنوا بیٹھیں ؟ میں کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوتا کیونکہ ایسا ہوا نہیں - سنیے - جب

کلچرل ارتباط کی تنظیم نسل، زبان اور قومیت کے محدود احاطے کے باہر عمل پیرا ہو تو اخلاقی اور ملی معیار سے متعلق نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے کہ انسانوں کا ذہن غیر مقامی ہوجاتا ہے یعنی اس کے شعور کا نفسیاتی محور وسیع اور زاویۂ نگاہ فراخ ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگلے وقتوں میں ایسا ہوا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم سے ملی تو اپنی قومی انفرادیت کھو بیٹھی۔ لیکن یاد رکھیے اور خوب یاد رکھیے کہ یہ نتیجہ تھا مذہبی میل کا —

مذہب کے نقاط نظر بھی اور چیزوں کی طرح اب بدل گئے ہیں۔ آج کتنے مسلمان ہیں جو سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہیں کہ مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ

لبیں بڑھ رہی ہوں نہ ڈاڑھی چڑھی ہو
ازار اپنی حد سے نہ آگے بڑھی ہو

اور کتنے ہندو ہیں جو اونچے گلے سے یہ کہیں کہ ہندو وہ ہے جو غیر ہندو ہی نہیں بعض ہندوؤں سے بھی روٹی بیٹی کا پرہیز رکھتا ہو۔ وہ دہلی کا ایک مسلمان ہی تو تھا جس نے اس کا اعلان کیا کہ معرکۂ کربلا کبھی واقع ہوا ہی نہیں۔ اور وہ ایک ہندو عالم ہی تو تھا جس نے یہ دعویٰ کیا کہ وید میں شکھا سوتر کا ذکر کہیں نہیں آیا ہے۔ قصہ مختصر اب نہ ہندو وہ ہندو ہیں جن کا دھرم کچے دھاگے کی مانند ہو اور نہ اب مسلمان وہ مسلمان ہیں جو غیر مسلم سے میل جول یا تشابہ کی علت میں کفر کے فتوے کے مستوجب ہوں —

عہد حاضر کی تہذیب

آج کل کا کلچرل اتحاد زیادہ تر دو (کچھ ایک) مختلف روایات کا

میل جول ہے - روایات کا بہترین نتیجہ ان کا باہمی آزادانہ ملاپ ہو اس لیے عہد حاضر میں کلچروں کا باہم مبادلہ یا زیادہ صحیح الفاظ میں کہیے سمونا ایسا ہے جیسے ایک پہاڑی نالہ سے نہر نکال کر میدانی علاقے کو سیراب کرنا - وہاں زمین کم تھی' پتھر تھے یا پانی' اس لیے زراعت برائے نام تھی - جب کہ یہاں زمین زیادہ تھی اور پانی ندارد' امیدیں بادلوں کے رحم کی منتظر رہتی تھیں یا لوہے کے چلے چلاکر چپہ بھر زمین ہل کے سپرد کی جاتی تھی - اب یہ ہوا کہ ان کو غلہ مل گیا اور ان کو پانی - دونوں کا کام نکل گیا - میں کہتا ہوں کہ ہندوانی روایات اور کلچر میں کچھ خوبیاں ہیں تو ہندوؤں کا فرض ہے کہ ان خوبیوں کو عام کریں' ڈبیا میں بند کرکے نہ رکھیں - اسی طرح اگر اسلامی روایات اور کلچر میں کچھ محاسن ہیں تو وہ انہیں عالمگیر بنائیں' مقفل اور محدود کرکے نہ رکھ چھوڑیں - یہ جب ہی ممکن ہے کہ تبصرہ اور موازنہ سے کام لیا جائے - ایسا کام کھلے خزانے ہوا کرتا ہے حرم سرا یا رنواس کے تہ خانوں میں نہیں —

آپ بھولتے ہوں تو اور بات ہے ورنہ یہ کام ہوچکا ہے - ہم ہندو مسلمانوں کو خصوصی طور پر اور کل برادران وطن کو عام طور پر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سب ہمارے بزرگوں کی دیدہ وری کی بدولت ہوچکا ہے - اسی آپ کے وطن میں جزیہ لگا اور پھر منسوخ کردیا گیا - اسی انڈیا میں البرٹ بل کا جو طوفان پچھلی صدی میں فتنہ سامانی کر گیا وہ کل کی بات ہے - اور آج کیا ہو رہا ہے - زمانہ بدلتا رہتا ہے اس کے ساتھ ہی قوموں کے رسم و رواج اور طرز ماند و بود اور ان کی ذہنیت بھی بدلتی رہتی ہے - اساسی اعتقاد جوں کے توں رہتے ہیں

لیکن ان کے نفسیاتی ذریات کی پرداز بدل جاتی ہے - انسانی شعار کا اصلی جوہر خلوص اور راستبازی ہے - اسی طرح اجتماعی زندگی کا جوہر موالات اور رواداری ہے - اور ان جوہروں کو جلا دینے میں کلچرل اتحاد اور ادبی و لسانیاتی ارتباط کی تشکیل ہؤا کرتی ہے —

ہوسکتا ہے کہ آپ کے اور میرے قول میں جذبہ داری یا عصبیت کا لوث بتایا جاے - اس لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ ایک یورپین مسٹر جوڈ کی تازہ تصنیف "دی سٹوری آف انڈین سویلزیشن" سے استفادہ کروں - لکھا ہے :-

"قرون وسطیٰ میں ہندوؤں کے تخیل کا اسلامی خیالات سے تصادم ہؤا - ہندوستان میں مختلف نظاموں کی یہ مڈ بھیڑ دیسی کلچر کے غلبہ میں صورت پذیر ہوئی اور اسلامی ذہنیت بہت کچھ ہندوانیت میں جذب ہوگئی" - (صفحہ ۵۹)

اصل الفاظ مصنف کے بھی سن لیجیے جو یہ ہیں :-

" During the Middle Ages Hindu thought came in conflict with the ideas of Islam in India. The clash between these two opposite systems resulted in the preponderance of the native culture, and Islamic thought was largely absorbed in Hinduism."

یہ تحقیق ایک غیر ہندو اور غیر مسلم کی ہے - اس غیریت کے باوجود بھی ممکن ہے کہ اس مصنف کی تحقیق اور دریافت ذاتی پسند یا شخصی رجحان کا رنگ لیے ہوے ہو جس سے وہ بے خبر رہا - یہ کچھ بھی ہو اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ تاثر کے غلبہ سے قطع نظر ہؤا یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی قوت فکر و تخیل باوجود ان کے مذہبوں

کے اختلاف کے شیر و شکر ہوگئی - فلہذا ہندوانہ کلچر کا رہا یا اسلامی کا ؟ یہ امر تنقیح طلب نہیں - نہ اس کا اثر اس تاریخی نتیجے پر پہنچتا ہے جس کی مولود ہماری ہندو مسلم یا ہندیرانی کلچر ہے -

اس کلچرل ہم آہنگی میں جو حصہ ہماری ورنیکولر یعنی دیسی زبانوں اور ادب کا ہے اسے بھلایا نہیں جا سکتا - چنڈی داس - چیتنیہ - ودیا پتی - کبیر - امیر خسرو - نامدیو - تکارام - نرسنگھ مہتہ اور گرونانک کے نام اس ضمن میں ذکر کے قابل ہیں - ایسے اور بہت سے بزرگوں کے نام آپ کو بھگت مالاؤں میں ملیں گے - ان کی تلقین اعتقادی فراخ دلی سے شروع ہوکر کلچر اور معاشرت کی وسیع نظری میں نتیجہ پذیر ہوئی - اردو یا ہندوستانی اپنی تنظیم اور تدوین سے پہلے اور اس کے بعد اس سلسلے میں جو کچھ کرتی رہی اور اب تک کر رہی ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں - اردو والوں نے اپنا کوئی پنتھ یا متھ قایم نہیں کیا لیکن وہ کام کرگئے جو قوموں کے کلچرل اتحاد میں بے نظیر ہے - انہوں نے دیر و حرم اور شیخ و برہمن کو ایک جگہ لا بٹھایا - ان کا فکر استقرائی تھا اس لیے معاشرت اور روزانہ زندگی پر چھا گیا - یہ بدیہی امور واقعہ ہیں جو تشریح و تاویل کے محتاج نہیں - عمارات کی ملکہ یعنی تاج محل میں ہندو ہاتھ کہاں کہاں نمایاں ہے ؟ پراکرت اور آپ بھرنشی بھاشاؤں کے لغات پر کیا اثر ہوا ؟ مغل یعنی ایرانی نقاشی اور راجپوت پینٹنگ کے باہم کیا اخذ و ترک ہوا ؟ ہمارے قدیم سنگیت کے موسیقی میں کیا جدت آفرینی یا کیدیجیے بدعتیں ہوئیں اور کتنی نئی سنکیرن راگنیاں پیدا ہوگئیں ؟ یہ اور ایسی بہت سی چیزیں ہندو مسلم کلچروں کے ارتباط اور اتحاد

کے پھل ہیں - ان میں سے ایک ایک شق ایک علحدہ دفتر چاہتی ہے -

ایک عالمگیر نظریہ

مفکرین اور شاعروں نے، جو اس ارتباط کے سب سے بڑھ کر علمبردار تھے، وہ کام کیا جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا - میں سمجھتا ہوں کہ مثال کی طور پر متقدمین و متوسطین اور عہد حاضر کے چند شعرا کے کلام سے استفادہ بے محل نہ ہوگا:

ولی مرحوم کا قول ہے: —

گر ہوا ہے طالب آزادگی
بند مت ہو سبحۂ و زنار کا

آبرو مغفور کا قول ہے: -

کیا شیخ و کیا برہمن جب عاشقی میں آوے
تسبی کرے فراموش زنار بھول جاوے
(تسبیح)

میر تقی نے فرمایا: -

نغمۂ عشق سے ہیں سبحۂ و زنار ملے
ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

منشی مادھو رام جوہر کا ارشاد ہوا: -

دیر و مسجد پر نہیں موقوف کچھ اے غافلو
یار کو سجدے سے مطلب ہے کہیں سجدہ کیا

استاد ذوق کا یہ کُلیہ ہے: -

کیسا مومن کیسا کافر کون ہے صوفی کیسا رند ؟
سارے بشر ہیں بندے حق کے - سارے جھگڑے شر کے ہیں

امیر مینائی نے یہ تلقین کی :-

مشرب صلح کُل ہے اے زاہد
دیر بھی اک حرم کا سایہ ہے

فصیح الملک داغ اس مقام پہنچے :-

سر نیاز سلامت رہے پڑے تسلیم
نہیں تمیز ہمیں دیر کیا حرم کیا ہے

چکبست مجبور نے یہ فیصلہ کیا :-

جس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی
کعبہ ہے وہی اور وہی بت خانہ ہے میرا

حضرت جلیل مانکپوری نے فرمایا :-

کعبہ و دیر میں دوڑاتے ہو دھوکے دے کر
کیا کہیں گے تمہیں سب گبرو مسلمان دل میں

ثاقب بدایونی کا مشاہدہ ہے :-

تمہارا بول بالا ہر جگہ اللہ والوں میں
یہی ہو حق حرم میں ہے یہی جپ تپ شوالوں میں

اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھایا جائے گا نہ اس سے بحث کی جائے گی کہ مسلمان اور ہندو شعرا کے ان اور ایسے ملفوظات نے جمہور کی ذہنیت کو کیا رنگ دیا - اتنا کہنا کافی ہے کہ شاعر قوم کی زبان اور اس کی معاشرت اور کلچر کا ترجمان ہوا کرتا ہے - صرف دو شعرا اور پیش کروں گا پیشتر اس سے کہ موضوع کے اور شعبوں پر نظر ڈالوں - ہندو شاعر نے دعویٰ کیا :-

ذات پات پوچھے نا کوئے
ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے

یہ دعویٰ دلیل کا محتاج نہیں - مسلمان شاعر نے اس کا اعلان کیا : —

وفاداری بہ شرط استواری شرط ایماں ہے

مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

حضرات - آپ نے کلچرل اتحاد کے کارنامے ملاحظہ فرمائیے - آپ نے اسلاف کے شاہکاروں کو اپنے حافظہ میں ٹٹولا - آپ ہندو مسلمان حضرات میرے وطنی بھائی جس طرح رہتے ہیں کیا اس کے ملاحظہ کے لیے آپ کو کسی شیش محل یا آئینہ خانہ میں لے جاؤں؟ یہ معاشری صلاحیت، یہ سمجھوتا، یہ کلچرل اتحاد، یہ سوشل یگانگی اور یہ رواداری کسی معجزے یا چمتکار، کسی شاہی حکم یا فتوے سے وقوع میں نہیں آئی - یہ نتیجہ ہے ہمارے اور ہمارے بزرگوں کے مدت العمر کے حسن عمل کا اور جلب منفعت اور خذ ما صفا و دع ما کدر کے اصول کا - جماعتوں کا طرز عمل نتیجہ پیدا کرنے کو ایک خاص مدت اور استقلال چاہتا ہے - یہ جو کچھ ہوا کئی نسلوں کی انتھک اور لگاتار کوششوں کا ثمرہ ہے - جب ہی تو انگلستان کے مفکروں اور مورخوں کو یہ کہنا پڑا جس کی تفصیل بالاجمال آگے پیش کی جاتی ہے - سنیے جو یورپ کی تازہ ترین تصنیف آپ کی نسبت رائے رکھتی ہے : —

" ہندوستان کی گزشتہ تاریخ اور موجودہ زاویۂ نظر پر نسلوں کے ملاپ کے اہم نتیجے پیدا ہوئے ہیں - ان میں سے اولین نتیجہ اساسی یگانگی ہے - یہ یگانگی یا یونٹی اس سے کہیں زیادہ بین اور مستقل ہے جو ایک ہی جغرافی رقبہ میں قربت کی وجہ سے ہوتی ہے - یورپین یعنی اہل فرنگ بھی تو ایک ہی جغرافی رقبہ میں اکٹھے رہتے ہیں جو رقبہ

ہندوستان سے بہت مختلف نہیں ہے - لیکن جیسا کہ وہ جنگیں جنہوں نے یورپ کی تاریخ کو بدنام کر دیا ہے اور تنازعے اور باہمی رقابت کے جھگڑے جو اس وقت لیگ آف نیشنز کی کمر توڑ رہے ہیں - صاف طور پر ثابت کرتے ہیں کہ یورپ کے باشندے اتفاق اور یکجہتی کے احساس کی اس اثر پذیری سے محروم ہیں جس کا امتیاز ہندوستان کے باشندوں کا حصہ ہے - غرض کہ اُس معنوی صحت کے ساتھہ ایک یورپین کا ذکر نہیں کر سکتے جس کے ساتھہ ہم ایک انڈین کا ذکر کر سکتے ہیں جو رنگ ' جاتی اور مذہب کے اختلافوں کے باوجود تمام دوسرے اہل ہند کو اپنا ہموطن اور ہمجولی سمجھتا ہے اور ہندوستان کو اپنا وطن " —

(اے ہسٹوری آف انڈین سویلزیشن - سنہ ۱۹۳۶ ع صفحہ ۴ - ۲۳)

حضرات - آپ کے اور آپ کے ہم وطنوں کے حق میں یہ قطعی رائے اور موازنہ سنہری حرفوں میں لکھے جانے کا مستحق ہے - یہ اسی کلچرل یونٹی کا ظہور ہے جس نے ہماری معاشری اور سیاسی قسمتوں کو ایک کر دیا - لیکن معاف فرمائیے عہد حاضر کے واقعات سے چشم پوشی اور سہل انگاری ناممکن ہے - سنیے اور غور سے سنیے کہ کچھہ تو ہے جو آج یہاں اس کلچرل کانفرنس کا اجلاس منعقد ہو رہا ہے - کچھہ بات تو ہے جس نے مدراس اسمبلی کو اور اس کے اصحاب بست و کشاد کو ملی مناقشوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی تحریک کی - کوئی بات تو ہے جس نے ملک کے دوسرے سرے میں پنجاب کی اسمبلی اور اس کے سرگرم دستور اعظم کو یونٹی کانفرنس کے قایم کرنے کی ترغیب دی جس نے گرم جوشی سے اپنا کام شروع بھی کر دیا ہے - یہ وہ جدید اور بدیہی واقعات ہیں

جنہیں کوئی ذی شعور نظر انداز نہیں کر سکتا ؛ جن سے کوئی صحیح د
رکھنے والا انکار یا بے اعتنائی نہیں کر سکتا —

تو پھر کیا اب یہ سمجھا جائے کہ ہمارا وطن کایا پلٹ ہوگیا اور صدیو
کے کیے کرائے پر پانی پھر گیا جیسا کہ فارسی کا شعر ہے :

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

کوئی حزنیت کا پجاری یہ کہے تو کہے لیکن کیفی ایسا نہ
کہہ سکتا - آپ اس کے اعتقاد میں اس کے ہم یقین و ہم نوا ہوں
جو یہ ہے :-

ہنوز آن ابر رحمت درفشاں است
مے و میخانہ با مہر و نشان است

اپنا قول تو یہ ہے :-

قیس کا تجھہ میں جاوں - جذبۂ منصور نہیں
ورنہ منزل گہہ دلدار تو کچھہ دور نہیں

جو عوارض اس وقت ہمارے گرد و پیش ہیں وہ اپنی نوعیت م
اگلے وقتوں کے عوارض اور ماحول سے مختلف ہیں - ہندوؤں اور ہندو
کے ' مسلمانوں اور مسلمانوں ' سکھوں اور سکھوں کے ' غیر مسلم
مسلم کے باھمی تعلقات جیسے کچھہ عریاں مناظر پیش کر رہے ہیں
ہماری عہد حاضر کی تواریخ کے چہرے پر خوشنما نقش ہرگز نہیں
لیکن سوال پھر بھی وہاں کا وہیں رہتا ہے کہ ان کی نوعیت
ہے ؟ وہ گزشتہ عہد کی تاریخ کو ذہن میں رکھتے ہوئے کس قبیل م
آتے ہیں ؟ یہ ایک سوال ہے جو مرکزی حیثیت رکھتا ہے - اسی کے

دوسرے تمام مسایل طواف کرتے ہیں - وطن کے ہر ذی ہوش ، ہر حریت شعار اور ہر مفکر کا اہم فرض ہے کہ ٹھنڈے دل سے اس سوال کے حل پر غور کرے - غور کرنا ہے کہ آیا موجودہ عوارض کی اصلیت اقتصادی اور معاشی ہے یا ملّی اور قومی؟ اگر آپ مجھ سے اس سوال کا جواب طلب فرمائیں تو میں اسے آپ کی ستم ظریفی کہوں گا۔ معاف فرمائیے اس کلمے کے لیے - ایسے مہتم بالشان اور دور رس مسئلے ایک لفظ یا ایک جملے کے کہہ دینے سے طے نہیں ہوا کرتے - جب تک ہر نقطۂ نظر کے اصحاب اس نیت سے مل کر نہ بیٹھیں کہ اس مسئلہ کو حل کر ہی ڈالنا ہے کچھ فایدہ قیل و قال سے نہ ہوگا —

اس ضمن میں ایک بات آپ سے اور کہنی ہے - شروع میں تین کلچرل تصادم یا اتصال آپ کے پیش کیے گئے ہیں - اب تک نمبر (۳) کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا جس کا تعلق مغربی کلچر سے ہے - یہ کل کی بات ہے اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہے ۔ اس بارے میں صرف یہ عرض کیا جاے گا کہ مغرب کا جذبۂ حب وطن اور شخصی انفرادیت کو مضبوطی سے قایم رکھتے ہوئے اجتماعی مفاد کو مد نظر رکھنا اور آزادی اور جمہوریت کا احساس وہ چیزیں ہیں جو ہر قوم کی ترقی کیا زندگی کی پہلی شرط ہیں اور ان امور میں ہم اہل مغرب کے شعار سے بہت استفادہ کر سکتے ہیں - رہیں وہ باتیں جن سے خود مغرب کا ناک میں دم ہے اس کی اندھا دھند تقلید ہم کو کہیں کا نہ رکھے گی —

امید افزا صورت حال

حضرات - میں دیکھ کر باغ باغ ہوں کہ ان مسایل پر غور و فکر

کی خواہش آپ کے دل میں پیدا ہوئی ہے - مجھے یقین ہے کہ اس خواہش کی محرک خلوص اور بہبود وطن ہے - اگر میں صرف یہی یقین لے کر بہار سے واپس گیا تو اس سفر کو حج اکبر سے کم مبارک نہ سمجھوں گا - جب ایک کام کرنے کی ٹھن جائے تو کامیابی کے سو راستے نکل آتے ہیں - فلسفۂ نفسیات جماعتوں کی ذہنیت اور جودت عمل کے بارے میں بتاتا ہے کہ جب ایک امر جماعت کے ذہن میں استواری کے ساتھ جاگزیں ہو جاتا ہے تو وہ اس کے سر انجام اور تکمیل کی تدبیر خود ہی نہایت سرعت سے نکال لیا کرتی ہے - اور اپنے فیصلے پر فوراً عمل پیرا ہو جاتی ہے - کمی ہوتی ہے تو احساس اجتماعی کی - لیکن اجتماعی احساس میں اس معزز مجمع میں بدرجۂ اتم دیکھ رہا ہوں -

ایک اور عرض کروں گا اس سے پہلے کہ بیٹھ جاؤں - اور وہ یہ ہے کہ موجودہ صورت حال سے متعلق ہندوستانی قوم کا خواہ کوئی فیصلہ ہو لیکن ایک حقیقت ہے جو اس سوال اور اس کی اہمیت سے بالا تر ہے - وہ ہے کلچرل ہم آہنگی - مغربی اتصال نے چاہے کوئی شکل اختیار کی ہو کلچرل یونٹی جو ہم میں پہلے سے موجود ہے اس کے رنگ کو مدھم نہیں پڑنے دینا چاہیے - اس کی ترقی اور اس کی نشر و اشاعت کبھی حد سے زیادہ نہیں ہو سکتی - یہی ہماری وطنیت کی روح و رواں' یہی ہماری نجات کی شاہراہ اور یہی حریت کے خزانے کی کنجی ہے - اس بارے میں ہمارا لائحۂ عمل کاش وہ ہو' کاش ہمارا وفور شوق ویسا ہی ہو جس کا چربہ اس تاریخی عظمت رکھنے والے متھلا کے مہا کوی ودیاپتی نے اپنے ان اشعار میں نہایت خلوص اور جذبے سے کھینچا ہے - ان الہامی اشعار کے ترجمے کے ساتھ میں آپ سے رخصت ہوتا

ہوں - فرمایا ہے :-

دیکھتا ہوں - جب سے اس جگ میں ہوں میں اس کا سروپ
چین پھر بھی میری آنکھوں کو نہیں اک پل ہوا
ہے جُگوں سے من کو میرے میل اس کے من کے ساتھہ
اس پہ بھی ہے شانتی کی پیاس ہی من کو سدا

افکار و واقعات

(از اڈیٹر)

۱ - بنگال ۶۷۹

۲ - بہار کا دورہ ۶۸۲

۳ - انجمن کے دو نمایندوں کا دورہ

سی پی اور برار وغیرہ میں ۶۸۷

۴ - مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندی اردو ۶۸۹

۵ - اخبار مدینہ کی رائے ۶۹۱

۶ - ہندوستان کا ایک نادان دوست ۶۹۳

۷ - مسٹر ساورکر اور قومی زبان ۶۹۴

۸ - مدراس اور ہندی دشمنی ۶۹۵

۹ - ایک نہایت خطرناک تجویز ۶۹۹

افکار و واقعات

(از اڈیٹر)

۱ - بنگال

آخر اپریل میں مجھے کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کے ممتاز اور روشن خیال اصحاب سے ملنے کا موقع ملا - کلکتہ میں اردو زبان کا عام رواج ہے ، تقریباً ہر طبقے کے لوگ اس زبان کو بولتے یا سمجھتے ہیں - بنگال نے ایک زمانے میں اردو کی بڑی خدمت کی ہے اور وہاں اردو کے بہت اچھے ادیب اور شاعر ہوئے ہیں اور اب ہیں - فورٹ ولیم کالج جس نے اردو کو بہت کچھ فروغ دیا ، کلکتہ ہی میں تھا - کلکتہ کے علاوہ بنگال کے بعض دوسرے شہروں مثلاً مرشدآباد ، ڈھاکہ ، چاٹ گاؤں وغیرہ میں بھی اردو کا خاصا رواج ہے - لیکن زمانے کے تغیرات اور حالات کی وجہ سے مسلمانان بنگال کی توجہ اس طرف کم ہو گئی تھی اور وہ دیگر اہل بنگال کی طرح اردو یا ہندوستانی زبان کی کوئی خاصی ضرورت نہیں سمجھتے تھے - لیکن جدید حالات اور انقلابات نے انہیں خود بخود اس طرف متوجہ کر دیا ہے اور قومی نقطۂ نظر سے وہ اس زبان کی اہمیت اور ضرورت کو خوب سمجھ گئے ہیں - چنانچہ ملک کی دوسری سیاسی اور غیر سیاسی جماعتیں بھی اس ضرورت کو محسوس کر رہی

میں اور اس امر کی کوشش کر رہی ہیں کہ ملک بھر کی ایک زبان ہوجاے - خوش قسمتی سے ہمارے پاس پہلے سے ایک ایسی زبان موجود ہے جو اس خدمت کو انجام دے رہی ہے اور اس لیے اس کی اشاعت و ترقی، کسی فرقے یا جماعت کی خاطر نہیں بلکہ قومی اور ملکی نقطۂ نظر سے نہایت ضروری ہے —

اس خیال کی بنا پر جناب عبدالرحمن صدیقی ایم - ایل - اے اور جناب مولانا اکرم خاں صاحب اڈیٹر محمدی و آزاد و دیگر احباب نے اپنے حلقے میں نجی طور پر اس مسئلے پر غور اور مشورہ کیا اور سب کی یہ راے قرار پائی کہ صوبۂ بنگال کے لیے کلکتہ میں انجمن ترقیء اردو کی ایک شاخ قائم کی جاے اور اردو کی اشاعت اور تعلیم کے متعلق مناسب تدابیر اختیار کی جائیں - اس کے بعد ان صاحبوں نے مجھے دعوت دی اور ۳۱ مئی کو ایک عام جلسہ مسلم انسٹیٹیوٹ ہال میں آنریبل پرنس اکرم حسین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا - اس جلسے کی روداد کلکتہ کے اردو انگریزی بنگالی اخبارات میں شایع ہوی - اخبار "ہند" کلکتہ سے اس کی نقل درج کی جاتی ہے —

جلسۂ مسلم انسٹیٹیوٹ

صوبۂ بنگال میں انجمن ترقیء اردو کا قیام

"ایک عام جلسہ زیر صدارت آنریبل پرنس اکرم حسین صاحب کل شام مسلم انسٹیٹیوٹ ہال میں منعقد ہوا - جناب مولوی عبدالحق صاحب پروفیسر جامعۂ عثمانیہ و سکرٹری انجمن ترقیء اردو نے اپنی عالمانہ تقریر میں اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کا ہندستان کے مختلف صوبوں مثلاً دکن، مدراس، بنگال سے تعلق اور اس کی تدریجی ترقی

کو نہایت دلنشین پیرایہ میں بیان فرما کر ثابت کیا کہ ہندستان میں متحدہ قومیت کے لیے ایک عام زبان کی ضرورت ہے اور اردو میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ہر مقام پر بولی اور سمجھی جاتی ہے، اسی لیے ہر جماعت نے اردو کو کسی نہ کسی شکل میں عام زبان تسلیم کیا ہے - صوبۂ بنگال نے اردو کی ہمیشہ خدمت کی اور اس کے ابتدائی دور میں جس قدر کام بنگال میں ہوا ہے وہ بہت زیادہ اور نہایت اہم ہے - اب ہندستان میں عظیم الشان تبدیلیاں اور انقلاب ہونے والے ہیں اس دور میں بنگال کے لیے ایک عام ہندوستانی زبان سے غفلت برتنا کسی طرح جائز نہ ہوگا - مولانا کی اس تقریر کا حاضرین نے پر زور خیر مقدم کیا - اس کے بعد مولانا محمد اکرم خاں صاحب اڈیٹر آزاد نے فصیح و بلیغ اردو میں تقریر کی اور بنگال کا اردو زبان سے تعلق واضح کرنے کے بعد یہ تحریک پیش کی کہ انجمن ترقیء اردو (ہند) کی ایک مرکزی شاخ صوبۂ بنگال میں قایم کی جاے - اس تجویز کی تائید مسٹر بدرالدجیٰ نے اپنی تقریر میں کی - اور تائید مزید شمس العلما کمال الدین احمد صاحب نے فرمائی جو بہ اتفاق راے منظور کی گئی —

اس کے بعد خان بہادر بدرالدین صاحب نے تجویز پیش کی کہ انجمن ترقیء اردو صوبۂ بنگال کے صدر جناب آنریبل پرنس اکرم حسین صاحب اور معتمد مولانا اکرم خاں صاحب اور جناب عبدالرحمن صدیقی اور نائب معتمد جناب بدرالدجیٰ صاحب اور جناب نورالرحمن صاحب قرار پائیں اور یہ حضرات مجلس انتظامی کے ارکان کا انتخاب اور اعلان کریں - اس تجویز کی تائید مظہر توحید صاحب اور ڈاکٹر زبیر صدیقی صاحب

نے فرمائی جو باتفاق رائے منظور کی گئی —

آخر میں جناب صدر نے ایک برجستہ تقریر میں اردو کی عالمگیر حیثیت کا تذکرہ کرتے ہوئے حاضرین کو مولانا عبدالحق صاحب کے خیالات پر توجہ دلائی اور فرمایا کہ زبان کا مسئلہ ہندوستان کے لیے نہایت اہم ہے اور مسلمانوں کو بالخصوص اپنی قدیم روایات اور تہذیب کو برقرار رکھنے کے لیے اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور صوبۂ بنگال میں انجمن ترقیء اردو کی شاخ کو کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش ہونا چاہیے —

جناب عبدالرحمن صدیقی صاحب نے آخر میں جناب صدر کا شکریہ ادا کیا اور اپنی تقریر میں اردو کی یہ خصوصیت کہ نہ صرف وہ ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر دیگر ممالک میں بھی سمجھی اور بولی جاتی ہے، بیان کی اور اس کی سیاسی اہمیت کی وضاحت فرمائی۔ ان کی تقریر کے بعد جلسہ برخاست ہوگیا " —

۲ - بہار کا دورہ

کلکتہ سے میں پٹنے آیا - قاضی عبدالودود صاحب معتمد انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار نے مجھے خاص طور پر پٹنے بلایا تھا تاکہ انجمن کے بعض معاملات کا فیصلہ جو ایک مدت سے الجھن میں پڑے تھے، میری موجودگی میں ہو جائے - اس میں کئی روز لگ گئے - اس سے فارغ ہونے کے بعد مولوی ضمیرالدین احمد صاحب جائنٹ سکرٹری انجمن ترقیء اردو

صوبۂ بہار نے یہ مشورہ دیا کہ مناسب ہوگا کہ میں مضافات بہار کے چند مقامات کا دورہ کر کے وہاں کے حالات کا بچشم خود معائنہ کر لوں - اور انہوں نے از راہ عنایت خود بھی میرے ہمراہ چلنے کا وعدہ فرمایا - چنانچہ ۹ جون کو چھپرے روانہ ہوگئے - چھپرے اور مظفر پور کے سفر میں پروفیسر نجیب اشرف بھی ہمارے ہمراہ تھے - چھپرے میں ہم نے مولوی عبدالماجد صاحب ایڈوکیٹ کے مکان پر قیام کیا - شام کو کچھ اصحاب جمع ہوگئے اور ان سے ترویج و ترقیٔ اردو کے متعلق گفتگو رہی - شب کو ٹاؤن ہال کے میدان میں مختصر سا جلسہ ہوا جس میں انجمن کے مقاصد بیان کیے گئے اور چند ضروری قرار دادیں منظور ہوئیں - یہاں انجمن کی شاخ پہلے سے موجود ہے لیکن کام بہت کم ہوا ہے - حافظ احمد کریم صاحب سکرٹری انجمن اور سید صالح حسین صاحب کو اس کام میں خاص دلچسپی ہے - چھپرے کے بعض محلوں میں شبینہ مدرسے جاری ہیں اور رضا کار پڑھاتے ہیں —

۱۰ جون کو چھپرے سے مظفر پور پہنچے - اسٹیشن پر مولانا شفیع داؤدی صاحب اور شہر کے سر برآوردہ مسلمان، مسلم لیگ کے والنٹیر اور کارکن اور کانگرس کے نمایندے موجود تھے - مولانا شفیع داؤدی صاحب کے دولت کدے پر قیام کیا - مولانا پرانے قوم پرست اور قومی کارکن ہیں اور انہوں نے بہت کچھ ایثار کیا ہے - ان میں اب بھی وہی مستعدی اور جوش موجود ہے جو پہلے تھا - وہ تمام دن ہمارے کام میں مصروف رہے اور اُن کی بدولت مظفر پور کا سفر خاطر خواہ کامیاب رہا - سہ پہر کو ہم نے سعد پورہ لائبریری اور وہاں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے مدرسوں کا معائنہ کیا - شام کو ذکی حسن صاحب کے مکان پر ایک مشاورتی جلسہ

ہوا اور کھانا کھانے کے بعد مسلم کلب کے میدان میں ایک عام جلسہ مولانا شفیع داؤدی صاحب کی صدارت میں ہوا - یہ بہت بڑا جلسہ تھا اور ہ طبقے کے لوگ شریک تھے - میں نے اور پروفیسر نجیب اشرف نے تقریر کی ضروری تجاویز پیش ہوئیں جن پر پہلے سے کامل غور ہو چکا تھا - انجمن کی شاخ کو از سر نو مضبوط کیا گیا - خان بہادر سید ظہور الدین پرنسپل ٹریننگ کالج انجمن کے صدر اور مولوی سید مجتبیٰ ایڈوکیٹ سکرٹری منتخب ہوئے - یہ جلسہ گیارہ بجے شب کے ختم ہوا اس کے بعد تین مرکزوں کا معائنہ کیا جہاں بچوں اور بالغوں کی پڑھائی کا انتظام کیا گیا ہے - ایک مدرسے میں پندرہ ہندو لڑکے بھی اردو پڑھ رہے تھے - باقی دو میں مسلمان بالغ اور بچے تعلیم پاتے ہیں - پروفیسر نجیب اشرف بعض مجبوریوں کی وجہ سے پٹنے واپس چلے گئے —

ہم مولانا شفیع داؤدی اور دیگر اہل مظفر پور کے بہت شکر گزار ہیں کہ وہ بڑے خلوص اور گرم جوشی سے پیش آئے' ہمارے کام میں ہر طرح کی مدد دی اور آیندہ انجمن کے مقاصد کو زیادہ مستعدی سے عمل میں لانے اور موجودہ کاموں کو ترقی دینے کا وعدہ کیا —

دوسرے روز مظفر پور سے لہریا سرائے (دربھنگہ) پہنچے مولوی مصلح الدین صاحب ڈاکٹر محمد فرید اور مولوی عبدالحفیظ صاحب سکرٹری انجمن ترقیٔ اردو دربھنگہ اور بعض سربرآوردہ حضرات سے اسٹیشن ہی پر ملاقات ہوئی - ڈاکٹر محمد فرید صاحب بہت مخلص اور پر جوش کام کرنے والے ہیں - انہوں نے یہاں ایک مدرسہ قائم کیا ہے جس کے ساتھ دارالاقامہ بھی ہے - مدرسے اور دارالاقامہ کی عمارت بہت وسیع اور خوشنما ہے - ہمارا قیام مولوی مصلح الدین صاحب وکیل

کے مکان پر ہوا - شام کو مجلس مشاورت ہوئی اور بعض تجاویز پر غور ہوا - شب کو ڈاکٹر صاحب کے قائم کردہ مدرسہ کے میدان میں جلسہ ہوا - بہت اچھا مجمع تھا اور ہندو مسلمان اور ہر طبقے کے لوگ شریک تھے - تجویزوں پر بہت گرم اور پر جوش تقریریں ہوئیں - ڈاکٹر محمد فرید اور مولوی عبدالحفیظ صاحب سے کامل توقع ہے کہ وہ در بھنگے میں اردو کی ترویج و ترقی میں پوری کوشش فرمائیں گے -

۱۲ جون کی سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کٹیہار پہنچے - وہاں کے بعض سربرآوردہ اصحاب اور کارکنوں سے گفتگو کے بعد یہ قرار پایا کہ ۱۳ جون کی صبح کو کشن گنج چلے جائیں اور ۱۴ جون کو کٹیہار واپس آکر یہاں کام کریں - چنانچہ ہم دوسرے روز علی الصبح کشن گنج پہنچے - وہاں تمام دن اور رات مسلسل بارش رہی - تاہم وہاں کے وکلا' مختار' کار پرداز' عمال اور عام مسلمان مسجد میں جمع ہوگئے اور وہیں انجمن ترقیء اردو کا جلسہ قرار پایا - مولوی امام علی صاحب ایڈوکیٹ نے کشن گنج کے حالات سنائے اور مولوی عبدالغنی صاحب وکیل نے لوکل بورڈ کے تعلیمی اعداد و شمار دیے - میری تقریر کے بعد انجمن ترقیء اردو کی ایک شاخ قائم کی گئی جس کے صدر مولوی فضل الرحمن صاحب ایم - ایل - اے اور سکرٹری مولوی محمد سلیمان صاحب بی - اے' بی - ایل منتخب ہوے - مولوی فضل الرحمن صاحب اس زمانے میں کشن گنج میں نہ تھے' اس لیے ملاقات نہ ہوسکی - لیکن یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ وہ بہت مخلص کام کرنے والوں میں ہیں - ہمیں امید ہے کہ ان صاحبوں کی کوشش سے کشن گنج میں انجمن کی شاخ ضرور مفید کام کرے گی -

دوسرے روز ہم کٹیہار واپس آئے - شب کو مسجد میں بہت بڑا

جلسہ ہوا - میری تقریر کے بعد حاضرین نے حتمی وعدہ کیا کہ وہ ایک مہینے کے اندر ہر ہر محلے میں اردو مدرسے خاص کر شبینہ مدرسے جاری کردیں گے اور انجمن کے مقاصد کو عمل میں لانے کے لیے پوری کوشش کی جائے گی - اور دیہات میں برسات کے بعد کام شروع کیا جائے گا - اسی وقت انجمن کی ایک شاخ قائم کی گئی جس کے صدر مولوی رضی الدین صاحب وکیل اور سکرٹری ڈاکٹر مظفر صاحب منتخب ہوئے -

ان تمام مقامات میں جو تجویزیں پیش ہوئیں وہ بہت کچھ مشترک تھیں - خصوصاً ایک بات ایسی تھی جس کے متعلق ہر جگہ شکایت سننے میں آئی - بہار گورنمنٹ کا ایک سرکلر اس مضمون کا اس سے قبل دو وزارتوں میں لوکل باڈیز کے نام شایع ہوا تھا کہ جہاں کہیں لوئرپرائمری اور اپرپرائمری مدرسوں میں چھ اردو پڑھنے والے ہوں وہاں ایک اردو داں معلم تقرر کیا جائے - موجودہ حکومت نے بھی اس سرکلر کو شایع کیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ تشریح بھی کر دی کہ لوکل باڈیز خود مختار ادارے ہیں ان کے معاملات میں ہم مداخلت نہیں کرنا چاہتے یہ صرف بطور مشورے کے لکھا جاتا ہے - اس تشریح سے اصل سرکلر کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اس بنا پر ہر جگہ بالاتفاق یہ قرار داد منظور کی گئی کہ بہار گورنمنٹ اس سرکلر کی تعمیل پر اصرار کرے اور اگر وہ عمل نہ کریں تو ان کی امداد بند کردی جائے - اردو داں طبقے کا یہ مطالبہ بالکل جائز ہے ایسے سرکلر کے نفاذ سے کیا حاصل جس کی تعمیل کی کوئی توقع نہ ہو بلکہ جس میں عدم تعمیل کا اشارہ ہو —

۳ - انجمن کے دو نمایندوں کا دورہ سی پی اور برار وغیرہ میں

میری تحریک پر علی شبر صاحب حاتمی بی - اے نے تعطیلات موسم گرما میں سی پی اور برار وغیرہ کے دورے کا قصد کیا - حاتمی صاحب بہت پر جوش اور مستعد کام کرنے والے نوجوان ھیں - انھوں نے اپنے ساتھ ایک اور طالب علم اسرار حسین صاحب کو بھی لے لیا - ان دونوں نے شدید گرمی کے زمانے میں دن رات بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کیا اور ایسا کام کیا کہ دوسروں کے لیے نمونہ ھوسکتا ھے - میں ان کی ھمت پر آفریں کہتا ھوں - اگر ایسے چند سرگرم اور بے نفس کام کرنے والے مل جائیں تو ھماری کامیابی یقینی ھے - اس دورے کی مفصل رپوٹ زیر ترتیب ھے اور عنقریب شایع کی جائے گی ' یہاں اس کی بہت مختصر سی کیفیت درج کی جاتی ھے —

دورے کا آغاز ناگپور سے ۱۷ اپریل کو ھوا اور ۱۰ جولائی کو ختم ھوا - اس عرصے میں انھوں نے سی پی اور برار نیز دیگر مقامات کا معائنہ کیا جس کی تفصیل یہ ھے —

(الف) صوبۂ متوسط و برار کے ۱۹ اضلاع کے صدر مقام ' ۴۰ تحصیلیں ' ۳۰ قصبات اور دیہات اور اس کے علاوہ صوبے کی دو ریاستیں راج نانڈگانو اور ڈونگر گڑھ (کھیراگھڑھ) —

(ب) خاندیس میں جلگانو ' بھوساول ' دھولیہ ' چالیس گانو —

(ج) سنٹرل انڈیا ایجنسی میں اندور ' مئو چھاونی —

(د) ان کے علاوہ حاتمی صاحب نے ممالک متحدہ میں الہ آباد ' فتحپور ' تحصیل کھاگا کے دیہات شاہ پور ' ایرایاں ' ھتگام ' سہلیا اور

ناتھوپور کا دورہ کیا —

ان مقامات میں انہوں نے مفصلۂ ذیل انجمن کی شاخیں اور شبینہ مدرسے قائم کیے —

(۱) ناگپور کمشنری میں انجمن کی ۳۳ شاخیں اور اسی قدر شبینہ مدرسے قائم کیے —

(۲) جبل پور کمشنری میں انجمن کی ۲۳ شاخیں اور اسی قدر مدرسے

(۳) چھتیس گڑھ میں انجمن کی ۲۳ شاخیں اور اسی قدر مدرسے —

(۴) برار میں انجمن کی ۳۱ شاخیں اور اسی قدر مدرسے —

چھتیس گڑھ اور جبل پور کمشنری کی ڈسٹرکٹ کونسلوں کا ایک بھی اردو مدرسہ نہیں اور مسلمان بچوں کو جن کی زبان اردو ہے ہندی پڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں —

اضلاع بیتول اور منڈلہ میں اردو کا ایک مدرسہ بھی نہیں نہ میونسپلٹی کی جانب سے اور نہ ڈسٹرکٹ کونسل کی طرف سے —

سونسر، لکھنا دون، امرواڑہ، رام ٹیک، بیتول، منڈلہ، ملتائی ملکہلی، وارہ سیونی اور بعض دوسرے مقامات میں جہاں اردو پڑھنے والوں کی کافی تعداد موجود ہے اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں —

صوبے کے مسلمانوں میں اردو پڑھنے کا زبردست احساس موجود ہے جن مقامات میں حکومت، ڈسٹرکٹ کونسل اور میونسپلٹی کی طرف سے کوئی انتظام نہیں وہاں انہوں نے خانگی مکتب کھول رکھے ہیں ملکہلی کے خانگی اردو مکتب میں ۴۵ فی صدی ہندوؤں کے بچے بھی پڑھتے ہیں —

سرکاری حکام، ڈسٹرکٹ کونسلوں اور میونسپلٹیوں کے ذمہ دا

اصحاب کا رویہ اردو کے ساتھہ اچھا نہیں - اردو اسکولوں کے رجسٹر هندی اور مرهٹی میں لکھے جاتے هیں اور مدرسین کو اردو میں مراسلت کرنے کا اختیار نہیں - ناگپور جیسے مرکزی مقام میں بھی اردو مدارس کا کوئی اردو داں نگراں نہیں —

باوجود اردو پڑھنے والے طلبہ کی کافی تعداد کے گزشتہ سالوں میں متعدد اردو مدارس بند کردیے گئے —

پاندھرنا میں مسلمان بچے جو هندی اسکول میں پڑھتے هیں اور جن کی تعداد (۴۰) هے سرسوتی دیوی کے سامنے کھڑے هوکر پرارتھنا کرتے هیں - جو مسلمان بچے هندی اسکولوں میں پڑھتے هیں وہ عام طور پر بجائے سلام کے نمستے اور جے رام جی کی کہتے هیں —

هندی اسکولوں میں پڑھنے والے مسلمان بچوں کو رامائن ' مہابھارت ' اور ساوتری اور شیواجی کی سوانح زندگی پڑھنی پڑتی هے - اس میں کچھہ مضائقہ نہ هوتا اگر اس کے ساتھہ اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب کے سبق بھی هوتے بلکہ یہ قومی اتحاد کے لیے مفید هوتا —

ودیا مندر کے خلاف صوبے بھرکے مسلمان هم آواز هیں اور ان کی مخالفت کا سلسلہ اب تک جاری هے —

۳ - مولانا ابوالکلام آزاد اور هندی اردو

اپریل کے آخری هفتے میں جب میں کلکتے میں تھا تو مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں بھی حاضر هوا - اور یہ عرض کیا کہ کانگرس حکومتوں کے اکثر ارکان اور وزرا اپنی سرکاری اور غیر سرکاری

تقریروں اور تحریروں میں ہندی کی اشاعت پر زور دے رہے ہیں اور یہ کانگرس کے فیصلے کے صریحاً خلاف ہے - خصوصاً جب اس قسم کے الفاظ کسی حکومت کے وزیر تعلیم کی زبان اور قلم سے نکلتے ہیں تو اس سے سخت غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ کانگرس حکومت اردو کے مٹانے اور ہندی کے رواج دینے کی کوشش کر رہی ہے - چونکہ آپ کی رائے اس معاملے میں کانگرس کے حلقوں میں زیادہ مستند سمجھی جائے گی لہذا اگر آپ ان کو ہدایت فرمادیں گے تو مناسب ہوگا - مولانا نے وعدہ فرمایا کہ وہ گشتی چٹھی کے ذریعہ سے اس کی اصلاح فرمادیں گے - لیکن غالباً انہیں اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس کا موقع نہ ملا یا بھول گئے - اس لیے میں نے انہیں خط لکھا اور اس وعدے کی یاد دھانی کی - چنانچہ اس کے بعد انہوں نے ساتوں صوبوں کے وزیر اعظموں کے نام خط لکھے اور ہندی اور اردو کی بجائے "ہندستانی" کے استعمال کی ہدایت کی -

مولانا نے اپنے خط میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے اور بہت بچ بچ کو لکھا ہے - ان کا کہنا یہ ہے کہ مدراس، بمبئی، سی پی، بنگال والے ہندی اردو کے نازک فرق سے واقف نہیں اس لیے اس غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں - میرا تجربہ اس کے خلاف ہے - مجھے اس معاملے میں کانگرس حکومتوں کے بعض وزرا سے ملنے کا موقع ملا اور گفتگو کے بعد انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا، لیکن اس کے بعد بھی وہ ہندی کا دم بھرتے رہے - مثلاً جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ بمبئی کی حکومت نے اپنے بجٹ میں کئی لاکھ روپے ہندی کی اشاعت کے لیے منظور کیے ہیں تو میں فوراً بمبئی پہنچا اور وہاں کے وزیر اعظم مسٹر کھیر سے ملا

اور ان کو اس طرف توجہ دلائی تو انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور آئندہ اصلاح کا وعدہ فرمایا اور جو میں نے کہا اسے لکھ لیا لیکن اس کے چند روز بعد ہی اپنی تقریر میں ہندی کی اشاعت کی پر زور حمایت کی اور پہلے سے زیادہ اصرار کیا۔ اسے کیا کہنا چاہیے؟ بھولا پن یا مکرا پن؟ - کانگرس نے صاف اور صریح الفاظ میں ہندستانی کو ملک کی زبان قرار دیا ہے پھر اس میں غلط فہمی کی گنجائش ہی کہاں ہے - گاندھی جی کے پاس تو بنا بنایا عذر موجود ہے کہ وہ تو کانگرس کے چار آنے والے ممبر بھی نہیں ہیں اس لیے اُن پر کانگرس کے فیصلے کی پابندی لازم نہیں ' حالانکہ ہندستانی کا رزولیوشن خود انھیں کا تجویز کیا ہوا ہے - لیکن کانگرس کے وزرا کے پاس کیا عذر ہے؟ - اصل یہ ہے کہ چونکہ گاندھی جی ہندی سمیلن کے صدر اور ہندی کے سرپرست اور مربی ہیں اس لیے سب کانگرس والے انھیں کی پیروی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے - قول کچھ ہی ہوا کرے اصل چیز تو عمل ہے - لہذا جب تک "سرچشمہ" کی اصلاح نہ ہوگی یہ گدلا پن یونہیں باقی رہے گا —

---

۴ - اخبار مدینہ کی راے

مولانا ابوالکلام آزاد کی اس گشتی چٹھی کے متعلق اخبار مدینہ کی راے قرین انصاف اور قابل غور ہے —

" ہم خود ہمیشہ سے کہتے چلے آئے ہیں کہ اردو ہندی کے مسئلے کے بارے میں کانگرس نے جو فیصلہ کیا ہے وہ نہایت صائب ہے اور اس

سے بہتر اور معقول فیصلے کی بحالات موجودہ کوئی توقع نہیں کی جاسکتی ہے - لیکن اسی کے ساتھہ ہمارا خیال ہے کہ ہندؤں کا متعصب اور تنگ نظر طبقہ اس مسئلے کے بارے میں جو خیال رکھتا ہے اور عملاً اسے جس طرح حل کرنا چاہتا ہے وہ یقیناً اردو کے لیے خطرناک ہے اور اس کی بنا پر مسلمانوں کے دلوں میں خود کانگرس کی طرف سے بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں اور انہیں یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہے کہ کہیں اردو کو آسان بنانے کی تحریک ہندی کی ترویج عام کا زینہ سمجھہ کر تو نہیں اختیار کی گئی ہے؟ مثلاً حکومت یو پی ہی کی طرف سے جو سرکاری بیانات و اعلانات وغیرہ فارسی اور ہندی رسم الخطوں میں الگ الگ شایع ہو رہے ہیں' اُن کی زبان بھی ایک دوسرے سے جداگانہ ہے - حالانکہ کانگرس کے فیصلے کے مطابق زبان ایک ہونی چاہیے تھی اور صرف رسم الخطوں کا فرق ہونا چاہیے تھا - اس طرح بہت سے کانگریسی لیڈر اپنی تحریروں اور تقریروں میں اب ایسے الفاظ بہ کثرت استعمال کرنے لگے ہیں جن کا پنڈتوں کی مدد کے بغیر مسلمانوں کے لیے اور شاید عام ہندؤں کے لیے بھی سمجھنا دشوار ہے - درانحالیکہ اُن الفاظ کے ہم معنی سہل اور سادہ الفاظ روزمرہ کی زبان میں مستعمل ہیں اور خود یہ لوگ اپنی پہلے کی تقریروں اور تحریروں میں ان کے استعمال کے عادی رہ چکے ہیں - بہت سے ہندو اخبارات مثلاً تیج وغیرہ جو کانگریس کے علم بردار خیال کیے جا رہے ہیں' اردو کے عام اور مستعمل الفاظ کے ساتھہ مخصوص طور پر تعصب برت رہے ہیں اور اُن کی بجاے سنسکرت کے غیر مانوس اور ثقیل الفاظ کو روز بروز زیادہ کثرت کے ساتھہ استعمال کرنے لگے ہیں -

ایسی حالت میں کانگریس کا فیصلہ خواہ کتنا ہی معقول اور صائب ہو، مسلمانوں کو بدگمانی سے کسی حال میں بچایا نہیں جا سکتا - بدا بریں ہم کانگریسی ارباب حل و عقد سے التجا کرتے ہیں کہ وہ کانگریسی حکومتوں اور لیڈروں کے ان اعمال کی پوری شدت کے ساتھہ نگرانی کریں، جن میں ممکن ہو بد نیتی کو دخل نہ ہو لیکن جو مسلمانوں کی بدگمانی کو تقویت پہنچانے والے ہیں - اور ہندو اخبارات سے درخواست ہے کہ وہ اپنے تعصب اور تنگ نظری کا مظاہرہ کرکے ملک کے مفاد کو نقصان نہ پہنچائیں اور سمجھہ بوجھہ سے کام لیں" - (۷ جون سنہ ۳۸ ع)

۵ - ہندستان کا ایک نادان دوست -

سی پی کانگرسی حکومت کے وزیر اعظم مسٹر کھرے نے ایک بڑے جلسے میں جو "یوم چین" کے نام سے کیا گیا تھا، یہ فرمایا کہ چین کے سب مسلمان چینی زبان بولتے ہیں - اسی طرح ہندستان کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اردو کو ترک کردیں اور ہندی اختیار کرلیں - مسٹر کھرے کانگرسی حکومت کے وزیر اعظم ہیں اور بڑے قابل سمجھے جاتے ہیں اور اس پر اُن کی واقفیت کا یہ حال ہے کہ وہ اردو کو کسی غیر ملک کی زبان سمجھتے ہیں - اِس کانگرسی بوزر جمہر کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ اردو خالص ہندی زبان ہے اور سوائے ہندستان کے کسی دوسرے کی زبان نہیں - یہیں پیدا ہوی اور پھیلی اور اس کے بنانے اور پھیلانے میں زیادہ تر ہندؤں کا حصہ تھا - یہی وہ نادان دوست ہیں جو اپنے نامعقول اور بے محل مشوروں سے ملک میں نفاق

کا بیج بوتے اور قوموں میں تفرقہ پیدا کرتے ہیں —

۶ - مسٹر ساورکر اور قومی زبان

مسٹر ساورکر نے ارشاد فرمایا کہ ہندستان کی قومی زبان سنسکرت آمیز ہندی ہونی چاہیے کیونکہ ہندستان کی اکثریت کی یہی زبان ہے - اگر کوئی نیویارک کا باشندہ ایسی بات کہتا تو ہمیں تعجب نہ ہوتا بلکہ ہنسی آتی ' لیکن مسٹر ساورکر کا یہ قول سن کر نہ تعجب ہوتا ہے اور نہ ہنسی آتی ہے بلکہ ان کی سمجھ پر افسوس ہوتا ہے - وہ سنسکرت آمیز ہندی جسے وہ خود بھی نہیں جانتے ہندستان کے کسی مقام کی زبان نہیں - اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ وہ یہ تجویز کرتے کہ اس ملک کی زبان سنسکرت ہونی چاہیے - یہ ایک زبان تو ہے گو مردہ ہی سہی -

اسی ضمن میں اخباروں سے یہ معلوم ہوا جب کہ امرتسر میں ۱۱ مئی کو مسٹر ساورکر کے سامنے اردو زبان میں اڈریس پڑھا جانے لگا تو ہندؤں نے شور مچایا کہ ہم ملیچھوں کی زبان سننا نہیں چاہتے - یہ اڈریس ہندی زبان میں پڑھا جاے چنانچہ اردو اڈریس کا ترجمہ ہندی میں کر کے سنایا گیا —

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ساورکر نیا ہندستان اور نئی زبان اور نئی تہذیب پیدا کرنی چاہتے ہیں - اگر یہ ہے تو اُن کی یہ کوشش اور یہ جرأت مجنونانہ قابل تحسین ہے —

—*—

۷ - مدراس اور ہندی دشمنی

جب سے مدارس کی کانگرسی حکومت نے ہندی کو وہاں کے مدرسوں میں جبری طور پر رائج کرنے کا تہیہ کیا ہے اُسی وقت سے تمام دراوڑی قوموں اور خاص کر تامل ناڈ والوں کی طرف سے سخت مخالفت شروع ہوگئی ہے - اخباروں سے اس کا پورا اندازہ نہیں ہوتا ' وہاں جاکر اصل کیفیت معلوم ہوتی ہے - میں حال ہی میں مدراس گیا تھا اور وہاں مجھے کانگرسی ' غیر کانگرسی اور تامل والوں سے ملنے کا اتفاق ہوا - منجملہ ان کے ایک مسز میلم بال سورراج تھیں - یہ دبلی پتلی ' تیکھی ' سوکھی الفن بہت ہی پرجوش اور مستعد خاتون ہے - ہندی کی مخالفت میں جب وہ مجھ سے باتیں کررہی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے منہ سے لفظ نہیں بلکہ انگارے نکل رہے ہیں - اگرچہ اس کی گفتگو بہت تیز و تند تھی مگر بہت دلچسپ تھی - مجھے اس کی پوری گفتگو تو یاد نہیں رہی اور یاد رہتی بھی تو میں لکھنا پسند نہ کرتا ' لیکن اس کے بعض بعض جملے اور ٹکڑے ضرور سننے کے قابل ہیں - وہ کہتی یہ تھی کہ اگر ہندی ہی پڑھنی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی مگر یہ برہمن ہندی کے ذریعہ سے سنسکرت پھیلانی شروع کریں گے اور ہماری زبان و تہذیب کو مٹا ڈالیں گے - برہمن چاہتا ہے کہ ہم وہ نامعقول (wretched) کتاب رامائن پڑھیں ؟ ہم ہرگز نہیں پڑھیں گے اور آخر تک اس کا مقابلہ کریں گے - وہ ہم میں اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا چاہتا ہے مگر ہم اور مسلمان ایک ہیں اور یہ برہمن (آریا) غیر ملکی ہے - میں نے پوچھا کہ تم اور مسلمان ایک کیوں کر ہوئے تو کہنے لگی کہ ہمارے علاقے میں جو مسلمان ہیں وہ کہیں باہر سے تھوڑا

ہی آئے ہیں' ہمارے ہی بھائی بند تھے جو مسلمان ہوگئے' اور اب بھی بھائی بندوں کی طرح رہتے ہیں - اگر یہ برہمن ہم پر زیادہ جبر کریں گے تو ہم مسلمان ہوجائیں گے' ہم دونوں جنگی قومیں ہیں' برہمن ہمارا مقابلہ نہیں کرسکتے - میرا نام میلم بال ہے پھر میں میراں بائی ہو جاؤں گی -

مجھے اس پر بے اختیار ہنسی آئی اور وہ بھی خوب ہنسی —

غرض تامل ناڈ کا ایک ایک فرد مخالفت پر تلا ہوا ہے اور ان سب کے خیالات اسی قسم کے ہیں جو میں نے اوپر بیان کیے ہیں - مسٹر سی راج گوپال چاریار جہاں جاتے ہیں ' کالے جھنڈوں سے ان کا استقبال کیا جاتا ہے - روزانہ ان کے مکان کے سامنے کئی کئی شخص دھرنا دیتے ہیں اور گرفتار ہوتے ہیں - وہ جلسوں' جلوسوں ' کانفرنسوں' دھرنا دینے ' فاقے کرنے اور کالے جھنڈوں سے اپنی مخالفت کا اظہار کررہے ہیں - اس میں لڑکے ' جوان' ادھیڑ سب قسم کے لوگ شریک ہیں - مخالفت کی یہ سب ترکیبیں خود کانگرس کی سکھائی ہوئی ہیں اور آج وہ کانگرس کے خلاف انہیں ترکیبوں سے کام لے رہے ہیں - فاقے کرنے والوں میں سب سے ممتاز نام مسٹر استالن جگدیسن ہیں - میں بھی انہیں دیکھنے گیا تھا ' اس دن (۱۹ جولائی کو) اُن کا ۷۸ واں فاقہ تھا - وہ ایک کوچ پر خاموش پڑے تھے' ان کے اوپر ایک سفید چادر پڑی تھی اور چہرہ اور سر کھلا تھا - لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا' آتے تھے اور چپ چاپ دیکھہ کر چلے جاتے تھے - دو ایک ہمدرد اُن کے پاس کرسیوں پر بیٹھے تھے - ضعف اور نقاہت کا غلبہ تھا ' رنگ زرد پڑگیا تھا ' بڑی بڑی کھلی آنکھیں بے کسی ظاہر کر رہی تھیں - اس شخص کو دیکھہ کر مجھے بہت ترس آیا اور افسوس بھی ہوا -

ان کی شکایت یہ ہے کہ (۱) حکومت اقلیتوں کی زبان اور تہذیب

کی پروا نہیں کرتی - (۲) کانگرس نے کبھی یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ہندی جبراً پڑھائی جائے اور نہ انتخاب کے وقت تقریروں اور تحریروں میں اس کا اظہار کیا - (۳) وزیر اعظم کا ایک مقصد اس جبری تعلیم سے ایک خاص جماعت کو فائدہ پہنچانا ہے - یعنی ہندی پرچار سبھاؤں کے لوگوں کو جو کانگرس کے رضاکار بھی تھے روزگار پیدا کرنا ہے - (۴) ہندی کے رائج کرنے سے فرقہ واری تفرقہ اور زیادہ بڑھے گا - کیونکہ وزیر اعظم کا اصل مقصد غیر برہمنوں کو دبانا اور پائمال کرنا ہے - پولٹیکل برہمن اب تک اس بات کو نہیں بھولا کہ وہ آریا ہے اور غیر برہمن دراوڑی ہے - (۵) شمالی ہند کے سیاست کاروں کا منصوبہ یہ ہے کہ جب انگریزوں کا قدم درمیان میں نہ رہے تو جنوبی صوبے پر اپنی حکومت جمائیں - ہندی کی جبری ترویج اس منصوبے کو عمل میں لانے کا صرف پہلا قدم ہے - (۶) سب سے ضروری اور اہم مسئلہ جہالت کا رفع کرنا ہے - اس لیے جو مصارف ہندی کی جبری تعلیم پر کیے جا رہے ہیں وہ اگر جہالت رفع کرنے پر کیے جائیں تو زیادہ مفید ہوگا - (۷) ہندی اگر رائج ہی کرنی ہے تو اختیاری ہونی چاہیے - اسے جبری قرار دینا کسی حال میں مناسب نہیں —

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اعتراض پیش کیے گئے ہیں - ان میں کسی قدر مبالغہ اور بدگمانی پائی جاتی ہے جو درست نہیں - البتہ ان کا یہ کہنا کہ مدرسوں میں ہندی ایک اختیاری مضمون رکھا جائے بہت معقول ہے - جبری رواج کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ ہرگز جائز نہیں ہے - لیکن وزیر اعظم کا اصرار ہے کہ میں اسے جبراً رائج کر کے چھوڑوں گا اور مخالفین کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوں گا -

دوسری نازیبا بات جو اس نزاع میں پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ وزیر اعظم کے مکان یا بعض مدرسوں کے سامنے (جن میں ہندی جبری تعلیم رائج کی گئی ہے) دھرنا دیتے ہیں، انہیں بہت سخت سزائیں دی جاتی ہیں - ایسی معمولی حرکتوں کے لیے چھ چھ مہینے اور سال سال بھر کی قید بامشقت کی سزا انصاف اور انسانیت کے خلاف ہے - یہ مخالفت کی روک تھام نہ ہوئی بلکہ اچھا خاصا انتقام ہوا - اس پر مخالفوں کا یہ کہنا کہ جس حکومت کو کانگرس والے شیطانی کہتے تھے یہ تو اس سے بھی زیادہ شیطانی نکلی، کچھ زیادہ بیجا نہیں ہے —

اس تمام تنازع میں ایک بات اچھی ہوی کہ اب وزیر اعظم بجائے ہندی کے ہندستانی کہنے لگے ہیں - اس میں انجمن ترقیء اردو کی کوشش کو بھی کچھ دخل ہے - مخالف یہ کہتے ہیں کہ یہ محض مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے کیا گیا ہے - ہم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ اس بارے میں کانگرس رزولیوشن کا صاف اور صریح الفاظ میں موجود ہے - البتہ یہ ضرور ہے کہ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ مخالفت دونوں کی طرف سے ہو رہی ہے تو انہوں نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ ہندی کو چھوڑ کر ہندستانی کہنے لگے ورنہ آنریبل راج گوپال چاریار جو گاندھی جی کے ہر ارشاد کو الہام و وحی سمجھتے ہیں، ویسے اس پر مشکل سے رضامند ہوتے —

۹ - ایک نہایت خطرناک تجویز

اخباروں کے دیکھنے سے معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رامیا صدر کانگرس کمیٹی علاقۂ آندھرا نے بیان کیا ہے کہ مہاتما گاندھی جدید تقسیم ہندستان کے متعلق ایک مفصل اور جامع اسکیم تیار کر رہے ہیں - یہ تقسیم زبانوں کی رو سے ہوگی - یعنی ہر زبان بولنے والوں کے صوبے الگ الگ کردیے جائیں گے اور ہر صوبے کی کوئی خاص زبان قرار دے دی جائے گی - مثلاً بنگال کی بنگالی' صوبۂ متحدہ اور صوبۂ بہار کی ہندی' پنجاب کی پنجابی' مہاراشٹر کی مرہٹی' گجرات کی گجراتی اور جنوبی علاقہ توڑ کر اور اس کے الگ الگ حصے کرکے تلنگی' تامل' کنڑی' ملیالم وغیرہ بولنے والوں میں تقسیم کر دیا جائے گا - اور اس وقت جو تقسیم ہے وہ زبان کی بنیاد پر بدل دی جائے گی - اب ذرا آپ غور کیجیے کہ اردو کس خطے کی زبان ہوگی —

اس سے پہلے انگریزوں نے تقسیم کی تھی' وہ مسلمانوں سے ناراض تھے' اس لیے دلی کو نکال کر پنجاب سے' سندھ کو بمبئی سے' بہار کو بنگال سے ملا دیا - اب کانگرس کی حکومت آئی ہے وہ بھی مسلمانوں سے کچھ خوش نہیں معلوم ہوتے' یہ جو تقسیم کریں گے تو اس سے اردو زبان اور اسلامی تہذیب کا خاتمہ ہی ہو جائے گا - زبانوں کی بنا پر جو تقسیم کی سوچی گئی ہے یہ بڑی گہری چال ہے - جنوبی ہند کے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے - ریاست حیدرآباد کا کیا حشر ہوگا - اس تجویز کی رو سے تلنگانہ آندھرا صوبے میں جا ملے گا' مرہٹواڑی کا علاقہ مہاراشٹر کو مل جائے گا اور کنڑی کا علاقہ صوبۂ کرناٹک کو دے دیا جائے گا —

مدت ہوئی کانگرس نے بھی اس قسم کا ایک رزولیوشن منظور کیا لیکن اس وقت وہ محض کاغذی قرار داد سمجھی گئی تھی - اب اتفاق زمانہ سے کانگرس کو حکومت بھی مل گئی ہے ' بہت ممکن ہے کہ کچھہ دنوں کے بعد وہ رفتہ رفتہ اس پر عمل کرنا شروع کریں - اگر یہ صحیح ہے کہ کوئی ایسا منصوبہ سوچا جا رہا ہے تو ہمیں اندیشہ ہے کہ اس سے ملک میں نئے نئے جھگڑے اور فساد نہ پیدا ہوجائیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان اس اسکیم پر اصرار کریں جو پاکستان کے نام سے موسوم کی جاتی ہے اور جو اب تک ایک خیالی چیز سمجھہ کر قابل اعتنا نہیں سمجھی گئی - اس نئے منصوبے کے بانیوں کو ان تمام باتوں پر پوری طرح غور کرلینا چاہیے —

تبصرے

ادب

واقعات اظفری ۷۰۱

دیوان بیدار ۷۰۴

آئی - سی - ایس ۷۰۵

میخانۂ الہام ۷۰۶

خطبات صدارت ۷۰۶

Hali's Poetry ۷۰۷

طب

کلیات ادویہ ۷۰۹

دیسی فارماکوپیا موسوم بہ علاج بالمرکبات ۸۱۰

مذہب و سیر

تابعین ۷۱۰

تفسیر سورۂ والعصر ۷۱۲

لغت

تسہیل العربیہ ۷۱۳

ہندی اردو لغت ۷۱۵

متفرقات

الکتاب الوحید ۷۱۶

عربوں کی جہاز رانی ۷۱۶

فہرس ۷۱۹

اردو کے جدید رسالے

برہان ۷۲۰

جدید اردو ۷۲۰

کارنامہ ۷۲۱

اردو رسالوں کے خاص نمبر

علی گڑھ میگزین کا اقبال نمبر ۷۲۲

سب رس اقبال نمبر ۷۲۲

ہمدرد صحت دق و سل نمبر ۷۲۳

دی مسلم یونیورسٹی میگزین ۷۲۴

تبصرے

ادب

واقعات اظفری

(مترجمہ مولوی محمد حسین صاحب محوی، لکچرار اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ مدراس یونیورسٹی - قیمت دو روپے آٹھ آنے)

یہ کتاب بہت ہی دلچسپ ہے - اردو میں ایسی کتابیں جن میں دلچسپی کے ساتھ معلومات بھی ہوں اور معلومات بھی ایسی جو دوسری کتابوں میں نہ ملتی ہوں، بہت کم شایع ہوتی ہیں —

اس کتاب کے مصنف میرزا محمد ظہیرالدین علی بخت اظفری دھلوی گورکانی ہیں - یہ شاہ عالم بادشاہ کے ہم جد اور انہیں کے عہد میں تھے - شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر خلد مکان کی پوتی نواب عفت آرا بیگم کے نواسے ہوتے ہیں - اظفری قلعۂ معلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی - تیس سال تک وہ قلعہ میں رہے جسے وہ قید سلاطین سے موسوم کرتے ہیں اس لیے سلاطین (یعنی بادشاہ کے ہم جد

لوگوں) پر سخت پابندیاں تھیں اور ان پر بڑی نگرانی رکھی جاتی تھی - ان کی ڈیوڑھیاں تین پہر کو دن ڈھلے بند ہو جاتی تھیں اور ہر دروازے میں اندر اور باہر تین تین قفل لگا دیے جاتے تھے - اسی لیے اسے سلاطینی قید کہتے تھے - غلام قادر خاں نمکحرام کا واقعہ اظفری کی آنکھوں سامنے ہوا - قلعہ کے حالات ایسے خراب ہوگئے تھے اور اس پر شب و روز کی قید ، کہ اظفری نے نکل بھاگنے کی ٹھان لی - علاوہ اس کے ان کی جاں نثارانہ خدمات کے صلے میں بادشاہ نے بہت سے وعدے کیے تھے مگر ایفا نہ کیے - اس سے بھی وہ بہت بد دل ہوگئے - آخر قلعے کے بعض ملازموں سے سازش کر کے نکل بھاگے - جے پور اور جودھ پور وغیرہ ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے - سات سال وہاں قیام کیا - نواب آصف الدولہ نے بیحد عنایتیں فرمائیں - مگر دکن کی لولگی ہوئی تھی - حیدرآباد کے نواب آصف جاہ بہادر اور مدراس کے امیر الہند والا جاہ سے ملنے کا اشتیاق تھا - آخر لکھنؤ سے چل کھڑے ہوئے اور سنہ ۱۲۱۲ ھ میں مدراس پہنچ گئے - یہاں اُن کی بڑی قدر ہوئی اور آخر دم یعنے سنہ ۱۲۳۴ ھ تک یہیں رہے —

اگرچہ اُس زمانے میں بادشاہت برائے نام رہ گئی تھی اور بادشاہ انگریزوں کے وظیفہ خوار اور بے بس تھے مگر اظفری جہاں کہیں گئے ان کی قدر و منزلت بادشاہوں کی سی ہوئی - چنانچہ جے پور کے راجہ کی ملاقات کے ضمن میں لکھتے ہیں :—

> " اس مہینے کی تیرھویں تاریخ ، چودھویں کی آدھی رات کو خود راجہ نے ہمارے ہاں آکر نہایت شایستہ طریقے پر ملاقات کی - ہمارے خاندان کے آداب کے مطابق سلام گاہ میں جا کر مجرا ادا کیا - پھر نزدیک آکر ایک سو ایک اشرفیاں نذر

گزرانیں- پھر آداب گاہ میں جا کر آداب بجا لایا- میں نے اشارے سے پاس بلایا- مگر جب دیکھا کہ بہت دیر سے کھڑا ہے اور طول طویل داستان چھیڑ دی ہے تو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا مگر وہ نہ بیٹھا" —

اس کتاب میں اظفری نے اپنی سیر و سفر کے علاوہ قلعۂ مبارک کے بھی بہت سے حالات لکھے ہیں - یہ باتیں تاریخوں کے صفحات میں نہیں ملتیں' لیکن اصل تاریخ یہی ہیں- اس حیثیت سے یہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے- اس کے علاوہ جہاں جہاں وہ گئے ہیں وہاں کی عجیب چیزوں' رسم و رواج وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے- رستے میں جو دشواریاں پیش آئی ہیں وہ بھی لکھتے جاتے ہیں اور جن قابل قدر لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی ہیں انہیں بھی بیان کر دیا ہے - اہل مدراس کے طور طریق' آب و ہوا' عادات و اخلاق پر بھی تبصرہ کیا ہے —

اظفری صاحب ذوق اور ذی علم شخص تھے - علم طب' رمل' عروض و قافیہ میں پوری مہارت رکھتے تھے- فارسی' اردو' ترکی کے بہت اچھے ادیب اور شاعر اور تینوں زبانوں میں صاحب دیوان تھے- علاوہ دیوانوں کے کئی کتابوں کے مصنف تھے- ہماری نظر سے ان کا اردو کلام گزرا ہے- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر زبان کی خاطر شعر کہتے تھے اور خاص کر قلعۂ معلیٰ کی زبان اور محاورے نظم کرتے تھے —

مولوی محمد حسین صاحب محوی نے ترجمہ بہت سلیس اور فصیح زبان میں کیا ہے - یہ مدراس یونیورسٹی کے اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ اردو کی پہلی کتاب ہے جو شایع ہوئی ہے اور ہم

یونیورسٹی کو اس عمدہ انتخاب پر مبارک باد دیتے ہیں - کتاب ٹائپ میں بہت صاف ستھری چھپی ہے —

دیوان بیدار

(مرتبہ مولوی محمد حسین صاحب محوی صدیقی
لکچرر اردو مدراس یونیورسٹی - قیمت دو روپے آٹھ آنے)

یہ مدراس یونیورسٹی کے اورینٹل ری سرچ انسٹیٹیوٹ شعبۂ اردو کی دوسری کتاب ہے - میر محمدی بیدار اردو کے ممتاز شعرا میں سے ہیں - خواجہ میر درد کے عقیدت مند احباب میں سے تھے اور انہیں اپنا کلام بھی دکھایا ہے - میر تقی میر سے بھی ان کے دوستانہ تعلقات تھے - انہوں نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے - صاحب ذوق صوفی منش تھے - کلام میں ان کے سادگی لطف اور درد پایا جاتا ہے - زبان کی صحت اور صفائی میں بیدار نے بھی دوسرے اساتذہ کی طرح کام کیا ہے —

محوی صاحب نے یہ نسخہ دو نسخوں سے مرتب کیا ہے - ایک نسخہ تو انہیں خان بہادر آنریبل عبدالقدوس بادشاہ مدراس سے ملا اور دوسرا نسخہ سکرٹری انجمن ترقیء اردو نے دیا - مدراس والا نسخہ پورا نہیں بلکہ انتخاب ہے دوسرا نسخہ کامل ہے، اس میں ان کا فارسی دیوان بھی شامل ہے —

محوی صاحب نے اسے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے اور شروع میں

ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ھے —

آئی - سی - ایس

(مولفہ سید علی عباس حسینی صاحب - انڈین پریس الہ آباد -
قیمت ایک روپیہ آٹھہ آنے)

یہ چودہ فسانوں کا مجموعہ ھے جو سید علی عباس حسینی صاحب کے طبعزاد ھیں - اس قسم کے فسانے ھمارے ادب میں بالکل جدید ھیں اور اس زمانے میں اس کا چرچا زیادہ ھوگیا ھے' اچھے برے سب ھی طرح کے لکھنے والے ھیں - لیکن سید صاحب کے یہ فسانے پڑھ کر بہت خوشی ھوئی - وہ لکھنے کے گُر سے خوب واقف ھیں - ادبی خوبیوں کے ساتھہ زبان میں سلاست اور روانی ھے اور قصے کے لکھنے کا ڈھنگ بہت اچھا ھے - ان میں نقالی نہیں جیسا کہ اکثر فسانوں میں پائی جاتی ھے بلکہ انھوں نے ایسی چیزیں لکھی ھیں جو حقیقت پر مبنی ھیں اور جن کا تعلق ھمارے وطن اور معاشرت سے ھے - وہ ھر قسم کے بیان پر قدرت رکھتے ھیں - رنج و الم' مسرت و انبساط' مزاج و ظرافت' جھگڑا ٹنٹا عشق و محبت غرض ھر قسم کی واردات کو سلیقے سے نبھالے گئے ھیں - یہ فسانے پڑھنے کے قابل ھیں اور بعض ان میں ایسے ھیں جو انتخاب کے قابل ھیں -

ایک آدھ جگہ کتابت کی غلطی یا سہو قلم ھوگیا ھے' مثلاً حجر (بمعنی پتھر) کو ھجر' نقید کو نقیض لکھہ دیا ھے یا نذر کی بجائے نذری

جو صحیح نہیں ھے —

میخانۂ الہام

(دیوان شاد عظیم آبادی ' مرتبۂ حمید عظیم آبادی صاحب - مطبوعہ برقی مشین پریس بانکی پور ' پٹنہ)

شاد عظیم آبادی اردو کے نہایت نامور شعرا میں سے تھے اور بہت پرگو تھے - چھپنے اور شائع ہونے سے پہلے ھی ان کا کلام ھندوستان بھر میں پھیل گیا تھا اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا - اس سے قبل سنہ ۱۹۲۴ ع میں یعنی تقریباً تیرہ چودہ برس سے پہلے انجمن ترقیٔ اردو پٹنہ کی سعی سے ان کے کلام کا مجموعہ " کلام شاد حصۂ اول " کے نام شایع ہوا تھا - اس پر " اردو " بابت ماہ جنوری ۱۹۲۵ ع میں مفصل تبصرہ لکھا گیا تھا - اس لیے اب اس پر کچھ لکھنا لاحاصل ھے - البتہ جناب حمید عظیم آبادی کی کوشش اور محنت کی داد دینی ضروری ھے - انھوں نے حق شاگردی ادا کر دیا ھے اور اس مجموعے کو بڑی نفاست اور خوبی سے طبع کرایا ھے - کلام بھی اس میں پہلے مجموعے سے زیادہ ھے - شاد کے قدردان اس کی ضرور قدر کریں گے —

خطبات صدارت

(آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ)

گزشتہ سال مارچ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ

جوبلی بڑی شان سے منائی گئی تھی ۔ علاوہ اور باتوں کے اس کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ بارہ مختلف شعبوں کے الگ الگ اجلاس ہوئے - یہ گیارہ شعبے یہ تھے :

(۱) شعبۂ معاشیات و اصلاح معاشرت - (۲) شعبۂ تعلیم نسواں (۳) شعبۂ ابتدائی تعلیم و مدارس اردو - (۴) شعبۂ اعلیٰ تعلیم (۵) شعبۂ اردو پریس کانفرنس - (۶) شعبۂ اسلامی علوم و فنون - (۷) شعبۂ مدارس اسلامیہ - (۸) شعبۂ خواندگی و تعلیم بالغاں - (۹) شعبۂ اردو کانفرنس - (۱۰) شعبۂ صنعتی تعلیم - (۱۱) شعبۂ تعلیم ثانوی -

ان تمام خطبوں کی تعداد بارہ ہے' اردو پریس کانفرنس کے دو اجلاس ہوے اور دو خطبے الگ الگ پڑھے گئے - ہر شعبہ کا صدر اپنے فن کا ماہر تھا - اس لیے یہ خطبے بہت بصیرت افروز اور مطالعہ کے قابل ہیں - اور امید کی جاتی ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت کثرت سے ہوگی اور خاص کر وہ اصحاب جو تعلیم اور زبان کا شوق رکھتے ہیں اس کی پوری قدر کریں گے —

Hali's Poetry

(حالی کی شاعری - مولفہ جناب محمد طاہر جمیل
ایم - اے - ڈی بی تارا پوری والا اینڈ سنز بمبئی)

اگرچہ اردو میں مولانا حالی کے کلام پر بہت کچھہ لکھا جا چکا ہے اور انگریزی میں بھی اردو زبان و ادب کے سلسلے میں ان کا ذکر آتا

ہے لیکن اب تک انگریزی میں کوئی مستقل کتاب ان کی شاعری پر نہیں لکھی گئی تھی- محمد طاہر جمیل صاحب کی یہ سعی بہت قابل تحسین ہے —

دراصل ان کا یہ ایک مقالہ تھا جو انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے گرفتھہ میموریل پرائز کے لیے لکھا تھا جو یونیورسٹی نے منظور کیا- بعد ازاں انہوں نے اس کی نظر ثانی کی اور اس میں بہت کچھہ اضافہ کیا اور کتاب کی صورت میں شایع کیا —

یہ کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے- پہلے باب میں حالی کی زندگی کے مختصر حالات اور ابتدائی کلام کا ذکر ہے- دوسرے باب میں مسدس پر بحث ہے- تیسرے باب میں ان کی دوسری نظموں کا ذکر ہے- چوتھے میں مرثیوں کا بیان ہے اور پانچواں خاتمۂ کلام ہے جو صرف چار صفحے کا ہے —

شاعر کے خیالات اور مقصد کی تشریح کے ضمن میں قابل مولف نے جا بجا اصل اشعار نقل کیے ہیں اور ان کے ساتھہ انگریزی ترجمہ بھی دے دیا ہے- مولف نے نہ صرف حالی کے کلام کے سمجھنے کی کوشش کی ہے بلکہ اس کا جو اثر ملک اور قوم پر ہوا اور اس نے زبان کے بدلنے اور قوم کی اصلاح میں جو کام کیا ہے اُسے بھی سمجھا اور بیان کیا ہے- اگرچہ یہ کتاب اُس اعلیٰ پایہ کی نہیں جس کی توقع حالی کے قدردان کرتے ہیں لیکن مولف کے شوق اور خلوص اور محنت میں مطلق شبہہ نہیں- ان کا مقصد اس کتاب کے لکھنے سے یہ ہے کہ وہ جو لوگ اتنی اردو نہیں جانتے کہ اصل کو پڑھ کر اس سے مستفید ہوسکیں وہ حالی کے حالات اور اس کے کلام کی خوبیوں سے واقف ہوسکیں اور یہ معلوم

کرسکیں کہ اس نے اردو زبان کے بنانے اور قوم کے خیالات میں انقلاب پیدا کرنے اور اردو شاعری کی اصلاح میں کیسا عظیم الشان کام کیا ہے - اس مقصد کو اس کتاب نے پوری طرح انجام دیا ہے —

طب

کلیات ادویہ

(حکیم محمد کبیرالدین صاحب کی تالیف ہے- جسے دفترالمسیح قرول باغ دہلی نے شائع کیا ہے - کتاب ۲۶×۲۰/۸ سائز کے ۹۵۰ صفحات پر مشتمل ہے - لکھائی چھپائی بھی اچھی اور کاغذ بھی اچھا ہے - کتاب کی قیمت پانچ روپیہ رکھی گئی ہے جو حجم اور اس کی خوبصورت جلد کو دیکھتے ہوے کچھ زیادہ نہیں) —

حکیم محمد کبیرالدین صاحب ان لوگوں میں ہیں' جو ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں - آپ کی متعدد کتابیں طبیہ کالج دہلی اور ہندستان کے دوسرے طبی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں - علم الادویہ کے متعلق عربی ' فارسی اور اردو کی طبی کتابوں میں متفرق طور پر جو کچھ موجود تھا' حکیم صاحب موصوف نے یہ سب نہایت عمدگی اور قرینے کے ساتھہ اپنی اس تالیف میں جمع کردیا ہے - کتاب کے آخر میں چند صفحات معالجات کے لیے بھی مخصوص کردیے گئے ہیں - اگر حکیم صاحب آئندہ اپنی تالیفات و تصنیفات کو غیر مانوس

اور ثقیل عربی اصطلاحوں سے آلودہ نہ کریں تو اچھا ہو - حکیم صاحب کی یہ کتاب موضوع اور اپنی افادی حیثیت سے اس قابل ہے کہ کسی طبیب کا مطب اس سے خالی نہ رہنا چاہیے —

دیسی فارما کوپیا موسوم بہ علاج بالمرکبات

(حکیم سید محمد اکبر علی زیدالپری فاضل الطب والجراحت کی یہ تالیف $\frac{۳۰\times۴۰}{۱۶}$ سائز کے ۱۹۰ صفحوں میں چھپی ہے - لکھائی، چھپائی اور کاغذ غنیمت جلد مضبوط اور خوبصورت لیکن قیمت دو روپیہ بہت زیادہ اور غیر مناسب ہے) -

حکیم صاحب نے اپنی اس فارما کوپیا میں صرف وہی نسخے درج فرمائے ہیں جن کا تجربہ وہ خود کر چکے ہیں - ضرورت مند اصحاب صاحب زادہ ممتاز حسین زیدی الپر ضلع سیال کوٹ سے طلب فرمائیں —

مذہب و سیر

تابعین -

(مرتبہ مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ قیمت چار روپے حجم ۵۰۸ تقطیع $\frac{۲۶\times۲۰}{۸}$)

مجلس دارالمصنفین اعظم گڈھ نے سیرۃ النبی اور سیر صحابہ پر اچھی کتابوں کا ایک سٹ شائع کیا ہے - اس سلسلہ میں ان کے بعد ان بزرگوں کا درجہ ہے جو والذین اتبعوھم باحسان کے آسمانی خلعت سے مفتخر و مکرم ہیں - اس لیے اب دارالمصنفین نے بزرگ تابعین کا تذکرہ شائع کرنا شروع کیا ہے - یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جو دارالمصنفین کے سلسلہ نشریات کی ۶۲ ویں کتاب ہے —

اس کتاب میں مرتب نے متداول کتب رجال سے ۹۱ تابعین کا تذکرہ درج کیا ہے اور دلچسپ بناکر درج کیا ہے - یہ کتاب اس لائق ہے کہ مسلمان اس کو پڑھ کر اپنے بزرگوں کے کارناموں سے سبق حاصل کریں اور دیکھیں کہ پچھلے بزرگوں نے جنھیں صحابہ کرام کا فیض تربیت میسر آسکا تھا کس طرح زندگی بسر کی اور ان میں کس قدر آھنگ عمل پایا جاتا تھا —

مرتب کی محنت کی داد ملنی چاھیے - مگر کیا اچھا ہوتا کہ روایات پر تنقیدی نظر بھی ڈالی جاتی اور ہر تذکرہ کو تحقیق کے بعد درج کیا جاتا - بعض ایسی باتیں درج ہوگئی ہیں جن کا مرتبہ افسانہ سے زیادہ نہیں - کچھ تسامح اور فرو گزاشتیں بھی ایسی رہ گئی ہیں جو دارالمصنفین کے شایان شان نہیں - مثلاً اس کتاب میں حضرت مسعر بن کدام المتوفی سنہ ۱۵۳ کا تذکرہ بھی غلطی سے درج ہوگیا ہے - حالانکہ کسی تذکرہ نویس نے ان بزرگ کو تابعی نہیں لکھا اور نہ خود مرتب نے کسی صحابی سے ان کی ملاقات کا ذکر کیا ہے - غالباً مرتب کو ابن سعد کی طبقہ داری تقسیم سے غلط فہمی ہو گئی ہے - حالانکہ ابن سعد اگر کسی بزرگ کا طبقۂ تابعین میں ذکر کرتے ہیں تو اس کا مطلب ان کو تابعی ثابت کرنا نہیں

ہوتا - حضرت ایوب سختیانی کے ذکر میں مرتب نے یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے حضرت انس کو دیکھا تھا - حالانکہ ابن حجر نے تہذیب میں اس کا ذکر کیا ہے —

اسی طرح بعض طباعتی غلطیاں بھی ایسی رہ گئی ہیں جن سے غلط فہمی ہوتی ہے - اگرچہ آخر میں غلط نامہ بھی لگا دیا گیا ہے مگر بعض غلطیاں اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہیں - مثلاً صفحہ ۶۸ میں حضرت جعفر صادق (رض) کا نسب نامہ اس طرح لکھا گیا ہے " حضرت جعفر بن محمد بن علی بن ابی طالب " حالانکہ صحیح نسب نامہ " جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب " ہونا چاہیے - اسی طرح صفحہ ۹۲ پر حضرت بکر بن عبدالله المزنی کی وفات سنہ ۱۸۰ لکھی ہوئی ہے حالانکہ صحیح سنہ ۱۰۸ ہے - غلط نامے سے بھی اس کی تصحیح نہیں ہوئی —

اس قسم کی بعض اور غلطیاں بھی ہیں جن کی احتیاط کے ساتھ دوسرے ایڈیشن میں اصلاح ہونی چاہیے —

کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو میں بالکل نئی چیز ہے - اب تک اس موضوع پر کوئی کتاب اردو زبان میں شائع نہیں ہوئی - کتابت و طباعت دیدہ زیب دارالمصنفین اعظم گڈھ سے مل سکتی ہے —

(ع - ق)

تفسیر سورۂ والعصر

(ملنے کا پتہ منیجر دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر - اعظم گڈھ - قیمت ۲ آنے)

یہ تفسیر ' سلسلۂ دائرہ حمیدیہ کی آٹھویں کتاب ہے - مولانا حمید الدین صاحب فراهی مرحوم کی تالیف ہے جن کو خدا نے قرآنی معارف وحکم کی تفہیم کا خاص سلیقہ عطا کیا تھا - جو توقعات فاضل مولف کی شخصیت سے وابستہ ہو سکتی ہیں یہ کتاب انہیں بوجہ احسن پورا کر رہی ہے - مولوی امین احسن صاحب اصلاحی نے اس کا ترجمہ کر کے نہ صرف استاذ مرحوم سے عقیدت کا حق ادا کیا ہے بلکہ اردو ادب کی ایک شایستہ خدمت انجام دی ہے - در اصل مسلمانوں میں فہم قرآن کا ذوق پیدا کرنے کے لیے ایسی ہی کتابوں کی ضرورت ہے - یہ حقیقت اس کتاب کے مطالعہ ہی سے روشن ہو سکتی ہے کہ چھوٹی چھوٹی تین چار آیتوں کی سورۃ بھی اپنے اندر اتنے حکیمانہ اسرار کو پنہاں کیے ہوئے ہے جن کے بیان کے لیے ۹۹ صفحات درکار ہیں - کتاب ۱۲ عنوانات میں تقسیم ہے اور ہر عنوان ایک جامع بحث پر حاوی جس کی خوبیوں کا صحیح اندازہ اس کے پڑھنے کے بعد ہی ممکن ہے —

(م - ز)

لغت

تسہیل العربیہ

(مرتبہ مولانا محمد حسن صاحب مولوی فاضل و چودھری غلام محمد صاحب بی - اے (علیگ) حجم ۹۹۸ صفحات - قیمت مجلد چار روپے اور غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے)

یہ عربی اردو لغت ہے - اردو داں اصحاب کو ایسے لغت کی بہت ضرورت تھی خوشی کی بات ہے کہ وہ ضرورت ایک حد تک اس کتاب کی تدوین سے پوری ہوگئی ہے - لیکن پھر بھی یہ مزید اصلاح کی محتاج ہے —

عربی زبان و ادب میں اعراب و اشتقاق کو جو اہمیت ہے وہ پوشیدہ نہیں - اگرچہ الفاظ پر حتی الوسع اعراب لگائے گئے ہیں لیکن پھر بھی غلطیاں رہ گئی ہیں - جب تک ابواب معلوم نہ ہوں عربی زبان کے کسی ماضی یا مضارع کے صحیح اعراب کا پتا لگنا بہت دشوار ہے - افسوس ہے کہ لائق مؤلفین نے اس بارے میں پوری احتیاط سے کام نہیں لیا - بعض الفاظ کے ترجمے اصلی مفہوم سے الگ ہوگئے ہیں مثلاً (صفحہ ۲) "ابن الرجل" کا ترجمہ پانو کی رگیں کیا گیا ہے - یہ مغالطہ انہیں پانو کی اس بھدی تصویر سے ہوا ہے جو 'المنجد' میں دی ہے - وہ عربی لغت کی دوسری کتابیں بھی دیکھ لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اس سے مراد گلتی یا دنبل ہے نہ کہ پانو کی رگیں - بعض جگہ ترجمے میں زبان کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں - مثلاً (صفحہ ۳) "فرس اثیر" کے تحت میں لکھا ہے "گھوڑا جس کے کُھروں کے نشان بڑے ہوں" - گھوڑے کے کُھر نہیں ہوتے سم ہوتے ہیں —

اگرچہ اس کا اظہار نہیں کیا گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ المنجد کا ترجمہ ہے —

ہمیں امید ہے کہ لائق مؤلفین آئندہ طبع کے وقت اس پر غور کے ساتھ نظر ثانی کریں گے تاکہ جو نقص باقی رہ گئے ہیں وہ رفع ہو جائیں —

باوجود اس کے ان کا کام قابل شکریہ ہے اور اس کتاب سے اردو داں اصحاب کو بہت بڑی مدد ملے گی —

ہندی اردو لغت

مولفہ راجہ راجیسور راؤ اصغر صاحب بڑی تقطیع ' صفحات - ۴۹۱ - قیمت سات روپے آٹھ آنے)

یہ ہندی اردو کا مبسوط لغت ہے اور اس کی ترتیب میں موجودہ ہندی لغات سے کام لیا گیا ہے - ہر ہندی لفظ کے مقابل میں صحیح اردو مترادف درج ہیں - الفاظ پر اعراب بھی صحت کے ساتھ لگائے گئے ہیں - لیکن بعض الفاظ پر بلا وجہ بھی اعراب کی بھر مار کردی ہے - مثلاً "کاری" کے 'ک' پر زبر اور یاے معروف کے نیچے زیر کی مطلق ضرورت نہ تھی - پیش کے استعمال میں بھی مروجہ قاعدے کے خلاف کیا ہے - یعنے اُلٹا پیش واؤ مجہول کے لیے اور سیدھا پیش واؤ معروف کے لیے استعمال کیا ہے —

اگر ہندی لفظ جیسا کہ اردو میں لکھا ہے دیوناگری حروف میں بھی لکھ دیا جاتا تو ہندی داں اصحاب کو جو اردو سیکھنا چاہتے ہیں ' بہت آسانی ہو جاتی - شاید لیتھو کی طباعت کی وجہ سے یہ بات عمل میں نہ آسکی —

راجہ صاحب ایک مشہور مولف ہیں - اور اردو زبان میں اُن کی متعدد تالیفات شایع ہوچکی ہیں - ان کی یہ جدید تالیف بہت مفید ثابت ہوگی - جس کے لیے ملک کے تمام اردو اور ہندی داں طبقے کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے —

متفرقات

الکتاب الوحید

مولانا حافظ قاری محمد اسمعیل مدنی مجددی نے علم قرأت کی ایک عربی کتاب مفتاح التجوید کا ترجمہ مع اصل متن اس نام سے کیا ہے - کتاب کے آخر میں کئی بڑے بڑے قاریوں اور عالموں کی تقریظیں بھی ہیں - کتاب $\frac{26 \times 20}{8}$ سائز کے ۱۱۲ صفحات پر چھپی ہے - کتابت، طباعت عمدہ اور کاغذ بھی کافی اچھا لگایا گیا ہے - فن قرات و تجوید سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اتحاد بک ڈپو پیش حضور تحصیل ریاست رامپور سے آٹھ آنے میں طلب فرمائیں —

عربوں کی جہاز رانی

(مصنفہ مولانا سید سلیمان ندوی - لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ - تقطیع خرد - حجم ۲۰۰ صفحات - ملنے کا پتہ : اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن نمبر ۳۴ چوپاٹی روڈ بمبئی ۷ سے مل سکتی ہے - قیمت درج نہیں ہے)

یہ کتاب مولانا سید سلیمان ندوی کے ان چار خطبوں کا مجموعہ ہے جو مارچ سنہ ۳۱ ع میں انہوں نے انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی میں دیے تھے - اس میں عربوں کی جہازرانی کے حالات زمانۂ جاہلیت

سے شروع کر کے اس عہد تک بیان کیے گئے ہیں جب کہ ان کی بحری ترقی کا خاتمہ ہوا ہے —

عرب ایک طرف بحیرہ قلزم بحر عرب اور بحر ہند سے گزرتے ہوئے چین اور جاپان تک جہاز رانی کرتے تھے - اور دوسری طرف شامی سواحل سے بحر روم میں اندلس اور افریقہ کے ساحلی بندرگاہوں میں ان کے جہاز چلتے تھے - اس کتاب میں ان کے جہازوں کی ساخت - جہاز سازی کے کارخانوں - بحری معلومات - جہاز رانی کے آلات - اور بندرگاہوں - نیز جنگی بیڑوں - بحری لڑائیوں وغیرہ کے حالات اور ان کے عہد بعہد کی کیفیات بیان کی گئی ہیں - واسکوڈی گاما کو ہندوستان کا راستہ بتانے والے عربی ناخدا ابن ماجد کی تفصیلی کیفیت مستند ماخذوں سے درج کی گئی ہے - فن جہاز رانی پر عربوں کی تصانیف کا بھی مفصل ذکر ہے —

لیکن مولانا نے عربی الفاظ اور قدیمی اشعار سے عہد جاہلیت میں عربوں کی جہاز رانی پر جو استدلال کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ان الفاظ اور اشعار سے صرف ان کی واقفیت کا ثبوت ہوتا ہے نہ کہ جہاز رانی کا - آج طیران - طیارہ اور بعض اصطلاحی الفاظ بھی اس کے متعلق عربی زبان میں داخل ہو چکے ہیں لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ عرب ہوائی جہاز بناتے اور اڑاتے ہیں - علی ہذا قرآن کی آیتیں جو درج کی گئی ہیں وہ بھی اس کا ثبوت نہیں دیتیں کہ اس عہد میں عرب جہاز رانی کرتے تھے بلکہ ان سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کشتی اور سمندر سے واقف ہے اصل یہ ہے کہ جس طرح دیگر ممالک ساحلی باشندے کشتیاں چلاتے تھے وہی حال ان کا تھا - حضرت عمر (رض)

کے عہد تک کوئی خاص توجہ عربوں کو جہاز رانی کی طرف نہ تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے جب کوفہ آباد کرایا تو تاکید لکھی کہ ایسی جگہ آباد کرنا کہ میں آؤں تو بیچ میں دریا نہ پڑے۔ یہی عمر ابن العاص کو لکھا جب انہوں نے مصر فتح کیا۔ جس کی وجہ سے وہ اسکندریہ کو اسلامی مرکز نہ بنا سکے اور دریائے نیل کے اس پار ہی خطاط کو آباد کیا —

دراصل عربوں میں جہاز رانی کا آغاز امیر معاویہ کی بدولت ہوا جن کو والی شام ہونے کی وجہ سے رومیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کی سخت ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ عہد فاروقی میں اس کی اجازت کہاں مل سکتی تھی۔ جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو انہوں نے چند شرائط کے ساتھ امیر موصوف کو اجازت دی جس کے بعد انہوں نے جنگی بیڑہ تعمیر کیا جو یوماً فیوماً ترقی کرتا گیا —

آیات جو اس کتاب ان میں مندرج ہیں ان میں سے ایک آیت کی تشریح میں سید صاحب فرماتے ہیں :—

"ایک جگہ دو دریاؤں کا ذکر ہے جن میں سے ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے اور دونوں سے مچھلیاں اور ایک سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں صفحہ ۳۴" —

آخری فقرہ یعنی "ایک سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں" نہ قرآن کا مفہوم ہے نہ سوائے سید صاحب کے کسی نے ایسا سمجھا ہے۔ آیت یہ ہے

ومن کُل تاکلون لحماً طریاً وتستخرجون حلیۃً تلبسونہا۔ اور ہر ایک (سمندر) سے تم تازہ گوشت کھاتے اور زیور نکالتے ہو۔ یعنی دونوں سے مچھلیاں پکڑی جاتی اور موتی مونگے نکالے جاتے ہیں نہ کہ "ایک سے"

تعجب یہ ہے کہ اس کے بعد سید صاحب نے سورۂ الرحمن کی یہ آیت بھی نقل کی ہے —

یخرج منہما اللولوء والمرجان — دونوں (سمندروں سے) موتی اور مونگے نکلتے ہیں —

مگر باوجود اس تصریح کے بھی ان کو اپنی اس غلطی پر کہ "ایک سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں" تنبہ نہ ہو سکا —

فہرس

(کتب خانہ سٹی کالج حیدرآباد دکن - مرتبہ مولوی غلام رسول صاحب مددگار کالج قیمت دو روپے)

یہ انٹرمیڈیٹ سٹی کالج حیدرآباد کے کتب خانے کی موجودہ کتابوں کی مکمل فہرست ہے جو قابل مرتب نے جدید اصول پر ترتیب دی ہے - اس میں اردو فارسی اور عربی کی ہر فن کی کتابیں ہیں - علاوہ اس کے اردو کے اکثر مشہور رسالے جو کالج میں آتے ہیں ان کا اندراج بھی کردیا گیا ہے - آخر میں اشاریہ یعنی انڈکس ہے - کتابیں سب مطبوعہ ہیں - فہرست بہت خوشنما چھاپی گئی ہے —

اُردو کے جدید رسالے

برہان

یہ ندوۃ المصنفین دہلی کا ماہوار رسالہ ہے جس کے مرتب سعید احمد صاحب اکبرآبادی، ایم - اے، فاضل دیوبند ہیں - اس وقت تک اس کے دو نمبر شایع ہوچکے ہیں - اس کا مقصد مذہب اسلام کی حمایت اور اسے مادی علوم کے اثر اور ری سرچ کے پردے میں مستشرقین یورپ کے حملوں سے بچانا، وقت کی جدید ضرورتوں کے پیش نظر قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر پیش کرنا اور اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تاریخ کی خدمت انجام دینا ہے - اس مقصد کو یہ رسالہ پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہے - اگرچہ اس اعلیٰ مقصد کی تکمیل جو اس کے پیش نظر ہے فی الحال مشکل ہے کیونکہ اس کے لیے بڑے سامان اور مشرقی و مغربی علوم کے ماہرین کی ضرورت ہے تاہم جو کچھ اب تک اس نے کیا ہے وہ قابل قدر ہے - سالانہ چندہ پانچ روپے ہے اور منیجر برہان قرول باغ، نئی دہلی سے مل سکتا ہے —

جدید اردو

یہ ماہانہ رسالہ کلکتہ سے شایع ہونا شروع ہوا ہے جس کے اڈیٹر پرویز شاہدی ایم - اے ہیں - کلکتہ بنگال میں پھر اردو کا مرکز ہوتا

جاتا ہے - وہاں سے اردو کے متعدد اخبار اور رسالے شایع ہوتے ہیں - لیکن اردو کی اشاعت میں جیسی کوشش ہونی چاہیے وہ ابھی تک نہیں ہوئی - امید ہے کہ انجمن ترقیء اردو کی شاخ جو حال ہی میں وہاں قائم ہوئی ہے اس طرف توجہ کرے گی - قابل اڈیٹر کو شکایت ہے کہ کلکتہ کے سے شہر میں کتابت و طباعت کی وہ سہولتیں میسر نہیں جو دہلی لاہور وغیرہ میں ہیں - یہ شکایت بھی اسی وقت رفع ہوگی جب اردو لکھنے پڑھنے کا چرچا عام ہوجاے گا —

رسالے میں زیادہ تر ادبی مضمون ہوتے ہیں - فسانے' ڈرامے' نظمیں بھی شایع ہوتی ہیں - اب نیا نیا ہے' غنیمت ہے - اسے زیادہ بہتر اور مقبول بنانے کی ضرورت ہے —

کارنامہ

یہ ماہانہ رسالہ الہ آباد سے شایع ہوتا ہے - اس کے عنوان پر لکھا ہے "علمی اور عملی معلومات کا ماہانہ جریدہ" - اس کا مقصد اردو دانوں کے لیے دلچسپ اور مفید مضامین کا (خصوصاً ایسے مضامین کا جو صنائع اور فنون یا علم صنعت سے تعلق رکھتے ہیں) فراہم کرنا ہے - اس مقصد کے پورا کرنے میں رسالہ نے حتی الامکان کوشش کی ہے - کاغذ اور چھپائی معمولی ہے - سالانہ چندہ دو روپے آٹھ آنے ہے - مسرور قنوجی صاحب کی ادارت میں سبزی منڈی الہ آباد سے شایع ہوتا ہے —

اردو رسالوں کے خاص نمبر

علی گڑھ میگزین کا اقبال نمبر

یہ نمبر اقبال کی وفات کے بعد ہی فوراً شایع ہوا تو خیال ہوا کہ علی گڑھ والوں نے کمال کیا کہ اتنی جلدی اقبال مرتب کر کے شایع کر دیا لیکن شذرات پڑھنے سے معلوم ہوا کہ ۲۹ جنوری کو علی گڑھ یونیورسٹی میں جو یوم اقبال منایا گیا تھا اور اس میں جو مقالے، نظمیں پڑھی گئیں اور جو تقریریں کی گئیں وہی جمع کر کے اقبال نمبر کی صورت میں شایع کر دیا گیا ہے - کسے معلوم تھا کہ اجل سر پر کھڑی ہوئی ہے —

یہ اقبال کے کلام اور خیالات پر نظم و نثر کا بہت نفیس مجموعہ ہے اور ان تمام مضامین کے لکھنے والے علی گڑھ ہی کے ہیں - یہ نمبر مطالعہ کے قابل ہے اور بہت پاکیزہ چھپا ہے اور اس قابل ہے کہ اردو کے ہر کتب خانے میں رکھا جاے —

سب رس اقبال نمبر

یہ ایک سو ساٹھ صفحے کا مجموعہ ہے جس میں اقبال کی حیات و کلام کے ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے - حیدرآباد میں بھی مثل دوسرے شہروں کے یوم اقبال بڑی شان سے منایا گیا تھا - اس میں جو پیغامات وصول ہوے یا مضامین اور نظمیں پڑھی گئیں وہ سب اس میں درج ہیں - اس کے بعد جب اقبال کی وفات کی خبر آئی تو ایک بڑا تعزیتی جلسہ کیا گیا - اس میں جو پیام آئے اور تقریریں ہوئیں یا نظمیں اور مضمون پڑھے

گئے وہ بھی اس میں درج کردیے گئے ھیں - ان کے علاوہ اور مختلف مضامین بھی داخل کیے گئے ھیں شروع میں نامور مصور چغتائی کی ایک رنگین تصویر ھے جو اقبال کی ایک رباعی کی تفسیر ھے —

یہ بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ھے اور بہت کم وقت میں بڑی محنت اور شوق سے مرتب کیا گیا ھے —

ھمدرد صحت دق و سل نمبر

حکیم حاجی عبدالحمید صاحب نے زیر نظر نمبر کو مرتب کر کے نہ صرف ایک ملی اور علمی فرض کو ادا کیا ھے بلکہ رفاہ عام کا ایسا مفید کام کیا ھے جو ھمیشہ یاد رکھنے کے قابل ھے - اگرچہ حکیم صاحب موصوف اپنے نیک نام اور مشہور عالم "ھمدرد دواخانہ" دھلی کے ذریعہ سے بھی قابل قدر خدمات انجام دے رھے ھیں لیکن "ھمدرد صحت" کی افادی حیثیت سب پر فائق ھے —

دق و سل کی یہ اشاعت خاص ۲۵۳ صفحات پر مشتمل ھے - اس نامراد بیماری کا کوئی پہلو ایسا نہیں، جس پر نہ صرف ھندوستان کے بڑے بڑے حکیموں، تجربہ کار ڈاکٹروں، ھوشیار ویدوں بلکہ یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا کے دق و سل کے ماھرین و متخصصین نے بھی پر از معلومات بحث نہ کی ھو - گویا یہ نمبر ھماری زبان میں مشرق و مغرب کے مایۂ ناز اطبا کے سالہا سال کے تجربات کا نچوڑ اور ان کی طبی کاوشوں کا مرقع ھے —

مضمون نگاروں کی تصویریں تو ان گنت ھیں ھی، لیکن ماؤف پھیپھڑوں

اُن کے غار، کلتھوں، خون چوسنے والے جرائم اور [illegible]وں پر اُن کے مہیب اور تباہ کن اثرات کی بھی بھیانک تصویریں دے دی گئی ہیں۔ چند جدول اور نقشے بھی ہیں - غرض ایک اعلیٰ اور معیاری رسالہ کے لیے علم و فن کی اس نئی روشنی میں جن جن لوازم کی ضرورت ہے وہ سب اس نمبر میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں - اگر فاضل مرتب نسخوں کے اندراج میں ذرا احتیاط سے کام لیتے تو اچھا ہوتا - اعلیٰ ایڈیشن کی قیمت ۱۴ آنے اور معمولی کی صرف آٹھ آنے رکھی گئی ہے جو بہت کم ہے —

دی مسلم یونیورسٹی میگزین

یہ انگریزی میگزین ۲۰۸ صفحے پر ہے اور اس کے علاوہ آخر میں ۴۰ صفحے کا ضمیمہ ہے جس میں یونیورسٹی کے حالات اور خبریں ہیں —

مضامین مختلف نوعیت کے ہیں لیکن زیادہ تر ادبی اور علمی ہیں - دو ایک سیاسی اور تاریخی بھی ہیں - سب سنجیدہ اور غور سے پڑھنے کے قابل ہیں - میگزین کے اڈیٹر محمد نعمان صاحب ایم ۔ اے قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے ایسے اچھے لکھنے والے اور ایسے اچھے مضامین فراہم کر لیے —